قومی زبان

ماہنامہ قومی زبان کراچی

قومی زبان جنوری ۱۹۹۴ء جلد: ٦٦ شمارہ: ۱

مضمون نما

ادارۂ تحریر
ادا جعفری
جمیل الدین عالی
مشفق خواجہ

مدیر
ادیب سہیل

بدل اشتراک
فی پرچہ ——— ۸ روپے
سالانہ عام ڈاک سے ۹۰ روپے
سالانہ رجسٹری سے ۱۹۲ روپے

بیرونِ ممالک
سالانہ عام ڈاک سے ۱۰ پونڈ ۱۵ ڈالر
سالانہ ہوائی ڈاک سے ۱۵ پونڈ ۲۵ ڈالر

انجمن ترقی اردو پاکستان
ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال،
کراچی ۷۵۳۰۰ ۔ فون ۴۹۱۳۰۷۹، ۴۹۱۲۳۰۶

انجمن کی کتاب "فرہنگِ اصطلاحاتِ بینکاری" کی تقریبِ اجرا میں دائیں سے بائیں ڈاکٹر اسلم فرخی، جناب نورالحسن جعفری، جناب جمیل الدین عالی، جناب آفتاب احمد خاں، جناب محمد احمد سبزواری، ڈاکٹر محمد یعقوب۔

قومی زبان ۱۸ اکتوبر ۱۹۹۲ء

صدر مجلس کے ساتھ اراکینِ مجلس کا گروپ فوٹو

جناب ڈاکٹر محمد یعقوب

تعلیمی استعداد:

۱۹۵۷ء	پنجاب یونیورسٹی سے بی۔اے اکانومکس (آنرس)
۱۹۵۹ء	پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔اے اکانومکس
۱۹۶۵ء	ییل یونیورسٹی سے ایم۔اے اکانومکس
۱۹۶۶ء	پرنسٹن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی اکانومکس

بینک دولت پاکستان کے تجربات

۶۸-۱۹۶۶ء	اسسٹنٹ ڈائریکٹر ریسرچ ڈیپارٹمنٹ بینک دولت پاکستان
۶۹-۱۹۶۸ء	ڈپٹی ڈائریکٹر ریسرچ ڈیپارٹمنٹ بینک دولت پاکستان
۷۲-۱۹۶۹ء	سینئر ڈپٹی ڈائریکٹر ریسرچ ڈیپارٹمنٹ بینک دولت پاکستان
۱۹۷۵ء	سینئر پرسنل آفیسر/ڈائریکٹر ریسرچ ڈیپارٹمنٹ آف پاکستان (عدم موجودگی میں)
۷۲-۱۹۶۶ء	کے دوران پاکستان ٹیکسیشن کمیشن، متعدد دیگر ورکنگ گروپس اور بین الحکومتی کمیٹیوں کے رکن رہے۔ بین الاقوامی اجلاسوں اور کانفرنسوں میں بھی پاکستان کی نمائندگی کی۔

بین الاقوامی ادارۂ مالیاتی فنڈ کے تجربات

۷۴-۱۹۷۲	شعبہ مشرقِ وسطیٰ کے اکانومسٹ
۱۹۷۵ء	سینئر اکانومسٹ اور سعودی عرب کے مقامی نمائندہ تھے۔
۱۹۷۷ء	سعودی عرب حکومت میں مالیات کے مشیر رہے۔
۸۰-۱۹۷۷ء	شعبۂ مشرقِ وسطیٰ کے ڈویژن کے سربراہ رہے۔
۹۲-۱۹۸۱ء	شعبۂ مشرقِ وسطیٰ کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہوئے۔
۹۲-۱۹۷۲ء	مختلف مالیاتی کمیٹیوں اور ورکنگ گروپ کے ممبر ہوئے۔ پیرس کلب، لندن او۔ای۔سی۔ڈی اور ملکوں کی امدادی کنسوشیم میں آئی۔ایم۔ایف کی نمائندگی کی۔ مشرقِ وسطیٰ کے بہت سے ممالک سعودی عرب، ایران، سوڈان، اُردن، متحدہ عرب امارات، یمن، قطر اور لبنان میں آئی۔ایم۔ایف مشن کی سربراہی کی۔
۳ اگست ۱۹۹۲ء سے ۲۴ جولائی ۱۹۹۳ء	وزارتِ خزانہ میں مشیر خصوصی برائے معاشیات پرنسپل سیکریٹری کے عہدے پر فائز رہے۔

۲۵ جولائی ۹۳ء سے تا حال گورنر بینک دولت پاکستان

جناب ڈاکٹر محمد یعقوب

گورنر، بینک دولت پاکستان

کا

"انجمن ترقی اردو" کی شائع کردہ

"فرہنگ اصطلاحاتِ بینکاری"

کی تقریب اجراء

منعقدہ ۱۱ دسمبر ۹۳ء

سے

خطاب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صدر انجمن محترم نورالحسن جعفری صاحب، معزز اراکینِ انجمن اور خواتین و حضرات!
السلامُ علیکم،

میں آپ حضرات کا بے حد مشکور ہوں کہ اہلِ علم اور دانشوروں کی اس محفل میں آپ نے مجھے دعوت دے کر میری عزت افزائی فرمائی۔ ہم بینکاروں کا زیادہ تر حساب کتاب سے تعلق رہتا ہے۔ آپ نے سوچا ہوگا کہ مجھے مجبور کریں کہ میں ایک شام حساب کا ساتھ چھوڑ کر صرف کتاب کے لیے وقف کروں، مگر آپ لوگ شاید یہ بھول گئے کہ یہ کتاب بھی ہمارے حساب کتاب سے تعلق رکھتی ہے، لہٰذا یہ شام میرے لیے منافع بخش ثابت ہوگی۔

معزز خواتین و حضرات! یہ امر باعثِ مسرت اور قابلِ تحسین ہے کہ انجمن ترقی اردو عرصہ دراز سے ملک و قوم کی ادبی و علمی خدمت سر انجام دے رہی ہے اور اس مدت میں اس نے ادبی اور علمی معلومات کا گراں بہا خزانہ، نایاب کتابوں کی اشاعت کے ذریعے عوام تک پہنچایا ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے خاموشی اور استقلال کے ساتھ کام کرنے کی جو روایت ڈالی تھی، اسے محترم اختر حسین صاحب اور دیگر کارکنانِ انجمن نے بڑی خوش اسلوبی سے نبھایا، اور اردو زبان کو دنیا کی دیگر زبانوں کے ہم پلہ بنانے کی کوششوں میں انجمن کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

یہ کتاب جس کی رونمائی کے لیے ہم سب یہاں جمع ہوئے ہیں، بینکاری کی اصطلاحات کے اُردو ترجموں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کی اہمیت و افادیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس کا تعلق ایک ایسے شعبے سے ہے جو جدید دنیا میں ریڑھ کی ہڈی کی سی اہمیت اختیار کر گیا ہے، بلکہ یہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا کہ بینکاری کے بغیر ہم اپنی روزمرّہ زندگی کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے، جس کام کا روزمرّہ کی زندگی سے گہرا تعلق ہو، اسے ہم غیر ملکی زبان تک محدود نہیں کر سکتے، چونکہ اس کے جاننے اور سمجھنے والے بہت کم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج بینکوں کے وہ تمام کاغذات جن کا تعلق براہِ راست عوام سے ہے، انگریزی کے ساتھ اُردو میں بھی دستیاب ہیں۔ اردو ہمارے عوام کے درمیان رابطے کی زبان ہے۔ پاکستان میں ہر طبقے اور خطّے کے لوگ اسے سمجھتے اور بولتے ہیں مگر بد قسمتی سے بینکاری سے اُردو کا تعلق ابھی خاصا محدود ہے۔ بینکاری کے شعبے میں عام استعمال کی زبان انگریزی ہی ہے۔ جس طرح زندگی کے دوسرے علوم میں اردو کا عمل دخل بڑھ رہا ہے، بینکاری کے شعبے میں بھی ہمیں اُردو کے استعمال کو بڑھانا چاہیے۔ میں انجمن ترقی اردو کی شائع کردہ ڈکشنری کی اشاعت کو اسی نقطۂ نظر سے ایک اہم اقدام سمجھتا ہوں۔

قیامِ پاکستان کے ابتدائی دنوں ہی سے شعبۂ بینکاری سے اردو کا کچھ نہ کچھ تعلق رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے پہلے گورنر، جناب زاہد حسین (مرحوم) کے ایما پر بابائے اُردو مولوی عبدالحق (مرحوم) نے ۱۹۵۱ء میں بینکاری کی صطلاحات کی ایک ڈکشنری تیار کی۔ تقریباً چار دہائیوں کے بعد اس ڈکشنری کو ازسرِ نو مرتّب کیا گیا ہے اور اس میں پہلے ایڈیشن کے مقابلے میں اصطلاحات کی تعداد کئی گنا زیادہ ہے۔

ہمارے ہاں اصطلاحات کا مسئلہ تقریباً ایک صدی سے اہلِ علم کی توجّہ کا مرکز رہا ہے۔ مختلف علوم و فنون کی اصطلاحوں کے تراجم بھی ہوتے رہے ہیں اور اس سلسلے میں اصولی بحثیں بھی کی جاتی رہی ہیں۔ جہاں تک سائنسی علوم کا تعلق ہے، اس کی اصلی صطلاحات مشکل بھی ہوں تو کام چل جاتا ہے۔ مگر بینکاری سے متعلق اصطلاحات ایک عام آدمی کو ایک عام زندگی میں استعمال کرنا پڑتی ہیں۔ لہٰذا وہ بہت آسان ہونا چاہئیں۔ اس ضمن میں یہ صحیح ہے کہ آسان کا فیصلہ کرنا بھی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ایک علم کی اصطلاح اُسی علم سے تعلق رکھنے والے کے لیے آسان ہوتی ہے اور ایک عام آدمی کے لیے مشکل ہوتی ہے۔ مگر یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس ڈکشنری میں بینکاری کی اصطلاحات کو کافی عام فہم زبان میں پیش کیا گیا ہے۔

بینکاری کی اصطلاحات میں دراصل کئی دوسرے علوم کی اصطلاحات بھی شامل ہیں مثلاً ریاضی و معاشیات، تجارت اور زراعت۔
ان کی اصطلاحات بھی بینکاری میں مستعمل ہیں۔ چونکہ بینکاری کی اصطلاحات عام زندگی سے وابستہ بے شمار علوم اور شعبوں سے
تعلق رکھتی ہیں، ان علوم کے بے شمار اصطلاحی الفاظ پہلے ہی اُردو میں مروّج ہیں۔ زیرِ نظر ڈکشنری میں انھی کو قبول کر لیا گیا ہے جو
ایک مستحسن اقدام ہے۔ اس کی ترتیب، ترجمے اور نظر ثانی کا سارا کام بڑی محنت اور سلیقے سے کیا گیا ہے جس کی میں داد دیتا
ہوں۔

بحیثیت مجموعی یہ ڈکشنری ایک عمدہ علمی کام ہے لیکن جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ علمی دُنیا میں کوئی کام بھی حرفِ آخر
نہیں ہوتا، اصلاح کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے۔ اس طرح اس ڈکشنری کے سرسری مطالعے سے چند باتیں میرے ذہن میں آئی ہیں
انھیں آپ کی توجہ کے لیے پیش کرتا ہوں۔

پہلی بات تو یہ کہ وہ الفاظ جو اردو کی روزمرہ بول چال میں شامل ہو چکے ہیں، ان کا ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اُردو
زبان نے ہمیشہ دوسری زبانوں کے الفاظ کو بڑی کشادہ دلی سے قبول کیا ہے۔ یہ اردو کی سرشت میں داخل ہے کہ اسے جہاں کہیں
بھی اپنے مطلب کا کوئی لفظ نظر آتا ہے، اسے اپنا لیتی ہے۔ ہمیں اردو کی اس کشادہ دلی سے استفادہ کرنا چاہیے۔ بینک ٹوکن کا ترجمہ
بینک بلا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیش، بینک ڈرافٹ، کریڈٹ کارڈ اور کمیشن جیسے الفاظ جوں کے توں استعمال کیے جاسکتے ہیں، اسی طرح
کوشش کرنی چاہیے کہ ٹیکنیکل الفاظ کا ترجمہ ایک ہی کر کے اُسے مشہور کیا جائے۔ مثلاً مارکیٹ، بازار، منڈی، وصول کنندہ، رسید
جیسے الفاظ کے مزید متبادل الفاظ پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بعض اصطلاحات کثیر المعانی ہوتی ہیں۔ اس لیے ایک
سے زیادہ متبادل الفاظ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ مگر کوشش ہونا چاہیے ایک اصطلاح کا ترجمہ ایک ہی ہو تو بہتر ہے تاکہ جہاں کہیں
یہ اصطلاح استعمال ہو، اس کا جامع مفہوم خود بخود ذہن میں آ جائے۔

یہ ایک باتیں تو خیر ایسے ہی کر دیں، بطور اعتراض نہیں کیں۔ میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ انجمن ترقی اُردو
کے اس عظیم منصوبے کی بہت افادیت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُردو زبان کی تاریخ میں بینکاری کی اصطلاحات کی یہ ڈکشنری ایک
سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں نے اسٹیٹ بینک کی لائبریری میں اس ڈکشنری کے کئی نسخے رکھنے کے لیے کہا ہے
مجھے یقین ہے، بلکہ پُرزور الفاظ میں میری یہ گزارش ہے کہ ملک کے تمام بینک اور دیگر مالیاتی ادارے بھی اس مفید اور معلومات
افزا کتاب کو ایک مستند حوالہ جاتی کتاب کے طور پر استعمال کریں اور اپنے اداروں کی سب شاخوں میں اس کے نسخے رکھیں، اس
طرح بینکاری کے شعبے میں ان اصطلاحات کا رائج ہونا آسان ہو جائے گا اور انجمن کی اس کتاب کی اشاعت میں اضافہ ہوگا۔

آخر میں میں اس کتاب کے مؤلفین محترم سبزواری اور جمیل الدّین عالی صاحب اور انجمن کے صدر نور الحسن جعفری صاحب
کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ پاکستان میں اصطلاحاتِ بینکاری کی پہلی فرہنگ بھی سبزواری صاحب نے مرتّب
کی تھی اور اب دوسری کتاب بھی انھی کی محنت کا نتیجہ ہے۔ میں آپ کی درازیٔ عمر کی دُعا کرتا ہوں تاکہ اس فرہنگ کا تیسرا ایڈیشن
بھی سبزواری صاحب ہی مرتّب کریں۔ میں انجمن ترقی اُردو کے صدر اور کارکنان کو یقین دلاتا ہوں، آپ لوگ جس خلوص، لگن
استقلال سے علمی خدمت سرانجام دے رہے ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی جزا دے گا۔

معزّز خواتین و حضرات! آپ میں سے اکثر اُردو ادب کے ماہر ہیں، اور آپ سے مل کر مجھے دلی خوشی ہوئی ہے۔ میں آ
سب کا شکر گزار بھی ہوں کہ آپ نے میری ٹوٹی پھوٹی اُردو میں کی جانے والی باتوں کو تحمل اور توجّہ سے سُنا۔ میں آپ سب کا بہ
ممنون ہوں۔ شکریہ

فرہنگِ اصطلاحاتِ بینکاری

محمد احمد سبزواری

عزت ماب ڈاکٹر محمد یعقوب صاحب، صدر انجمن نورالحسن جعفری صاحب، محترم جمیل الدّین عالی صاحب، آفتاب احمد خاں صاحب، محترم خواتین و حضرات السلام علیکم۔

"فرہنگِ اصطلاحاتِ بینکاری" کی یہ تقریب کئی لحاظ سے میرے لیے اعزاز کا باعث ہے۔ اوّل تو انجمن ترقی اردو پاکستان کی نوے سالہ تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ اس کی پان سو چار شائع کردہ مطبوعات میں سے کسی کی رسمِ اجرا و منائی جا رہی ہو۔ دوسرے اس کتاب کے موضوع کے لحاظ سے اس تقریب کے مہمان خصوصی بینک دولت پاکستان کے گورنر عزت ماب ڈاکٹر محمد یعقوب ہیں۔ ملک میں اس فرض کی انجام دہی کے لیے ان سے بہتر اور برتر کوئی شخصیت نہیں ہو سکتی۔ یوں کتاب کے اجرا میں جو طویل تاخیر ہوئی اس کی ایک گونا تلافی ہو گئی بلکہ دیر آید درست آید والی مثل دیر آید و لے خوش تر آید میں بدل گئی۔

یہ تو درست ہے کہ جب انسان آگے بڑھتا ہے تو ماضی کے نقوش مدھم ہو جاتے ہیں۔ سوچ کے دھارے بدل جاتے ہیں، قدیم چلن، روش، رویے، آدرش، اصول، کلیات سب میں تبدیلی آ جاتی ہے۔ اگر یہ تبدیلی جدید تحقیق، مزید غور و فکر یا نئے انکشافات کا نتیجہ ہو تو رشک و تقلید ہے اور اگر محض نام و نمود، دکھاوے اور تصنع کی خاطر ہو تو درِ خور اعتنا نہیں۔ سالہا سال سے اپنی علمی حیثیت اور ادبی تخلیق پر فخر کا اظہار ہوتا رہا ہے اور تخلیق کو معنوی اولاد کے مماثل سمجھا جاتا رہا ہے۔ حضرت مولانا روم نے اپنی مثنوی کے متعلق فرمایا "مثنویِ مولوی معنوی۔ ہست قرآں در زبانِ پہلوی" حافظ شیراز نے کہا "غزل گفتی و دُر سُفتی"۔ میر انیس نے اپنی قادر الکلامی کو یوں ظاہر کیا ایک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں۔ غالب نے اغیار کے طعن و تشنیع سے تنگ آ کر بے نیازی سے یہ ضرور کہا " نہ سہی گر میرے اشعار میں معنی نہ سہی۔ مگر دعویٰ ان کا بھی یہی تھا:

گنجینۂ معنی کا طلسم اُس کو سمجھیے

جو لفظ کہ غالب میرے اشعار میں آوے

بلکہ ایک فارسی شعر میں تو اپنے دیوان کو "ایزدی کتاب" سے تشبیہ دی اور اس سے اشارہ پا کر بجنوری مرحوم نے دیوانِ غالب کو الہامی کتاب قرار دیا تھا۔ مزید براں اپنے ایک خط میں انھوں نے اپنی تخلیق کو معنوی اولاد سے تعبیر کیا۔

اس کے باوجود ہر اولاد میں کچھ خامیاں اور کمزوریاں ہوتی ہیں جن کی ہمیشہ پردہ پوشی کی جاتی ہے اور اگر کبھی بدرجہ مجبوری پردہ

شکنی کی نوبت آجائے تو وہی صورت ہوتی ہے جو اُن والدہ محترمہ کو پیش آئی تھی جو اپنے بادہ و ساغر کے رسیا فرزند ارجمند کا رشتہ لے کر گئیں لڑکی والوں نے خوبیوں کی طولانی فہرست سننے کے بعد کہا، سنا ہے لڑکا پیتا ہے خاتون گڑبڑا گئیں اور بولیں "توبہ! یہ بہتان ہے اُس غریب کو تو یہ بھی پتہ نہیں کہ کھانے سے پہلے کون سی پیتے ہیں اور کھانے کے بعد کون سی۔" اسی پس منظر میں ایک موجودہ دانشور کا یہ قول نظر سے گزرا کہ "ادبی تخلیق کو اولاد سمجھنا، ایک احمقانہ فعل ہے، یہ رویّہ گمراہ کر دیتا ہے اور ایسے خیالات انسان کو ناکارہ بنا دیتے ہیں" تو اب غالب کی زبان میں صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ "کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟" میرے لیے گمراہی سے بچنے اور مزید ناکارہ بننے سے بہتر یہی ہے کہ میں اپنی صفائی میں اپنے کرم فرما جمیل الدّین عالی کو پیش کروں جنھوں نے میری کاوش پر چالیس صفحے کا مقدمہ سپرد قلم فرمایا اور اس مقدمے کو اپنے "حرفے چند" کے دوسرے مجموعے میں شامل کر کے صاحب کتاب کو ایک ناقابل فراموش مقام پر کھڑا کر دیا اور راقم کی تعریف ایسے الفاظ میں فرمائی کہ مجھے ایک گو احساس خجالت ہونے لگا چونکہ من آنم کہ من دانم۔

پاکستان کا آئین تو بعد میں بنا جس میں اردو کی سرکاری حیثیت متعین کی گئی مگر حضرت قائد اعظم نے تو پاکستان کے ابتدائی دور ہی میں اس کا اعلان فرما دیا تھا۔ چھیالیس سال گزر جانے کے بعد اس میں پیش رفت کیوں نہیں ہوئی۔ کون سے مصالح اس کی راہ میں حائل رہے یا ہیں اس کی تفصیل مقدمے کے باب دوم میں موجود ہے۔ دراصل ہماری وہ انتظامیہ (بیورو کریسی) جو نفاذ کی ذمہ دار ہے دو عملی، دورُخی یا تضاد کا شکار ہے۔ ایک جانب وہ مشکلات اور دشواریوں کے ڈھول پیٹتی ہے دوسری جانب جب اس کو اپنی بات عوام تک پہنچانا، ان کو اپنے موقف سے آگاہ کرنا، ان کو اعتماد میں لینا یا اُن کی اعانت مقصود ہوتی ہے تو ہر قسم کے مصالح کو بالائے طاق رکھ کر بلا تکلف تحریری شکل میں اردو کا سہارا لیا جاتا ہے۔ اُس وقت انتظامیہ نہیں دیکھتی کہ حکومت کس کی ہے۔ ایوان صدر یا مسند وزارت پر کون متمکن ہے وہ سب کو اپنے راستے پر لے آتی ہے۔ اس ذیل میں ذاتی تجربے کی بنا پر چند مثالیں ہیں:

(الف) بینک دولت پاکستان نے سب سے پہلے اپنی سالانہ روئدادیں اردو میں شائع کرنا شروع کیں جن کا سلسلہ اب تک جاری ہے (ب) حکومت نے مجلہ "ماہ نو" کے ساتھ جس کا مقصد ادبی چاشنی میں عوام کو حکومت کی سرگرمیوں سے باخبر رکھنا ادارہ مطبوعات پاکستان بھی قائم کیا جس نے ملکی مسائل پر بعض اچھی کتابیں شائع کیں اور اب تو متعدد ادارے یہ خدمت انجام دے رہے ہیں (ج) ۱۹۵۱ء میں کولمبو منصوبے کے تحت پہلا ترقیاتی منصوبہ تیار ہوا جس کی تفصیل "پاکستان لکس اے ہیڈ" میں دی گئی اور راقم ہی سے اس کا ترجمہ "پاکستان کا خوش گوار مستقبل" کے نام سے کرایا گیا (د) دیہی ترقی کے "ویلیج ایڈ" پروگرام میں مختلف سطحوں پر بہت کافی لٹریچر شائع کیا گیا (ہ) جب یہ پروگرام "بنیادی جمہوریت" میں تبدیل ہوا تو نئے موضوع پر بے تحاشہ مواد مولوی عبدالحق، شاہد احمد دہلوی، ابوالاثر حفیظ جالندھری، ممتاز مفتی، ابن انشا جیسے زعمائے اردو کے تعاون سے تیار کیا گیا۔ (ز) وزیر خزانہ محمد شعیب صاحب کے زمانے میں معاشی مشیر کے دفتر سے مرکزی حکومت کے میزانیوں کے خاکوں کا سلسلہ شروع ہوا جو کئی سال تک چلتا رہا اور ایک سال تو سالانہ معاشی جائزہ کا اردو ترجمہ بھی شائع کیا گیا (ح) دہ سالہ جشن جمہوریت پر منصوبہ بندی کمیشن نے چوتھے پنج سالہ منصوبے کا خلاصہ شائع کیا مگر ۸۳ء میں تو ساڑھے پانچ سو صفحات پر مشتمل چھٹے منصوبے کا دو بار ترجمہ کرایا گیا دوسری بار یہ خدمت راقم ہی نے انجمن کے توسط سے انجام دی۔ (ط) وزیر خزانہ کی بجٹ تقریر کے پہلے حصّے کا ترجمہ تو کافی عرصے سے بجٹ کے موقع پر تقسیم ہوا کرتا تھا اب تو کئی سال سے پوری تقریر اردو میں ہونے لگی ہے (ی) زکواۃ اور عُشر کے نظام کے وقت اس کے اعلانات، قوانین و قواعد، دستور العمل بلکہ سندھ میں تو ڈپٹی کمشنروں اور ضلع کمیٹیوں کے چیئرمینوں کے

واسطے تربیتی کتابچے اردو اور سندھی میں شائع کیے گئے (ک) مردم اور زراعت شماریوں میں سوال نامے اردو ہی میں تیار کیے جاتے ہیں اور آج کل تو مردم شماری کی طرف سے ایک سہ ماہی مجلہ "ہم لوگ" بھی نکل رہا ہے۔ (ل) مرکزی محکمہ شماریات کافی عرصے سے تکنیکی جائزوں کے سوال نامے اور ہدایات اردو میں شائع کر رہا ہے اور اب تو وہ بیرونی ادارے جو خاندانی منصوبہ بندی یا دوسرے جائزوں کا انتظام کرتے ہیں اپنے سوال ناموں اور ہدایات کو اردو میں منتقل کرانے لگے ہیں۔ ایسی اور بھی مثالیں ہوں گی جہاں مختلف وزارتوں، محکموں یا اداروں کی گوناگوں تیکنیکی اور غیر تیکنیکی کارگزاریوں کو اردو میں پیش کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی ہوگی تاہم ان کو اردو دوستی کا نام دینا خوش فہمی ہوگی بلکہ یہ ایک لاچاری کی صورت ہے کیوں کہ ایک ایسے ملک میں جہاں ۹۳ء میں بھی خواندگی ۳۰ فیصد ہو یعنی ساڑھے بارہ کروڑ کی آبادی میں پونے نو کروڑ افراد ناخواندہ ہوں اور جہاں انگریزی کی شدھ بدھ رکھنے والوں کی تعداد (میٹرک یا اس سے اوپر) بمشکل ۷۵ لاکھ ہوتی ہو وہاں اردو ہی ایسی زبان رہ جاتی ہے جس کے توسط سے زیادہ سے زیادہ عوام سے رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے۔

وہ اصحاب جنھیں اردو کی تنگ دامنی کا شکوہ ہے اُن کی خدمت میں گزارش ہے کہ اردو میں مختلف علوم و فنون کی تین لاکھ سے زائد اصطلاحیں وضع ہو چکی ہیں اور ان میں اضافے کا سلسلہ جاری ہے۔ وضع اصطلاحات میں بعض چھوٹے ادارے بھی دلچسپی لے رہے ہیں۔ کراچی کی "شہری" نامی ایک نجی انجمن نے ماحولیات جیسے نئے اور خشک تکنیکی مضمون پر اہل الرائے کے تعاون سے کوئی دو ہزار کے قریب تشریحی اصطلاحات وضع کی ہیں۔ دراصل مسئلہ اصطلاحات کے قحط کا نہیں بلکہ ان کے استعمال کرنے والوں کے قحط کا ہے۔

علوم و فنون کی ترقی کے ساتھ نئی اصطلاحات کا سلسلہ تو جاری رہے گا۔ بالعموم ان کی دو صورتیں ہوتی ہیں، یعنی یا تو کسی فکر، خیال، تصور یا شے کو ظاہر کرنے کے لیے کوئی نئی اصطلاح وضع کی جائے یا پرانے الفاظ کو نئے مضمون کا جامہ پہنا دیا جائے جیسے BULLET, HARDWARE, INFRASTRUCTURE, GALLOPING INFLATION, TUTORS, PIPE LINE, SOFTWARE وغیرہ اردو کو بھی اسی صورت حال کا سامنا ہے لیکن اردو اپنے مخصوص مزاج اور قوام کی بدولت دوسری زبانوں سے الگ نظر آتی ہے مثلاً اردو میں غیر زبانوں کے لفظ ایسے گھل مل جاتے ہیں کہ یہ تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے کہ یہ لفظ ہمارا نہیں ہے۔ اردو (ترکی) کمرا (اطالوی) نیلام (پرتگالی) پادری (لاطینی) بوتام (فرانسیسی) چائے (چینی) زکواۃ اور عشر (عبرانی) ماش (تامل) بھبیا (مرہٹی) بنگلہ (بنگالی) وغیرہ اس کی چند مثالیں ہیں۔ اردو کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ جب کسی بیرونی لفظ کو قبول کرلیا گیا تو اس سے دوسرے الفاظ آسانی سے بنائے جاسکتے ہیں۔ اردو میں بینک کا لفظ لے لیا گیا اور اس سے بینکار، بینک کاری، بینک کاران، بینک بینکاران، بینکی زر، بینکی سلک جیسی حسین اصطلاحیں بنالیں، چیک کے لفظ کو اردوالیا گیا اور اس سے سادہ چیک، کورا چیک، ناقص چیک، عمومی چیک، خصوصی چیک، سفری چیک، خط کشیدہ چیک، منسوخ شدہ چیک جیسی درجنوں اصطلاحیں وضع کر لیں۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اردو، عربی، فارسی، ہندی، انگریزی، پنجابی، سندھی، پشتو، بروہی، سرائیکی، بلوچی، بالتی، پوٹھواری، گوجری، گجراتی وغیرہ سے بہ آسانی استفادہ کرسکتی ہے۔ صرف ابتدا میں نئی اصطلاحوں میں ندرت، نامانوسیت یا کسیلا پن محسوس ہوگا مگر یہ تاثیر عارضی ہوگی اور متواتر استعمال سے اس کا احساس جاتا رہے گا۔

انجمن ترقی اردو پاکستان قابل مبارک باد ہے کہ وہ ادبی تخلیقات کے ساتھ ساتھ علمی کارناموں پر بھی توجہ دیتی رہتی ہے۔ پہلے ابتدائی دور میں الیاس برنی صاحب نے علم المعیشت جیسی کتاب لکھوائی جو تقریباً تین عشروں تک اردو میں معاشیات کی واحد ستند کتاب رہی۔ انجمن بجا طور پر یہ دعویٰ کرسکتی ہے کہ اُس نے ۱۹۴۲ء میں اردو میں بینکاری پر پہلی کتاب "ہمارے بینک"

شائع کی۔ اگست ۴۹ء اپنی نوعیت کا واحد جریدہ ماہ نامہ "معاشیات" جاری کیا۔ اس کے پہلے اداریے میں میں نے دو اہم باتوں کا ذکر کیا تھا اول لوگوں کی اردو میں لکھنے کی جھجک اور دوسرے اردو میں معاشی اصطلاحات کے مترادفات سے ناواقفیت۔ پہلی مشکل کا حل یہ نکالا کہ ہر مضمون کے آخر میں اس میں استعمال ہونے والی اصطلاحات کے مترادفات دیے جانے لگے اور دوسرا مستقل حل یہ طے کیا کہ معاشی اصطلاحات کو اقساط وار رسالے میں شائع کیا جائے چنانچہ فروری ۵۳ء سے جولائی ۵۴ء تک انگریزی حروف "A" سے "C" تک کوئی ڈیڑھ ہزار اصطلاحیں شائع ہوئیں۔ اس کے بعد پہلی مرتبہ میرے تعلیمی سلسلے میں امریکہ جانے کی وجہ سے یہ سلسلہ منقطع ہو گیا اور پھر تو رسالہ ہی بند ہو گیا۔

اسی دوران میں انجمن نے بینک دولت پاکستان کی جمع کردہ اصطلاحات کو نظر ثانی کے بعد ۱۹۵۱ء میں شائع کیا اور اب بیالیس سال بعد "فرہنگ اصطلاحات بینکاری" کا جدید نسخہ آپ کے سامنے ہے جس میں گیارہ ہزار سے زائد اصطلاحات ہیں۔ ان کی تعداد بڑھ بھی سکتی تھی کیوں کہ بینکاری کا تعلق زر، مالیات، بیمہ، صنعت، تجارت، زراعت، قانون وغیرہ سے ہے لیکن فی الحال صرف ضروری اصطلاحوں پر اکتفا کیا گیا۔

زاہد حسین صاحب نے اپنی مرتبہ فرہنگ کو انگریزی سے اردو کی طرف رجوع کرنے کا سنگ بنیاد قرار دیا تھا اور توقع ظاہر کی تھی کہ ان کی فرہنگ نہ صرف ان اصحاب کے لیے جو مالیات، بینکاری اور تجارت کی جدید مغربی کتابوں کا ترجمہ کریں گے شمع راہ ثابت ہوگی بلکہ ابنائے وطن میں ملکی زبان کی استعداد کے متعلق خود اعتمادی پیدا کرے گی۔ اردو اخبارات و رسائل کے لیے بھی یہ امر ممکن ہو جائے گا کہ وہ بینکاری اور مالیات کے متعلق اصطلاحات کا ترجمہ صحت اور یقین کے ساتھ کر سکیں۔

زاہد حسین صاحب نے جو سنگ بنیاد رکھا اس پر ڈھانچہ جعفری صاحب نے کھڑا کر دیا اب اس پر عمارت کی تعمیر و توسیع کی ذمہ داری دوسروں کے سر ہے اور کیا عجب کہ قدرت کو یہ کام ڈاکٹر محمد یعقوب سے لینا منظور ہو اور وہ مردے از غیب بروں آید و کارے می کند کی عملی تفسیر ثابت ہوں۔

جہاں تک کتاب کی فروخت کا تعلق ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ یہ کوئی مسئلہ ہے خود بینک دولت پاکستان کے کراچی میں ۲۰ محکمے اور درجنوں شعبے ہیں، پندرہ شہروں میں اس کے دفاتر ہیں، ملک میں دس جدولی بینک، بیس غیر ملکی بینک اور کئی مالیاتی ادارے ہیں۔ جدولی بینکوں کی شاخوں کی تعداد ساڑھے سات ہزار کے قریب ہے اگر ہر شعبے یا شاخ کے لیے صرف ایک ہی نسخہ خریدا جائے تو پہلا ایڈیشن تو گرما گرم خستہ کچوریوں کی طرح ختم ہو جائے گا اور پیچھے رہ جانے والوں کو دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا مگر اس کے لیے کسی کو پہلا پتھر پھینکنے کی ہمت کرنا ہوگی۔

میں آخر میں بینک دولت پاکستان، نیشنل بینک آف پاکستان، الائیڈ بینک آف پاکستان کے ان اعلیٰ عہدیداروں اور اولی الذکر دونوں بینکوں کے چیف لائبریرینوں اور اُن مختلف اصحاب کا شکریہ ادا کرنا اپنا خوش گوار فریضہ سمجھتا ہوں جنھوں نے کتابوں، رسالوں اور مشوروں سے میری اعانت و رہنمائی فرمائی اور خصوصی طور پر جناب خادم حسین صدیقی سابق صدر الائیڈ بینک کا کہ آپ نے اپنا وقت صرف کیا اور قیمتی مشوروں سے نوازا۔ طباعت، اشاعت، معاونت اور تشہیر کے ذیل میں میں محترم جعفری صاحب عالی صاحب اور ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب کا شکر گزار ہوں۔ آج یہاں آپ سب خواتین و حضرات کی تشریف آوری سے میری بڑی حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔ شکریہ

ہاتھ پر ہاتھ مارنا

سیّد قدرت نقوی

لسانیات کے اعتبار سے "ہاتھ پر ہاتھ مارنا" ایک محاورہ بھی ہے اور ایک مرکب بھی۔ دونوں حیثیت سے اس کے معنی متعین کیے جاتے ہیں۔ محاورہ کی حیثیت سے لغات میں اس کا اندراج پایا جاتا ہے۔ مگر بلحاظ مرکب اس کو درج نہیں کیا گیا اور نہ اس کے استعمال کے مواقع بتائے گئے ہیں۔

درحقیقت "ہاتھ پر ہاتھ مارنا" ایک عمل کا اظہار ہے۔ جو معنی عمل کے نتیجہ سے ماخوذ کیے گئے، وہ مجازی ہونے کی وجہ سے محاوراتی معنی بن گئے، اور یہ محاورہ کہلایا۔ جو معنی عمل کے موقع و محل سے متعلق ہوئے وہ مرکب کے تحت آئے اور یہ ترکیبی حیثیت قرار پائی۔ بطور محاورہ یہ معنی ہیں۔

۱۔ عہد و پیمان کرنا، پختہ عہد کرنا، قول و قرار کرنا، پکا وعدہ کرنا۔

درج ذیل اشعار میں یہ محاورہ انہی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

وعدۂ وصل زبانی ہے میں کیونکر مانوں
ہاتھ پر ہاتھ تو اس شوخ نے مارا ہی نہیں

کہیو! پیام یہہ کہ جو آتے نہیں ہو اب
پھر کیوں گئے تھے ہاتھ پہ تم [illegible]

قول دینے میں کیا عذرِ نزاکت پھروں
ہاتھ پر ہاتھ کبھی تم نے نہ مارا جھٹ پٹ

[illegible]انا، بازی لگانا، جیسے ان اشعار میں:

ہاتھ پر ہاتھ تو ہیں مارتے، پھر جاتے ہیں
جیب میری ہو مگر وہ نہیں کرتے ہیں قبول

قومی زبان (۱۸) جنوری ۱۹۹۴ء

ہاتھ پر ہاتھ نہ مارا تو یہ اچھا ہی ہوا
مجھ سے جی دار سے تم ہارتے ورنہ بازی

دیکھتا مجھ سے جیتتے کیسے؟
ہاتھ پر ہاتھ مار کر چلتے!

ان دونوں معنی میں ایک فرد دوسرے فرد کے ہاتھ پر ہاتھ مارتا ہے۔ یہی عمل ترکیبی اعتبار سے مواقع و مواد کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔

۱۔ دو یا چند افراد کا اظہار دوستی، یگانگت، یکجہتی، اتحاد، کسی بات کی تائید و قبولیت کے موقع پر ایک دوسرے کے ہاتھ مارنے کا عمل۔

۲۔ دو دوستوں کا ہر لحاظ سے دوستی کو مضبوط کرنے کے موقع پر ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارنے کا عمل۔

ہاتھ پر ہاتھ مار کر بولے
دوستی اب تو ہوگئی پکی

۳۔ (کشتی) پہلوان کا اپنے حریف پہلوان کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر مقابلے پر آمادگی ظاہر کرنا۔ ("ہاتھ ملانا" اس سے الگ عمل ہے۔)

۴۔ (کشتی) دو دو یا زیادہ پہلوانوں کا جوڑیوں کی صورت میں مل کر لڑنے کے موقع پر اکھاڑے میں لڑنے والے پہلوان کا اکھاڑے کے باہر اپنے جوڑی دار پہلوان کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر اسے حریف سے مقابلہ کرنے کا بلاوا دینے کا عمل۔

۵۔ دوستوں، ساتھیوں کا کسی خوشی یا کامیابی کے موقع پر ہاتھ بلند کر کے ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر اظہار خوشی و مسرت کا عمل۔ ایسا بالعموم کھیلوں میں کیا جاتا ہے۔

یہ تمام امور دو یا دو سے زیادہ افراد کے عمل پر مبنی ہیں۔ اور بھی اسی طرح کے مواد و مواقع ہو سکتے ہیں۔

ایک ہی فرد کا اپنے ہاتھ پر ہاتھ مارنا بھی ایک عمل ہے کہتے ہیں کہ "تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے" اس عمل میں بھی فرد واحد اپنے ہاتھ پر ہاتھ مارتا ہے تو تالی بجتی ہے۔ لیکن یہاں ہاتھ سے مراد ہتھیلی ہے، کیونکہ "تالی" دراصل دونوں ہتھیلیوں کی باہمی زد سے اصول موسیقی کے مطابق کھنک دار آواز کا نام ہے۔ یہ کھنک ہتھیلیوں کے گڑھوں کے ذریعہ پیدا ہوتی ہے۔ "تالی" ہتھیلیوں کی ایک خاص زد، وقفہ اور تسلسل ہے آہنگ قائم کرنا موسیقی کی اصطلاح ہے اس میں مشق و مزاولت کا بھی دخل ہے۔ قوالی میں اور بعض ناچوں وغیرہ میں یہ تالی مروج ہے۔ شادی بیاہ کی رسوم میں ڈومنیوں، مراثیوں وغیرہ میں اسی کا رواج ہے، مخنث بھی اسی طرح تالی بجاتے ہیں۔

موسیقی کی محفل وغیرہ میں نائکہ، رقاصہ، گائکہ یا سازندوں کے بہک جانے کے موقع پر اپنے سیدھے ہاتھ کی چار انگلیوں کو بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر مار کر، سر تال درست کرنے کے لیے آس دیتی ہے تو اسے بھی تالی کہتے ہیں۔ یہ عمل بھی ہاتھ پر ہاتھ مار کر کیا جاتا ہے، مگر آہنگ و تسلسل کے ساتھ۔

بچے اور بڑے بھی کسی خوشی کے موقع پر یا کسی کو چڑانے، پریشان کرنے کے لیے تالیاں بجاتے ہیں۔ یہ عمل بھی ہاتھ پر

تھ مار کر کیا جاتا ہے۔ مگر اس میں تسلسل ہوتا ہے اور تسلسل کے ساتھ ایک طرح کا آہنگ بھی اس لیے یہ "ہاتھ پر ہاتھ مارنا" کے یل میں نہیں آتا۔

کبھی کبھی گانے کے دوران میں گویّے کے گانے سے محظوظ ہو کر اور گویّے کی حوصلہ افزائی کے لیے مجمع گانے سے ہم ہنگ تالیاں بجا کر اسے داد دیتا ہے۔

کہتے ہیں کہ کھیتوں اور باغوں میں رکھوالے بھی پرندوں کو اُڑانے کے لیے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہیں، لیکن مشاہدہ اس کے برعکس ہے کہ کھیتوں میں رکھوالے گوپھیے میں بھر بھری مٹی کا ڈلا رکھ کر گھماتے اور پرندوں کو اڑاتے ہیں۔ باغات میں پرانا لنستر، بانس کا جھوجھرا ڈنڈا یا صرف ڈنڈا کسی درخت کے گدّے میں اس طرح باندھتے ہیں کہ وہ ہلایا جائے تو دوسرے گدّے سے نکرا کر آواز پیدا ہو، جسے سن کر پرندے اڑ جائیں۔

پہلوان جب خم ٹھونکتا ہے تو وہ اپنے بائیں ہاتھ کے نیچے سے سیدھے ہاتھ کے بازو کو اور سیدھے ہاتھ کے نیچے سے بائیں ہاتھ کے بازو کو تھپتھپاتا ہے۔ اس کو بھی بعض نے وضاحت میں ہاتھ پر ہاتھ مارنا کہہ دیا حالانکہ یہاں ہاتھ سے مراد پنجہ اور بازو ہیں۔ کل بول کر جُز مراد لیا ہے، کیوں کہ مونڈھے سے پنجے تک ہاتھ ہی کہلاتا ہے اور اس کے ہر حصّے یعنی بازو، کہنی، کلائی، پنجہ، ہتیلی کو بھی ہاتھ کہا جاتا ہے۔ زیر بحث میں ہاتھ سے مراد صرف کلائی سے انگلیوں تک کا حصّہ یعنی پنجہ مراد ہے۔

مندرجہ بالا امور کا تعلق زیر بحث "ہاتھ پر ہاتھ مارنا" سے نہیں ہے۔ ایک فرد کے اپنے ہی ہاتھ پر ہاتھ مارنے کے مواقع و موارد یہ ہیں۔

۱۔ کسی کو روکنے، ٹھہرانے، متوجہ کرنے کے لیے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہیں تاکہ آواز پر وہ متوجہ ہو کر رک جائے۔
۲۔ گھروں میں مرغی، کتے بلی وغیرہ کو بھگانے کے لیے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہیں کہ وہ آواز سے ڈر کر بھاگ جائیں۔
۳۔ مکانوں کی منڈیروں، کیاریوں پودوں پر سے کوّوں، چڑیوں وغیرہ کو اڑانے کے لیے یہ عمل کیا جاتا ہے۔
۴۔ عام طور سے پرندہ ہاتھ پر ہاتھ مارنے کی آواز سے ڈر کر اڑ جاتا ہے۔

ہاتھ پر ہاتھ نہ مارو! ہو ہنسی سے بیدم
مرغ دل اپنا نہ اڑ جائے کہیں ڈر کے صنم

ہاتھ پر ہاتھ نہ مارو کہ صدا سن کے کہیں
روح عالم، نہ ہوا خوف سے ہو سوئے فلک

۵۔ انتہائی مسرت و انبساط کے اظہار کے لیے بھی ہاتھ پر ہاتھ مارا جاتا ہے۔
۶۔ کسی پُر حیرت و استعجاب امر کے واقع ہونے پر مسکراہٹ یا ہلکی ہنسی کے ساتھ ہاتھ پر ہاتھ مارنے کا عمل کیا جاتا ہے۔
۷۔ مد مقابل حریف کی تضحیک، استہزا یا اسے شرمندہ کرنے کے لیے پر زور قہقہہ لگاتے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہیں۔ عمل اس لیے بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ شدت قہقہہ سے جسم غیر متوازن ہو جاتا ہے۔ توازن قائم رکھنے کے لیے یہ عمل سہارے کا ا دیتا ہے۔ اس کیفیت کو غالب نے اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے:

ہاتھ پر گر ہاتھ مارے یار، وقتِ قہقہہ
افشانی کرے

قومی زبان (۲۰) جنوری ۱۹۹۴ء

غالب کا یہ شعر اگرچہ متداول دیوان غالب میں نہیں ہے، مگر بیاض غالب مطبوعہ نقوش لاہور، نسخۂ حمیدیہ اور نسخۂ شیرانی میں ہے۔ وقت انتخاب غالب نے اسے خارج کر دیا تھا۔ یہ شعر "وقت قہقہہ ہاتھ پر ہاتھ مارنا" کی سند مہیا کرتا ہے اور حالت و کیفیت کی نشاندہی کرتا ہے۔ ایک نادر تشبیہ کا بھی حامل ہے۔

شعر پر غور کیا جائے تو اس میں تین باتیں غور طلب ہیں (۱) محبوب کا قہقہہ لگانا (۲) وقت قہقہہ ہاتھ پر ہاتھ مارنا (۳) جگنو کی طرح مہ کا پروں کو پھڑ پھڑانا۔

۱۔ محبوب کے قہقہہ لگانے کی کیفیت میں مسرت و انبساط، حیرت و استعجاب، تضحیک و استہزا میں سے کوئی بھی سبب ہو سکتا ہے۔

۲۔ قہقہہ کی شدت میں ہاتھ پر ہاتھ مارا جاتا ہے، کیونکہ ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہونے کی حالت میں جسمانی توازن برقرار نہیں رہتا۔ اسے برقرار رکھنے کے لیے اور جسم کو سہارے کے لیے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہیں۔ خواہ یہ قہقہہ کھڑے ہونے کی یا بیٹھے ہونے کی حالت میں لگایا جائے۔

۳۔ جگنو کی طرح مہ کا پروں کو پھڑ پھڑانا یا پرواز کرنا۔ دراصل شعر میں اسی کی توجیہ کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر یہاں مہ سے چاند مراد لیں، تو یہ اس لیے مفید مطلب نہیں کہ چاند کبھی جگنو کی طرح نہ پروں کو پھڑ پھڑاتا ہے اور نہ پرواز کرتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ بادل کے رواں ٹکڑوں میں ایسا ہی لگتا ہے، تو چاند کی اس حالت کو دوام کہاں؟ اس حالت کے پیش نظر مصرع اولیٰ بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے اس کا اس مصرع ثانی سے کیا تعلق قائم کیا جائے گا؟

شعر کا یہی پہلو قابل غور ہے۔ مصرع میں "کرمک شب تاب، مہ پرافشانی پر غور کیا جائے تو کرمک شب تاب یعنی جگنو کی حیثیت واضح ہے کہ اس کی چمک کبھی ظاہر ہوتی ہے اور کبھی غائب ہو جاتی ہے۔ جگنو کی اس حالت سے چاند کو تشبیہ نہیں دی جا سکتی، کیونکہ چاند کی یہ حالت نہیں ہوتی۔ "پرافشانی" یعنی پروں کا پھڑ پھڑانا یا پرواز کرنا، جگنو کی حالت اور صفت تو ہو سکتی ہے، چاند کی نہیں۔

محبوب کے چہرہ اور خود محبوب کو چاند سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ مثلاً:

اس قمر نے جو پرافشاں کیے یکسر گیسو
ہو گئے دہر میں ہم طالع اختر گیسو

لب بام نکلا ہے چاند
رخ مہ جس آگے ہے ماند

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مشبہ بہ بیان کر کے مشبہ مراد لیتے ہیں۔ اسی طرح "مہ" کہہ کر چہرۂ محبوب مراد لیا ہے۔ اس مصرع میں جگنو مشبہ بہ ہے "آسا" حرف تشبیہ اور "مہ" مشبہ ہے۔ لیکن مہ پھر مشبہ بہ بن جاتا ہے یعنی یار مشبہ اور "مہ" مشبہ بہ ہے۔ اس شعر میں یہی عمل کارفرما ہے۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ محبوب مذکورہ اسباب میں سے کسی سبب کی بناء پر قہقہہ لگا رہا ہے۔ شدت قہقہہ کی وجہ سے لوٹ پوٹ ہونے کی حالت و کیفیت ہے۔ اس حالت میں اس کا توازن قائم نہیں رہتا۔ وہ جھکتا ہے تو اس کا چہرہ اوجھل ہو جاتا ہے۔ محبوب، ہاتھ پر ہاتھ مار کر جسم کو سہارتا ہے۔ تو اس کا چہرہ سامنے آ جاتا ہے۔ چہرہ محبوب کو بالمقابل ہونے اور نہ ہونے کی حالت و کیفیت کو وہ جگنو کو پھڑ پھڑانے یا پرواز سے تشبیہ دے رہا ہے، کہ جس طرح جگنو کی اس حالت میں چمک کبھی ظاہر ہوتی اور کبھی

ب ہوجاتی ہے۔ اسی طرح محبوب کا چہرہ جب وہ شدت قہقہہ میں ہاتھ پر ہاتھ مارتا ہے تو کبھی جھکنے کی وجہ سے چھپ جاتا ہے اور م سہارنے کے بعد سامنے آجاتا ہے ہاتھ پر ہاتھ مارنے کی کیفیت کو جگنو۔ کے پر پھڑپھڑانے سے تشبیہ دی ہے۔ یہ تشبیہ بالکل ر اور اچھوتی ہے۔

چیکوسلواکی ادب سے

سائفرٹ کی تین نظمیں

معین نظامی

چیکو سلواکیہ کا عظیم شاعر یروسلاو سائفرٹ [JAROSLAV SEIFERT] ۱۹۰۱ء میں پراگ میں پیدا ہوا۔ تعلیم ھوری چھوڑ کر وہ صحافت کے پیشے سے منسلک ہوگیا۔ شاعر کی حیثیت سے اُس کا فنی ارتقاء تیزی سے جاری رہا۔ ۱۹۴۹ء میں اُس نے حافت سے کنارہ کش ہو کر اپنے آپ کو محض ادب تک محدود کر لیا۔ ۱۹۲۱ء میں اُس کا پہلا شعری مجموعہ .... "آنسوؤں میں ایک ہر" .... شائع ہوا۔ اس کے بعد ہر دوسرے تیسرے سال باقاعدگی سے اس کا نیا مجموعۂ کلام شائع ہوتا رہا۔ بد قسمتی سے ایک رصے تک اُس کے اپنے ملک میں اُس کی تخلیقات کی اشاعت پر پابندی رہی۔ ۱۹۶۵ میں وہ شدید بیماری سے بمشکل جانبر وا۔ ۱۹۸۴ء میں اُسے ادب کے نوبل انعام سے نوازا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اُس کے بے مثال فکر و فن کے لیے مناسب ترین خراج سین تھا۔ دو سال بعد ۱۹۸۶ء میں اُس نے وفات پائی۔

سائفرٹ نے نظم و نثر کی بیس سے زائد کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ اُس کے اہم شعری مجموعے یہ ہیں:

آنسوؤں میں ایک شہر [۱۹۲۱ء]، صرف اور صرف عشق [۱۹۲۳ء]، ہنی مون کا سفر [۱۹۲۵ء]، ایک بلبل جسے گانا نہیں آتا [۱۹۲ء]، قاصد کبوتر [۱۹۲۹ء]، زیرِ طبع گیت [۱۹۳۲ء]، خدا حافظ بہار! [۱۹۳۷ء]، ہاتھ اور شعلے [۱۹۴۸ء]، میری ماں [۱۹۵۴ء]، جوان اور ستارہ [۱۹۵۶ء]، پراگ [۱۹۵۶ء]، اور جزیرے میں کنسرٹ [۱۹۶۵ء]۔

اُس کی اکثر و بیشتر نظمیں دُنیا کی کئی زندہ زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔

سائفرٹ ایک قادر الکلام اور پُر گو شاعر تھا۔ اُس نے اپنی خدا داد تخلیقی صلاحیتوں سے خوب خوب کام لیا۔ اس کا کلام مقدار ں بھی اچھا خاصا ہے اور معیار کے لحاظ سے بھی غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ انسان دوستی، آزادیِ رائے، صلح جوئی، امن ری اور فطری اقدار سے گہری وابستگی اُس کی شاعری کے نمایاں ترین عناصرِ ترکیبی ہیں۔

سوز و سازِ عشق اور تب و تابِ اخلاص اس کا مدارِ فکر ہے۔ ۱۹۶۵ء کی اذیت ناک بیماری سے معجزانہ طور پر شفایاب ہونے کے ، احساسِ مرگ اُس کی شاعری کے رگ و ریشے میں سرایت کر گیا، اس کا اظہار جا بجا مختلف انداز میں ملتا ہے۔ کمال کی بات یہ ، کہ اس احساسِ مرگ نے اُس کے فن کو منفی طور پر متاثر نہیں کیا، بلکہ اُس کی صوفیانہ دروں نگری اور معنویت آشنائی کو مزید جلا ۔

کہیں کہیں حیات و کائنات کی لاحاصلی اور انسانی امکانات کی تہی دامنی کے رنگ بھی سائنفرٹ کی نظموں میں دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر اس کے افکار عجیب طرح کی عرفانی آفاقیت سے سرشار ہوتے ہیں اس کی زبان صاف، رواں اور لب و لہجہ سادہ، مخلصانہ اور توانا ہے ...... بالکل فیض احمد فیض کی طرح!

سائنفرٹ کی تین معروف نظموں کا اردو ترجمہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے:

کھڑکی کے پاس!

جب بہار آئی
اور دھوپ میں باغیچے کے درختوں پہ کونپلیں پھوٹیں
تو میری ماں کسی مجسمے کی طرح بے حس و حرکت
کھڑکی کی طرف منہ کر کے رو رہی تھی
کیوں رو رہی ہو؟ تمھیں کس نے دکھ دیا ہے؟
تمھیں کیا چاہیے؟
کسی دن تمھیں بتادوں گی
بتادوں گی
جب درختوں پہ کونپلیں نہ ہوں!
شدید برفباری ہوئی
شیشوں پر برف کی تہیں جم گئیں
کھڑکی کے پاس، جہاں کچھ روشنی تھی
میری ماں، چپ چاپ بیٹھی، اُون سے کچھ بنا رہی تھی
اور اُس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے
کیوں رو رہی ہو؟ تمھیں کیا چاہیے؟
کسی دن تمھیں بتادوں گی
بتادوں گی
جب برفباری نہ ہو!

خدا حافظ

مَیں نے اِس دُنیا کے لاکھوں شعروں میں
صرف چند شعروں کا اضافہ کیا ہے

اور مَیں جانتا ہوں کہ میرے اشعار باغیچوں کے حشرات سے زیادہ حکمت آمیز نہیں ہیں میں معذرت خواہ ہوں!

مَیں اپنی باتیں ختم کرتا ہوں
میرے اشعار، چاند کی دُھند پر پڑنے والے پہلے قدم نہیں تھے
اگر کسی دن یہ چمکے بھی
تو یہ روشنی ان کی اپنی نہیں تھی
مَیں تو اُس زبان کا عاشق ہوں
جو خاموش ہونٹوں کو لرزا دیتی ہے
جو بڑی آسانی سے، چاہنے والوں کو
شفق میں ٹھہر جانے پر مجبور کر سکتی ہے
کیونکہ وہاں غروب، استوا کے مقابلے میں زیادہ طویل ہے
شاعری شروع ہی سے ہمارے ساتھ رہی ہے
عشق کی طرح
بھوک کی طرح
طاعون کی طرح
جنگ کی طرح
کبھی کبھی تو میرے اشعار ندامت کی حد تک سادہ واقع ہوئے ہیں
لیکن مَیں معذرت خواہ نہیں ہوں!
کیونکہ مجھے یقین ہے کہ
خوبصورت لفظوں کی جستجو
قتل و غارت سے بہتر ہے!

شاعری کیا ہے؟

جب کوئی مجھ سے پوچھتا ہے کہ شاعری کیا ہے؟
تو اس کا جواب اچھی طرح جانتے ہوئے بھی
مجھے کچھ دیر تو بالکل کچھ نہیں سوجھتا
میں پرانے شعراء کا کلام اکثر پڑھتا رہتا ہوں
ان کے اشعار میری راہیں روشن کرتے ہیں
جیسے اندھیرے میں کوئی شعلہ!

اور مَیں جانتا ہوں کہ میرے اشعار باغیچوں کے حشرات سے زیادہ حکمت آمیز نہیں ہیں میں معذرت خواہ ہوں!

مَیں اپنی باتیں ختم کرتا ہوں
میرے اشعار، چاند کی دُھند پر پڑنے والے پہلے قدم نہیں تھے
اگر کسی دن یہ چمکے بھی
تو یہ روشنی ان کی اپنی نہیں تھی
مَیں تو اُس زبان کا عاشق ہوں
جو خاموش ہونٹوں کو لرزا دیتی ہے
جو بڑی آسانی سے، چاہنے والوں کو
شفق میں ٹھہر جانے پر مجبور کر سکتی ہے
کیونکہ وہاں غروب، استوا کے مقابلے میں زیادہ طویل ہے
شاعری شروع ہی سے ہمارے ساتھ رہی ہے
عشق کی طرح
بھوک کی طرح
طاعون کی طرح
جنگ کی طرح
کبھی کبھی تو میرے اشعار ندامت کی حد تک سادہ واقع ہوئے ہیں
لیکن مَیں معذرت خواہ نہیں ہوں!
کیونکہ مجھے یقین ہے کہ
خوبصورت لفظوں کی جستجو
قتل و غارت سے بہتر ہے!

شاعری کیا ہے؟

جب کوئی مجھ سے پوچھتا ہے کہ شاعری کیا ہے؟
تو اس کا جواب اچھی طرح جانتے ہوئے بھی
مجھے کچھ دیر تو بالکل کچھ نہیں سوجھتا
میں پرانے شعراء کا کلام اکثر پڑھتا رہتا ہوں
ان کے اشعار میری راہیں روشن کرتے ہیں
جیسے اندھیرے میں کوئی شعلہ!

لیکن زندگی کبھی نہیں ٹھہرتی
بلکہ کبھی کبھی تو ہمیں کھلونا بنالیتی ہے
اور بوجھل بوجھل قدموں سے چلتی ہے
میں کئی بار عشق کی تلاش میں اُٹھا ہوں
بصارت سے محروم اس شخص کی طرح
جس کے ہاتھوں اشتیاق
سیب کے درختوں کی شاخوں
اور پھلوں کی گولائیوں کو چھوتا ہے!
میں بہت بڑے بڑے شعروں سے واقف ہوں
ایسے شعروں سے جو کسی دوزخی کی چشمِ بد جیسے ہیں
جو جنّت کے دروازے اکھیڑ دیتی ہے
اگر میں یہ شعر
سرگوشیوں میں، مبہوت آنکھوں کو سناتا
تو فضول ہاتھ، خوف کے مارے
آغوشِ محبت کو درہم برہم کرنے کے لیے فوراً بلند ہوجاتے!
لیکن اگر کوئی میری بیوی سے پوچھے کہ عشق کیا ہے؟
تو میرا خیال ہے کہ
اس کا جواب گریہ ہوگا!

بیسویں صدی میں غزل کا احیاء اور حفیظ ہوشیار پوری

عظمیٰ فرمان

اگر یہ سوال کیا جائے کہ اردو شاعری کی سب سے توانا صنفِ سخن کون سی ہے تو اس کا صرف ایک جواب ممکن ہوگا یعنی "غزل" گو کہ اردو نظم بھی کم رتبہ نہیں ہے۔ نظیر، میر انیس اور اقبالؔ سے لے کر جوش اور فیض تک اردو نظم نہایت بلند سطح پر سفر کرتی ہوئی نظر آتی ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں ہے کہ آج بھی نظم سے زیادہ غزل ہمارے مزاج کا حصّہ ہے۔ اقبال اور فیض کی جو نظمیں ہم ذہن میں بار بار دہرا کر محظوظ ہوتے ہیں غور کیجیے تو وہ نظمیں "غزل" کے مزاج کے بے حد قریب نظر آئیں گی۔ غزل کی اس کامیابی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ غزل بڑے سے بڑے فکر انگیز اور فلسفیانہ موضوع کو نہ صرف یہ کہ اس کی جامعیت کے ساتھ بیان کر سکتی ہے بلکہ اس خاص موضوع کو ہمارے احساسات کی سطح پہ لے آتی ہے۔ چنانچہ دل اور ذہن کو بیک وقت متاثر کرنے کی جو صلاحیت غزل میں ہے کسی اور صنف میں نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو غزل، اردو شاعری کی ابتداء سے آج تک اپنے جملہ امکانات اور آداب سمیت زندہ ہے اور ایک فاتح کی سی حیثیت سے ہمارے اصنافِ سخن میں ممتاز ہے۔

فاتح کا لفظ قصداً یوں استعمال کیا گیا کہ جتنی شدّت سے غزل کی مخالفت کی گئی اردو شاعری کی تاریخ میں شاید ہی کسی اور صنف کی ایسی مخالفت کی گئی ہو۔ انجمن پنجاب کے قیام سے لے کر قیام پاکستان تک تقریباً اسّی (۸۰) سال کا عرصہ ہے اور اس عرصے میں شعری منظر نامے پہ نظم ہی چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ خصوصاً پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے درمیانی عرصے میں غزل کی مخالفت کا رجحان اس قدر شدید ہوگیا کہ عظمت اللہ خاں نے غزل کی گردن بے تکلف اور بے تکان مار دینے کا مشورہ دے دیا۔ اسی طرح جوش صاحب نے اسے غیر فطری صنف سخن قرار دے کر کہا کہ یہ ایک ایسی محفل کی طرح ہے جس میں لوگ ایک دوسرے سے پیٹھ لگائے بیٹھے ہیں اور کلیم الدّین احمد نے اسے نیم وحشی صنفِ سخن قرار دے دیا۔

غزل کی اس طوفانی اور بلند بانگ مخالفت سے قطع نظر مغربی ادب کے زیر اثر اردو شاعری میں جب نئے تجربات کا رجحان سامنے آیا تو اردو غزل پس منظر میں چلی گئی۔ اس عرصے میں غزل کی مخالفت تو نہ کی گئی لیکن شعری فضا غزل کے لیے حوصلہ افز

بھی نہیں رہی اور عموماً شعراء اور شاعری کے قارئین میں نظم ہی مقبولیت پاتی رہی۔ غرض اس دور میں خواہ ترقی پسند تحریک ہو یا حلقۂ اربابِ ذوق یا کوئی اور حلقہ ہر ایک کی توجہ نظم پر ہی مرکوز نظر آتی ہے۔

اس حوصلہ شکن ماحول میں بھی ہم کو یگانہ، فراق، شاد، حسرت، فانی، اصغر اور جگر جیسے نام غزل سے وابستہ نظر آتے ہیں۔ انھوں نے غزل کی روایات کو پوری طرح سمجھ کر اس صنف کو برتا اور اسے زندہ رکھا حتیٰ کہ ۱۹۴۷ء کے بعد غزل نے ایک نئی زندگی پائی اور اس کا احیاء اس مرتبہ کچھ اس طرح ہوا کہ اس کے قدم ہماری بساطِ شاعری پر ایک مدّت کے لیے جم گئے۔

۱۹۴۷ء کی سیاسی اور معاشرتی کشمکش اور لرزہ انگیز خوں ریزی نے انسانی دلوں کو ہلا کر دکھ دیا۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات کے زیرِ اثر جو ادب تخلیق ہوا وہ اپنی بے انتہا سنجیدگی اور سنگینی اور بے پناہ گہرے دکھ کی وجہ سے آج بھی علاحدہ شناخت کیا جاسکتا ہے۔ بہتا ہوا خون، لٹی ہوئی بستیاں، سیاسی، معاشرتی اور معاشی تفکرات، ٹوٹے ہوئے آدرش، بے گھری کا احساس، تنہائی، اجنبیت اور یادیں، یہ سب اس دور کے ادب کے موضوعات ہیں اور ان سب کو یعنی اس عہد کے سارے دکھوں، پریشانیوں اور تغیرات زندگی کو اگر کوئی صنفِ سخن اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے تو وہ غزل ہے۔

یوں ۴۷ء کے بعد غزل کا احیاء ہوتا ہے اور یہ صنف اپنی تمام تر بہترین روایات کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہے لیکن روایات سے وابستہ ہونے کے باوجود سو فی صد جدید غزل ہے جو قدیم غزل سے اتنی ہی مختلف ہے جتنا اسے ہونا چاہیے۔ جیسا کہ انجم اعظمی صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ،

شعرِ جدید سے مراد محض آزاد یا معرّیٰ نظم نہیں
بلکہ ہر وہ غزل، پابند، آزاد یا معرّیٰ نظم ہے
جس کی تخلیق میں اس دور کے کرب کا ہاتھ ہو

اس دور کی غزل میں اپنے عہد کا کرب پوری طرح سمایا ہوا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اساتذہ کے لہجے کا عکس بھی موجود ہے۔ اس ر میں حفیظ ہوشیار پوری، ناصر کاظمی، سلیم احمد، عزیز حامد مدنی اور فرید جاوید وغیرہ کے نام غزل سے وابستہ نظر آتے ہیں۔ ان یں چند ایک کے سوا، سب ہی غزل کے حوالے سے شناخت کیے جاتے ہیں۔ ان سب شعرا کی غزل میں ۱۹۴۷ کے واقعات کا س بہت واضح نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پہ چند شعر دیکھیے:

نہ آنکھیں ہی برسیں، نہ تم ہی ملے
بہاروں میں اب کے عجب گل کھلے

(ناصر کاظمی)

شہر در شہر گھر جلائے گئے
یوں بھی جشنِ طرب منائے گئے

(ناصر کاظمی)

انہیں صدیوں نہ بھولے گا زمانہ
یہاں جو حادثے کل ہوگئے ہیں

(ناصر کاظمی)

کیسا اس نفرت کے سناٹے میں گھبراتا ہے دل
اے محبّت کیا تیرے ہنگامہ آرا سو گئے؟

(سلیم احمد)

یہ شاخِ گل ہے، آئینِ نمو سے آپ واقف ہے
سمجھتی ہے کہ موسم کے ستم ہوتے ہی رہتے ہیں

(عزیز حامد مدنی)

روایاتِ وصل و فراق اب کہاں
نئی قربتیں ہیں نئے فاصلے

(حفیظ ہوشیار پوری)

غزل کے اس احیاء کے ساتھ بلکہ اس سے کچھ پہلے ہی دو نام غزل کے حوالے سے سامنے آتے ہیں اور یہ دونوں نام ہی بے حد اہم ہیں۔ ان میں پہلا فراق گورکھپوری کا اور اس کے بعد حفیظ ہوشیار پوری کا نام ہے

حفیظ ہوشیار پوری نے تقسیم ہند سے قبل ہی شعر گوئی کا آغاز کر دیا تھا۔ ان کے ہم عصر شعرا میں فیض، حفیظ جالندھری، ڈاکٹر تاثیر اور صوفی تبسم جیسے اہم نظم گو شعرا شامل ہیں لیکن حفیظ ہوشیار پوری نے ہر دور میں غزل سے وفا کا رشتہ استوار رکھا اور ساری زندگی غزل سے ہی وابستہ رہے۔ خود انھیں کے لفظوں میں:

کوئی بھی غم ہو، غمِ دل کہ غمِ دہر حفیظ
ہم بہرحال بہر رنگ غزل خواں ہوں گے

جیسا کہ اوپر کہا گیا کہ جدید شاعری میں اپنے دور کے کرب و عذاب کا ہاتھ بہرحال پنہاں ہوتا ہے۔ ہر بڑے غزل گو کی غزل اس قول پہ پوری اُتر سکتی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ میر اور غالب کی غزل آج کے کئی شعراء کے مقابلے میں جدید تر معلوم ہوتی ہے۔ اگر میر کے ہاں لٹی ہوئی دلّی کی تصویریں جگہ جگہ موجود ہیں تو غالب کے ہاں آزادی کی آخری شمع کے بجھ جانے کا دکھ گہرائی تک نظر آتا ہے۔ حسرت اور چکبست کی غزل میں سیاسی موضوعات سامنے آتے ہیں اور فیض احمد فیض کی غزل بھی ان کی نظم کی طرح ان کے نظریات کی عکاسی کر سکتی ہے۔ حفیظ ہوشیار پوری کی غزل میں بھی سیاسی و معاشرتی تغیرات اور زندگی کے مسائل کا عکس تواتر کے ساتھ موجود ہے۔ بقول حفیظ:

تصوّراتِ غمِ دل بدلتے جاتے ہیں
کہ زندگی کے مسائل بدلتے جاتے ہیں

۴۷ء کے فسادات کے پس منظر میں یہ شعر دیکھیے:

وہی بشر ہے، وہی اس کا خونِ ناحق ہے
یہ اور بات ہے قاتل بدلتے جاتے ہیں

کچھ اس طرح سے بہار آئی ہے کہ بجھنے لگے
ہوائے لالہ و گل سے چراغِ دیدہ و دل

یا

کئی چراغ جلائے امیدِ فردا نے
اجڑ کے بس نہ سکے پھر دلوں کے کاشانے

فسادات کے بعد جب ملک سنبھلنے کے بجائے مسلسل غیر یقینی صورت حال کا شکار نظر آتا ہے تو حفیظ مستقبل کے
ے میں سوچنے پر مجبور ہوجاتے ہیں اور ان کا دکھ مزید گہرا ہوجاتا ہے ۱۹۵۵ء کی یہ غزل حفیظ کے سیاسی و سماجی شعور کی بھرپور
ی کرتی ہے:

رواں دواں بھی رہے قافلے تو کیا ہو گا
یونہی بدلتے رہے راستے تو کیا ہو گا
تلاشِ راہبر و جستجوئے منزل میں
تمام عمر بھٹکتے رہے تو کیا ہو گا

چونکہ جدید غزل روایت سے بغاوت کے نتیجے میں سامنے نہیں آتی بلکہ بتدریج ارتقاء پاکر جدید صورت اختیار کرتی ہے اور اس کی
اد کلاسیکی روایت پر ہی قائم رہتی ہے اس لیے عشقیہ مضامین آج بھی غزل کا اہم جزو ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ عشق کے خمیر
ں شامل ہے۔ مشاہدہ حق کی گفتگو بھی غزل میں بادہ و ساغر کے استعاروں میں کی گئی اور سراج الدّولہ کی شہادت کے واقعے کو بھی
لاں، مجنوں اور ویرانے کے حوالے سے بیان کیا گیا۔ البتّہ یہ ضرور ہے کہ تصوّرِ عشق، خصوصاً عشقِ مجازی کا تصوّر وقت و حالات
ے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا نظر آتا ہے اور اس کے ساتھ محبوب کے تصوّر میں بھی تبدیلی آتی ہے چنانچہ آج کی غزل میں محبوب
ے حسن سے زیادہ اس کی رفاقت جلوہ گر نظر آتی ہے لیکن میر اور درد کے دور میں محبوب کی رفاقت تو دور کی بات ہے اس کی ایک
ک دیکھنا بھی اتنا ہی دشوار ہے جتنا محبوب حقیقی کا نظارہ کرنا اور شاید اسی لیے اس دور کے محبوب کا احترام بھی اسی قدر واجب
ہ کہ لکھنؤ پہنچ کر یہ احترام باقی نہیں رہتا کیونکہ اس دور کا محبوب پردے سے نکل کر شمع محفل بن گیا ہے۔ غالب کا محبوب، جو
غالب کی مسحور کن شخصیت کے سامنے صفر ہوجاتا ہے، سراپا ناز تو ہے لیکن زیادہ واجب الاحترام نہیں، حالی کی غزل خوانی کے
ں میں محبوب کا تصوّر رفتہ رفتہ شمع محفل کے تصوّر سے علاحدہ ہونے لگتا ہے اور آخر کار حسرت کے ہاں یہ تصوّر بنتِ عم کی
ت اختیار کر لیتا ہے۔ حفیظ ہوشیار پوری بھی اپنی غزل میں عشق و محبّت کے مضامین کو بنیادی اہمیت دے دیتے ہیں۔ ان کا
محبوب بھی ان کی ارد گرد کی زندگی سے مختلف نہیں۔ ان کے ہاں محبوب تک رسائی ناممکن نہیں ہے لیکن وضع داری اور پردہ
بھی بدستور قائم ہے:

تم آگئے تو جیسے ہر چیز اجنبی ہے
خود آج اپنے گھر میں مہمان ہو گئے ہم

زمانہ ہوگیا لیکن یہی محسوس ہوتا ہے
تمھیں پہلے پہل جس طرح دیکھا ہو ابھی ہم نے
ملے جب بھی نئے جلوے نظر آئے نگاہوں کو
دیارِ حسن میں دیکھا نہ تم سا اجنبی ہم نے

جب میدانِ عشق میں حفیظ کے قدم مزید آگے بڑھتے ہیں تو ان کا جذبہ اس قدر طاقتور ہوجاتا ہے اور اتنی وسعت اختیار کرلیتا ہے کہ ہر غم، غمِ عشق کا ایک جزو بن جاتا ہے:

غمِ زندگانی کے سب سلسلے
بالآخر غمِ عشق سے جا ملے

مضامین و موضوعات کے علاوہ حفیظ کے لہجے میں بھی جدیدیت اور کلاسیکیت کا خوبصورت امتزاج ہے۔ ان کے الفاظ اور علامت جدید ہیں لیکن لہجہ، کلاسیکی غزل کا لہجہ ہے جس میں تغزل بھی ہے اور سادگی بھی اور ساتھ ساتھ ایسا گداز اور اثر بھی جو پڑھنے والے کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا اسی لیے ڈاکٹر سید عبداللہ نے انھیں حسرت، جگر، فانی اور اصغر کی روایت سے وابستہ قرار دیا ہے۔ حفیظ کے اس مخصوص لہجے کی چند مثالیں دیکھیے:

رازِ سربستہ محبت کے زباں تک پہنچے
بات بڑھ کر یہ خدا جانے کہاں تک پہنچے
وفا کی داستان چھیڑی کبھی تم نے کبھی ہم نے
بطرزِ دلبری تم نے، بطرزِ عاشقی ہم نے

حفیظ ہوشیار پوری نے بزرگ شعرا کی زمین میں بھی شعر کہے ہیں۔ مثلاً داغ کے رنگ کے دو اشعار دیکھیے:

بے زبانی زباں نہ ہوجائے
رازِ الفت عیاں نہ ہوجائے
لطف آنے لگا جفاؤں میں
اب کہیں مہرباں نہ ہوجائے

پیشرو شعراء کے ساتھ وہ ہمعصر شعرا سے بھی متاثر ہونے کا کھلے دل سے اقرار کرتے ہیں اور اُن کے رنگ میں شعر کہتے ہیں۔ مثلاً فیض صاحب کی زمینِ خاص میں ان کا یہ شعر:

ضرور عشق سے بڑھ کر بھی کوئی غم ہوگا
کہ آج دل پہ گراں یادِ یار گزری ہے

یا ناصر کاظمی کے لب و لہجے میں حفیظ کے یہ اشعار:

جو مجھے یاد نہ آیا برسوں
یاد آیا تو عجب یاد آیا
رو چکے جب تو بڑی دیر کے بعد
ہمیں رونے کا سبب یاد آیا

ر فراق کی زمین میں حفیظ کے اس نوع کے شعر:

کسی کی یاد نے بھی گل کھلائے ہیں کیا کیا
ہجومِ غم میں بھی ہم مسکرائے ہیں کیا کیا

ندرجہ بالا چند مثالوں سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ حفیظ نے اپنے لب و لہجے میں جو کچھ کہا وہ تو اردو شاعری کے لیے ایک اثاثہ ہے ہی لیکن جب وہ دوسروں کی زمین میں شعر کہتے ہیں تو اس کا بھی پورا حق ادا کر دیتے ہیں۔

حفیظ ہوشیار پوری تاریخ گوئی میں بھی کمال رکھتے تھے۔ چند دوستوں کی وفات پہ انھوں نے مرثیے بھی کہے ہیں اور بہت امیاب مرثیے کہے ہیں لیکن ان کا اصل میدان غزل ہی ہے۔ غزل میں ان کی فنی و تخلیقی صلاحیتیں کھل کر سامنے آتی ہیں نتیجتاً تاریخی عتبار سے وہ انتہائی اہم موڑ پر ایک بہت اہم شاعر کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔

یوں بیسویں صدی میں غزل کے احیاء کے سلسلے میں ان کا نام بنیادی حیثیت کا حامل ہو جاتا ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے ہ حفیظ کی غزل کو وہ کریڈٹ دیا ہی نہیں گیا جس کی وہ مستحق ہے حالانکہ سچ تو یہ ہے کہ تخلیقی اور تاریخی، دونوں اعتبار سے حفیظ وشیار پوری کا نام جدید اردو شاعری، خصوصاً جدید اردو غزل کی تاریخ کا ناقابلِ فراموش نام ہے اس نام کی حیثیت اس سنگِ میل کی ی ہے جس کے سہارے کاروانِ غزل کو آگے قدم بڑھانا آسان ہو جائے گا۔

وزیر آغا۔ تخلیق اور ترجمے کا سفر

عباس رضوی

شاعری کے سلسلے میں اب تک جو مقتدر آراء سامنے آئی ہیں ان میں ایمرسن کی رائے بہت وقیع ہے کیونکہ وہ ایک مکمل
سے ہماری ملاقات کراتا ہے یہ شاعر بے جان اور گونگی اشیاء کو آنکھیں اور زبان عطا کرتا ہے اور یہی خلاقی اک شاعر کا صحیح
ب ہے جس کے بغیر شاعری محض لفظوں کا کھیل ہے کیونکہ خلاقی کے اس جوہر کی عدم موجودگی میں لفظ خود بھی گونگے اور
جان ہوتے ہیں ایمرسن کے اس قول کی روشنی میں جب ہم وزیر آغا کی شاعری کی سلطنت کی حدود میں داخل ہوتے ہیں تو ہمیں
س ہونے لگتا ہے کہ وہ واقعی لفظ کی قوت سے گونگی اور بے جان اشیا کو آنکھیں اور زبان عطا کرتے ہیں ان کی نظموں میں جو
ئی درو بست سے پاک ہیں پیکر سازی اور استعارے کی صدر نگی ہمیں ان دیکھی دنیاؤں میں لے جاتی ہے مگر ان تخلیقی قوت کا
پور مظاہرہ ان کی طویل نظموں میں نظر آتا ہے جو صرف بڑے کینوس ہی کی نہیں بلکہ ہر اعتبار بڑی نظمیں ہیں ان کی طویل
ں میں "آدھی صدی کے بعد" اور "اک کتھا انوکھی" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اک کتھا انوکھی کا ترجمہ انھوں نے خود انگریزی
بان میں A TALE SO STRANGE کے عنوان سے کیا ہے اور یہی ترجمہ ہمارا موضوع گفتگو ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم اس ترجمے سے لطف اندوز ہونے کے عمل کا آغاز کریں ہمیں کچھ بنیادی سوالوں کے جوابات تلاش کرنا
گے جو اس لیے بھی زیادہ ضروری ہے کہ وزیر آغا خود اک بلند پایہ نقاد ہیں اور چیزوں کے غیر جذباتی اور معروضی انداز میں
پسند کرتے ہیں اس لیے ہمیں دیکھنا ہوگا کہ یہ ترجمہ جس نظم کا ہے اس کا تخلیقی مرتبہ کیا ہے؟ اس ترجمے کی ضرورت اور
کی ادبی حیثیت کیا ہے؟ اور یہ بھی کہ یہ ترجمہ کن لوگوں کے لیے کیا گیا ہے؟

جن لوگوں کو وزیر آغا سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا وہ شاید اردو کے اک ایسے شاعر کو تصور میں بھی نہ لاسکیں جو اردو کے
شاعر کی ضد ہے وہ اپنے ملاقاتیوں کو نہ اپنی غزلیں سناتے ہیں نہ اپنی شاعری کی معنیاتی جہات پر گفتگو کرنا پسند کرتے ہیں
کے علاوہ انھیں خود کو عظیم شاعر، عظیم افسانہ نگار یا عظیم انشائیہ نگار لکھنے یا لکھوانے کی بھی آرزو نہیں ہے وہ یہ شکایت بھی
کرتے کہ فلاں مشاعرے میں فلاں شاعر سے پہلے یا فلاں شاعر کے بعد پڑھوایا گیا اور یہ کہ اس تاریخی زیادتی کا اب ازالہ ممکن ہی
ہے یا یہ کہ فلاں فلاں شعرا کو فلاں مشاعرے کا دعوت نامہ نہیں ملا، دراصل مشاعرہ ان کا مسئلہ ہی نہیں ہے کیونکہ سننے
نے والی نغمہ ریز اور ترنم خیز شاعری ان کی دلچسپی کا میدان ہی نہیں ہے اس کے برعکس وہ ان اشیا پر گفتگو کرتے اور ان مظاہر

میں دلچسپی رکھتے ہیں جن سے براہ راست تعلق نہیں ہے مگر زندگی سے گہرا اور موثر تعلق ہے جیسے کسی جرم فلکی کے نو دریافت شدہ ماہتاب یا BIG BANG THEORY وغیرہ۔ اور یہی نہیں بلکہ ان کی نظموں میں یہ اور ایسے مظاہر نظر بھی آتے ہیں وزیر آغا ان جدید سائنسی علوم پر حیرت انگیز طور پر اتنے UP TO DATE جتنا کوئی ماہر سائنسداں ہوسکتا ہے اور ظاہر ہے وا کسی دیوار کے سائے بیٹھنے والے شاعر نہیں ہیں اور نہ زلف ولب ورخسار و چشم سے شیفتگی ان کا منصب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری ایک مختلف النوع خام مال سے وجود پذیر ہوتی ہے اور نمو پاتی ہے اسی لیے وہ جس روپ میں ہمارے سامنے آتی ہے و بازار میں عام طور پر دستیاب مال سے یکسر مختلف ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کی شعری جمالیات بھی مختلف ہے بدیں وجہ اس شاعری کے پسند کرنے والے بھی کم مگر منتخب لوگ ہیں۔

وزیر آغا کم و بیش بیالیس برس سے ایک ہنگامہ خیز تخلیقی زندگی گذار رہے ہیں انھوں نے افسانے کے علاوہ سبھی میدانوں میں اپنے آپ کو منوایا ہے اور افسانہ غالباً اس لیے ان کی توجہ اپنی جانب مبذول نہ کرا سکا کہ وہ انشائیے پر ملتفت تھے جس کے وہ اولین خالقوں اور پرزور وکلاء میں سے ہیں اس تناظر میں ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اپنی متعدد طویل نظموں میں سے انھوں نے "اک کتھا انوکھی" ہی کو کیوں ترجمے کے لیے انتخاب کیا اور پھر ترجمہ بھی کسی اور سے نہیں کرایا بلکہ خود کیا۔ اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے ہم ان کی نظم "اک کتھا انوکھی" پہ نگاہ ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ تجربے کی نوعیت اور تخلیقی برتاؤ کے اعتبار سے یہ نظم بڑی بھرپور اور واقعی انوکھی ہے۔ یہ انسان کو اس کی قوتوں کی خبر دیتا ہے اور اسے اپنی دریافت پر اکساتی ہوئی یہاں تک لے آتی ہے۔

باہر آ
اور امرت رس سے بھرا ہوا
مہتاب کا کاسہ
سورج کے ہاتھوں سے لے کر پی
کہ تیری آنکھ سے پھر
کرنوں کا سونا
چشمہ بن کر پھوٹ بہے
اس میرے جگ کو
نئے جنم کی ملے بشارت
میرے مورکھ دل کو بھی آنند ملے
میری آنکھ کو کشتی کا بہروپ ملے
پال اڑا کر نورانی موجوں پر سفر کرے
بجھے ہوئے اس مرتے قلم کی
نوک پہ بھی اک
پربت ایسے شبنم ایسے
لفظ کا دیپ جلے
اک لفظ کا دیپ جلے"

اس اک لفظ کا دیپ جلانے کے لیے وزیر آغا نے گھنے جنگلوں میں ماقبل تاریخ زمانوں سے آج تک کا سفر طے کیا ہے یہ سفر دراصل ست جگ سے کل جگ تک کا سفر ہے جس کے دوران وہ طوفان نوح سے بھی گذرتے ہیں اور سفینۂ نوح کو کوہ جودی پر ظفیت یاب ہوتے دیکھتے ہیں کالی کا بھیانک روپ بھی ان کے سامنے آتا ہے مگر وہ دکھیاری ماں، درگا میا، کا دکھ اپنے دل میں محسوس کرتے ہیں جو اپنے جگر پارے کو آوازیں دیتی پھرتی ہے ان کے اندر کا دلنواز انسان منتقم مزاج کالی کو ذرا قصور وار نہیں ٹھیراتا اسی سفر میں پنڈورا کا صندوق بھی کھلتا ہے اور ان گنت بلائیں نکل کر دنیا بھر میں پھیل جاتی ہیں اور یوں یہ سفر ایٹمی عہد کی ہر سامانیوں تک آن پہنچتا ہے جہاں وہ سونے والے کو جگا کر اسے مہتاب کے کاسے میں امرت رس سورج کے ہاتھوں سے لے کر پینے کی تلقین کرتے ہیں اور لفظ کا دیپ جل اُٹھتا ہے نظم کے اس آخری حصے میں جہاں آنکھ سفینۂ نوح کا استعارہ بن جاتی ہے وہ اپنے عہد کے لیے نئے جنم کی بشارت کے آرزو مند نظر آتے ہیں اور دلوں کے لیے سکون کی دعا مانگتے ہیں ان کا سائنسی اندازِ فکر جب کاسۂ مہتاب اور امرت رس کا حوالہ دیتا ہے تو سورج کے ہاتھوں سے لے کر پینے کو کہتا ہے اور اس میں جدید تر حسیّت کی لہر صاف نظر آتی ہے اس نظم میں انھوں نے بہت سے کائناتی مظاہر کو جس فنکاری سے مصوّر کیا ہے اس سے ان کی خلاّقانہ قدرت کا پتہ چلتا ہے اور اسی وجہ سے یہ نظم وزیر آغا ہی کی نہیں اردو کی اک بڑی نظم بن گئی ہے اس نظم کے اس انوکھے پن اور اتھاہ معنویت کی بناء پر انھوں نے ترجمے کے لیے اس کا انتخاب کیا ہے اور "آدھی صدی کے بعد" جیسی نظم پر ترجیح دی ہے۔

جہاں تک اس نظم کو خود ترجمہ کرنے کا سوال ہے اس سلسلے میں ان کا روّیہ اس ماں کا سا محسوس ہوتا ہے جو ممتا کے سرور میں سرتاپا بھیگی ہوئی ہے۔ ایک بار وہ اپنے بچے کو جنم دے کر تخلیقی سرشاری سے گزری ہے اور اب وہ اسے نت نئے ملبوسات پہنا پہنا کر دیکھنا اور نہال ہوجانا چاہتی ہے بچے کو نت نئے لباسوں میں ملبوس کر کے اس کے روپ کو آنکھوں میں اُتار لینے کا عمل بجائے خود شاعری ہے اسی لیے وزیر آغا نے اس دوہری لذت یابی کی جانب قدم بڑھایا ہے اور نظم کو REINCARNATE کیا ہے حالانکہ ایک بڑے ادیب اور مستند نقاد ہونے کے ناتے وہ ان ذمہ داریوں سے بخوبی آگاہ ہیں جو ایک تخلیق کار پر عائد ہوتی ہیں۔ یہ ذمہ داری اس قدر گراں بار ہے کہ ورجل جیسا شاعر اور کافکا جیسا کہانی کار اس ذمہ داری سے خوف زدہ ہے اور دونوں ہی اپنی ساری تخلیقات کو نذر آتش کر کے آنیوالی صدیوں میں عائد ہونے والی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں مگر وزیر آغا دوسری ذمہ داری اٹھا لینے کا حوصلہ رکھتے ہیں انھیں اپنی ژرف نگاہی پر پورا اعتماد ہے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ مترجم کی اپنی کچھ حدود متعین ہیں جن سے تجاوز کرنے کی صورت میں وہ مختلف الزامات سے نہیں بچ سکتا۔ لیکن اگر تخلیق کار ہی مترجم ہو تو بہت سے الزامات سرے سے عائد ہی نہیں ہوتے۔ کیونکہ اپنی ترجمانی کا حق ہر شخص کو سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ یہاں مجھے پابلو نردا یاد آتا ہے جو مترجم کا موازنہ مانجھی سے کرتا ہے جو اپنی کشتی کو دھارے کے ساتھ ساتھ کھیتا ہے اور اپنی کشتی میں مختلف سامان اس کنارے سے اس کنارے تک پہنچاتا ہے اس سلسلے میں وزیر آغا زیادہ قابل داد ہیں کہ ان کی کشتی میں ترجمے ہی کا نہیں تخلیق کا مال بھی ہے اور پھر ان کا سفر بھی بہاؤ کی مخالف سمت میں ہے۔ اس مال کو اپنے قاری تک پہنچانے کے لیے جتنی صعوبت جھیلنے کو وہ تیار ہیں کوئی دوسرا مترجم ہر گز نہ ہوگا کیونکہ انھیں متن ہی نہیں حسیّت بھی دوسرے کنارے تک پہنچانی ہے۔ کافکا کا مترجم جے۔ اے۔ انڈر ووڈ ترجمے کی سچائی کے سلسلے میں رقم طراز ہے۔

"This is of course the ideal and as such, only to be approached, never acheived. A traranslator's rule of thumb might be to seek to carry as much of the original across to the reader of the target language

as is compatiable with an eqivalant level of readability.Try to carry too much and the vessal founder: Jettison too much and you are cheating the consignee."

آگے چل کر وہ مزید اضافہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"One is continually trimming for a balance between content and equivalence, between the demands of fidelity and the requirements of readability."

اب سوال یہ ہے کہ آخر ترجمے کی ضرورت کیا تھی؟ اس سلسلے میں ہمیں وزیر آغا کی شاعری کے عمومی رویے کا جائزہ لینا ہوگا۔ جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے وزیر آغا روایتی شاعر کی ضد کے طور پر نمایاں ہیں اور ہم سبھی جانتے ہیں کہ اردو شاعری کے قارئین اور سامعین نظم کے مقابلے میں غزل کے لیے اپنے دلوں میں نرم گوشہ رکھتے ہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ نرم گوشہ کی ترکیب اُس شیفتگی کو ظاہر کرنے کے لیے کافی نہیں ہے جو برصغیر میں غزل اور غزل گو شعراء کے لیے پائی جاتی ہے نظم میں چونکہ ذات کا ہی نہیں شاعر کی انفرادیت کا بھی اظہار ہوتا ہے اس لیے اور اس لیے بھی کہ نظم کو سمجھنے اور اس کی مختلف سطحوں کا ادراک کرنے کے لیے ایک خاص علمی سطح اور ذہنی استعداد کی ضرورت ہوتی ہے پاک و ہند میں نظم کے لیے کچھ زیادہ گرم جوشی نہیں پائی جاتی جیسا کہ ہم راشد اور میرا جی کے معاملے میں دیکھ سکتے ہیں قومی و ملی شاعری اور رومانی نظمیں البتہ استثنیٰ میں ہیں اس حوالے سے وزیر آغا کے سامنے والٹیر، لورکا، نرودا، ایلیٹ اور موجودہ دور میں فیض اور محمود درویش کی مثالیں موجود ہیں جن کے تراجم نے ان کی شاعری اور حلقہ ہائے قارئین کے نئے افق روشن کر دیے اور انھیں مختلف زبانوں میں سراہا گیا۔ اس صورت حال میں وزیر آغا کا اپنی ایک دلربا تخلیق کا ترجمہ کر کے دنیا کے ایک بڑے حصّے میں قارئین تک پہنچانے کی خواہش کرنا فطری ہے اور اس طرح وہ اپنی تخلیق ان لوگوں تک پہنچانا چاہتے ہیں جنھوں نے شیکسپیئر سے ایلیٹ اور ازرا پاؤنڈ کو پڑھا ہے۔

ترجمے کی زبان بھی بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے اور یہ کسی بھی ترجمے کی ناکامی یا کامیابی کا باعث بن سکتی ہے اس سلسلے میں بنیادی بات یہی ہے کہ ترجمہ اپنے عہد کی زبان میں ہونا چاہیے تاکہ زیادہ سے زیادہ پڑھنے والے اس تک رسائی حاصل کر سکیں اور اس سے لطف اندوز ہو سکیں۔ اس سلسلے میں ڈبلیو۔ ایف۔ جیکسن نائٹ۔ ورجل کی اینیڈ (AENEID) کے ترجمے کے ابتدائیے میں لکھتے ہیں۔

"To find the right kind of english for a prose translation of this stupendous poem is not easy. It is perhaps not so hard to see what is wanted, but how to provide it is a very differe nt matter.

Obviously it must be contemporary english, reasonably smooth and free from any serious jolts. To make the story of Aeneid dull, slow moving, hard to read or obscure, would probably be the unfairest thing of all both to the reader and to virgil himself.

But the English used must also be as impersonal as posible and not closely dated to the middle of twentieth century. The translator has too aviod,if he can, his own mannerism of writing and sometimes admit expressions more natural to other writers then to himself. He must also avoid the latest of the colloquial phrases and tricks of speech current only among specialized groups of people; it would not do to use technical terms only to be understood by, for example, priests or sailors or soldier. If possible everything should seen fairly natural to people accustomed to english of fifty years ago or fifty years hence; that any way, is the ideal .

اب ہم وزیر آغا کی نظم "اک کتھا انوکھی" اور اس کے ترجمے پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس نظم کا ترجمہ خود کر کے بعض ایسے فواید حاصل کیے ہیں جو کسی اور کے ترجمہ کرنے کی صورت میں حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔

مثال کے طور پر

"اب تو اٹھ جا
آخری جگ بھی بیت چکا
سورج میں کالک اگ آئی
چاند کا ہالہ ٹوٹ گیا
دیکھ کہ گھاس جلی جھلسی ہے
ندیوں میں جل سوکھ گیا
جس بھی سنہری بیج سے
یہ برہمانڈ اگا تھا
واپس شاید اسی کے اندر اتر گیا"

اب ان لائنوں کا ترجمہ ملاحظہ کیجیے۔

"------- Tis time you woke up, dear,
even the lost millenium
is now gone forever. On the round disc of
the sun
dark spots have sprung up,
The shining necklace of the moon.
has now shattered into
gewels of burning stars.
Look!

the grass is all burnt,
the streams all dry,
and the big universe
which once rose
from the golden seed with a bang,
has now vanished,
back into it again."

ان لائنوں سے واضح طور پر اندازہ ہوتا ہے کہ ترجمہ صاف، سادہ، عام فہم، اور عصری زبان میں ہوا ہے اور ان میں سے کسی کے لیے مخصوص یا علمی زبان جو ادبی زبان سے علاحدہ شناخت کی جاتی ہے۔ استعمال کرنے سے وزیر آغا نے گریز کیا ہے اور یہی بات اس ترجمے کو ادبی سطح پر قابل قبول بناتی ہے ساتھ ہی انھوں نے کچھ فائدہ خود ترجمہ کرنے کا بھی حاصل کیا ہے جب انھوں نے "چاند کا ہالہ ٹوٹ گیا" کا ترجمہ یوں کیا ہے۔

The shining necklace of the moon
has now shattered into
jewel s of burning stars.

ہر چند کہ مترجم کو اس طرح ترجمہ کرنے کا پورا حق حاصل ہے مگر ان لائینوں میں صرف ترجمے ہی کو وسعت نہیں ملی ہے بلکہ شاعری کا اضافہ بھی ہوا ہے جو ان لوگوں کے لیے ہے جو صرف اس ترجمے کو پڑھیں گے۔ اسی طرح "جس بھی سنہری بیج سے یہ برہمانڈا کا تھا" کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے۔

"And the big universe
which once rose
from the golden seed with a bang"

اس مرتبہ وزیر آغا نے صرف شاعری ہی کا نہیں بلکہ ایک واقعاتی اضافہ بھی کیا ہے جو BIG BANG THEORY کا مولہ ہے اور ترجمے میں حسن ہی نہیں دلیل کا بھی اضافہ کرتا ہے مگر یہی اضافہ وزیر آغا کے سوا کوئی مترجم کرتا تو وہ اپنی حدود سے تجاوز کرتا اور جواب دہی کی ذمہ داری سے نہ بچ سکتا۔ محولہ بالا لائینوں میں کچھ الفاظ جیسے "DEAR" اور "ROUND" محل نظر ہیں مگر ترجمہ ان سے متاثر ہوتا نظر نہیں آتا۔
نظم ... لائنیں دیکھیے

بوڑھی بانجھ ملوں کے پنجر
کھمبوں کی صورت
دھرتی کے اندر سے جیسے اگ آئے ہیں"

اب ترجمہ ملاحظہ کیجیے

"The skeletons of
old haggard sterile Mills
have sprung up
like mushrooms from soil"

اس ترجمے کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اصل اردو نظم کی تخلیق کے وقت وزیر آغا کے ذہن میں بانس کا پودا تھا جو
تنہائی تیز رفتاری سے بڑھتا ہے (اسی بنا پر ترکی میں شہنشائیت کے زمانے مجرموں کو سزا دینے کے لیے رات کے وقت بانس کی
نئی ایسی تیز نیلی کونپل اس طرح لٹا کر باندھ دیا جاتا تھا کہ کونپل عین دل کے مقام پر ہوتی تھی اور صبح تک وہ دل کو چیرتی ہوئی جسم
کے پار ہو جاتی تھی) مگر جب انہوں نے اس نظم کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا تو انہوں نے وہ مثال دی جس سے مغربی پڑھنے
والے بخوبی آشنا تھے یعنی مشروم - اور جس کا آناً فاناً بڑھنا ان کے روزمرّہ کے مشاہدے کا اک حصّہ ہے اور جس میں اذیت رسانی کا
پہلو موجود نہیں ہے۔

اسی طرح

"گیس کے گولے
ڈالر - ایڈز - پلاسٹک پھوڑے
ان میں بانٹ رہے ہیں۔"

کا ترجمہ وزیر آغا نے یوں کیا ہے

"Gas filled baloons,
and above all,
dollars (as aida)
and aids as dollars"

اس طرح انھوں نے ڈالر کا تذکرہ جو امدادی پروگرام میں تیسری دنیا کے پسماندہ ملکوں کو دیے جاتے ہیں مگر انھیں ہشت پا کی
صورت جکڑ لیتے ہیں اور DEBT SERVICING کے عذاب سے کبھی نہیں نکل پاتے ایک مختلف انداز میں وضاحتی سطور
کے ساتھ شامل کیا ہے اور ساتھ ہی ایڈز نامی بیماری کا حوالہ جو اصل نظم کا حصّہ تھا دیا ہے اس طرح ترجمے کو معنوی بھی وسعت ملی
ہے۔

اک اور مثال ملاحظہ فرمائیے۔

"چپ ہو جاؤ
پھٹ کر اس کا اندر جیسے چیخ اُٹھا ہے
رک جاؤ وہ چُر مُر ہو کر
منّت کر کے پوچھ رہا ہے
یہ سب کیسے ہوا ہے بھائی
میں جب سویا ....."

اب ان لائنوں کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے

"Stop! Stop!
Please be quiet!" he almost bursts
into a shriek. Then collapsing
into a leap
he begs me to tell him

how it all come to be
when he went to sleep
every thing was wide awake
floating on a calm and
tranquil sea

[illegible] سے وہ ... کے لیے ہیں ... کی ... اور ... سے ان کا رشتہ اتنا مضبوط [illegible] ... اصل نظم ... ہی ہوتیں۔

[illegible]

"Out came iron
donning a crown of steel
on its head
declaring itself the master
(of this ever churning wheel)
of earth."

[illegible] "EVER-CHURNING WHEEL OF EARTH" [illegible] کا اضافہ ہی نہیں بلکہ نظم میں حسن کا [illegible] ... کا ترجمہ ملاحظہ کیجیے:

"And taken its first
foothold
on the electric stair
(or is it chair)"

[illegible] ... نے اصل نظم کے حسن کو ترجمے چھوڑ دیا ہے مثال کے طور [illegible]

When iron became the monarch
all humans turned into
robots. Bereft of name and face - - -
they all fused into
segments of black and yellow numbers and
pounced upon saplings of words
printing them selves on each
morpheme, nay, every phoneme."

اس ترجمے میں تخلیق جیسی لہریں محسوس ہوتی ہیں اور جس طرح کوئی بھی شاعر مسلسل ایک ہی معیار کی تخلیقات پیش نہیں کر سکتا ترجمہ بھی ایک مخصوص گراف کی حدود میں اوپر نیچے حرکت کرتا نظر آتا ہے اور کہیں کہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم کسی

۔۔۔ریزی نظم کا کوئی حصّہ پڑھ رہے ہوں۔

"The birds blazing like,
specks of words
floating higher and higher
towards heaven have finally perched
on the rim of the sun and the moon."

لیکن اس نظم کے آخری حصّے میں ترجمہ بھی ذہنی بلندیوں کو چھوتا [illegible] نظم اور اس کے ترجمے نے ایک ہی لہر میں کلائمیکس کو چھو لیا ہے

Let my heart be filled
with the nectar of bliss
my eye metamorphosed
into a vessel
with inflated sails
traversing the radiant waves of eternity on the point
of my extinguished pen.
Let a mountain Size dewdrop
of the waxen word
light up
(like a radiant morn
and a brawe new world be born.)

یوں آخری دو لائنیں اپنے حسن میں اس انتہا کو پہنچتی ہیں جہاں وہ پڑھنے والوں کو سحر میں مبتلا کر دیں اور خیال کی لہر شاعر سے قاری تک سفر کرتی ہوئی اک قوسِ قزح بن دے۔

"اک کتھا انوکھی" کا ترجمہ خود کر کے وزیر آغا نے ایک ایسے کام کا آغاز کر دیا ہے جو قابلِ ستائش بھی ہے اور قابلِ تقلید بھی چونکہ بار بار یہ بات محسوس کی گئی ہے کہ اردو شاعری اور افسانہ عالمی تناظر میں محض اس لیے نہیں دیکھا جا سکتا کہ اردو بین الاقوامی رابطے کی زبان نہیں ہے۔ اس لیے اس سمت میں کام کی ضرورت ہے۔ امید کی جانی چاہیے کہ آئندہ بھی اچھی شاعری اور اچھے نثر پاروں کا ترجمہ کیا جائے گا اور خوشبو کو ایک دائرے میں مقید نہیں رکھا جائے گا۔

چراغِ نیم شب

شفیق الدّین شارق

برِ صغیر پاک و ہند کے آزاد ہونے کے بعد جب نیا دور شروع ہوا تو اردو شاعری میں ایک جاندار اور توانا آواز گونجی۔

شاید کوئی بندۂ خدا آئے
صحرا میں اذان دے رہا ہوں

یہ آواز سلیم احمد کی تھی اور اُن کے پہلے مجموعہ کلام "بیاض" میں ریکارڈ ہے۔ پھر اُنھوں نے اپنے دوسرے مجموعہ کلام "اکائی" میں کہا:

نیا مضموں کتابِ زیست کا ہوں
نہایت غور سے سوچا گیا ہوں

پہلا مجموعہ کلام ۱۹۶۶ء میں اور دوسرا ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا۔ ان دو آوازوں میں سولہ سال کا فرق ہے۔ پہلی آواز میں پکار تھی دوسری میں فکر۔ ان کے امتزاج سے ایک تیسری روشن آواز اُبھری:

میری زبانِ آتشیں لو تھی مرے چراغ کی
میرا چراغ چُپ نہ تھا تیز ہوا کے شور میں

یہ نوائے آتشیں سلیم احمد کے تیسرے مجموعہ کلام میں ہے۔ ۱۹۸۵ء میں چھپا جبکہ سلیم احمد ۱۹۸۳ء میں انتقال کر گئے تھے۔ "چراغِ نیم شب" دو عقیدت سے سرشار نعتوں اور ۴۹ غزلیات کا مجموعہ ہے۔ یہ کلام سلیم احمد کی زندگی کے آخری دور کا ہے جو ایک سال سے بھی کم عرصہ پر مشتمل ہے۔

سلیم احمد ۱۹۲۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۲ء میں میدانِ شاعری میں قدم رکھا۔ خیر سے برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن۔ عہدِ طفلی اور لڑکپن کا دور وہ کبھی نہ بھولے۔ اس حوالے کو "چراغِ نیم شب" میں انھوں نے بار بار استعمال کیا اور اپنی عمر اور فکر دونوں کی پختگی کے دور میں بڑی معنی خیز باتوں کے ساتھ:

بچوں کی طرح سے خواب دیکھیں
اور صبح اُٹھیں تو بھول جائیں

بچوں کے لیے صحت [illegible] نہیں ہے
اس شہر میں مدت سے ہیں نایاب پرندے
سوتے نہیں مدت سے مرے شہر کے بچے
جیسے ہوں کسی خوف سے بے خواب پرندے
[illegible] اُنھیں سونے [illegible]

[illegible]
[illegible] خواب دیکھا تھا بچپن میں سلیم
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
کھلنے والے میرے کار بے مصرف پہ ہنستے ہیں
میں بچوں کے لیے گلیوں میں غبارے بناتا ہوں
جانے کیا کیا سوچتی رہتی ہیں اُس کی حیرتیں
[illegible] کو [illegible] کے نام
[illegible]
[illegible] مائیں

[illegible] سلیم احمد جیسا شاعر ماؤں کو کیسے بھول سکتا تھا۔ بچوں کے ساتھ ماؤں کا ذکر ناگزیر ہے۔ ہر چھوٹا بڑا اپنی ماں کا ممنونِ احسان ہے۔ مہر و محبت کے تمام انسانی جذبوں میں مامتا کا جذبہ سرِ فہرست ہے۔ یہ ہر عہد کا ایک لازوال جذبہ ہے۔ سلیم احمد کا احساس [illegible] ہے۔

وہ لوری گائیں گی اور ان میں بچوں کو سلائیں گی
میں ماؤں کے لیے پھولوں کے گہوارے بناتا ہوں
دلوں میں درد بھرتا آنکھ میں گوہر بناتا ہوں
جنھیں مائیں پہنتی ہیں میں وہ زیور بناتا ہوں
یہ دھرتی میری ماں ہے اس کی عزت مجھ کو پیاری
میں اس کے سر چھپانے کے لیے چادر بناتا ہوں

یہ ہیں دنیائے انسانیت کے رنگارنگ احوال جو سلیم احمد نے دیکھے۔ اِس ضمن میں ایک اور شعر ہے جو عین ممکن ہے کہ اُن کی نجی زندگی کا داخلی معاملہ ہو لیکن زندگی میں ایک بڑے رقبے کا احاطہ کرتا ہے۔

اُس ایک چہرے میں آباد تھے کئی چہرے
اُس ایک چہرے میں کس کس کو دیکھتا تھا میں

انسانی زندگی بچے اور ماں کے حوالے سے شروع ہوتی ہے اور پھیل کر دھرتی کے سب لوگوں کو ایک نوع یا جنس میں شامل کرتی ہے اور یوں روئے زمین کے طول و عرض کی ایک فضا اور اُس کے ماحول کی تشکیل کرتی ہے۔ یہ فضا اور یہ ماحول اپنا ایک مرکزی حوالہ رکھتے ہیں اور وہ ہے گھر آنگن۔ اس حوالے کو ایک استعارہ یا علامت سمجھا جائے تو بھی یہ انسانی زندگی کا ایک بنیادی اور اہم حوالہ ہے۔

ظاہر ہے سلیم احمد اس سے بے تعلق نہیں رہ سکتے تھے۔ جب وہ اس موضوع پر فکر کرتے ہیں تو اُن کی سوچ کوئی دھندلی یا تجریدی تصویر نہیں بناتی بلکہ انسانی معاشرہ اور اس کے متعلقات کے خطوط کو واضح اور روشن کرتی ہے۔ ان کا ایک رخ تو ہمارے سامنے آئی ہوئی، جامد اور ناقابلِ رشک زندگی کا سا ہے۔

خموشی کے ہیں آنگن اور سناٹے کی دیواریں
یہ کیسے لوگ ہیں جن کو گھروں سے ڈر نہیں لگتا
یہ کیسے لوگ ہیں صدیوں کی ویرانی میں رہتے ہیں
انھیں کمروں کی بوسیدہ چھتوں سے ڈر نہیں لگتا

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر وہ یہ کہنے پر مجبور ہوجاتے ہیں

رفتہ رفتہ اِن سے اُڑ جائے گی یکجائی کی بُو
آج جو گھر ہیں وہ سب دیوار و در ہوجائیں گے

دوسرا رُخ اِس تصویر کا یہ ہے:

چہک رہا تھا جو آنگن کے پیڑ پر سرِ شام
کہیں سے آیا ہوا موسمی پرندہ تھا

میرے مکاں کی چھت پہ تھے طائرِ شب ڈرے ڈرے
جیسے ہیامِ مرگ تھا تیز ہوا کے شور میں

شب کو یہ سلسلہ ہے برسوں سے
گھر کا گھر جاگتا ہے برسوں سے

یہ سوچا ہے کہ اب خانہ بدوشی کر کے دیکھوں گا
کوئی آفت ہی آتی ہے اگر میں گھر بناتا ہوں

افق افق گھر آنگن ہے

آنگن پار رسائی دے

گھر آنگن کے یہ دونوں رُخ دو قوتیں ہیں۔ تیسرے رُخ کی قوس اپنے دائرے کو یوں مکمل کرتی ہے۔

اِک بجھا دیا جیسے خود بخود سُلگ اُٹھے
اپنے گھر کی یاد آئی یوں دیارِ غربت میں
در بدر ٹھوکریں کھائیں تو یہ معلوم ہوا
گھر کسے کہتے ہیں کیا چیز ہے بے گھر ہونا

گھر کے حوالے سے دیگر شعراء نے بھی اچھے اچھے شعر کہے ہیں جو جزوی اور وقتی کیفیت کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں لیکن "چراغِ نیم شب" میں مندرجہ بالا اشعار سلیم احمد کے فکری سفر کے پورے عمل کا احاطہ کرتے ہیں اور الگ الگ ٹکڑوں کو ملا کر اُن کی ایک پوری اکائی بناتے ہیں۔ وہ وقتی اور جزوی بات بھی کہتے ہیں لیکن رہنے والی کسر کی تلاش میں وہ نامعلوم کی طرف چل پڑتے ہیں یہاں تک کہ وہ اُسے دریافت کر لیتے ہیں۔ وہ اپنی ذات میں ایک بے خوف اور دلیر آدمی ہے۔ ذوقِ جستجو انھیں بے باک رکھتا ہے۔

یہ ممکن ہے وہ ان کو موت کی سرحد پہ لے جائے
پرندوں کو مگر اپنے پروں سے ڈر نہیں لگتا

یوں لگتا ہے کہ سلیم اپنے اندر سے بھی فطری طور پر ایک نڈر انسان ہیں اور خطرات سے نبرد آزما رہنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

مجھے اِن آتے جاتے موسموں سے ڈر نہیں لگتا
نئے اور پُر اذیت منظروں سے ڈر نہیں لگتا

یہ "چراغِ نیم شب" کی پہلی غزل ہے۔ اس میں وہ کچے گھڑے پر سوار ہو کر تو اپنی سوچ کا دریا پار نہیں کرتے لیکن اس سے بھی ایک قدم آگے کاغذی کشتی پر اندھا بھروسہ کرتے ہیں اس حد تک کہ وہ طوفان میں بھی گہرے پانیوں سے نہیں ڈرتے۔ سمندر کی سرکش موجوں کا شور اور تیز ہواؤں کی چیخیں مل کر بھی انھیں اندھیری راتوں میں اکیلے ساحلوں سے خوف زدہ نہیں کر سکتے۔ وہ تو اپنے رفیقوں سے بھی اس بات کے متمنی ہیں کہ اُن کی آنکھیں بے باک اور سچے آئینوں سے کسی قسم کا کوئی خوف محسوس نہ کریں۔ جرأت اور ہمت کے ساتھ فطرت کے مہیب اور پُر جلال منظر میں موجود رہنے کی یہ مثال اوروں کے یہاں مشکل سے ملے گی۔ سلیم احمد سمندر اور ساحل کے چند اور مناظر کو یوں قلمبند کرتے ہیں۔

اِس ساحل سے اُس ساحل تک
کیا کہیے کتنی دوری ہے
مجھ کو ملاّحوں کے گیتوں سے محبت ہے مگر
رات ساحل پر ہوا کا شور بے اندازہ تھا
کل جنھیں رخصت کیا تھا وہ مسافر کیا ہوئے
کشتیاں ٹوٹی ہوئی لوٹ آئی ہیں ساحل کے پاس
کل کے اخباروں میں چھپ جائے گی یہ تازہ خبر

کشتیاں، ساحل کا منظر ڈوبنے والوں کے نام
یہ سمندر یہ سنہری کشتیاں
کاش ہوتا تو بھی اس منظر کے بیچ

سمندر قدرت کی صناعی کا ایک عظیم الشان مظہر ہے۔ کرۂ زمین پر بھی پھیلاؤ اور گہرائی اس کی خصوصیتیں ہیں۔ اگرچہ سلیم احمد نے مظاہرِ قدرت کو انسانی مطالعہ کے مقابلے میں اپنا موضوعِ سخن کم بنایا ہے لیکن چونکہ وہ ایک فطری شاعر ہے اس لیے ناممکن ہے کہ حسنِ فطرت اس کی توجہ کو اپنی طرف مبذول نہ کرے۔

یہ زمیں، یہ چاند، یہ سورج، یہ تارے دیکھنا
حسنِ نادیدہ کے سارے استعارے دیکھنا
افق پر جا ملیں گے آسماں سے
یہ کتنا فاصلہ ہوگا یہاں سے
مور اور بھنور دونوں محوِ رقص رہتے ہیں
یہ بھنور ہے جنگل کا وہ ہے مور دریا کا

سلیم احمد کے یہاں اجتماعِ ضدین بھرپور انداز میں پایا جاتا ہے۔ یہ دراصل اُن کے فکری سفر کا حصّہ ہے۔ وہ اپنی آزادیٔ فکر کو یہاں بھی استعمال کرتے ہیں۔ خیر اور شر کے بارے میں کہتے ہیں۔

خیر و شر کی خبروں کو مانتے تو سب ہی ہیں
کس کو ہوش رہتا ہے جبر اور ضرورت میں
خیر کا تجھ کو یقیں ہے اور اس کو شر کا ہے
دونوں حق پر ہیں کہ جھگڑا صرف پس منظر کا ہے
تو سکوں سے تھک گیا ہے اور بے تابی سے میں
شوق ہے تجھ کو سفر کا اور مجھ کو گھر کا ہے
وہاں دیوار اٹھادی مرے معماروں نے
گھر کے نقشے میں مقرر تھا جہاں در ہونا

نفرت اور محبت کے سلسلے میں اُن کی رائے یہ ہے:

دونوں درد دیتی ہیں آہ سرد دیتی ہیں
فرق کچھ نہیں ایسا نفرت و محبت میں

سلیم احمد کا مزاج کلاسیکی اور اندازِ فکر جدید ہے۔ اُن کا معاملہ شرابِ کہنہ در جامِ نو کے بالکل برعکس ہے۔ اُن کی شاعری میں جدت ہے لیکن جدیدیت کا کھوکھلا پن نہیں۔ آدمیت یا انسانیت کو وہ فطرت کے مطابق مکمل دیکھنا چاہتے ہیں۔ حیاتِ انسانی کے غیر فطری اسالیب سے وہ مرعوب نہیں ہوتے نہ جذباتی طور پر فکری طور پر۔ کلاسیکی مزاج عصری حسیت سے متصادم نہیں ہوتا بلکہ ہم آہنگ ہو کر ایک خوبصورت پیرایۂ اظہار کو وجود میں لاتا ہے۔ حقیقت میں ترقی پسندی کی صحیح علامت یہی ہے نہ کہ کسی مخصوص

گروہی نظریے کو اپنانا۔ ارتقائی عمل جب وہ مثبت سمت میں ہو تو وہ ترقی پسندی ہے خواہ اچھے جذبوں کے اظہار میں یا نئے اسالیب کی دریافت میں یا انسانی زندگی کی بہتری کی جستجو میں یا ذہنی بالیدگی کے حصول کی خاطر یا فن کو مزید جلا اور حُسن بخشنے کے لیے۔ یا زندگی کی مختلف سرگرمیوں سے بہتر نتائج حاصل کرنے کے لیے۔ سلیم احمد کی فکر کے مختلف پہلوؤں سے اتفاق یا اختلاف کا جواز تو ہوسکتا ہے لیکن اُن کی فکری تازگی اور اُن کے خیال کی شادابی اپنی جگہ برقرار ہے۔ جہاں وہ اپنے لیے دوسروں سے اختلاف رائے کا حق چاہتے ہیں وہاں وہ دوسروں کو بھی اپنی رائے سے اختلاف کرنے کا حق دیتے ہیں۔

یہ نئے نقشِ قدم میرے بھٹکنے سے بنے
لوگ جب اِن پر چلیں گے راستہ بن جائے گا

لیکن تنقید جب تنقیص بننے لگتی ہے تو وہ اپنے حریفوں سے یوں مخاطب ہوتے ہیں:

حریفانِ فسوں گر موقلم ہے میرے ہاتھوں میں
یہی میرا عصا ہے اس سے میں اژدر بناتا ہوں

یہ دوسری بات ہے کہ فرعون کے ساحر کلیم کے خدا کے قائل ہوجائیں اور سلیم احمد کے رقیب اپنی فسوں گری پر ہی اصرار کریں۔ یہاں سلیم کی چھیڑ تُند ہوجاتی ہے۔

تم تو دشمن بھی نہیں ہو کہ ضروری ہے سلیم
میرے دشمن کے لیے میرے برابر ہونا

بہرحال ان باتوں سے قطع نظر جو سلیم احمد کے اپنے بعض رویوں کا حصّہ تھی، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ معلوم سے نامعلوم کا سفر اپنے ساتھ نئی دریافتیں لاتا ہے اور اس سفر میں ساتھ دینے والے کم کم ہوتے ہیں۔

مرے پیچھے کہاں آئے ہو نامعلوم کی دُھن میں
تمھیں کیا اِن اندھیرے راستوں سے ڈر نہیں لگتا
اِس سے آگے کون جانے دشت نامعلوم میں
ہم نہ کہتے تھے کہ سارے ہمسفر منزل کے ہیں

چنانچہ شعروادب کی راہ میں صرف بھاری بھرکم الفاظ کی ہیرا پھیری اور ژولیدہ طرزِ تحریر سے جدت کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ فکروخیال کی شاداب تازگی، صحت مند سچے جذبوں کی خوشگوار لہریں، روشنی کی کرنیں داخلی اور خارجی جمالیات کا احساس، اچھوتا پن جو ذہن میں حیرتناک فضا پیدا کردے اور دل میں اترتے ہوئے لفظ جو مہکتی ہوئی لو دینے لگیں۔ جب یہ اجزاءِ شاعری میر، جمع ہوں تو اُن کے نئے پن سے نہ صرف ذہن چونکتا ہے بلکہ دل بھی متاثر ہوتا ہے۔ حقیقی جدت یہی ہے جو اپنی دلیل آپ ہے اور ہر قسم کی لایعنی مجبت اور بے مغز بحث سے بے نیاز ہے۔ "چراغِ نیم شب" کی شاعری اِن خصوصیات سے مالامال ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار اپنے موضوعات کے ساتھ:

سچ:

ہوتی ہے صداقت میں خاموشی کی گہرائی
صرف شور ہوتا ہے حرفِ بے صداقت میں

پتھر:

یہ میرے ہاتھ میں پتھر ہیں اور رات ہے سرد
میں کام لیتا ہوں ان سے شرر بنانے کا

آئینہ:

وہ ہر چہرے کے خدو خال کو پہچان لیتا ہے
مگر دیکھو تو آئینے کا خود کوئی نہیں چہرہ

شبنم:

گھاس میں جذب ہوئے ہوں گے زمیں کے آنسو
پاؤں رکھتا ہوں تو ہلکی سی نمی لگتی ہے

لمس:

اپنے لمس کو زندہ کر
ہاتھوں کی بینائی سے

زنجیر در:

سانپ میرے گھر کے دروازے سے لپٹا تھا مگر
جھٹپٹے میں شام کے دھوکا ہوا زنجیر کا

احساس:

وہ گرمیِ انفاس وہ جاڑے کی خنک رات
احساس میں شعلے سے لپکتے رہے تادیر

گریہ:

آنسو تو ہوئے خشک پہ گریہ رہا جاری
بچوں کی طرح روتے سسکتے رہے تادیر

جبر وقدر:

میں سمجھتا ہوں کے میرے پاؤں ہیں میرے نصیب
میں جدھر جاؤں وہی ہے فیصلہ تقدیر کا

جہدِ حیات:

چھایا ہوا تھا رنگِ غم دل پہ غبار کی طرح
میں نے اسی غبار سے ڈالی بہار کی طرح

موت وحیات:

زندگی موت کے پہلو میں بھلی لگتی ہے

گھاس اس قبر پہ کچھ اور ہری لگتی ہے

داخلی انتشار:

بلندی کی طلب ہے اور اندر انتشار اتنا
سو اپنے شہر کی سڑکوں پہ فوارے بناتا ہوں

امیگریشن:

کس دیس انھیں لے گئیں بے تاب اڑانیں
آنکھوں کے نشیمن سے گئے خواب پرندے

شاعری میں بعض اوقات کوئی بات استفہامیہ طور پر بھی کہی جاتی ہے جس سے زور بیان پیدا ہوتا ہے اور سننے یا پڑھنے والا چونکتا بھی ہے اور اگلی بات سننے کا مشتاق بھی ہو جاتا ہے۔

حیات سب کے لیے اک سوال لاتی ہے
تمام عمر اسی کا جواب لکھتے ہیں

یہ شعر تو خیر ایک وسیع تناظر میں کہا گیا ہے لیکن سلیم احمد اپنی غزل میں بہت سے سوال اٹھاتے ہیں۔ کچھ کے جواب تو وہ خود ہی دے دیتے ہیں جو "چراغِ نیم شب" میں موجود ہیں لیکن کچھ کے جوابات وہ اپنے قارئین کی صوابدید پر چھوڑ دیتے ہیں تاکہ وہ خود انھیں اپنے اندرون میں تلاش کریں اور ذوقِ جستجو سے لطف اندوز ہوں۔ ایسے سوالات کے سلسلے میں سلیم احمد نے جو انداز اختیار کیا ہے وہ یہ ہے۔

بارش سے چھتیں ٹپک رہی ہیں
چڑیاں کہاں گھونسلے بنائیں
کس پتے پر اُسے تلاش کروں
شخص اِک کھو گیا ہے برسوں سے
کس نے دل میں رکھ دیے یہ فاصلے
کس نے دیواریں اُٹھا دیں در کے بیچ
کس کے حرفِ آتشیں سے لوحِ امکاں جل اُٹھی
کس کے ہاتھوں نے دکھایا معجزہ تحریر کا
یہ کون ہے جو مرے گھر میں رنگ لے آیا
یہ کس کے عکس سے دیوار و در گلابی ہیں
چین نہیں ہے دل کو جب رات کٹے گی کس طرح
ہم لفسانِ نیم شب رات کٹے گی کس طرح
یہاں تو کوئی نہیں ہے، ہوا، نہ تو، نہ چراغ
یہ مجھ کو کس نے جگایا ہے آدھی رات کے بعد

سلیم احمد کی غزل یوں تو مختلف اور متنوع انسانی محسوسات اور تاثرات کی آئینہ دار ہے لیکن غزل کی ایک بنیادی خصوصیت جسے اصطلاحاً تغزل کہا جاتا ہے وہ بھوشکلاً نہیں بلکہ اپنے پورے خلوص اور سچائی کے ساتھ اُن کی غزل میں موجود ہے۔ ایک سچا شاعر محبت کے سچے جذبے کو نظر انداز کر ہی نہیں سکتا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ اُس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہ جذبہ اگر کسی شاعری میں جاری وساری نہ ہو تو وہ کلام منظوم تو ہو سکتا ہے لیکن شعریت سے عاری، محبت کا جذبہ ہی شاعر کی شخصیت اور شاعری کو یک جان بناتا ہے اگر شاعری کثیر الجہتی ہونے کے باوجود ایک مرکز سے مربوط نہ ہو تو ایسی شاعری فنکارانہ صناعی تو ہو سکتی ہے لیکن جوہری حُسن سے خالی۔ "چراغِ نیم شب" کا رنگِ تغزل دیکھیے:

بے خیالی میں لکیریں کھینچتا رہتا تھا میں
جانے کیسے بن گیا خاکہ تری تصویر کا

کیا لمس تھا اُس دستِ حنائی کا تہہِ آب
انگارے سے ہاتھوں میں دہکتے رہے تادیر

جب میں باتوں سے ٹوٹ جاتا ہوں
کوئی ہونٹوں سے جوڑتا ہے مجھے

میں کتنا تجھ کو چاہتا ہوں
یہ کہنا غیر ضروری ہے

ساری کڑیاں توڑ دیں میں نے محبت کے سوا
کون توڑے گا اسے یہ جبر تو اندر کا ہے

وہ ہاتھ ہاتھ میں آیا ہے آدھی رات کے بعد
دیا دیے سے جلایا ہے آدھی رات کے بعد

عمرِ مختصر اپنی صرف عشق میں گزری
کتنے کام کر لیتے دو گھڑی کی فرصت میں

یہ کس کا دستِ حنائی ہے میری آنکھوں پر
کہ میرے خوابوں کے سارے نگر گلابی ہیں

"چراغِ نیم شب" میں سلیم احمد نے اپنے تخلیقی عمل اور شعری رویے کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ اُن کے سعورکی پختگی فکرو خیال کی مضبوط ہمرشتگی اور ذہنی بلوغ کا ثبوت ہے۔ اور اس اعتماد کا اظہار بھی کہ وہ اپنے فن پر کتنی قدرت رکھتے ہیں اور اُس کی آبیاری کے لیے اپنا کتنا لہو صرف کرتے ہیں۔

ہم ایک حرف کو بھی رائیگاں نہیں لکھتے
بیادِ کم سخناں انتخاب لکھتے ہیں

اس میں کورکھ دوں گا میں جلتے ہوئے احساس کی
لفظ جو ہونٹوں سے نکلے گا دیا بن جائے گا

معانیٔ شبِ تاریک کھل رہے تھے سلیم
جہاں چراغ نہیں تھا وہاں اُجالا تھا
گرمیٔ رفتار سے وہ آگ ہے زیرِ قدم
میرے نقشِ پا چراغِ رہ گزر ہوجائیں گے

وہ زندگی کی ٹھوس حقیقتوں سے نازک خیالی اور نکتہ آفرینی کشید کرتے ہیں۔ یہی اُن کا تخلیقی جوہر ہے۔ وہ اپنے دیدۂ بینا اور گوشِ شنوا دونوں کے ذریعے سے مختلف رنگوں اور آوازوں سے اپنی حیرتیں تخلیق کر کے اپنی غزلوں کی صورت میں ہمارے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ "چراغِ نیم شب" میں سلیم احمد اپنے شعری اور تخلیقی سفر کے اختتام پر ارتقا کی جس منزل پر نظر آتے ہیں وہاں انھوں نے اپنی شناخت بھی تخلیق کرلی ہے۔ خود انھوں نے اپنی غزل کے بارے میں جس رائے کا اظہار کیا ہے وہ شاعرانہ تعلّی نہیں بلکہ اُن کی خود شناسی کا اعلان ہے۔

بھیجتی ہیں جو پیامِ روشنی تاروں کے نام
رات میں نے اک غزل لکھی ہے اُن آنکھوں کے نام
میری بھائے فن ہے یہ مجھ سے ہے کارِ زرگراں
رکھا گیا دُوکان میں مجھ کو عیار کی طرح
نقش تو بنائے ہیں کچھ غزل کی صورت میں
یہ کتابِ فردا ہے دیکھیے گا فرصت میں

اس آخری شعر کی زمین میں تو اُن کی روانیٔ طبع نے ایک غزل پر بس نہیں کیا بلکہ تین غزلیں کہلوائی ہیں۔ "چراغِ نیم شب" سلیم احمد کو ایک پورے شاعر کی حیثیت سے متعارف کراتا ہے۔ وہ جب سیپیوں کو دیکھتے ہیں انھیں خیال آتا ہے کہ سیپیاں تو پانی سے موتی بنا دیتی ہیں تو کیوں نہ وہ اپنے خون سے گوہر بنائیں۔ جب تیرہ شبی اُن کے خوابوں پر یلغار کرتی ہے تو وہ دل نہیں ہارتے بلکہ جوابی کارروائی کے طور پر کرنیں گوندھ کر چاند کا پیکر بنا لیتے ہیں۔ اگر انھیں کبھی ادھورے پن کا احساس ہوتا ہے تو انھیں اپنے خالق پر ٹوٹ کر پیار بھی آتا ہے کہ اُس نے کیسے سما سما کے غزل کی طرح سے انھیں لکھا ہے۔ وہ زندگی میں اپنی فطرت کی بے تابی اور اضطرابی کیفیت میں ایک شرر کی طرح سے رقصاں تھے اور اپنے زندہ ہونے کا ثبوت فراہم کرتے تھے۔ اُن کی شاعری ہی نہیں اُن کی نثر بھی اُنھیں اردو ادب میں بعد از مرگ زندہ رکھنے کے لیے بہت ہے۔ اُنھیں کا شعر ہے۔

اب اس کے سوگ میں کچھ اور کیا کہیں ہم لوگ
کہ مرنے والا تو ہم سے زیادہ زندہ تھا

اگر غزل اردو شاعری کی آبرو ہے تو "چراغِ نیم شب" جدید اردو غزل کی آبرو ہے۔ مناسب ہوگا اگر اب اس کتاب کے بارے میں معروف نقاد جمیل جالبی کی رائے نقل کر دی جائے۔ "ان غزلوں میں سلیم احمد نے اپنی شاعری کی اس منفرد آواز کو دریافت کرلیا ہے جس کے لیے ۱۹۴۲ء سے ۱۹۸۳ء تک انھوں نے طویل تخلیقی سفر طے کیا تھا۔ یہ آواز مختلف آوازوں، رنگوں اور لہجوں کے امتزاج سے وجود میں آئی ہے جس میں جدید حسیّت بھی اور روایت بھی طرح، جو کا لہجہ بھی ہے اور جدید سائنسی دور کا شعور بھی۔ اِن غزلوں میں ان کا لاشعور شعور بن کر روشن ہوجاتا ہے۔ یہی وہ آواز ہے جو سلیم احمد نے جدید اردو غزل کو دی ہے۔"

آخر میں "چراغِ نیم شب" کی ایک ایسی غزل کا ذکر بھی کر دیا جائے جو اپنی معنویت میں سلیم احمد کے تخلیقی سفر کا حاصل اور اُن کے فکری نشیب و فراز کو سمیٹنے والا حرفِ آخر ہے۔ اس غزل کو اس مجموعہ کلام کی ترتیب میں سب سے آخر میں آنا چاہیے تھا۔ غالباً انہیں احساس ہو گیا تھا کہ ایک سرگرم اور پر جوش ادبی زندگی گزارنے کے بعد اُس کا ماحصل ایک پیغام کی صورت میں محفوظ کر دیا جائے۔ یہ غزل پوری کی پوری سلیم احمد ہے۔ اپنی زندگی کے بالکل آخری دور کا سلیم احمد:

دل کے اندر درد آنکھوں میں نمی بن جائیے
اس طرح ملیئے کہ جزوِ زندگی بن جائیے

اک پتنگے نے یہ اپنے رقصِ آخر میں کہا
روشنی کے ساتھ رہیے روشنی بن جائیے

جس طرح دریا بجھا سکتے نہیں صحرا کی پیاس
اپنے اندر ایک ایسی تشنگی بن جائیے

دیوتا بننے کی حسرت میں معلق ہو گئے
اب ذرا نیچے اُتریے آدمی بن جائیے

جس طرح خالی انگوٹھی کو نگینہ چاہیے
عالمِ امکاں میں اک ایسی کمی بن جائیے

عقلِ کل بن کر تو دنیا کی حقیقت دیکھ لی
دل یہ کہتا ہے کہ اب دیوانگی بن جائیے

وسعتوں میں لوگ کھو دیتے ہیں خود اپنا شعور
اپنی حد میں آیئے اور آگہی بن جائیے

حسنِ معنی کیوں رہے حرف و صدا کی قید میں
ماورائے گوش و لب اک اَن کہی بن جائیے

عالمِ کثرت نہاں ہے اِس اکائی میں سلیم
خود میں خود کو جمع کیجیے اور کئی بن جائیے

نوہ تمثیل

سوتووا کُماچی

SOTWA KOMACHI

از

کان آمی کی یُت سُوگو

KAN AMI KI YOTSUGU

(۱۳۳۴-۸۴ء)

عبدالعزیز خالد

سٹوپا۔ سنگ تربت

یہ نوہ تمثیل اونونو کُماچی ...... قدیم جاپان کی ممتاز و طرحدار شاعرہ کے بارے میں ہے۔ جو اپنے جمالِ شخص و کمالِ شعر سے ایک ضربُ المثل کی حیثیت اختیار کر گئی تھی .... اس نے اپنے ایک بگڑے دل رئیس عاشق ...... شوشو...... سے ملاقات کی شرط یہ رکھی کہ وہ اپنے رتھ میں بیٹھ کر سو (۱۰۰) راتیں متواتر اس کے مکان کا طواف کرے۔ وہ بے چارہ اس صبر آزما امتحان کے پورا ہونے سے عین قبل چل بسا...... لیکن اس کا ناآسودہ سوزِ عشق اور شدید جوشِ رقابت سایہ بن کر کُماچی پر جب وہ ایک خستہ حال و کہنہ سال عجوزہ بن چکی تھی۔ متصرّف ہونے کے لیے لوٹ آیا۔ سب سے بڑا نوہ نگار اور نوہ کا ناقد زیامی موٹو کیو ZEAMI MOTOKIYC (۱۳۶۳ .. ۱۴۴۳ء) نوہ کھیل کی تین بلند ترین قسموں کا بیان کرتے ہُوئے یہ حوالے دیتا ہے:

۱۔ سِلّا میں آدھی رات کو روشن ہے آفتاب

۲۔ ہزار پربتوں پر برف کی جمی چادر
ہوئی نہیں ہے سفید اک اکیلی چوٹی کیوں؟

۳۔ ڈھیر اک برف کا چاندی کے پیالے میں لگا

ان سے نوہ کے تین لازمنگ اجزا

الف۔ اس کی آخرت پرستی

ب۔ اس کی گہرائی
ج۔ اور اس کا خاموشی
کی طرف اشارہ مقصود ہے

کردار

پہلا پجاری
دوسرا پجاری
تماچی .... خود اور اپنے دیرینہ عاشق کے روپ میں
کورس

مقام: مضافات میاکو
موسم: خزاں

دونوں پجاری:

اونچے نہیں پہاڑ چھپاتے ہیں جن پہ ہم
اونچے نہیں پہاڑ چھپاتے ہیں جن پہ ہم
اپنے دلوں کے سُونے عمق

پہلا پجاری:

کوہ کوہ کا
میں اک پجاری ہوں اور اتر کر پہاڑ سے
ہوں اب میں رہگزارِ میاکو پہ گامزن

دوسرا پجاری:

جو بُدھ کہ تھا کبھی کا وہ تو کوچ کر گیا
جو بُدھ کہ آنے والا ہے آیا نہیں ابھی
دنیائے آب و گل میں کیا ہم نے جب ظہور
ہم جاگے درمیان کی دنیا کے خواب میں
یہ اتفاق تھا کہ ہم انسان بن گئے
امکان اور ورنہ ہزاروں ہزار تھے
ہم پا گئے خزانۂ قانونِ پاک کو
ہر قسم کی نجات کا گویا جو بیج ہے
پھر سوچتے دلوں سے بدن اپنے رکھ دیے
کالی سیاہی ایسے لباسِ مہین میں

ہم بُدھ کے جاں نثار ہیں ہم کو بزور کشف
اس زندگی سے پہلے کے جنموں کا علم تھا
اس زندگی سے پہلے کے جنموں کا علم تھا
یہ بھی تھا علم ان کی محبت نہیں ہے قرض
ہم پر، جو اس جنم کا ہمارے سبب بنے
پہچانتے نہیں تھے کسی والدین کو
پروا ہماری بھی کسی اولاد نے نہ کی
ہم اک ہزار کوس چلے اور اس پہ بھی
ہم کو ہماری راہگزر مختصر لگی
طاری ہوئی تکان تو کھیتوں میں پڑ رہے
رات آ گئی اگر تو پہاڑوں پہ کاٹ دی
گھر بھی ہمارے اب ہیں وہی، آستاں بھی
قطعِ تعلقِ ارضی علائق سے کر چکے

تماچی:

آؤں گی ایک جڑ کٹے سرکنڈے کی طرح
الجھائے دامِ موج اگر تو بھی آؤں گی
میں آؤں گی میں جانتی ہوں، کس طرح مگر
ندی کوئی بلاتی ہے اس درد کو نہ لہر
کوئی مزاج پوچھتی ہے، کس قدر ہے قہر!

آیا ہے ذکر اس کا تو انکار کیا کروں
مدّت ہوئی کہ میں بھی سراپا غرور تھی
مجموعۂ نزاکت و تمکین و سرکشی
جو نو بہار ناز ہو مغرور کیوں نہ ہو؟
زرّیں طیور تھے مری زلف سیاہ میں
لہراتے بید کی تھی لچک میری چال میں
وہ سرخوشی کہ جیسے نسیم بہار ہو
آواز عندلیب کی، برگ گلاب شاخ
دور و دراز پھیلے حنا بستہ اوس سے
بے سانس کے زوال سے پہلے کے لمحے میں
میں ان سے بڑھ کے دلکش و صاحب جمال تھی
اب کیا ہوں میں حقیر تریں سے حقیر تر
موضوع عام و خاص ہیں رسوائیاں مری
میں ہوں رہینِ سال و مہِ ناخوش آمدید
سو سال کا خرابہ ہے میری پناہ گاہ
پہچان اہل شہر کو تاکہ نہ ہو مری
حیران ہو کے وہ نہ کہیں کیا یہ ہے وہی؟
مغرب کی سمت چاند کے ہمراہ وقت شام
میں قصر کے قریب سے ہو کر گزرتی ہوں
بُرجوں کے پاس سے نہ جہاں ٹوکیں پہرے دار
پیڑوں کے سایوں اور پہاڑوں کی کھوہ میں
کوئی جہاں نہ ہو کہ کرے جرح روک کر
مجھ سی تباہ زائرۂ خستہ حال سے
منزل ہو جس کی مقبرۂ یاد رفتگاں
دریائے کالسودہ، خزاں کی پہاڑیاں
کھیتا ہے چاندرات مگر کشتیوں کو کون؟
دکھتا نہیں ہے مجھ کو، پہ کھیتا ہے ان کو کون؟
تکلیف دہ یہ بات ہے، تکلیف دہ بہت
اس پیڑ کے تنے پہ کہ جو سوکھ کر ہے ٹھنٹھ
تک بیٹھ کر بحال کروں میں حواس کو!

پہلا پجاری: آؤ قدم بڑھاؤ ہو کھوٹی نہ اپنی راہ

سائے دراز ہوتے ہیں، وقت غروب ہے
دیکھو مگر وہ بیٹھی ہے بوڑھی فقیرنی
کچھ پاس اس کو پاک سٹوپے کا بھی نہیں
سمجھی ہے اس کو عام سی کوئی نشست گاہ
اس کو وہاں سے ہٹنے کا فی الفور ہم کہیں

دوسرا پجاری:

ہاں کیوں نہیں!

پہلا پجاری:

معاف کر اے پیرہ زن! مگر
تم کو نہیں ہے غالباً اس بات کی خبر
بیٹھی ہو جس پہ تم وہ سٹوپا ہے سر بسر
یعنی شبیہ پاک وہ اوتار بُدھ کی ہے
اٹھو شتاب بیٹھو کسی اور چیز پر!

کماچی:

بدھ کی شبیہ پاک! کہا تم نے کیا یہی؟
مجھ کو نہ حرف اس پہ دکھائی دیے نہ نقش
سمجھی تھی میں تو اس کو بس اک پیڑ کا تنا

پہلا پجاری:

تنہا پہاڑی سلسلوں پر چیری کے درخت[۵]
ہوں امتداد وقت سے ہر چند پختہ
لیکن دمِ شگفت نہ خود کو چھپا سکیں
(جوش نمو میں خود کو نہ روپوش رکھ سکیں)
بدھ کے بدن کا جس پہ نشاں ہو کھدا ہوا
وہ چوب خشک اس کی ہو مصداق تر نہ کیوں؟

---

۵ مینا موتو۔ نو۔ یوری ماسا MINAMOTO - NO YORIMASA (۸۰ ..... ۱۱۰۴ ..... ایک مشہور گینجی جرنیل) کے ان ابیات کی طرف اشارہ:

کنارہ کوہ و کمر میں درخت چیری کا
کھرا ہو جو کہ ملا دوسرے درختوں میں
دم شگفت کرے بے نقاب اپنے کو

تماچی:

میں بھی تو ایک پیڑ ہوں جو ہے گرا ہُوا
اس خستگی کی شان میں بھی میرے دل کے پھول
شاید کہ نذر بن سکیں بُدھ کے حضور میں
بدھ کا بدن مگر اسے تم کہہ رہے ہو کیوں؟

پہلا پجاری:

پیڑ ہے بدھ کے جسم کا مظہر کہیں اسے
کرتا ہے جب بھی عارضی صورت وہ اختیار
ہنگام پر ظہور جو ہوتا ہے بار بار

تماچی:

کیا کیا وہ دھارے صورتیں اس کا ہو جب ظہور؟

پہلا پجاری:

پانی، فضا، زمین، ہوا اور آگ کی

تماچی:

انساں کے جو عناصرِ خمسہ ہیں بس وہی؟
کیا امتیاز ان میں رہا؟ فرق کیا ہُوا؟

پہلا پجاری:

صورت اگرچہ ایک ہے طاقت ہے مختلف

تماچی:

طاقت ہے کیا سٹوپے کی؟

پہلا پجاری:

دیکھے جو ایک بار
اس کو ہمیشہ کے لیے محفوظ و مطمئن
وہ تین بد ترین بلاؤں سے ہو

تماچی:

اگر
ایسے کہیں تو کوئی خرابی ہے کیا، کہ ہو
اک ناگہاں خیال سے انوار کا ظہور؟

پہلا پجاری:

گر ہو چکا ہے نور یہ حاصل تمہیں تو پھر
دھوکے کا اک مقام ہے دنیائے رنگ و بُو
اس میں بھٹکتی پھرتی ہو کیوں؟ رُک رہی ہو کیوں؟
بُدھی کی آرزو ہے تو ترکِ جہاں کرو

تماچی:

ترکِ جہاں بدن کا نہیں ذہن کا ہے
میرا بدن اگرچہ ہے الجھا ہُوا ابھی
دل کر چکا ہے ترک اسے، مدتیں ہوئیں

پہلا پجاری:

عاری ہو چونکہ دل سے اسی واسطے تمہیں
اتنا بڑا سٹوپہ دکھائی نہیں دیا

تماچی:

احساس شاید اس کا ہی لایا مجھے ادھر

دوسرا پجاری:

یہ بات تھی تو مار تیں اس پر نہ چوکتو
ایسے، بغیر حرف دعا کے کبھی بھی تم

تماچی:

پہلے ہی یہ زمین پہ تھا

پہلا پجاری:

کچھ بھی ہو عمل
حتماً یہ افتراق و تصادم کا ہے

تماچی:

مگر
کھلتا ہے افتراق سے بھی در نجات کا

پہلا پجاری:

کہتے ہیں ہم بدی جسے

تماچی:

وہ خیر بھی تو ہے

پہلا پجاری:

دھوکا!

تماچی:

نجات ہے

دوسرا پجاری:

جسے ہم کہتے ہیں نجات

کماچی:

پانی تو مثلِ پیڑوں کے اس کو نہ دے سکیں

پہلا پجاری:

روشن ترین شیشہ

کماچی:

تو دیوار پر نہیں

کورس:

کچھ بھی جدا نہیں ہے نہیں کچھ بھی دیرپا
انسان اور بدھ میں نہیں کچھ بھی امتیاز
اک اختلاف ظاہری، اک پردۂ فریب
مردانِ بے خرد کی تسلّی کے واسطے
ضامن ہے وہ شروع سے جن کی نجات کا
"کھلتا ہے افتراق سے بھی در نجات کا!"
بولی کماچی یوں: تو پجاری یہ کہہ اٹھے:
باہر ہے اپنے بس سے یہ بودھی فقیرنی
اس کا مقام، عقل ہماری نہ پا سکے
تب تین بار انھوں نے زمین پر جھکا کے سر
اس کے حضور بھینٹ عقیدت کی پیش کی
تھے وہ پجاری کس قدر الغرض تحصیل کیا!
تھے وہ پجاری کس قدر الغرض خصیل کیا!
اصلاح ان کی کس میں یارا کہ کر سکے؟

پہلا پجاری:

تم کون ہو بتاؤ ہمیں اپنا نام دو!
ہم روح کے لیے تمھاری کریں گے ہم دعا!

کماچی:

تم کو بتاؤں گی میں خجالت کے باوجود
رسوائیوں کو اپنی کروں گی میں مشتہر
اک خستہ و تباہ کماچی کے واسطے
دیوا کے مالک، اونو کے یوشی زنے کی دُخت
کے واسطے دعا کرو اے صاحبانِ دل!
وہ ناتواں نزار پراگندہ، پابگِل

دونوں پجاری:

یہ سوچنا کہ تم ہو وہ ہے کس قدر حزیں
وہ نازنیں کہ جس کا نہ ثانی ہُوا کہیں
وہ بہترین پھول چمن زارِ حسن کا
وہ قوس کی طرح تنے ابروئے عنبریں
روئے ملیح جس پہ طلوعِ سحر کا رنگ
سرمایہ دارِ ناز تھی وہ پیکرِ شباب
خوشبوئے دیودار سے مہکے ہوئے اطاق
لائیں کہاں لباس مشجر کی اس کے تاب

کماچی:

لکھتی تھی شعر بھی میں ہماری زبان میں
بلکہ زبانِ غیر میں بھی شُعلہ بند تھی

کورس:

سرکاتی آگے جامِ ضیافت کو جب کبھی
دامن میں اس کے چاند کے انوار منعکس
آرام کرتے، سرخوشِ تدبیر کامیاب
وہ حسن بے پناہ ہُوا کس طرح تباہ؟
ناعورۂ جمال میں آیا کہاں انقلاب؟
ہاں اس سے کہا ایک کھنی کھریلی گھاس کی
شانوں پہ اس کے کاکل شبگوں کے لہریے
ابرو کی دونوں قوسوں کا انداز سرکشی
عارض کا رنگ...... خاک میں کس نے ملا دیا؟

کماچی:

سو سال سے بنا ہے فسانہ وہ رنگ روپ
اب تو وہ عہدِ غالیہ بُو دراز دست
میلی کچیلی جیسے سمندر کی گھاس ہو

کورس:

تھیلا جو ہے تمھاری کمر پر ہے اس میں کیا؟

کُماچی:

یا آج دن کی موت ہے یا کل کی بھوک
رکھے ہیں میں نے تھیلے میں کچھ لوبیے کے بیج

کورس:

ہے پیٹھ پر تمھارے جو گٹھری ہے اس میں کیا؟

کُماچی:

میلا سا اک لباس کہ ہے گرد سے اٹا

کورس:

جو ٹوکرا ہے بازوؤں میں اس میں پھر ہے کیا؟
اک کوٹ پارہ پارہ؟

کُماچی:

شکستہ سا ایک ٹوپ

کورس:

جس میں وہ اپنا چہرہ بمشکل چھپا سکے

کُماچی:

پالے کے ساتھ برف کی برکھا کا سوچو تو
دامن کہاں کہ آنسوؤں کو خشک کر سکوں
وہ لوگ جن کی آمد و رفت اس سڑک پہ ہے
ان سے میں بھیک مانگتی پھرتی ہوں جا بجا
ناکام ہو یہ حربۂ دریوزگی بھی جب
اک خوفناک مجھ پہ ہو دیوانگی محیط
پہلا سا اب رہا نہ نہ لب و لہجہ بھی میرا
ہے... ڈالو میرے کاسے میں کچھ اے پجاریو!

پہلا پجاری:

کیا چاہتی ہو تم؟

کُماچی:

کہ کُماچی کے پاس جاؤں

پہلا پجاری:

کیا کہہ رہی ہو تم؟ ہو کُماچی تم آپ ہی

کُماچی:

مَیں، وہ؟... نہیں نہیں! تھی کُماچی تو بے مثال
تھے نامہ و پیام لگاتار، جس طرح
گرما کے آسمان سے بارش ہو زور کی
لیکن دیا نہ اُس بُتِ مغرور نے جواب
حرفِ تہی سے وعدۂ باطل سے بھی کبھی
اس شوخ نے تسلّیِ دلِ سوختہ نہ کی
اس فعلِ ناسزا کی بڑھاپا ہے اب سزا
کرتا ہوں اس سے عشق، میں کرتا ہوں اس سے عشق!

پہلا پجاری:

اس سے ہے عشق تم کو؟ کُماچی سے عشق ہے؟
کس کا پریت تم سے یہ سب کہلواتا ہے

کُماچی:

تھے یوں تو اس کے چاہنے والے بہت مگر
شوشوے بڑھ کے تھا نہ کوئی اس کا جاں نثار

کورس:

پیچھے کی سمت پہیہ مگر گھومتا ہے پھر
چکر میں ناخوشی کے، میں کرتا ہوں پھر سے زیر
ہر رات جاتے لوٹتے پہیوں کے ساتھ ہی
ہو کر سوار جاؤں میں کاخِ جیب تک
سُورج۔ گھڑی یہ کون سی ہے؟
جھٹپٹے کا وقت؟
مہتاب ہو گا راستے میں ہم سفر مِرا
درّے پہ پہرے دار ہیں استادہ گو مگر
روکیں گے راستہ نہ وہ اس شب نورد کا

کُماچی:

اٹھا کے اپنے ذیلِ سفید و دراز کو

کورس:

اٹھا کے اپنے ذیلِ سفید و دراز کو
سنبھال اپنے ریشمی اسکرٹ کا اٹھائے

لمبے سیاہ ٹوپ کو نیچے کیے ہوئے
سر پوش آستینوں کو اپنی بنا کے میں
خود کو چھپائے راہروں کی نگاہ سے
ظلمت ہو، چاندنی ہو، برابر سڑک کا گز
جب تار و تیرہ رات کو ہوتی ہیں بارشیں
جب رات کی ہوائیں اڑاتی ہیں مینہ سماں
پتّوں کو، برف کی جمے جب اک دبیز تہ!

کُھاچی:

سیّال قطرے گرتے ہیں گڑیوں سے جس گھڑی
جو ایک ایک کرکے

کورس:

میں آیا، میں پھر گیا
اک رات اور دوسری بعد اس کے تیسری
دسویں جو رات تھی وہ تھی اک رات فصل کی
اس سے مگر نہ میری ملاقات ہو سکی
اس مرغ کی طرح کہ جو ہر صبح بانگ دے
باقاعدہ، نہ میں نے بھی ناغہ کیا کبھی
کرتا تھا کندہ نقش میں اپنا ستون پر
سو راتیں حاضری مجھے دینا تھی گو مگر
رہتی تھی رات
آہ یہ دوران سر! یہ درد!

کورس:

سینے میں اس کے درد اٹھا جو اخیر رات
راہی وفا کا راہی ملکِ عدم ہوا
شوشو تھا جس کا نام، وہ ناکام عاشقی
عشاق نامراد کا سرخیل، شیر مرد

کُھاچی:

ہوں اس کی ناتمام محبّت کی میں اسیر
قابض ہے مجھ پہ وہ میں اب اس کی دبیل ہوا
ہوگی کبھی فرو بھی یہ آگ انتقام کی؟
کرتی ہوں میں دعا کہ ملے مجھ کو زندگی
ان عصرہائے تازہ میں آئیں گے جو ابھی
میں نیکیوں کی ریت کی ڈھیری بناؤں گی
جس پر کہ اک بلند پہاڑی کا ہو گماں
زریں، شریف بدھ کے مقدس حضور میں
لفظوں کو اپنی پھول سمجھ کر چڑھاؤں گی
مجھ کو ملے گا داخلہ اس طرح مارگ میں
مجھ کو ملے گا داخلہ اس طرح مارگ میں[۱]

---

[۱] یا
مجھ کو ملے گا راہ صداقت میں داخلہ

انجمن ترقی اردو کی چند مطبوعات

کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
فرہنگ اصطلاحات بینکاری	محمد احمد سبزواری	۲۰۰/-
داستان سحرالبیان	ڈاکٹر احمد سجاد	۱۶۰/-
مضامین غلام ربانی	غلام ربانی	۱۰۰/-
اردو، قومی یکجہتی اور پاکستان	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	۶۰/-
ایران بعہد ساسانیان	آرتھر کرسٹن سین ترجمہ/ڈاکٹر محمد اقبال	۲۰۰/-
الف لیلہ و لیلہ (سات جلدیں)	ترجمہ: ڈاکٹر نورالحسن منصور	۸۹۰/-
تاریخ الحکما	جمال الدین ابوالحسن علی بن یوسف القفطی ترجمہ: ڈاکٹر غلام جیلانی برق	۱۶۵/-
بابائے اردو	ڈاکٹر اسلم فرخی	۱۵/-
روسی ادب (دو جلدیں)	پروفیسر محمد مجیب	۲۴۰/-
قہر عشق	ولیم شیکسپیر/ احسان الحق حقی	۱۲۰/-
جوامع الحکایات و لوامع الروایات (دو جلدیں)	ترجمہ: اختر شیرانی	۱۶۵/-
نوادر الالفاظ	سراج الدین علی خاں آرزو	۱۰۰/-
محمد تقی میر	ڈاکٹر جمیل جالبی	۵۰/-
تنقید عقل محض	امانوئل کانٹ ترجمہ: ڈاکٹر عابد حسین	۱۸۰/-
سعادت یار خاں رنگین	ڈاکٹر صابر علی خاں	۱۳۰/-
حرفے چند (حصہ اوّل)	جمیل الدین عالی	۱۰۰/-
حرفے چند (حصہ دوم)	جمیل الدین عالی	۱۲۵/-
غالب کے خطوط (حصہ اوّل)	ڈاکٹر خلیق انجم	۱۵۰/-
غالب کے خطوط (حصہ دوم)	ڈاکٹر خلیق انجم	۱۵۰/-
غالب کے خطوط (حصہ سوم)	ڈاکٹر خلیق انجم	۱۵۰/-
غالب کے خطوط (حصہ چہارم)	ڈاکٹر خلیق انجم	(زیر طبع
تنقید اور جدید اردو تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	۵۰/-
غزل نما	مرتبہ: ادا جعفری	۱۰۰/-
غالب آشفتہ نوا	ڈاکٹر آفتاب احمد خاں	۵۰/-
ابن انشا	ڈاکٹر ریاض احمد ریاض	۱۵۰/-
جدید اردو شاعری (حصہ اوّل)	عزیز حامد مدنی	۱۲۰/-
جدید اردو شاعری (حصہ دوم)	عزیز حامد مدنی	(زیر طبع
جاپانی کہانیاں	شفیع عقیل	۸۵/-

انجمن ترقی اردو پاکستان

ڈی-۱۵۹ بلاک (۷) گلشن اقبال کراچی-۷۵۳۰۰

ایک بنگلہ دیشی افسانہ

سائے کی زنجیر

تصنیف مفروحہ چودھری / ترجمہ ظہیر مشرقی

اچانک اس کے کمرے کا بلب ہولڈر سے چھوٹ کر زمین پر آ گرا اور ایک تڑاقے کے ساتھ چور چور ہو گیا۔ چنانچہ اسے لالٹین جلانا پڑی جس کی دھندلی روشنی نے ماحول میں ایک متانت سی پیدا کردی۔ کمرے میں جدھر دیکھو ادھر سایہ ہی سایہ تھا۔ پردے کا سایہ کونے کھدرے سے چھن چھن کر آنے والی روشنی کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہا تھا اور منی پلانٹ کا سایہ نہ صرف گلدان سے لے کر سامنے والی دیوار تک پھیل گیا تھا بلکہ ہوا کے ہلکے پھلکے جھونکوں کے ساتھ اس طرح جھوم رہا تھا جیسے وہ ایک دوسرے کے ہمزاد ہوں۔

سنگار میز کے آئینے کے انعکاس نے کمرے کو نور و ظلمت کے تقریباً دو برابر حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ میز، کرسیاں، مسہری، الگنی اور اس پر ٹنگے ہوئے تمام ملبوسات سلمیٰ کے دل و دماغ میں اترتے اور وہاں موجود روشنی کو نگلتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ اس قسم کے مظاہرے سے سلمیٰ کو شاید پہلی مرتبہ واسطہ پڑا تھا۔ اسی لیے اندھیرے کو سونگھتے ہوئے وہ ایک عجیب سی کیفیت محسوس کر رہی تھی۔

دوسرے تمام کمرے بجلی کی روشنی میں جگمگا رہے تھے۔ ان کمروں کے بیچ میں سلمیٰ کا کمرہ دھندلکے میں مصور خوابوں کا ایک نشیمن سا لگ رہا تھا۔ جہاں سلمیٰ کو اختیار تھا خواہ وہ ماضی کے مسمار خوابوں کی ریزہ چینی کرے خواہ اپنے خواب آلود مستقبل کی منصوبہ بندی کرے۔ مسہری کے پاس ہی اس کے مطالعہ کے لیے ایک میز پڑی تھی اور میز پوش ہوا میں پھڑپھڑا رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس کا سایہ اس کے سوئے ہوئے بچے پر اس طرح پڑ رہا ہے جیسے کوئی گدھ اپنا پر پھیلا رہا ہو۔ سلمیٰ فوراً اس کی طرف لپکی لیکن اتنے میں سایہ وہاں سے ہٹ چکا تھا۔

اس نے اپنے بچے کے ساتھ اس کمرے میں یوں سمجھو کہ پناہ لے رکھی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس گھر پر نہ صرف اس کا بلکہ اس کے نوزائیدہ بچے کا دعویٰ بھی کمزور سے کمزور تر ہوتا جا رہا تھا حالانکہ اس کمرے کا تمام سامان وہ میکے سے جہیز میں لائی تھی۔

اسے ایسا لگا جیسے دو چار لمحوں کے اندر دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آنے گی اور اس کی ساس اپنی مہین آواز میں اسے پکارے گی سلمیٰ بیٹی! سو گئی ہو کیا؟ کھانا نہیں کھاؤ گی؟ بیچاری ایک بے کراں سمندر میں تنکے کی طرح بہہ رہی تھی۔ سلمیٰ کا دیور اپنی شریک حیات کے ساتھ اس گھر کا حقیقی سربراہ تھا۔ اسی وجہ سے سلمیٰ کے والدین نے کئی بار چاہا کہ اسے اپنے یہاں رکھ لیں لیکن سلمیٰ نے ہر بار زور دار الفاظ میں انکار کر دیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہاں بھی اس سے چھوٹے کئی بھائی اور بہنیں تھیں۔ اس سے چھوٹی دو بہنوں کی تو شادی بھی ہو چکی تھی اور وہ اپنے اپنے شوہر کے گھر خوش تھیں۔ عین ممکن تھا کہ جب کبھی وہ میکے آتیں تو سلمیٰ سے محبت، ہمدردی اور غم خواری کے اظہار کے لیے غیر ارادی طور پر ایسے الفاظ کا استعمال کر جاتیں جو طعن و تشنیع اور ملامت و توہین کے مرادف ہوتے۔

اس کی ساس نے اسے تعلیم جاری رکھنے کا مشورہ دیا تھا۔ اپنی پڑھائی پوری توانائی کے ساتھ جاری رکھو بیٹی! تاکہ تمہیں دوسروں کے سہارے جینا نہ پڑے۔ اس کے باوجود یہ نہ بھولو کہ ہر حال میں تمہیں اپنے بچے کی پرورش و پرداخت کرنی ہوگی اور یہ فرض تم کو پوری ذمہ داری کے ساتھ انجام دینا ہوگا لیکن یہ بھی ذہن نشین کر لو کہ اس سے یہ آس لگائے رکھنا کہ بڑا ہو کر وہ تمہارے بڑھاپے کا سہارا بنے گا پرلے درجے کی حماقت ہوگی۔ سلمیٰ کو معلوم تھا کہ یہ کہہ کر بڑی بی دراصل اپنے بیٹے صابر کے خلاف سینے میں دبے ہوئے مجروح جذبات کو زبان دے رہی تھی۔

کمرے کی دھندلی روشنی میں اس نے اپنے بچے کی طرف دیکھا اور پھر اس معمہ کو حل کرنے میں الجھ گئی کہ کیا اس کی ساس اسے اپنے بیٹے صابر سے زیادہ چاہتی ہے۔ غالباً یہ بات غلط نہیں، اس نتیجے پر پہنچتے ہی اس نے اپنی ساس کو دل کی گہرائیوں سے ماں کہہ کر پکارنا چاہا۔ بے ساختہ اس کے سینے میں یہ آرزو مچلنے لگی کہ نور و ظلمت کے اس ملگجے سے ماحول میں اپنی ساس کو لے آئے اور اس سے لپٹ کر ماں...... میری ماں...... ماں...... میری ماں کہتے کہتے اپنا دل اس کے دل میں ڈال دے تاکہ اسے بھی اندازہ ہو جائے کہ وہ بھی اسے ایک بیٹی کی طرح چاہتی ہے۔ اسے یاد آیا کہ ایک دن اس نے بالا ہی بالا اپنی ساس کو پڑوسن سے یہ کہتے سنا تھا کہ میں اپنے گھر میں ایک بچی لے آئی ہوں اور یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اس عمر میں کوئی اسے نظر انداز کرے۔ لیکن کیا کروں مجبور ہوں خواہش کے باوجود اس کی پوزیشن بحال نہیں کر سکتی میں تو صرف گناہ بٹورنے کے لیے زندہ ہوں، سلمیٰ یہ سن کر بولنے ہی والی تھی کہ "نہیں امی! تمہارا کوئی قصور نہیں تم نے کوئی گناہ نہیں کیا" لیکن مصلحتاً خاموش رہی اور پھر حسبِ توقع آواز آئی سلمیٰ بیٹی! آجاؤ کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔

"آتی ہوں امی!" سلمیٰ نے محبت بھرے لہجے میں جواب دیا بڑی بی اپنی دونوں بہوؤں کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھ گئی۔ کھانے کے دوران سلمیٰ اپنی دیورانی کے ساتھ باتیں کرتے کرتے خلاف معمول زور سے ہنس پڑی۔ ہنسی کی آواز اتنی اونچی تھی کہ ساس بھی چونک پڑی۔ اس نے نظر اٹھا کر سلمیٰ کی طرف دیکھا۔ کیا یہ سلمیٰ ہے جو ہنس رہی ہے۔؟ کیا واقعی یہ وہی ہے؟ اس کی آنکھیں تو نہیں بھیگیں یہ سوچتے سوچتے خود اس کی آنکھیں بھی نم آلود ہو گئیں اور ایک لمبی آہ اس کے سینے سے نکلتے نکلتے رہ گئی کیوں کہ جلد ہی اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

ایک اور موقع پر جب بڑی بی اپنی دونوں بہوؤں کے ساتھ کھانے میں مصروف تھی باہر جھما جھم بارش ہو رہی تھی۔ اور رہ رہ کر جھکڑ چل رہے تھے۔ اس وقت یہ کہنا مشکل تھا کہ رات کو حالات اعتدال پر آجائیں گے یا اور زیادہ خراب ہو جائیں گے۔ بجلیاں بھی چمک رہی تھیں اور کڑکا بھی ہو رہا تھا۔ کھانا ختم کر کے ساڑھی کے پلو سے منہ پونچھتے ہی فوراً بڑی بی نے سلمیٰ سے کہا کہ

اپنے کمرے کو تالا لگا دو اور بچے کو لے کر میرے کمرے میں سو جاؤ۔ کیوں کہ ان پُر ہول حالات میں بچے کو لے کر ایک الگ کمرے میں رات گذارنی مناسب نہیں۔" سلمیٰ کا کمرہ ڈرائنگ روم کی مانند گھر سے بالکل الگ تھلگ تھا۔ اس دو منزلہ عمارت کی زمینی منزل کرایہ پر دی ہوئی تھی۔ جب کہ بالائی منزل میں یہ لوگ خود رہتے تھے۔ سلمیٰ کا کمرہ ایک متصلہ غسل خانے کے ساتھ سیڑھیوں سے لگا ہوا تھا۔ اس میں ایک ہی دروازہ تھا جس سے ملا ہوا ایک دالان تھا جس سے گزر کر ہی کمرے میں داخل ہو سکتے تھے۔ شادی کے بعد ہی سے صابر اور سلمیٰ اس کمرے میں رہا کرتے تھے حتیٰ کہ شادی کی پہلی رات رومان پرور گھڑیاں بھی اس سے وابستہ تھیں۔ صابر کے ملک سے باہر چلے جانے کے بعد سلمیٰ اس کمرے کو تالا لگا کر ساس کے کمرے میں منتقل ہو گئی تھی۔ البتہ کبھی کبھی بیتے دنوں کی یاد تازہ کرنے کو اس کمرے میں چلی جاتی تھی اور کچھ دیر وہاں ٹھہر کر لوٹ آتی تھی کبھی کچھ لے کر اور کبھی خالی ہاتھ۔

بچے کی پیدائش کے چند دنوں بعد وہ اپنی ساس کے مشورے سے پڑھائی جاری رکھنے کی غرض سے اپنے کمرے میں واپس آگئی تھی شادی سے پہلے وہ آئی۔ اے کا امتحان پاس کر چکی تھی۔ شادی کے بعد یہ طے ہوا تھا کہ صابر اسے اپنے پاس بلا لے گا۔ لیکن جس دن اسے جانا تھا اس دن سے صابر نے خط و کتابت ہی بند کر دی اور پھر سننے میں آیا کہ اس نے وہاں نئی ازدواجی زندگی کا آغاز کر دیا ہے۔

یکایک چکا چوند کر دینے والی بجلی کوندی اور بہت زور کا کڑکا ہوا۔ لگتا تھا کہیں نہ کہیں ضرور بجلی گری ہوگی "لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ" بہوا بچے کو لے کر فوراً چلی آؤ" بڑی بی نے اونچی آواز میں سلمیٰ سے کہا "دیر نہ کرو" سلمیٰ کے کمرے کی حالت اس وقت کسی جہاز کے ایک بے رونق کیبن کی سی تھی اور بڑی بی کپتان کے رول میں سگنل پا کر سلمیٰ کو مسلسل خبردار کیے جا رہی تھی حتیٰ کہ اس کی طرف مدد کا ہاتھ بھی بڑھاتی جا رہی تھی۔

"حواس قابو میں رکھیں امی" سلمیٰ نے دھیرے سے جواب دیا۔ ذرا ذرا سی باتوں سے بڑی بی کا کلیجہ منہ کو آجایا کرتا تھا۔ لیکن سلمیٰ ایک ہلکے سے احتجاج کے ساتھ اسے یہ باور کرانے کی کوشش کرتی تھی کہ تشویش کی کوئی بات نہیں۔ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے اور چونکہ اس کے اعصاب بہت مضبوط ہیں اس لیے وہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے بالکل سراسیمہ نہیں ہوتی تاوقتیکہ کسی حقیقی گزند کا احتمال نہ ہو۔

"تشویش تو ہونی چاہیے بیٹی" اس نے سلمیٰ کو سمجھانے کی کوشش کی "اگر اللہ کا کرم شامل حال نہ ہو تو قدم قدم پر خطرہ ہے" اس کا مفہوم بہت دوررس تھا۔ شادی کے بعد ہی اس نے صابر سے کہا تھا کہ وہ سلمیٰ کو اپنے ساتھ لے جائے اس لیے کہ وہ ایک خاص قسم کا خطرہ محسوس کر رہی تھی لیکن صابر نے قطعی طور پر انکار کر دیا تھا۔ الغرض بڑی بی سلمیٰ کو ساتھ لے کر کمرے کے اندر گئی اور سوتے بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ سلمیٰ نے تمام الماریوں اور صندوقوں کو تالا لگایا، ہر چیز کو قرینے سے رکھا، کمرے کے چاروں طرف ایک سرسری نگاہ ڈالی، بتیاں بجھائیں اور وہاں سے نکل آئی۔ لیکن یکایک اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اسے ایسا لگا جیسے کہ وہ اس کمرے کو چھوڑ کر جس سے اسے بہت سی حسین یادیں وابستہ تھیں، اور وہاں رکھی ہوئی تمام چیزوں کو تاریکی کی قبر میں دفنا کر ہمیشہ کے لیے رخصت ہو رہی تھی۔ اس نے غیر ارادی طور پر اپنا ہاتھ سوئچ بورڈ کی طرف بڑھا کر سوئچ آن کر دیا۔ ایک بار پھر کمرہ روشن ہو گیا اور وہاں رکھی ہوئی ہر شے میں جان پڑ گئی، اس نے یہاں تک محسوس کیا کہ جیسے اس کے دل و دماغ پر مسلط تاریکی بھی تیزی کے ساتھ کافور ہو رہی ہو۔

"دیر کس بات کی ہے بیٹی؟ آ بھی جاؤ" بڑی بی نے کہا۔ وہ سامنے کے برآمدے میں کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی سلمیٰ

کے ذہن سے یہ بات اتر چکی تھی۔ وہ چونک پڑی اور بہت اونچی آواز میں پوچھا "کیا بتیاں جلتی چھوڑ آئی امی؟ بڑی بی نے اثبات میں جواب تو دے دیا مگر مفہوم نہ سمجھ پائی۔

غالباً وہ سلمیٰ کے جذبات سے اچھی طرح آگاہ تھی سلمیٰ نے بھی متعدد بار یہ نوٹ کیا تھا کہ جب کبھی وہ اپنی دیورانی کے ساتھ گپ شپ کر رہی ہوتی اور دیورانی جس نے صابر کو کبھی نہیں دیکھا تھا (اس لیے کہ اس کے جانے کے بعد بیاہ کر لائی گئی تھی) صابر کے بارے میں کچھ جاننا چاہتی یا کوئی بھونڈا سا سوال کر بیٹھتی تو بڑی بی فوراً کسی نہ کسی بہانے اسے اپنے پاس بلا لیتی اور سلمیٰ اطمینان کا سانس لیتی۔ بڑی بی کے رویّہ سے اسے اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ وہ بیشتر اوقات اسی کے بارے میں سوچا کرتی تھی اور اس باعث سلمیٰ بھی اس کی ممنونِ کرم تھی۔ عام طور پر لوگ اس بات کو مانتے ہیں اور اس کی ساس نے بھی ایک بار کہا تھا کہ روح تو ایک ہی ہے جو تمام اجسام میں جاری و ساری ہے لیکن گوشت پوشت کے ڈھانچوں نے اسے الگ الگ وحدتوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ سلمیٰ کے دل میں اس بات نے اچھی طرح گھر کر لیا تھا کہ بڑی بی نے اسی کی خاطر صابر سے لاتعلقی قائم کر رکھی تھی۔ اگر وہ ماں بیٹے کے درمیان حائل نہ ہوتی تو شاید بڑی بی بیٹے کی کارستانی پر نکتہ چینی کرنے کے بجائے ایک تعلیم یافتہ ولایتی میم کو بہو بنا کر فخر و مسرت کا اظہار کرتی۔ اس خیال نے سلمیٰ کو ایک زبردست ذہنی اذیت سے دوچار کر دیا "وہ اس گھر میں ایک مد فاضل کی حیثیت رکھتی ہے اور بڑی بی کے راستے کا پتھر بن کر رہ گئی ہے" اس نے سوچا "اگر وہ وہاں موجود نہ ہوتی تو بڑی بی تمام تفکرات سے آزاد ہو چکی ہوتی۔ شاید اس کی تمام الجھنوں کا واحد سبب وہی ہے"

بڑی بی کے کمرے میں سنگل بیڈ کی دو چارپائیاں پڑی تھیں۔ ایک پر وہ خود سویا کرتی تھی اور دوسری اس وقت استعمال میں لائی جاتی تھی جب کوئی رشتہ دار عورت بہ طور مہمان آجاتی۔ کمرہ چھوٹا تھا اس لیے چارپائیاں ایک دوسرے کے بہت قریب بچھی ہوئی تھیں۔

سلمیٰ نیم دراز حالت میں بچے کے ساتھ لیٹی ہوئی ایک کتاب پڑھ رہی تھی۔ بڑی بی نے نماز اور مناجات سے فارغ ہو کر اس سے پوچھا "بہو! تم ابھی پڑھو گی یا بتی بجھا دوں"

"نہیں امی!" اس نے جواب دیا "اب نہیں پڑھوں گی"

بڑی بی نے بتی بجھا دی اور اپنی چارپائی پر آ گئی۔ کمرے میں اندھیرا پھیل گیا۔ لیکن آہستہ آہستہ آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہونے لگیں اب اس نے نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ بڑی بی اپنے بستر پر لیٹ گئی ہے۔

"بیٹی! کیا تم نے سوچا بھی ہے کہ بی۔اے کر لینے کے بعد تم کیا کرو گی؟ بڑی بی نے پوچھا

"کیوں اماں؟" سلمیٰ نے جواب دیا "میں ایم اے کی تیاری کروں گی"

اس وقت بھی موسلادھار بارش ہو رہی تھی۔ پھر ایک بار بجلی چمکی اور دیکھنے میں آیا کہ بجلی کی ایک کرن کمرے میں داخل ہوئی اور پلک جھپکتے ہی باہر نکل گئی۔ اس کی چمک میں اس نے دیکھا کہ اس کی ساس سینے پر ہاتھوں کی صلیب بنائے چت لیٹی ہے۔ اس کو بڑی بی سے دلی محبت پیدا ہو گئی تھی جس نے اس کی خاطر اپنا مادی آرام اور ذہنی سکون سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ سلمیٰ کو یاد آیا کہ ابھی کچھ زیادہ دن نہیں ہوئے جب اس نے اپنے چھوٹے بیٹے کو بلا کر متنبہ کر دیا تھا کہ وہ اس بات کا خاص خیال رکھے کہ سلمیٰ کا وقار اس کی بیوی کی نگاہ میں ہمیشہ بلند رہے اور کبھی گرنے نہ پائے اس لیے کہ وہ گھر کی بڑی بہو ہے اور اس حیثیت سے تعظیم و تکریم کی مستحق ہے "سلمیٰ اس سے زیادہ سن نہ سکی اور چپکے سے وہاں سے کھسک گئی۔ معاً اسے صابر یاد آگیا۔ وہ یہ

سمجھنے سے قاصر تھی کہ اس کی زندگی میں اتنا بڑا انقلاب کیسے رونما ہوگیا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ صابر کے ساتھ صرف چھ مہینے رہی تھی لیکن اس پوری مدت میں وہ دونوں ایک دن بھی ایک دوسرے سے الگ نہیں رہے۔ وہ ایام ایک حسین و دلکش خواب کی مانند تھے کسی باکمال مصور کی شاہکار تخلیق کی طرح فریم میں سجا کر رکھنے کے لائق۔

ماحول پر چھائی ہوئی تاریکی منجمد ہو کر ایک پتھر بن گئی تھی اور وہ پتھر اس کے دل پر بیٹھ گیا تھا۔ اس تاریکی میں سلمیٰ کو اس کا بھی خیال نہیں رہا کہ وہ کہاں تھی۔ وہ بری طرح تنہائی محسوس کر رہی تھی لیکن کچھ ہی دیر میں اسے ایسا لگا جیسے اس کے دل پر مسلط تاریکی کے بطن سے کوئی اور واضح الفاظ میں اس پر سوالات کی بوچھار کر رہا ہے کہ تم اب تک یہاں کیوں ہو؟ فیملی میں تمہارا کیا مقام ہے؟ اس عمر رسیدہ عورت کے بیٹے سے تمہیں مزید کیا توقع ہے؟ کیا تم لوگوں کے رحم و کرم پر زندگی گزارنا چاہتی ہو اور دوسروں کی دست نگر بن کر رہنا چاہتی ہو؟ اسے محسوس ہوا کہ جیسے کوئی اس کے دل کو مسوس رہا ہو اور شدت درد سے وہ اپنے حواس کھو چکی ہو۔

"امی! آپ سو گئی ہیں کیا؟"

"نہیں بیٹی! میں تو جاگ رہی ہوں"

سلمیٰ نے باہر کھڑکی کی طرف نظر ڈالی مگر کچھ دیکھ نہ پائی۔ کمرے میں پھیلی ہوئی گہری تاریکی کے سبب وہ دونوں بھی ایک دوسرے کو دیکھنے سے معذور تھے ورنہ سلمیٰ جو کچھ کہنا چاہتی تھی شاید کہہ بھی نہ پاتی۔ رات کی تاریکی نے اسے اچھا موقع فراہم کر دیا تھا۔

چنانچہ وہ فوراً بول اٹھی میرا خیال ہے امی! کہ مجھے اب یہاں سے چلی جانا چاہیے،

کہنے کو تو اس نے یہ بات کہہ دی لیکن فوراً اسے اندیشہ ہوا کہ کہیں بڑی بی ایسے پریشان کن سوالات کی بوچھاڑ نہ کردے جن کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ مثلاً کہاں جانا چاہتی ہو؟ کیا کرنا چاہتی ہو؟ بچے کی پرورش کیسے کرو گی؟ وغیرہ وغیرہ لیکن بڑی بی نے ایسا کوئی سوال نہیں کیا اور صرف اتنا کہا کہ ایک نہ ایک دن تم کو یہاں سے جانا ہی ہوگا لیکن میری تمنا ہے کہ تم اس وقت تک میرے پاس ٹھہر جاؤ جب تک میرا بلاوا نہ آجائے "پھر ذرا دم لے کر کہا" اور اس سے پہلے کہ اس گھر پر تمہارے دعوے کو چیلنج کرنے کی کوئی نادانی کرے میں نے اس خطرے کا سد باب کرنے کے لیے ضروری اقدامات کرنے کی منصوبہ بندی بھی کی ہے۔ جملے کا آخری حصہ بڑی بی نے ایک جوش اور ولولے کے ساتھ ذرا اونچی آواز میں ادا کیا۔ جس کی گونج نہ صرف کمرے کی چار دیواری بلکہ اس کے دماغ تک پھیل گئی۔ سلمیٰ نے احتجاجاً چلا چلا کر واویلا کرنا چاہا لیکن اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ایک قید خانے میں بند ہو جہاں اس کے نالہ و فریاد کو سننے والا کوئی نہیں۔

اس کا بازو چارپائی پر پڑے ہوئے گوشت پوست کے ایک لوتھڑے سے چھو گیا جو کچھ دیر پہلے ہاتھ پاؤں ہلا ہلا کر سو گیا تھا۔ اس نے پیار سے اسے چھوا اور اپنے داہنے ہاتھ سے اس کے ننھے سے جسم کو سہلانے لگی، سلمیٰ نے ایک بار پھر آہ و زاری سے کام لینا چاہا لیکن ناکام رہی۔ دل پر کرب و اذیت کا جو بار گراں پڑا ہوا تھا اس نے اس کے پیمانۂ خودی کو چکنا چور کر کے رکھ دیا تھا۔

رفتار ادب

(تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

پاکستان کے نعت گو شعراء (جلد اوّل)

سید محمد قاسم

صفحات ۳۶۸ قیمت ۲۰۰/۰ روپے

ہارون اکیڈمی، اورنگی کراچی

اردو زبان میں نعتیہ کلام کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اُن میں زیادہ تعداد اُن مجموعوں کی ہے جن میں تمام کی تمام نعتیں ایک ایک نعت گو شاعر کی ہیں اور کمتر مجموعے وہ ہیں جن میں مختلف شعراء کی نعتیں جمع کر کے شائع کردی جاتی ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب کا انداز ان دونوں سے الگ ہے۔ یہ مخصوص طور پر پاکستان کے نعت گو شعراء کا تذکرہ ہے۔ جس میں شعراء کے حالات و کوائف کو اوّلیت کا درجہ دیا گیا ہے اور نمونہ کے طور پر ایک کی دو، دو نعتیں شامل کر دی گئی ہیں۔ البتہ ماہر القادری کا صرف مشہور و مقبول سلام دیا گیا ہے بعض اور شاعروں کی نعت کے ساتھ ایک سلام بھی پیش کردیا گیا ہے۔ غرض اِس اعتبار سے یہ ایک منفرد کوشش ہے اِس جلد میں پورے ۱۰۰ نعت گو شعراء کے حالات درج ہیں۔ نعتوں کے انتخاب میں تذکرہ نگار نے اپنے ذوقِ سلیم سے کام لیا ہے۔ تاہم بعض نعتیں بڑی معرکہ کی شامل کی گئی ہیں۔ مثلاً

احسان فاروقی کی وہ نعت جس کا پہلا مصرع ہے "پُر کیف مدینہ کے منظر جب یاد ہمیں آجاتے ہیں" اپنے رنگ و آہنگ کی بنا پر نہایت پُر تاثیر ہے۔

بہزاد لکھنوی کی یہ نعت "ہم مدینے سے اللہ کیوں آ گئے قلبِ حیراں کی تسکیں وہیں رہ گئی" اپنی طویل اور مترنم بحر کی وجہ سے اثر و تاثیر میں ڈوبی ہوئی ہے۔

ماہر القادری کا یہ سلام .. "سلام اُس پر کہ جس نے بیکسوں کی دستگیری کی" محمانِ رسول میں ہمیشہ مقبول رہا ہے۔ شعراء کی ترتیب زمانی نہیں بلکہ حروف تہجی کے اعتبار سے ہے۔

جناب افسر ماہ پوری کے بیان کے مطابق یہ منصوبہ متعدد جلدوں میں مکمل ہوگا۔ ہر جلد میں سو نعت گو شعراء ہوں گے ہر نعت گو کے لیے تین صفحات مخصوص ہوں گے۔ سب سے اہم بات اُن کے نزدیک یہ ہے کہ نعتوں کے انتخاب میں یہ نکتہ پیش نظر رکھا گیا ہے کہ وہ سرورِ کائنات ؐ کی پاک سیرت و شخصیت کے بارے میں اظہار عقیدت و بیان ارادت میں شرعی حدود سے متجاوز نہ ہوں۔ یہ نکتہ واقعی نہایت اہم ہے اس لیے کہ بعض شعراء اس معاملہ میں لاپروائی سے کام لیتے ہیں اور افراط و تفریط میں مبتلا ہو کر شرک کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اِس گمراہی سے محفوظ رکھے۔

بہرحال یہ ایک مستحسن اقدام ہے جس کو سیّد محمد قاسم صاحب کے حسنات میں شمار کیا جائے گا۔ ایک ایسے نیک کام میں اوّلیت کا شرف اُن کو حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ اِس منصوبہ کو تکمیل کی منزل تک پہنچائے۔

(شاہ الحق صدیقی)

حافظ محمود شیرانی اور اُن کی علمی و ادبی خدمات (جلد اوّل)

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی

صفحات ۵۷۰، قیمت ۲۰۰/- روپے

مجلس ترقی ادب، کلب روڈ، لاہور

حافظ محمود شیرانی غیر منقسم ہندوستان کے مشاہیر علم و ادب میں نہایت امتیازی شان رکھتے تھے۔ اُنھوں نے تحقیق و تنقید کے میدانوں میں جو کامرانیاں حاصل کیں وہ محتاج تعارف نہیں۔ اُن کی علمی و ادبی خدمات مدت تک یاد رہیں گی۔

ایک ایسے فاضل اور محقق کے حالات اور کارناموں سے آئندہ نسلوں کو آگاہ و باخبر رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ اُن کی ایک جامع سوانح عمری لکھی جائے۔ زیرِ تبصرہ کتاب اسی ضرورت کو بہ احسن وجوہ پورا کرتی ہے۔ یہ کتاب اُن کے لائق فائق پوتے ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے تصنیف کی ہے۔ اس میں اُنھوں نے شیرانی قبیلہ کی برصغیر میں آمد، جودھپور کے علاقہ میں سکونت، وہاں سے حافظ محمود شیرانی کے دادا اور والد کی ٹونک میں منتقلی کی داستان نہایت دلچسپ انداز میں بیان کی ہے۔ پھر شیرانی صاحب کے حالات زندگی اور علمی و ادبی خدمات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

یہ کتاب زیرِ تبصرہ کی پہلی جلد ہے جو پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اوّل کا موضوع سوانح و سیرت ہے۔ باب دوم میں شیرانی صاحب کا تذکرہ بطور ماہر لسانیات کیا گیا ہے۔ باب سوم کا عنوان ہے شیرانی صاحب کا تحقیقی طریقۂ کار۔ باب چہارم میں شیرانی صاحب کے تحقیقی کارنامے بیان کیے گئے ہیں۔ اور باب پنجم میں شیرانی صاحب اور تدوین متن کے موضوع پر گفتگو کی گئی ہے۔

ظاہر ہے کہ دادا کے سوانح و سیرت پر پوتے سے بڑھ کر کون خامہ فرسائی کر سکتا تھا۔ اور پوتا بھی وہ جو خود زیورِ علم سے آراستہ پیراستہ ہو۔ سوانح و سیرت جس انداز سے لکھے گئے ہیں اُن میں تفصیلات اور حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ دلچسپی اور ادبیت کے عناصر بھی بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ تحقیقی کتابوں میں اس درجہ دلکشی اور شگفتگی بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ سوانح حیات کو مرتب کرنے کے لیے جس مواد کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی اگر دسترس میں ہو تو پھر قیاسات سے کام لینا نہیں پڑتا۔ کتاب زیرِ تبصرہ کو ترتیب دینے میں یہ سہولت حاصل رہی جس کی وجہ سے گلہائے تازہ و رنگین سے مزین یہ حسین گلدستہ تیار ہو گیا۔

باقی چار ابواب میں مختلف عنوانات کے تحت شیرانی صاحب کی علمی و ادبی خدمات پر بھی نہایت فاضلانہ انداز سے گفتگو کی گئی ہے اس حصّہ کو پڑھتے وقت ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اُنھوں نے محاسنِ کلام غالب میں صرف غالب کے کلام کی خوبیاں ہی بیان نہیں کیں بلکہ خود اپنی قابلیت کا بھی ایک گہرا نقش قارئین کے قلوب پر مرتسم کر دیا ہے۔ اسی طرح کتاب ہٰذا کے مصنف نے شیرانی صاحب کی تحقیق و تنقید پر اظہار خیال کرتے ہوئے اپنی غیر معمولی علمیت و بصیرت کا بھی اظہار کیا ہے۔ عرض ناشر میں جناب احمد ندیم قاسمی کی تحریر سے پتہ چلا کہ یہ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی کا پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ ہے لیکن تحقیقی مقالوں کی یبوست اس میں کہیں نظر نہیں آتی۔ کتاب کی بے شمار خوبیوں کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُس کا بغور مطالعہ کیا جائے۔ ایک مختصر تبصرہ میں تو اِس کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ:

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسن تو بسیار

البتہ اہلِ ذوق کو تبصرہ نگار یہی مشورہ دے گا کہ وہ اس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں اس لیے کہ اِس وقت تک اِس کی حیثیت حرفِ آخر کی سی ہے۔

(ثناء الحق صدیقی)

الایام

پروفیسر ڈاکٹر نثار احمد

صفحات ۱۴۲

شعبۂ تاریخِ اسلامی، جامعہ کراچی، کراچی

کتاب زیرِ تبصرہ شعبۂ تاریخِ اسلامی کی ۴۰ سالہ تاریخ ہے جو اس شعبہ کے صدر پروفیسر ڈاکٹر نثار احمد صاحب نے نہایت سلیقہ سے مرتب کی ہے۔ کتاب کا نام "الایام" ڈاکٹر صاحب کی دینی بصیرت اور اس آیت کریمہ "تلک الایام نداولھا بین الناس" کی روح سے مکمل واقفیت پر دلالت کرتا ہے۔ اسی واقفیت کی بنا پر اُنھوں نے اِس لفظ کو کتاب کا عنوان بنایا ہے۔

آیت کریمہ سے تاریخ کے اُس ردو بدل پر روشنی پڑتی ہے جو ایک قوم کے بعد دوسری قوم کے عروج و زوال کی بنا پر رونما ہوتا رہتا ہے۔ آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"یہ تو زمانہ کے نشیب و فراز ہیں جنھیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں"

تاریخ کے مطالعہ کا مقصد وحید یہ جاننا ہے کہ مختلف ادوار میں قوموں کو جو عروج و زوال ہوتا رہتا ہے یہ ہمیشہ سے اللہ تعالیٰ کی سنت رہی ہے اور اس کے لیے اسباب پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ تاریخ کے طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان اسباب پر نظر رکھے اور تاریخ کو محض قصہ کہانی سمجھ کر ان سے سرسری طور پر نہ گزر جائے۔ اگر تاریخ کے مطالعہ کے وقت یہ نکتہ پیش نظر نہ رہے تو پھر یہ مطالعہ فعل عبث اور وقت کا ضیاع ہوگا۔

کتاب ہٰذا کے سرورق پر کتاب کے نام اور متعلقہ آیت کریمہ کے نیچے یہ عبارت دی گئی ہے۔

"تعارف تاریخ احوال شعبۂ تاریخ اسلامی ۴۰ سالہ تقریبات پر"

کتاب کے مشمولات و موضوعات کی ترتیب یہ ہے

(۱) جامعہ کراچی تاریخ کے آئینہ میں (۲) پیغام شیخ الجامعہ (۳) پیغام رئیس کلیہ فنون (۴) پیش لفظ (۵) تعارف شعبۂ تاریخِ اسلامی (۶) تاریخ شعبۂ تاریخ اسلامی (۷) علمی، تعلیمی، ثقافتی سرگرمیوں کا جائزہ (۹۱ - ۹۲) (۸) فہرست مطبوعات اساتذہ

ان تمام موضوعات کو اس ترتیب سے پیش کیا گیا ہے کہ اُن پر نظر ڈالنے سے ایک طرف یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ جامعہ کراچی کا یہ شعبہ شروع سے نہایت فعال رہا ہے اور دوسری طرف شعبہ کی کارکردگی کا ایک واضح خاکہ نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ زبان میں ادبیت و شگفتگی بدرجہ اتم موجود ہے اور انداز بیان عالمانہ ہے۔ غرض یہ ایک ایسا قیمتی تحفہ ہے جو تعریف کے قابل ہے اور اس کی تیاری میں جو کاوش کی گئی ہے اُس کے لیے شعبہ کے جملہ اراکین بالخصوص صدر شعبۂ بجا طور پر تحسین و تبریک کے مستحق ہیں۔

(ثناء الحق صدیقی)

پریم چند ۔ حیاتِ نو

مانک ٹالا

صفحات ۴۰۸ قیمت ۔/۲۵۰ روپے

موڈرن پبلشنگ ہاؤس

پریم چند پر جناب مانک ٹالا کی پہلی کتاب "پریم چند اور تصانیفِ پریم چند۔ کچھ نئے تحقیقی گوشے" ۱۹۸۵ء کے اواخر میں اور دوسری تحقیقی کتاب "پریم چند کچھ نئے مباحث" اکتوبر ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی۔ جناب مانک ٹالا نے اپنی دوسری کتاب پیش کرنے کے بعد ابھی فراغت کا سانس لیا ہی تھا کہ اس کتاب پر جناب مشفق خواجہ کی تحسین اور تحریک نے انھیں پریم چند پر تیسری کتاب لکھنے کی جانب راغب کیا۔ جہاں چاہ وہاں راہ ہے کے مصداق اس کے لیے راہیں نکلتی چلی گئیں اور آنجہانی پریم چند سے متعلق اب کے بھی اتنا مواد جمع ہوگیا کہ اس کی اچھے خاصے ۴۰۸ صفحات میں سمائی ہوئی۔

اس کتاب میں پریم چند کے متعلق وہ سب کچھ ہے جس کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اس میں اُن کی زندگی کے کُھلے گوشے بھی ہیں اور ڈھکے گوشے بھی! جن کے مطالعے سے پونے یا آدھے پریم چند کی بجائے پورے پریم چند کی تصویر ذہن میں اُبھرتی ہے اور پریم چند کو جاننے کا عمل خوش گوار اور دوبالا ہوجاتا ہے۔

اگر جناب مانک ٹالا کی تینوں کتابوں کو ایک سیدھ میں رکھ کر دیکھا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اب پریم چند پر لکھنے کو کچھ اور باقی نہیں اور اُن کی ذات و فن کا کوئی بھی گوشہ اَن چھوا نہیں رہ گیا۔ لیکن نہیں انسان کی لکھی ہوئی کتاب کبھی حرفِ آخر نہیں ہوتی، لکھنے کو کچھ نہ کچھ باقی پھر بھی رہ جاتا ہے۔

اس کتاب میں پریم چند کی زندگی کے پالنے سے چتا تک کے سارے واقعات ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر یکجا کر دیے گئے ہیں، یہ یقینی بہت تحقیق، محنت اور محبت کا کام تھا۔ جناب مانک ٹالا نے اِن سب کو یکجا کیا ہے۔ اور قارئین و طلبہ کے لیے مطالعۂ پریم چند کا مرحلہ آسان کر دیا ہے۔

پریم چند کے شیدائیوں کو اِس کے متون کو نوشِ جان کرتے ہوئے تلچھٹ تک رسائی کا مزہ آگیا ہے۔ یہی اس کتاب کی بڑائی ہے اِس ناتے پریم چند پہ مانک ٹالا صاحب کی یہ ایسی تصنیف ہے جو حرفِ آخر کے درجے تک پہنچتی ہے اُردو ادب کی تاریخ میں پریم چند پر اُن کا یہ ادبی کام اختصاص کی نظر سے دیکھا جائے گا اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔

(ا۔ س)

اردو ناول کے بدلتے تناظر

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں

صفحات ۳۲۰ قیمت ۔/۱۵۰ روپے

ویلکم بک پورٹ (پرائیوٹ) اردو بازار، کراچی

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے اپنی کتاب "اردو ناول کے بدلتے تناظر" کا دیباچہ بعنوان "اپنے دفاع میں" لکھا ہے۔ لیکن اِس میں اپنے دفاع میں اُنھوں نے کچھ نہیں لکھا۔ دفاع کا کام دوسروں پر چھوڑ دیا ہے، وہ جو کسی نے کہا ہے کہ اکیلی لاٹھی، لاٹھی ہوتی ہے اور جب کئی ایک مل کر ایک دوسرے میں بستہ ہوجاتی ہیں تو یہ بڑی قوت بن جاتی ہیں۔ یہی حال اِس کتاب کا ہے کہ اکیلے

اکیلے اس میں سے کوئی مضمون پڑھا جاتا تو شاید اس سے وہ تاثر حاصل نہیں ہوتا جو بہت سے مضامین یکجا ہو کر اب دے رہے ہیں۔ یہ سارے مضامین فرداً فرداً ایک نہ ایک ناول سے بحث کرتے ہیں۔ اس حوالے سے ناول کی بہت سی جہات اور تکنیکی و تجرباتی رموز سے ہم آشنا ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اِس کتاب میں بہت سی چھوٹی چھوٹی ادبی بحثیں مل کر بڑی بن گئی ہیں۔ اِس طرح ڈاکٹر ممتاز کے کام کے دفاع کا خود بہ خود سامان پیدا ہو گیا ہے۔

ہر ناول کے متعلقہ مباحث سے ظاہر ہوتا ہے کہ ممتاز صاحب نے اسے سبقاً پڑھا ہے۔ اور ایک نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سے قطع نظر ممتاز صاحب کو دورِ جدید کے ہر اردو ناول کو پڑھنے کے اسباب اِس لیے پیدا ہوئے کہ اُن کے پی ایچ ڈی کا مقالہ "آزادی کے بعد اردو ناول" ہیئت اور تجربے" ہے۔ اُنھیں اپنے اِس مقالے کے سیاق و سباق کو قابلِ مطالعہ اور جامع بنانے کے لیے نہ صرف اردو کے قدیم و جدید ناولوں سے گزرنا پڑا بلکہ قدیم و معاصر انگریزی ناول نگار اور اُن کے ناولوں کو بھی زیرِ مطالعہ رکھنا پڑا۔ انگریزی ناول نگار اور اُن کے ناول کی قرات ممتاز صاحب پر اس لیے آسان گزری کہ وہ خود کالج میں انگریزی کے اُستاد ہیں اور ظاہر ہے کہ پڑھانے کے لیے ہر وقت کچھ نہ کچھ تو پڑھنا ہی پڑتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے اپنی اس کتاب میں ۲۹ اردو کے اہم ناولوں (اور اُن کے تخلیق کاروں: عزیز احمد، ڈاکٹر احسن فاروقی، قرۃ العین حیدر، نثار عزیز بٹ، شوکت صدیقی، فضل احمد کریم فضلی، ممتاز مفتی، خدیجہ مستور، محمد خالد اختر، انتظار حسین، بانو قدسیہ، عبد اللہ حسین، فہیم اعظمی، ڈاکٹر انور سجاد، انیس ناگی، جیلانی بانو، جمیلہ ہاشمی، غلام عباس، غلام الثقلین نقوی، نسیم مرور) کو الگ الگ موضوع بحث بنایا ہے۔ کسی ایک کتاب میں اتنے سارے ناولوں پر مباحثہ یکجا شاید کسی دوسری کتاب میں نہ ملے۔ یہی ممتاز احمد خاں کی کتاب کی انفرادیت و اولیت ہے۔

(ا۔ س)

روایاتِ علی گڑھ

محمد ذاکر علی خاں

صفحات ۲۷۲ قیمت ۱۲۵/- روپے

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن پاکستان کراچی،

اب تک زیادہ تر گلے تک بٹن بند علی گڑھ (مسلم یونیورسٹی) کا ذکر ہوتا رہا ہے جسے سُن کر ہمارا سر فخر سے اونچا ہوا، اور احترام سے جھک گیا ہے، یہ درس گاہ ہمارے شاندار ماضی قریب کا اہم باب ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے تک ملّی لحاظ سے یہ ہمارے لیے تعلیمی ملّی کی حیثیت رکھتی تھی اس کی خدمات قیام پاکستان کی یاد سے ہمیشہ وابستہ رہیں گی۔

جناب ذاکر علی خاں نے "روایات علیگڑھ" لکھ کر کھلے گلے کے نظارہ کا سامان پیدا کیا ہے۔ اُنھوں نے شیروانی کے تمام بٹن بلکہ بند ہونے کے آخری احساس "ہک" کو بھی کھول دیا ہے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اپنی تمام تر روایات اور درونِ خانہ دلچسپیوں کے ساتھ اظہر من الشمس ہو گئی ہے۔ یہ کام کوئی اور کرتا تو شاید اتنا دلچسپ نہ ہوتا۔ ذاکر علی خاں صاحب اِس کے لیے موزوں ترین فرد اس لیے ہیں کہ علیگڑھ روزِ اوّل سے ان کا اوڑھنا بچھونا رہی ہے۔ دیکھیے میں نے اوڑھنا بچھونا غلط نہیں کہا ہے اس کی ادنیٰ مثال یہ اعلان ہے کہ ذاکر صاحب نے "علیگڑھ کی روایات" سے ہونے والی آمدنی کو بھی علیگڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے علمی اور فلاحی منصوبوں کے لیے مختص کر دیا ہے۔

میں نے اس کتاب کے بین السطور ذاکر صاحب کے محسوسات کی گرمی اور روایات علی گڑھ سے ان کے والہانہ تعلقِ خاطر کو بجا محسوس کیا ہے۔ ایسے ہی شخص کے قلم سے کسی مادر علمی کے لیے یہ جملے ادا ہو سکتے ہیں کہ "علی گڑھ باپ کا سایہ ماں کی آغوش اور بھائی کا بازوئے شمشیر زن ہے" اس ایک جملہ کے پیچھے جو جذبات کار فرما ہیں آپ اسے وہ قطرہ سمجھیے جو پوری کتاب میں پھیل کر سمندر ہو گیا ہے۔

"روایاتِ علیگڑھ" کی جو خوبی اس طرح کی دوسری لکھی جانے والی کتب پر اس کو ممیز و فائق کرتی ہے۔ وہ اس کے مصنف کی شگفتہ تحریر ہے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ شگفتگی تحریر میں "آوازِ دوست" کا سا وقار پایا جاتا ہے۔ ایسی تحریر لکھنے کے لیے منجھے ہوئے قلم، متوازن فکر اور ایک اعلیٰ تہذیبی پس منظر کی ضرورت ہوتی ہے۔

مختصر یہ کہ ذاکر علی خاں صاحب کی یہ کتاب ادبی حلقے میں شوق سے پڑھی جائے گی کتاب نہایت عمدہ کاغذ اور خوبصورت گٹ اپ کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔

(ا۔ س)

جشنِ جنوں

خواجہ ریاض الدّین عطش

صفحات ۱۹۱ قیمت ۱۰۰/۸۰ روپے

جاوید محمد خاں اسٹیٹ میڈیا، ۹۵ آر۔ بلاک۔۶ گلشن اقبال کراچی،

"جشنِ جنوں" خواجہ ریاض الدّین عطش کا شعری مجموعہ ہے یہ مجموعہ گزشتہ سال منظر عام پر آیا۔ اس کے حرف اوّل سے ظاہر ہوتا ہے کہ خواجہ ریاض الدّین نے ۱۹۳۸ میں شاعری شروع کی اس طرح اُن کی شاعری کی عمر نصف صدی سے تجاوز کرتی ہے۔ اس سے پہلے ان کے دو شعری مجموعے "سوغاتِ جنوں" اور "وردِ نفس" شائع ہو چکے ہیں۔ سوغاتِ جنوں میں غزلیں ہی غزلیں ہیں اور وردِ نفس حمد و نعت ﷺ کا مجموعہ ہے۔

"جشنِ جنوں" اپنے مواد کے لحاظ سے گنگا جمنی خاصیت رکھتی ہے۔ اس میں لفظوں کے ساتھ نثر کے لیے بھی صفحات مختص کیے گئے ہیں۔ جن کے مطالعے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خواجہ ریاض الدّین عطش نہ صرف اچھے نظم و غزل گو ہیں بلکہ اچھی نثر بھی لکھ سکتے ہیں، مثال کے لیے اس میں شامل ایک مضمون "عظیم آباد...... میرا مولد و مسکن" پیش کرتا ہوں۔ یہ مضمون طویل اور اس کا سیاق و سباق تاریخی پس منظر رکھتا ہے۔ اس مضمون سے خواجہ عطش کے تحقیقی ذوق کا سراغ بھی ملتا ہے۔

اس کتاب میں شخصی نظموں کا ایک بڑا حصّہ شامل ہے۔ یہ نظمیں قائد اعظمؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ، سیّد سلیمان ندویؒ، حمید عظیم آبادی، نازش حیدری اور حسن حمیدی کی یاد میں لکھی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے موضوعات پر بھی طبع آزمائی کی گئی ہے۔ خواجہ ریاض الدّین عطش نے اپنے شعری مجموعہ جشن جنوں کا آغاز اپنے اس شعر سے کیا ہے، میں تبصرہ کا اختتام بھی اُسی شعر پر کرتا ہوں:

روشنی جس کی کسی اور کے کام آجائے
اِک دیا ایسا بھی رستے میں جلا کر رکھنا

کچھ وقت ہندوستانی کتابوں کے ساتھ

ڈاکٹر انور سدید

تاریخ و تحقیق / الطاف حسین خاں شروانی

الطاف حسین خان شروانی کا مقصد حیات آپ کو ضرور دلچسپ معلوم ہوگا۔ انھوں نے ان گل بوٹوں کو مٹانے کا قصد کر رکھا ہے جو انگریزوں نے ہماری قرونِ وسطیٰ کی تاریخ میں کھلائے تھے۔ یہ جملہ طنزیہ ہے اس کی توضیح ڈاکٹر تارا چند نے زیر نظر کتاب "تاریخ و تحقیق" کے دیباچے میں یوں کی ہے۔

> "کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ تاریخ کے ان گلے سڑے غلافوں کو اتارا جائے اور ان فرضی نظریوں کی سختی سے جانچ پڑتال کی جائے تاریخ کو مذہب نہیں علم کی روشنی میں پڑھا جائے۔"

الطاف حسین شروانی نے وقت کے اس تقاضے کو لبیک کہا اور تاریخ کی اس دھند کو صاف کرنے کی کوشش کی جو انگریزوں نے اپنے عہد کو تابندہ اور حکومت کو مستحکم کرنے کے لیے مسلسل اڑائے رکھی۔ شروانی صاحب کو دکھ اس بات پر بھی ہوتا ہے کہ ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ پر پرایوں نے ہی نہیں اپنوں نے بھی ستم ڈھایا ہے اور تاریخ کو کسی عہد کا آئینہ دار بنانے کے بجائے بادشاہوں اور حکمرانوں کے ذاتی کارناموں کی کھتاؤنی بنا دیا ہے۔ چنانچہ تاریخ کے سابقہ ادوار سے عوام اور عوام کی سماجی زندگی غائب ہے۔ تذکرے ہیں تو حکمرانوں کی لڑائیوں کے اور ان کی فیاضی اور دریا دلی کے اور مؤرخ اگر مخالفانہ روّیہ رکھتا ہے تو تاریخ عیوب کی نقاب کشائی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ شروانی صاحب نے اس کتاب کی داغ بیل مقاصد کے مدار سے، نکل کر ڈالی ہے۔ انھوں نے اپنے ذہن کو سابقہ کتابی دائرے سے نکالا، وہ فقہی مباحث سے نہیں الجھے، ان کا انداز تجزیاتی ہے اور انھوں نے سچ اور جھوٹ میں حدِ فاصل قائم کرنے اور افراط و تفریط کو صاف کرنے کی سعی کی ہے۔ ان کی اس سعیِ بلیغ کو ڈاکٹر تارا چند جیسے فاضل مؤرخ نے سراہا ہے۔

الطاف حسین شروانی کی زیر نظر کتاب "تاریخ و تحقیق" ۱۲ مختلف النوع ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب کا موضوع الگ ہے۔ یعنی اسے یک موضوعی مسلسل کتاب شمار نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم اس کا پہلا باب "ہندی قرونِ وسطیٰ تاریخ اور مؤرخین کا جائزہ" اس کتاب کا اہم ترین مقالہ ہے اور اسی سے شروانی صاحب کی فکری اور تاریخ نگاری کی جہت سامنے آتی ہے۔ لیکن یہ بات شاید محلِ نظر

معلوم ہو کہ اس جائزے میں انھوں نے یورپی اور امریکی مصنّفوں کو نظر انداز کر دیا ہے اور دلیل یہ دی ہے کہ ان کے ملک کی ذہنی بربادی کا سامان ان ہی کا رہین منّت ہے۔ اپنے اس عمل کے جواز میں انھوں نے مولانا صباح الدّین عبدالرحمان کی اس تحریر کا سہارا لیا اور ان سے اتفاق کیا ہے:

> "میری ذاتی رائے ہے کہ یورپی اور امریکی مصنّفوں کی کتابوں کو بالکل نظر انداز کرنے کی مہم چلائی جائے خواہ ان کی تحریر اسلام اور مسلمانوں کی حمایت میں ہی کیوں نہ ہو۔ ان کی کسی اچھی رائے کو بھی قابلِ اعتنا قرار دینے کے معنی یہ ہیں کہ ان کی مخالفانہ اور معاندانہ رائے کی اہمیت غیر شعوری طور پر بڑھ جاتی ہے۔"

میرا خیال ہے کہ اس طریق سے شروانی صاحب نے اس کتاب کا دائرہ محدود کر دیا ہے اور تاریخ کی وہ غلط فہمیاں موجود اور وہ "گل بوٹے" کھلے رہتے ہیں جو انگریزوں نے قرون وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ میں پیدا کیے تھے۔ اس کے باوجود اس بات کا اعتراف ضروری ہے کہ شروانی صاحب نے محمد بن قاسم، اورنگ زیب عالمگیر اور محمد تغلق کے بارے میں پھیلائے گئے متعصبانہ خیالات کو صاف کرنے کی اچھی کاوش کی ہے۔ ان کی دوسری خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اس بات میں میر غلام علی آزاد بلگرامی، شبلی نعمانی، سلیمان ندوی، مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی، ڈاکٹر تارا چند، پروفیسر محمد حبیب، پروفیسر خلیق احمد نظامی اور چند دوسرے روشن خیال تاریخ نگاروں کے دیدہ ورانہ کام پر بھی تبصرہ کیا ہے جنھوں نے تاریخ کو حالیہ دور کے جدید تقاضوں کے مطابق مرتّب کرنے کی کوشش کی۔

اس کتاب کے دوسرے مقالات میں مسعود بک کے بارے میں مقالہ نادر معلومات سامنے لاتا ہے۔ انھوں نے فتح پور کی ادبی، تاریخی اور سماجی اہمیت کو اُجاگر کرنے کی بھی عمدہ کاوش کی ہے۔ متعدد لائبریریوں کے مخطوطات پر سرسری نظر ڈالی گئی ہے اور بعض مخطوطات کا تفصیل سے تعارف کرایا گیا ہے۔ ذاتی زاویے سے شروانی صاحب کا وہ مقالہ خاصے کی چیز ہے جس میں انھوں نے اپنے ذہنی اور فکری انقلاب کا جائزہ خود اپنے قلم سے لیا ہے۔

الطاف حسن خان شروانی تلاشِ حق اور طلبِ صداقت میں دیوانہ وار سفر کرتے ہیں۔ تاریخ ان کا مشغلہ نہیں، جنون نظر آتا ہے لیکن وہ اس جنون سے لطافت حاصل کرتے ہیں اور سرورِ جاں اکتساب کرتے ہیں۔ ڈاکٹر تارا چند نے درست کہا ہے کہ اس پہلی تصنیف میں اس وسیع موضوع کا احاطہ ممکن نہ تھا لیکن یہ تو حرفِ اوّل ہے۔ ہمیں توقع کرنی چاہیے کہ شروانی صاحب تاریخ کے اس اہم موضوع پر مبسوط کتابیں لکھیں گے۔ یہ کتاب نصرت پبلیشرز، حیدری مارکیٹ، امین آباد لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے۔ ۱۱۲ صفحات کی اس کتاب کی قیمت صرف ۲۵/ روپے ہے۔

ہم قبیلہ...... علی جواد زیدی

علی جواد زیدی کا نام ادبی دنیا میں گزشتہ نصف صدی سے گونج رہا ہے۔ ابتدا میں وہ ترقی پسند تحریک کے ایک انقلابی شاعر کی صورت میں رونما ہوئے اور جنگ آزادی میں عملی حصہ لیا اور تحریکی سرگرمیوں کو نیا ولولہ عطا کیا۔ اردو غزل میں انھوں نے انقلاب کے رومانوی زاویے کو ابھارا اور منزل کو پالینے کے لیے جدّوجہد جاری رکھنے کی تلقین کی۔ حالیہ دور میں علی جواد زیدی ایک دیدہ ور محقّق اور بالغ نظر نقّاد کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ ڈاکٹر محمود الٰہی نے درست لکھا ہے کہ ان کے مقالوں پر دانشوری حکومت ہے اور وہ اپنے طریقۂ استدلال سے مسلّمات کا طلسم توڑ دیتے ہیں۔ ان کے فن کی یہ آخری بات ان کے خاکوں اور شخصیہ

ناموں پر بھی صادق آتی ہے۔ وضاحت کے طور پر عرض ہے کہ علی جواد زیدی نے اپنی زندگی میں متعدد شخصیات سے ملاقات کی، ان ملاقاتوں میں ان کے ذہن میں وہ آرا یقیناً موجود ہوں گی جو ان شخصیات کے بارے میں افسانوں کی طرح زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ لیکن علی جواد زیدی نے خاکہ نگاری کا فریضہ قبول کیا تو مولانا برکت اللہ بھوپالی، مولانا عبدالماجد دریاآبادی، مسعود حسن رضوی ادیب، علی عباس حسینی، جعفر علی خان اثر، رام بابو سکسینہ، ڈاکٹر ذاکر حسین، نجیب اشرف ندوی اور متعدد دوسری بڑی شخصیات کو اپنے ذاتی کیمرے کی آنکھ سے دیکھا اور ان شخصیات کا عکس اتارنے کی کوشش کی۔ ان کی زیر نظر کتاب "قبیلہ" خاکوں کی کتاب ہے لیکن یہ اس صنف کی دیگر کتابوں سے اس لیے مختلف ہے کہ علی جواد زیدی نے شخصیات کو دل میں اتار کر دیکھا اور ان کی شخصیت و کردار کے ان گوشوں کو اُجاگر کیا ہے جن پر بالعموم افسانہ نویسوں کی نظر نہیں جاتی۔ ان کی یہ خوبی بھی نمایاں ہے کہ انھوں نے شخصیت کی پہلوداری اور رنگا رنگی کو بھی نمایاں کیا ہے اور شخصیت کا عکس اُتارتے وقت علمی اور ادبی افادیت کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ ان کی بڑی خدمت یہ بھی ہے کہ انھوں نے متعدد ایسے لوگوں کی یاد تازہ کر دی ہے جنھیں نئی نسل بھولتی جا رہی ہے۔ مولانا برکت اللہ بھوپالی، شمیم کرمانی، قاضی عدیل عباسی اور نجیب اشرف ندوی کے خاکے اسی نوعیت کے ہیں۔

علی جواد زیدی خاکہ نگاری میں تاریخ کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ یعنی وہ شخصیت کے اوصاف کے ساتھ تاریخ کی شہادت بھی فراہم کرتے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس کتاب میں متعدد ایسی نئی باتیں بھی ملتی ہیں جو پہلے منظرِعام پر نہیں آئی تھیں یا اس دور کے خاص لوگوں کے سینے میں دفن تھیں۔ مثال کے طور پر مولانا عبدالماجد دریاآبادی کے خاکے میں یہ بات پہلی دفعہ معلوم ہوئی کہ "انگارے" کی مخالفت میں سجاد ظہیر کے چچا نبیر حسین قتیل بھی اپنے بھتیجے کے خلاف میدان میں اتر پڑے تھے اور پھر "انگارے" کو ضبط کرا کے ہی دم لیا تھا۔ علی عباس حسینی کے بارے میں بھی یہ بات انکشاف کا درجہ رکھتی ہے۔

> "حسینی نے بہت کچھ لکھا ہے جو ان کے نام سے شائع نہیں ہو سکا۔ اب اس کے جاننے والے بھی کم رہ گئے ہیں کہ کب کب اور کہاں کہاں ان کی تحریریں فرضی ناموں سے شائع ہوئیں۔ انھوں نے قلم سے کافی کمایا اور کمایا تو پھر بے دردی سے اڑایا بھی۔"

ان خاکوں میں علی جواد زیدی کے اندر کا نقاد اکثر باہر نکل آتا ہے اور وہ شعرا کے بارے میں اپنی رائے لکھنے سے گریز نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر سراج لکھنوی کے خاکے میں لکھتے ہیں:

> "سراج کے ہاں فکری عنصر ہلکا ہے...... اسقام شاعری سے احتراز کی ارادی کوشش کا احساس ہوتا ہے لیکن کہیں کہیں فنی احتساب کی گرفت ڈھیلی بھی ہو جاتی ہے ... سراج کا ایک مصرع ہے:
>
> "نظریے اپنے بدلنے لگے سب اہلِ خرد"
>
> اصل لفظ نظریہ ہے.... ان کا ایک یہ شعر ہے:
>
> اے چرخ کاش آگ لگے تیری چال میں
> اک روح تھی، ہر آرزوئے پائمال تھی
>
> مجھے یہاں 'کاش' حشو معلوم ہوتا ہے..."

عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ علی جواد زیدی نے "ہم قبیلہ" میں خاکہ نگاری کے اصول و ضوابط کے علاوہ اپنے فن کے حقوق

استعمال کرنے کی کاوش بھی کی ہے۔ جس سے کتاب کا فنی دائرہ تو وسیع ہو گیا ہے لیکن شخصیت قدرے دب گئی ہے۔ یہ کتاب اتر پردیش اکادمی کی ایک قابلِ قدر پیشکش ہے۔ اس کتاب میں بہت سا نیا مواد مستقبل میں حوالے کے طور پر کام آئے گا۔

"۱۹۹۱" ...... عبدالمجید خاں

عبدالمجید خاں کی انگریزی نظموں کا یہ مجموعہ جس کا عنوان "نائنٹی نائنٹی ون" (۱۹۹۱) ہے مجھے بنگلور سے موصول ہوا۔ یہ ان کی نظموں کا تیسرا مجموعہ ہے اور ان کا تعارف یہاں کرانا اس لیے ضروری ہے کہ وہ پاکستان کے ان شعرا کے لیے بھی اجنبی ہیں جو انگریزی میں شاعری کرتے ہیں میری مراد توفیق رفعت، وقاص احمد خواجہ، محمد افسر ساجد اور عالمگیر ہاشمی جیسے ادبا سے ہے۔

عبدالمجید خاں بنیادی طور پر انگریزی کے استاد ہیں۔ تیس برس تک انگریزی زبان کی درس و تدریس کے بعد ملازمت سے رضاکارانہ ریٹائرمنٹ اختیار کر لی اور بنگلور میں غالب ایجوکیشن سوسائٹی قائم کی۔ لیکن اپنے تعلیمی شوق سے الگ نہ ہو سکے۔ چنانچہ اب جی۔ ای۔ ایس پری یونیورسٹی کالج کے ساتھ متعلق ہیں۔ اب تک متعدد اصناف میں ان کی ۱۸ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ لیکن شاعری سے ان کی محبت زیادہ ہے اور اس کی داد انھوں نے پروفیسر ٹی ایف، مارشلین، وینگوپال سوراہا، لغوی نائے (امریکہ) شنکر موکاشی پونیکر، جوگندر پال، خالد عرفان اور نارائن راؤ جیسے لوگوں سے حاصل کی ہے۔

"۱۹۹۱" ان کی مٹھی بھر نظموں کی چھوٹی سی کتاب ہے جو نقادوں کے بجائے پڑھنے والوں کے لیے پیش کی گئی ہے۔ اس کتاب میں وہ نغمے شامل ہیں جو عام لوگوں کے دلوں میں تھرکتے تھرکتے لبِ نے نواز پر آجاتے ہیں۔ جوگندر پال نے درست کہا ہے کہ "یہ نظمیں پڑھ کر میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے انفاس کی تہذیب ہو رہی ہے اور میں نظموں کی داخلی موسیقی کی لہر میں شرابور ہو رہا ہوں۔" ذاتی طور پر مجھے ان نظموں میں عبدالمجید خاں کے ذاتی تجربات کی روشنی زیادہ نمایاں نظر آئی ہے۔ یہ بات کو تہہ دار بنانے کے بجائے پوشیدہ حقیقت کو عیاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک نظم میں انھوں نے اس خیال کو روشن کیا کہ کسی اجنبی شخص کے کارنامے اس کی شخصیت کے عکاس ہوتے ہیں۔ اس قول کی روشنی میں انھوں نے سقراط، نہرو، نپولین اور ہٹلر کا ذکر کیا ہے جن کی پوری عملی زندگی ان کی شخصیت کی عکاس تو ہے ہی لیکن ان کا عکس ان کے نام کے ساتھ بھی چپکا ہوا ہے اور تا ابد چپکا رہے گا اور شاید ان کے کارناموں سے کماحقہ آگہی بھی اب ان کے نام کے ساتھ ہی عیاں ہو جاتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ نظمیں صرف لطف و انبساط ہی کی مظہر نہیں بلکہ یہ قاری کی سوچ کو کروٹ بھی دیتی ہیں۔ نظموں کی یہ کتاب "سمیت پرکاش، رحامی نگر،" بنگلور سے شائع ہوئی ہے۔

جنید احمد کی آٹوگراف بک ..... جنید احمد

آٹوگراف لینا بظاہر بچوں کا مشغلہ نظر آتا ہے لیکن جب بہت سا وقت گزر جاتا ہے اور جب آٹوگراف دینے والی شخصیات ہمارے درمیان سے غائب ہو جاتی ہیں تو کسی خاص لمحے میں لکھے ہوئے چند الفاظ کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے۔ انھیں یادگار حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ جنید احمد جنھوں نے اپنی آٹوگراف بک خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ سے شائع کی ہے۔ لکھا ہے:

"نہ صرف عجائب گھر بلکہ اصحابِ ذوق بھی قدیم کتب، قیمتی پتھر، سونے چاندی کے زیور،

مصوری کے شاہکار، ڈاک ٹکٹ اور کتنی ہی چیزیں جمع کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح
آٹوگراف کاپی جو علماء، سیاستدانوں، دانشوروں، فنکاروں، دوستوں اور عزیزوں کے خیالات،
جذبات، نظریات اور تجربات کی عکاسی کرتی ہے بیش قیمت ذخیرہ ہے۔"

جنید احمد نے اپنی زندگی میں یہ بیش قیمت نوادرات جمع کیے تو ان کے ذوق وشوق کی داد انھیں ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے یوں دی:

"جنید احمد کے سوا مجھے ابھی تک ادب میں، علم میں، انسان کی جستجو میں، ایسا ڈوبا ہوا، ایسا کھویا ہوا اور کوئی نہیں ملا۔"

انھوں نے اس آٹوگراف بک میں وہ جگنو جمع کیے ہیں جو لمحہ بھر کے لیے چمکے اور پھر ان کی آٹوگراف بک میں جمع ہو گئے۔ لیکن اب انھوں نے یہ جگنو اپنی مٹھی کھول کر آزاد کر دیے ہیں۔ آیئے کچھ دیر کے لیے ہم بھی روشنی کی یہ لہریں اپنے اوپر نچھاور کر لیں اور دیکھیں کہ اکابر ادب اپنے اندر کا پیغام ہم تک کس طرح پہنچا رہے ہیں:

انھیں کے دینے سے ملتا ہے جس کو ملتا ہے
وہی نہ چاہیں تو کوشش کوئی ہزار کرے

(سید سلیمان ندوی)

زندگی کو وفا کی راہوں میں
موت خود روشنی دکھاتی ہے

(فراق گورکھپوری)

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسد
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

(نجیب اشرف ندوی)

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

(سجاد ظہیر)

مفتی کفایت اللہ کا آٹوگراف:

"انسان کا فرض ہے کہ وہ حق کے لیے پوری امکانی جدّوجہد کرے اور خدائے تعالیٰ سے توفیق کی دعا کرتا رہے۔"

سید عطاء اللہ شاہ بخاری:

"مخلوق میں جب تک خالق کا نظام نہیں چلایا جائے گا۔ دنیا میں امن نہیں ہوگا۔"

ڈاکٹر ذاکر حسین:

"اپنی شخصیت کی تکمیل کا سب سے بہتر طریقہ خدمت میں ہے۔"

ظ۔ انصاری:

"کم ظرفوں کی کم ظرفی جتانا بھی کوئی عالی ظرفی نہیں۔"

محمد حفظ الرحمان:

"دین.... خیر خواہی کا نام ہے۔"

کرشن چندر:

"انسانیت کا خدا..... سب کا خدا ہے۔"

راجندر سنگھ بیدی:

"کچھ لوگ بیج اس لیے نہیں بوتے کہ شام تک اس کا پھل نہ پا سکیں گے۔"

عصمت چغتائی:

"دنیا کبھی ختم نہ ہوگی۔"

آرزو لکھنوی:

"زندگی کے تین کام:

۱۔ زندگی کو قائم رکھنے کی کوشش، یعنی اکتساب معاش

۲۔ زندگی کو زندگی بنانا۔ فرصت کا وقت ایسے مشغلے میں گزارنا جس سے طبیعت کو خاص لگاؤ ہو۔

۳۔ ہم کہاں سے آئے ہیں اور ہمیں اب کہاں جانا ہے۔ اور اس کا کیا سامان ہونا چاہیے۔

فیض احمد فیض:

آتے آتے یونہی پل بھر کو رکی ہوگی بہار
جاتے جاتے یونہی دم بھر کو خزاں لہرائی ہے

"آٹوگراف بک" میں اربابِ عظمت کو ان کے اپنے خط تحریر میں پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اکثر مقامات پر تاریخ درج نہیں کی گئی۔ چنانچہ یہ معلوم کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ آٹوگراف کا یہ جگنو کس وقت چمکا تھا۔

گرد و پیش

(انجمن کا ایک اہم اجلاس)

[illegible] کتاب "فرہنگ اصطلاحات بینکاری" کی تقریبِ اجراء نیپا سماعت گاہ میں منعقد ہوئی [illegible] ڈاکٹر محمد یعقوب گورنر اسٹیٹ بینک حکومت پاکستان تھے۔ انجمن کے حسب روایت تقریب کی صدارت [illegible] نے فرمائی۔ ان کے ساتھ شہ نشین پر جناب آفتاب احمد خاں، جناب محمد [illegible] تھے۔

تقریب کا آغاز [illegible] کی تلاوت قرآن پاک سے ہوا۔

[illegible] انجمن ترقی اردو نے کہا آج ہم نے جس کتاب کی افادیت و اہمیت پر گفتگو کرنے کے لیے تقریب منعقد کی ہے۔ اس پر بات کرنے سے پہلے اُس شخص کو یاد کرنا ضروری ہے جو ہم میں موجود نہیں۔ وہ ذاتِ گرامی [illegible] جناب زاہد حسین کی تھی جنھوں نے "فرہنگ اصطلاحاتِ بینکاری کی ضرورت کو سب سے پہلے [illegible] مولوی عبدالحق کے سامنے رکھی۔ بابائے اردو نے اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنایا اور [illegible] کتاب ۱۹۵۱ء میں انجمن ترقی اردو پاکستان نے شائع کی۔

[illegible] حسین کی تجویز کے پیچھے یہ خیال کارفرما تھا کہ جب حکومت تحریک پاکستان کے دوران اور قیامِ پاکستان [illegible] (۱۹۴۸ء) کی روشنی میں یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ ہماری قومی اور سرکاری زبان اردو ہوگی تو [illegible] تیاری کرنی چاہیے تاکہ وقت آنے پر ہماری مملکت کے تمام شعبوں میں بتدریج اردو کو انگریزی کی جگہ دی [illegible] انجمن نے اس سلسلے میں کئی منصوبوں کا آغاز کر دیا۔

[illegible] ہوئے کہا کہ جناب محمد احمد سبزواری نے اس نوع کے کام کی ابتدا اب سے برسوں پہلے کی تھی جو بعد [illegible] کے نام سے ۱۹۴۲ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔ قیام پاکستان کے بعد جب فرہنگِ اصطلاحات بینکاری کا کام جناب زاہد حسین کے ایما پر انجمن نے شروع کیا تو اس کام پر محمد احمد سبزواری صاحب ہی کو مامور کیا گیا جو اس وقت انجمن کے [illegible] کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ [illegible] اس کی نگرانی اور نظر ثانی بابائے

اردو نے کی۔ پھر ۱۹۵۱ء میں ۱۹۶ صفحات پر مشتمل "فرہنگِ اصطلاحاتِ بینکاری" انجمن نے شائع کی واضح رہے کہ جب جناب زاہد حسین کی سربراہی میں بینک دولت پاکستان کی سالانہ رپورٹ اردو میں پیش کی گئی تو اس کا انگریزی ترجمہ بھی سبزواری صاحب ہی نے کیا تھا اور خدا کی شان دیکھیے کہ چھیالیس برس بعد گیارہ ہزار سے زیادہ الفاظ پر مشتمل اصطلاحات بینکاری کی اس گراں قدر کتاب کی تشکیل، ترجمہ اور تدوین کا کام بھی سبزواری صاحب کے ہاتھوں ہی انجام پایا۔ اللہ ان کی عمر دراز کرے۔ انھوں نے کہا کہ اصل مسئلہ سرکاری دفتروں میں نفاذ اردو کا ہے۔ اس سلسلے میں اس کتاب کے مقدمے میں انھوں نے ایک سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب "قومی یکجہتی میں اردو کا حصہ" (جس کا دوسرا ایڈیشن انجمن نے شائع کیا ہے) لائق مطالعہ ہے جس پر انھوں نے (عالی صاحب) قیام پاکستان کے بعد نفاذ اردو پر ایک تفصیلی روداد لکھتے ہوئے نفاذ کے خلاف رجحانات اور کارروائیوں کی کہانی سنائی ہے۔ انھوں نے کہا کہ نفاذ اردو صرف فروغ اردو کا مسئلہ نہیں قومی یکجہتی کا مسئلہ ہے اور صرف قومی یکجہتی ہی بقاو ترقیٔ پاکستان کی ضامن ہو سکتی ہے۔

کتاب سے متعلق گفتگو کے بعد عالی صاحب نے مہمانِ خصوصی ڈاکٹر محمد یعقوب گورنر اسٹیٹ بینک حکومت پاکستان کا تفصیلی تعارف کرایا اور اس تقریب کے مہمان خصوصی بننے کی دعوت قبول کرنے پر انھیں خوش آمدید کہا۔

عالی صاحب نے سلسلہ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ہمارے اس کام میں بینک دولت پاکستان کے تین گورنروں سرپرستی شامل ہے۔ ابتدا جناب زاہد حسین کے مخلصانہ تجویز سے ہوئی ان کے بعد سابق گورنر دولت پاکستان جناب آئی اے حنفی صاحب کی حوصلہ افزائی بھی اس کارِ خیر میں ممد و معاون ثابت ہوئی اور اب گورنر ڈاکٹر محمد یعقوب اس کتاب کی تقریبِ اجرا فرما رہے ہیں۔

آخر میں عالی صاحب نے کہا کہ جب پاکستان کی کل آبادی کو ایک قوم کی لڑی میں آج نہیں تو کل پرویا جانا ہے اور اس ناتے اس کی ایک قومی زبان بھی ہوئی ہے جس کا اعلان حضرت قائداعظمؒ پہلے ہی کر چکے ہیں اور اس کی اس حیثیت کو ۱۹۷۳ء کے آئین میں حتمی طور پر قبول بھی کر لیا گیا ہے تو کیوں نہ ہم انجمن کی یہ نئی مطبوعہ کتاب "فرہنگِ اصطلاحاتِ بینکاری" کو پاکستان کی بقا اور عظمت کی راہ میں ایک چھوٹے سے تحفے کے طور پر پیش کر دیں۔

اس موقع پر جناب محمد احمد سبزواری مؤلف "فرہنگ اصطلاحات بینکاری" نے ایک جامع مقالہ پڑھا (جو اس شمارے کی زینت ہے) اس میں انھوں نے تفصیل سے اصطلاحات سازی کے مختلف نوعیت کے کام کا ذکر کیا۔

انھوں نے اردو میں اصطلاحات سازی کے ضمن میں انجمن ترقی اردو کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ان کتب کے نام گنوائے جو انجمن نے نصف صدی سے پہلے شائع کی تھیں۔ جن میں ایک "فرہنگ اصطلاحاتِ علمیہ" (کئی جلدوں) ہے جو عمرانیات، معاشیات، تاریخ و سیاسیات کی اصطلاحات کا مجموعہ ہے۔ دوم "اصطلاحات پیشہ وراں" ہے جسے مولوی ظفر الرحمن دہلوی نے مرتب کیا ہے۔ سوم "فرہنگ اصطلاحات کیمیا" جسے قیام پاکستان کے فوراً بعد انجمن ترقی اردو پاکستان نے چھاپا ان کے علاوہ بھی انجمن کی مطبوعات میں کئی اور اصطلاحاتی کتب کے نام آتے ہیں۔

آفتاب احمد خاں (سابق وفاقی معتمد وزارت خزانہ) نے اپنی تقریر میں کہا کہ "فرہنگ اصطلاحاتِ بینکاری" کی تقریب اجرا ایک واقعی تاریخی موقع ہے۔ عالی صاحب نے بجا کہا ہے کہ قومی زبان اردو کا نفاذ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ علاوہ بریں اس کی لنگوا فرینکا اہمیت کو انگریز نے ۱۹ویں صدی میں محسوس کر لیا تھا۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ (۱۸۰۰ء) کا قیام اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ وہ اپنے انگریز افسران کو اس زبان سے باخبر رکھنا چاہتے تھے جو سارے برصغیر میں یکساں طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھی۔

انھوں نے کہا کہ جب انگریزوں نے سیاسی مصلحت کی بنا پر ایک جناتی زبان کو آگے بڑھایا تو سرسید اور دوسرے زعما نے اس کی مخالفت کی ان زعما نے صحیح قدم اٹھایا تھا ان کا کہنا تھا کہ ہماری تہذیب و ثقافت کی بقا کی ضمانت ہماری زبان ہے۔

جہاں تک اصطلاحات سازی کا تعلق ہے انجمن شروع ہی سے اس کام میں پیش پیش رہی ہے اور انجمن یہ کام آج بھی اپنی بساط بھر بے جزا و سزا کرتی جا رہی ہے۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد ملک بھر میں کئی اور ادبی و لسانی ادارے تقریباً ہر بڑے شہر میں اصطلاحات سازی میں منہمک ہیں ان کا خیال ہے کہ آنے والے دور میں جب قومی زبان کا مکمل نفاذ عمل میں آجائے گا تو وطن عزیز پاکستان کے سرکاری دفاتر اور مالیاتی و تجارتی اداروں کی ضروریات کی کفالت میں جہاں تک اصطلاحات کا تعلق ہے اردو زبان تہی داماں نہیں ہوگی۔

آفتاب احمد خاں صاحب نے اس بات پر زور دیتے ہوئے کہا کہ یہ کہنا کہ اردو میں استطاعت نہیں سرے سے درست نہیں دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں جس کا عجز کہیں نہ کہیں ظاہر نہ ہوتا ہو۔ اکملیت اور حرف آخر تو کہیں بھی نہیں ہے۔ بس منزل تک پہنچنے کے لیے لسانی سفر ہمہ دم جاری رہتا ہے۔ انھوں نے کہا "فرہنگ اصطلاحاتِ بینکاری" کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جتنی بھی اصطلاحات اس میں وضع کی گئی ہیں وہ آسان اور عام فہم ہیں۔

آفتاب احمد خاں صاحب نے کہا کہ جہاں تک قومی زبان کے نفاذ کا تعلق ہے تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ ابھی پوری طرح اس کا نفاذ نہیں ہو سکا ہے لیکن ہم ناامید نہیں ہیں تاخیر ضرور ہو گئی ہے جب ایک بار کوئی قافلہ منزل کی طرف چل پڑتا ہے تو وہ منزل پر پہنچ کر ہی دم لیتا ہے۔ انھوں نے یاد دلایا کہ وفاقی بجٹ تقریر ان کے دور معتمدی (۱۹۷۸ء) سے اردو میں ہونے لگی ہے۔

انجمن ترقی اردو کی جانب سے "فرہنگ اصطلاحاتِ بینکاری" کے مدوّن و مترجم جناب محمد احمد سبزواری کو ان کی طویل علمی خدمات کے صلے میں گورنر اسٹیٹ بینک آف پاکستان عزت مآب ڈاکٹر محمد یعقوب نے "نشانِ سپاس" پیش کیا۔

اس کے بعد تقریب کے مہمان خصوصی عزت مآب ڈاکٹر محمد یعقوب نے حاضرین سے خطاب کیا انھوں نے اپنے خطبے میں کہا "میں آپ حضرات کا بے حد شکر گزار ہوں کہ اہل علم اور دانشوروں کی اس محفل میں آپ نے مجھے دعوت دے کر میری عزت افزائی فرمائی۔ ہم بینکاروں کا زیادہ تر حساب کتاب سے تعلق رہتا ہے۔ آپ نے سوچا ہوگا کہ مجھے مجبور کریں کہ میں ایک شام حساب کو چھوڑ کر صرف کتاب کے لیے وقف کروں۔ مگر آپ لوگ شاید یہ بھول گئے کہ یہ کتاب بھی ہمارے حساب کتاب سے تعلق رکھتی ہے لہٰذا یہ شام بھی میرے لیے منافع بخش ثابت ہوگی۔"

ڈاکٹر محمد یعقوب نے "فرہنگ اصطلاحاتِ بینکاری" کی اہمیت کے بارے میں کہا کہ اس کتاب کی اہمیت و افادیت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اس کا تعلق ایسے شعبے سے ہے جو جدید دنیا میں ریڑھ کی ہڈی کی سی اہمیت اختیار کر گیا ہے بلکہ یہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا کہ بینکاری کے بغیر ہم اپنی روزمرہ زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

ڈاکٹر محمد یعقوب صاحب نے اپنے خطبے میں آگے چل کر کہا کہ میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ انجمن ترقی اردو کے اس عظیم منصوبے کی بہت افادیت ہے حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان کی تاریخ میں بینکاری کی اصطلاحات کی یہ ڈکشنری ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ملک کے تمام بینک اور مالیاتی اداروں کو مشورہ دیا کہ وہ اس مفید اور معلومات افزا کتاب سے استفادہ کریں آخر میں جناب گورنر بینک دولت پاکستان نے صدر اور معتمد اعزازی انجمن کو اس مفید کتاب کے شائع کرنے پر مبارکباد پیش کی اور اس اتفاق کو دلچسپ کہا کہ پاکستان میں اصطلاحات بینکاری کی پہلی فرہنگ بھی سبزواری صاحب نے مرتب کی اب دوسری بھی انھیں کی محنت کا نتیجہ ہے۔ خدا کرے کہ فرہنگ کا تیسرا ایڈیشن بھی سبزواری صاحب ہی کے ہاتھوں ترتیب پائے۔

آخر میں صدر جلسہ جناب نورالحسن جعفری نے کہا کہ ہمارے سامنے کتاب کی لکاسی کا مسئلہ کافی زیادہ اہم ہے مگر دراصل اہمیت اس بات کی ہے کہ "فرہنگ اصطلاحات بینکاری" کی صورت میں اتنی اہم مہم تیز تر ہو گئی جو بہ قول گورنر اسٹیٹ بینک جناب ڈاکٹر محمد یعقوب ایک سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ ہم انجمن کی طرف سے ڈاکٹر محمد یعقوب کی انجمن کی اس تقریب میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے آمد پر تہہ دل سے شکر گزار ہیں۔ اس موقع پر سابق گورنر اسٹیٹ بینک آف پاکستان جناب آئی اے حنفی صاحب بھی شکر گزاری کے مستحق ہیں جن کی اس مفید کام میں تائید و تحریک ہمیشہ شامل حال رہی۔

آرٹس کونسل آف پاکستان کے زیر اہتمام مجلس مذاکرہ

۸ دسمبر ۱۹۹۳ء کو پریس پبلی کیشنز کمیٹی آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی کی جانب سے ایک مجلس مذاکرہ آرٹس کونسل آڈیٹوریم میں منعقد کی گئی۔ مذاکرے کا موضوع "کیا ریڈیو پاکستان اپنی افادیت کھو چکا ہے" تھا۔ مذاکرے کی صدارت جناب جمیل الدّین عالی معتمد اعزازی انجمن ترقی اردو پاکستان نے فرمائی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے پیپلز پارٹی کے ڈپٹی سیکریٹری جنرل جناب این ڈی خان مدعو تھے۔ مذاکرے میں اس امر پر اتفاق کیا گیا کہ ریڈیو کی اہمیت و افادیت برقرار ہے تاہم ریڈیو پاکستان کی کارکردگی بہ وجوہ متاثر ہوئی ہے۔ جسے حکومت اپنے مثبت اور تعمیری اقدامات کے ذریعے بہتر بنا سکتی ہے۔

پروفیسر این ڈی خان نے ریڈیو پاکستان کی کارکردگی متاثر ہونے کے اسباب میں فنڈز کی کمی، آلات و عمارات کی خستہ حالی اور ابلاغ کے جدید ذریعہ ٹی وی سے اس کے مقابلے کو بتایا۔ ساتھ ہی انھوں نے یقین دلایا کہ جلد ہی ریڈیو پاکستان کے ڈھانچے میں تبدیلی لائی جائے گی اور اسے جدید آلات سے آراستہ کیا جائے گا تاکہ اس ادارہ میں جو کمی محسوس کی جا رہی ہے اس کا ازالہ ہو جائے۔

مذاکرے کے صدر جناب جمیل الدّین عالی نے اس بات کا اظہار تاسف سے کیا کہ ریڈیو کو بہتر ڈائریکٹر جنرل نہیں مل سکے ورنہ دنیا میں آج بھی انفارمیشن ہی سے بڑی بڑی جنگیں لڑی جا رہی ہیں اور ریڈیو موثر ہتھیار کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا ابلاغ عامہ کے اس ادارہ میں پہلے سے بھی زیادہ ترقی کی ضرورت ہے۔

اس سے پہلے سابق ڈائریکٹر پروگرام ریڈیو پاکستان جناب ایف کلیم اللہ نے تجویز پیش کی کہ الیکٹرانک میڈیا کمیشن قائم کر کے اس شعبے کو بہتر بنانے کی تدابیر عمل میں لائی جانی چاہئیں۔

ادارہ تحفظ ماحولیات کی ڈائریکٹر جنرل محترمہ مہتاب راشدی نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ریڈیو کا اعتماد بحال کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا جمہوریت کے نئے دور میں بھی اب تک کوئی پالیسی ریڈیو کے سلسلے میں نہیں آئی ہے۔ اس سے پہلے بھی حکومتیں بدلتی رہی ہیں لیکن ریڈیو کا نظام وہیں کا وہیں رہا۔ اب اگر موسم بدلا ہے تو اس کا احساس بھی ہونا چاہیے۔

ان مقررین کے علاوہ مذاکرے سے محترمہ ممتاز راشدی، محترمہ قدسیہ اکبر، جناب احمد ہمدانی، جناب شمس الدّین بٹ، جناب تاج حیدر، جناب حسن عسکری فاطمی اور محترمہ ارم وارث نے خطاب کیا۔

اردو کو سرکاری زبان قرار دے کر ذریعہ تعلیم بنایا جائے

سندھی لینگویج اتھارٹی کے چیئرمین اور سابق صوبائی وزیر تعلیم ڈاکٹر این اے بلوچ نے کہا ہے کہ اردو کو سرکاری زبان قرار دے کر اسے ذریعہ تعلیم بنایا جائے فیضی رحمین آرٹ گیلری میں ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر این اے بلوچ نے کہا کہ اردو کے بغیر بین الصوبائی روابط قائم نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے قومی زبان اردو کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ چھ سو سندھی شعرا ایسے ہیں جنھوں نے اردو میں بھی شعر کہے ہیں۔

عابد علی خاں کو "مخدوم ایوارڈ"

روزنامہ "سیاست" حیدرآباد (دکن) کے بانی مدیر عابد علی خاں مرحوم کی صحافتی خدمات کے پیشِ نظر "مخدوم ایوارڈ" برائے صحافت ۱۹۹۲ء کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ یہ ایوارڈ ۱۵ ہزار روپے اور ایک توصیفی سند پر مشتمل ہے یہ فیصلہ اکادمی کی مجلس عاملہ نے کیا ہے۔

ماجد الباقری کو بہترین شاعر کا ایوارڈ

پاکستان کے معروف جدید شاعر جناب ماجد الباقری کو خیابانِ ادب گوجرانوالہ اور ڈاکٹر لٹریری سرکل کی طرف سے مشترکہ طور پر ۱۹۹۲ء، ۱۹۹۳ء کے بہترین شاعر ہونے کا ایوارڈ دیا گیا ہے۔ تقریب کا اہتمام ایک مقامی ہال میں کیا گیا۔

تقریب کی صدارت معروف دانشور بابو جاوید احمد نے کی جب کہ مہمان خصوصی ایس ایس پی گوجرانوالہ ملک محمد اقبال تھے۔ سرکل کے چیئرمین ڈاکٹر سعید اقبال سعدی نے مہمانوں کا استقبال کیا۔

ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی انتقال کر گئے

اردو و فارسی کے ممتاز ادیب، محقق اور ماہر لسانیات پروفیسر ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی ۳ نومبر ۱۹۹۳ء صبح نو بجے اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وفات کے وقت آپ کی عمر ۷۲ سال تھی۔

مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین ڈاکٹر جمیل جالبی کی صدارت میں ادارے کے افسران و عملے کا ایک تعزیتی اجلاس منعقد ہوا جس میں اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی نے کہا کہ ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی انتہائی شریف النفس انسان تھے۔ انھوں نے پوری عمر تعلیم و تدریس اور تحقیق میں گزاری۔ مولانا ظفر علی خاں پر وہ ایک سند کی حیثیت رکھتے تھے۔ جب کہ "غالب تاریخ کے آئینے میں"، "انقلاب ایران بیسویں صدی میں"، "سچوں کی باتیں"، "مولانا ظفر علی خاں بحیثیت صحافی"، "مولانا ظفر علی خاں بحیثیت شاعر"، "مولانا ظفر علی خاں شخصیت و کردار"، "شخصیات و مباحث"، "حضرت اویس قرنی (ترجمہ)"، "تذکرہ سہوان"، اور "چند یادگار خطوط" کے عنوانات سے شائع ہونے والی ان کی کتابیں علمی و ادبی مقام و مرتبے کی حامل ہیں۔ ان کی وفات سے علمی و ادبی دنیا میں جو خلا پیدا ہوا ہے وہ کبھی پُر نہ ہو سکے گا۔

پروفیسر ڈاکٹر سید نظیر حسنین زیدی ۱۹۲۲ء میں مشرقی پنجاب کے ضلع کرنال کی مشہور بستی برست میں متولد ہوئے۔ ۱۹۵۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا اور دین محمد چانسلر گولڈ میڈل حاصل کیا۔ ۱۹۵۸ء میں کراچی یونیورسٹی میں فارسی میں فرسٹ ڈویژن میں پوزیشن حاصل کرتے ہوئے ایم اے کیا اور پھر بی ٹی کی ڈگری لی اردو میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں اور پروفیسر حبیب اللہ غضنفر نے رہنمائی کی اور فارسی ادب کے لیے پروفیسر ڈاکٹر غلام سرور صاحب سے تعلق رہا۔

۱۹۵۸ء میں مغربی پاکستان پبلک سروس کمیشن کے ذریعے منتخب ہوئے اور سندھ کے تقریباً تمام کالجوں میں خدمات انجام دیتے ہوئے ۱۹۸۳ء میں پیپلز سائنس کالج کراچی سے ریٹائر ہوئے۔ ۱۹۷۰ء میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں اور ڈاکٹر وحید قریشی کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کرنے کا اعزاز پایا۔ موضوع تھا "مولانا ظفر علی خاں بحیثیت شاعر و صحافی۔"

اجلاس کے آخر میں مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کی گئی اور دعا کی گئی کہ اللہ تعالیٰ پسماندگان کو صبر جمیل سے نوازے۔

معین الدین شاہ کے اعزاز میں تقریب

برصغیر کے ممتاز شاعر صبا اکبرآبادی کی یاد میں قائم کی جانے والی ادبی انجمن صبا اکبرآبادی اکیڈمی کے زیر اہتمام انگلستان

ے آنے والے شاعر سیّد معین الدّین شاہ کے اعزاز میں شعری نشست کا اہتمام کیا گیا اس شعری محفل کی صدارت بزرگ شاعر تابش دہلوی نے کی سیّد معین الدّین شاہ نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ اردو کا مستقبل صرف برطانیہ اور ہندوستان ہی میں نہیں اعتبار سے بہتر نظر نہیں آتا بلکہ پاکستان میں بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ اردو کے نفاذ کے لیے مخلصانہ اور بھرپور کوشش نہ جائے نئی نسل اپنے ادب سے ہی نہیں بلکہ اپنی زبان سے بھی دور ہوتی جارہی ہے۔ زبان اور ادب سے تعلق برقرار رکھنے میں الیکٹرونک میڈیا بھی اپنا کردار ادا کرسکتا ہے۔

گفتگو کے بعد شعر و سخن کی محفل شروع ہوئی جن شعرائے کرام نے اپنا کلام سنایا ان میں تابش دہلوی، سیّد معین الدّین شاہ، رضی اختر شوق، حنیف اسعدی، دلاور فگار، حسین انجم، پروفیسر نصیر الدّین، پروفیسر افتخار اجمل شاہین، طارق سبزواری، صفدر صدیق رضی اور تاجدار عادل کے نام شامل ہیں۔

اس محفلِ شعر و سخن میں باذوق سامعین کی تعداد بھی خاصی تھی۔

(رپورٹ سیّد جاوید رضا)

شہداد پور میں اردو سندھی مشاعرہ

المشرق آرٹ اکیڈمی شہداد پور کے زیر اہتمام ایک آل سندھ سندھی اردو مشاعرہ کا انعقاد ہوا صدر معروف علمی شخصیت پروفیسر گل محمد گلانی اشک پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج شہداد پور تھے جب کہ مہمانِ خصوصی شہداد پور کے علم دوست اور ادب نواز اسسٹنٹ کمشنر ایس ڈی ایم شہداد پور ڈاکٹر عبدالرحیم سومرو، تمثیل جاوید عبدالحمید شہید اور منظور اعظمی تھے۔

نظامت کے فرائض نوابشاہ سے آئے ہوئے مہمان شاعر اظہار قریشی نے انجام دیے تلاوتِ کلامِ پاک کا شرف فاضل حمیدی نے حاصل کیا۔

جن شعرائے کرام نے اپنا کلام پیش کیا ان میں راقم الحروف ڈاکٹر رحمان دانش، منظور اعظمی، تمثیل جاوید، عبدالحمید شہید، کیف اکبرآبادی، خیر محمد انجم، ڈاکٹر پروفیسر فدا انصاری، خلیق آذر، صفدر گمنوری، نگہت زیبا، عبدالجبار، شیخ استاد ظفر بخاری، سرور حسین آزاد، اطہر جعفری، اظہار قریشی، حبیب سنگھانوی، ندیم احمد ندیم، فاروق صادق، مسرور جاوید، آزاد وارثی، سیف شہداد پوری، فاضل حمیدی اور صدر مشاعرہ اشک گلانی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

(رپورٹ رحمان دانش)

وجد چغتائی رحلت کر گئے

۲۶ نومبر ۱۹۹۳ء کو مرزا محمد ایوب وجد چغتائی کا حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے انتقال ہوگیا مرحوم اردو کے ایک معروف شاعر تھے۔ ان کا ایک شعری مجموعہ "شکست قیمت دل" کئی برس پہلے شائع ہو کر مقبول ہوچکا ہے وجد صاحب فن موسیقی سے بھی گہرا شغف رکھتے تھے اس موضوع پر ان کے مضامین اکثر رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ ریڈیو پاکستان کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد کچھ عرصے انجمن ترقی اردو پاکستان میں "قاموس الکتب" کے کام سے منسلک رہے۔

انجمن میں مرحوم کے ایصال ثواب اور ان کے پسماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعائیں کی گئیں اس موقع پر جناب مختار اجمیری نے ایک قطعہ تاریخ کہا۔

ایوب جس کا نام تخلص تھا جس کا وجد
دنیا بھی اس کی، دین بھی اس کا، بہشت بھی
مختار فکر تھی کہ یہ تاریخ نے کہا
چغتائی بھی ہے اور وہ "غالب سرشت" بھی

۱۴۱۴ھ ۱۹۹۳ء

معروف شاعر احسن احمد اشک کی رحلت

۱۷ دسمبر ۱۹۹۳ء کو بنگلہ دیش کے معروف اردو شاعر احسن احمد اشک کا ڈھاکے میں حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت اُن کی عمر ۷۹ سال تھی وہ رائٹرس گلڈ پاکستان کے بانیوں میں تھے۔ اُن کا شعری مجموعہ "جاگتے ہیرے" کے نام سے اب سے بہت پہلے پاکستان رائٹرس گلڈ کی جانب سے چھپا تھا۔ اُن کا شمار اردو کے اچھے شاعروں میں ہوتا تھا۔ شعر و شاعری کا آغاز کلکتہ کے مشاعروں سے ہوا۔ ایک عرصہ تک کالج میں درس و تدریس سے تعلق رہا۔ بعد ازاں وہ بنگلہ اخبار "دینک پاکستان" کی انتظامیہ کے سربراہ رہے۔

مرحوم نے اپنے پسماندگان میں ایک بیوہ اور دو بیٹے چھوڑے ہیں۔

ادارہ "قومی زبان" مرحوم کی مغفرت اور اُن کے پسماندگان کے صبر جمیل کے لیے بارگاہِ خداوندی میں دعا گو ہے۔

نئے خزانے

ڈاکٹر وفا راشدی

مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت جنوری تا جون ۱۹۹۳ء کے رسائل جرائد کے مندرجات کا موضوع وار اشاریہ۔

معارف قرآن
علوم اسلامیہ
مطالعہ پاکستان
مطالعہ سائنس
فکر، فلسفہ، حکمت
تاریخ، تہذیب، ثقافت
تاریخ فن وادب
علمی، ادبی، سوانح و تذکرے
فارسی زبان وادب
اردو زبان وادب
زبان مسائل و مباحث
ادب مسائل و مباحث
لسانیات
تحقیق و تنقید
ترجمہ فن ترجمہ
خود نوشت
سفر نامہ
خطوط
ملاقات

شخصیات
شاہ ولی اللہ محدث دہلوی
غالبیات
سر سیّد اور علی گڑھ تحریک
اقبالیات
مولانا محمد علی جوہر
مولانا حسرت موہانی
مولانا ابوالکلام آزاد
بابائے اردو مولوی عبدالحق
سیّد الطاف علی بریلوی
جوش ملیح آبادی
علامہ جمیل مظہری
اختر حسین رائے پوری
پروفیسر احتشام حسین
اسرار الحق مجاز
فیض احمد فیض
ڈاکٹر وزیر آغا
سیّد ضمیر جعفری
غلام ربانی تاباں

مانی جائسی
سجاد حیدر
پرتو روہیلا
انجم نیازی
دیگر علمی ادبی تعلیمی شخصیات
تعلیم و تدریس مسائل و مباحث
علمی ادبی تعلیمی ثقافتی ادارے اور تحریکیں
کلکتہ ایک دبستان
ارتقاء سیمینار
سیاست صحافت امور مملکت
موسیقی، مصوری خطاطی دیگر فنون
مخطوطات و نوادرات
مطالعہ کتب

جنوری تا جون ۱۹۹۳ء کے رسائل و جرائد کا موضوع وار اشاریہ ترتیب حسبِ ذیل ہے۔

مجلہ ارتقاء، کراچی ۱۰/۹۳ء
مجلہ اقبالیات، لاہور جولائی ستمبر ۹۱ء
مجلہ الشاہ، حیدر آباد سندھ ۲/۹۳ء
مجلہ خدا بخش لائبریری جنرل پٹنہ ۶۹۔ ۷۴/۹۲ء
سہ ماہی ادبیات، اسلام آباد ۲۲/۹۳ء
سہ ماہی اردو، کراچی جنوری مارچ ۹۲ء
سہ ماہی اقبال، لاہور جنوری ۹۳ء۔ اپریل ۹۳ء
سہ ماہی العلم، کراچی سید الطاف حسین بریلوی نمبر اکتوبر دسمبر ۹۲ء جنوری مارچ ۹۲ء اپریل جون ۹۳ء
سہ ماہی دانش، اسلام آباد ۳۲/۹۳ء
سہ ماہی روحِ ادب، کلکتہ جولائی ستمبر ۹۲ء۔ اکتوبر ۹۲ ک مارچ ۹۳ء
سہ ماہی فنون، لاہور ستمبر دسمبر ۹۲ء جنوری اپریل ۹۳ء
سہ ماہی مفیض، گوجرانوالہ مارچ جون ۹۳ء
ماہنامہ آگہی، کراچی جنوری فروری ۹۳ء سالنامہ مارچ اپریل ۹۳ء مئی ۹۳ء جون ۹۳ء
ماہنامہ اخبار اردو، اسلام آباد جنوری ۹۳ء فروری ۹۲ء فروری ۹۳ء مارچ ۹۳ء جون ۹۳ء
ماہنامہ ادب لطیف، لاہور جنوری ۹۳ء، مارچ ۹۳ء اپریل ۹۳ء مئی ۹۳ء
ماہنامہ اردو نامہ، لاہور جنوری، فروری، مارچ، اپریل، جون ۹۳ء
ماہنامہ افکار، کراچی جنوری، فروری، مارچ، اپریل، مئی، جون ۹۳ء
ماہنامہ المعارف، لاہور جنوری ۹۳ء مئی جون، ۹۳ء
ماہنامہ الولی، حیدر آباد سندھ جنوری، فروری، مارچ، اپریل، مئی، جون ۹۳ء
ماہنامہ الشعاب ملتان مئی جون ۹۳ء
ماہنامہ اوراق، لاہور خاص نمبر مئی جون ۹۳ء
ماہنامہ تخلیق لاہور اپریل ۹۳ء
ماہنامہ ترجمان القرآن، لاہور فروری، مارچ ۹۳ء
ماہنامہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ جنوری، فروری، مارچ، اپریل، مئی، جون ۹۳ء
ماہنامہ تہذیب الاخلاق، لاہور جنوری، مارچ، مئی، جون ۹۳ء
ماہنامہ سائنس میگزین، کراچی جنوری، فروری، مارچ، اپریل، مئی، جون ۹۳ء
ماہنامہ سب رس کراچی، جنوری، فروری، مارچ، اپریل، مئی، جون ۹۳ء
ماہنامہ شام و سحر، لاہور جنوری ۹۳ء
ماہنامہ صریر، کراچی جنوری، فروری، مارچ، اپریل، مئی ۹۳ء
ماہنامہ طلوع افکار، کراچی جنوری، فروری، مارچ، اپریل، مئی، جون ۹۳ء

ماہنامہ قومی زبان، کراچی، جنوری، فروری، مارچ، اپریل، مئی، جون ۹۳ء

ماہنامہ ماہ نو لاہور جنوری، فروری، مارچ، اپریل، مئی، جون ۹۳ء

ماہنامہ محفل، لاہور جنوری، فروری، اپریل، جون ۹۳ء

ماہنامہ نگار پاکستان، کراچی جنوری، فروری، مارچ، اپریل، مئی، جون ۹۳ء

ہفت روزہ ہماری زبان، نئی دہلی ۲۲ جون ۹۳ء

معارفِ قرآن

خرم مراد	فہم قرآن تفاسیر کی روشنی میں	ترجمان القرآن، لاہور فروری ۹۳ء ص ۱۹
ذوالفقار علی ملک، ڈاکٹر	محفل ترتیل و حُسنِ قرأت	اردو نامہ، لاہور جنوری ۹۳ء ص ۱۱
سرور اکبر آبادی، ڈاکٹر	قرآن مجید ایک معجزہ	آگہی، کراچی جنوری ۹۳ء ص ۳۹
نعیم الدّین اصلاحی	قرآن کی بعض صفات قسط نمبر (۱)	ترجما القرآن، فروری ۹۳ء ص ۳۲
نعیم الدّین اصلاحی	قرآن کی بعض صفات قسط نمبر (۲)	ترجمان القرآن، لاہور مارچ ۹۳ء ص ۱۹
وقار اشدی، ڈاکٹر	برصغیر میں قرآن حکیم کا پہلا مکمل فارسی ترجمہ	الولی، حیدرآباد سندھ جنوری ۹۳ء ص ۵

علومِ اسلامیہ

اعجاز انجم لطیفی	علم دین کی فضیلت و اہلیت	العلم، کراچی اپریل جون ۹۳ء ص ۷۲
الغزالی	امر بالمعروف و نہی عن المنکر محتسب کی صفات و آداب	ترجمان القرآن، لاہور مارچ ۹۳ء ص ۳۹
امام ابوالفراج ابن جوزیؒ	حضرت عمر فاروقؓ کی عدالت	الولی، حیدرآباد سندھ فروری مارچ ۹۳ء ص ۵
توکل حسین قدوائی	پیکرِ رحمت ﷺ	آگہی، کراچی جنوری فروری ۹۳ء ص ۴۷
جاوید انور عظیمی	حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی تحریک اصلاح و احیائے دین	صحیفہ، لاہور ستمبر ۹۲ء ص ۴۵
ذوالفقار علی ملک، ڈاکٹر	سیرت کا پیغام	اردو نامہ، لاہور مارچ ۹۳ء ص ۱۱
رشید احمد خاں، ڈاکٹر	سنت اور مستشرقین	اردو نامہ، لاہور فروری ۹۳ء ص ۱۰
ریاض الاسلام، پروفیسر	صوفیانہ ادب کے لیے ایک منہاج تحقیق کی ضرورت	خدا بخش جرنل ۶۹، ۷۴/۹۲ء ص ۳۶۸
ریاض الاسلام، پروفیسر	صوفیانہ ادب کے لیے ایک منہاج تحقیق کی ضرورت	المعارف، لاہور مئی جون ۹۳ء ص ۱۳
شیخ نذیر حسین	حافظ ابوالعلا ہمدانی نامور محدث اور صوفی	المعارف، لاہور جنوری ۹۳ء ص ۲۳
عبدالستار انصاری	امام ابوالحسن الاشعری کا دینی فلسفہ	الولی، حیدرآباد سندھ اپریل مئی ۹۳ء ص ۲۰
عبدالستار انصاری	امام ابوالحسن الاشعری کا دینی فلسفہ	الولی، حیدرآباد سندھ جون ۹۳ء ص ۱۵
غلام رسول خاں، ڈاکٹر	شیخ یعقوب کے صرفی [۱] کشمیری کا.....	دانش، اسلام آباد ۳۲/۹۳ء ص ۲۱۱
غلام مصطفےٰ قاسمی علامہ	مناقبِ جمیلہ صدیقی اکبرؓ	الولی، حیدرآباد سندھ جنوری ۹۳ء ص ۲
کلیم اختر	فکرِ شاہ ولی اللہ کے شارح، پروفیسر محمد سرور مرحوم	المعارف لاہور جنوری ۹۳ء ص ۵۸
کلیم اللہ ساریو، ڈاکٹر	شاہ ولی اللہ کے سیاسی معاشی اور معاشرتی.....	الولی، حیدرآباد سندھ فروری مارچ ۹۳ء ص ۹
محفوظ علی، پروفیسر	سیرت نگار مصباح الدّین شکیل قسط نمبر (۲)	آگہی، کراچی جون ۹۳ء ص ۱۱۷
مرزا نظام الدّین حسام	اسرار اسراء کا تجزیاتی مطالعہ قرآن و حدیث کی روشنی میں	الولی، حیدرآباد سندھ جنوری ۹۳ء ص ۲۹
نور احمد شاہ تاز	علامہ محمد ابوزہرہ مصری جدید سیرت نگار	آگہی، کراچی جنوری فروری ۹۳ء ص ۶۵

[۱] ۹۲۴ھ – ۱۰۰۳ھ – عالم دین، فاضلِ اکمل، فقیہ، خطیب المحدث، ولی کامل، شاعر و ادیب تھے۔ ان کے ایران و وسط ایشیا کا علمی سفر تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔

مطالعۂ پاکستان

مصنف	عنوان	ماخذ
الطاف حسین	دو قومی نظریہ	اردو نامہ، لاہور فروری ۹۳ء ص ۳۳
الطاف علی	۲۳ مارچ	اردو نامہ، لاہور مارچ ۹۳ء ص ۳۴
خالد پرویز ملک	سید حسین امام	العلم، کراچی اپریل جون ۹۳ء ص ۲۲
خواجہ عبدالحیٔ فاروقی	ریشمی خطوط	الولی، حیدرآباد سندھ جون ۹۳ء ص ۳۷
سید مصطفےٰ علی بریلوی	قائداعظم اور نظام تعلیم	العلم، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۴۸
سیف اللہ خالد	۱۴ اگست یوم تجدید عہد	اردو نامہ، لاہور جنوری ۹۳ء ص ۲۸
غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر	۲۳ مارچ، تجدید عہد کا دن	ماہِ نو لاہور مارچ ۹۳ء ص ۱۴
فاروق قریشی	جلیانوالہ باغ امرتسر......	الولی، حیدرآباد سندھ فروری مارچ ۹۳ء ص ۱۹
قاضی عبدالغفار	قیام پاکستان کی عظیم داستان	ماہ نو لاہور مارچ ۹۳ء ص ۱۹
محمد فاروق قریشی	جلیانوالہ باغ (امرتسر).....	الولی، حیدرآباد سندھ جنوری ۹۳ء ص ۲۱
منیر احمد صدیقی عثمانیہ	جب قائداعظم، اقبال اور سر علی امام	تہذیب الاخلاق، لاہور جون ۹۳ء ص ۱۱
وفار اشدی، ڈاکٹر	تواریخ ملت اسلامیہ کا ایک سنہرا باب (پہلی قسط)	اردو نامہ، لاہور جنوری ۹۳ء ص ۱۸
وفار اشدی، ڈاکٹر	تواریخ ملت اسلامیہ.... (دوسری اور آخری قسط)	اردو نامہ، لاہور فروری ۹۳ء ص ۲۶
وفار اشدی، ڈاکٹر	تاریخ پاکستان اور اہل سندھ	الولی، حیدرآباد سندھ اپریل مئی ۹۳ء ص ۲۹

مطالعہ سائنس

مصنف	عنوان	ماخذ
اسٹیفن ہاکنگ ترجمہ: ڈاکٹر انیس عالم	اصول غیر یقینی	ارتقاء، کراچی ۱۰/۹۳ء ص ۱۱۷
اسلم پرویز	خون بیش قیمت ہے	تہذیب الاخلاق، علیگڑھ اپریل ۹۳ء ص ۳۹
باسط حسن	پاکستان میں سائنس کا مستقبل	سائنس میگزین، کراچی مارچ اپریل ۹۳ء ص ۵۶
بشارت کاظمی	پرسنل کمپیوٹر	سائنس میگزین، کراچی جنوری فروری ۹۳ء ص ۱۵۰
بیگم امتیاز احمد شامی	ڈاکٹر قدیر اور کہوٹہ	سائنس میگزین، کراچی مارچ اپریل ۹۳ء ص ۱۴۲
بیگم امتیاز احمد شامی	سائنس میوزیم لاہور	سائنس میگزین، کراچی مئی جون ۹۳ء ص ۱۱۸
تسلیم اشرف	ایٹمی عدم پھیلاؤ	سائنس میگزین، کراچی مئی جون ۹۳ء ص ۱۶۵
تفسیر احمد	زہرہ، فلکیات	سائنس میگزین، کراچی مئی جون ۹۳ء ص ۳۷
ثمینہ امیر	سائنس اور ادب	سائنس میگزین، کراچی جنوری فروری ۹۳ء ص ۱۰۳
ثمینہ امیر	حکمت و دانش اور سائنسی تفکر کا فرق	سائنس میگزین، کراچی مارچ اپریل ۹۳ء ص ۲۶
جگجیت سنگھ	جلاوطن نوبل انعام یافتہ سائنس داں عبدالسلام	سائنس میگزین، کراچی مارچ اپریل ۹۳ء ص ۸۲
رضوان علی	کمپیوٹر	سائنس میگزین، کراچی مئی جون ۹۳ء ص ۱۷۴
سعید اختر درانی، ڈاکٹر	مذہب اور سائنس	سائنس میگزین، کراچی مئی جون ۹۳ء ص ۱۹
سعید الظفر چغتائی	ممتاز سائنس داں پروفیسر بنگٹ اولین	تہذیب الاخلاق، علیگڑھ جون ۹۳ء ص ۱۵
سلطان رفیع	سائنس اور مذہب	تہذیب الاخلاق، علیگڑھ مئی ۹۳ء ص ۳۴
سہیل یوسف	ماحول سدھار میں شہریوں کا کردار	سائنس میگزین، کراچی جنوری فروری ۹۳ء ص ۹۳
ترجمہ: سید قاسم محمود	اسٹیفن ہاکنگ عظیم طبیعیات داں	مطالعہ سائنس، کراچی جنوری فروری ۹۳ء ص ۴۱

سیّد قاسم محمود	معرکہ مذہب و سائنس	سائنس میگزین، کراچی جنوری فروری ۹۳ء ص ۵۶
سیّد قاسم محمود	رفعت کا عمل سائنسی نقطۂ نگاہ سے	سائنس میگزین، کراچی مارچ اپریل ۹۳ء ص ۲۸
سیّد قاسم محمود	معرکہ مذہب و سائنس	سائنس میگزین، کراچی مارچ اپریل ۹۳ء ص ۷۳
سیّد قاسم محمود	ستارے اور کہکشاں	سائنس میگزین، کراچی مئی جون ۹۳ء ص ۶۴
سیّد قاسم محمود	معرکہ مذہب و سائنس	سائنس میگزین، کراچی مئی جون ۹۳ء ص ۱۳۴
سیّد کاظم رضا	آئن اسٹائن	سائنس میگزین، کراچی مارچ اپریل ۹۳ء ص ۹۸
شاہد نواز آفریدی	سائنس کی افادیت	سائنس میگزین، کراچی مئی جون ۹۳ء ص ۴۴
شکیل عباس رونی	شخصیت پر روشنی کے اثرات	سائنس میگزین، کراچی مئی جون ۹۳ء ص ۵۳
ظفر الدّین احمد	اسلامی نفاذ اور پاکستان	تہذیب الاخلاق، لاہور مارچ ۹۳ء ص ۱۴
عاصم محمود	سائنس کی پیش رفت ۱۹۹۲ء	سائنس میگزین، کراچی جنوری فروری ۹۳ء ص ۳۸
عبد الباری	بنیادی فزکس میں مسلم سائنسدانوں کی خدمات	تہذیب الاخلاق، علیگڑھ مارچ ۹۳ء ص ۲۳
عبد الباری	ابو علی حسن ابن الہیثم علمِ بصارت کے بانی	تہذیب الاخلاق، علیگڑھ جون ۹۳ء ص ۳۱
عبد الحکیم خاں	زمین کا جھکاؤ	سائنس میگزین، کراچی مارچ اپریل ۹۳ء ص ۱۶۵
عبد السلام، ڈاکٹر ترجمہ: منیر الدّین احمد	کتالونیا بین الاقوامی انعام	ارتقاء، کراچی ۱۰/۹۳ء ص ۱۰۰
عظیم قدوائی ترجمہ: عاصم محمود	نوبل انعام یافتہ سائنس داں ڈاکٹر رابرٹ ہوبر.....	سائنس میگزین، کراچی جنوری فروری ۹۳ء ص ۸۱
مائیکل رائٹ جان گرین	اسٹیفن ہاکنگ ماہر طبیعیات قسط نمبر (۱)	سائنس میگزین، کراچی مارچ اپریل ۹۳ء ص ۴۲
مائیکل رائٹ جان گرین	اسٹیفن ہاکنگ ماہر الطبیعیات قسط نمبر (۲)	سائنس میگزین، کراچی مئی جون ۹۳ء ص ۳۰
منیزہ شمسی	پاکستانی سائنس داں قطب شمالی میں	سائنس میگزین، کراچی مئی جون ۹۳ء ص ۱۲۸
میاں محمد واجد	پاکستانی سائنس داں ڈاکٹر منظور احمد	سائنس میگزین، کراچی مارچ اپریل ۹۳ء ص ۱۴۸
نسیم سیّد	سبز قیامت، کرۂ ارض کی بڑھتی ہوئی حرارت	ارتقاء، کراچی ۱۰/۹۳ء ص ۱۲۷
نعمان احمد لطیفی	غذائی صنعت و سائنس	سائنس میگزین، کراچی مئی جون ۹۳ء ص ۹۲
نعیم اللہ خاں	وسائل آرائش اور طبِ یونانی	تہذیب الاخلاق، علیگڑھ جنوری ۹۳ء ص ۴۴

(جاری ہے)

حروف تازہ

کتابیں

دشت تہہ آب
شاعری ۱۹۹۳ء
شاعر لکھنوری
صفحات ۹۶ قیمت ۱۰۰/۰ روپے
دارالادب ۱۵/۹۴، ۵۔ ڈی نارتھ کراچی

فہرست مخطوطاتِ اُردو
۱۹۹۳ء
ڈاکٹر ظفر اقبال
صفحات ۴۵۰ قیمت ۵۰۰/۰ روپے
ادارہ کتابیات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۸۴۲۱ جامعہ کراچی

میر و سودا کا دور
۱۹۹۳ء
ثناء الحق صدیقی
صفحات ۴۹۶ قیمت ۱۰۰/۰ روپے
آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس ۱۔ بے۔ ۱۰/۴۵
شارع سید الطاف علی بریلوی ناظم آباد کراچی

حافظ محمود شیرانی جلد اوّل
۱۹۹۳ء
ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی
صفحات ۵۷۰ قیمت ۲۰۰/۰ روپے
مجلس ترقی ادب کلب روڈ۔ لاہور

نگارشاتِ سندھ
۱۹۹۳ء
ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی
صفحات ۲۹۶ قیمت ۱۲۵/۰ روپے
سندھی ادبی اکیڈمی لاڑکانہ سندھ

انقلاب ہے یہ لہو
۱۹۹۳ء

ثاقب رزمی
صفحات ۲۴۳ قیمت -/۱۴۰ روپے
مقبول اکیڈمی دیال سنگھ مینشن شاہراہ قائداعظم لاہور

آشوبِ میکدہ
۱۹۹۳ء

پروفیسر ڈاکٹر صفدر حسین صفدر
صفحات ۴۰۲ قیمت -/۲۲۵ روپے
خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران ۷۸۸ا بی خانیوال روڈ ملتان

دستک اُس دروازے پر
۱۹۹۳ء

وزیر آغا
صفحات ۱۹۲ قیمت -/۵۰ روپے
مکتبۂ فکر و خیال ۷۲ا ستلج روڈ علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

ماہِ شکست
۱۹۹۳ء

تابش دہلوی
صفحات ۱۷۶ قیمت -/۱۲۵ روپے
بلاک ۳-اے-۶/۹ ناظم آباد کراچی ۷۴۶۰۰

بساطِ گفتگو
۱۹۹۳ء

عبدالعلیم کے-طالب
صفحات ۱۵۲ قیمت -/۹۰ روپے
۴۵/۹-۱-دستگیر سوسائٹی-ی فیڈرل بی ایریا کراچی

ایران بہ عہد ساسانیان
۱۹۹۳ء

ترجمہ: ڈاکٹر محمد اقبال
صفحات ۷۸۶ قیمت -/۲۰۰ روپے
انجمن ترقی اردو پاکستان-ڈی ۱۵۹ بلاک (۷) گلشن اقبال کراچی

جریدے

فنون شمارہ ۳۹

احمد ندیم قاسمی
صفحات ۳۶۰ قیمت -/۷۵ روپے
اے-۵۴ مزنگ روڈ لاہور

افکار

صہبا لکھنوی، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، نکہت بریلوی
صفحات ۸۴ قیمت ۱۰/۰ روپے
۱۰۵ سی نیشنل آٹو پلازہ مارسٹن روڈ کراچی

مجلہ

مدیر: ڈاکٹر لنظر کامرانی
صفحات ۲۲۴ قیمت ۴۰/۰ روپے
۲۵۲ سی بلاک ۶ فیڈرل بی ایریا کراچی

فکر و نظر
اپریل، جون ۱۹۹۳ء

مدیر: ڈاکٹر صاحبزادہ ساجد الرحمٰن
صفحات ۹۶ قیمت ۱۵/۰ روپے
ادارہ تحقیقات اسلامی بین الاقوامی یونیورسٹی اسلام آباد

خدا بخش لائبریری جنرل ۷۵-۷۷
۱۹۹۲ء

صفحات ۴۷۵ قیمت ۷۵/۰
خدا بخش اورینٹیل پبلک لائبریری پٹنہ بھارت

تشکیل
حصہ دوم سہ ماہی

احمد ہمیش
صفحات ۳۶۰ قیمت ۶۰/۰
تشکیل پبلشرز ۶/۸- جے-۲ (عروج کلیننک بلڈنگ) ناظم آباد کراچی

اردو سہ ماہی
۱۹۹۲ء

مجلسِ ادارت:
نور الحسن جعفری، جمیل الدین عالی، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر اسلم فرخی

صفحات ۱۷۶ قیمت ۱۵/۰ روپے
انجمن ترقی اردو پاکستان ڈی ۱۵۹ بلاک (۷) گلشن اقبال کراچی

قومی زبان

مرزا اسداللہ خاں غالب
۱۷۹۷ء ——— ۱۸۶۹ء

فروری ۱۹۹۴ء   جلد: ۶۶   شمارہ ۲

مضمون نما

ادارۂ تحریر

ادا جعفری

جمیل الدین عالی

مشفق خواجہ

مُدیر

ادیب سہیل

بدل اشتراک

فی پرچہ ——— ۸ روپے

سالانہ عام ڈاک سے ۹۰ روپے

سالانہ رجسٹری سے ۱۶۲ روپے

بیرونِ ملک

سالانہ عام ڈاک سے ۱۰ پونڈ ۱۵ ڈالر

سالانہ ہوائی ڈاک سے ۱۵ پونڈ ۲۵ ڈالر

انجمن ترقی اردو پاکستان

شعبۂ تحقیق: ڈی ۱۵۹۔ بلاک ۷۔ گلشن اقبال

کراچی ۷۵۳۰۰۔ فون: ۴۶۱۴۰۶

تجارت، صنعت
اور زراعت
ہماری ترقی
کا زینہ ہیں!

اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو بے شمار وسائل سے نوازا ہے۔
اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم ان وسائل سے زیادہ سے زیادہ
فائدہ اٹھا کر خود کفالت کی منزل سے ہمکنار ہو جائیں۔

زیادہ اگائیے

پیداوار بڑھائیے

برآمدات بڑھائیے

Energy Supports Life

Our track record portrays a spectacular success story of energy exploration in Pakistan.

We've completed with satisfaction four decades of our dedicated services in the vital energy sector of the country.

We're Pakistan's premier petroleum exploration and production company; discoverers and producers of the country's largest gas field—Sui and pioneers of gas industry in Asia.

Our daily production of natural gas exceeds energy equivalent of 110,000 barrels of furnace oil. And we also produce substantial quantities of oil and LPG.

We have stepped up petroleum exploration through a number of joint ventures with leading oil companies.

NATIONAL PPL 1 91 R

ترقی

جمیل الدین عالی معتمد اعزازی انجمن، بابائے اردو یادگاری خطبہ ۱۹۹۳ء کی تقریب میں خطاب کر رہے ہیں

پروفیسر رالف رسل مقالہ پڑھ رہے ہیں ان کے ساتھ جمیل الدین عالی کھڑے ہیں

جمیل الدین عالی
معتمد اعزازی

حرفے چند

فروری ایک طرح ماہِ غالب ہے۔ جنوبی ایشیا میں ہی نہیں دنیا بھر میں جہاں جہاں اردو دانوں کی چھوٹی بڑی آبادیاں ہیں اس مہینے میں کسی نہ کسی پیمانے پر غالب کی برسی بھی منائی جاتی ہے۔ انفرادی سطح پر تو ہر اردو داں اور ہندی جاننے والا اہلِ ذوق، اہلِ نظر بھی فنِ غالب سے شعوری اور غیر شعوری طور پر استفادہ کرتا رہتا ہے۔ اس طبقے میں جو صاحبان اظہار گزرے اور گزر رہے ہیں وہ نثر اور نظم میں اپنے اپنے ذریعہ ابلاغ سے غالب کو خراجِ عقیدت پیش کرتے رہے ہیں اور یہ عمل مسلسل ہے۔ فارسی کے حوالے سے بھی ایران میں بڑے پیمانے پر نہ سہی، تاجکستان اور افغانستان میں غالب کی یاد مستقلاً منائی جاتی ہے۔ جن مشرقی اور مغربی جامعات میں اردو کے شعبے قائم ہیں فروری کا کوئی نہ کوئی دن ذکرِ غالب کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ جن زبانوں میں غالب کے ترجمے ہوئے (بیشتر شورائیہ روس کی کئی زبانوں میں ہوئے تھے) غالب ایک دلچسپ اور وقیع اور اہم مطالعہ کہے جاتے ہیں۔ انگریزی میں پورے اردو یا فارسی مجموعے کا ترجمہ تو اب تک کتابی صورت میں نہیں چھپا مگر انتخابات (اردو فارسی دونوں کی نظم و نثر سے) کئی چھپ چکے ہیں۔ یہ الگ بات کہ ان کی مقدار تاحال قابلِ ذکر و ستائش نہیں ہوئی گو اس میں قصور "محاسن کلامِ غالب" کا نہیں اس کے ذمہ دار بہت سے عوامل ہیں جن میں پاکستانی اور ہندوستانی حکومتوں، نجی ثقافتی اداروں اور سرپرستانِ ثقافت امرا کی بے پروائی بھی شامل ہے اور ان کم نصیب مغربی ناشروں کی تقصیر بھی جنھوں نے غالباً نسلی اور سامراجی شاونیت کی بنا پر ان ترجموں کی تشہیر مناسب طور سے نہیں کی۔ (وہاں علامہ اقبال کی تشہیر بھی مطلوبہ انداز میں نہیں کرتے) ورنہ مغربی قارئین میں بہت سی روایتی اور جارحانہ عادات مطالعہ کے باوجود ایسے اداروں اور افراد کی کمی نہیں جو ان کی عظیم مشرقی روایات کو پچاس ساٹھ ہزار کی تعداد میں خرید کر بھی نہ پڑھ سکیں (گھٹیا کتابیں، سیاسی کتابیں لاکھوں کی تعداد میں بکتی ہیں) ہماری زبانوں کے بڑے وقیع ترجمے دو ہزار فی ایڈیشن کی تعداد سے زیادہ نہیں چھپتے۔ پروفیسر رالف رسل کا ترجمۂ غالب اب کہیں جا کر پیپر بیک میں یعنی بڑی مقدار میں آ رہا ہے یہ وہ ترجمہ ہے جو فارسی اردو خطوطِ غالب سے انتخاب کر کے غالباً ۱۹۷۰ء میں چھاپا گیا تھا۔ اب ان کا غالب اردو فارسی شاعری سے انتخاب کا انگریزی ترجمہ زیرِ اشاعت ہے (یونیسکو کا ایک منصوبہ) مغرب مشرق شناسی میں کسی قدر آگے بڑھ رہا ہے امید کرنی چاہیے کہ یہ زیادہ تعداد میں چھپے گا۔ راقم نے اس کام کے اکثر حصے دیکھ رکھے ہیں۔ بڑے کمال کا ترجمہ ہے سچ یہ کہ ترجمہ ہو تو مطابق متن ہو اور اچھا ہو، ورنہ دوسری زبان کا قاری ان کی پوری ثقافت کے خلاف سخت ردِ عمل میں مبتلا ہو سکتا ہے۔

برسوں ہوئے پروفیسر احمد علی نے بھی کچھ ترجمے کیے تھے وہ بعض موقر انگریزی حلقوں تک پہنچے اگر وہ کافی تعداد میں ہو کر کتابی شکل میں آتے تو متعلقہ مغربی حلقوں میں ایک کارنامہ سمجھے جاتے۔ بہت دن ہوئے آنجہانی شری جے ایل کول کا ایک تعبیری ترجمہ بھی معروف ہوا تھا اور جناب داؤد کمال کا ترجمہ بھی مغرب میں پہونچا ہوا ہے۔ (یہ تحریر محض یادداشت کی بنا پر لکھی جارہی ہے) حال ہی میں ڈاکٹر داؤد رہبر (اب مقیم بارورڈ) نے "عودِ ہندی" اور "اردوئے معلّٰی" کے ترجمے معہ تشریحات کیے ہیں راقم کی نظر سے نہیں گزرے۔ جاننے والے تعریف کرتے ہیں امید ہے جلد ادھر بھی آئیں گے۔ جیسا کہ تحریر کیا گیا ترجموں کے لیے مطابق متن کے ساتھ ساتھ بہت عمدہ ہونا بھی ضروری ہے۔ ہمارے بیشتر ترجمے میرے جاننے والے مغربی قارئین سے مذاق اڑواتے رہتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ اداریہ محض حرفے چند کی حیثیت رکھتا ہے کوئی تحقیقی مقالہ نہیں۔ انگریزی میں نظم و نثر غالب کے ترجموں، تعبیروں اور حوالوں کی ایک طویل نہ سہی قابلِ ذکر فہرست بن سکتی ہے۔ مگر تاحال بوجوہ ظاہر غالب ابھی مغرب میں عام نہیں ہوئے۔ شاید اسی لیے چین اور جاپان اور دنیائے عرب میں ان کا تذکرہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ عموماً تاحال دیگر مشرقی ممالک میں بھی اردو کے بڑے انگریزی کی معرفت ہی بار پاتے ہیں۔ (نیا چینی شعبہ اردو البتہ غالب پر راست توجہ کا آغاز کر رہا ہے) اور مغرب نے ہماری فکری ثقافت کو جس طرح اور جن وجوہ سے نظر انداز کیا وہ ایک پوری کہانی ہے یہ الگ بات کہ شہرت اور بڑائی دو الگ الگ مضمون ہیں۔ غالب کی عظمت اپنی جگہ ہے سقراط، ارسطو قدیم یونانی مفکرین کم از کم ہزار برس تک خود یورپ میں غیر متعارف رہے تا آنکہ عربی ترجموں نے انھیں وہاں روشناس کرایا۔

غالب جنوبی ایشیا کے اُن مستند معدودے چند ادیبوں میں شامل ہیں جن کا عالمی سطح پر تعارف شروع ہو چکا ہے اب غالبیات اور غالب شناسی مستقل اور مستعد موضوعات تحریر ہیں جبکہ اس میں کسی ہندوستانی' پاکستانی حکومت یا نیم سرکاری ادارہ کا کوئی دخل نہیں پاکستان کی حد تک تو صورتِ حال یہ ہے کہ علمی ادبی عوامی دنیا غالب کی قدر دان اور ہر حکومت پاکستان عملاً ان سے بے نیاز۔ ۱۹۶۹ء میں جب غالب کی صد سالہ برسی دنیا بھر کے ہر متعلقہ حلقے میں منائی جارہی تھی حکومت پاکستان نے کسی ادارے کو ایک پیسے کی گرانٹ بھی فراہم نہیں کی، غالب کے نام پر کوئی نیم سرکاری صاحب وسائل ادارہ تھا ہی نہیں۔ بقول قدرت اللہ شہاب مرحوم (جو اس وقت وفاقی معتمد وزارت تعلیم تھے) انھوں نے وزارت خزانہ سے اس مقصد میں کچھ اداروں کو امداد دینے کے لیے ایک معمولی سی رقم، غالباً ایک لاکھ روپے، طلب کی تو جواب ملا کہ چونکہ غالب پاکستان کی جغرافیائی حدود میں پیدا نہیں ہوئے تھے اس لیے حکومت پر ان کے حوالے سے کچھ خرچ کرنا واجب نہیں آتا............ لیکن تقریباً سبھی جامعات پاکستان کے اردو فارسی شعبوں نے اور بہت سے نجی اداروں نے یہ برسی خاصی شان و شوکت کے ساتھ منائی۔ کراچی میں ایک غریب سی ایسوسی ایشن تھی۔' (اب بھی ہے گو حالات نسبتاً بہتر ہیں) "ادارۂ یادگار غالب" اس کے صدر نشین جناب فیض احمد فیض اور معتمد اعزازی مرزا ظفر الحسن تھے ایک نہایت فعال شخصیت۔ رُکن سرپرست محترمہ آمنہ مجید ملک (علیگڑھ والے ڈاکٹر بٹ کی بڑی صاحبزادی) اس ادارے نے تو اس انتہائی سیاسی ابتری کے ماحول میں بھی یہ برسی اس دھوم دھام سے منائی کہ لوگ دنگ رہ گئے تھے۔

پرانے بڑے کاموں کے بعد غالب پر پچھلے دس بارہ برس میں بھی بڑے بڑے کام ہوئے ہیں۔ غالب کے پورے علمی سرمائے پر محیط ایک بے مثال کتاب ڈاکٹر سید معین الرحمٰن مرتّب کر چکے ہیں جو ۱۹۸۹ء میں شائع ہوئی۔ یہ ایک تفصیلی جائزہ معہ حوالہ جات و اشاریہ ہے ہر اُس تحریر کا جو غالب نے لکھی۔ اس کے بعد ایک آدھ غیر مطبوعہ خط کے علاوہ اس میں اضافہ کے

لیے کوئی مواد سامنے نہیں آیا ہے اس کتاب سے غالب کی ادبی ہی نہیں علمی شخصیت کے تمام پہلو بھی پورے استناد کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ بمبئی سے جناب کالی داس گپتا رضا نے جو بیش بہا کام کیا ہے اُس کی داستان الگ ہے انھوں نے مولانا عرشی کے کام سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے شوق اور جستجو کے ساتھ پورا دیوان ترتیبِ زمانی کے ساتھ شائع کیا جو انجمن نے اُن کی اجازت سے پاکستان میں شائع کر دیا ہے۔ اُس کا نام ہے "دیوانِ غالب کامل" (اردو) چونکہ ان کی ترتیبِ زمانی ناقابلِ تردید رہی اس لیے اب درجہ استناد حاصل کرتی جاتی ہے اور کم عمری میں ہی غالب کی جی نی اس کے عجب عجب کرشمے دکھاتی ہے۔

اردو شعرا میں سوانح کے حوالے سے جتنا کام غالب پر ہوا ہے اور ہوتا رہتا ہے وہ ایک بڑا ہی دلچسپ معاملہ ہے غالب کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس پر آج بھی کہیں نہ کہیں کوئی تحقیق کوئی تبصرہ نہ ہورہا ہو۔ کام کرنے والے اس روّیے کا ناتہ کسی نہ کسی طرح غالب کی فکری اور تخلیقی زندگی سے جوڑ دیتے ہیں اور شاید یہ کسی تجزیے میں درست بھی ہو مگر غالب سے اپنی تمام تر عقیدت اور نسبتوں کے باوجود راقم الحروف اس امر پر حیران ضرور ہوتا ہے کہ پس ماندہ معاشرہ میں پچھلی صدی کا ایک ادیب جس نے کوئی سیاسی کارنامہ بھی سرانجام نہ دیا ہو اپنی کوئی ایسی نسبی یا سببی ذریت بھی نہ چھوڑی ہو جو اس کے نام اور کام کو اپنے ذرائع سے فروغ دیتی رہتی محض اپنی تخلیقی اور فکری قوتوں کے بل پر اتنی اہمیّت اختیار کر لے اور اس اہمیّت میں اضافہ ہی ہوتا رہے .... حیات غالب پر باقاعدہ کام مولانا حالی کے زمانے ہی سے شروع ہوگیا تھا بیچ میں مختصر سے وقفے ضرور آئے مگر اب کوئی پچاس برس سے غالب کی زندگی کا ایک ایک گوشہ اہلِ تحقیق اہلِ تبصرہ اہلِ تجزیہ کے لیے ایک مطالعہ بنا ہوا ہے۔ پچھلے چند برس میں اس موضوع پر جناب کالی داس گپتا رضا نے اختصاص حاصل کر رکھا ہے۔ افسوس کہ ان کی بیشتر کتابیں پاکستان میں درآمد نہیں ہوئیں لوگ ہندوستان جاتے ہیں تو لے آتے ہیں یا منگوالیتے ہیں۔ جیسا کہ عرض کیا انجمن نے ان کا مرتّبہ "دیوان غالب کامل" (اردو) تو ان کا اجازت سے چھاپ دیا اب ان کی ایک اور تالیف "غالب دورنِ خانہ" (محقق سوانح) زیرِ اشاعت ہے لیکن غالب پر ان کی کئی دوسری کتابیں مثلاً

غالب۔ بعض تصانیف کے بارے میں

اسد اللہ خاں غالب مُرد

غالبیات۔ چند عنوانات

یقیناً اس قابل ہیں کہ پاکستان (اور بیرونِ پاکستان) کے غالب دوست انھیں ملاحظہ کریں غالب کے بارے میں ۱۸۵۷ء کے حوالے سے مختلف تاثرات عام رہے۔ ڈاکٹر سیّد معین الرّحمٰن کی ایک نہایت وقیع تالیف غالب اور انقلاب ستاون، شائع کردہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے اشاریوں سمیت دو سو پچاسی صفحات میں اس موضوع سے ہمدردانہ نہیں محققانہ اور ناقدانہ بحث کی ہے۔ ڈاکٹر ملک اختر کی کتاب "حیات غالب" کا ایک باب تحقیق کی روشنی میں شائع کردہ مکتبۂ عالیہ لاہور، پنشن کے مقدمے پر حکومت پنجاب کے ریکارڈ کھنگال کر بڑی جستجو کے ساتھ گفتگو کی گو جناب کالی داس گپتا رضا نے "اسد اللہ خاں غالب مُرد" میں اس پر کسی قدر اختلافی تحقیق و تنقید کی ہے۔

غالب ہی جنوبی ایشیا اور ہماری معلومات کے مطابق اردو فارسی دنیا کے وہ واحد شاعر ہیں جن کی حیات پر ان گنت ٹی وی ڈراموں کے علاوہ تین پوری پوری فیچر فلمیں بن چکی ہیں دو ہندوستان میں اور ایک پاکستان میں یقیناً ان میں خلط ملط افسانوی رنگ بھی بھرا گیا جو شاید تاجرانہ ضرورت تھی بعض حقائق کو غیر ضروری طور پر توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا بعض اہم پہلوؤں پر توجہ ہی نہیں

دی گئی بعض میں بڑی تاریخی غلطیاں بھی در آئیں مگر ان فلموں کا بننا اور اُن کی مقبولیت جنوبی ایشیائی طبقہ ادبا سے غالب کی عوامی سطح پر بھی مسلسل مقبولیت کے واضح ثبوت ہیں۔ برسبیل تذکرہ چند برس ہوئے ہندوستانی ٹیلیویژن نے غالب پر ایک قسط دکھائی جس نے اس فلم کے مطابق محترم کیفی اعظمی کی تحقیق و نگرانی منسوب ہے (یہ فلم کیسٹوں کی شکل میں پاکستان میں دستیاب ہے) اس میں دوسری بہت سی اُن غلطیوں کے علاوہ جو حیات غالب سے متعلق ہیں سقوط سلطنت اودھ کو نواب الدین خان والی فیروز پور جھرکہ ولوہارو کے انگریزوں کے ہاتھوں گرفتار ہونے سے پہلے دکھایا گیا ہے جبکہ وہ انگریز ریذیڈنٹ کرنل فریزر کے قتل پر اعانت قتل کے الزام میں گرفتار ہو کر ۱۸۳۵ء میں پھانسی پا گئے تھے اور سلطنت اودھ پر انگریزوں ۱۸۵۶ء میں قبضہ کیا تھا۔

جنوبی ایشیا میں سب اردو شعرا سے زیادہ گائے جانے والے شاعر آج بھی غالب ہی ہیں آزاد ہندوستان میں جہاں دیو... رسم الخط سرکاری اور لازمی رسم الخط بن چکا ہے اور اردو رسم الخط رفتہ رفتہ ختم ہو رہا ہے غالب کی غزل آج بھی گانے اور سننے میں مقبول ترین فن پارہ ہے۔ بعض غزلوں سے شعر لے کر تمثیلات لکھنے اور اسٹیج پر پیش کرنے کی روایت بھی زور پکڑ رہی ہے۔

انجمن ترقی اردو ہند کے معتمد ڈاکٹر خلیق انجم کے مرتب کردہ غالب کے اردو خطوط کی تین جلدیں انجمن ترقی اردو پاکستان نے بھی شائع کردی ہیں (چوتھی جلد ہندوستان میں چھپتے ہی پاکستان میں بھی شائع کردی جائے گی۔ انشاءاللہ) انجمن ہی کو یہ حاصل ہے کہ بیسویں صدی میں علمی ادبی سطح پر "احیائے غالب" کے سلسلے میں ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کا مقالہ پہلی بار اس سہ ماہی جریدے اردو میں شائع ہوا تھا (۱۹۲۱ء) اب بھی انجمن اپنی بساط بھر غالبیات کے حوالے سے کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہے۔ غالب کے فارسی کلام اور خطوط کے سلسلے میں جو کام ہونا چاہیے وہ حقیقتاً ابھی شروع بھی نہیں ہوا۔ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم مرحوم مختصر شرح پیکجز لیمیٹڈ لاہور نے بطور ہدیہ شائع کر کے چنیدہ اہلِ ذوق تک ضرور پہنچائی، دستنبو کا اردو ترجمہ بھی ہو گیا، کچھ فارسی کے اردو ترجمے بھی ہو چکے تھے مگر مجموعی طور پر ان کی فارسی نثر و نظم اب تک ایک طرح ابتدائے تعارف کی منزلوں سے گزر رہی ہے بدقسمتی کہ ہمارے ملک میں فارسی کا چلن بہت کم ہو گیا ہے۔ مگر غالب کی فارسی نظم و نثر کی اردو میں انا توی ہو کر... اور ایک دن ہم غالب کی مجموعی شخصیت کو کو جانچنے کے مرحلے میں ضرور داخل ہونگے۔ بعد میں یا شاید ساتھ ساتھ غالب تقابل بھی ہو کر رہے گا یہ کام صدیاں لے لیتے ہیں مگر دنیا بڑے ذہنوں کے سرمائے سے تاوقتیکہ وہ نابود نہ ہو گئے ہوں محروم نہیں رہ سکتی۔ بہت سے عظیم مصنفین کا تعارف صدیوں بعد ہوا ہے مگر اب نسبتاً وقت کی رفتار تیز تر ہے۔

قومی زبان کا یہ شمارہ غالبیات کے حضور ایک بہت ہی حقیر سا نذرانہ ہے۔ انشاءاللہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

غالب اور نقش نو آئین

ڈاکٹر حنیف فوق

غالب ۔ ، ایسے شاعر اور دانش ور تھے، جن کی ذات میں متنور الفکری، ترقی خواہی، اور پیش بینی کی صفات ایک خلاقانہ کلیت کے ساتھ مجتمع ۔ ئی تھیں۔ ان کے طرزِ فکر سے سرسید اور حالی ہی متاثر نہیں ہوئے، اقبال اور فیض تک اس کا سلسلہ پہنچا ہے۔ ان کے علاوہ ۔ ی عبدالحق، یلدرم، یگانہ اور نیاز اپنے اپنے طور پر اس چشمۂ فیض سے سیراب ہوتے رہے ہیں۔ غالب کی رومانیت اور غا ۔ کی مادیت پسندی دونوں نے اربابِ فکر و نظر کو اظہار کے نئے گوشوں کی جانب مائل کیا ہے۔ پھر ان کی ذہنی بغاوت اور بت ۔ نی کی الگ جہات ہیں کہ یگانہ کی غالب شکنی بھی، اسی سمت میں ایک قدم کہی جاسکتی ہے۔ غالب کی ایک ادبی بت کی طرح پرست ۔ ں کرانا، خود ان کی وسعتِ نظری کی توہین ہے اور غالب کی ذات کا مجاور بن جانا، ان کی فکری اساس سے محرومی کی دلیل ہے۔ لیکن غالب کی فکر کو نئی حقیقتوں پر منطبق کیا جاسکتا ہے اور ان کے کلام میں نئی صداقتوں کی تلاش سے فنی بصیرت و ادارک میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ غالب نے زندگی کی تبدیلیوں کے جلوۂ ہزار شیوہ کو مدِ نظر رکھا ہے لیکن کلاسیکی روایات کی تکمیل بھی کی ہے۔ تہذیبِ گذشتہ کی صناعانہ درو بست ان کے کلام میں رچی بسی ہے۔ نظیری، بیدل، ظہوری اور دوسرے فارسی شاعروں سے غالب نے بکثرت استفادہ کیا ہے۔ اردو شاعروں میں میر اور نظیر اکبر آبادی کے اثرات ہی نہیں، دبستان لکھنؤ کے نمائندوں یعنی آتش اور ناسخ کے متوازیات بھی غالب کے کلام میں بڑی آسانی سے تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ آتش کے کلام میں قلندرانہ وضع کے ساتھ جس مردانہ ولولے کی نمود ملتی ہے، غالب کی شاعری بھی ان کی نظیروں سے پُر حرکت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اوصافِ جمال کے احساس اور ولولہ و تحرک میں آتش کی شاعری الگ مقام رکھتی ہے۔ ناسخ کی شاعری فنی طور پر سخت گیر لیکن تخیلاتی طور پر نسبتاً آزاد معاشرے میں، جس مضمون آفرینی کو راہ دیتی ہے، اس کے صحیح تجزیے کی بڑی ضرورت ہے۔ غالب کی شاعری ایک متوازی راہ پر گامزن ہے لیکن ناسخ کی مضمون آفرینی، غالب کے کلام میں زندگی کی فکر تازہ سے مملو ہو کر دو آتشہ بن گئی ہے۔ دراصل ماضی کے تہذیبی عناصر کی گرفت اور حال کی تہذیبی ماہیت کے استخراج کے ساتھ زندگی کی فکرِ تازہ ہی وہ صفت ہے۔ جس نے غالب کی بیدار و مستعد نظر کو مستقبل کی پیکر تراشی کا وصف بخشا ہے۔

غالب کی فکر تازہ کی ایک خصوصیت آزاد خیالی ہے۔ چنانچہ یگانہ غالب دشمنی کے باوجود اور نیاز ایک حد تک غالب کے نقش ہائے رنگ رنگ کے معترف ہوتے ہوئے بھی، اپنی نقادانہ نامناسبتی کے سبب، غالب کے بارے میں کم ترجیحی کا سلوک رکھتے ہوئے، اس کی آزاد خیالی اور فکری جسارت کے خوشہ چین رہے ہیں۔ لیکن اس فکرِ تازہ کی دوسری اور زیادہ اہم خصوصیت، حال

کے واسطے سے مستقبل کا شعور ہے۔ چنانچہ بعد کے ادیبوں اور شاعروں ہی نے نہیں، بڑی ادبی تحریکوں نے بھی غالب سے اکتسابِ فکر کیا ہے۔ علی گڑھ تحریک کے بعد اردو ادب کی دوسری بڑی فعالیت یعنی ترقی پسند تحریک پر غالب کے اثرات کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ ترقی پسند تحریک نے جہاں بعض کی شہرتوں کا چراغ بجھا دیا، وہاں اس سے غالب کی روشنی تیز تر ہو گئی۔ علی گڑھ تحریک کی فکری جدیدیت اور ترقی پسند تحریک میں فکری بغاوت کی مستقبل آفریں غایت کا سلسلہ افکارِ غالب سے جا ملتا ہے۔ یہی غایت ہے جو شاعر کے انجام کے بجائے معاشرے کی سرانجامی سے سروکار رکھتی ہے۔ اور اس میں انفرادی کاوشیں اجتماعی بہبود کا نقش ابھار کر تی نظر آتی ہیں۔ غالب نے یوں ہی نہیں کہا تھا کہ:

آغشتہ ایم بر سر خارے بہ خونِ دل
قانونِ باغبانیِ صحرا نوشتہ ایم

ترقی پسند تحریک سے پہلے اسے ترقی پسندانہ افکار کا منشور کہا جا سکتا ہے اور اس منشور کی متعدد خصوصیتیں خود غالب کے کلام میں اور اس کے بعد، آنے والوں کے اقوال و اعمال میں نمایاں ہوتی رہی ہیں۔ فیض نے "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" کہہ کر جدوجہد کے جس ختم نہ ہونے والے سلسلے کا پتہ دیا تھا، غالب کا مندرجہ ذیل شعر بھی گویا اسی جانب اشارہ کناں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

خارہا از اثرِ گرمیِ رفتارم سوخت
منتے بر قدمِ راہ رواںست مرا

غالب انسانی کمزوریوں اور اپنے عہد کے تضادات کی پیدا کردہ خطاؤں سے مبّرا نہ تھے۔ ایک طرف ان کے آدرش کی بلندی تھی اور دوسری طرف وہ انسانی پستیاں جنھیں جینے کے لیے انھیں اختیار کرنا پڑتا تھا۔ دعوے کے باوجود وہ شیوۂ منصور سے بہت دور تھے۔ طبیعت کی دیرینہ آزادی کے ساتھ آسائش کی گرفتاری انھیں پسند تھی اور ذوقِ بہبود انھیں آتش کے "ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا" کے رویّے سے بیگانہ رکھتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ "گر نہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی" کہہ سکتے تھے۔ لیکن نہ صرف یہ کہ ان کے خیال کی دنیا بڑی وسیع تھی بلکہ وہ اس احساس کے ساتھ کہ:

غالب سوختہ جاں راچہ بہ گفتار آری
بہ دیارے کہ ندانند نظیری ز قتیل

یہ شکایت بھی رکھتے تھے کہ:

وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ ہے
دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

پھر وہ اپنے عہد کے سیاسی اور سماجی احوال کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتے تھے کہ:

نہ کنی چارہ لبِ خشک مسلمانے را
اے بہ ترسا بچگاں کردہ مئِ ناب سبیل

یہی نہیں اس وسیع آشوب کے بالمقابل انھیں اپنی ذات میں کمی اور ناکفایتی کا اندازہ بھی تھا۔ وہ کہتے ہیں:

جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں

ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے

دراصل عمل سے زیادہ حقائق کے وسیع نظارے اور انسانی آدرش سے گہری پیوستگی سے ان کی شاعری نے بڑائی پائی ہے۔ ان کے دل میں اعلیٰ انسانی اقدار کے لیے جو غیر معمولی تڑپ تھی، وہ بار بار شعری پیکروں میں ظاہر ہوئی ہے۔ ان کے خیال کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ بعض اوقات اظہار ان کا ساتھ نہ دیتا تھا۔ پھر نفاست و صیقل کی جگہ ایک مجتہدِ فکر اور نابغۂ روزگار کی طرح ان کے بیان میں مستقبل کے لیے وہ قوت و حرکت ہے، جو کہیں کہیں پائی جانے والی کم شستگی اور نارسائی کی حدوں میں بھی اپنا نقش مستحکم کرتی ہے۔ چنانچہ جہاں بعض لکھنے والے اپنے زمانے ہی میں قصۂ پارینہ بن جاتے ہیں اور کوئی نئی ادبی تحریک ان کو طاقِ نسیاں نہ بھی کتب خانے کی الماری کی زینت بنا دیتی ہے، وہاں ہر آنے والا دن غالب کی شاعرانہ عظمت کو زیادہ روشن کر رہا ہے۔ ان کی یاد تازہ رکھنے کے لیے کسی سالانہ عرس کی ضرورت نہیں بلکہ زندگی کی نئی صورتیں ان کی فکر کو زندہ رکھتی ہیں اور نئی تحریکیں ان سے توانائی پاتی ہیں۔ غالب کے کچھ کم مشہور اشعار بھی ان کے فکری جہات کی بڑی اچھی نمائندگی کرتے ہیں۔ مثلاً مندرجہ ذیل اشعار میں شاعر کی انا صرف ذاتی نہیں بلکہ مستقبل کی قوتوں کی امین ہے وہ کہتے ہیں کہ:

این ابر کہ شوید رخِ گلہائے بہاری
از دامنِ ما پرورش آموز نسستے
زیں نقش نو آئین کہ برانگیختہ غالب
کاغذ ہمہ تن وقفِ سپاس قلمستے

وقت کے لفظوں کے معنی ضرور بدل جاتے ہیں، لیکن یہ معانی شاعری میں جن تصورات کی چھب دکھاتے ہیں، ان کا تاریخی ضرورتوں اور عصری تقاضوں کی روشنی میں جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ برصغیر میں غالب کے دور کے سیاسی شعور جمہوریت کا مفہوم نامعروف تھا۔ لیکن جدید و قدیم کی آویزش ایک زندہ حقیقت کی حیثیت رکھتی تھی اور آگے بڑھتی ہوئی زندگی کے سائنسی اور منطقی رویوں کا خیر مقدم پیش قدمی کا انداز فکر کہا جاسکتا ہے۔ پرتگالی، فرانسیسی اور انگریز جو نئے صنعتی دور کے ترجمان تھے، برصغیر میں سیاسی بالادستی کے لیے کوشاں تھے اور ان میں انگریزوں کو نہ صرف حریف یورپی قوتوں، بلکہ جاگیردارانہ معاشرے کی مقامی طاقتوں پر بھی فتح حاصل ہوئی۔ یہ دوسری بات ہے کہ انگریزوں نے اپنے سیاسی اقتدار کو محفوظ رکھنے کے لیے، مختلف سطحوں پر خود مقامی جاگیردارانہ استحصال سے مفاہمت کرلی۔ اس کے باوجود ان کی آمد سے برصغیر کی خود کفیل معاشی زندگی کا طلسم ضرور ٹوٹا اور نئے سائنسی ذرائع نے نئے احساسات و خیالات کے لیے زمین ہموار کی۔ لیکن انگریزوں کے واسطے سے جو نظامِ فکر آیا تھا، اس میں بھی قدامت کے اجزاء موجود تھے۔ شاہیت انگلستان میں ایک مستحکم ادارے کی حیثیت رکھتی تھی۔ حالانکہ انقلابِ فرانس جس نے ساری دنیا کے فکری محوروں کو بدلا تھا، ۱۷۸۹ء میں رونما ہوچکا تھا۔ لیکن برصغیر کی تہذیب و معاشرت پر فرانسیسی اثرات ابھی تک تحقیق طلب رہے ہیں۔ البتہ خود انگلستان میں بعض رومانی شاعروں نے انقلاب فرانس کے گن گائے تھے اور کچھ نے اس کے سیاسی مضمرات سے ڈر کر اس کی حمایت سے بازگشت بھی اختیار کی تھی۔ پھر خود فرانس میں نپولین بونا پارٹ نے ۱۸۰۴ء میں اس انقلاب کو رد کیا اور امپراطو (EMPEROR) کی حیثیت حاصل کرلی۔ لیکن انقلابِ فرانس نے جو اثرات چھوڑے، وہ تاریخ کا حصہ ہیں۔ بائرن نے کہا تھا کہ مجھے ایک جمہوریت دو۔ شاہوں کے زمانے ختم ہو رہے ہیں۔ اس نے اس خیال کا بھی اظہار کیا تھا کہ آخر میں عوام کو فتح حاصل ہوگی۔" اس کے برخلاف برک (BURKE) نے انگلستان میں شاہیت کی حمایت کی اور انقلاب

فرانس کے بارے میں اپنے خیالات پیش کرتے ہوئے، اس موضوع پر اپنی ۱۹۰۷ء میں شائع ہونے والی کتاب میں نہ صرف شوالیت (CHIVALRY) کے عہد کے خاتمے پر افسوس کا اظہار کیا بلکہ نئے دور کو روشنی اور عقل کی نئی فتح کرنے والی سلطنت سے تعبیر کیا۔ غالب نے جہاں مٹنے والی تہذیب کا ماتم کیا اور دہلی کے ذرّہ ذرّہ خاک کے مسلمانوں کے تشنۂ خوں ہونے کا اظہار کیا، وہاں انگریزوں اور انگریزوں کی سلطنت کی تعریف کی، ملکہ وکٹوریہ اور انگریز حکام کی تعریف میں قصیدے بھی لکھے۔ ان کے کلام میں قدیم کے خاتمے کے احساس اور جدید کے آئین نو کے شعور کے ساتھ ساتھ روشنی اور عقل کی فتح مندی یا منور الفکری اور تعقل پسندی کی ظفریابی نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔

غالب کا دائرہ فکر آزاد خیالی کے نام پر پیش کی جانے والی بعض مصنفین کی تحریروں سے، فنی اور فکری طور پر بدرجہا بلند ہے۔ فنی طور پر اس لیے کہ قدیم و جدید کی آویزش اور تضاد کو احساس کی متنوع کیفیتوں اور معنی کی متعدد تہوں کے ساتھ غالب نے جن شاعرانہ پیکروں میں ڈھالا ہے۔ دوسروں کے یہاں اس کا شائبہ بھی نہیں۔ فکری طور پر اس لحاظ سے کہ غالب کا شعور محدود نہیں۔ وہ صرف ایک گوشۂ آزادی کو نہیں پیش کرتے، بلکہ ان کا شاعرانہ ادراک عقلیت اور روشنی کی وسعتوں پر محیط ہے۔ یہاں تک کہ وہ روشِ خاص کا دعویٰ کرنے والے اہلِ خرد کے یہاں پابستگی رسم و رہ عام کے شاکی ہیں یعنی غالب کے نزدیک ان کی ذہنی بغاوت بنیادی نہیں بلکہ وہ انحراف کے پامال راستوں پر گامزن ہیں اس کے برخلاف غالب نے صرف زاہدانہ تنگ نظری کو نہیں، انسانی حوصلے کے مقابلے میں کائنات کو موضوع بنایا ہے۔ پھر ان کی یہ فکر ایسی شاعرانہ شباہتوں میں ظاہر ہوئی ہے کہ ان کی تعبیر محض مجرد تصورات کے اعتبار سے نہیں کی جاسکتی بلکہ ان کی قوت تخیل اور وسعتِ تصور کے ساتھ ساتھ ان میں احساس و معنی کے نئے جہاں آباد نظر آتے ہیں۔ انسانی آرزوؤں میں مزاحم، معاشرتی اور کائناتی محدودات کا ادراک غالب کو یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ:

کوہ کے ہوں بارِ خاطر گر صدا ہو جائیے
بے تکلف اے شرارِ جستہ کیا ہو جائیے
بیضہ آسا ننگ بال و پر ہے یہ کنج قفس
از سرِ نو زندگی ہو گر رہا ہو جائیے

غالب کا دور ایک ایسی تاریخی اور تہذیبی کشمکش کا دور تھا، جس کی مشابہت برصغیر کی تاریخ میں پہلے نہیں ملتی تھی۔ دراصل تاریخ میں ہر واقعہ اپنی انفرادی نوعیت رکھتا ہے اور ان معنوں میں تاریخ کبھی اپنے آپ کو نہیں دہراتی، صرف اس کی ظاہری مماثلتوں کی بناء پر تکرار کا گمان ہوتا ہے۔ لیکن غالب کے دور کی یہ ظاہری مماثلت بھی موجود نہیں تھی، اس لیے اکثر نظریں رشتۂ حقائق کی گرفت سے قاصر رہیں۔ صدیوں کی قائم تہذیب جس کے رنگوں سے فنونِ لطیفہ کے اقدارِ جمال کی ترتیب ہوئی تھی، ایسے انتشار کا شکار تھی کہ اس کا زوال اگر عام نظروں سے مخفی رہے تو رہے، حساس آئینوں میں ضرور دیکھا جاسکتا تھا۔ غالب کی شاعری بھی ایک ایسا ہی آئینہ ہے۔ لیکن یہ آئینہ صرف انفعالی نہیں۔ اس آئینے میں غالب کی نظر کی دور بینی بھی پیوست تھی۔ کار گزارانِ تحقیق یہ پتہ چلاتے رہیں کہ "ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے" کی کیفیات کو پیش کرنے والی غزل ۱۸۵۷ء سے کتنے پہلے لکھی گئی تھی۔ لیکن غالب "اک شمع رہ گئی ہے، سو وہ بھی خموش ہے" کہہ کر یہ بتا دیتے ہیں کہ ان کی نظر دیوار کی تحریر پڑھنا جانتی تھی۔ لیکن ان کی پیش بیں ذکاوت جہاں قائم شدہ تہذیبی صفات سے جذباتی تعلق رکھتے ہوئے بھی، اس کے خارجی

دباؤ اور اندرونی انتشار کے ہاتھوں پارہ پارہ ہونے کا منظر دیکھ رہی تھی، وہاں وہ اس منظر کے پیچھے نئے امکانات کا اندازہ بھی کر سکتی تھی۔ یہی نہیں وہ انسان اور انسان کے درمیان اس کشمکش کو بھی دیکھ رہے تھے، جو کسی بھی تہذیب میں معاشرے کی ہموار ترقی میں مانع ہو سکتی ہے۔ یقیناً غالب کے اشعار میں بعض لفظوں کا وہ مفہوم نہیں، جو تاریخ کی کئی منزلوں سے گزرنے کے بعد آج ہمارے ذہنوں میں موجود ہے۔ لیکن وہ الفاظ آج اور کل کے تسلسل میں ایک بامعنی صورت کو ضرور پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب غالب "دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم" کہتے ہیں تو اس میں اس مزدور سے جسے ہم پرولتاریہ کے نام سے جانتے ہیں۔ ہمدردی کا کوئی شائبہ نہیں ملتا اور نہ ہم اس تاریخی صورتِ حال میں، ان سے اس کی توقع کر سکتے ہیں۔ مگر جب وہ کہتے ہیں کہ:

عشق و مزدوریٔ عشرت گہِ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامیٔ فرہاد نہیں

تو یہ ایک ایسا حرکت آفریں شعر ہے، جو عشرت گہِ خسرو کے کلیدی تلازم سے معاشرتی کشمکش کے تضاد کو پیش کرتے ہوئے ماضی کی اقداری روایات کو تسلیم کرنے سے پہلے اور مستقبل میں ایک نئے بامعنی عمل کا اشارہ بن جاتا ہے۔ غالب کو عشرت گہِ خسرو کی مزدوری پر اعتراض ہے، لیکن اس کا متبادل عمل، اس وقت تک وقت کے نہاں خانے میں پنہاں تھا۔ غالب کے کلام کی رمزیاتی حقیقت شناسی حال کو مستقبل تک لے جاتی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کے اشعار کی نئی تعبیروں کی راہیں نکالتی ہے۔ اس ضمن میں اک ذرا مختلف کیفیت کے لیے غالب کا مندرجہ ذیل فارسی شعر بھی ملاحظہ ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ:

اے گُلِ تر بہ رنگ و بو، ایں ہمہ نازش از چہ رو
منّت ابر یک طرف، مزد چمن طراز دہ

غالب کے متعدد اشعار مستقبل کا رُخ لیے ہوئے ہیں۔ مثلاً

کریں گے کوہ کن کے حوصلے کا امتحاں آخر
ہنوز اس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے

ہے موجزن اک قلزم خوں کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

آخری شعر کی تفصیلِ جذبی نے گویا اپنی نظم "موت" میں پیش کی ہے جو شاید ان کی سب سے کامیاب نظم ہے۔ واضح اشارۂ مستقبل کے علاوہ غالب کے ایسے متعدد اشعار بھی، جو صریحاً ماضی سے تعلق رکھتے ہیں، اپنے اندر مستقبل کے امکانات لیے ہوئے

ہیں۔ مثلاً

آزادیِ نسیم مبارک کہ ہر طرف
ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گل
مانعِ وحشت خرامیہائے لیلیٰ کون ہے
خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا

غالب کے بعض مشہور فارسی اشعار روایت شکنی کے انداز کے ساتھ ساتھ انقلاب آفرینی کے مضمرات بھی رکھتے ہیں۔ مثلاً

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم
قضا بہ گردشِ رطلِ گراں بگردانیم

با من میاویز اے پدر فرزند آزر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نکرد

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و زخورشید نشانم دادند

غالب کی شاعری کا حسی اور فکری نظام انسانی مسائل کا گہرا شعور رکھتا ہے، ان کے یہاں حقائق کا ادراک صرف خارجی یا سطح پر نہیں۔ بلکہ وہ انفس و آفاق کے حوالے سے انسانی وجود کی اس غیر مختتم کشمکش کو اپنا موضوع بناتے ہیں، جو عالم فطرت سے لے کر عالم محسوسات تک اپنا دائرہ وسیع کیے ہوئے ہے۔ غالب نے انسان کو تہذیب سے وابستہ سمجھتے ہوئے بھی اسے عالم فطرت سے الگ نہیں کیا ہے۔ دو مقابل حقیقتوں یعنی تہذیب کی پابند شائستگی اور فطرت کی آزاد بے لگامی کے درمیان وہ انسان کو کرب کی . . . ہوئے پاتے ہیں۔ ان کے لیے حوادث ذات کے اندر بھی اور ذات کے باہر بھی سب مسائل، تصورات اور کیفیات ایک . . . سے میں لفوذ رکھتے ہیں اور عمومی و اعیانی کی باہمی آویزش جاری ہے۔ یہ کائنات طبعی طور پر متحرک ہے اور جذبے کی گرمی سے رقصاں بھی۔ حقیقتِ اشیاء، حقیقتِ ذات سے مربوط بھی . . . تصادم بھی، چنانچہ ہستی کو وہم و حقیقت اور ہے اور نہیں دونوں منزلوں سے گزارتے ہوئے غالب ادراک ذات تک پہنچتے ہیں لیکن ان کے نزدیک ذات معیار آگہی ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ میں تنہا نہیں، بلکہ اسے خود اپنا عرفان دوسروں کے وسیلے اور کائنات کے واسطے ہوتا ہے۔ پھر خود کائنات اپنے طور پر اجتماعی کل کا طبیعیاتی یا مابعد الطبیعیاتی آئینہ ہے۔ غالب جب کہتے ہیں کہ:

نہ پوچھ وسعتِ مے خانۂ جنوں غالب
جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز

تو یہ "مے خانۂ جنوں" صرف انفرادی انا کی عکس نہیں بلکہ انسانی انا کی توسیع ہے اور تضادوں کے سب سے بڑے تضاد یعنی ذات اور اکنافِ کائنات کی متوازیت جنوں اور خاک انداز کے لفظوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے، جہاں واہمہ و یقین سے گزر کر حاصلِ لاحاصل اور لاحاصلِ حاصل دونوں ہوش رُبا بن جاتے ہیں۔

قومی زبان (۱۹) فروری ۱۹۹۴ء

برصغیر میں انگریزوں کے واسطے سے صنعتی تہذیب کا آغاز، جدید علوم اور سائنس کی فتوحات کا تعارف تھا۔ برصغیر ہی
میں انیسویں صدی میں دنیا کے بڑے سائنس دانوں، مفکروں اور دانش وروں نے سائنسی وسائل اور جدید علوم کے ذریعے انسان
اب تک حاصل شدہ بہتری کے خواب دیکھے تھے۔ اگر یہ خواب پورے نہ ہوئے تو ان میں یہ علوم اور جدید سائنس کا نہیں، ان
ے کام لینے والے استحصالی مفادات کا قصور ہے۔ انسان ذرّے کا دل چیر سکتا ہے اور چاند پر اپنا جھنڈا گاڑ سکتا ہے، لیکن اپنے
اشرے کی منصفانہ تنظیم پر قادر نہیں۔ اس نے کسی ایک خطۂ زمین یا تمام عالم میں جو فساد بھی برپا کیا ہو اس کے ساتھ ساتھ
سانی روح اور انسانی ضمیر کو حزن، اضطراب، کشمکش، کرب، تلخی، تنگی، خشم، فشار اور مغائرت سے پارہ پارہ کر دیا ہے۔ کیا اکیسویں
صدی میں ہم یہی اجزائے شکست لے کر داخل ہو رہے ہیں؟

ایک صدی پہلے غالب کو تمام آنے والے کوائف کا علم ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن وہ انسان کی سرشت، معاشرے کے عدم
توازن اور حالات کی اس کشمکش سے واقف تھے، جس نے اسے ہمیشہ مضطرب محزوں رکھا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ وہ کہتے ہیں
:

نہ کہہ کہ گریہ بہ مقدار حسرتِ دل ہے
مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیٔ آزادی
ہوئی زنجیر موجِ آب کو فرصت روانی کی

خزاں کیا فصلِ گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

کار گاہ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے
برقِ خرمنِ راحت خونِ گرم دہقاں ہے

دور ہو یا دہقان، زنجیر ہو یا زندان ان علامات کے ذریعے غالب نے انسانی احوال کی کرب ناک اور شوریدہ کیفیات کو پیش
وہ غیر متوازن معاشرے میں استبداد کی چیرہ دستی اور وسیع لایعنی مظاہر و اشیاء میں جبر ہی، بدبختی کی نقش طرازی کرتے
بار ان کے یہاں انسان اور آدمی کے تضادات نمایاں ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ وہ اس عمومی صورتِ حال فراموش نہیں
ں کا انسان ازل سے اب تک شکار رہا ہے۔ چند فارسی اشعار، اس باب میں غور طلب ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

آرائش زمانہ ز بیداد کردہ اند

بہ خوں کہ ہست غازہ روئِ زمیں شناس

مگر آتش نفس دیوانۂ مرد از اسیرانت
کہ دود از روزنِ دیوارِ زنداں بر نمی آید

ہر چہ بینی بہ جہاں حلقۂ زنجیرے ہست
ہیچ جانیست کہ ایں دائرۂ باہم نرسد

بادیدہ و دل از دوسُو، ماندم بہ بندِ غم فرو
اندوہ پنہاں یک طرف آشوب پیدا یک طرف

شود برہم ولے زنہر پندارد کہ درخوابم
شبے کا وازِ نالیدن ز زندانم نمی آید

تا دل بہ دنیا دادہ ام، در کشمکش افتادہ ام
اندوہِ فرصت یک طرف، ذوقِ تماشا یک طرف

آیندہ و گزشتہ تمنا و حسرت است
یک کاشکے بود کہ بہ صد جانوشتہ ایم

انسان جو خلوت میں انجمن اور بجائے خود محشرِ خیال ہے، کیا اسی طرح غیر انسانی صورتِ حال کا اسیر اور بے چارگی کا شکار رہے گا؟ وقت کے دامن میں گرہ کشائی کا سامان بھی موجود ہے۔ غالب جو بے کسی میں بھی خجالت اپنی ذات ہی سے کھینچنا چاہتے اور انفعال کو ہنگامہ زبونی ہمت کہتے ہیں، انسان کی تقدیر سازی کا یہ پیغام بھی دیتے ہیں کہ:

نزا کہ گفت کہ منت کشِ چرخِ کبود
بہ قہر کام دل خویشتن ز اختر کش

غالب کو فارسی شاعری میں روایت کی تقلید اور روایت کے چیلنج دونوں کا سامنا تھا، اردو شاعری نے انھیں نسبتاً زیادہ آزادانہ میدان فراہم کیا ہے۔ وہ کس آسانی سے احساس و خیال کو یکجا کرتے ہوئے۔ استعارہ سازی کے اجتماعی انسلاک کا جادو جگاتے اور شاعرانہ تخیل کو تجریدی صفت کا حامل بناتے ہوئے مادی و معنوی غایتوں کو سمیٹ لیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

پرِ پروانہ شاید بادبانِ کشتیِ مے تھا

لیکن فارسی کلام ہو یا اردو شاعری غالب نے انسان کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔

غالب سے پہلے اردو شاعری میں انسان کو بطورِ خاص میر اور آتش نے موضوع بنایا تھا۔ میر نے انسانی دردمندی کے جن تاروں کو چھیڑا ہے اُن کی شیریں موسیقی دلوں میں اتر جاتی ہے اور اُن کی شعری تصویروں کی زیبائش تاثر و ترفیع کے منفرد رنگوں سے ترتیب پاتی ہے۔ آتش نے انسانی عزم و ولولہ کو خاص طور پر مرکزِ توجہ بنایا اور اپنی شاعری میں ایسی تب و تاب بھر دی کہ اس کی لے کی توانائی نیا سامانِ تلاطم فراہم کرتی رہی۔ اقبال نے انسانی عظمت کو جس جس طرح نئی نئی شکلوں میں نمایاں کیا ہے۔ اس کی اردو شاعری میں قدر آفریں حیثیت ہے۔ ان کی شاعری سے عصرِ حاضر کا فکری شعور مستحکم ہوا اور شعری جمالیات کو نئی بنیادیں ملی ہیں۔ اقبال مشرق و مغرب کے معیاراتِ نظر سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مفکرانہ جلال کا نقش ثبت کرتے اور انسان کو تسخیرِ کائنات کی منزل تک لے جاتے ہیں۔ فیض نے سیاسی جدوجہد سے انسانی بڑائی کے رنگوں کو تابانی بخشی ہے لیکن وہ محض تفسیر کنندۂ وقائع سیاسی نہیں بلکہ ان کی شعری جمالیات رومانیت و حقیقت کے امتزاج کے ساتھ ساتھ تصور کو عمل اور عمل کو دل کی لرزش بنانے کی جو غیر معمولی صلاحیت رکھتی ہے، اس سے انسانی نصب العین پر محکم یقین کے متعدد پہلو نکلتے ہیں۔ غالب یقین کے کسی خوش خبر نظارۂ جمال کی آسودگی کے بجائے اقدار کی کشمکش کے پیہم اضطراب میں گرفتار ہیں۔ جاگیردارانہ معاشرتی قدروں سے وابستہ ہوتے ہوئے وہ سرمایہ دارانہ نظام کی خوش ترکیبی سے متاثر ہوئے لیکن انسانی وجود کا تناظر پر حسن و قبح کے نئے زاویے منکشف کرتا اور آشوبِ نظر کا طلسم پیچ و تاب بن جاتا ہے۔

خیال اور مادے کے جس تعلق کو حالی نے تنقیدی شعور کے ساتھ ادبی محاکمے کی بنیاد بنایا، اس کی جانب لطافت و کثافت کے لفظوں میں غالب نے پیش قدمی کی تھی اور اپنے بیان سے شاعرانہ تجربے کے اظہار کی صورت نکالی تھی۔ غالب نے انسانی عظمت کے ساتھ ساتھ اس کی حزینہ صورتِ حال کو بھی زبان بخشی ہے۔ غالب کا انسان، خواب اور حقیقت کی کشمکش میں کئی زمانوں کے مقابل ہے اور اس کی زندگی اندرونی اور بیرونی طور پر جن المیوں میں گرفتار ہے، ان سے اس کی آزمائش کی راہیں زیادہ دشوار گزار ہو جاتی ہیں۔ مگر ماضی و حال میں اس کے کرب کی اذیت مستقبل کی آرزومندی کو زیادہ گہرا کر دیتی ہے۔ غالب مادی حقیقتوں اور منطقی تعبیروں کے علاوہ مظاہر کے رشتوں میں تصویر کی کارفرمائیوں کو بھی جلوہ گر دیکھتے تھے۔ ان کی فکر سے قدامت پسندی پر ضرب لگی اور روشن خیالی کی ارتقاء پذیری کو تقویت حاصل ہوئی لیکن وہ بے کراں وقت کے تناظر میں کائنات کے اسرار و رموز کی اس سریت کو بھی پیش کرتے ہیں جو وجود و عدم، موجود و ماوراء اور شے و لاشے کو مربوط کرتی ہے اور جن کے باہمی تعلق کی تلاش میں خیال ہمیشہ کوشاں رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تصوف غالب کے لیے محض "قال" کی حیثیت رکھتا تھا "حال" کی نہیں، لیکن تصوف کی وسیع روایت کو نظر انداز کر کے غالب کی تلمیحات، اشارات اور معنیات کی صحیح توجیہ نہ ہوگی۔ اسی طرح صرف مشکل لفظوں کی تشریح کر کے شارحین غالب خود اپنے لیے مشکلات پیدا کرتے اور معنیٔ غالب کی تفہیم میں مانع ہوتے رہے ہیں۔ غالب کے لیے جمہوریت اور طبقاتی جدوجہد کے مفاہیم ناقابلِ فہم تھے۔ لیکن طبقۂ اشرافیہ سے ذہنی اور تہذیبی وابستگی کے باوجود غالب کے یہاں انسان دوستی کا وہ چراغ روشن نظر آتا ہے، جس کی کرنیں آج تک ذہنوں کو منور کر رہی ہیں۔ اس کے برخلاف بعض آزاد خیالوں کے بارے میں چاہے وہ غالب سے پہلے ہوں یا بعد کے، خود غالب کے لفظوں میں "اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو" کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ان کی آزاد خیالی ایک ایسا انانیت کا نشان ہے جو فرد اور معاشرے دونوں کو پہچاننے سے قاصر ہے اور اسی لیے قدامت کے انبار میں گم ہو گئی ہے۔ ایسی آزاد خیالی جو ذات کی نمائش کی صورت رہے، اس

انسان دوستی سے خالی ہے، جس سے زندگی کو ایک ایسا اندازِ فکر ملتا ہے جو برداشت و تحمل کے ساتھ صرف ناگوار ذہنی اثرات کے خلاف نہیں بلکہ تمام ناانصافیوں، بدنمائیوں، سختیوں اور حوادث کی جبری صورتوں کے مقابل صف آرا رہتا ہے۔ اس کا دائرہ شخصی پسند اور ناپسند سے بلند ہے اور اس میں مستقبل کے نئے امکانات کی جستجو کلیت کے بجائے مرمت کے نقوش استوار کرتی ہے۔ اس میں زندگی کی انفرادی محرومیوں اور کشمکش و تضاد کی پیدا کردہ پیچیدگیوں کے باوجود اجتماعی تعقل کا احساس ہوتا ہے۔ پھر یہ تعقل اپنے اندر زرنگار رنگ تصورات کی ثروت لیے ہوتا ہے اور یہ ثروت منفی ربط سے نہیں، مثبت تعلق سے ظہور میں آتی ہے۔ اس انسان دوستی کے احساس کی لہروں میں امید کی خوشی اور مایوسی کا اضطراب دونوں شامل ہیں۔ لیکن ذات کی ہار متعلقات سے آزاد، نوعِ انساں کی آزادی اور بہتری کی خواہش بھی اس کی متمائز موج ہے۔ انسان کی فلک زدگی اور زبوں کاری ازل سے اب تک سہی، ابد تک مقدر نہیں۔ انسان اپنے وجود کی سرگراں تنہائیوں سے دوچار ہوتے ہوئے بھی وسیع عالم انسانیت سے پہلے اپنا رشتہ قائم رکھتا ہے۔ وہ اپنے تخیل کی سرانگیزی اور اپنے تخلیقی عمل کی طرح افگنی سے جمال و زیبائی کے مظاہر عدم سے وجود میں لاتا ہے۔ یہ انسان دوستی آگہیِ ذات اور معاشرے کی ہم آہنگی سے وجود پاتی ہے اور تخلیقی انا کو اپنی تہذیب ہی نہیں، عالمی انسانی تہذیب کا حصہ بناتی ہے۔ تخلیقی انا کی یہ وسعت ہمیں غالب کے کلام میں نظر آتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ غالب کے کلام میں اس انسان دوستی کی تابانی ہے، جس سے مستقبل کی انسانی جمہوریت روشنی پائے گی۔ اسی لیے ان کے کلام کے نئے نئے گوشے روز بروز زیادہ نکھر کر سامنے آرہے ہیں۔

غالب۔ غالب

صبا اکبر آبادی

غالب برصغیر کا زندہ معجزہ تھا اس کی اردو شاعری نے اسے شہرت دوام بخشی مگر وہ اس سے مطمئن نہ تھا اور بار بار پکارتا تھا کہ:

فارسی بین تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اُردو بے رنگِ من است

مگر امتداد زمانہ نے اسی بیرنگی کو اس کا سرمایۂ افتخار بنا دیا۔ اگر انگریزی حکومت کا قیام عمل میں نہ آتا اور درباری زبان فارسی رہتی تو شاید غالب کو اس قسم کی تنبیہ کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہ ہوتی مگر وقت پر کس کا اختیار ہے۔ حکومت کے ساتھ فارسی پر بھی زوال آتا گیا اور یہ حالت ہو گئی کہ آج ایک فیصد فارسی داں بھی بمشکل مل سکتے ہیں۔ جو لوگ "آمد اور رفت" کے آشنا ہیں وہ کلام فارسی کی خصوصیات سے ناآشنا ہیں اس کے رس سے ناواقف ہیں کیوں کہ ان کی فارسی اسکولوں اور کالجوں کے نصاب تک محدود ہے جس میں وہ مرگر کے کسی نہ کسی طرح "پاس" تو ہو جاتے ہیں لیکن تحقیق لفظی و معنوی سے ان کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا اساتذہ متقدمین و متاخرین کے کلام سے بے بہرہ، لطف بیان سے ناآشنا فارسی زبان کے پیچ و خم میں بھٹک کر رہ جاتے ہیں۔

اب سے ساٹھ برس پہلے تک جب ابتدائی تعلیم چٹائیوں پر بیٹھ کر مولویوں سے حاصل کی جاتی تھی کچھ نہ کچھ فارسی کے اسرار و غوامض ذہن نشین ہو جاتے تھے مگر جب مکتب اجڑنے لگے اور اسکولوں کا دور شروع ہوا تو فارسی بھی معرض زوال میں آ گئی اور اب یہ عالم ہے کہ فارسی کے اساتذہ بھی درسگاہوں میں لغت کی مدد سے فارسی پڑھاتے ہیں۔ پھر جب طالب علموں میں ذوق علم بھی باقی نہیں رہا تو وہ فارسی پڑھ کے کیا کریں جو نہ کسی دفتر میں کام آتی ہے نہ ملازمت میں مدد و معاون ہوتی ہے حد تو یہ کہ اب تو کوئی علم دوست اپنے بچوں کے لیے فارسی ٹیوٹر بھی مقرر نہیں کرتا۔ لہذا فارسی کیوں پڑھی جائے؟ دوسری طرف ان علاقوں میں جو اب بھارت کا حصہ ہیں خود اردو کو اپنی بقا کے لیے جدوجہد کرنا پڑ رہی ہے وہاں فارسی کا کون نام لے۔ ایک ادارہ دیوبند میں قائم ہے جہاں نصاب تعلیم کا بڑا حصہ عربی ہے اور فارسی دوسری زبان کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ علوم شرقیہ پر ادبار کی گھٹائیں چھا رہی ہیں۔ اس صورت حال میں کسی کی شکایات ایک طرف خود فارسی کا مولد و گہوارہ ایران بھی اپنی قدیم ادبیات کو ترک کر رہا ہے۔

قومی زبان (۲۴) فروری ۱۹۹۴ء

موجودہ فارسی اب سے پچاس برس پہلے کی فارسی سے مختلف معلوم ہوتی ہے چنانچہ اگر آدھی آدھی صدی کے فرق سے ایرانی زبان پر نظر ڈالیں تو رودکی، عنصری، قاآنی، خاقانی، ظہوری، فردوسی، سعدی، حافظ، عرفی، نظیری، ناصر خسرو، رشید وطواط کی زبان وہاں اجنبی ہو گئی ہے بس ایک ہم آہنگی ہے جو سب میں یکساں ہے۔

پاکستان اور ہندوستان میں متعدد فارسی گو شعراء گزرے ہیں۔ اب سے ایک صدی قبل تو کوئی اردو شاعر ایسا نہ تھا جس نے اردو کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی طبع آزمائی نہ کی ہو مگر گنتی کے جو نامور شعرائے فارسی گو کے برصغیر میں نمایاں ہیں ان میں حضرت امیر خسرو، محمد طاہر غنی کاشمیری، مولانا غنیمت، مرزا بیدل، مرزا غالب اور علامہ اقبال سرفہرست ہیں جہاں تک حضرت امیر خسرو کا تعلق ہے وہ تو ایک ہمہ جہت اور نابغہ روزگار ہستی تھے فارسی کوئی معتبر اہل ایران نے بھی ان کا لوہا مانا ہے اس کے علاوہ فن موسیقی، سپاہ گری اور انتظامی امور میں صلاحیت کے ساتھ وہ ایک طرح ریختہ کے بانی بھی قرار پائے ہیں۔ ملا طاہر غنی کاشمیری ایک خدا رسیدہ بزرگ تھے علائق دنیوی سے بے نیاز یاد خدا اور شعر گوئی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ مولانا غنیمت اپنی مثنوی کی بدولت برصغیر کے فارسی ادب میں ایک بلند مقام پیدا کر گئے۔ مرزا عبدالقادر بیدل نے بھی اپنی شعر گوئی اور بلاغت سے بڑا نام پیدا کیا اور ان کے معنوی فرزند مرزا غالب نے فارسی شاعری کو منتہائے کمال تک پہنچا دیا۔ نظم و نثر فارسی میں غالب کسی طرح نظیری اور ظہوری کے مقابل کمتر نہیں ٹھہرتے بلکہ اکثر مقامات پر ان بزرگوں سے آگے بڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مرزا کی دستنبو، مہر نیم روز، ماہ نیم ماہ، پنج آہنگ، نثر فارسی کی شاندار تصانیف ہیں لیکن زوال سلطنت مغلیہ کے ساتھ ساتھ یہ سب پردہ خفا میں چلی گئیں البتہ ان کی کلیات فارسی جو ان کی حیات میں ہی مرتب ہو گئی تھی اب بھی خال خال ہم دوست حضرات کے پاس مطبوعہ شکل میں نظر آ جاتی ہے۔

اپنے عہد طفولیت سے ہی مجھے فارسی کے اساتذہ متعددین اردو اور بالخصوص کلام غالب سننے کو ملتا رہا تھا جو نتیجہ تھا میرے والد کے شوق مطالعہ کا۔ گھر پر جب وہ اپنے دوستوں کی محفلوں میں اشعار سناتے تو میرے کان میں بھی پڑتے۔ عربی اور فارسی میں تعلیم کا آغاز ہونے اور سمجھنے کی منزل پر مجھے غالب کا اردو کلام دیگر شعراء سے کچھ مختلف بھی لگتا اور اچھا بھی لگتا تھا۔ لیکن سنہ ۱۹۲۰ء میں شاعری کے آغاز تک میں جہاں فارسی کے بیشتر شعرا کو سبقاً سبقاً پڑھ چکا تھا وہیں اکثر اردو اور فارسی اساتذۂ سخن کے بیشتر اشعار مجھے از خود یاد ہو چکے تھے اور اردو کلام غالب کا میں بغیر کوشش کئے حافظ ہو چکا تھا۔

آج کے عہد میں تعلیم کی بتدریج کمی اور تنزلی کے بعد تو غالب اور زیادہ مشکل شاعر محسوس ہونے لگا ہے لیکن اس عہد میں بھی کلام غالب کی شرحیں لکھی جا رہی تھیں۔ سخن فہم حضرات میں بھی غالب کے اشعار کے معنوں میں اختلاف ملتا تھا جس پر مجھے خیال آیا کہ غالب کی شاعری کو شاعری کے ہی ذریعے سمجھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔ نثر اس معاملہ میں معنی کی حد تک تو مددگار ہو سکتی ہے لیکن احساس اور انداز بیان کا قتل عام ہو جاتا ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۸ء میں جب میں نے دیوانِ غالب کی تضمین شروع کی تو اس بات کا خاص التزام رکھا کہ کسی شعر کو حذف نہ کیا جائے اور تمام غزلیات اور ہر شعر کی تضمین اس طرح کی جائے کہ شعر کا مضمون بھی واضح ہو جائے اور غالب کے شعر کی شرح بھی ہوتی جائے۔

یہ میری شاعری کے ابتدائی عشرے کا واقعہ تھا لہذا ارادے بلند اور اعصاب مضبوط تھے چنانچہ اندازہ نہ ہوا کہ کتنے بڑے کام کا آغاز کر بیٹھا ہوں اور پھر ایک خود عائد کردہ پابندی یہ تھی کہ اگر کبھی کسی شعر کا مضمون اظہار کے پیرایہ میں نہیں آیا تو اسے چھوڑ کر آگے شعر کی تضمین نہیں شروع کی بلکہ جب تک وہ منزل سر نہ ہوئی آگے نہ بڑھا بہت سے مواقع پر یوں بھی ہوا کہ معاشی اور

معاشرتی ذمہ داریوں کی بنا پر چھ چھ مہینے تضمین کی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہ مل سکی۔ یوں سنہ ۱۹۲۸ء میں شروع ہونے والی اس کہانی کا اختتام دس سال کے بعد سنہ ۱۹۳۹ء میں ہوا۔ مشہور ادیب اور محقق مولانا حامد حسن قادری مرحوم نے اپنی کتاب "نقد و نظر" اشاعت سنہ ۱۹۴۲ء میں اس تضمین کے بارے میں اپنی مبسوط رائے ظاہر کی اور میرا حوصلہ بڑھایا۔ وقت ہوا کی طرح گزرتا گیا اور تضمین شائع کرنے کی خواہش ہزاروں دوسری خواہشوں کی طرح خواب ہو گئی۔ پھر ۴۵ برس بعد فارسی رباعیات غالب کا رباعی میں ترجمہ کرتے ہوئے مجھے اندازہ ہوا کہ اس راہ گزر سے تو میں جوانی میں بھی گزرا تھا۔ ماضی کا وہ بھاری پتھر اب بھی میرے سر کا تکیہ ہے۔ خدا نے چاہا تو ایک روز آنے والی نسلوں کے لیے غالب کی راہ میں نشانی کے طور پر پیش کروں گا تاکہ نئی نسل بھی اس عظیم شاعر کی فکر میں سے اپنی خوشی کشید کر سکے۔ غالب کو اپنی فارسی شاعری پر ناز بھی تھا اور بیجا بھی نہ تھا۔ جو شخص شعرائے ہند میں سے ایک دو شاعروں کے علاوہ کسی کو نہ گردانتا ہو۔ اور فرہنگ لکھنے والوں کو قیاس کا پیرو سمجھتا ہو۔ اس کا اپنی شاعری پر غرہ بے سبب نہیں ہو سکتا پھر قتیل کے ساتھ معرکوں کی تفصیل پڑھیں تو غالب کے اعتراضات دھوپ میں چمکتی ہوئی تلوار کی طرح روشن نظر آتے ہیں۔ ذرا مرزا کی اس تحریر کو پڑھیے "اہل ہند میں سوائے امیر خسرو کے کوئی مسلم الثبوت نہیں۔ میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے۔ فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے جو اپنے تئیں صحیح سمجھا لکھ دیا۔ نظامی کی، سعدی وغیرہ کی لکھی ہوئی فرہنگ ہو تو ہم اس کو مانیں ہندیوں کو کیوں کر مسلم الثبوت جانیں۔ گائے کا بچہ بہ زور سحر آدمی کی طرح کلام کرنے لگا۔ بنی اسرائیل اس کو خدا سمجھے۔" اس تحریر سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ کہنے والے کے بیان کا محرک وقتی اشتعال نہیں بلکہ عمیق مطالعہ اور ایک بنی ہوئی رائے ہے۔ سوچ ہے، ژرف نگاہی ہے، اور جودت فکر ہے۔

بات یہ ہے کہ فارسی زبان میں ایجاز و اختصار کا ایک خاص جادو ہے۔ کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ بات کی جا سکتی ہے۔ تراکیب مل کر ایک نیا جہاں معنی آباد کرتے ہیں۔ غالب جیسے ذہین شاعر نے یہ کام اردو میں جس طرح کیا ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں، دوسری طرف ہمیں یہ بھی سوچنا ہوگا کہ جو کام اردو میں اتنے عمدہ طریقے سے ہوا ہے وہ فارسی میں بھی اسی طرح بلکہ زیادہ بہتر انداز میں ہوا ہوگا۔ خدا معلوم اہل علم کی توجہ مرزا کی فارسی شاعری پر اس طرح کیوں نہ ہوئی جب کہ خود غالب بھی بار بار یہی پکارتے رہے کہ دیکھنا ہے تو ... بگو۔

پاکستان کے قیام کے بعد میرے ذہن و دل کی ایک عجیب کیفیت تھی جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں لیکن میں نے اس کیفیت سے نجات پانے کے لیے ایک بار پھر بیدل، حافظ، سعدی، خیام، غنی، نظیری، قاآنی، ظہوری، فردوسی، ثنائی، غالب اور دیگر فارسی گو شاعر کو اہتمام کے ساتھ پڑھنا شروع کیا۔ اور پھر یہی سوال بار بار میرے سامنے آتا رہا کہ غالب کے فارسی کلام کی اس طرح پذیرائی کیوں نہیں ہوئی۔ ایک روز کلام بیدل پڑھتے ہوئے اچانک ذہن میں غالب کا یہ شعر بجلی کی طرح کوند گیا۔

طرز بیدل میں ریختہ کہنا

اسد اللہ خاں قیامت ہے

اور اسی لمحہ جیسے یہ بات آشکار ہو گئی کہ فارسی میں تو حافظ، سعدی، خیام جیسے بہت عظیم شعرا کرام کے ساتھ ساتھ بیدل بھی موجود ہیں جو فارسی شاعروں میں اپنی فکر اور اسلوب کی بنا پر بڑی انفرادیت اور بڑی عظمت کے حامل ہیں۔ دوسری طرف اردو میں بھی شعرائے نامدار کا ایک عظیم اجتماع ہے۔ لیکن اردو میں طرز بیدل کی فکر کے موجد اور خاتم صرف مرزا غالب ہیں۔ فکر انگیز، کشادہ دل، شریر، شوخ، ظریف، مہجور، مجبور، مفلوک، امیر، دربار دار، فقیر منش غالب۔ یعنی فارسی گو شاعروں میں جو انداز بیدل کو انفرادیت عطا کرتا

ہے اردو شاعروں میں وہی طرز غالب کے لیے عظمت کا سبب بن جاتا ہے۔

دوسری طرف یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ غالب کی اردو شاعری پر بیدل کے جتنے بھی اثرات ہوں فارسی شاعری میں وہ ہو بکھی لڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کبھی ظہوری کے مقابل میں خقائی بن جاتے ہیں۔ اور کبھی کوئی اور انداز اختیار کر لیتے ہیں۔ مختلف ذائقوں کے مشروب جمع ہو کر جو خوشگوار تاثر پیدا کر سکتے ہیں غالب کی فارسی شاعری اس کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔

مرزا کی اردو شاعری، خطوط اور فارسی شاعری کو پڑھنے سے ایک شخصیت ہی ابھر کے سامنے نہیں آتی زندگی کی بوقلمونی بھی نظر آتی ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان تینوں چیزوں کو علیحدہ علیحدہ پڑھیں تو جو انفرادی تاثرات مرتب ہوتے ہیں وہ اپنی جگہ مکمل ہوتے ہیں لیکن جب ان تینوں یعنی اردو شاعری، خطوط اور فارسی کلام کو یکے بعد دیگرے تواتر سے پڑھیں تو جو وحدت تاثر ابھرتی ہے وہ گزشتہ تاثرات سے متصادم نہیں ہوتی بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے سلطنت، عوام اور سربراہ یکجا ہو گئے ہوں۔

غالب کے فارسی قطعات، نوحہ جات، ترجیع بند، قصائد ہوں یا غزلیات وہ ہر صنف میں ایک کوہ بلند نظر آتے ہیں جہاں تک ان کی فارسی رباعیوں کا تعلق ہے مرزا نے اس صنف میں بھی اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا ہے۔ ہر رباعی چست، مرصع اور زور بیان کی آئینہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے دور کی تاریخ کا آئینہ نظر آتی ہے۔ اگر کوئی چاہے تو ان کی مدد سے خود غالب کی سوانح عمری مرتب کر سکتا ہے ان کے خاندان کا اندازہ لگا سکتا ہے، سال ولادت معلوم کر سکتا ہے، ان کے احباب اور شاگردوں کے حال سے آگاہی مل سکتی ہے۔ اپنے ہم عصر شعرا کے بارے میں اُن کے خیالات کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے ان کے عقائد پر روشنی پڑ سکتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ ان رباعیوں کو ایک خاص ترتیب سے مرتب کیا جائے ترجمۂ رباعیات کے بعد یہ کام میں نے اہل ذوق کے لیے چھوڑ دیا ہے کہ وہ جس طرح چاہیں ان سے استفادہ کریں۔ دراصل مرزا اسد اللہ خاں غالب فکر و فن کا ایک سمندر ہیں۔ لیکن ان کی شاعری کے ہزار پہلو تلاش کرنے کے باوجود جب تک ان کی فارسی شاعری کا بھرپور جائزہ نہیں لیا جائے گا۔ ہماری مثال اُس سیاح کی سی ہوگی جو ایک براعظم کی تلاش میں نکلا ہو لیکن چند جزائر پر قناعت کر کے بیٹھ جائے۔

غالب اور فرہاد

افتخار احمد عدنی

کوئی پچیس سال پہلے کی بات ہے کہ ایک ادبی تقریب میں جرمنی کی مشہور زبان دان اور ادب شناس خاتون اینا میری شمل
ب پر تقریر کر رہی تھیں۔ وہ چونکہ رومی کے مطالعے سے اقبال کے فارسی کلام سے متعارف ہوئی تھیں اور اس تعارف سے غالب
ب ان کی رسائی ہوئی تھی لہٰذا ان کی تقریر میں زیادہ تر حوالے غالب کے فارسی کلام سے تھے۔ ان کی گفتگو کا انداز ہمارے سکّہ بند
رروں سے بہت مختلف تھا۔ ایک تو خوبی یہ تھی کہ اشعار کا انتخاب ان کا اپنا تھا۔ اس لیے ایسے شعر سننے کو ملے جو زبان زدِ خاص و
ام نہیں ہیں۔ پھر مغربی لہجے میں ان کے شعر پڑھنے کا کچھ کچا سا انداز ایک خاص انفرادیت رکھتا تھا۔ دوسرے یہ کہ تقریر انگیریزی
یں تھی اور اس وقت تک انگریزی پر انھیں پوری طرح عبور حاصل نہیں ہوا تھا۔ اب تو وہ مدت سے امریکہ میں مقیم ہیں اور
انی سے انگریزی بولتی ہیں۔ بہرحال اس وقت ان کی تقریر میں اور شعروں کی ادائیگی میں ایک نو آموز کی سادگی اور زبان پر
ری قدرت نہ ہونے کی وجہ سے اظہار میں تشنگی کی دلچسپ کیفیت تھی۔ تقریر کے دوران جب انھوں نے یہ شعر پڑھا تو میں
الب کی فرہاد دشمنی پر حیران رہ گیا۔

ازعشق و حسنِ ماو تو باہم دگر گفتگو
خسرو بہ مجنوں یک طرف، شیریں بہ لیلیٰ یک طرف

یرے عشق اور تیرے حسن کو دیکھ کر حیرت سے محوِ گفتگو ہیں۔ ایک طرف خسرو اور مجنوں اور دوسری طرف شیریں اور لیلیٰ۔

میرے برابر شان الحق حقی صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے فریاد کی کہ یہ کیا ستم ہے کہ غالب شیریں کے ساتھ فرہاد
ا نام تک لینے کے روادار نہیں ہیں۔ انھوں نے خسرو کو مجنوں کے مقابل لا کھڑا کیا ہے۔ حقی صاحب نہایت نیک نہاد اور خوش
ن واقع ہوئے ہیں۔ انھوں نے کہا ایسا نہیں ہوسکتا۔ یہ شعر انہیں صحیح یاد نہیں ہے۔ غالب مجنوں کے مقابلے میں خسرو کا نام
نہیں لے سکتے۔ نام فرہاد کا ہی ہوگا۔ مصرعہ شاید اس طرح ہو۔ فرہاد و مجنوں یک طرف، شیریں و لیلیٰ یک طرف۔

میں غالب کی طرف سے کوئی بہت نیک گمان نہیں رکھتا لیکن حقی صاحب نے یہ بات اتنے میٹھے لہجے میں کہی کہ میری
بدگمانی دور ہوگئی۔ اور میں مطمئن ہوگیا۔

دوسرے دن حقی صاحب کا فون آیا۔ انھوں نے کہا، وہ مصرعہ اینا میری شمل نے صحیح پڑھا تھا۔ دیوان میں اسی طرح ہے۔
دیکھا آپ نے غالب اپنے قدردانوں کو بھی دھوکہ دینے سے باز نہیں آتے۔ کس سے بے مہری غالب کی شکایت کیجیے۔ قدردانوں

قومی زبان (۲۸) فروری ۱۹۹۳ء

کی بے قدری کا کیا گلہ وہ تو اپنے محبوب کو دھوکہ دینے کا ذکر بھی بڑے فخر سے کرتے ہیں۔

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

ان دو اشعار میں غالب نے دنیائے عشق کے چاند اور سورج دونوں ہی کو گہنا دیا۔ یہ تعین ضروری نہیں ہے کہ ان میں سے چاند کون ہے اور سورج کون یہ فیصلہ ہر ایک اپنے مزاج کے مطابق کر سکتا ہے۔ بہرحال غالب نے دونوں کا صفایا کر دیا۔ معشوق فریبی کے اس دعوے کے باوجود غالب کے دل میں مجنوں کے لیے ایک نرم گوشہ تھا۔ اس کا ذکر نسبتاً فیاضی سے کرتے تھے لیکن فرہاد کے لیے وہ کوئی کلمۂ خیر کہنے کے لیے آمادہ نظر نہیں آتے۔ نادانستہ طور پر کچھ کہہ جائیں تو اُسے عشق کا اعجاز سمجھنا چاہیے۔

فرہاد سے متعلق ایک حیرت انگیز شعر اینا میری شمل کے حوالے سے نقل کرنے کے بعد خود ان کے بارے میں مجھے دو چار باتیں یاد رہی ہیں سوچتا ہوں کہ کیوں نہ انھیں بھی یہیں لکھ دوں۔ تک تب ان کے بارے میں لکھنے کا مجھے کہاں موقع ملے گا۔

میں نے تقریباً پینتیس سال پہلے لاہور میں یوم اقبال کے موقعے پر پہلی دفعہ ان کی تقریر سنی تھی۔ تقاریر کا چھپا ہوا پروگرام جو تقسیم کیا گیا تھا اس میں ایک بات ذرا عجیب سی نظر آئی۔ اس میں دوسرے مقررین کی تقریریں دس منٹ، پندرہ منٹ یا بیس منٹ کی تھیں۔ لیکن اینا میری شمل کی تقریر کا دورانیہ گیارہ منٹ تھا ان کی تقریر متعین شدہ وقت پر ہوئی۔ انھوں نے تقریر شروع کرتے ہی آنکھیں بند کر لیں اور ٹھیک گیارہ منٹ بعد آنکھیں کھولیں اور تقریر ختم کر دی حیرت کی بات یہ تھی کہ بغیر آنکھیں کھولے اور بغیر گھڑی دیکھے انھوں نے گیارہ منٹ پورے ہونے پر تقریر کیسے ختم کر دی۔ ایک سال بعد وہ پھر لاہور آئیں اور پھر یہی صورتِ حال دہرائی گئی۔ اس دفعہ تقریر کا دورانیہ نو منٹ تھا۔ انھوں نے آنکھیں بند کر کے تقریر شروع کی اور نو منٹ پورے ہوتے ہی تقریر ختم کر دی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اپنی تقریر کا دورانیہ طاق عدد سے کیوں متعین کرتی تھیں، تقریر کرتے ہوئے آنکھیں کیوں بند کر لیتی تھیں۔ اور تقریر کے اختتام کا اعلان آنکھیں کھول کر کیوں کرتی تھیں۔ ممکن ہے یہ کرشمہ ان کے ریاض کا نتیجہ ہو۔ وہ ایک متعین مدت کے لیے اپنی تقریر لکھتی ہوں، پھر اُسے یاد کر کے اس کی ادائیگی کی مشق کرتی ہوں، اور اس قدر کمال حاصل کر لیتی ہوں کہ معینہ مدت سے ایک ثانیہ اِدھر سے اُدھر نہ ہو سکے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ رومی جیسے وارفتۂ ذاتِ عارف کا دم بھرنے والی ایک صاحب نظر خاتون کو اس قسم کے ریاض کی کیا ضرورت تھی ممکن ہے طاق عدد کی یہ تقریریں پیر رومی اور مرید ہندی کے اسرار میں سے کوئی راز ہو۔ کیونکہ کراچی میں جو تقریر انھوں نے غالب پر کی تھی، اس میں نہ طاق عدد کا التزام تھا اور نہ آنکھیں بند کرنے کا۔

ایک اور بات جو مجھے ان کی لاہور والی تقریروں میں عجیب لگی وہ لفظ عشق کا تلفظ تھا۔ رومی کے کلام سے عشق کے موضوع پر انھوں نے بہت سے اشعار پڑھے اور پھر اقبال کے کلام میں عشق کے تصور سے ان کا موازنہ کیا۔ اُن اشعار میں کم از کم پندرہ بیس دفعہ لفظ عشق کا استعمال ہوا، اور ہر مرتبہ انھوں نے عشق کو زیر کے بجائے زبر سے پڑھا۔

عِشق کے بجائے عَشق۔ میں حیران تھا کہ اقبال کے شیدائیوں میں سے کوئی ان کی اصلاح کیوں نہیں کرتا بڑی مدت کے بعد مجھے خیال آیا کہ کسی مستند لغت میں اس لفظ کو دیکھوں۔ تب یہ پتہ چلا اس متعدی مرض کا تلفظ زیر اور زبر دونوں کے ساتھ صحیح ہے۔ ہمارے ہاں اگر کسی محبت کے مارے کو یہ بتایا جائے کہ وہ عِشق کے بجائے عَشق میں مبتلا ہے تو وہ اس سانحے کو برداشت نہ کر سکے۔ اور ممکن ہے وہ اتنا بد حواس ہو کہ اتفاقی رخصت لے کر شہر محبوب ہی سے کوچ کر جائے۔

قومی زبان (۲۹) فروری ۱۹۹۴ء

اسی زمانے میں میری جاوید اقبال سے ملاقات ہوئی اور میں نے اُن سے اینامیری شمل کی پر اسرار تقریروں کا ذکر کیا تو انھوں نے بتایا کہ ایک دفعہ انھوں نے ان کے اعزاز میں بڑے پیمانے پر دعوت کی جس میں بہت سے اقبال کے مداحوں اور منکروں نے شرکت کی۔ اس دعوت کا انتظام علامہ اقبال کے ایک مخلص منشی کے سپرد تھا۔ جو نہایت خوش اسلوبی سے ہر چیز کی نگرانی کر رہے تھے۔ اینامیری شمل انھیں دیکھتی رہیں۔ رخصت ہونے سے پہلے انھوں نے جاوید اقبال سے پوچھا کہ کیا وہ سلسلہ نقشبندیہ سے وابستہ ہیں۔ جاوید اقبال نے کہا کہ میں انھیں علامہ کے ایک دیرینہ کارکن کی حیثیت سے جانتا ہوں۔ مجھے ان کے مسلک کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ دوسرے دن جب وہ دعوت کے انتظامات کو سمیٹنے کے سلسلے میں آئے تو جاوید اقبال نے اس بارے میں اُن سے سوال کیا تو انھوں نے بتایا کہ وہ سلسلۂ نقشبندیہ میں بیعت ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اینامیری شمل کو فون کر کے پوچھا کہ انھیں کس طرح معلوم ہوا کہ علامہ اقبال کے منشی سلسلہ نقشبندیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے کشف کو چھپانے کے لیے کہا بات یہ ہے نقشبندیوں کے دیکھنے کا ایک مخصوص انداز ہوتا ہے۔ اس سے مجھے خیال ہوا کہ یہ شاید نقشبندی ہوں۔ بجائے یہ کہنے کے "ولی راولی میں شناسد" انھوں نے بات بنادی۔ چند سال بعد جب کراچی میں میری ان سے ملاقات ہوئی اور میں نے اس بارے میں سوال کیا تو انھوں نے ہنس کے کہا یہ اس وقت کی بات ہے جب میں امریکہ میں آباد نہیں ہوئی تھی۔ گویا یہ انھوں نے تسلیم کر لیا کہ وہ علم انھیں کشف سے ہوا تھا اور ساتھ ہی یہ پردہ بھی ڈال دیا کہ اب وہ بات نہیں رہی۔ یہ ان کی پردہ داری کا کمال ہے۔

یہاں مجھے غالب کا ایک خوبصورت شعر پردہ داری کے حوالے سے یاد آگیا۔ فرہاد کی بات تو ہوتی رہے گی اس شعر کے استعمال کا شاید ایسا موقعہ ہاتھ نہ آئے۔

برند دل بہ ادائے کہ کس گماں نبرد
فغاں زپردہ نشیناں کہ پردہ دار انند

اس ادا سے دل لیتے ہیں کہ اُن پر کسی کو گمان تک نہیں گزرتا کیا ستم کرتے ہیں یہ پردہ نشین اپنی پردہ داری میں۔

اب اس شعر کی روشنی میں بہت احتیاط سے مضمون کو آگے بڑھاتا ہوں۔ اینامیری شمل کی آمد پر ممتاز حسن صاحب نے ایک بہت پر تکلف چائے کی دعوت کا اہتمام کیا۔ مہمانوں میں صرف اہلِ ذوق مدعو تھے۔ اس زمرے سے صرف وہ دو تین جرمن خارج تھے جنھوں نے ان کے قیام کا بندوبست کیا تھا۔ ممتاز حسن صاحب جرمن، انگریزی، فارسی، اردو، اور پنجابی ادبیات پر کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ ان کے بہت عزیز دوست پیر حسام الدّین راشدی جو شاید جرمن نہ جانتے ہوں وہ دوسری زبانوں کے ساتھ سندھی زبان پر بھی پورا عبور رکھتے تھے۔ لہٰذا دو تقریباً ہم پلّہ اور ہم عمر اہلِ ذوق اور اہلِ دانش حضرات کے درمیان اینامیری شمل ادب شناسی کی کرنیں بکھیر رہی تھیں۔ اقبال، غالب اور رومی کے حوالے سے اُن سے بات کرنے میں تقریباً سب ہی مہمان شریک تھے۔ لیکن ممتاز حسن صاحب اور راشدی صاحب کی تمام تر توجہ اُن پر مرکوز تھی۔ وہ دونوں سے بہت اخلاص سے باتیں کرتی رہیں۔ یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ ان کا میلان زیادہ کس داستانِ محبت کی طرف تھا، ہیر رانجھا یا سسی۔ پنوں۔ رومی کی مثنوی حکایات سے لبریز ہے۔ ان دونوں حضرات نے یہ کمال کیا کہ وارث شاہ کی ہیر اور شاہ عبداللطیف بھٹائی کے رسالے میں اینامیری شمل کو اس طرح الجھایا کہ وہ رومی کو بھول کے پاکستانی مستشرق بن گئیں۔ ممتاز حسن صاحب نے ہیر رانجھا کا ترجمہ انگریزی میں بڑے اہتمام سے شائع کیا تھا۔ اور انھوں نے اس داستان کی دلاویزی سے اینامیری شمل کو اتنا متاثر کیا کہ وہ محبت اور تصوف پر تقریر کرتے ہوئے یہ

مصرعہ اکثر پڑھتی ہیں۔ رانجھا رانجھا کردی نی میں آپی رانجھا ہوئی۔ انشاءاللہ خاں نے سچ ہی کہا تھا:

سنایا رات کو قصہ جو ہیر رانجھے کا
تو اہلِ درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

ان کے ساتھ ہی سسی پنوں کی کشش بھی ان کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ اور وہ کشش اب اس قدر بڑھ گئی ہے کہ جب وہ پاکستان آتی ہیں تو بھٹ شاہ میں حاضر ہو کر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی خدمت میں نذرانۂ اخلاص ضرور پیش کرتی ہیں۔ اب ان کی وابستگی سرزمینِ سندھ سے اس قدر بڑھ گئی ہے کہ وہ ٹھٹھہ کے قبرستان میں دفن ہونا چاہتی ہیں۔

سنایا رات کو قصہ جو سسی پنوں کا
تو شہرِ مہر و وفا سندھیوں نے لوٹ لیا

کسی صاحبِ تصرف نے یہ دونوں پامال دوست۔ خدا دونوں کی قبروں پہ محبت کے پھول برسائے۔ اس چائے کی دعوت کے ذکر سے میں تاثرات کی دنیا میں نکل گیا۔ چائے کے دوران میں نے اینا میری شمل سے پوچھا کہ انھیں تصوف کا اتنا ذوق ہے تو انھیں سماع سے بھی دلچسپی ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ دلچسپی تو ہے لیکن کبھی اچھا فارسی کلام سننے کا موقع نہیں ملا۔ اتفاق سے وہ منگل کا دن تھا اور منگل کو بابا ذہین شاہ صاحب کے گھر پر محفل سماع منعقد ہوا کرتی تھی میں نے کہا آپ منتخب فارسی غزلیں سننا چاہتی ہیں تو میرے ساتھ چلیں۔ وہ فوراً راضی ہوگئیں۔ اس زمانے میں بابا صاحب کا قیام ڈاکٹر محمود حسین روڈ پر تھا۔ چائے کے بعد ہم تھوڑی ہی دیر میں وہاں پہنچ گئے۔ محفل میں شرکت کرنے والے سب موجود تھے۔ قوال بھی آگئے تھے۔ لیکن بابا صاحب نہیں تھے۔ وہ کسی سے ملنے گئے تھے اور واپسی میں دیر ہوگئی تھی اینا میری شمل کے ساتھ جرمن کونسل جنرل اور دو اور جرمن تھے۔ کونسل جنرل نے اپنے گھر پر ان کے اعزاز میں دعوت کی تھی۔ لہٰذا ان کو یہ فکر تھی کہ ساڑھے آٹھ بجے سے پہلے ہر صورت میں انھیں گھر پہنچ جانا چاہیے۔ میں نے سوچا کہ بابا صاحب کے آنے سے پہلے ہی ایک غزل اینا میری شمل کو سنوا دوں۔ اس بات پر ایک نیم مجذوب سے بزرگ بگڑ گئے۔ انھوں نے کہا صلوٰۃ و سلام سے پہلے، اور بابا صاحب کی اجازت کے بغیر قوال کوئی غزل نہیں سنا سکتے۔ میں نے قوالوں سے پوچھا کہ وہ کچھ سنانے کے لیے تیار ہیں۔ انھوں نے کہا اگر آپ ذمہ داری لے لیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ وہ نیم مجذوب بزرگ ناراضگی میں محفل سے اُٹھ کے چلے گئے۔ میں نے اینا میری شمل سے پوچھا آپ کس کا کلام سننا پسند کریں گی۔ انھوں نے رومی کی ایک ایسی غزل کی فرمائش کی جو دیوان شمس تبریز کے مطالعے کے باوجود میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ وہ غزل قوالوں کو یاد تھی۔ انھوں نے خوب جم کے وہ غزل پڑھی، لیکن بابا صاحب کے نہ ہونے کی وجہ سے محفل اپنے مخصوص رنگ سے محروم رہی۔ ایک غزل سن کے اور شکریہ ادا کر کے اینا میری شمل رخصت ہوگئیں۔ اس وقت یہ لکھتے ہوئے مجھے بابا صاحب کی عدم موجودگی کی مصلحت کا اندازہ ہو رہا ہے، اگر وہ موجود ہوتے تو ان کی شخصیت، ان کی وجاہت، ان کی علمیت سے اینا میری شمل اتنی متاثر ہوتیں کہ انھیں رومی کا جانشین سمجھ کر وہیں بیٹھ جاتیں۔ اور ہمارے دونوں دانشور اور محترم بزرگ ان کی توجہ سے محروم ہو جاتے۔ بابا صاحب واپس آئے تو میں نے ان سے عرض کیا کہ میں نے کیا جسارت کی تھی، اور قبل اس کے کہ میں اس گستاخی پر معافی مانگتا انھوں نے ایک دلنشین تبسم سے بات ختم کر دی۔

اپنے موضوع سے اس طویل انحراف کے بعد اب میں غالب کی طرف لوٹتا ہوں۔ ۲۴ دسمبر ۱۹۹۳ء کو جشن نگار و نیاز کے بعد جس کا اہتمام ڈاکٹر فرمان فتح پوری ہر سال مثالی آب و تاب سے کرتے ہیں مجھ سے قومی زبان کے لیے غالب پر مضمون لکھنے کی

فرمائش کی گئی۔ دو موضوع تو اس جشن میں کی جانے والی تقریروں میں موجود تھے۔ ایک تقریر تھی غالب اور مومن کے موضوع پر۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے ایک بہت خوش ذوق شاگرد کی۔ اور دوسری تھی میرے غالب شناس دوست کی مشکلات غالب پر۔ غالب کی مشکلات میں ایک بہت بڑی مشکل خود علامہ نیاز فتحپوری بھی تھے جنھوں نے دیوان مومن کو وہی مقام دینے کی کوشش کی جو ڈاکٹر عبد الرحمن بجنوری نے کلام غالب کو دیا تھا۔ لیکن وقت نے فیصلہ بجنوری کے حق میں دے دیا ہے۔ لہٰذا علامہ سے اُلجھنا بیکار ہے۔ اس کے علاوہ فرمان صاحب مجھے اتنے عزیز ہیں کہ میں کسی ایسے موضوع کو ہاتھ نہیں لگانا چاہتا جس سے وہ ناخوش ہوں۔ حقی صاحب جب مجھے وہاں نظر آئے تو انھیں دیکھتے ہی میری مشکل حل ہوگئی۔ اینا میری شمل نے جو غالب کا شعر سنایا تھا وہ مجھے یاد آگیا۔ اور میں نے سوچا کہ مضمون غالب اور فرہاد پر ہونا چاہیے۔

غالب کی فرہاد دشمنی کا ذکر کرنے سے پہلے بہتر ہوگا کہ اینا میری شمل کا سنایا ہوا شعر دہرا دیا جائے:

از عشق و حسنِ ما و تو باہم دگر گفتگو
خسرو بہ مجنوں یک طرف شیریں بہ لیلیٰ یک طرف

غالب اور ان کی محبوب کی محبت دیکھ کر دنیائے عشق کی نامور ہستیوں کے ہوش اڑ گئے۔ انھیں اندیشہ ہوا کہ کہیں ان کی وابستگی کے افسانے دھندلا نہ جائیں۔ چنانچہ لیلیٰ نے شیریں سے اور مجنوں نے خسرو سے جی ہاں خسرو سے مشورہ کیا کہ اس فتنے سے کس طرح نمٹا جائے۔ ادب کی تاریخ میں شاید غالب وہ پہلے آدمی ہیں جنھوں نے خسرو کو ارفع مقام دیکر فرہاد کو منصب عشق سے معزول کیا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر غالب کو فرہاد سے کیا بیر تھا کہ ہمیشہ اس پہ تیر برساتے رہے، اس کی تحقیر کرتے رہے اور آخر میں اس کا نام تک شیریں کی داستانِ محبت سے خارج کرنے پر اُتر آئے۔ اس سوال کا ایک جواب تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ غالب ایک نہایت رئیسانہ مزاج کے مالک تھے مالی مشکلات کے باوجود انھوں نے اپنے نوابانہ طرز زندگی کو ترک نہیں کیا۔ جس طبقے سے ان کا تعلق تھا اس کا مقام عوام کی سطح سے بہت بلند تھا۔ ان کے ذاتی محاسن نے انھیں خواص سے بھی بہت ارفع کر دیا تھا۔ وہ عوام اور خواص دونوں سے بے نیاز ہوگئے تھے۔

جہاں را خاصہ دعاے ست آں مغرور و ایں عاجز
بیا غالب زخاصاں بگذر و بگزار عاماں را

جہاں میں خواص مغرور ہیں اور عوام عاجز۔ دونوں میں کوئی لائق اعتنا نہیں۔ غالب خواص سے کنارہ کر اور عوام کو اُن کے حال پہ چھوڑ دے۔

وہ نابغہ روزگار شاعر جو خواص کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا کس طرح محبت کی دنیا میں جہاں ہر سخنور اپنے جذبات کی انفرادیت پر ناز کرتا ہے۔ فرہاد جیسے ایک بے حیثیت مزدور کو اپنا حریف تسلیم کر سکتا تھا۔ لہٰذا غالب نے فرہاد کے پیشے کو ہدف بنا کے اُسے دنیا کی نظروں سے گرانے کی کوشش کی:

عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو کیا خوب
ہم کو منظور نکو نامی فرہاد نہیں

کارگاہ عشق میں جو کام فرہاد کو تفویض ہوا تھا وہ جوئے شیر لانے کا تھا۔ دودھ کی نہریں تو صرف جنت میں ہوتی ہیں۔ وہ کہاں سے

جوئے شیر لانا۔ شاید جوئے شیر سے مراد میٹھے پانی کی نہر ہو۔ پہاڑوں پہ جھرنے اور چشمے ہوتے ہیں ان کا پانی تو برف کے پگھلتے ہوئے تودوں سے آتا ہے وہ تو ہوگا ہی میٹھا۔ لہٰذا شاید فرہاد کا امتحان یہ ہو کہ ناقابل عبور چٹانوں کو کاٹے اور جھرنوں کا رخ موڑ کے پانی کی نہر خسرو کے محل تک پہنچادے۔ تقریباً پالیس سال پہلے میں نے شیریں فرہاد نامی ایک فلم دیکھی تھی۔ وہ واقعی دیکھنے کے لائق تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ ڈائریکٹر نے وہ فلم فرہاد پر غالب کے بے بنیاد اعتراضات کے جواب میں بنائی تھی۔ کہانی کا آغاز اس طرح ہوا کہ خسرو پرویز نے کوہ بے ستون پر ایک عالیشان محل بنانے کا منصوبہ بنایا جب اُسے یہ معلوم ہوا اس خوشنما پہاڑ پر آب رسانی کا کوئی انتظام نہیں ہے تو اس نے اپنی سلطنت کے مانے ہوئے ماہرین فن کو طلب کیا۔ انھوں نے بے ستون کی دشوار گزار گھاٹیوں اور چٹانوں کا جائزہ لے کر معذوری کا اظہار کیا۔ اس وقت فرہاد نے جو ایک کم عمر اور خوبرو انجینئر تھا یہ ذمہ داری قبول کر لی۔ اور پھر وہ سارا فلم اس کے کمالاتِ فن کا آئینہ بن گیا۔ اس نے چشموں اور جھرنوں کے پانی کا ذخیرہ کرنے کے لیے بند بنائے اور پہاڑوں کو کاٹ کے نہر نکالی۔ اور جب فرہاد کے حکم پر مزدوروں نے آخری چٹان کو کاٹا تو اس زور سے پانی کا ریلہ آیا کہ سارا سنیما ہال تماشائیوں کی تالیوں سے گونج اٹھا۔ پالیس سال پہلے کتنے اچھے تماشائی ہوتے تھے۔ جو غالب کے برعکس عاشق کی کامیابی پر کھل کے داد دیتے تھے۔ ڈائریکٹر کا کمال یہ تھا کہ اس نے فرہاد کو ایک بے نظیر انجیر کی طرح پیش کیا، جس کے حکم پر سیکڑوں مزدور کام کرتے تھے۔ غالب نے اُسے صرف عشرت گہ خسرو کا مزدور قرار دیا۔ کتنی اہانت ہے ان کے لہجے میں۔ گویا وہ مزدوری کر کے خسرو اور شیریں کے وصال کے لیے ایک خواب گاہ کی تیاری میں لگا ہوا تھا۔

کہیں کہیں غالب نے اپنے اعتراضات کی نفی بھی کی ہے اور فرہاد کے کارنامے کا اعتراف بھی کیا ہے، لیکن فرہاد کا نام لیے بغیر:

کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

دراصل فرہاد کا امتحان جوئے شیر کا لانا تھا۔ وہ اس مرحلے میں کامیاب ہونے کے لیے میدان میں اترا تھا، مزدوری اس کا پیشہ نہ تھا۔ لیکن یہاں بھی غالب اُسے نیچا دکھانے سے باز نہیں آتے فرہاد کو تو زندگی میں صرف ایک دفعہ جوئے شیر لانا تھی۔ وہ ہر رات اس قیامت سے گزرتے ہیں۔

ایک شعر میں وہ اصل وجہ عناد کا صاف ذکر دیتے ہیں لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ ان کے دل میں اتنی وسعت ہے کہ اس کے باوجود وہ اُسے اپنوں میں شامل کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ اصل بات انھوں نے بڑی دریادلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہی ہے۔

پیشے میں عیب نہیں رکھیئے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

پہلے مصرعے کا لہجہ ہی اعلان کر رہا ہے کہ عیب سارا پیشے میں تھا۔ کون ہے جو اس پہ نام نہیں دھرے گا۔ غالب یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ دو کوڑی کا مزدور اور چلا ہے شیریں کے عشق کا دم بھرنے اور خسرو سے مقابلہ کرنے لیکن ہم ایسے وسیع القلب ہیں کہ صرف اس کی آشفتہ سری کی خاطر اسے اپنوں میں شمار کرنے سے احتراز نہیں کرتے۔ اس شعر میں ہمدردی کے انداز میں کتنی حقارت جھلکتی ہے۔

غالب خود اپنے عشق کے تجربات کی حد تک بہت بڑا ظرف رکھتے تھے۔ وہ ہر قسم کی ذلت اور توہین برداشت کرنے کے لیے

ار تھے۔ کبھی رقیب کے ہاتھوں، کبھی دربان کے ہاتھوں۔ اور کبھی خود محبوب کے ہاتھوں لیکن فرہاد کے معاملے میں وہ بے حد ساس واقع ہوئے تھے۔

از جوئے شیر و عشرت خسرو نشاں نماند
غیرت ہنوز طعنہ بہ فرہاد می زند

وئے شیر اور عشرت خسرو کا تو نام و نشاں بھی نہیں رہا۔ لیکن عزتِ نفس آج بھی فرہاد کی بے غیرتی پہ طعنہ زن ہے جس نے نیب کے محل میں مزدوری کی ذلت گوارا کی۔

سیاست میں تو ہم دوہرے معیاروں کی شکایت کرتے نہیں تھکتے۔ لیکن ہمیں یہ نظر نہیں آتا کہ ہمارے مایۂ ناز شاعر کس بے باکی سے دوہرے پیمانے اپناتے ہیں۔

غالب کو پہلا اعتراض تو فرہاد کے پیشے پر تھا۔ وہ اسے طبقہ اشراف کا فرد نہیں سمجھتے تھے۔ دوسرا اعتراض یہ تھا کہ وہ کم بخت یک نہایت محنتی، سخت کوش، باحوصلہ مرد عمل تھا۔ ایک تیشہ ہاتھ میں اُٹھا کر چٹانوں کا سینہ چاک کر کے جوئے شیر لانے پر ستعد ہوگیا۔ غالب ٹھہرے ایک تن آسان، آرام پسند، عیش طلب خوش فکر شاعر وہ کہاں ایسے خارہ شگاف رقیب کو برداشت رسکتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ اتنا نڈر اور جری تھا کہ عشق میں موت کا خوف اس کے لیے بے معنی ہوگیا۔ ایک کٹنی کے منہ سے شیریں کی موت کی خبر سن کر خود اپنی جان لینے پر تیار ہوگیا، اور وہ بھی خود اپنے ہی تیشے کی ضرب سے۔ کیسا بے مثال، باحوصلہ عاشق تھا۔ محبوب کی خاطر جان دینے کی پیشکش تو سب ہی کرتے ہیں، لیکن وہ واحد عاشق تھا جس نے اس دعوے کا بھرم رکھ لیا۔ اور وہ بھی محبوب کے مرنے کی خبر کی تصدیق کیے بغیر۔ غالب کے لیے اس قسم کے انجام کا تصور بھی ناممکن تھا۔ انھوں نے تو کھل کے اعتراف کر لیا تھا کہ معاملہ کیسا ہی سنگین اور نتائج کیسے ہی قیامت خیز کیوں نہ ہوں وہ کبھی جان کی بازی لگانے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔

تاب لائے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

غالب نے محبت کی، پیمان وفا باندھا، اور پھر محبوب کی موت کے جان لیوا المیے سے دوچار ہوئے لیکن بے مروتی کی حد یہ ہے کہ صرف ایک مرثیے پہ اپنی محبوب کو ٹال دیا۔ اور مرثیہ بھی ایسا جو شدت احساس سے عاری ہے۔ وہ بجائے اپنے غم کا اظہار کرنے کے اس غریب سے شکوہ کرتے ہیں کہ وہ انھیں چھوڑ کے کیوں چلی گئی۔ شکوے کی ابتدا اس طرح کرتے ہیں۔ کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے،

ہائے ہائے کرتے ہوئے مصرعہ بہ مصرعہ اپنی محبوبہ پر الزامات عاید کرتے ہیں "تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے" گویا غمگساری بھی اس کی خطا تھی آگے کہتے ہیں:

"اُٹھ گئی دنیا سے راہ و رسم یاری ہائے ہائے" وہ بیچاری جان سے گئی اور غالب ہیں کہ یہ کہنے کے بجائے کہ اب میں زندہ رہ کے کیا کروں گا اس پہ ایک فرد جرم عاید کرتے چلے جاتے ہیں، غفلت شعاری سے تو نے منہ موڑ لیا غمگساری کا حق ادا نہیں کیا، راہ و رسم یاری کو چھوڑ دیا، یہ سب کچھ کہ کے ہائے ہائے بھی کرتے جاتے ہیں، افسوس تو نے یہ نہ کیا، افسوس تو نے وہ نہ کیا، اس سے زیادہ عیاری کیا ہوسکتی ہے کہ وہ اس مرثیے میں اپنے اوپر آنچ تک نہیں آنے دیتے۔ سارا قصور اپنی محبوبہ کا ٹھہراتے ہیں۔ صداقت پر

معنی اگر اس مرثیے میں کوئی شعر ہے تو صرف ایک:

ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اک لگنے نہ پایا زخم کاری ہائے ہائے

اس شعر میں غالب نے دو باتوں کا واضح اعتراف کیا ہے۔ ایک تو یہ کہ قبل اس کے دل پہ کوئی کاری زخم لگے تو دنیا سے رخصت ہوگئی۔ ایسی صورت میں تیری موت پر میں کس طرح مضطرب ہوں۔ میرے مرثیے میں شدت غم نہ ڈھونڈ۔ دوسرے یہ کہ عشق کی دشمنانی میں معاملہ زخم دل سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔ تن آسان شرفا جسمانی زخموں کے متحمل نہیں ہوسکتے چہ جائیکہ تیشے کی ضرب کے جو موت کا باعث ہوسکتی ہے۔ جب اس سانحے پر ایک عرصہ گزر گیا اور غالب کا تھوڑا بہت غم بھی جاتا رہا تو انھوں نے ایک خط میں اس کا ذکر اس طرح کیا جیسے ماضی کا کوئی پر لطف واقعہ بیان کر رہے ہوں "مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں۔ جس پہ مرتے ہیں۔ اسے مار رکھتے ہیں گویا محبوبہ کی موت کو غالب اپنا ایک کارنامہ سمجھ کے اس پہ فخر کرتے ہیں۔ آگے چل کر اسے "ستم پیشہ ڈومنی" کہہ کے متعارف کراتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ایک محبت کرنے والی کی غالب کے نزدیک کیا حیثیت تھی اگر وہ ڈومنی بھی تھی تو محبوبہ بن کے تو وہ رشک لیلیٰ ہوجاتی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ غالب خود اپنی محبت میں ایسے گرفتار تھے کہ کسی اور کی محبت کے لیے ان کے پاس وقت نہیں تھا۔ نہ وقت تھا، نہ میلان۔ وہ محبت کو زندگی سے لطف لینے کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ ایسی صورت میں وہ اپنی محبوبہ کو "ڈومنی" اور فرہاد جیسے عاشق کو "مزدور" کہیں تو ان سے جھگڑنا بیکار ہے۔

غالب اپنی بے مثال صلاحیتوں سے اس بات پر قادر تھے کہ جسے چاہیں رفعتِ ثریا پر پہنچا دیں اور جسے چاہیں تحت الثریٰ میں دھکیل دیں۔ رشک سے مجبور ہوکر وہ اپنی محبوبہ کا جو حال کرتے ہیں اس سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔

غیر کی مرگ کا غم کس لیے اے غیرت ماہ
ہیں ہوس پیشہ بہت وہ نہ ہوا اور سہی

غالب کی محبوبہ اپنے چاہنے والے کی موت پہ غم میں ڈوب کے سوگ منا رہی ہے۔ یہ بات انھیں سخت ناگوار گزرتی ہے۔ سوگ صرف ان جیسے نابغہ روزگار لوگوں کا منانا چاہیے۔ ایک کم حیثیت رقیب ایسے غم کا کس طرح اہل ہوسکتا۔ چنانچہ وہ اس کی مٹی پلید کرنے کے لیے وہی نسخہ استعمال کرتے ہیں جو کچھ سال پہلے حاتم علی مہر کے لیے تجویز کر چکے تھے۔ جب ایک ستم پیشہ ڈومنی کی موت پر جس کا نام "چناجان" تھا یا جسے یہ عامیانہ نام دے کر غالب نے اُسے ناقابل اعتنا قرار دینے کی کوشش کی تھی، ان کا دل کسی طرح نہیں ٹھہرتا تھا تو غالب نے لکھا تھا "اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو "چناجان" نہ سہی "مناجان" سہی"

غالب اپنی محبوبہ کو جو ستم پیشہ ڈومنی نہیں کوئی باوفا نازنین ہے جسے وہ غیرت ماہ کہتے ہیں یہ مشورہ دیتے ہیں کہ تجھے اس مرد ہوس پیشہ کا غم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ دنیا تو ایسے ہوس پیشہ لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ اگر تو اس کی ہوس رانی سے محروم ہوگئی تو کیا ہوا، ایسے اور بہت سے موجود ہیں جس کا چاہے انتخاب کر لے۔ تیری لذت پرستی کا سامان آسانی سے بہم ہو جائے گا۔ "چناخان" نہ سہی "مناخان" سہی، اس سے زیادہ پست حملہ ایک غم میں ڈوبی ہوئی عورت پہ کیا ہوسکتا ہے، اور یہ حملہ غالب نے صرف اس لیے کیا کہ وہ ان کے علاوہ کسی اور کے غم میں مبتلا تھی۔ یہ وہی غزل ہے جس میں غالب نے اس شان کا شعر بھی کہا ہے:

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملالیں یارب

سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

غالب کس آسانی سے ایک ہی غزل میں تحت الثریٰ سے فردوس بریں کا سفر کرتے تھے،
فرہاد کا جوئے شیر لانا ہی کیا کم عذاب تھا کہ غالب پر اُس نے اپنی موت سے قیامت ڈھادی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس سانحے سے وہ کس طرح نبرد آزما ہوں۔ بہت سوچ کے اس کے کارنامے کو بے حقیقت ثابت کرنے کے لیے نہایت مُربیانہ انداز میں اس پہ اعتراض کیا۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسد
سر گشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

یہ اعتراض اتنا بودا ہے کہ خود اس پہ کم از کم تین اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔ پہلے یہ کہ تیشے کی ضرب سے موت کا واقع ہونا ایک خارجی فعل کالازمی نتیجہ ہے۔ اس مادّی دنیا کے فطری قوانین کی گرفت سے کون آزاد ہوسکتا ہے۔ فرہاد کی موت میں رسوم کا کیا دخل تھا۔ غالب نے اس کی دشمنی میں منطق کی مبادیات کو بھی خیر باد کہہ دیا۔ یہ تو ایسا ہی ہے کسی پر یہ اعتراض کیا جائے کہ پانی پیے بغیر اس کی پیاس نہیں بجھتی، یا کھانا کھائے بغیر اس کی بھوک نہیں مٹتی۔ یا سوئے بغیر اس کی نیند پوری نہیں ہوتی۔ اگر فرہاد یہ شعر سن کر غالب پہ اس طرح کا اعتراض کرتا تو اس کا ضرور کچھ نہ کچھ جواز ہوتا۔

مے کے بغیر مست کہاں ہوسکا اسد
سر گشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

مے کے بغیر مستی ممکن ہے، محبت کی مستی۔ خود فراموشی کی مستی۔ لیکن بالارادہ مرنے کے لیے تو کچھ کرنا ضروری ہے۔ مرنے والا یا تو زہر کھائے گا، مگر زہر کھا کے مرنا تو بہت آرام کا سودا ہے۔ اور اس کے لیے زہر فروش کی دکان بھی چاہیے۔ یا دریا میں ڈوب کر مرے گا۔ وہاں دریا کہاں تھا۔ یا پہاڑ سے چھلانگ لگائے گا۔ لیکن پہاڑ سے جست لگانے میں بچنے کا بھی امکان ہے، درختوں کے جھنڈ میں اٹک بھی سکتا ہے کوہکن یقینی موت چاہتا تھا۔ اس کا ایک ہی طریقہ تھا۔ یا تو چٹانوں سے ٹکرا کے جان دیدے۔ یا اپنے ہی تیشے کی ضربوں سے خود کو ہلاک کر ڈالے۔ فرہاد نے سب سے زیادہ تکلیف دہ اور حوصلہ طلب طریقے کا انتخاب کیا۔ اس کی جرأت غالب کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ اسی لیے انھوں نے اس کی موت کو رسوم و قیود کی پابندی سے تعبیر کیا ہے۔ وہ یہاں یہ بھی بھول گئے کہ خود انھیں سر پھوڑنے کے لیے ایک دیوار کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔

سر پھوڑنا وہ غالب شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اگر واقعی فرہاد رسوم و قیود کا پابند ہوتا تو وہ خسرو پرویز جیسے رقیب سے ٹکر کیوں لیتا، جوئے شیر لانے پر کیوں آمادہ ہوتا، اور شیریں کی محبت میں جان سے کیوں گزر جاتا۔ رسوم و قیود کے احترام میں تو اُسے چاہیے تھا۔ کہ ناصح مشفق کے مشورے پہ عمل کرتے ہوئے دو بول پڑھوا کے کسی نیک سیرت کے ساتھ گھر میں بیٹھ جاتا۔ اُسے انقلابی امتحانات سے گزرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کی زندگی اور موت دونوں میں رسوم و قیود کے خلاف بغاوت کا اعلان ہے

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ رسوم و قیود کا خُمار سے کیا تعلق۔ رسوم و قیود میں تو قید خانے کی گھٹن ہوتی ہے، اُسے خمار سے تعبیر کرنا زبان اور شعری روایت دونوں کی نفی ہے۔ رسوم و قیود کے لیے خمار کا لفظ اتنا موزوں ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ غالب جیسے شاعر

نے اس کا انتخاب کیسے کیا اور اس پہ "سرگشتہ" کا اضافہ اور بھی عجیب ہے۔ گویا رسوم و قیود میں احساس بے بسی کے بجائے غالب پر ایک نشے کی کیفیت طاری ہوئی۔ جب نشہ اترا اور خمار کی اعضا شکنی محسوس ہوئی تو اضمحلال نے فرہاد کو ناکارہ بنا دیا اور وہ حیران و سراسیمہ رہ گیا۔ اور اسی عالم سرگشتگی میں اس نے تیشہ اٹھا کر خودکشی کر لی۔ سبحان اللہ کیا منطق ہے۔ یہاں غالب کو یہ بھی یاد نہیں رہا وہ اپنے ایک مشہور شعر میں رسم و رہ عام کو قید و بند قرار دے چکے تھے۔

ہیں اہلِ خرد کس روش خاص پہ نازاں
پابستگیٔ رسم و رہِ عام بہت ہے

وہ آسانی سے پابستہ، یا پابند، یا اسیر رسوم و قیود کہہ سکتے۔ لیکن فرہاد کی دشمنی نے انھیں خود سرگشتہ کر دیا تھا اور اس سرگشتگی میں وہ اپنے محاسن کلام سے بھی بیگانہ ہو گئے۔

فرہاد کی مخالفت کی حد یہ ہے کہ وہ ان پتھروں کی حمایت میں بھی سرگرم نظر آتے ہیں جنھیں فرہاد کے تیشے کی ضربوں نے ریزہ ریزہ کیا تھا۔

تاندانی جگرِ سنگ کشودن ہدراست
تیشہ داند کہ چہا بر سرِ فرہاد آمد

یہ نہ سمجھا کہ پتھر کا جگر چیرنا کوئی مفت کا سودا ہے۔ دیکھو جس تیشے سے فرہاد نے پتھروں کو توڑا تھا اُس نے خود فرہاد کا کیا حشر کیا۔ اللہ غنی۔ غالب نے فرہاد دشمنی کی انتہا کر دی۔ دنیائے عشق کی سب سے زیادہ ممتاز اور منفرد ہستی پر کیا کیا نہ ستم ڈھائے، کس کس طرح اُسے بے حیثیت اور کم عیار نہ ثابت کیا، اس کی تحقیر کے لیے کیسی موشگافیاں نہیں کیں۔ لیکن اعجازِ عشق دیدنی ہے کہ اس تمام سعی ملامت پر ان کے ایک شعر نے پانی پھیر دیا۔ اور وہ اُسے ایسا بلند مقام دینے پر مجبور ہو گئے جو اُسے دنیائے کمال کی اَمر ہستیوں کی صف میں لا بٹھاتا ہے۔

کوہکن نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسد
کوہ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

فرہاد نہ کوئی سرپھرا عاشق تھا۔ نہ عشرت گہ خسرو کا مزدور تھا، نہ وہ جوئے شیر لانے پہ مامور کوئی کارکن تھا۔ وہ ایک نقاش تھا۔ ایک سنگتراش تھا۔ ایک ایسا فنکار جسے بس یہ لگن تھی کہ کسی طرح شیریں کے پیکر کو، یا اس تصویر کو جو شیریں نے اس کے ذہن پہ مرتسم کیا تھا بے ستوں کے سینے پہ ایسے نقش کر دے کہ وقت کی گرد اُسے دھندلا نہ سکے آنے والی صدیاں اس کے کمال فن کو حیرت سے دیکھتی رہیں۔ بے ستوں پہ کندہ شیریں کے نقش میں انھیں نسائیت کے بے شمار رنگ نظر آئیں، اور ہر دیکھنے والا بقدر ظرف شیریں کے پیکر میں مثالی حسن کا مشاہدہ کر سکے۔ اگر شیریں کا حصول اس کا مقصد ہوتا تو وہ کیوں پہاڑوں میں سر ٹکراتا پھرتا۔ اگر وہ تمثال شیریں کو سینۂ بے ستوں پر ثبت کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو لوگ اُسے مائیکل انجلو اور لیونارڈو ڈی ونچی سے بڑا فنکار قرار دیتے۔ لیکن افسوس کہ شیریں کی موت کی خبر نے اسے یہ فن پارہ تخلیق کرنے کی مہلت نہیں دی۔

اس مفہوم کی روشنی میں حضرت علیؑ کی منقبت کا شعر بھی ایک اور معنویت اختیار کر لیتا ہے:

کوہکن گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب
بے ستوں آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں

اس شعر کے معنی پھر یہ نہیں رہتے کہ شیریں خوابِ غفلت میں ہے اور اُسے کچھ پتہ نہیں کہ اس کے عاشق پر کیا گزری۔ وہ کس طرح رسوائی کی زندگی گزار کے جان دینے پہ مجبور ہو گیا۔ پھر اس شعر کے معنی یہ ہونگے کہ خواب دیکھنے والی شیریں نہیں، خواب فرہاد دیکھ رہا ہے۔ ایک خوابِ شیریں جس میں اُسے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی آسودگی کا سامان نظر آتا ہے یہی اس کی شیرینی ہے، اور وہ چونکہ شیریں کا مرہونِ منت ہے اس لیے اور بھی زیادہ شیریں ہے۔ لیکن ساتھ ہی گراں بھی ہے، اس لیے کہ اُسے حقیقت بنانا آسان نہیں ہے۔ غالب یہاں یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کہ حالات کی سنگین ستم ظریفی ہے کہ کوہکن جیسا عظیم فنکار خسرو پرویز کی طرب گاہ میں ایک عام مزدور کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔ لیکن اس جسمانی مشقت کے باوجود اس کا ذہن ایک حسین پیکر تراشنے میں مصروف ہے۔ بے ستوں اس کے لیے ایک ایسا آئینہ ہے جو اس کے خواب کی تعبیر بن جائے گا۔ وہ اُسے شیریں کے ایک امٹ نقش سے مزین کردے گا۔ لیکن ایسا نہ ہوسکا، اور وہ خواب صرف ایک خواب ہو کے رہ گیا۔ ایک خوابِ گراں۔

اس دنیا میں کتنے تخلیق کار ہیں جنھیں اپنے فن کے اظہار کے لیے مناسب سہولتیں حاصل ہوتی رہیں، بے شمار اہلِ کمال انتہائی عسرت میں زندگی گزارتے رہے، احسان دانش مرحوم نے تو فرہاد کی طرح ایک مزدور کی حیثیت سے روزی کمانے کا آغاز کیا۔ وہ اپنی آپ بیتی جہانِ دانش میں لکھتے ہیں۔ اس طرح ہم دونوں (انھیں اور ان کے والد) کو چار سو من ریت کھودنے اور ڈھونے کے معاوضے میں ٹھیکیدار صرف آٹھ آنے دیتا تھا۔ آگے چل کر وہ لکھتے ہیں عرصہ کے بعد میرا جسم اس مشقت کو سہہ گیا اور ہاتھوں میں پھاوڑے کی ٹھیکیں پک گئیں تو وہ ہلاک کر دینے والی مشقت میرے لیے کوئی جان لیوا چیز نہ رہی لیکن یہ خیال ضرور آتا رہا کہ ٹھیکیداروں کو کتنے (کثیر معاوضے) ملتے ہیں اور ہم مزدوروں کو صرف چار آنے روز دیے جاتے ہیں جس سے نہ اچھی طرح کھانے بھر کو ملتا اور نہ زندگی کے دوسرے کام چل سکتے ہیں۔ "گرسنہ مزدور طرب گاہِ رقیب" کی کسی جیتی جاگتی تصویر ہے احسان دانش کے ان اقتباسات میں لیکن اس محرومی اور مشقت کے باوجود وہ اپنی شاعرانہ صلاحیتوں سے محروم نہیں ہوئے۔ غالب خود انتہائی نامساعد حالات سے دوچار رہے لیکن ان کی تخلیقی قوتیں ان حوادث سے مجروح ہونے کے بجائے فروغ پاتی رہیں۔ ان کے لیے کیا مشکل تھا کہ وہ فرہاد کی روح فرسا مشکلوں اور آزمایشوں کے باوجود اس کی ذات میں "نقاشِ یک تمثالِ شیریں" کی حقیقت تک پہنچ جاتے اور بے ستوں میں "خوابِ گرانِ شیریں" کا آئینہ دیکھ لیتے۔ ساری عمر فرہاد کو برا بھلا کہنے کے بعد غالب نے ان دو شعروں سے اپنی تمام زیادتیوں کا کفارہ ادا کر دیا۔ اور اس کے کمال کے اعتراف میں ایسا بے نظیر نذرانہ پیش کیا کہ ان کے شارحین بھی اُسے نہ سمجھ سکے۔ سوائے میرے غالب شناس دوست کے جن کے قہقہے فکرِ غالب کی ہر گرہ کو کھول کے شرح کا حق ادا کر دیتے ہیں۔

پس نوشت:

یہ غالب کا اعجاز نہیں تو اور کیا ہے کہ بابائے اُردو توسیعی لیکچر کے بعد جب عالی صاحب کے ہاں میں نے پروفیسر رالف رسل کو یہ مضمون سُنایا تو بجائے میری تنقید سے متفق ہونے کے وہ نہایت کشادہ قلبی سے مجھ سے اتفاق کرتے چلے گئے۔ حد یہ ہے کہ کم از کم چار دفعہ انھوں نے خوش ہو کے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

میں یہ سمجھتا تھا کہ اتفاقِ رائے اور مکمل تائید کے اظہار میں ہاتھ ملانا صرف اس برصغیر کی خصوصیت ہے۔ اب یہ کھلا کہ اپنے مداحوں کی حد تک اس کے پیچھے کچھ غالب کا تصرف بھی کارفرما ہوتا ہے میں غلطی سے اپنے غالب شناس دوست کی قہقہہ افگنی اور دست زنی کو اُن کے خون کی گرمی اور توانائی کی افراط پہ محمول کرتا تھا۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ غالب ایک سرد مزاج قوم کے سنجیدہ مصنف رالف رسل کو بھی اس قسم کے طرزِ عمل پر اُکسانے پر کامل قدرت رکھتے ہیں۔ عالی صاحب میری قابلِ اعتراض تحریر

پر خاصے برہم ہوئے [illegible] پروفیسر رسل کی تائید نے اس برہمی میں اور اضافہ کر دیا۔ جب اُن کی برہمی کی وجہ سے صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تو انھوں نے اپنے مضمون کو اس غیر ذمہ دارانہ رویے کے مضمرات سے آگاہ کیا۔ لیکن جب اس تنبیہ کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا تو انھوں نے اپنی بیگم سے یہ کہتے ہوئے صبر کر لیا کہ ان دونوں کی بدمذاقی سے یہ ہفتہ مجھ پہ بہت گراں گزرے گا۔ [illegible] رسل کے [illegible] کے ساتھ قیام کا ایک ہفتہ [illegible] میری بدمذاقی کے شاکی ہیں اور میں پروفیسر رسل کی کشادہ قلبی کا معترف!

قومی زبان (۳۹) فروری ۱۹۹۴ء

غالب۔ ایک جائزہ

اختر حسین رائے پوری ترجمہ محمد رضا کاظمی

غالب اپنے زمانۂ حیات ہی میں ایک اعلیٰ شاعر اور ایک اہم نثر نگار تسلیم کر لیے گئے تھے مگر اردو اور فارسی ادب کی اقلیم میں ان کا اصل مقام ان کی موت کے بعد معیّن ہوا۔ ایک صدی کے دوران ان کے مرتبے میں اضافہ ہوتا گیا ہے اور اب اس کی جہات کی پیمائش ممکن ہوگئی ہے۔

خود اپنے فیصلے کے مطابق وہ فارسی کے عظیم شاعر تھے۔ وقت نے اس دعوی کی نفی کردی ہے اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ اپنی ہی زبان تخلیقی اظہار کا بہترین ذریعہ ہوتی ہے۔ تاہم اس سے انکار ممکن نہیں کہ غالب فارسی غزل کے آخری باکمال شاعر تھے۔ انیسویں صدی ایران کا واحد نامور شاعر قاآنی تھا۔ غالب ہی کا معاصر جو قصیدہ کے قدیم فن میں سبقت رکھتا تھا۔ اس جائزہ سے غالب کی روح کو بے قرار ہونے کی ضرورت نہیں چونکہ اردو نے انھیں غزل کے دو اساتذہ میں سے ایک تسلیم کیا ہے اور جدید نثر کے پیش رو کی حیثیت سے بھی۔

غنائی شاعری کی ایک ہئیت کی حیثیت سے غزل نے اپنا آغاز عربی میں پایا اور تکمیل فارسی میں۔ اردو میں یہ بے انتہا مقبول ہوگئی اور ہزارہا موزوں طبع افراد نے اس کے افسردہ نشانوں کو اپنا ہدف بنایا مگر چند ہی اس لطیف ترین شعری ہیئت کی داخلی ترکیبوں کو حل کر سکے ہیں اور ان چند میں میر تقی میر اور غالب دیو کی مانند کھڑے ہیں۔ اگر زبان کی فصیل ہٹا دی جائے تو وہ حافظ، سعدی اور امیر خسرو کے ساتھ ایوان اعزاز میں داخل ہو سکتے ہیں۔

مغربی ادبی تنقید کے معیاروں کے ترجمانوں نے غزل کو اس کی رسمیت اور تنگنائی کی خاصیت کی بنا پر مطعون کیا ہے۔ غزل مترجم کی عاجزی بھی ہے کہ وہ بازگشت و سرگوشی کو الفاظ کا جامہ پہنا نا نہیں جانتا۔ ترجمہ کا فن محض دو زبانوں کے علم پر منحصر نہیں بلکہ اس ادراک پر بھی کہ فنکار نے کیا چیز ان کہی اور بے لکھی چھوڑ دی ہے غزل سے زیادہ کوئی شعری اسلوب اس قدر اغماض نہیں برتتا اس سے مترجم کی دہری دقت سمجھ میں آتی ہے۔

بہر حال یہ تنقید۔ چینی مصوری اور ہندو پاکستانی موسیقی پر مغربی تنقید کی طرح۔ یک طرفہ ہے۔ اگر ہماری موسیقی مغربی آہنگ کے اندازوں کے مطابق نہیں، اور اگر چینی تصویر مغربی مصوّر کے تناظر سے میل نہیں کھاتی اور ایک ایرانی مختصر تصویر میں ایک جہت کی کمی ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ شعر اور مصوّری نہیں رہتیں۔ یہ صرف فنی اظہار کی ایک نئی نوع کو پیش کرتی ہیں اور فنی تجربہ کی میزان میں اضافہ کرتی ہیں۔ غرض کہ غزل غنائی شاعری کا ایک ایسا اسلوب ہے جس نے فارسی اور اردو میں

تکمیل پائی اور اشارت وعلامت میں فرد ہے۔

خود ہمارے بعض ناقدین نے غزل کو فارسی شاعری کی ایک مدھم نقل محض کراس کی تنقیص کی ہے۔ یہ تعریف کم و بیش درست ہوتی اگر میر تقی میر اور غالب نہ ہوتے۔

اٹھارویں صدی اس برصغیر کی طویل تاریخ میں سب سے زیادہ متلاطم تھی۔ خاص کر مسلمانوں کے لیے یہ ایک بہت مشکل دور تھا جونکہ وہ یکلخت زوال اور انحطاط سے دوچار ہو گئے تھے۔ میر نے اپنے عہد کے فرد اور اجتماعی روح کی اذیت کو جمع کر دیا تھا اور درحقیقت ہر اس عہد کے دکھ کو بھی جس میں درد و غم کا آسیب ذہن انسانی کو آلیتا ہے۔ ان کی پوری شاعری درد کی اک کراہ تھی جو پامال اور مظلوم انسانیت کی تہوں سے گویا پھوٹ نکلی تھی۔

غالب اپنے پیش رو سے کئی لحاظ سے مختلف تھے۔ ان کی زندگی اور شاعری انیسویں صدی میں گزری جو ایک مردہ عہد کی شام اور ایک نئے عہد کے سویرے کے درمیان واقع تھی۔ جہاں میر کا فن مجرد سادگی اور خلوص پر مبنی ہے، غالب شعوری طور پر آفاقی اور گنجلک ہے۔ وہ کئی نقاب پہنتا ہے، کئی طبائع سے کھیلتا ہے اور اپنے سامع کو اپنے اشکال سے حیران کر کے خوش ہوتا ہے اردو کے کسی اور شاعر نے اتنی شرحوں اور تبصروں کو دعوت نہیں دی جتنا کہ غالب نے۔ غالب کی یہی ترغیب انگیز صلاحیت ہے جس نے اس قدر دلچسپی کو بیدار کیا ہے۔

جہاں غالب غزل کی روایات کے وفادار رہے، وہاں انھوں نے اسے ایک فلسفیانہ اور دانشورانہ مافیہ دیا اور ایک ایسا طرز اپنایا جس میں طباعی، تازگی کی ایک لہر کی طرح آئی تھی۔ یہاں بیدل و نظیری، برصغیر کے مشہور فارسی شاعروں کے اثرات دریافت کیے جا سکتے ہیں، لیکن غالب کی شاعری رنگ اور روشنی پاتی ہے اپنی انسان دوستی، مروّج اقدار پر طنز اور اپنے آہنگ کے زیریں سر میں للکار رکھنے کی وجہ سے، جو میر کی انفعالیت اور مظلومیت سے بہت مختلف ہے۔ غالب نے یہ صلاحیت اپنی بصیرت سے حاصل کی جو ۱۸۵۷ء کے عظیم سانحہ سے قبل ہی پیدا ہو چکی تھی۔

نظریہ کی رو سے غزل عاشقوں کا مکالمہ ہے۔ خام کاروں کے ہاتھ..... اور ان کی تعداد کثیر ہے..... یہ اکتا دینے کی حد تک یکساں اور نقال ہوتی ہے۔ موزوں طبائع رعایت لفظی کی خاطر اس کا استعمال کرتے ہیں اور اپنے معشوق کو اپنی سستی جذباتیت اور بیزار کن مسنیت سے لب گور پہنچا دیتے ہیں۔ لیکن ایک سچا شاعر ان چند اشعار میں، جس سے غزل بنتی ہے، اپنا کمال دکھاتا ہے۔ اس طور سے کچھ بہترین شاعری وجود میں لائی گئی ہے اور اپنی بہترین حالت میں غزل اپنی جذباتی کشش، لفظ و معنی کے لطیف آمیزہ کی وجہ سے عالی ہے۔

غالب غزل کی ہیئت کو برقرار رکھتے ہیں لیکن اسے وہ عاشق و معشوق کا رسمی دوگانہ نہیں سمجھتے۔ اس کی یہ حسن (جو صدق بھی سکتا ہے) کی تلاش ایک راہ بے منزل ہے۔ وہ یہاں وہاں رک کر آفاق و حیات کے راز دریافت کرتے ہیں۔ ایک ان تھک تعاقب کے درمیان ان کی یہی راہ گریزی ہے جو ان کی شاعری پر اسرار کا سایہ کیے ہوئے ہے۔ یہ ایک ماضی طلبی، حسرت اور ناآسودگی فضا پیدا کرتی ہے جس کی بدولت وہ دوسروں سے الگ کھڑے ہیں۔

میر امن کے اسلوب نثر کو حیات نو دیکر غالب نے اردو ادب کی ایک نمایاں خدمت کی ہے۔ انھوں نے مکتوب نگاری کو ادب لطیف کا رتبہ دے دیا ہے۔ یہ مظاہرہ کر کے کہ نثر کس قدر سادہ اور سجیلی ہو سکتی ہے، غالب نے آرائشی اور پھولدار لفاظی کے ان مغز جالوں کو صاف کیا جنھیں ان کے زمانے سے قبل نثر کا نام دیا جاتا تھا۔

اپنے ہم چشموں میں غالب تنہا ہیں جو مرد نشاط ثانیہ کے خطاب کے حقدار ہیں۔ اس نشاطِ ثانیہ کے پس منظر میں جس نے
ویں صدی کے آخر میں برصغیر کے اقوام کو جالیا۔ انھوں نے روایت اور جدت کے درمیان توازن رکھا، جب ان کے ساتھی ہر
ے کھو چکے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے عالمی ادب کی ابدی ہستیوں میں جگہ لے لی ہے۔ ملک و ملت اور زبان
ے تنگ فصیلوں کو عبور کرنے کے بعد۔

Sualin
نہایت موثر اجزا کے اضافے کے ساتھ
نئے اسٹرپ پیک میں
نئی مفید ترین
سُعالین

مدینۃ الحکمۃ
تعلیم سائنس اور ثقافت
کا عالمی منصوبہ۔
جب کھانسی کا ٹھسکا ہو ایک ٹکیہ سعالین منہ میں ڈال کر چوسیے۔ سانس میں راحت پائیے۔ ہر قسم کی کھانسی کے لیے مفید ترین۔ سعالین
سعالین جوشاندے کا جوہر ہے۔ تین ٹکیاں گرم پانی میں ڈال کر نوش جاں کیجیے۔ نزلہ زکام اور کھانسی سے راحت پائیے۔

غالبیات ۱۹۹۰ء ۹۲

ڈاکٹر معین الرحمٰن

غالب (ولادت ۱۷۹۷ء) کا انتقال ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو ہوا۔ اگلے برس، وسط میں اُن کی وفات پر ۱۲۵ برس پورے ہوں گے۔ ہم نے شعبۂ اُردو گورنمنٹ کالج لاہور میں غالب کے انتقال کی سواسویں برسی کو اہتمام سے منانے کی منصوبہ بندی کی ہے۔ اَب سے ۔ برس بعد ۱۹۹۷ء میں غالب کی ولادت کو دو سو برس ہو جائیں گے۔ اُن کے دوسرے صد سالہ جشنِ ولادت کو شایانِ شان طور پر منانے کی آرزو اَبھی بے چین کیے دے رہی ہے۔ متعدد علمی منصوبوں کے منجملہ ہماری خواہش اور کوشش یہ بھی رہے گی کہ موضوع وار (اور زمانی ترتیب سے بھی) ذخیرۂ غالبیات کا جائزہ پیش کیا جاسکے۔ یہ کام متعدد جلدوں میں سمائے گا۔ اور اس کی بجا آوری اہلِ علم کے عمومی اور غالب شناسوں کے خصوصی تعاون کے بغیر ممکن نہیں۔

حالی کی "یادگارِ غالب" کو غالب پر پہلی باقاعدہ کتاب بتایا جاتا ہے۔ یہ غالب کے پہلے صد سالہ جشنِ ولادت (۱۸۹۷ء) کی یاد گار ہے۔ "یادگارِ غالب" کے بعد سے اَب تک غالب کے بارے میں بے حد بے شمار چھوٹی بڑی کتابیں، رسالے یا رسائل کی خصوصی اشاعتیں اور متفرقِ مضامینِ نظم و نثر چھپ چکے اور برابر چھپتے چلے آ رہے ہیں۔ میرے شخصی ذخیرۂ غالبیات میں ایسے محفوظ حوالے، ہزاروں سے متجاوز ہیں ...... غالب پر میری پہلی کتاب "اِشاریۂ غالب"، غالب کی پہلی صد سالہ برسی کے موقع پر ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ کام کی نوعیت ایسی تھی کہ غالب پر چھوٹی بڑی، اچھی بُری، نئی پرانی مطبوعات کو دیکھنا اور فراہم کرنا ضرورت بنتا گیا ...... آج اِس شغف کے نتیجے میں، اپنے شخصی ذخیرۂ غالبیات کو بے تکلف بر طرف میں خاصا مضبوط اور بے مثال پاتا ہوں۔

غالب کی پہلی صد سالہ برسی (۱۹۶۹ء) کے بعد تاحال، کوئی برس ایسا خالی نہیں گیا کہ غالب کے بارے میں کتابی حجم کا کوئی نہ کوئی قابلِ ذکر کام منظرِ عام پر نہ آیا ہو۔ تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں، میں شخصی ذخیرۂ غالبیات سے، سال ۱۹۹۰ء ۱۹۹۱ء اور ۱۹۹۲ء کے کتابی حجم کے اضافات کی فہرست پیش کر رہا ہوں۔ یہ اضافات، مطالعۂ غالب میں کسی طور نظر انداز کیے جانے کے لائق نہیں۔

سال ۱۹۹۰ء کے حاصلات:

(۱) غالب کے خطوط (حصہ سوم)، مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم، مطبوعہ کراچی

(۲) دیوانِ غالب کامل، مرتبہ: کالی داس گپتا رضا، کراچی
(۳) تحقیق اور تلاش (غالبیات)، از: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، لاہور
(۴) غالب - احوال و آثار، از: ڈاکٹر حنیف نقوی، لکھنؤ
(۵) غالب پر چند تحریریں، از: ڈاکٹر سعادت علی صدیقی، دہلی
(۶) عظمتِ غالب، از: ڈاکٹر عبدالغنی، دہلی
(۷) غالب اور تصوف، از: سید محمد مصطفےٰ صابری، دہلی
(۸) غالب کی رہ گذر، مرتبہ: واجد سحری، دہلی
(۹) غالب شکن اور یگانہ، از: ڈاکٹر نجیب جمال، ملتان
(۱۰) بنگال میں غالب شناسی، از: ڈاکٹر کلیم سہسرامی، ڈھاکا
(۱۱) دیوانِ غالب (مرتبہ: مولانا حامد علی خاں)، دیباچہ نورالحسن نقوی، علی گڑھ
(۱۲) غالب نامہ، مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر نذیر احمد، جنوری ۱۹۹۰ء دہلی
(۱۳) غالب نامہ، مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر نذیر احمد، جنوری ۱۹۹۰ء دہلی
(۱۴) اردو کلام غالب کا ابجدی اشاریہ، مرتبہ: سیدہ نغمہ واسطی، لاہور (غیر مطبوعہ تحقیقی ایم اے اردو، نگران کار: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن)
(۱۵) نذرِ منظور، (حصۂ غالبیات)، مرتبہ: اسلوب احمد انصاری، علی گڑھ

سال ۱۹۹۱ء کی مطبوعات

(۱) غالب کچھ مضامین، مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم، مطبوعہ دہلی
(۲) انتخابِ کلامِ غالب (اُردو مکمل)، از: ڈاکٹر مسعود حسین، علی گڑھ
(۳) غالب تب اور اب (مسعود حسین رضوی)، مرتبہ: ڈاکٹر طاہر تونسوی، لاہور
(۴) مُطالعۂ غالب، از: ڈاکٹر گوہر نوشاہی، لاہور
(۵) غالب پر چند مقالے، از ڈاکٹر نذیر احمد، دہلی
(۶) اشاریۂ خطوطِ غالب (جلد اوّل)، مرتبہ: ہما اخلاق نسیم، لاہور
(۷) تحقیق اور تلاش (غالبیات)، از: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، طبع دوم لاہور
(۸) غالب نامہ، مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر نذیر احمد، جنوری ۱۹۹۱ء، دہلی
(۹) غالب نامہ، مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر نذیر احمد، جولائی ۱۹۹۱ء دہلی

غالبیات میں سال ۱۹۹۲ء کے اضافات

(۱) غالب بُرا نہ مان، از: ریاض صدیقی، مطبوعہ کراچی

(۲) غالب کی نفسیاتِ غم، از: سمیع اللہ قریشی، لاہور

(۳) غالب آگہی، مرتبہ: سیّد قدرت نقوی، لاہور

(۴) رُوحِ غالب شرح دیوانِ غالب، از: نشتر جالندھری، لاہور

(۵) اشاریہ خطوطِ غالب (جلد دوم) مرتبہ: ساجدہ پروین، لاہور

(۶) غالب، مرتبین: مختار زمن، رعنا فاروقی، کراچی

(۷) غالب نامہ، مدیر اعلیٰ "ڈاکٹر نذیر احمد، جنوری ۱۹۹۲ء، دہلی

(۸) غالب نامہ، مُدیرِ اعلیٰ: ڈاکٹر نذیر احمد، جولائی ۱۹۹۲ء دہلی

(۹) غالب نامہ، کا تجزیاتی مطالعہ (تھیسس ایم اے اردو) از: عاصمہ اعجاز، لاہور

(۱۰) غالب کے تین اہم سوانح نگار۔ حہر، اکرام، مالک رام، از: شازیہ اشفاق، فیصل آباد (غیر مطبوعہ تھیسس برائے ایم اے اردو نگرانِ کار: ڈاکٹر انور محمود خالد)

(۱۱) دیوانِ غالب اردو نسخہ عرشی، مولانا امتیاز علی خاں عرشی لاہور

(۱۲) دیوانِ غالب نسخہ حمیدیہ، مرتبہ: پروفیسر حمید احمد خاں، لاہور

یہ بات واضح طور پر پیشِ نظر رہے کہ یہ فہرست، اس عرصے (۹۲-۱۹۹۰) میں چھپنے والے کُل ذخیرۂ غالبیات کی نہیں۔ ان تین برسوں کی کتابی حجم کی یہ صرف وہ چیزیں ہیں جو مجھے میسّر آسکیں۔ بہت سے قیمتی علمی کام اور تحائف ایسے ہیں جو مجھے کوشش کے باوجود نہیں مل سکے جن کی فکر اور تلاش میں ہوں، ایسے بھی ماخذ ہوں گے جو دسترس تو دُور کی بات ہے، میرے احاطۂ علم ہی میں نہ آپائے ہوں گے۔ اہلِ قلم اور ناشرین سے گزارش ہے کہ وہ ہدیتاً، قیمتاً یا عاریتاً اپنی کاوشوں سے شاد کام فرمائیں تاکہ "غالبیات" سے متعلق پیشِ نظر علمی منصوبے کی زیادہ سے زیادہ حد تک جامعیت کو یقینی بنایا جاسکے۔

غالب کو ہم سے جُدا ہوئے آج ایک سو چوبیس برس ہو چکے۔ غالب کے عیب و ہنر پر بہت کچھ کہا گیا ہے اور کہا جاتا رہے گا۔ غالب ہمیں اپنی کمزوریوں کے ساتھ اور لغزشوں سمیت، عزیز ہیں۔ ایک ایسے موقع پر رشید احمد صدیقی کو ایک پاپولر سانگ کا ٹکڑا یاد آیا تھا۔ جہاں ایک سیدھا سادہ امریکی عاشق اپنے محبوب کے بارے میں کہتا ہے کہ:

WITH ALL YOUR FAULTS I LOVE YOU STILL کچھ اسی نوع کی کیفیت غالب کے لیے ہم اپنے دلوں میں پاتے ہیں اُن کے اعمال کے کچھ مصرعے، رشید صاحب کے بقول شاید تقطیع سے گرتے ہوں، بایں ہمہ وہ مجھے عزیز ہیں۔ چاہتا ہوں کہ محبت کا یہ شعلہ ہم سب کی مشترک اَساس، اَمانت یا وراثت بن جائے!

قومی زبان (۴۶) فروری ۱۹۹۴ء

عاشقِ غالب برجندر سیال۔ ایک باکمال فن کار

جمیل زبیری

آگرہ ہندوستان کا ایک قدیم اور تاریخی شہر ہے۔ اس شہر کی منہ بولتی تصویر تاج محل ہے جو اپنی صناعی اور خوبصورتی کے لیے سارے عالم میں مشہور ہے۔ یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہے کہ آج بھی وہاں بڑے بڑے فنکار موجود ہیں اور انھی میں ایک برجندر سیال ہیں۔

کچھ عرصہ قبل جب میں ہندوستان گیا تھا تو آگرہ جانے کا بھی اتفاق ہوا وہاں میرے ایک عزیز ایک شام مجھے ان سے ملانے لے گئے۔ جانے سے پہلے انھوں نے مجھے سیال کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا سوائے اس کے کہ "آج آپ کو ایک بڑے باکمال فن کار سے ملانے لے چلتے ہیں۔"

ہم شام کو تقریباً ساڑھے پانچ بجے ان کے گھر پہنچے۔ باہر ایک چھوٹا سا گیٹ تھا گیٹ سے داخل ہوتے ہی سامنے ایک چھوٹی سی بیٹھک تھی جس میں ایک صوفہ اور چند کرسیاں پڑی تھیں۔ ... ہا ایک کھلی الماری تھی جس میں اوپر سے نیچے تک بہت سے چھوٹے چھوٹے مجسمے رکھے ہوئے تھے۔

میں ابھی ان کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ برجندر سیال داخل ہوئے۔ ان سے تعارف ہوا بڑی گرمجوشی سے ملے۔ وہ ایک بہت ہی سادہ، دبلے پتلے چھوٹے قد کے UNASSUMING آدمی ہیں مگر ان کی شخصیت کا جائزہ لینے کے بعد جب میں نے ان کی آنکھوں کی طرف دیکھا تو مجھے ان میں ایک عجیب گہرائی، تاثر اور سوچ دکھائی دی۔

تھوڑی دیر ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر میرے عزیز نے بتایا کہ سیال بڑے باکمال انسان ہیں۔ غالب کے عاشق ہیں اور انھیں غالب کا پورا دیوان زبانی یاد ہے۔ یہ سُن کر سیال کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی جیسے وہ کہنا چاہتے ہوں کہ یہ تو معمولی بات ہے۔ غالب کا دیوان تو کوئی بھی حفظ کر سکتا ہے۔ لیکن جب میرے عزیز نے بتایا کہ ان کے کمالات کے نمونے وہ سامنے الماری میں رکھے ہیں تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ بظاہر وہ چھوٹے چھوٹے مجسمے لگ رہے تھے اور میں نے انھیں غور سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ کہنے لگے کہ یہ جتنے مجسمے رکھے ہیں یہ سب غالب کے اشعار ہیں جنھیں سیال صاحب نے ان شکلوں میں ڈھال دیا ہے۔

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہ جملہ سنتے ہی سیال کے اندر کا فن کار اچھل کر باہر آگیا وہ اپنی جگہ سے اٹھے اس الماری کے قریب گئے۔ سنگ مرمر کی ایک تختی اٹھائی اور میرے سامنے رکھ دی۔ اس تختی پر ایک مجسمہ بنا ہوا رکھا تھا۔ جو تجریدی طرز کا تھا۔ میں اسے دیکھتا رہا اور سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ سیال میری طرف دیکھ کر مسکراتے رہے پھر انھوں نے غالب کا شعر پڑھا۔

سر پائے خم پہ چاہیے ہنگام بے خودی

رو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے

شعر سنتے ہی ایسا لگا جیسے کوئی چیز اچھل کر میرے حلق میں آ گئی۔ میں زندگی بھر غالب کے اشعار پڑھتا رہا ہوں۔ سنتا رہا ہوں مرقع چغتائی دیکھا ہے، مرقع صادقین دیکھا ہے مگر غالب کے شعر کو اس طرح بولتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

میں سوچنے لگا کہ سیال ان پتھروں کو کس محنت سے تراشتے ہوں گے۔ آخر میں نے ان سے پوچھ ہی لیا۔ اس پر وہ ہنسے اور انھوں نے مجھے بتایا۔

زبیری صاحب یہ پتھر میں نہیں تراشتا بلکہ قدرت خود انھیں تراشتی ہے۔ میں صرف انھیں ڈھونڈتا ہوں۔ دریاؤں کے کنارے، پہاڑوں کے دامن میں، پتھریلے میدانوں میں!! مجھے ہر جگہ کبھی کبھی غالب کے پورے پورے شعر اور کبھی ان اشعار کے حصے، پتھروں میں پڑے نظر آتے ہیں۔ انھیں میں سمیٹ لاتا ہوں اور گھر لا کر انھیں سنگِ مرمر کی تختیوں پر سجا دیتا ہوں۔ پھر غالب کا شعر مجھے بولتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ میں ان پتھروں میں کوئی کاٹ چھانٹ نہیں کرتا یہ کام قدرت خود ہی کرتی ہے سورج کی کرنوں سے، تیز بہتے ہوئے پانی کے دھارے سے، بارش کے قطروں سے، دن میں بے انتہا گرم ہو جانے کے بعد رات میں چلنے والی خشک ہوائیں انھیں تراشتی ہیں۔ میرا فن اور میری آنکھ صرف انھیں ڈھونڈتی ہے اور پھر میں انھیں سجاتا ہوں۔

وہ بولے جا رہے تھے اور میں حیرت سے انھیں دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ قدرت نے اس شخص کو کیا ذہن اور کیا آنکھیں عطا کی ہیں اور کیسا فنکار بنا دیا ہے۔ ہماری دلچسپی اور انہماک دیکھ کر ان کے بولنے کی رفتار میں اور تیزی پیدا ہو گئی تھی اب انھوں نے ایک اور مجسمہ اٹھایا، میری طرف بڑھایا اور شعر پڑھا:

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

سیال نے بتایا کہ کبھی کبھی کوئی کمی پوری کرنے کے لیے میں گیہوں کا ایک دانہ لگا کر دوسری آنکھ بنا دیتا ہوں یا تار لگا کر مضراب کی شکل پوری کر دیتا ہوں یا ایک چھوٹا سا ہار پہنا کر مجسمے کے گلے میں ڈال دیتا ہوں پھر وہ خود بہ خود بولنے لگتا ہے۔ سیال نے پھر ایک اور مجسمہ اٹھایا۔ میں اسے دیکھتا رہا اور غور کرتا رہا کہ یہ غالب کے کس شعر کی "تشریح" ہو سکتی ہے مگر اس کی صلاحیت تو قدرت نے سیال کو عطا کی تھی۔ وہ مسکراتے رہے اور پھر جب انھیں محسوس ہوا کہ ہم ناکام ہو گئے تو انھوں نے شعر پڑھا۔

جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دُعا کیا ہے

پھر اسی طرح ایک اور مجسمہ مجھے دیا اور انتظار کرتے رہے۔ پھر خود ہی شعر پڑھا:

ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرت تعمیر گھر میں خاک نہیں

پھر انھوں نے ایک مجسمہ اور اٹھایا اور اس مرتبہ میرے ذہن میں شعر آ گیا:

پوچھ مت حالت مرے دل کی ہم آغوشی کے وقت

سیال زور سے ہنسے اور کہنے لگے اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ مجسمہ سب سے بہتر بنا ہے اتنے میں ان کی بیٹی ابھرو جی جائے اور کچھ لوازمات لیے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی اور ہماری باتوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

ہم لوگ چائے پیتے رہے۔ میں اپنے طالب علمی کے زمانے کے قصے انھیں سناتا رہا (میں نے آگرے ہی میں سینٹ جانز کالج میں پڑھا ہے)۔

چائے سے فراغت پا کر مجسمے دکھانے کا سلسلہ انھوں نے پھر جاری کیا اور اسی طرح میں نے تقریباً پچاس مجسمے دیکھے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ تقریباً اتنے ہی وہ غالب اکیڈمی کو بطور تحفہ دے چکے ہیں۔ ہندوستان میں کئی مرتبہ ان کی نمائش بھی ہو چکی ہے۔

جب مجسمے دکھا چکے تو شاعری پر بات ہونے لگی اس وقت مجھے پتا چلا کہ وہ خود بھی شاعر ہیں اور اچھے شعر کہتے ہیں۔ میرے اصرار پر انھوں نے مجھے کئی غزلیں اور نظمیں سنائیں۔

میری ان سے اب بھی خط و کتابت ہے۔ وہ بڑی خوبصورت عبارت لکھتے ہیں۔ ان کے ایک خط سے اقتباس۔

آپ سے جاتے وقت جب آپ سے بغل گیر ہوا تھا تو ایسا لگا تھا جیسے اپنے قریبی عزیز سے مل رہا ہوں۔ کتنی سادہ خوبصورت اور بے لاگ ہوتی ہیں یہ ملاقاتیں۔ جمیل صاحب انسانیت کی معراج کی جانب ہم پروازی کی چاہ لیے ہوئے۔ سیاست اور ریاست سے اٹھ کر ایک لاہوتی سی خوشی ہوتی ہے اور اکثر یہ لمحاتی خوشی دائمی نقش چھوڑ جاتی ہے۔ ورنہ ہم کہاں جاتے ہیں، کہاں جا سکتے ہیں۔

چلتے وقت انھوں نے اس تاریخی ملاقات کی یادگار کے طور پر مجھے ان مجسموں کی چند تصاویر عنایت کیں۔

برجندر سیال ایک دکھی انسان ہیں۔ انھیں اپنی بیوی سے بہت محبت تھی مگر میری ملاقات سے کچھ عرصہ قبل ان کا انتقال ہو گیا تھا اور وہ اکیلے رہ گئے تھے مگر وہ ایک باہمت انسان ہیں۔ انھوں نے اپنے دکھ کو ان مجسموں میں شامل کر دیا ہے۔ غالب کے اشعار اور ان کے دکھ نے مل کر ان مجسموں میں ایسی جان ڈال دی ہے کہ انسان دیکھے تو دیکھتا ہی رہا جائے۔

مکاتیبِ غالب اور ۱۸۵۷ء

ڈاکٹر صدیقہ ارمان

مرزا غالب سے پیشتر اردو میں مکتوب نویسی کا رواج عام نہیں تھا۔ چند خطوط ڈاکٹر غلام مصطفی خاں صاحب کی تحقیق کے بموجب ایک بیاض میں ملتے ہیں جو قیام الدولہ اور قمر الدولہ نے ۱۸۳۱ء سے ۱۸۳۹ء تک نواب عظیم جاہ کو یا ان کے توسط سے حکومت وقت کو نہایت غیر اہم معاملات کی اطلاع کے لیے یا کسی معاملہ کی اجازت طلب کرنے کے لیے لکھے تھے۔ کچھ اور بھی اِس قسم کے حوالے مل جاتے ہیں جو اُردو میں لکھے گئے عریضہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ ان سب کے لہجہ کی خاکساری وانکساری نے باقی تمام تاثرات کو مغلوب کر لیا ہے۔

غالب کے زمانے تک اردو کے پھیلاؤ کے باوصف علماء اپنی نگارشات کے لیے فارسی ہی کا سہارا لیتے تھے اُردو میں خط لکھنا بھی کم علمی کی دلیل سمجھا جاتا تھا۔ خود غالب نے اُردو میں خط لکھنا شروع کیا تو اسے اپنی مجبوری قرار دیا۔

مہر کو لکھتے ہیں برسوں سے خطوط فارسی لکھنے چھوڑ دیے، اب شہزادہ بشیر الدّین نبیرہ ٹیپو سلطان مغفور کے سوا کسی کو فارسی خط نہیں لکھتا اور یہ موافق ان کے حکم کے ہے اور وہ مطاع ہیں اور میں مطیع (۱)

انوار الدولہ شفق کو لکھا کہ اب جسم و جاں میں تاب و تواں نہیں، نثر فارسی لکھنی یک قلم موقوف، اردو، سو اس میں عبارت آرائی متروک، جو زبان پر آوے، وہ قلم سے نکلے (۲)

اردو نثر کے دو اسلوب اُس کا وقت موجود تھے سادہ اور عمومی فورٹ ولیم کالج کا اسلوب اور دوسرا مقفیٰ مسّجع اور مرجز نثر کا اسلوب۔

ان شواہد کی روشنی میں غالب کو اردو مراسلت کا واضع (اس وضع کو اختیار کرنے والا پہلا شخص) اور جدید نثر کا بانی قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن غالب کو اس سرفرازی کا علم نہیں تھا جبھی تو وہ خطوط کی اشاعت پر متفق نہ تھے۔ شیو نرائن کو تنبیہ کرتے ہیں کہ۔

رقعات کے چھاپنے میں ہماری خوشی نہیں ہے؟ لڑکوں کی سی ضد نہ کرو۔ اگر تمہاری اسی میں خوشی ہے تو صاحب مجھ سے نہ پوچھو، تم کو اختیار ہے، یہ امر میرے خلاف رائے ہے (۳) کرشمہ سازئ قدرت دیکھیے کہ میں یہی اردو خطوط جن کی اشاعت غالب کو اپنی سخنوری، کے شکوہ کے منافی نظر آتی تھی، اپنے راقم کو جدید نثر کا بانی اور اردو مکتوب نگاری کا باوا آدم کہلواتے ہیں۔

اردو خطوط کے آغاز وانصرام کی تو یہ شان ہے کہ اتفاقاً اور مجبوراً نہ کہ ارادتاً اور ترجیحاً یہ منظرِ عام پر آتے ہیں اور پھر ایک نئی تاریخ (اردو نثر کی) رقم کرتے چلے جاتے ہیں۔ مقبولیت اور پذیرائی کا عالم یہ کہ ابلاغ کی حدوں سے گزر کر نہ صرف اردو بلکہ عالمی

ادبیات میں خزینۂ ادب کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ استقامت کی کیفیت یہ ہے کہ ہر بڑے اور اہم آدمی کے مکتوبات محفوظ و مطبوعہ کر لینے کی روایت قائم کر دیتے ہیں یعنی خطوطِ غالب اردو مکتوب نگاری کو ایک معین ادبی رتبہ عطا کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں یہ کمال ان کے مزاج کا بھی ہے اور اندازِ نگارش کا بھی۔ بقول ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے۔

" غالب نے تو غزل کی طرح خط کو بھی ایک ادبی مشغلہ بنا لیا تھا...... ان کے خط انھیں تقاضوں سے پیدا ہوتے تھے۔ جن سے ان کی غزل پیدا ہوئی (۴) ادب میں مرقع کشی کے لیے بڑی ہنرمندی اور سلیقے کی ضرورت ہوتی ہے۔ غالب جزئیات کی ترتیب میں ایسی ہنرمندی کو روبہ کار لاتے ہیں کہ ہر معمولی اور غیر معمولی چیز ایک مجموعی فضا دل پذیری و دلکشی کی پیدا کر دیتی ہے۔ "

خطوطِ غالب کا نمایاں ترین جوہر ان کی علمی فنی اور سحر کارانہ صلاحیت کا حاوی ہونا ہے۔ غلام رسول مہر اسی جوہر کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

تعجب ہے کہ انھیں صرف رسمی خطوط سمجھ لیا گیا اور اس لحاظ سے نہ دیکھا گیا کہ ان میں صحیح مذاقِ نگارش کی پرورش کے کتنے جوہر موجود ہیں۔ (۵)

مرزا کا اسلوبِ نگارش ہی ان کو علمی نثر بنا دیتا ہے وہ حسنِ انتخاب اور حسنِ ترتیب سے اپنے گرد و پیش کی جزئیات سے ایسے مرقع تیار کرتے ہیں جنھیں پڑھ کر قاری محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ باتیں کرنے کا انداز ان کا ایسا دل کش ہے کہ نثر میں زندگی کا احساس پیدا ہونے لگتا ہے، عمرانی زندگی کے بعید گوشے نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں۔

خطوطِ غالب کی علمی ادبی، فنی تکنیکی، تاریخی، تہذیبی، سماجی، تمدنی اور گلرنگ نثری خصوصیات اتنی زیادہ ہیں کہ ڈیڑھ سو سال سے اہلِ قلم کا موضوعِ خاص بنی ہوئی ہیں تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ابھی اور کتنے گوشہ ہائے پنہاں ہیں جو مرورِ ایام کے ساتھ عیاں ہوتے جائیںگے!

لیکن انھیں خطوط کے کچھ ایسے پہلو بھی ہیں جو ایک طرف اپنے عہد کے نامہربان حقائق پیش کرتے ہیں، دوسری طرف لطافت و کثافت کی آمیزش سے ملوا ایک شخصیت جسے غالب کہا جاتا ہے۔

غالب نے جس زمانے میں یہ خطوط لکھے (۱۸۴۸ء - ۱۸۶۹ء) وہ ایک ایسا دور تھا جب برصغیر انگریز کے قہر و غضب کی زد میں تھا۔ ۱۸۵۷ء کی شکست و ریخت نے مسلمانوں کو کچھ اس طرح پسپا کیا تھا کہ متین لمحوں کا وقار چھین کر ظالم کی پذیرائی کرنے والے لمحوں کی زیادہ ضرورت تھی۔ یہ مجبوریوں کا جبر تھا کہ غاصبوں کے محاسن گنوائے جانے لگے، اور لیٹروں کو اپنے لیے رحمت قرار دیا جانے لگا۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار صاحب نے غالب کی اس کیفیت کو حالات سے مفاہمت، موقعہ کے مطابق کارروائی، معاملہ فہمی اور دور اندیشی قرار دیا ہے برصغیر میں جو کشمکش، تقریباً ڈیڑھ سو سال سے جاری تھی، اس کا خاتمہ مغل حکمت کے انتزاع پر ہوا۔ غالب اس قیامتِ صغریٰ (مسلمانوں کی شکست) کو جس اطمینانِ قلب کے ساتھ قبول کرتے ہیں وہ یہ تاثر دیتا ہے کہ یہ ایک معمولی بات تھی لکھتے ہیں۔

"بھائی بُری آ بنی ہے، انجام اچھا نظر نہیں آتا، قصّہ مختصر یہ کہ قصّہ تمام ہوا" (۶) (۳ فروری ۵۸ء بنام تفتہ)

مرزا تفتہ ہی کو ۱۲ مارچ ۱۸۵۸ء کو لکھتے ہیں "بہرحال! یہ خدا کا شکر ہے کہ بادشاہی دفتر میں سے میرا کچھ شمول فساد میں نہیں گیا اور میں حکام کے نزدیک یہاں تک پاک ہوں کہ پنشن کی کیفیت طلب ہوئی ہے اور میری کیفیت کا ذکر نہیں، یعنی ..

جانتے ہیں کہ اس (غالب کو) کو (اہلِ ہنگامہ) سے لگاؤ نہ تھا۔ (۷) ۶ مارچ ۵۸ء کو مرزا تفتہ کو لکھا:

کاش تم سے (سر رشتہ دار من پھول سے) آشنائی ہوتی تو تمہیں اوپر اوپر ایک خط لکھ کر اُن کو بھیج دیتے کہ غالب ایک فقیر گوشہ نشین اور بے گناہ محض اور واجب الرحم ہے، اس کے حصولِ مطالب میں دریغ نہ کرنا۔ (۸)

منشی شیو نرائن آرام کو لکھتے ہیں:

"بہر حال اس شہر کے اخبار سنیئے۔ حکم ہوا ہے کہ دوشنبہ کے دن پہلی تاریخ نومبر کو رات کے وقت سب خیر خواہانِ انگریز اپنے اپنے گھر میں روشنی کریں اور بازاروں میں اور ڈپٹی کمشنر بہادر کی کوٹھی پر بھی روشنی ہوگی۔ فقیر بھی اس تہی دستی میں کہ اٹھارہ مہینے سے پنشن مقرری نہیں پاتا، اپنے مکان پر روشنی کرے گا اور قطعہ پندرہ بیت کا لکھ کر صاحب کمشنر شہر کو بھیجا ہے۔ (۹)

ایک اور خط میں شیو نرائن کو لکھا۔

اب ایک اور داستان سنو غدر کے رفع ہونے اور دلّی کے فتح ہونے کے بعد میرا پنشن کھلا، چڑھا ہوا روپیہ دام دام ملا، آئندہ کو بدستور بے کم وکاست جاری ہوا مگر لاٹ صاحب کا دربار اور خلعت جو معمولی اور مقرری تھا مسدود ہو گیا......... پہلے صاحب سکرتر بہادر سے ملا، پھر نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تصوّر میں کیا بلکہ تمنا میں بھی جو بات نہ تھی وہ حاصل ہوئی۔ یعنی عنایت سی عنایت! اخلاق سے اخلاق! وقتِ رخصت خلعت دیا اور فرمایا یہ ہم تجھ کو اپنی طرف سے ازراہِ محبت دیتے ہیں اور مژدہ دیتے ہیں کہ لارڈ صاحب کے دربار میں بھی ترا نمبر اور خلعت کھل گیا، انبالہ جا! دربار میں شریک ہو، خلعت پہن...... اس پھوڑے کا برا ہو، انبالہ نہ جا سکا (۱۰)

۲۹ ستمبر ۱۸۵۸ء کو مرزا حاتم علی مہر کو لکھا۔

"جب کوئی نواب گورنر جنرل بہادر نئے آتے ہیں، میری طرف سے ایک قصیدہ بطورِ نذر جاتا ہے........... اور جناب سکرتر بہادر گورنمنٹ کا خط اس کی رسید میں بسبیل ڈاک پاتا ہوں" (۱۱)

یہ تو زمانے کا جبر اور اتلافِ جاں کا خوف ہے جو غالب کو بے نیاز محض ظاہر کر رہا ہے لہجہ کا یہ دباؤ اپنے زمانے کی گواہی دے رہا ہے۔ مورخ تو صرف واقعات لکھتا ہے۔ یہ خطوط اس عمومی فضا کو پیش کر رہے ہیں۔ جن کو ارادتاً بیان نہیں کیا جا سکتا۔ لہجہ کا قرینہ اور الفاظ کا چناؤ بتا رہا ہے کہ اُس وقت عام و خاص مسلمان کی کیا کیفیت تھی!

حقیقی جذبات غالب کے اُس وقت کیا تھے اس کا انکشاف مکتوبات کے مندرجہ ذیل اقتباسات سے ہو سکتا ہے۔

اے میری جان! یہ وہ دلّی نہیں جس میں تم پیدا ہوئے...... وہ دلّی نہیں جس میں تم نے علم حاصل کیا........ وہ دلّی نہیں جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں، ایک کیمپ ہے مسلمان اہلِ حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ باقی سراسر ہنود...... فلاں ناتھ ڈھمک داس (علاء الدّین خاں علائی کے نام۔ ص ۱۹)

۲۶ مئی ۱۸۶۵ کو نواب امین الدّین خاں کے نام لکھا:

"آج شہر کے اخبار لکھتا ہوں۔ سوانح لیل و نہار لکھتا ہوں...... بڑے مدرسہ کا دروازہ ڈھایا گیا۔ قابل عطار کے کوچے کا بقیہ مٹایا گیا، کشمیری کڑے کی مسجد زمین کا پیوند ہو گئی، سڑک کی وسعت دوچند ہو گئی، اللہ اللہ گنبد مسجدوں کے ڈھائے جاتے ہیں اور ہنود کی ڈیوڑھیوں کے پرچم لہرائے جاتے ہیں، ایک شیر زور اور پیل تن بندر پیدا ہوا ہے، مکانات جا بجا ڈھاتا پھرتا ہے..... واہ رے

بندہ، یہ دلی وہ شہر ہے کہ اندر!(۱۲)

میر مہدی مجروح کو ایک خط میں یہ اطلاع دی کہ:

اہل اسلام میں صرف تین آدمی باقی ہیں، میرٹھ میں مصطفیٰ خان، سلطان جی میں مولوی صدر الدّین خاں بلی ماروں میں سگ دنیا موسوم بہ اسد، تینوں مردود مطرود، محروم، مغموم

اگست ۱۸۶۶ء میں شمشاد علی بیگ کو لکھا:

"آدمی تو آتے جاتے رہتے ہیں، خدا کرے یہاں کا حال سن لیا کرتے (ہو) اگر جیتے رہے اور نصیب ہوا تو کہا جائیگا، ورنہ قصہ مختصر قصہ تمام ہوا لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں اور وہ بھی کون سی خوشی کی بات ہے جو لکھوں؟" (۱۳)

۵ دسمبر ۱۸۵۷ء کو تفتہ کے نام خط لکھتے ہیں:

اور شہر میں کہاں اور یہ شہر کہاں؟ مبالغہ نہ جاننا امیر غریب، سب نکل گئے جو رہ گئے تھے نکالے گئے......... مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں، ملازمان قلعہ پر شدت ہے، باز پرس اور دارو گیر میں مبتلا ہیں" (۱۴)

شیو نرائن کو لکھا:

"بھائی ہندوستان کا قلم رو بے چراغ ہو گیا۔ لاکھوں مر گئے جو زندہ ہیں، ان میں سینکڑوں گرفتار بند بلا ہیں" (۱۵)

تین مختلف کیفیات خطوط غالب سے اخذ کی جا سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ رقم صرف وہ لکھ رہا ہے جو کاتبِ وقت اس سے لکھوا رہا ہے کہ دل اس کا مسکن غم والم ہے لیکن خوف اتلاف جاہ و جاں اس سے قصیدے لکھوا رہا ہے۔ مسلم حکومت کے مکمل خاتمے اور غاصب ٹولے کے قبضہ پر جشن چراغاں میں انتہائی تنگ دستی کے عالم میں بھی شریک ہونے پر مجبور کر رہا ہے مبادا کہ اس کا شمار غدار حکومت میں ہونے لگے دوسری کیفیت وہ جو ایک کمزور انسان کی ہو سکتی تھی۔ کہ رد و قبول کی کشمکش میں جیت قبول کی ہوئی۔ دراصل رد کر دینے کی مدافعانہ شان ان میں ہو نہیں سکتی تھی۔

غالب ایک دنیا دار، جاہ طلب، عیش کوش، بے عمل اور اعلیٰ "دماغ" رفعت خیال کا حامل، تنوع پسند اور بے مثل ذہنی و علمی صلاحیتوں سے مالا مال شخص تھا، یہاں یہ بات بھی بہت اہم ہے جو کہ ان کو اپنی ان غیر معمولی اور کمیاب صلاحیتوں کا احساس بھی تھا۔ خاندانی رئیس بھی تھے ان تمام کوائف سے کچھ عرصہ تو رد و قبول کے دوراہے پر انہیں کھڑا رکھا لیکن بالآخر عیش پسند، اور جاہ طلب غالب کی جیت ہوئی اور ان کے اندر کا انسان دب گیا، اسی لمحہ نے خطوط غالب کی ایک تیسری جہت کو پیش کیا ہے جسے بشریت بھی کہا جا سکتا ہے کہ غالب جیسا ذہین و فطین جو اپنی صدی پر چھا جانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مستقبلِ بعید پر ان مٹ نقوش ثبت کرتا ہے، لیکن بشری کمزوری یوں کی اور مجبوریوں کی زد میں آ کر اپنے آپ کو "بھاٹ" تسلیم کرتا ہے:

"گورنمنٹ کا بھاٹ تھا، بھٹئی کرتا تھا، خلعت پاتا تھا خلعت موقوف، بھٹئی متروک، نہ غزل نہ مدح، ہزل و ہجو میرا آئین نہیں، مرکھو کیا لکھوں

(۲۱ جولائی ۱۸۶۰ء بنام علاؤالدین احمد علائی)

بشری کمزوری کے یہی تقاضے غالب سے نواب رام پور (سید محمد یوسف علی خاں) کی خدمت میں وہ التجائیں کراتے ہیں جن کے جواز میں کہنے کو کچھ بھی نہیں ہے:

۱۹ اگست ۶۷ کو اپنے فرزند متبنّیٰ زین العابدین خاں عارف کے بیٹے حسین علی خاں کی منگنی کی خبر نواب صاحب کو دے

ان سے دستِ سوال دراز کرتے ہیں:

"آپ کے غلامِ زر خرید، یعنی حسین علی خاں کی منگنی ہو گئی .... اور رجب کا مہینہ قرار پایا اب میرے بڑھاپے اور میری مفلسی کی شرم آپ کے ہاتھ ہے"۔(۱۶)

نواب صاحب جو مرزا کو سو روپیہ ماہانہ وظیفہ دیتے تھے، اس التجا آمیز درخواست پر کچھ متردد ہوتے ہیں تو ۷ استمبر ۶۸ء کو غالب پھر عرضِ حال کرتے ہیں۔

"پیر و مرشد! حسین علی خاں کے سسرال والوں کا بڑا تقاضا ہے۔ زندگی مشکل ہو گئی ہے، بطریق شیأ للّٰہ سوال مختصر یہ ہے کہ جو حضرت کے مزاج میں آوے۔ وہ عطا کیجیے، اور حسین علی خاں کے نام جداگانہ تنخواہ مقرر کر دیجیے لیکن یہ دونوں امر جلد صورت پکڑ جائیں" (۱۷)

اس حوالے سے ابھی غالب کا دست سوال دراز ہی تھا کہ اس کے قرض خواہوں نے اپنی طلب شدید کر دی اور غالب شادی کی خوشی بھول کر ادائیگیِ قرض کی فکر میں مبتلا نظر آتے ہیں۔

"مجملاً آٹھ سو روپے ہوں تو میری آبرو بچتی ہے، ناچار حسین علی خاں کی شادی اور ان کے نام کی تنخواہ سے قطع نظر کی، اب اس باب میں عرض کروں، کیا مجال کبھی نہ کھولوں گا؟ آٹھ سو روپیہ مجھے دید یجیے شادی کیسی؟ میری آبرو بچ جائے تو غنیمت ہے۔ (۱۸) (بنام یوسف علی خاں ۱۶ نومبر ۱۸۶۸ء)

ان التجاؤں کے علاوہ چند اور اقتباسات ان کے خطوط سے ملتے ہیں جو ظالم اور مظلوم کی جنگ میں، ظالم کی طرف داری کا تاثر دیتے ہیں تفتہ کو لکھتے ہیں۔

"انگریز کی قوم میں سے جو، اُن رو سیاہ، کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے، ان میں کوئی میرا امید گاہ تھا اور کوئی شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی یار اور کوئی میرا شاگرد"

۱۸۵۷ء میں حاتم علی بیگ مہر کو لکھا:

"ہائے میجر جان جاکوب کیا جوان مارا گیا ہے۔ اس کا شیوہ یہ تھا کہ اردو کے فکر کو مانع آتا تھا اور فارسی زبان میں ۭ رکھنے کی رغبت دلاتا تھا یہ بھی انھیں میں ہے کہ جن کا میں ماتمی ہوں"

ہر صاحب بہادر، کی آمد پر قصیدہ لکھ کر دینا انھوں نے اپنا معمول بنا لیا تھا۔ ملکۂ معظمہ، انگلستان کی خدمت میں ساٹھ بیتی قصیدہ لکھا جس کا عنوان ہے "قصیدۂ تہنیت فتح ہند اور عمل داریِ شاہی"

چیف سکرٹر صاحب القاب میں خاں صاحب بسیار مہربانِ دوستان سے بڑھا کر خاں صاحب مشفق بسیار مہربان مخلصان لکھ دیتے ہیں تو غالب ان کو اپنا محسن و مربی جانتے ہیں۔

اور مہر نیم روز کو جو مغل دورِ حکومت میں معاوضہ دیکر لکھوائی گئی تھی، قابل اشاعت نہیں سمجھتے کیونکہ یہ مغلوں کی تاریخ تھی۔

خطوطِ غالب ہمیں یہ بھی بتاتے ہیں کہ وہ اپنے دیوان کی چھ جلدیں بہترین کاغذ اور عمدہ جلد کی بنوانا چاہتے ہیں جن کو وہ نواب گورنر جنرل بہادر، چیف کمشنر بہادر صاحب، کمشنر بہادر صاحب، ڈپٹی کمشنر بہادر دہلی اور ایڈمنسٹن صاحب بہادر کو نذر کر سکیں۔

ذہنی و فکری طور پر درحقیقت غالب جس مقامِ ممتاز کے مستحق تھے وہ انھیں ان کی زندگی میں نہیں ملا۔ لیکن ۱۸۵۷ء کی دارو

گئے نے انھیں علمی طور [illegible] مقام تقدیت تک پہنچا دیا۔ [illegible] کی شخصیت کا پیوند کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اور یہی وہ تاثر ہے [illegible] ہوں میں [illegible] اخذ شدہ [illegible] کیفیت قرار دیا ہے۔ ۱۸۵۷ء نے صرف حکومت نہیں بدلی تھی کہ حکمراں مسلمان نہ ہو کے انگریز ہو گئے! بلکہ حقیقتاً ان صدیوں پر محیط ایک بہت عظیم الشان پرشکوہ اور باوقار تہذیب کو ختم کیا تھا اور یہ تہذیب مسلمانوں کی قومی زندگی نے [illegible] کو تہذیبی، تمدنی، علمی ثقافتی اور تعلیمی ورثہ کی ایک ایسی تاریخ دی تھی جو اقوامِ عالم کی تاریخ میں [illegible] نقش و نگار نقوش رکھتی ہے۔

[illegible] ایک مسلمان کا غم ہے۔ اور ہر نئے "صاحب بہادر" کی آمد پر ایک نیا قصیدہ لکھنے کا عمل جابر وقت کے مواخذہ کا خوف ہے اسی لیے تو اپنے آپ کو بھاٹ لکھا ہے۔ گنجینہ معانی کا طلسم لکھنے والا شخص [illegible] کسی ایسے قصیدے لکھنے پر مجبور ہو جائے حواس کے باطن کی آواز ہو تو اسے بھٹی کرنے میں عافیت ملتی ہے۔

[illegible] مشکل نہیں ۱۸۵۷ء نے کیسی کیسی اور کتنی عمارتیں ڈھائی تھیں! عظمت کردار کی عمارتیں، [illegible] عظمت کی عمارتیں وسعت خواب کی عمارتیں، تہذیب و تمدن کے بلند مینار کی عمارتیں اور انسانی بطون کی تہ دار [illegible]!

حواشی

(۱) غالب [illegible] خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر ص ۶۵۱

(۲) ایضاً ص ۳۶۲

(۳) ایضاً ص ۱۹

(۴) [illegible] (ڈاکٹر) اردو خطوط [illegible] نقوش مکاتیب نمبر لاہور نومبر ۱۹۵۷ء ص ۴۳

(۵) [illegible] غالب مرتبہ غلام رسول مہر ۱۹۸۰ء لاہور تعارف، غلام رسول مہر ص ۱۵

(۶) [illegible] غالب غلام رسول مہر لاہور ص ۱۳۶

(۷) ایضاً ص ۱۲۵

(۸) ایضاً ص ۱۳۴

(۹) غالب خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر ص ۴۴

(۱۰) ایضاً ص ۲۲۱

(۱۱) غالب خطوط غالب ص ۱۸۵

(۱۲) غالب خطوط غالب

(۱۳) غالب خطوط غالب

(۱۴) ایضاً

(۱۵) ایضاً

(۱۶) غالب مکاتیب مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی، رامپور، ۱۹۳۷ء ص ۷۲

رباعیات غالب کے منظوم تراجم

صبا اکبر آبادی

جاسیت مرا زغم شمارے دروے
اندیشہ فشاندہ خارزارے دروے
ہر پارۂ دل کہ ریزواز دیدہ من
پابندِ نفس ریزہ چو خارے دروے

[illegible] بہت [illegible] جس میں
[illegible] پھیلا ہوا صحرا [illegible]
[illegible] ٹپکتا ہے جو دل [illegible]
[illegible]

آں راکہ عطیّہ ازل در نظر است
ہر چند بلا بیش طرب بیش تر است
فرق است میانِ من و صدمن دزکفر
بخشش دگر و مُزد عبادت دگراست

[illegible] کے لیے [illegible] رحمت [illegible]
[illegible]
کافر سہی لیکن یہ عقیدہ ہے مرا
بخشش ہے الگ اجرِ عبادت ہے الگ

درخوردِ تبر بُود درختے کہ مراست
خائیدۂ آتش است رختے کہ مراست
بے آنکہ توبد نام شوی می کش دم
ناساز تراز خوئے تو بختے کہ مراست

ہر ایک شجر مِرا تبر کے قابل
ملبوس ہے شعلہ و شرر کے قابل
بدنامی سے پہلے تیری مرجاؤں گا
تقدیر نہیں تیری نظر کے قابل

غالب بہ گہرز دودۂ زاد شم
زاں روبہ صفائے دمِ تیغست دم
چوں رفت سپہدی زدم چنگ بہ شعر
شد تیر شکستۂ نیا کان قلم

غالب ہے نسب نامہ مِرا تیغ دو دم
تلوار کی دھار ہے نفس سے مِرے کم
اب شاعری ہے سپہ گری کے بدلے
ٹوٹے ہوئے نیزوں کو بنایا ہے قلم

[illegible]
[illegible] مارا
[illegible]
[illegible]

دُنیا میں ہمیں نشاط تو دے یارب
شمع گل و مل کو تیز لو دے یارب
ہم اہل توکّل کی طلب اتنی ہے
تھوڑا سا نمک تھوڑے سے جَو دے یارب

[illegible] نشاط
[illegible] نشاط
شراب [illegible] بارد غالب
[illegible] نشاط

کیا بزم طرب سے غم نصیبوں کو خوشی
شوخی سے ہو کیا ستم رسیدوں کو خوشی
غالب جو گھٹا شراب بھی برسائے
کیا جام و سبو توڑ کے رندوں کو خوشی

دی [illegible]ت به بزم باده ام خواند نیاز
[illegible] وقت مهر بگر داند نیاز
چشم من و عارضش که افروخت به مے
[illegible]ت من و دامنش که افشاند نیاز

کل یار نے بزم مے میں بلوایا تھا
رُخ اپنی عنایات کا دکھلایا تھا
رُخساروں پہ پھولی ہوئی تھی مے کی شفق
دامن کو مرے ہاتھ سے جھٹکایا تھا

هر چندکه زشت و ناسزائیم همه
در عهدهٔ رحمت خدائیم همه
در جلوه دهد چنانکه مائیم همه
شائسته لعنت و بوریائیم همه

حالانکہ خراب و ناسزا ہیں ہم سب
ہاں طالبِ رحمت خدا ہیں ہم سب
تُو جلوہ نما ہو، ہم ہیں جیسے بھی ہیں
شائستۂ خاک و بوریا ہیں ہم سب

تضمینِ غالب

صبا اکبر آبادی

پھر تمنا کی راز داری ہے
پھر امیدوں کی شعلہ باری ہے
پھر نیا حال ہم پہ طاری ہے
پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے
سینہ جویائے زخم کاری ہے

پھر ہوا ہے گرہ کشا ناخن
پھر حنائی سا ہو گیا ناخن
پھر کلیجے سے جا ملا ناخن
پھر جگر کھودنے لگا ناخن
آمد فصل لالہ کاری ہے

روحِ امید جانِ نغمہ و ساز
چشمِ مشتاق دید کا ہمراز
باعثِ التہابِ قلبِ گداز
قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز
پھر وہی پردۂ عماری ہے

ہوش مشغولِ جوشِ سودائی
صبر عنوانِ ناشکیبائی
عشق سودائے بے سرو پائی
چشم دلالِ جنسِ رُسوائی
دل خریدارِ ذوقِ خواری ہے

وہی پہلی سی ہر ادا آئی

وہی ارمانِ حسن برنائی
وہی انداز ناشکیبائی
وہی صد رنگ نالہ فرسائی
وہی صد گونہ اشکباری ہے

تیری رفتارِ ناز کی خاطر
حسرت پائمال ہے حاضر
پھر خراماں ہو فتنۂ ظاہر
دل ہوا ہے خرامِ ناز سے پھر
محشرستانِ بیقراری ہے

پھر اسی راہ سے گزرتے ہیں
پھر سے سینے میں داغ ابھرتے ہیں
اشک آنکھوں میں روز بھرتے ہیں
پھر اسی بیوفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

دل میں پھر تیر غم اترتا ہے
غم جاں حد سے پھر گزرتا ہے
زیست کا سلسلہ بکھرتا ہے
جلوہ پھر عرض ناز کرتا ہے
روزِ بازار جانسپاری ہے

پھر زمانے میں ہے حکومتِ ناز
دل کا قانون ہے شریعتِ ناز
ناز ساماں ہے پھر نظارتِ ناز
پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز
گرم بازار فوجداری ہے

پھر زبردست ہو رہے ہیں زیر
پھر پڑا ہے ہر اک خیال میں پھیر
ہے ابھی روشنی میں کافی دیر
ہو رہا ہے جہاں میں اندھیر
زلف کی پھر سر رشتہ داری ہے

دعویٰ خونِ دل ہے پیش جمال
اشک رنگین کی دی گئی ہے مثال
پھر کیا جارہا ہے عرضِ حال
پھر دیا پارۂ جگر نے سوال
ایک فریاد آہ وزاری ہے

پھر کوئی پوچھتا ہے غم کا سبب
پھر ہے تاکید احتیاطِ ادب
دل کا خوں آنکھ میں بھرا ہے اب
پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب
اشکباری کا حکم جاری ہے

غم کی عرضی کا فیصلہ ہوگا
پیش ہونے کو ہے ثبوت نیا
دیکھیے اب ملے گی کس کو سزا
دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا
آج پھر اس کی روبکاری ہے

خون میں تر ہے آستیں غالب
خاک آلود ہے جبیں غالب
بس صبا کرچکا یقین غالب
بے خودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

انجمن ترقی اردو کی چند مطبوعات

کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
فرہنگ اصطلاحات بینکاری	محمد احمد سبزواری	۲۰۰/-
داستان سرالعیان	ڈاکٹر احمد سجاد	۱۹۰/-
مضامین غلام ربانی	غلام ربانی	۱۰۰/-
اردو قومی یکجہتی اور پاکستان	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	۹۰/-
ایران بعہد ساسانیان	آرتھر کرسٹن سین ترجمہ ڈاکٹر محمد اقبال	۲۰۰/-
الف لیلہ ولیلہ (سات جلدیں)	ترجمہ: ڈاکٹر نور الحسن منصور	۹۰/-
تاریخ الحکما	جمال الدین ابوالحسن علی بن یوسف القفطی ترجمہ: ڈاکٹر غلام جیلانی برق	۱۲۵/-
بابائے اردو	ڈاکٹر اسلم فرخی	۱۵/-
روسی ادب (دو جلدیں)	پروفیسر محمد مجیب	۴۰/-
قہر عشق	ولیم شیکسپیئر احسان الحق حقی	۲۰/-
جوامع الحکایات ولوامع الروایات (دو جلدیں)	ترجمہ: اختر شیرانی	/-
نوادر الالفاظ	سراج الدین علی خان آرزو	۰۰/-
محمد تقی میر	ڈاکٹر جمیل جالبی	۱۰/-
تنقید عقل محض	امانوئل کانٹ ترجمہ: ڈاکٹر عابد حسین	۰/-
سعادت یار خان رنگین	ڈاکٹر صابر علی خان	۰/-
حرفے چند (حصہ اول)	جمیل الدین عالی	۰/-
حرفے چند (حصہ دوم)	جمیل الدین عالی	۵/-
غالب کے خطوط (حصہ اول)	ڈاکٹر خلیق انجم	۰/-
غالب کے خطوط (حصہ دوم)	ڈاکٹر خلیق انجم	۰/-
غالب کے خطوط (حصہ سوم)	ڈاکٹر خلیق انجم	/-
غالب کے خطوط (حصہ چہارم)	ڈاکٹر خلیق انجم	[illegible]
تنقید اور جدید اردو تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	[illegible]
غزل نما	مرتبہ: ادا جعفری	[illegible]
غالب آشفتہ نوا	ڈاکٹر آفتاب احمد خان	[illegible]
ابن انشا	ڈاکٹر ریاض احمد ریاض	[illegible]
جدید اردو شاعری (حصہ اول)	عزیز حامد مدنی	[illegible]
جدید اردو شاعری (حصہ دوم)	عزیز حامد مدنی	[illegible]
جاپانی کہانیاں	شفیع عقیل	[illegible]

انجمن ترقی اردو پاکستان
ڈی-۱۵۹ بلاک (۷) گلشن اقبال کراچی-۷۵۳۰۰

قومی زبان (۶۱) فروری ۱۹۹۴ء

خواتین معاشرہ نیاز کی نظر میں

پروفیسر ریاض صدیقی

اردو کی علمی و فکری اور ادبی تاریخ نے جیسی اور جو کچھ بھی ہے نثر نویسی کی قلمرو میں کتنی ہی قد آور شخصیات پیدا کی ہیں۔ ان میں سے بعض صرف اس لیے بلند و محترم ہیں کہ ارباب اختیار ادبی مورخوں اور نصاب سازوں نے انھیں اپنے اندازِ نظر مخصوص علاقائی و سیاسی ماحول اور عزائم کے حق میں مفید پایا، حالی، مولانا محمد علی جوہر، یگانہ چنگیزی، حسرت موہانی اور نیاز فتح پوری وغیرہ اتنے منافع بخش نہیں تھے اس لیے ارباب اختیار نے ان کی طرف سے منہ پھیر لیا اور مورخوں و نصاب سازوں نے ان کو اپنی حدود سے باہر رکھا یہی وجہ ہے کہ یہ قدر آور قلم کار صحافی اور شاعر ہمارے اجتماعی مزاج میں رچ بس نہ سکے اور ان کی جڑیں معاصر شعور کے اندر پھیل نہیں سکیں۔ اس صورت حال کا منطقی نتیجہ یہ ہوا کہ جو ہونا تھا ایک عہد ختم ہونے کے بعد جو نسلیں منظر پر آئیں تو ان کے ذہنوں میں شکوک و تعصبات کی مکڑی نے جالا تن رکھا تھا دورِ حاضر میں ایسی صورت حال کا سمجھنا یقیناً محال ہوگا تاہم بنیادی حقائق کو سامنے رکھیں تو بات آسانی سے سمجھ میں آجائے گی۔ اوّل تو ہمارا معاشرہ ناخواندگی پسماندگی اور بے شعوری کے معاملے میں کم سے کم کی انتہائی سطح پر ہے چنانچہ افکار اور نظریات ہوں یا قد آور لکھنے والے پڑھے لکھے طبقے اور طالب علموں تک ان کی پہنچ کا ذریعہ سرکاری ذرائع ابلاغ۔ تعلیمی ادارے نصابات ہوتے ہیں۔ چونکہ ان ذریعوں نے بعض قد آور ہستیوں کو نظر انداز ہی نہیں کیا بلکہ ان کے نقطہ ہائے نظر کی غلط تعبیر و تشریح کر کے شکوک و تعصبات کی فضا پیدا کی اس لیے یہی تاثر پڑھے لکھے طبقے اور طالب علموں نے بھی قبول کیا۔ دوسری طرف آزادیِ اظہار کی روایت کو پابند کر کے ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا ہے کہ اگر کوئی حق کو اصل حقیقت کا چہرہ دکھائے اور اس کی صحت و سند پر اصرار کرے تو اسے نہ صرف خود کو بلکہ اپنے افراد خانہ کو بچائے رکھنا مشکل ہو جائے۔ نیاز فتح پوری شکوک و تعصبات کے اسی تیر سے گھائل ہوئے۔ علمی و فکری تاریخ کا غیر جانبداری دیانتداری، اور سنجیدگی سے مطالعہ کرنے والے کہیں گے کہ اگر اس پوری تاریخ کو ایک طرف اور ان کو دوسری طرف رکھیں تو نیاز کا پلہ بھاری ہوگا۔ وہ اپنے عہد کی انتہائی فعال اور پھیلی ہوئی شخصیت تھے۔ بیسویں صدی کی غریب نواز آیڈیالوجی اس کے پیرو کار ملکوں اور مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کو تجزیاتی انداز میں موضوع نہ بنانے اور مومن کو بے جا داد و تحسین کے باوجود ان کی اوّل الذکر حیثیت مسلّم ہے ان کے معاصرین ہوں یا بعد میں آنے والی قد آور شخصیات کسی کو ان کے مدِ مقابل نہیں لایا جاسکتا ہے۔ ان کا ذہن انسائیکلو پیڈیائی تھا۔ آج کے اہلِ نظر اور طالب علم یقیناً حیرت کریں گے کہ ایسی صحت اور اتنی توجہ کے ساتھ کس طرح دنیا نے قدیم و جدید کے علوم و فنون کا انھوں نے احاطہ کیا حتیٰ کہ جنس (SEX) اور ہاتھوں کی لکیر جیسے موضوعات بھی ان

کی دسترس میں آئے اور ان پر بھی انھوں نے عالمانہ شان سے قلم اٹھایا۔ عربی فارسی اور انگریزی زبانوں سے وہ خوب واقف تھے۔ قرآن و حدیث اور فقہ پر انھیں عبور تھا اور مذاہب عالم کا انھوں نے تقابلی مطالعہ کیا تھا دینی اداروں سے فارغ التحصیل علما اور مجتہدوں کے لیے وہ چیلنج تھے۔ دینی فکر کو عقلی اور سائنسی بنیادوں پر قائم کرنے والوں میں سر سید کے بعد صرف دو ہی معتبر و مستند نام ملتے ہیں یعنی اقبال اور نیاز فتح پوری۔ نیاز نے شروع سے آزادی فکر و نظر "خرد افروزی و روشن خیالی" سیکولرزم اور جمہوریت نوازی کو اپنا مسلک بنا لیا تھا اور آخر دم تک اس پر قائم رہے کم ہی لوگوں کو یاد ہوگا کہ نیاز نے خواتین کی آزادی و حقوق کے موضوع پر ان دنوں ایک جامع اور مستند کتاب لکھی تھی۔ جن دنوں برصغیر میں ایسے موضوع کا کوئی نام لیوا تک نہ تھا کانگریس اور مسلم لیگ کی سیاست میں بھی اس قسم کے موضوعات شامل نہیں تھے۔ یہ ۱۹۱۷ء کا سال تھا اور اس زمانے میں خواتین پرانی روایات اور سخت گیر توہمات اور پابندیوں کی زنجیر میں جکڑی ہوئی تھیں اور سماج اس اخلاقی اور خاندانی سسٹم کو پسند کرتا تھا۔ اس دور میں خواتین صحیح معنوں میں مردوں کے پاؤں کی جوتی تھیں یعنی مکمل غلام تعلیم نسواں کا نام لینا حرام تھا۔ سر سید بھی تعلیم نسواں کے مخالف تھے اور اقبال جیسے حقیقت پسند و ترقی یافتہ دور کے واقف کار نے بھی تعلیم نسواں کی مخالفت کی۔ خواتین کی تعلیم صرف اولاد اور گھریلو امور کی نگہداشت، قدیم اخلاقیات، کھانے پکانے وسینے کاڑھنے اور شوہروں کی تابعداری تک محدود تھی۔ یورپ اور امریکہ کی خواتین اس زمانے میں اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کے میدان میں سرگرم عمل ہوئی تھیں۔ فیمینسٹ (FEMINIST) تحریک کے خدوخال واضح ہونا شروع ہوگئے تھے۔ فرانس و انگلستان میں خواتین کی تنظیمیں فعال تھیں۔ امریکہ میں تو ۱۸۴۸ء کے دوران "ومن رائٹس کونشن" (WOMENRIGHTS CONVENTION) منعقد ہوا تھا۔ اس دور کے ہندوستان میں پڑھے لکھوں کو تو چھوڑیے جید علما اور اہلِ نظر بھی خواتین تحریک سے یکسر لاعلم تھے حیرت ہے کہ نیاز نے اس زمانے میں مغربی دنیا سے متعلق ایسی نادر معلومات مع سند حاصل کرلی تھیں اور یہ لکھا بھی تھا کہ مغرب علمی تحقیق و تفتیش میں اتنا آگے نکل گیا ہے کہ یہ مشغلہ ایک ناقابل علاج مرض بن گیا ہے۔ اردو زبان اس لحاظ سے کم مایہ ہے بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں علوم وادبیات پر جو کتابیں اور رپورٹیں مغرب میں دستیاب تھیں ان میں اکثر کا مطالعہ وہ کر چکے تھے۔

کیسا حیرت انگیز واقعہ ہے کہ عورت کے مسئلے میں مغرب سے مشرق تک سب ایک رائے ہیں۔ جس طرح مغرب میں اس کو نشانہ ظلم بنایا گیا اسی طرح مشرق میں وہ غریب ہدفِ جور رہی۔ ہر چند یورپ ان خطرات کو جو عورتوں کی قیامت خیز بیداری سے پیدا ہوسکتے ہیں محسوس کر رہا ہے اور وہ جنسِ لطیف کی ان جارحانہ بے باکیوں کو نظر پسندیدگی سے نہیں دیکھتا لیکن اسے اس کا کوئی علاج بھی بظاہر نظر نہیں آتا ہے۔

ایسی بے باک آرا ان کی کتاب "گہوارۂ تمدن" مطبوعہ مطبوعات سلسلہ بلقیسیہ بھوپال ۱۹۱۷ء میں موجود ہیں۔ پچھتر سال پہلے وہ لکھتے ہیں کہ عورت تو خود ایک تاریخ ہے اور جس سلیقے و تسلسل سے وہ واقعات کو یاد رکھتی ہے اس کا مقابلہ مرد نہیں کرسکتے ہیں۔ پچھتر سال گزرنے کے بعد یہ نایاب کتاب پڑھیے تو حیرت ہوتی ہے۔ کیونکہ اس عرصے میں زمین و آسمان بدل گئے۔ دنیائیں ایک دوسرے سے قریب آگئیں۔ سات سمندر پار جو کچھ جس لمحے میں ہو رہا ہے ہم اپنی آنکھوں کے سامنے اس منظر کو دیکھ رہے ہیں۔ کتابیں "رسائل" رپورٹیں اور اطلاعات بر وقت ہماری دسترس میں ہیں۔ نیاز کے دور میں یہ انقلابات تصور میں بھی نہیں آسکتے تھے۔ آج ۱۹۱۷ء کے مقابلے میں خواتین ظاہری طور پر آزاد و بے باک نظر آتی ہیں دفتروں میں مردوں کے ساتھ کام کرتی ہیں۔ پردہ مردوں کی عقل پر پڑ چکا ہے۔ مغرب زدگی اور فیشن ان کا مسلک ہے مگر ان کے مسائل۔ حقوق اور اصل صورتِ

حالات جیسے موضوع پر کوئی ایک جامع علمی تصنیف اردو میں شاذ ہی ملے "گہوارۂ تمدن" ہی اس موضوع پر پہلی اور آخری کتاب ہے اور اس وقت بھی اتنی ہی تازہ ہے جتنی کہ ۱۹۱۷ء میں تھی۔ گویا اردو میں معاصر علوم پر کتابوں کا آج بھی اتنا ہی فقدان ہے جتنا کہ پچھتر سال پہلے تھا۔ اس کو پڑھنے کے بعد پوری ذمہ داری کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ہماری ترقی یافتہ تعلیم کے زیور سے مالامال اور پیروی مغربی کا شوق رکھنے والی خواتین کا معاشرہ آزادی و خود مختاری اور بنیادی انسانی حقوق سے اتنا ہی محروم ہے جتنا کہ بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں تھا اس کی ڈور آج بھی مرد کے ہاتھ میں ہے ترقی یافتہ مغربی ملکوں کی فیمینسٹ تحریک اپنی کھوئی ہوئی نسوانیت کو تلاش کرنے میں منہمک ہے اور مردوں کو تفریح کے لیے ان کی آلہ کار بننے پر راضی نہیں ہے۔ نیاز نے پچھتر سال پہلے اس صورتِ حال کے آثار کو محسوس کرلیا تھا۔

"ہندوستان کی عورت بھی اس منزل کی طرف حرکت کرتی ہوئی نظر آرہی ہے جہاں تک پہنچنے کے بعد یورپ کی عورت پلٹ کر اپنی کھوئی ہوئی نسائیت کو ڈھونڈھ نہیں سکی۔"

یہ رائے ۱۹۱۷ء میں صحیح ہوسکتی تھی مگر اب نہیں رہی کیونکہ ۱۹۱۷ کے بعد جو سوشلسٹ معاشرے ابھرے انھوں نے عورت کے اصل مقام کو پالیا دنیا کے سامنے ایک آزاد و خود مختار باوقار تعلیم یافتہ اور جدید عورت کا ماڈل پیش کر کے ثابت کر دیا کہ خواتین کو اخلاقی طور پر تباہ کرنے کا کردار بین الاقوامی سرمایہ دارانہ نظام نے ادا کیا ہے۔ اس نے آزادی اور مساوات کا نام لے کر فحاشی و فیشن زدگی کو رواج دیا بقول فیض:

حریفاں شمعِ محفل کو سرِ بازار لے آئے

"گہوارۂ تمدن" کو مصنف نے روایت کی ابتدا کی پہلی اینٹ قرار دیا ہے۔ کتاب کے مقدمے میں انھوں نے لکھا ہے کہ کتاب کا مقصد کوئی عالمانہ تھیسس نہیں بلکہ صرف ایک آئینہ پیش کرنا ہے جو مزید تحقیق و تفتیش کا راستہ کھول دے۔ یہ راستہ تو خیر نہیں کھلا بلکہ مزید بند ہوگیا اور اب اگر کتابیات کی جامع فہرستوں کا مطالعہ کیجیے تو اس میں "گہوارہ تمدن" کا نام شاذ ہی ملے۔ یہی وہ مرد مسلط رجحان ہے جس کے خلاف فیمینیزم (FEMINISM) کی عالمگیر تحریک سرگرم عمل ہے اور مدعی ہے کہ مردوں نے تاریخ ادب اور شاعری بھی مرد نقطہ نظر ہی سے لکھی ہے اور خواتین کے مجموعی کارناموں کو نظرانداز کیا ہے۔ اردو میں "گہوارہ تمدن" ہی ایک ایسی کتاب ہے جو ہمیں خواتین کے مجموعی کارناموں کی پوری تاریخ کا منظر نامہ دکھاتی ہے۔ اس کا اندازہ تو موضوعات کی فہرست ہی سے ہوجاتا ہے۔ (۱) اسباب وغذا کی فراہمی میں خواتین کے کارناموں کی تاریخ (۲) کپڑا بننے کی صنعت میں خواتین کے کارناموں کی تاریخ (۳) چرم سازی میں خواتین کے کارناموں کی تاریخ (۴) ظروف سازی میں خواتین کے کارناموں کی تاریخ (۵) خدمات بار برداری میں عورت کے کارناموں کی تاریخ (۶) فنون مختلفہ میں عورت کے کارناموں کی تاریخ (۷) فنون لطیفہ میں عورت کے کارناموں کی تاریخ (۸) زبان کی تشکیل و ترقی میں عورت کے کارناموں کی تاریخ (۹) عورت اور معاشرت (۱۰) عورت اور مذہب بُعد (۱۱) نتیجہ بحث۔ یہ بیانات سرسری نہیں ہیں بلکہ اس وقت تک قدیم وجدید زمانوں کی تاریخ، عمرانیات، علم الانسان، مخافت علم الاصنام، آثار قدیمہ، فنون لطیفہ اور شعر و ادب کا جس قدر بھی تحقیقی مواد کتابیں اور رپورٹیں موجود تھیں ان میں اکثر کا مطالعہ مصنف نے کیا تھا۔ چند جن کے حوالے "گہوارہ تمدن" میں دیے گئے یہ ہیں۔

MASON :- WOMEN's SHARE IN PRIMITIVE CULTURE

F.V.COVILLE; American Anthropologist. Washington 1892.

Trwels in South Africa - New York -1858.

BAN CROFT . Native Races. New York - 1874.

H.T. HARRIS. Carpet weaving .

THOMPSON ; The Land and the Books 1880.

G. BOSE . Practical Book of Oriental Rugs.

W.S. MURPHY Textile Industries.

CUSHING : Fouth Annual Report.

journal of Anthropological Institute London.

LUCIEN CARR:- Geological Survey.

CARL ENGEL ; Music of the most ancient nations.

ان حوالوں کے ہوتے ہوئے یہ سمجھنا کہ "گہوارۂ تمدن" سرسری قسم کی کوئی معلوماتی کتاب ہے صحیح نہیں ہوگا بلکہ اس دور میں عموماً قلمکار کتابیات کی فہرست شامل کرنے کے گر سے بھی واقف نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نیاز نے ۱۹۱۷ء میں اہلِ علم کو بتایا کہ کرۂ ارض کی کل آبادی میں آدمی سے زیادہ عورتوں کی تعداد ہے۔ یہ بات آج بھی صحیح ہے اور اب یہ لکھا گیا ہے کہ پاکستان کی کل آبادی کی نصف سے زیادہ یعنی اکیاون فی صد عورتوں پر مشتمل ہے۔

علمی حوالے سے یہ کتاب جامع دستاویز بھی ہے جس میں مردوں کے درمیان مساوات۔ خواتین کی آزادی اور ان کے بنیادی حقوق کے بارے میں انداز نظر ہمدردانہ ہے جو کہ ۱۹۱۷ء کے ہندوستانی سماج میں بغاوت کے مترادف تھا ہمارے یہاں ۱۹۹۴ء میں بھی بعض ایسے علاقے ملیں گے جہاں اس قسم کے اظہار کو ناپسند کیا جاتا ہے۔ مصنف کی بعض آرا اور موقفین کی وسیع تر عالمگیر فیمینسٹ تحریک سے قریب تر ہیں۔

عورت، عورت ہونے کے رشتے سے ساری دنیا میں ایک ہے۔ وہ عورت جو ساری دنیا کی ماں تمام تہذیب و ارتقا کی ماخذ اور جملہ ترقی و شائستگی کی اصلِ اصول ہے آج کے مہذب مردوں نے اس کے حقوق دبا رکھے ہیں اگر عورت مرد کے تمام کام انجام نہیں دے سکتی تو مرد بھی عورت کے بہت سے کام انجام نہیں دے سکتے ہیں۔ عورت نے ہمیشہ مرد کے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹایا ہے اور یہ ریت زمانۂ قدیم سے چلی آرہی ہے۔ عورت نے صدیوں وہ کام اپنے ضعیف ہاتھوں سے کیے ہیں جو آج مرد مشینوں کے ذریعے کررہے ہیں۔ آج بھی وہ صنعتوں میں مرد کی معاون ہے اور اس وقت بھی ایک سو چھتیس ایسے پیشے ہیں جن میں عورت کا کردار بنیادی ہے۔

نیاز نے کتاب کے ابواب کی فہرست عورت کے پیشہ ورانہ کارناموں کے حوالے سے مرتب کی ہے اور تاریخی تناظر میں سند و حوالوں کی مدد سے بتایا ہے کہ جتنے بھی مشاغل و مظاہر حیات ہیں ان میں اکثر کی ابتداء و ترقی کا سرچشمہ عورت رہی ہے۔ اس موضوع کو انھوں نے قدیم سے قدیم یونانی، مصری، بابلی، ہندی اور یورپی تہذیبوں کی تاریخ کے حوالوں سے مکمل کیا ہے۔ ان مباحث میں انھوں نے اپنے عہد کے علم عمرانیات اور علم الانسان سے بھی استفادہ کیا ہے جس کی ابتدا ان دنوں ہندوستان میں

نہیں ہوئی تھی۔

علمائے حق نے عموماً اس بات پر زور دیا کہ عورت طبعاً امن پسند اور پریم وادی ہوتی ہے۔ نیاز نے بھی اس موقف ہی کا اظہار کیا ہے اور لکھا ہے کہ عورت جنگی ساز و سامان کی تیاری میں بہت کم ہی حصہ لیتی ہے سوائے اس کے کہ کارخانوں میں ابتدائی قسم کے کوئی جزوی کام کرتی ہو یا ریڈ کراس کے تحت زخمیوں کی دیکھ بھال کرتی ہو۔ یہ بات آج بھی ایک حقیقت ہے۔

نیاز نے ان مظالم کی، جو "مرد مسلط معاشرہ" عورتوں پر ڈھاتا رہا ہے بڑی دردانگیز تاریخ کا بھی احاطہ کیا ہے۔ مثلاً روم میں راہبوں کے اشارے پر ہزاروں عورتوں کو گلیوں سڑکوں اور گھروں کے اندر ذبح کرنا۔ ۱۸۸۴ء میں پاپائے روم کے حکم سے ہزاروں عورتوں کو جادوگری کے الزام میں سولی دینا۔ انگلستان کی پارلیمان کا عورتوں اور ان کے معصوم بچوں کو سزائے موت دینا وغیرہ انھوں نے اس تفتیش و تحقیق کے بعد صحیح نتیجہ اخذ کیا کہ عورتوں پر مظالم کے معاملے میں ساری دنیا کے مردوں کا اندازِ نظر ایک جیسا ہے۔ ایسی کوئی قوم نہیں ہے جس نے عورت کو پامال نہ کیا ہو۔ دورِ جدید کی فیمینسٹ تحریک اور اس کے ادب نے اب یہ طلسم بھی توڑ دیا ہے کہ ترقی یافتہ و مہذب مغرب میں عورت آزاد ہے اور اسے تمام بنیادی حقوق حاصل ہیں بلکہ صورتِ حال اس کے برعکس ہے۔ مارچ اپریل ۱۹۶۹ء میں خواتین تنظیم کی طرف سے موٹیو (MOTIVE) نامی رسالے کا اجرا ہوا۔ اس کے خلاف امریکہ بھر کے پادریوں نے سخت احتجاج کیا اور کوئی چھاپنے والا ادارہ اس کا مسودہ لینے پر راضی نہیں ہوا۔ بورس میرنل پریس نے اس کی طباعت کا خطرہ مول لیا۔ خواتین تنظیموں نے اس رسالے کو پورے امریکہ میں گھر کے دروازوں پر جا کر تقسیم کیا۔ رسالے کے سرورق پر جلی حروف میں درج تھا کہ "اقتدار ان خواتین کا جو بہر حال انسانوں کی آبادی میں نصف ہیں" خواتین کا اجتماعی ترانہ جو ولس برادرز (WILLIS BROTHERS) کا گیت کہا جاتا ہے اسی دور میں مقبول ہوا۔

MY MISTAKES ARE NO MORE WORSE

THAN YOURS

"JUST BECAUSE I AM A WOMAN

"گہوارۂ تمدن" کا مصنف بھی عورت کو بقائے حیات کا سرچشمہ۔ عالم انسان کی ماں۔ تمام تہذیبوں کے ارتقا کی ماخذ اور ترقی و شائستگی کی اصل اصول قرار دیتا ہے۔

دورِ تازہ کے عملی تناظر میں نیاز کی کتاب "گہوارۂ تمدن" جدید علوم و ادبیات کی صف میں سب سے الگ روشنی و رہنمائی کا ذریعہ محسوس ہوتی ہے۔ ہمارے معاشرے کے لیے جو ترقی و تمدن کے اس مثالی عہد میں زوال کی آخری حد پر آ گیا ہے اور اب گلنے سڑنے کے عمل سے گزر رہا ہے اپنی قدامت کے باوجود تر و تازہ ہے۔ اس معاشرے کی بدقسمتی تو یہ بھی ہے کہ اس کے علوم ادبیات اور شاعری بھی اسے زندہ رہنے زندگی کو مثبت خطوط پر استوار کرنے اور جہد و عمل کے ذریعے اپنی قسمت کو بدلنے کا شعور دیتے ہیں۔ اگر کسی کونے سے روشنی کا کوئی دھارا پھوٹتا ہے تو اسے غداری بغاوت مذہب دشمنی اور نہ جانے کیسے کیسے الزامات سہنا پڑتے ہیں کہ وہ تاریکی کی چادر میں غائب ہو جاتی ہے اور اس قسم کے اہلِ نظر کو متنازعہ کہا جانے لگتا ہے جیسے کہ نیاز ہیں۔ وہ بھی علم و ادب اور فن کی ایسی روشنی ہیں جو سیاہی کی قبر میں گر گئی ہے:

شب کی لحد میں صبح کی دستار گر گئی

ہمارے روشن خیال۔ خرد افروز جمہوریت نواز اہل نظر کی اقلیت (۱) جو نیاز ہی کے مشن کو لے کر آگے بڑھی ہے شب کی لحد۔

ان دستاویز کو باہم لا کر علوم و ادبیات کے مستند منہاج تک لائے گی؟

حواشی

(۱) پاکستان میں سب سے پہلے سید سبط حسن نے نیاز و دیگر کی روایت پر تنقید چڑھائی ان کے بعد ڈاکٹر خیال امروہوی، ڈاکٹر مبارک ۵ ڈاکٹر قاضی جاوید، سید علی عباس جلالپوری نے ... ڈاکٹر قاضی جاوید نے فلسفہ۔ فکریات اور برصغیر کی تاریخ و تہذیب اور ڈاکٹر مبارک ۔ برصغیر کی تاریخ اور ... تاریخ پر ... قدر سرمایہ مہیا کیا ہے۔

کتابیات

نیاز فتح پوری، گہوارۂ تمدن — مطبوعات سلسلہ بلقیسیہ بھوپال ۱۹۱۷ء — نقش تازہ — عورت اور فنون نمبر نگار پاکستان سالنامہ دسمبر ۱۹۹۲ء

سائمن ڈی بووار — دی سیکنڈ سیکس — ... نیو یارک ۱۹۴۹ء

کیٹ ملٹ — سیکسول پالیٹکس — ویراگو لندن ۱۹۷۰ء

ایلین شوالٹر — اے لٹریچر آف دیر اون — پرنسٹن یونیورسٹی پریس ۱۹۷۷ء

ایم بیروٹ — ویمنز آپریشن ٹوڈے — نیولیفٹ بکس لندن ۱۹۸۰ء

ازراہ کرم مضمون کی پشت پر نام اور مکمل پتہ تحریر کریں

جدید ایرانی ادب سے

دو ننھی مسکراتی آنکھیں

امین فقیری/شاہدہ عالم

عورت جانتی تھی کہ بچہ کس قسم کا ہے بعض لوگ کہتے تھے کہ ایک لوتھڑا سا ہے۔ بڑا سا چہرہ .... چوڑا چکلا سینہ ...... کمر سے گردن تک ہموار اور ایک جیسا...... موٹے موٹے پاؤں ...... نرم نرم پُر گوشت ہاتھ ...... جو بھی اسے دیکھتا، سمجھتا کہ سات آٹھ سال کا ہے۔ جب اسے پتہ چلتا کہ صرف چھ مہینے کا ہے تو یقین نہ کرتا۔

بہت جلد گاؤں میں مشہور ہوگیا کہ بچہ زندہ نہیں رہے گا۔

...... "ہائے ہائے بہن تیرا بچہ بچہ نہیں، پہاڑ ہے گوشت کا"

...... "ہم نے اب تک نہیں سنا کہ اس طرح کا کوئی بچہ زندہ رہا ہو ذرا دیکھو تو کیا ڈیل ڈول ہے اس کا!" ماں ان باتوں کو سنتی اور دل مسوس کر رہ جاتی۔ پہلے پہل تو رونے بیٹھ جاتی...... اتنا روتی کہ اس کی ہچکی بندھ جاتی۔ بچے کے چہرے پر آنسو بہاتی جو معصومیت سے ماں کی طرف دیکھ رہا ہوتا۔ شاید ماں کے آنسوؤں کی گرمی ہوتی جو بچہ اچانک رونے لگتا۔

بعد میں ماں نے اپنا دل یوں بہلالیا تھا کہ جہاں تک ہوسکے بچے کو لوگوں کے سامنے نہ لائے۔ وہ اپنے اندھیرے کمرے میں بیٹھ جاتی اور اس کے مرنے کا انتظار کرتی رہتی۔ وہ منتظر رہتی کہ بچہ اس کی مضطرب آنکھوں کے سامنے جان دے دے۔ لیکن جب بچے کا موٹا اور خوبصورت چہرہ ہنسی سے کھل اٹھتا تو اچانک ماں کی ساری تلخ سوچیں دم توڑ دیتیں اور امید کا نور اس کے چہرے پہ چھا جاتا۔ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہو؟ اچانک وہ اپنے بیٹے کی موت کی فکر سے باہر آتی اور کسی وحشی ببر شیر کی طرح گاؤں کے لوگوں پر حملہ کر دیتی۔ وہ بچے کو گود میں لیے چھت پر چلی جاتی۔ چھت پر سب سے اونچی جگہ جا کر، جہاں سے تمام لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں اور دیکھیں کہ کس طرح بچہ کو گود میں لیے ہوئے ہے، بچے کو پیار کرتی۔ بار بار اسے چومتی چاٹتی۔

لوگ یہ منظر دیکھ کر استہزائی ہنسی ہنستے ...... کوئی مناسب موقع دیکھ کر عورت کے حلق میں ٹپکانے کے لیے وہ اپنا زہر ذخیرہ کرلیتے۔ اس کے خاوند کا ذہن زہر خوردہ ہوچکا تھا وہ کوشش کرتا کہ ایک بار بھی اپنے چھوٹے بیٹے کی آنکھوں میں آنکھیں نہ ڈالے۔ شاید وہ اس بات سے ڈرتا تھا کہ کہیں اس کے دل کی بنجر زمین سے اس کی محبت کا چشمہ نہ ابل پڑے۔ اس نے خود اپنے کانوں سے مُلّا طہماسپ کو کہتے سنا تھا کہ خدا مراد کا بچہ لوگوں کے لیے مصیبت اور بدبختی کی سوغات لائے گا۔ جیسے بارش کا نہ ہونا، دریا کہ جس کا پانی گز بھر نیچے اتر گیا تھا۔ درختوں کی ان کھلی کلیاں کہ جن کی حسرت میں باغ جل رہا تھا۔ اس نے حسین داد کی بیوی

کا حوالہ بھی دیا کہ وہ کیسے زچگی کے دوران چل بسی نصیبہ کی کانے صحرا میں بیٹی اور پھر اٹھ نہ سکی۔

خدامراد نے تمام باتیں سنی تھیں۔ لوگ بھی اپ اوپر ہونے والا ہر ظلم و ستم خدامراد کو بتانے لگتے تھے:

...... "خانی کلیمی نے مجھے سمن بھجوایا ہے خدامراد! کیا کروں اگر اس نے مجھے اندر کروادیا تو پھر کیا ہوگا! ڈرتا ہوں کہ میری بیوی اور بچی، کریم کے بال بچے کی طرح شہروں شہروں ماری ماری پھریں گی پھر ٹرک ڈرائیوروں کے ساتھ دور دراز کے شہروں میں چلی جائیں گی اور پھر کسی کو ان کا نام و نشان نہیں ملے گا!"

... "ہم ڈرتے ہیں خدامراد! ہم سب مقروض ہیں۔ ہماری فصل اچھی نہیں ہوئی خدامراد! ہمارے ہاتھ خالی ہیں۔ ہمارے بچوں نے زمین سے پیٹھ موڑلی اور شہروں کو چلے گئے۔ جتنا پیسہ کماتے ہیں، بُری عورتوں پر لٹا دیتے ہیں، شراب پیتے ہیں خدامراد! انھیں اب چشمے کا پانی پیتے شرم آتی ہے، وہ نلکے کا پانی چاہتے ہیں۔ بجلی چاہتے ہیں ...... انھیں تنور کی روٹی نہیں چاہیے وہ سینما جاتے ہیں، وہ زمین کا دل نہیں چیرتے۔ انھوں نے زمین سے، اپنی ماں سے منہ موڑلیا، شہر انھیں نگل گیا!

"خدامراد بارش نہیں برستی۔ آسمان پر بادل آتے ہیں لیکن ہم پر رحم نہیں کھاتے! اپنے بچے کو سہراب یاغی کے پہاڑ پر لے جا کر چھوڑ دو!"

اسی لیے خدامراد گھر میں ہمیشہ بچے سے منہ موڑے بیٹھا رہتا۔ اسے جرأت نہ ہوتی کہ اس کے چہرے پر نظر ڈالے۔ ہاتھ کی انگلیوں کی تعداد سے زیادہ کبھی اس نے اس پر نظر نہ ڈالی تھی۔ اتفاقاً بچے نے اسی وقت اپنی مسکراتی ہوئی آنکھیں اس پر گاڑ دی تھیں خدامراد ان کی تاب نہیں لا سکا تھا! اپنے نصیب اور قسمت پر اس کا دل اتنا کڑھتا تھا کہ جس کی کوئی حد نہیں۔

سب سے اہم بات یہ تھی کہ بچے کی پیدائش کے ایک دن بعد گاؤں کے ایک اچھے آدمی کاظم کی بیوی زچگی کے دوران چل بسی تھی۔ وہ عورت جس کی خوبصورتی کا پورے گاؤں میں چرچا تھا۔ شادی سے پہلے اس کے ہزاروں امیدوار تھے۔ دو تین سخت لڑائیاں چھڑ گئیں کہ قریب تھا کہ وہ ایک بڑی جنگ کی صورت اختیار کر جاتیں اور گاؤں بھر کو قہر و غضب کی آگ میں جھونک دیتیں۔ یہاں تک کہ گاؤں کے کچھ معتبر لوگوں کو بروقت احساس ہوگیا اور انھوں نے بیچ بچاؤ کرادیا۔ لڑکی کے ماں باپ، اپنی بیٹی اس سے بیاہنا چاہتے تھے، جس نے سب سے پہلے رشتہ مانگا تھا۔ حالات بھی کچھ ایسے ہوگئے تھے کہ لڑائی کے بعد کوئی بھی رشتہ مانگنے کے لیے آگے نہ بڑھا۔ شاید سب ایک دوسرے سے ڈرتے تھے۔ کاظم لڑکی سے محبت بھی کرتا تھا، اس نے ہمت کی۔ کچھ بھی تو نہ ہوا۔ سب لوگوں نے اس کی شادی میں شرکت کی۔ ظاہر ہے کہ نئی نویلی دلہن کی موت پر کیا ہنگامہ برپا ہوا ہوگا۔

مُلاطہماسپ نے بہت جلد موقع سے فائدہ اٹھایا اور زچگی کے دوران دلہن کی موت کے واقعے کو بچے کی زندگی سے جوڑ دیا اس کے بعد بھی جس کسی پر کوئی مصیبت ٹوٹتی، وہ بچے ہی کو زبان کے تازیانے اور تہمت سے نوازتا۔

خدامراد سب سے الگ تھلگ رہنے لگا تھا۔ صحرا سے لوٹتا تو کسی سے بات کیے بغیر اپنے کمرے میں چلا جاتا۔ بچے کے پنگھوڑے کے پاس بیٹھ کر وہ پریشان نظروں سے اسے گھورنے لگتا اپنے چار سالہ بچے عبداللہ کو گود میں لیتا۔ اگرچہ دو بچوں آنکھیں اس کی طرف لگی رہتیں مگر وہ عبداللہ کو یوں سینے سے چمٹا لیتا جیسے اس کا یہی ایک بیٹا ہو!

سورج ڈوبنے کو تھا نمبردار، علی چراغ اور ریحان آپہنچے۔ عورت نے جلدی سے اپنے ہاتھ پاؤں سمیٹے کیونکہ یہ گاؤں کے معزز ترین لوگ تھے۔ ہر ایک کسی قبیلے یا برادری کا سردار تھا۔ خاص طور ریحان تو عورت کا چچا بھی تھا۔ خدامراد شرمندہ سا ہوگیا: "آپ نے پہلے اطلاع کیوں نہیں دی کم از کم ایک آدھ مرغا ہی ذبح کر لیتے!"

عورت بولی: "ہم تو یہاں اجنبی ہو گئے ہیں چھ ماہ ہونے کو آئے کسی نے ہماری خبر تک نہیں لی آخر ہم نے ایسا کون سا گناہ کیا ہے؟ کیوں کوئی ہمارے ہاں آتا جاتا نہیں۔"

نمبر دار کہنے لگا: "ہم اسی سلسلے میں یہاں آئے ہیں۔ ہمارا بھی دل تو لوگوں کے لیے کڑھتا ہے۔ آخر یہی زندگی ہے۔ لوگوں پر مصیبتیں آتی رہتی ہیں۔ انسان کو سوگ تو نہیں منانے لگ جانا چاہیے۔ ماشاءاللہ آپ لوگ جوان ہیں۔ ایک آدھ اور بچہ کوئی بڑی بات نہیں۔ خدا مراد درخت کو جڑ سے ہی اکھاڑ دے گا۔"

ریحان بولا: "نمبر دار صحیح کہہ رہا ہے میں تمھارا اچھا ہوں۔ تمھارا بُرا تو نہیں چاہوں گا۔ اب چھ ماہ ہو گئے ہیں کہ اس گاؤں پر آفت آئی ہوئی ہے۔ بارش یہاں سے روٹھ گئی ہے۔ جانور مسلسل مر رہے ہیں۔ سب کا نقصان ہو رہا ہے۔ کاظم کی بیوی زچگی کے دوران چل بسی۔ اب میں تمھیں اور کیا کیا بتاؤں۔ صفدر کے بیل کے متعلق جو کل مر گیا، سیف اللہ کی گندم کے متعلق جسے کیڑا لگ گیا ہے؟

چراغ بولا: "بس اب چھ ماہ ہو گئے ہیں، مُلّا طہماسپ جہاں سے کتاب کھولتا ہے، اس بچے کا منحوس چہرہ نظر آتا ہے جس نے اس گاؤں پر سایہ کیا ہوا ہے کیسے پھولوں کی پتیاں بکھیر رہا ہے۔ خدا کے بندوں کے علاوہ خدا بھی اس بات سے خوش نہیں ہوتا کہ ایک بچے کا وجود سبھی کو خاک و خون میں گھسیٹ دے۔ ہفتہ میں ایک دفعہ بجائے شادی کی رسومات کے سوگ منایا جاتا ہے۔ آخر بے زبان مویشیوں نے کیا گناہ کیا ہے؟"

عورت نے اپنے دھوئیں سے سیاہ ہو جانے والے کمرے پر نظر ڈالی۔ اور اس پنگھوڑے کو دیکھا جو دیوار کے کونے میں پڑا تھا۔ لڑکا ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا اور ایسی آوازیں نکال رہا تھا۔ جو ایک انتہائی سی خوشی کا پتہ دے رہی تھیں۔ وہ اتنا موٹا تازہ تھا کہ اس کی ہر حرکت کے ساتھ پنگھوڑا اوپر نیچے ہونے لگتا۔ سب کی مضطرب آنکھیں پنگھوڑے پر گڑی تھیں۔ جیسے پہلی دفعہ پنگھوڑے کو دیکھ رہے ہوں۔ جیسے پہلی دفعہ کسی چھوٹے بچے کی خوش کن کلکاریاں سن رہے ہوں رات نے کھڑکی کے پیچھے سے اپنے منحوس وجود کو کمرے پر مسلّط کر دیا۔ خدا مراد نے اٹھ کر گیس لیمپ جلا دیا۔ مدھم سی روشنی تاریکی سے بھی زیادہ پژمردہ تھی۔

خدا مراد بولا: "میں لوگوں کے نقصان پر خوش نہیں۔ یہاں سبھی میرے برادری والے اور رشتے دار ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ مویشی مریں، فصلیں برباد ہو جائیں، عورتیں زچگی کے دوران چل بسیں، میں یہ سب کچھ بالکل نہیں چاہتا!"

نمبر دار بولا: "اسی لیے تو لوگ کہتے ہیں کہ ایسا بچہ جس نے بہر حال مر ہی جانا ہے جتنا جلدی نابود ہو جائے اچھا ہے!"

عورت بچے کو گود میں لیے ہوئے تھی اور اپنے پی جانے والے غم و غصے کو خوفزدہ نظروں سے بچے کی شکل و صورت پر لٹا رہی تھی۔ بچہ ایک چھوٹے سے چراغ کی مانند تھا۔ جو اپنی روشنی کو تاریکیوں پہ نچھاور کر رہا تھا۔ نمبر دار اور دوسرے لوگ ٹھیک سے بچے پر نظر نہیں ڈال سکتے تھے۔ بہت سی باتیں ہوئیں۔ خدا مراد کے حقیر سے کمرے سے رخصت ہوتے وقت نمبر دار بولا: "میرا بھی دل کڑھتا ہے، ناراض نہ ہونا! یہاں کوئی ظالم نہیں ہے۔ مُلّا طہماسپ کہتا ہے اب برداشت کی حد ہو گئی ہے۔ گاؤں میں وبا پھوٹ پڑنے کا ڈر ہے۔ اُس وقت کوئی زندہ نہیں بچے گا:"

خدا مراد بولا: "میں سب کا بھلا چاہتا ہوں۔ جائیے آرام سے سو جائیے مُلّا طہماسپ سے بھی کہہ دیں کہ اب کسی نئی مصیبت کی فکر نہ کرے۔ میں دیکھتا ہوں کہ میرے بچے کے مرنے کے بعد کیا اس گاؤں سے بدبختی بھاگ جاتی ہے؟"

جب وہ کمرے میں لوٹا تو اس نے دیکھا کہ ہچکیوں کی شدت سے عورت کے کندھے کانپ رہے ہیں۔ وہ آہستہ سے اس:

کے پاس گیا۔ پتہ نہیں کیوں جب اس نے عورت کے بالوں پر ہاتھ پھیرا تو آنسوؤں نے اس کے جلتے ہوئے رخساروں کو بھگو دیا۔
چار سال کا بچہ پہلے وحشت زدہ ہو کر ماں باپ کو دیکھتا رہا پھر اس سے رہا نہ گیا اور وہ بھی رو پڑا۔

آدھی رات کو رات کے مارے ہوئے کمرے سے گریہ وزاری کے شعلے آسمان کی طرف اٹھ رہے تھے۔

ابھی سورج غروب ہونے میں دو گھنٹے باقی تھے کہ لوگ ایک ایک کر کے گھر کے آگے اکٹھے ہو گئے۔ خوفناک آندھی نے گاؤں کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ سب کے چہروں اور پلکوں پر گرد جمی ہوئی تھی۔ بچے غمناک انداز میں گرد سے اٹے ہوئے تھے۔ ہوا پتہ نہیں کس سمت سے چل رہی تھی۔ نہ شمالی ہوا تھی نہ جنوبی نہ مشرقی نہ مغربی۔ بیک وقت چاروں طرف سے چل رہی تھی۔ کہا گیا تھا کہ اس طرح چلیں گے کہ مغرب تک منزل مقصود پر پہنچ جائیں۔ ویسے آدھے گھنٹے سے زیادہ کا راستہ نہیں تھا۔ لوگ خود کو روک نہیں سکتے تھے۔ وہ گھر میں بیٹھے نہیں رہ سکتے تھے۔ اسی لیے وقت سے پہلے ہی باہر نکل پڑے۔ لگتا تھا کہ کسی میں صبر نہیں۔ ایک تلخ سی پریشانی سب کے چہروں پر موجزن تھی۔ خاص طور پر عورتوں نے پریشانی میں اپنے بچوں کو یوں سینے سے بھینچا ہوا تھا جیسے ان کی ہڈیوں کا چورا ہی بنا دیں گی۔

خدا امداد نے کمرے کا دروازہ بند کر رکھا تھا۔ کمرہ ہر گھڑی تاریک ہوا جاتا تھا۔ ایک ایسی قبر کی مانند جسے ایک بڑے سے پتھر کی مدد سے ڈھک دیا گیا ہو۔ عورت کے پاس اب کوئی آنسو نہیں بچا تھا وہ گونگی بہری ہو چکی تھی۔ صرف کبھی کبھی عجیب سی چمک اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں ابھرتی جو خدا امداد کے وجود کو آگ لگا دیتی لیکن لمحے بعد ہی اس کی نظروں کے شعلے سرد پڑ جاتے اور ایک وحشت ناک مایوسی اس کے وجود پر طاری ہو جاتی۔ اس کا دل چاہتا کہ کم سے کم بچہ آواز نہ نکالے اور پھر ان کا چار سالہ بچہ مسلسل سوال نہ کرے کہ کمرے کا دروازہ کیوں نہیں کھولتے۔ حیرتناک بات تو یہ تھی کہ وہ ماں باپ کے پاس سے ہل ہی نہیں رہا تھا۔ جب اس کا حوصلہ جواب دے جاتا تو وہ پنگھوڑے کے پاس جا کر اپنے بھائی کو طرح طرح کی شکلیں بنا کر ہنسانے کی کوشش کرنے لگتا۔

اب کمرہ غم و اندوہ کی شدت سے پھٹا پڑتا تھا۔ نمبردار نے دروازہ کھولا۔ لوگوں کے ہجوم نے صحن اور گلی کو گھیرے میں لے رکھا تھا عورت اور مرد ایک طرف ہو گئے ...... اتنا کہ لگا جیسے خود کو دیوار میں ہی گھسیڑے دیتے ہیں۔ ریحان کی بیوی فرخندہ بھی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے عورت سے چند جملے کہے فرخندہ کی باتوں کا ایک لفظ بھی عورت کے پلے نہ پڑا لیکن اُسے فرخندہ کے آنسو نظر آئے۔ گرد و غبار چھٹ گیا تھا لیکن آسمان ابھی تک گرد آلود تھا۔

جب ریحان کی بیوی بچے کو لیے دہلیز پر نمودار ہوئی تو لوگوں کے جوش میں شدت آ گئی۔ عورتیں رونے لگ گئیں۔ گریہ و زاری کی آواز نے آسمان کو مغموم کر دیا۔ آسمان کا رنگ عجیب سا ہو رہا تھا۔ پتہ نہیں کوئی باتیں کیوں نہیں کر رہا تھا۔ سب اپنی ساری باتیں کر چکے تھے!

اگرچہ عورتوں کے رونے کی آوازیں آسمان تک جا رہی تھیں مگر کوئی اس کام میں مزاحمت نہیں کر رہا تھا آخر کب تک وہ بدبختی جھیلتے رہیں۔ بارش برسانے والے بادل گاؤں کے آسمان سے کتنی دور تھے۔ ایک طویل عرصے سے بادل پہاڑ کی بلندی سے اس طرف آئے ہی نہیں تھے اور پیاسے کھیت دھوپ میں جان کنی کے عذاب سے دوچار تھے۔

مویشیوں کے چرنے کے لیے چارا نہیں ملتا تھا۔ مویشی سارے کوہستان کی خاک چھاننے پر مجبور تھے۔ پیسے کم ہو گئے تھے۔ موتیں زیادہ ہو رہی تھیں۔ مُلّا طہماسپ نے سب سے کہہ دیا تھا کہ یہی موٹا بچہ کہ جس کے سینے کی چوڑائی آٹھ سال کے بچے کے

برا بر ہے ان ساری مصیبتوں اور پریشانیوں کا باعث ہے۔

گلیوں کے آس پاس کے باغوں سے اضطراب ٹپک رہا تھا۔ لوگ ان کے پاس سے گزر گئے بچے بھاگ بھاگ کر دھول اڑا رہے تھے۔ صحرا بہت جلد منہ کھولے دکھائی دینے لگا۔ سورج سامنے پہاڑ کی چوٹی پر دھرا تھا۔ لگتا تھا کہ چند لمحوں بعد سورج مرجائے گا۔ لوگوں نے اپنے قدم تیز کردیے تاکہ جلد اپنے مطلوبہ ٹیلے تک پہنچ جائیں۔

بچہ اس قدر بھاری تھا کہ بعض عورتیں بیس تیس میٹر سے زیادہ اسے نہیں اٹھا سکتی تھیں۔ بچہ ہر نئی عورت پر مسکراتا، تنے ملیح انداز میں کہ وہ برداشت نہ کرپاتی اور کوشش کرتی کہ جلدی سے بچے کو خود سے دور کردے خصوصاً اس کی نظروں کے شر سے نجات پالے۔ ٹیلے تک پہنچتے پہنچتے تیس چالیس افراد نے اسے کولہے پر اٹھایا۔ لوگ شور غل مچاتے آرہے تھے۔ گرد غبار تھا اور ہجوم۔ پہاڑ کے ٹیلے کے اوپر بڑوں نے بچوں کو پیچھے دھکیلا پھر انھوں نے بچے کو ایک پتھر کے تختے پر رکھ دیا جو سب سے زیادہ اونچا تھا۔ بچہ اپنے ہاتھ ہلا رہا تھا اور اس کی مسکراتی ہوئی نظریں ان پر جمی تھیں۔

نمبر دار: "اس سے پہلے کہ اس بچے کی نظریں سب کو دیوانہ کردیں آؤ لوٹ چلیں۔"

سب ہولے ہولے ٹیلے سے اتر آئے۔ عورتیں رو رہی تھیں۔ بچے خوفزدہ تھے۔ بچوں نے اپنے ماں باپ سے رخ موڑ لیا۔ سبھی بچے اعتراض کر رہے تھے۔ ماں باپ ان کے ہاتھ کھینچ رہے تھے۔ کسی کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ بچوں کے سوال کا جواب دے۔ کسی کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ پلٹ کر دیکھے۔ اب سورج مکمل طور پر دفن ہوچکا تھا۔ رات دور سے آواز دے رہی تھی۔ مُلّا طہماسپ اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے دعا کر رہا تھا اس نے لوگوں پر ایک آدھ نظر بھی نہ ڈالی۔

لوگوں کو معلوم تھا دو ننھی ننھی مسکراتی آنکھیں انھیں دیکھ رہی تھیں اسی لیے انھوں نے اپنے قدم تیز کردیے بوڑھی عورتیں اور مرد چھتوں پر بیٹھے لوگوں کا انتظار کر رہے تھے کہ ان کی زبان سے ماجرا سنیں۔ لیکن لوگوں نے کمروں میں گھس کر دروازے بند کرلیے۔ گاؤں ایک بہت بڑا قبرستان تھا بہت سے مردوں والا قبرستان۔

افسانوی مجموعے:

"سخن از جنگل سبز است و تبر دار و تبر" ۱۹۷۹ء (سرسبز جنگل، لکڑہارے اور کلہاڑے کی کہانی) سے انتخاب۔

این فرینچ
کریم اور لوشن
آپ کے سراپا کے لیے
ریشم سا احساس
MPL

رفتار ادب

(تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

میر و سودا کا دور

ثناء الحق صدیقی

صفحات ۴۹۶ قیمت -/۱۰۰ روپے

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی

میر و سودا کے دور کو اُردو شاعری کا عہدِ زرّیں کہا گیا ہے۔ ماضی کے تقابل میں بلا شبہ یہ دور عہدِ زرّیں کہے جانے کا مستحق ہے کہ یہ دور اپنی تمام تر تابنا کی کے ساتھ آج کا دور بھی شمار ہوسکتا ہے۔ آج کی غزل سرائی میں بھی وہی شاعر مقبول ہے جس نے میر کے لب و لہجہ کو اپنایا، مثلاً فراق گورکھپوری اور ناصر کاظمی! غالب کا تتبع آسان نہیں شعرا اس پتھر کو چھو کر چھوڑ دیتے ہیں وقتاً فوقتاً اکا دکا شعراء نے اِس بات کی کوشش کی لیکن یہ کوشش محض کوشش ہی رہی۔

میر و سودا کے عہدِ زرّیں کا سلسلہ وہیں ختم نہیں ہوجاتا، آگے بڑھتا رہتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ غزل سرائی کی یہ کھیتی لہلاتی چلی جاتی ہے، غالب، مومن، آتش، ذوق، داغ، اقبال، شاد عظیم آبادی، فانی جگر، حسرت یگانہ، اصغر، فیض اس تسلسل میں آتے چلے جاتے ہیں۔

سودا پر شیخ چاند کی تصنیف مولوی عبد الحق کی رہنمائی میں اب سے برسوں پہلے شائع ہوئی تھی۔ جناب ثناء الحق صدیقی نے اپنا موضوع میر و درد کو بنایا۔ اور اس دور پر سیر حاصل مواد فراہم کیا۔ ادبی حلقے میں یہ کتاب خاصی مقبول ہوئی۔ اِسی مقبولیت کی بنا پر اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا۔

ثناء الحق صدیقی صاحب اپنے مطالعاتی سفر میں دائیں بائیں دیکھتے جاتے ہیں۔ مظاہر پر ان کی نگاہ طائرانہ نہیں پڑتی۔ وہ مظاہر کے بین السطور بھی دیکھتے ہیں لہذا اُن کے تحقیقی کام میں بصیرت کی جھلک صاف محسوس کی جاسکتی ہے۔

کتاب کے باب اوّل میں اس کے مصنّف و مؤلف نے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور مذہبی پس منظر بیان کیا ہے۔ پھر اُردو شاعری کے آغاز و ارتقا اور متقدمین کے پہلے دور کا ذکر کیا ہے۔ دوسرے دور کی ابتدا مرزا مظہر جان جاناں سے ہوتی ہے لیکن اِس دور کا عہد ساز نام میر اور سودا ہے۔ میر کی شہرت غزل اور سودا کی قصیدے کی وجہ سے ہے۔ اِس دورِ زرّیں کا ذکر تقریباً سو صفحات تک پھیلا رہتا ہے اختتام جائزے کے باب پر ہوتا ہے۔ کتاب میں مرزا مظہر جان جاناں سے لے کر ثناء اللہ فراق تک ۲۴ شعرا کا فرداً فرداً ذکر کیا گیا ہے اور تقریباً بیس شعرا کا اجمالی تذکرہ ہے۔ مختصر یہ کہ میر و سودا کے دور کو سمجھنے کے لیے اِس کتاب کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔

ماہِ شکستہ

تابش دہلوی
صفحات ۱۶۶ قیمت ۱۲۵/۰۰ روپے
ادب گاہ، بلاک ۳-اے ۶/۹ ناظم آباد، کراچی

"ماہ شکستہ" جناب تابش دہلوی کا پانچواں شعری مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے ان کے چار شعری مجموعے نیم روز (۱۹۶۲ء) چراغ صحرا (۱۹۸۲ء) غبار انجم (۱۹۸۴ء) تقدیس (۱۹۸۴ء) شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں، غزل گوئی میں جناب تابش کا نام معتبر و محترم ہے۔ تابش صاحب کے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے جو پہلا تاثر قائم ہوتا ہے وہ یہ کہ اُن کی شاعری اُجلی اور دُھلی ہوئی ہے۔ زبان و بیان پر گرفت اُس پر مستزاد۔!

تابش صاحب کے ہاں غزل سرائی جن روایات سے گزر کر آئی ہے۔ اُن میں میر تقی میر کا سوز و گداز، غالب کی فکر آرائی، درد کا عارفانہ رویّہ اور مومن کی دل زدگی شامل ہے۔ اس پس منظر کے ساتھ اگر کوئی شاعر طبع موزوں اور دل گداز لے کر غزل گوئی کے میدان میں قدم رکھے تو اس کے کلام میں اختصاص پیدا ہونا لازمی امر ہے۔ ایسا ہی شاعر بہ قول احمد ندیم قاسمی فانی یگانہ، فراق، اصغر، جگر اور حسرت کے دور میں اپنی موجودگی کا بھرپور احساس دلا سکتا ہے۔

انسان جس عصر میں بود و باش کرتا ہے۔ اس عصر کا نمائندہ ہوتا ہے اگر وہ شاعر ہے تو اُس کی شاعری عصری حیثیت سے ضرور مملو ہوگی۔ اس کلیے کے تحت اگر جناب تابش کی شاعری میں عصر کو تلاش کیا جائے تو اس کا نظارہ شعروں میں جا بجا ملے گا۔ جو بات جدید غزل گوؤں سے تابش صاحب کو ممیز کرتی ہے وہ بیان کی شائستگی اور غزل کے مخصوص کلچر کا ادراک ہے۔ آئیے ان شعری اوصاف کو تابش صاحب کے شعروں میں تلاش کرتے ہیں۔

زنداں کی طرح تنگ ہوئیں ساری وسعتیں
صحرا نہ دے سکا مری دیوانگی کا ساتھ

دریا محیطِ بحر میں دریا نہیں رہا
میں بھی تری شناخت میں تنہا نہیں رہا

میری وحشت نے نکالے جب سے پاؤں
ایک صحرا صحن کے اندر کھلا

حُسن کی کن آرزوؤں سے رہا ہوں ہمکنار

میری آغوشِ تصور میں ہے اب تک بوئے دوست

جدا میرا سخن ہے سب سے تابش
الگ ہو کر چلا ہوں کارواں سے

راہ میں اجل ہے

زاہدہ حنا
صفحات ۳۰۴ قیمت ۱۵۰/- روپے
مکتبۂ دانیال وکٹوریہ چیمبرز، عبداللہ ہارون روڈ کراچی،

اعلیٰ تخلیق کار کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی تاریخ اور روایت کا گہرا شعور رکھتا ہو، اور اگر اس کی نظر دوسری اقوام کی تاریخ و روایت پر بھی گہری ہے پھر تو یہ سونے پہ سہاگے کے مصداق ہے۔ زاہدہ حنا کا پہلا افسانوی مجموعہ "قیدی سانس لیتا ہے" ہو یا تازہ مجموعہ "راہ میں اجل ہے" اِن میں شامل تقریباً سبھی افسانے مذکورہ کلیے کے مظہر ہیں، ان کی سرشت اور تار و پود میں تاریخیت کے ادراک کو صاف محسوس کیا جاسکتا ہے۔

"راہ میں اجل ہے" کی پہلی کہانی "زمین آگ کی آسمان آگ کا" چند سال پہلے کے ایک واقعہ سے تعلق رکھتی ہے اِس کی فضا بندی میں بیان کے قدیم و جدید طرز کی آمیزش سے کام لیا گیا ہے جس کی وجہ سے گنگا جمنی کا لطف آتا ہے۔ یہاں رشیدۃ النساء کے ناول، اصلاح النساء (۱۸۸۱ء) کی FEM INIST روایت سے بھی مطابقت نظر آتی ہے۔ جب مرد بھی اصلاح احوالِ نسواں کے لیے تابڑ توڑ ناول لکھ رہے تھے۔ (میری مراد ڈپٹی نذیر احمد اور راشد الخیری کے ناولوں سے ہے)

"زاہدہ حنا" بھی اصلاح احوال نسواں کی طرف دار ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ عورتوں کے حقوق کے حصول کے سلسلے میں ان کا رویّہ انقلابی ہے۔ وہ ایسے نظام میں تبدیلی لانا چاہتی ہیں، جہاں عورت دوسرے درجہ کی مخلوق تصوّر کی جاتی ہو۔ اس طرح زاہدہ حنا کی اصلاح احوالِ نسواں اِن کے بزرگ پیشروں سے یکسر مختلف ہوجاتی ہے اور اس کا رشتہ حقوق نسواں کے تحفظ کی عالمی تحریک سے جڑ جاتا ہے۔

افسانہ "آخری بوند کی خوشبو" برصغیر میں انگریزوں کے خلاف تحریک آزادی کا پس منظر پیش کرتا ہے۔ جس کا ماسٹر فیض بخش ایک سرگرم رُکن ہے، اِس افسانے کے مطالعہ سے سندھ میں انگریزوں کے خلاف جدوجہد کا طویل تاریخی منظر نامہ سامنے آجاتا ہے جس میں کہیں کہیں جنرل نیپیر کے خلاف ہوشو شیدی، نبرد آزما دکھائی دیتا ہے، کہیں ریشمی رومال کی تحریک کا سنگھٹن ہوتا رہا۔

افسانوں کے اِس مجموعے میں ایک ناولٹ "نہ جنوں رہا نہ پری رہی" بھی شامل ہے۔ یہ ناولٹ ایک کردار برجیس کے گرد گھومتا ہے۔ اس کی کہانی کا تعلق ہجر اور ہجرت سے ہے، کہانی ہجرت سے شروع ہوتی ہے اور ہجرت پر ختم ہوجاتی ہے اس کہانی سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ سرزمین بدلنے سے بعض اوقات محبتیں بھی بدل جاتی ہیں۔ برجیس کے سفر کے دوران کچھ ایسہ ناگہاں

رشتے پڑتے ہیں کہ مسائل دور سے دور تر ہو جاتی ہے اور بالآخر معمولی ایک دائرہ بنا کر بے نیلِ مرام ختم ہو جاتی ہے نہ جنوں جنوں رہتا ہے نہ پری پری رہتی ہے۔

زاہدہ حنا کا افسانہ "تتلیاں ڈھونڈنے والی" اس مجموعے کا سب سے مؤثر افسانہ ہے، اس کا تاثر آدمی کو بے حال کر دیتا ہے۔ اس میں غم کائنات کا بے پناہ جذبہ ہلکورے لے رہا ہے۔ افسانے کی خصوصیات و محاسن پر چند جملوں میں باتیں ختم نہیں کی جاسکتیں، اس لیے ایک الگ مضمون درکار ہے۔

زاہدہ حنا کا فن چہار دیواری میں طواف کرنے کا فن نہیں، یہ فن گلی میں اُترنے اور کشت زاروں تک رسائی حاصل کرنے کا دلدادہ ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں کے ڈانڈے وسعت و آفاقیت سے جاملتے ہیں، یوں بھی جب کوئی ادیب کی ترجیحات میں غم کائنات شامل ہو جائے تو اس کے ہاں کسی عنوان کی محدودیت بار نہیں پاسکتی۔ زاہدہ حنا کا فن بیکرانی سے مَس کرتا ہے ان کے ناقدین کو اس بات کا خیال رکھنا مناسب ہے۔

دھنک کے باقی ماندہ رنگ

امراؤ طارق

صفحات ۱۸۴ قیمت ۱۰۰/- روپے

سیپ پبلی کیشنز پوسٹ بکس نمبر ۳۲۲۴ کراچی

"دھنک کے باقی ماندہ رنگ" میں جناب امراؤ طارق کے دس خاکے شامل ہیں، ان کا پہلا خاکہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی شخصیت کے گرد گھومتا ہے۔ اسے پڑھ کر فرمان صاحب کا جو امیج بنتا ہے وہ یہ کہ ڈاکٹر صاحب ہر شخص کے کام آنے والے اور ہر ایک کی مشکل میں آگے بڑھ کر دادرسی کرنے والے فرد کا جذبۂ ہمدردی اپنے دل میں رکھتے ہیں۔ دیہات ایک عرصہ ہوا اُن سے چھُٹ چکا ہے لیکن دیہات کی خو بو تا حال اُن کے اندر زندہ ہے اور شہری تکلفات اُن کے ہاں اب تک بار نہیں پاسکے۔

جناب عبدالخیر کشفی پر لکھے گئے خاکے کے مطالعے سے بھی کم و بیش یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے، لیکن اس خاکے میں کچھ غیر ضروری باتوں کے داخل ہو جانے سے خاکے کی اثر آفرینی میں کمی واقع ہوئی ہے۔

محترمہ فردوس حیدر پر جناب طارق کا خاکہ سب سے زیادہ جچتا ہے اور کتاب مذکور میں شامل دوسرے تمام خاکوں کے مقابلے میں سجا ہوا ہے۔ ایک بات اور یہ ہے کہ خاکے کے بہتر ہونے کا انحصار خاکہ نگار کے ساتھ اُس شخصیت پر بھی ہوتا ہے جس پر خاکہ لکھا جا رہا ہو۔ فردوس حیدر کے حالات زندگی کے تنوعات کی وجہ سے خاکہ نگار کے قلم میں افسانہ نگاری کی جبلت پیدا ہو گئی ہے اور اس خاکے میں قارئین کے لیے ایک دائرہ کشش نمودار ہوا ہے۔ مجھے یہ خاکہ دوسرے تمام خاکوں سے زیادہ پُر اثر لگا ہے۔ یہاں مصنف نے قلم کے بجائے جذبۂ دل سے کام لیا ہے۔

دوسرے نمبر پہ سرشار صدیقی پر لکھا گیا خاکہ آتا ہے۔ خاکہ نگار نے سرشار کو اپنے اس قول کے کوزے میں جیسے بند کر دیا ہے "وہ اپنے کاز، اپنی شاعری اور اپنے دوستوں سے عشق کرتے ہیں" یہ ایک حقیقت ہے کہ جو اپنے "کاز" سے محبت کرتا ہے وہ شاعری بھی سچی کرے گا اور دوستوں کے معاملے میں فراخ دل بھی ہوگا۔

سرشار کے فکر و نظر کے تشکیلی دور میں کلکتہ کے حوالے سے ایک نام پرویز شاہدی کا آتا ہے۔ غالبؔ کے دل پر کلکتہ

کے ذکر سے تیر لگنے کی خلش سی پیدا ہوتی تھی۔ اور میرے دل کو خاکہ میں کلکتہ اور پرویز شاہدی کے ذکر نے تڑپایا ہے۔

ان خاکوں کے علاوہ یوسف تنویر، ڈاکٹر منظور احمد، انیس صدیقی انور عنایت اللہ جمیل زبیری اور سپاہی اللہ دتا پر لکھے گئے خاکے بھی خصوصی توجہ چاہتے ہیں، لیکن یہاں صورتِ حال یہ ہے کہ "جائے تنگ است و مرد ماں بسیار" البتہ سپاہی اللہ دتا" کو پڑھتے ہوئے، بابائے اردو مولوی عبدالحق کے خاکے کے" نام دیو مالی" کی روایت کی پاسداری کا خیال آیا ہے۔ بہر حال خاکے کی کتابوں میں "دھنک کے باقی ماندہ رنگ ایک اچھا اور قابلِ قدر اضافہ ہے۔

رہبرِ رہبراں

حضرت خواجہ صوفی مسعود احمد رہبر چشتی

صفحات ۱۵۵ قیمت۔ اندرج نہیں

۳۳-۳۱ ایچ رہبر پلاٹ نمبر ۲ شاہ فیصل کالونی نمبر ۲ کراچی،

نعت گوئی کی روایت کم و بیش اُتنی ہی قدیم ہے جتنا کہ خود مذہب اسلام! تب سے آج تک رسولِ مقبول کی مدحت کا سلسلہ جاری ہے عربی، فارسی، اُردو، پنجابی، سندھی، سرائیکی، پشتو، بلوچی، برصغیر پاک و ہند کی کون سی ایسی زبان ہے جس میں ہر زمانے میں بے شمار نعتیں نہ لکھی گئی ہوں۔ ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ غیر قوموں نے بھی مدحتِ رسول میں شعر کہے ہیں،

"رہبرِ رہبراں" جناب خواجہ صوفی مسعود احمد رہبر چشتی کی اُن نعتوں کی کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً وہ کہتے رہے ہیں۔ ان نعتوں کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ نہایت دل گدازی سے کہی گئی ہیں۔ اور لفظوں میں اُن آداب و احترام کو ملحوظ رکھا گیا ہے جو نعت کی قدر و قیمت متعین کرتے ہیں اور اس کی فضا کو بہ حال رکھتے ہیں۔ اس سلسلے کے چند شعر ملاحظہ کیجیے!

رہبر میں حضوری میں رہتا ہوں ہر اک لمحہ
پنہاں مرے دل میں ہے تصویر محمد ﷺ کی

در پہ نبی ﷺ کے جائیں گے آج نہیں تو کل سہی
دل کی مراد پائیں گے آج نہیں تو کل سہی

اِس لیے آنکھوں سے آنسو بہہ گئے
سب مدینے کو گئے ہم رہ گئے

یہ بندہ نوازی ہے یہ لطفِ کریمانہ
ہر بندہ ترے درکار آقا نظر آتا ہے

گردوپیش

بابائے اردو یادگاری خطبہ:

۱۵ جنوری ۱۹۹۴ء کو انجمن ترقی اردو کی جانب سے ہر سال کی طرح اس سال بھی بابائے اردو یادگاری خطبہ پیش کرنے کے لیے نیو آئیڈیل ہال میں ایک تقریب منعقد ہوئی۔ اس کے لیے لندن کے مشہور دانشور جناب رالف رسل مدعو تھے۔ تقریب کی صدارت جناب نور الحسن جعفری نے فرمائی۔

تقریب کے باضابطہ آغاز سے پہلے ملک کے نامور ادیب و دانشور جناب پروفیسر احمد علی کے انتقال پر انجمن کی جانب سے ایک تعزیتی قرارداد جناب ابوطارق نائب معتمد انجمن نے پیش کی۔ اس کے بعد انجمن کے معتمد اعزازی جناب جمیل الدّین عالی نے مقالہ نگار جناب رالف رسل کا تفصیلی تعارف کرایا اور کہا کہ ۱۹۵۸ء میں ان کی کتاب "دی مغل پوئٹ" شائع ہوئی تھی۔ (جو مومن، میر تقی میر اور سودا پر مشتمل تھی) اس کتاب کی تکمیل میں ڈاکٹر خورشید الاسلام کا تعاون حاصل تھا۔ ۱۹۶۹ء میں رسل صاحب کی ایک اور کتاب "غالب، لائف اینڈ لیٹرز" اور اس کے بعد PERSUIT OF URDU LITERATURE شائع ہو کر مقبول ہوئی۔ آخر الذکر میں ۱۴ مضامین شامل ہیں، خاص خاص عنوانات میں چند ایک یہ ہیں،

(۱) MEER THE POET AND THE MAN

(۲) THE GHAZAL OF GHALIB

عالی صاحب نے کہا کہ ان کتب کے علاوہ رسل صاحب کی دو اور کتابیں زیر طباعت ہیں جن میں ایک غالب کی اُردو، فارسی غزلوں کا انگریزی ترجمہ اور دوسری "انتھولوجی آف اُردو لٹریچر" ہے۔ "رسل کا یہ ترجمہ نہ صرف مجھے حیرت میں ڈالتا ہے۔ بلکہ یہ باور کراتا ہے کہ انھوں نے کلامِ غالب کی تفہیم کس اعلیٰ سطح سے کی ہے۔

عالی صاحب نے مزید کہا کہ انگلینڈ میں اُردو کے فروغ و تحفظ کے سلسلے میں جتنا وقیع کام رالف رسل صاحب کا ہے، اتنا کم مجھے کوئی دوسرا نام معلوم نہیں۔ اُردو کی حمایت و ترویج میں رالف رسل کا نام نہ صرف انگلینڈ میں شہرت رکھتا ہے بلکہ اس حوالے سے پورے یورپ اور امریکہ میں بھی رالف رسل کے منشا کی ترویج ہو رہی ہے۔ بلاشبہ انگلینڈ میں اُردو کی ترویج کے سلسلے میں رالف رسل نے ایک مجاہدانہ کردار ادا کیا ہے وہ ایک ایسے محبِ اُردو ہیں جو بغیر کسی جزا و سزا کے یہ کام انہماک سے کرتے چلے آرہے ہیں۔

عالی صاحب نے وضاحت کی کہ مالیاتی وجوہ سے انجمن نے "بابائے اردو یادگاری خطبہ" کے لیے اب تک جنوبی ایشیا سے ؛

کے ممالک کے دانشوروں کو مدعو نہیں کیا۔ خطبے کے اجراء کے بعد پہلا موقع ہے کہ جب رسل جنوبی ایشیا کے باہر ملک انگلینڈ سے تشریف لائے ہیں۔ لیکن ہم نے انھیں براہ راست انگلینڈ سے دعوت نہیں دی وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں کسی تقریب کے سلسلے میں مدعو ہیں ہم نے اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اِس بات پر رضامند کیا کہ وہ دہلی سے یہاں بھی تشریف لائیں۔ اس کے ساتھ عالی صاحب نے آج کے مہمان خصوصی جناب رالف رسل کو مقالہ سنانے کی دعوت دی۔ انہوں نے اجلاس کو مطلع کیا کہ دوسرے خطبوں کی طرح انجمن اسے بھی کتابی شکل میں چھاپ دے گی۔

جناب رالف رسل نے کہا انجمن ترقی اُردو کی جانب سے جو مجھے دعوت ملی ہے اِس کو بلا تکلف اور بجا طور پر میں اپنی ہمّت افزائی تصوّر کرتا ہوں۔ جناب رالف رسل نے اپنے مقالے کے اقتباسات سُنائے۔ انھوں نے کہا میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کا پیغام نہ صرف مسلمانوں اور پاکستانیوں کے لیے ہے بلکہ یہ ساری دُنیا کے حساس اور ذہین افراد کے لیے ہے کیونکہ یہ سوچنے اور فکر کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ قطع نظر اِس کے کہ ہر شخص کے فکر کرنے کا اپنا انداز ہوتا ہے اور اِس معاملے میں اُسے اتفاق اور اختلاف کرنے کا حق ہے۔ میرے مقالے میں میرا اپنا زاویہ نظر ہے۔

جناب رالف رسل کے خطاب کے بعد کچھ دیر سوال و جواب کا سلسلہ چلا۔ حاضرین جلسہ میں سے جن لوگوں نے سوالات اُٹھائے یا وضاحت طلب کی اُن میں جناب افتخار احمد عدنی، جناب شان الحق حقّی، ڈاکٹر حنیف فوق، جناب افضال شروانی، جناب سجّاد میر اور جناب شبنم صدیقی شامل ہیں، سوالات و جوابات کے نتیجے میں علامہ اقبال کے حوالے سے جو متعدد رُخ سامنے آئے اُن میں (۱) علامہ کے کلام میں احمد شاہ درّانی کا ہیرو کے طور پر ابھرنا (۲) اقبال اور خلافت تحریک، (۳) اقبال اور عقل دشمنی ہیں، اِس بحث میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے علامہ اقبال کے فارسی کلام سے کئی اشعار پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اقبال کے ہاں عشق کی ترجیح سے یہ مطلب ہرگز نہیں نکلتا کہ اقبال کے نزدیک عقل کی کوئی اہمیّت ہی نہیں تھی۔ اقبال جیسا شاعر عقل سے انحراف کس طرح کر سکتا ہے۔

سوال و جواب کے بعد صدر تقریب جناب نور الحسن جعفری نے اظہار تشکر کے طور پر کہا کہ ہم اپنی طرف سے انجمن کے متولیان اور حاضرین جلسہ کی طرف سے جناب رالف رسل کے شکر گزار ہیں کہ اُنھوں نے یہاں آنے کی ہماری دعوت قبول کی، انھوں نے مزید کہا کہ اہلِ زبان کے اُس تصوّر کی اب اہمیت نہیں کہ کون لکھنؤ اور کون دہلی کا ہے۔ جو بھی اُردو سے والہانہ وابستگی رکھتا ہے اور اس کی ترویج و ترقی کے لیے تقریر و تحریر سے اپنی خدمات انجام دیتا ہے وہ اہلِ زبان ہے۔ اِس ناتے رالف رسل بھی اہلِ زبان کہے جانے کے مستحق ہیں۔

جناب صدر نے کہا کہ مشاعرے کی تہذیبی اہمیت اپنی جگہ لیکن مشاعروں سے کوئی زبان بین الاقوامی نہیں بن سکتی۔ اِس کے لیے رسل صاحب جیسے ایک نہیں بہت سے اُردو دوست درکار ہیں۔ جو اُردو کے باب میں مجاہدانہ جذبہ رکھتے ہوں۔

مہ نیاز فتح پوری یادگاری جلسہ:

۲۴ دسمبر ۱۹۹۳ء کو حلقہ نیاز و نگار کراچی نے بہ اشتراک انجمن ترقی اردو پاکستان اور ہمدرد فاونڈیشن پاکستان کراچی علامہ نیاز پوری یادگاری جلسہ کا انعقاد کیا۔ جلسے کی صدارت جناب حکیم محمد سعید گورنر سندھ نے فرمائی، شریک صدر کی حیثیت سے حکیم مد احسن، پروفیسر کرار حسین، جناب نور الحسن جعفری اور جناب شوکت صدیقی تشریف رکھتے تھے۔ جلسے کی نظامت، کے فرائض

جناب امراؤ طارق نے انجام دیے۔
نے کہا کہ یہ ہمارا افتخار ہے کہ
جلسے کا آغاز جناب زبیر منصور کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ آغاز کے طور پر جناب امراؤ طارق
علامہ نیاز فتح پوری یادگاری جلسہ کے موقع پر ہر سال اندرون ملک اور بیرون ملک سے دانشوروں کو علامہ کی شخصیت و فن پر مقالے
پڑھنے کے لیے دعوت دے کر بلاتے ہیں۔ اس سال بیرون ملک سے پروفیسر ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
سے مدعو کیے گئے تھے۔ لیکن بوجوہ وہ نہ آسکے۔ اندرون ملک کے مدعوئین آچکے ہیں، اُن سے آپ اُن کے گراں قدر مقالات
سنیں گے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے حاضرین تقریب سے مخاطب ہو کر کہا میں آج کی علمی محفل میں آپ سب حضرات کی آمد کا شکر
گزار ہوں۔ ہمدرد یونیورسٹی کے بانی جناب حکیم محمد سعید آج ہمارے درمیان گورنر سندھ کی حیثیت سے تشریف فرما ہیں یہ ہم لوگوں
کے لیے افتخار کا باعث ہے۔ آپ کے لطف خاص اور علم و ادب سے دیرینہ تعلق کے سبب سے علم کی روشنی ہر چہار پھیل رہی
ہے۔ سندھ میں یونیورسٹیاں قائم ہو رہی ہیں، کالج کا قیام عمل میں آ رہا ہے، دارالمطالعہ کی داغ بیل ڈالی جا رہی ہے۔ گویا سر سیّد احمد
خاں کی روایات کی پاسداری ہو رہی ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے بعد زکریا یونیورسٹی ملتان کے پروفیسر ڈاکٹر نجیب جمال نے اپنا جامع مقالہ بعنوان "مومن خاں
مومن اور نیاز فتح پوری" پڑھا انھوں نے نگار کے مومن نمبر کے حوالے سے نیاز صاحب کے اقوال دہرائے۔

"مجھے صرف ایک کتاب طلب کرنا ہو تو میں یہ کہوں گا کہ مُومن کا دیوان" دیدو۔

"پہلی چیز جو مومن کو دوسرے شاعروں سے مختلف کرتی ہے وہ یہ کہ اُن کے کلام میں کہیں گدایانہ انداز نہیں"

"تصوف کی حدود وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں عقل کی عمل داری ختم ہو جاتی ہے۔"

"مومن نے اسی دُنیا کا عشق کیا وہ ہمہ وقتی عاشق تھے۔ وہ ہر لمحہ محبت میں گرفتار ہونے پر آمادہ رہتے تھے۔"

ڈاکٹر نجیب جمال نے مومن کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے بڑی اچھی بات کہی کہ مومن نے محبوب کی آواز کی کیفیتِ
حُسن کو دریافت کیا ہے اس باب میں اُن کا کوئی ثانی نہیں۔ انھوں نے ثبوت میں یہ شعر پیش کیا۔

شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو
اُس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک

جناب آفتاب احمد خاں نے کہا غالب شناسی اب ایک بڑی روایت بن چکی ہے۔ وہ نہ صرف بڑی شخصیت ہیں بلکہ محبوب
بھی۔ وہ "مرد مومن" نہیں تھے۔ لیکن پورے آدمی تھے، جتنی شرحیں غالب کی لکھی گئیں، کسی اور شاعر کی نہیں لکھی گئیں، اُن
شرحوں کی تعداد باون کے قریب ہے۔ شاعری کے ذریعے زندگی کے متعلق جتنے سوالات غالب نے اُٹھائے ہیں کسی اور شاعر نے
نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ نیاز صاحب نے استاد مومن کے محاسن کلام کو اجاگر کیا، لیکن وہ غالب سے کنارہ کش نہیں، اُنھوں نے
"مشکلات غالب" کے نام سے کلام غالب کی شرح بھی لکھی۔

لاہور سے آئے ہوئے مہمان ڈاکٹر سلیم اختر نے ایک مقالہ "بنیاد پرستی اور نیاز فتح پوری" کے عنوان سے پڑھا۔ اُنھوں
نے بنیاد پرستی کی تاریخ بیان کی، ادب پر اُس کے منفی اثرات کی نشاندہی کی۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے کہا کہ یہ تحقیق ہی ہے جس کے
ذریعے انسان اِس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ سائنس اور ایمان میں کوئی ٹکراؤ نہیں۔ انھوں نے کہا کہ علامہ نیاز کی "مُلّا نا پسندی اور خرد

افروزی سے "ساری ادبی دُنیا واقف ہے۔ اُن کی ملاّنا پسندی بھی خرد افروزی کا ایک حصّہ تھی، نگار کے "خدا نمبر" کو اِسی سلسلے کی کڑی سمجھنا چاہیے۔ نیاز صاحب کھلے اور انسائیکلوپیڈک ذہن کے مالک تھے۔

پروفیسر عتیق احمد نے "خدا نمبر" پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا" نگار کا یہ نمبر اِس کی عظیم روایت کا حصّہ ہے جو برسہا برس سے جاری ہے، نیاز صاحب کا "نگار" عام پرچہ نہ تھا، وہ اپنی ایک خاص نہج رکھتا تھا، اور نیاز صاحب اپنے اِس ماہنامے میں جو کچھ چھاپتے تھے وہ بہت چھان پرکھ کر چھاپتے تھے۔

پروفیسر عتیق نے گفتگو کو بڑھاتے ہوئے کہا کہ نیاز صاحب نے جب "خدا نمبر" نکالنے کا اعلان کیا تو اُس وقت علمی حلقے میں اس کے عنوان کے حوالے سے ایک ہیجان سا پیدا ہوا۔ لیکن نیاز صاحب بے خوف خطر سوال اُٹھاتے رہے اور کوئی نہ کوئی مسئلہ چھیڑتے رہے۔ مقصد یہ ہوتا تھا کہ لوگ عقل کی روشنی میں ہر شے کی پرکھ کریں اور توہمات اور خرافات سے ذہن کو صاف رکھیں۔ انھوں نے کہا کہ "خدا نمبر" ایک ایسی اہم دستاویز ہے جس میں بہت سارا مواد، مختلف کتابوں سے استدلال اور سند کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ فرمان صاحب نے یہ نسخہ چھاپ کر ایک روشن خیالی کا کام کیا ہے۔ اِس نمبر کی کل سے زیادہ آج ضرورت ہے۔

جناب نورالحسن جعفری صدر انجمن ترقی اردو نے کہا کہ میں حلقہ نیاز و نگار اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھے مجلس صدور میں شامل کیا وہ ہر سال چوبیس دسمبر کو اِس تقریب کا انعقاد کر کے نیاز صاحب کے نام اور کام کو یاد کرنے کی سبیل پیدا کرتے ہیں اور اِس موقع پر اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک کے مشاہیر علم و ادب کو بُلانے کا اہتمام کرتے ہیں۔

شوکت صدیقی صاحب نے کہا کہ نیاز صاحب کے بارے میں اتنا کچھ کہا جا چکا ہے کہ سرِدست اس میں اضافے کی گنجائش نہیں رہی۔ البتہ یہ کہوں گا کہ حلقہ نیاز و نگار کی سرگرمیوں کو جو لوگ جاری رکھے ہوئے ہیں اُن کی یہ مساعی قابلِ احترام و ستائش ہیں انھوں نے کہا جہاں روشن خیالی کی بات چلے گی وہاں نیاز کا نام نمایاں ہوگا۔

پروفیسر کرار حسین صاحب نے کہا کہ حلقہ نیاز و نگار کی طرف سے منعقدہ اس شام میں بڑا لطف آیا ہے۔ انھوں نے نہایت عالمانہ شان سے بنیاد پرستی کے مفہوم و مدارج پر بات کی، انھوں نے مزید کہا کہ قوموں کے زوال میں خیالات پر جمود کا دور دورہ ہوتا ہے۔ نیاز صاحب نے دراصل جمود کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ جمود میں زندہ رہنے کے لیے ایک رجحان یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ ماضی کو تفاخر کے ساتھ بیان کیا جائے۔

جناب حکیم محمد احسن نے کہا میں آج کی اِس تقریب کے منعقد کرنے والوں کا احسان مند ہوں کہ اُنھوں نے مجھے مجلس صدور میں شامل کیا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جناب حکیم سعید دہلوی گورنر سندھ بلا شرکت غیرے صدر محفل ہیں۔

صدر جلسہ جناب حکیم محمد سعید دہلوی گورنر سندھ نے فرمایا "میں حلقہ نیاز و نگار اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے دانشوروں کے اجتماع کے صدر نشین ہونے کا مجھے اعزاز بخشا۔ صدر نے کہا کہ شہر قائد کا یہ ایک ایسا اجتماع ہے جو علمی شعور اور تجسس مہیا کرتا ہے،

گورنر سندھ نے فرمایا "نیاز فتح پوری وہ قد آور شخصیت تھے کہ جن کی نصف صدی تک اُردو پر حکمرانی رہی۔ نیاز صاحب نے اپنی تحریروں سے فرسودہ نظام کے خلاف بغاوت کا جذبہ دیا ہے۔ نیاز کی بغاوت مذہب کے خلاف ہر گز نہیں تھی۔

تقریب کے اختتام پر نیاز صاحب کے صاحبزادے ڈاکٹر سرفراز نیازی نے کثیر تعداد میں حاضرین کی شرکت اور پذیرائی پر

اپنے اور اپنی والدہ محترمہ کی طرف سے شکریہ ادا کیا۔

اس موقع پر ہر سال کی طرح "سپاس نامہ" کی صورت میں نیاز ایوارڈ تقسیم کیا گیا۔ صدر جلسہ نے ڈاکٹر نجیب جمال اور ڈاکٹر سلیم اختر کو نیاز ایوارڈ پیش کیا۔

حلقہ نیاز و نگار کی اس تقریب کا اختتام مہمان کی تواضع پر ہوا۔

منصور زعیم الرحمن کی انجمن میں تشریف آوری:

گزشتہ دنوں پروفیسر منصور زعیم الرحمن انجمن تشریف لائے ان کے اعزاز میں ایک نشست کا اہتمام کیا گیا۔ نشست کی صدارت صدر انجمن جناب ... الحسن جعفری نے کی۔

منصور زعیم الرحمن ان دنوں اپنے والد محترم پروفیسر نعیم الرحمن (جامعہ الہ آباد) کی وقیع تصنیف "قاموس تلمیحات" کی تدوین کر رہے ہیں جس کی اقساط "سہ ماہی اردو" میں شائع ہو رہی ہیں۔ اس سلسلے میں منصور زعیم الرحمن صاحب نے بتایا کہ "قاموس تلمیحات" مرتب کرنے کا کام اُن کے والد نے ۱۹۳۰ء سے شروع کیا تھا۔ اور ۱۹۵۰ء میں ان کے انتقال تک جاری رہا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ والد محترم کے اس علمی کارنامے کا جائزہ تاریخی پس منظر میں لیا جائے۔ لیکن یہ کرے کون۔ ایک عبداللہ قریشی ہیں۔ اب وہ بہت ضعیف ہو چکے ہیں۔ حیدرآباد دکن کی ڈاکٹر عاصمہ نے اس کام کی ذمہ داری لی تھی لیکن وہ بھی اب عمر کی اُس منزل میں ہیں کہ جہاں آدمی ایک طرح سے معذور ہو جاتا ہے۔

صدر انجمن نے کہا کہ اگر قاموس تلمیحات کا انگریزی ایڈیشن چھپ جائے تو بڑا کام ہوگا۔ یہ ریفرنس کی ایک اہم کتاب ہے۔ انگریزی حلقے میں اندرون اور بیرون ملک ہزار کاپیوں کا تقسیم ہو جانا ایسا مشکل نہیں۔ رہا انجمن کے رسالہ اردو میں اس کی اقساط شائع ہو رہی ہیں، انشاء اللہ مکمل ہونے پر انجمن سے یہ شائع ہو جائے گا اس موقع پر گفتگو میں جناب مختار زمن پروفیسر عتیق احمد اور ڈاکٹر اسلم فرخی مشیر علمی و ادبی انجمن اور دوسرے حاضرین نے بھی حصہ لیا۔

امریکہ میں پاکستان کے نامور مصوّر گل جی اور ان کے بیٹے امین گل جی کے فن پاروں کی نمائش:

گزشتہ سال ۲۰ اکتوبر سے ۲۰ دسمبر تک پاکستان کے دو بہت ہی مقبول مصوّر گل جی اور اُن کے صاحبزادے امین گل جی کے فن پاروں کی نمائش، "فن کا سفر" کے عنوان سے واشنگٹن کے میری ڈیان انٹر نیشنل سنٹر میں کیفرٹز گیلری میں منعقد ہوئی۔ اس نمائش میں پاکستانی سفارت خانے کا تعاون شامل تھا۔

گل جی اپنی تصاویر، خاکوں اور پچی کاری کے لیے بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں اور امین گل جی کی خصوصی مہارت مجسمہ سازی اور جیولری ڈیزائنگ میں ہے۔ دونوں فنکار اپنے کام کو فلسفہ تصوف اور مغربی تہذیب سے یکساں متاثر قرار دیتے ہیں۔

گل جی جن کا اصلی نام محمد اسماعیل ہے ۱۹۲۶ء میں پشاور میں پیدا ہوئے۔ گل جی کو مصوّری کی تحریک اپنے دادا حکیم ابو علی سے ملی جو شوقیہ فنکار تھے۔ گل جی نے بی۔ ایس۔ سی کی ڈگری علی گڑھ یونیورسٹی سے حاصل کی۔ کولمبیا یونیورسٹی سے ۱۹۴۷ء میں ہائیڈرولکس میں ماسٹر آف سائنس کی ڈگری حاصل کی۔

گل جی کا فن میڈیمز اور اسٹائلز کا وسیع احاطہ کرتا ہے وہ اپنی تجریدی خطاطی تخیئلی مصوّری اور تیز رنگوں کے ساتھ پچی کاری کے لیے خاص شہرت رکھتے ہیں۔ اس شہرہ آفاق پاکستانی مصوّر کا کام تین براعظموں پر رچرڈ نکسن، جارج بش، آنجہانی چو این لائی،

اور کریم آغا خان، جیسے عالمی قائدین کی تصاویر کی صورت میں پھیلا ہوا ہے۔

امین گل جی کی مجسمہ سازی اور جیولری ڈیزائننگ بہت مشہور ہیں ان کا کہنا ہے کہ اپنے والد کی طرح وہ بھی خطاطی اور فلسفہ تصوف سے تحریک حاصل کرتے ہیں۔ وہ کانسی پر طلائی پتھر، بلور، پتھر اور جانوروں کے سینگوں کو ملا کر جیولری کے ڈیزائن بناتے ہیں جن میں بازنطینی اور مغل رنگ موجود ہوتا ہے۔ امین گل جی کا کہنا ہے "میں اپنے فن کے ذریعے فرد اور ابدیت کے درمیان تعلق کو واضح کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ خالق کی طرف میرا طرز عمل صوفی کی سوچ کا مظہر ہے۔ میں ذہن سے نہیں دل کی راہ سے اپنا فن تراشتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ عبادت ہے۔ یہی وقت ہوتا ہے جس میں اپنے آپ کو خدا کے قریب محسوس کرتا ہوں۔ اس لیے کہ اس وقت سب کچھ بھول جاتا ہوں۔ یہی میرا مراقبہ ہوتا ہے۔

(خبر و نظر۔ یکم دسمبر ۱۹۹۳ء)

ہالہ میں میں مخدوم طالب المولیٰ کی پہلی برسی کے موقع پر ادبی کانفرنس:

گیارہ جنوری ۱۹۹۴ء کو سروری جماعت کے روحانی پیشوا جناب مخدوم طالب المولیٰ کی پہلی برسی کے موقع پر غلام حیدر ہائی اسکول ہالہ میں ایک ادبی کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ کانفرنس کی مہمان خصوصی وزیر اعظم پاکستان محترمہ بے نظیر بھٹو تھیں، انھوں نے اپنے خطاب میں فرمایا کہ مخدوم طالب المولیٰ ایک بلند پایہ ادیب و شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک جرأت مند سیاست داں بھی تھے۔ ان کا وجود ہمارے درمیان ایک سرپرست بزرگ اور مشفق باپ کا سا تھا۔

گورنر سندھ حکیم محمد سعید نے کہا کہ مخدوم طالب المولیٰ نے ہمیشہ خدمتِ خلق کی۔ مرحوم بہت بڑے نقاد، صحافی، ادیب محقق اور عالم و فاضل، شاعر، اور عظیم سیاست داں تھے۔ ان کا شمار تاریخ ساز لوگوں میں ہوتا ہے۔

مخدوم جمیل الزماں نے کہا کہ مخدوم طالب المولیٰ سندھی تاریخ، تہذیب، تمدن اور ثقافت کے محافظ تھے۔ اس موقع پر مخدوم امین فہیم نے جمہوریت کی بحالی کی جدوجہد کرنے پر وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کو طالب المولیٰ ایوارڈ دیا۔ جبکہ محترمہ بے نظیر بھٹو نے بزرگ ادیب غلام مصطفےٰ قاسمی، سیّد احسن الہاشمی، ڈاکٹر عبد المجید میمن، ڈاکٹر در محمد پٹھان، نیاز ہمایونی، امداد حسینی، عبد الکریم بلوچ، گلوکارہ عابدہ پروین، موسیقار فیروز گل کو مخدوم طالب المولیٰ یادگاری ایوارڈ ان کے ادبی و فنی خدمات کے لیے دیے۔

اس موقع پر وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو نے مخدوم طالب المولیٰ کی کتاب "یاد رفتگاں" اور "گلہائے عقیدت" کی رونمائی کی۔ تقریب کی صدارت سروری جماعت کے روحانی پیشوا مخدوم امین فہیم نے کی۔ ڈاکٹر عبد الرحمٰن، ڈاکٹر محمد یعقوب مغل، امداد حسینی، محمد علی جوہر، قمر شہباز، مرتضیٰ ڈاڈائی، نیاز ہمایونی، میاں مشتاق ڈوگر، ڈاکٹر عبد المجید سندھی، حکیم محمد احسن، حاجن ابڑو محمد عبد الطیف انصاری، علی احمد شاہ اور سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر غلام علی الانا نے مخدوم طالب المولیٰ کو خراج عقیدت پیش کیا۔

اس ادبی کانفرنس میں وفاقی وزیر دفاع جناب آفتاب شعبان میرانی، سندھ کے صوبائی وزرا کے علاوہ ملک بھر سے ادیبوں، صحافیوں، دانشوروں، مفکروں اور اسکالروں نے شرکت کی۔

(جنگ ۱۲ جنوری)

اُردو کو ذریعہ تعلیم کے طور پر اپنایا جائے:

جامعہ کراچی کے سابق وائس چانسلر اور ممتاز دانشور ڈاکٹر جمیل جالبی نے کہا کہ اُردو کو ذریعہ تعلیم کے طور پر اپنایا جائے کیونکہ وہی قومیں بلندیوں کو چھوتی ہیں جو اپنی زبان کو ذریعہ تعلیم بناتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ انگریزی ذریعہ تعلیم کے حامل ہمارے ملک کی دو فی صد آبادی نے ملک کے سارے وسائل اور اقتدار پر قبضہ کر رکھا ہے۔ انھوں نے انکشاف کیا کہ اردو میں ساڑھے تین لاکھ علمی اصطلاحات موجود ہیں۔ وہ جمعرات ۱۳ جنوری ۱۹۹۴ء کو جامعہ عثمانیہ کے ۷۵ سالہ جشن تاسیس کے حوالے سے مجلس مذاکرہ سے صدارتی خطاب کر رہے تھے۔ جلسے سے جامعہ کراچی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر احسان رشید، ممتاز دانشور و صحافی، مختار زمن، ڈاکٹر محمد علی سبزواری اور محمد بن علی نے بھی خطاب کیا، اس موقع پر جامعہ عثمانیہ کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی بھی موجود تھے۔

(روزنامہ جنگ)

"کلیات یگانہ" کی آمد:

نامور محقق اور نقاد جناب مشفق خواجہ نے کئی برسوں کی تحقیق کے بعد ممتاز شاعر یاس یگانہ چنگیزی کا شعری سرمایہ "کلیات یگانہ" کی صورت مرتب کیا ہے۔ یگانہ کی اس کلیات میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام شامل ہے جبکہ مشفق خواجہ نے ایک بھرپور مقدمہ بھی لکھا ہے۔ جس سے یاس یگانہ کے فن اور شخصیت کے نئے گوشے اُجاگر ہوئے ہیں۔

(جنگ ۱۴ جنوری ۹۴ء)

پروفیسر عتیق احمد کے اعزاز میں:

گزشتہ دنوں فکشن گروپ اور ادارۂ طلوع افکار کے زیر اہتمام پروفیسر عتیق احمد کے اعزاز میں ایک شام منائی گئی جس کی صدارت جناب شوکت صدیقی نے فرمائی نظامت کے فرائض پروفیسر علی حیدر ملک نے انجام دیے۔

ایک عرصہ سے فکشن گروپ اور ادارۂ طلوع افکار زندہ ادیبوں کی تخلیقی کاوشوں کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے تقریبات کا انعقاد کرتی آرہی ہے۔ اس مرتبہ پروفیسر عتیق احمد کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں تقریب کا اہتمام کیا۔ تقریب میں عتیق صاحب کی تین کتابیں (۱) فیض عہد اور شاعری (۲) بتے بھائی (۳) سجاد ظہیر تخلیق اور تنقیدی جہات زیر بحث، آئیں، تینوں کتابوں کو موضوع بنا کر احمد زین الدین، صبا اکرام، رعنا اقبال، ممتاز احمد خاں محمد رضا کاظمی، اے خیام، پروفیسر علی حیدر ملک اور حسین مجروح نے مقالات و مضامین لکھے۔

اِن کے علاوہ ڈاکٹر حنیف فوق پروفیسر نظیر صدیقی احمد ہمدانی، مسلم شمیم، چودھری رفیق اور شہزاد منظر نے عتیق صاحب کی مذکورہ کتابوں کے حوالے سے اظہار خیال کیا۔

تقریب کے مہمان خصوصی پروفیسر عتیق نے کہا کہ میں فکشن گروپ اور ادارۂ طلوع افکار کا بے حد شکر گزار ہوں جنھوں نے مجھے آج کی شام کے لیے منتخب کیا۔ ہمارے لیے آج کی شام ایک بڑا سرمایہ ہے۔

صدر جلسہ جناب شوکت صدیقی نے اختتامی خطاب کرتے ہوئے کہا عتیق صاحب ایک مستند نقاد ہیں، انھوں نے ترقی پسندی اور روشن خیالی کے لیے ہمیشہ کام کیا۔

جناب رالف رسل کی انجمن میں آمد:

۱۷ جنوری کو جناب رالف رسل انجمن ترقی اردو کے معتمد جناب جمیل الدّین عالی کے ساتھ انجمن میں تشریف لائے۔ اس موقع پر ڈاکٹر حنیف فوق اور ملک کے ممتاز افسانہ و ناول نگار جناب انتظار حسین بھی مدعو تھے، جناب رالف رسل کے ساتھ کچھ دیر ادب کے حوالے سے مختلف موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔ پھر جناب رسل کو انجمن کا نیا دفتر دکھلایا گیا۔ انھوں نے نئے دفتر اور کتب خانہ خاص وعام کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا اپنے تاثرات مہمانوں کے رجسٹر میں درج کیے۔ آخر میں جناب جمیل الدّین عالی نے جناب رسل اور جناب انتظار حسین کو انجمن کی تازہ مطبوعات کے تحائف پیش کیے۔

ممتاز دانشور پروفیسر احمد علی کی رحلت:

ملک کے ممتاز عالمی شہرت یافتہ ادیب، اسکالر اور متعدد کتابوں کے مصنّف پروفیسر احمد علی ۸۴ سال کی عمر میں جمعرات اور جمعہ کی درمیانی شب مقامی ہسپتال میں انتقال کر گئے۔ انھیں جمعہ کو بلاک پلانٹ قبرستان گلشن اقبال میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ مرحوم کے جنازے میں ان کے عزیز و اقارب کے علاوہ ممتاز شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں نے شرکت کی۔ مرحوم نے پس ماندگان میں ایک بیٹی اور تین بیٹے چھوڑے ہیں۔

پروفیسر احمد علی جدید اُردو افسانے کے پیشروؤں تھے ان کی تصانیف TWILGHT IN DELHI اور "انگارے" اُن کی وجہ شہرت بنی، ان کا سب سے بڑا کارنامہ کلام پاک کا انگریزی ترجمہ ہے۔

پروفیسر موصوف نے چین اور مراکش میں پاکستانی سفارت خانے قائم کیے تھے۔ انھیں ادبی و علمی خدمات کے صلے میں حکومت کی جانب سے ستارۂ قائد اعظم عطا کیا گیا۔ کراچی یونیورسٹی کی جانب سے انھیں ادب میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی تفویض کی گئی۔

ادارہ قومی زبان اُن کی رحلت پر اُن کے سوگوار خاندان کے غم میں شریک ہے۔ اور دعا گو ہے کہ اللہ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے لواحقین کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

اُفق اجمیری رحلت کر گئے:

اُردو کے معروف شاعر اور صحافی اُفق اجمیری کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم ادب میں ایک خاص مقام رکھتے تھے افق مرحوم کے انتقال پر جناب برق اجمیری نے تاریخی قطعہ کہا:

محبِ باوفا حضرت اُفق اجمیری

۱۹۹۳

وفاتِ اُفق کی خبر جب سنی
نہ پوچھو ہوئی کیا مرے دل کی حالت
کہو برق تاریخِ رحلت پہ اُن کی
افق فرحتِ اہلِ جنت

۱۴۱۴ھ

شمیم صبائی متھراوی

گذشتہ سال جُدا ہم سے ہو گئے یہ لوگ
(۱۹۹۳ء)

(۱)
"طفیل ہوشیار پوری شاعر بزم گلشن خیاں"

۱۹۹۳ء

طفیل شعر و سخن کے دیار کوچ کر
خُدا کے حکم سے خُلد آشیاں ہوئے ہیں، لکھ
شمیم ہاتفِ غیبی نے صاف فرمایا
"طفیل مالک باغ جناں ہوئے ہیں" لکھ

۱۴۱۳ھ

([illegible] ماہنامہ محفل کے مدیر جناب طفیل ہوشیار پوری نے ۴ جنوری ۱۹۹۳ء مطابق ۱۰ رجب المرجب ۱۴۱۳ھ بروز پیر [illegible] ۸۰ [illegible] میں انتقال فرمایا)

(۲)
"جنرل آصف نواز مشتاقِ خُلد"

۱۹۹۳ء

آصف نواز چھوڑ کے گلزار دہر کو
آئی خبر کہ حاملِ جنّت ہوئے ہیں آج
پھر یوں خبر دی خُلد کے رضواں نے اے شمیم

"آصف نواز داخلِ جنّت ہوئے ہیں آج"

۱۴۱۳ھ

(چیف آف آرمی اسٹاف آصف نواز نے ۸ جنوری ۱۹۹۳ء مطابق ۱۴ رجب المرّجب ۱۴۱۳ھ بروز جمعہ بعمر ۵۶ سال راولپنڈی میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کو ہفتہ کی سہ پہر اُن کے آبائی موضع چکری راجگان ضلع جہلم میں ہزاروں افراد کی موجودگی میں پورے فوجی اعزاز کے ساتھ سپردِ خاک کر دیا گیا۔

(۳)

"وقتِ رحلتِ مخدوم طالب المولیٰ"

۱۹۹۳ء

ہزاروں لوگوں کے رنج و ملال کے باعث
ہوئی ہے رحلت مخدوم طالب المولیٰ
شمیم بن گیا سالِ وفات صاف اُن کا
"مکانِ جنّت مخدوم طالب المولیٰ"

۱۴۱۳ھ

(برصغیر کے نامور روحانی بزرگ شمس العارفین حضرت غوث الحق المعروف مخدوم نوح کے سترھویں سجادہ نشین سروری جماعت کے روحانی پیشوا، بزرگ سیاستدان، نامور شاعر و ادیب طالب المولیٰ نے ۱۱ جنوری مطابق ۱۷ رجب المرّجب ۱۴۱۳ھ بروز پیر بعمر ۷۲ سال کراچی میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کا جسدِ خاکی منگل کی دوپہر ہزاروں اشک بار آنکھوں کی موجودگی میں ہالا میں مزار مخدوم نوح سرور کے احاطے میں سپردِ خاک کر دیا)

(۴)

"آہ وداعِ مظہر علی خاں"

۱۹۹۳ء

مظہر علی کے اُٹھنے سے
بزم صحافت سونی ہوئی
تاریخِ رحلت نکلی شمیم
"آرام گاہِ مظہر علی"

۱۴۱۳ھ

صحافی، دانش ور، اور سابق ایڈیٹر روزنامہ پاکستان ٹائمز و ہفت روزہ "ویو پوائنٹ" نواب زادہ مظہر علی خان نے ۲۸ جنوری،

۱۹۹۳ء مطابق ۴ شعبان المعظم ۱۴۱۳ھ بروز جمعرات بعمر ۷۲ سال لاہور میں انتقال فرمایا۔ جمعہ کو مرحوم کا جسدِ خاکی گلبرگ کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔)

(۵)

"یوم ہجرِ مفتی شجاعت علی قادری"

۱۹۹۳ء

شجاعت علی قادری چل بسے
جو تھے آبرو محفل دین کی
شمیم ان کے دنیا سے اُٹھنے کا سال
ہے "روحِ شجاعت علی قادری"

۱۴۱۳ھ

(اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن، وفاقی شریعت عدالت کے سابق جج اور دارالعلوم نعیمیہ کے شیخ الحدیث جسٹس ڈاکٹر مفتی شجاعت علی قادری نے ۲۸ جنوری ۱۹۹۳ء مطابق ۴ شعبان المعظم ۱۴۱۳ھ بروز جمعرات بعمر ۵۲ سال جکارتہ (انڈونیشیا) میں رحلت فرمائی۔ مرحوم کی نعش پاکستان لائی گئی اور تدفین پیر یکم فروری کی رات ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں کراچی کے سخی حسن قبرستان میں عمل میں آئی)

(۶)

"اقبال حسن برنی سراجِ ریاضِ جناں"

۱۹۹۳ء

اقبال حسن برنی دنیا سے ہوئے رخصت
اب جا بسے گے باغوں میں جنّت کے وہ گھر لینا
مرقد پہ شمیم ان کے تاریخِ اجل اُن کی
"اقبال حسن برنی ہیں خُلد میں" لکھ دینا

۱۴۱۳ھ

(کراچی پریس کلب کے بانی، کنوینر اور ممتاز صحافی جناب اقبال حسن برنی نے ۵ فروری ۱۹۹۳ء مطابق ۱۲ شعبان المعظم ۱۴۱۳ھ جمعہ بعمر ۶۸ سال کراچی میں انتقال فرمایا)

(۷)

"سانحۂ وداعِ غلام ربانی تاباں"

۱۹۹۳ء

ہوگیا اچانک اُف سوگ وار و رنج آگئیں
انتقال تاباں سے شعر گوئی کا ایواں
آپ کا سنِ رحلت جب شمیم نے ڈھونڈھا
مل گیا اسے فوراً "اشک رحلتِ تاباں"

۱۴۱۳ھ

(اردو کے مشہور شاعر جناب غلام ربانی تاباں نے ۷ فروری ۱۹۹۳ء مطابق ۱۴ شعبان المعظم بروز اتوار بعمر ۸۰ سال نئی دہلی (بھارت) میں انتقال فرمایا)

(۸)

"وہاب صدیقی امیر محفلِ باغ جنت"

۱۹۹۳ء

تمام توڑ کے رشتے زمین والوں سے
ہیں آج خُلد میں بے غم وہاب صدیقی
ملا شمیم ہمیں ان کا یوں سنِ رحلت
"امیر ِ خُلد، مکرم وہاب صدیقی"

۱۴۱۳ھ

(ممتاز صحافی اور پاکستان ٹیلی ویژن کے معروف کمپیئر جناب وہاب صدیقی نے ۲۰ فروری ۱۹۹۳ء مطابق ۲۷ شعبان المعظم ۱۴۱۳ھ بروز ہفتہ بعمر ۴۲ سال کراچی میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کو اتوار کو بعد نماز ظہر سخی حسن کے قبرستان میں سپرد قبر کر دیا گیا۔)

(۹)

"ستم رحلتِ میجر آفتاب حسن"

۱۹۹۳ء

یہ کس نے گلشن دنیا سے آج کوچ کیا
سِلایہ کون سی مشہور شخصیت کا کفن
ندائے غیب شمیم آئی یوں پئے تاریخ
"چلے ہیں محفلِ ہستی سے آفتاب حسن"

۱۴۱۳ھ

(اردو زبان کے مخلص خادم، اردو میں سائنسی تعلیم کو فروغ دینے والے، ماہر تعلیمات، اردو کالج کے سابق پرنسپل، جامعہ کراچی شعبۂ تصنیف و تالیف کے سابق مدیر، اور پاکستان میں سائنٹیفک سوسائٹی کے بانی و معتمد میجر آفتاب حسن نے ۲۶ فروری ۱۹۹۳ء مطابق ۳ رمضان المبارک ۱۴۱۳ھ بروز جمعہ بعمر ۸۴ سال کراچی میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کو بعد نماز عصر سر شاہ سلیمان روڈ کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا)

(۱۰)

"مہ کل خانۂ جنت ملک تاج الدّین"

۱۹۹۳ء

بن کے بانی ہیں اس ملک میں اے پی پی کا
بن گئے خلد میں سرتاج ملک تاج الدّین
بہر تاریخ شمیم آ کے کہا رضواں نے
وادیٔ خلد میں ہیں آج ملک تاج الدّین"

۱۴۱۳ھ

(ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان (اے پی پی) کے بانی ملک تاج الدّین نے ۷ مارچ ۱۹۹۳ء مطابق ۱۲ رمضان المبارک ۱۴۱۳ھ بروز اتوار بعمر ۸۴ سال اسلام آباد میں رحلت فرمائی۔ مرحوم کو پیر کے دن ۸ مارچ کو اسلام آباد کے اکلوتے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا)

(۱۱)

"میجر جنرل (ریٹائرڈ) شاہد حامد کا مزار"

۱۹۹۳ء

کیا کہیں کتنے دلوں کو بے کل
کر گئی رحلتِ شاہد حامد
ان کی تاریخ فنا پائی شمیم
بے بدل تربتِ شاہدِ حامد"

۱۴۱۳ھ

(کئی کتابوں کے مصنف وزیر اطلاعات و نشریات میجر جنرل (ریٹائرڈ) شاہد حامد نے ۱۲ مارچ مطابق ۱۷ رمضان المبارک بروز جمعہ بعمر ۸۱ سال راولپنڈی میں رحلت فرمائی۔ مرحوم کو ہفتہ کی صبح راولپنڈی کے فوجی قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا)

(۱۲)

قومی زبان (۹۱) فروری ۱۹۹۴ء

"حبیب جالب حق پسند شاعرِ گل خانہ خُلد"

۱۹۹۳ء

عوامی شاعر ارم میں پہنچا تو بولیں حوریں
کلام اپنا ہمیں سنائے حبیب جالب
شمیم خوش ہو کے بہر تاریخِ مرگ، رضواں
پکارا "باغ ارم میں آئے حبیب جالب"

۱۴۱۳ھ

(معروف شاعر جناب حبیب جالب نے ۱۲ مارچ ۱۹۹۳ مطابق ۱۷ رمضان المبارک ۱۴۱۳ھ بروز جمعہ بعمر ۶۵ سال لاہور میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کو ہفتہ کے دن لاہور کے سبزہ زار اسکیم کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا)

(۱۳)

"محمد خاں جونیجو سردارِ بہشت"

۱۹۹۳ء

توڑ کر دہر سے ہر اک رشتہ
سُرخ رو پیشِ رب جونیجو ہیں
یوں خبر دی شمیم رضواں نے
"داخلِ خُلد اب جونیجو ہیں"

۱۴۱۳ھ

پاکستان کے سابق وزیر اعظم اور مسلم لیگ کے مرکزی صدر جناب محمد خان جونیجو نے ۱۸ مارچ ۱۹۹۳ء مطابق ۲۳ رمضان المبارک ۱۴۱۳ھ بروز جمعرات بعمر ۶۱ سال بالٹی مور (امریکہ) کے ایک اسپتال میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کی میت پاکستان لائی گئی اور مرحوم ہفتہ کے دن ان کے آبائی گاؤں سندھڑی میں سپرد خاک کیا گیا)

(۱۴)

"نصیر بُندہ سرورِ باغِ عدم"

۱۹۹۳ء

حکم رب ہے نصیر بُندہ بھی
کشتیٔ جوئے مغفرت میں بہیں
بولا رضوان باغِ خُلدِ شمیم

"خُلد میں اب نصیر بُندہ رہیں"

۱۴۱۳ھ

(ہاکی کے عالمی شہرت یافتہ اولمپک کھلاڑی جناب نصیر احمد (عرف بُندہ) نے ۲۰ مارچ ۱۹۹۳ء مطابق ۲۵ رمضان المبارک ۳ بروز ہفتہ راولپنڈی میں رحلت کی۔ مرحوم کی تدفین اتوار کے دن راولپنڈی کے ایک قبرستان میں عمل میں آئی)

(۱۵)

"ناوکِ غم ستار طاہر"

۱۹۹۳ء

تج کے دنیا ستار طاہر
رب کے آگے ہوتے ہیں حاضر
سال رحلت ان کا بنا ہے
"سالِ موتِ ستار طاہر"

۱۴۱۳ھ

(ماہنامہ قومی ڈائجسٹ لاہور کے ایڈیٹر جناب ستار طاہر نے ۲۵ مارچ ۱۹۹۳ء مطابق یکم شوال المکرم ۱۴۱۳ھ بروز جمعرات لاہور انتقال فرمایا۔ مرحوم کو اسلام پورہ کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا)

(۱۶)

"ماسٹر عنایت حسین والی مجلسِ جنّت"

۱۹۹۳ء

اُٹھے ہیں جب سے عنایت حُسین دنیا سے
نہیں ہے ان کے احبا کو چین لکھ دینا
شمیم سالِ فنا چاہیے اگر اُن کا
"مکینِ خُلد عنایت حسین" لکھ دینا

۱۴۱۳ھ

(پاکستان کے معروف موسیقار ماسٹر عنایت حسین نے ۲۶ مارچ ۱۹۹۳ء مطابق شوال المکرم ۱۴۱۳ھ بروز جمعہ بعمر ۸۵ میں رحلت فرمائی۔ مرحوم کو جمعہ کو قبرستان میانی صاحب میں سپرد خاک کیا گیا)

(باقی

نئے خزانے

ڈاکٹر وفا راشدی

فکر فلسفہ حکمت

آغا گل — افکارِ عالیہ — ماہ نو لاہور مئی ۹۳ء ص ۳۴
اسماعیل سعد، ڈاکٹر — نظامِ امتحانات میں تبدیلیوں کی ضرورت — آگہی، کراچی مئی ۹۳ء ص ۵۹
ثاقبہ رحیم الدّین — سمندر — شام و سحر، لاہور جنوری ۹۳ء ص ۵۴
جیون خان — دوسرا خط کچھ ذکر ٹیگور اور کنفیوشس کا — اردو نامہ، لاہور جون ۹۳ء ص ۱۷
حسن عابدی — افلاس کا کلچر اور کلچر کا افلاس — افکار، کراچی مئی ۹۳ء ص ۹
راحت سعید — یہ سیہ وقتی فروغِ شب تلک کی بات ہے — ارتقاء، کراچی ۱۰/۹۳ء ص ۷
رشید احمد جالندھری — سالِ نو کی آمد اور مسلم دنیا — المعارف، لاہور مئی جون ۹۳ء ص ۸
سلیم اختر، ڈاکٹر — عریانی اور فحاشی کا سیلاب اور قومی تقاضے — افکار، کراچی جنوری ۹۳ء ص ۱۲
سیّد حامد — کھیلوں کے ایوارڈ — تہذیب الاخلاق، علیگڑھ مارچ ۹۳ء ص ۷
سیّد حامد — آزمائش کی گھڑی — تہذیب الاخلاق، علیگڑھ اپریل ۹۳ء ص ۵
عالم خوند میری، ڈاکٹر — تشخص کا بحران — المعارف، لاہور جنوری ۹۳ء ص ۲۹
عبدالحمید کمالی — حکمت الٰہیہ کی روشنی میں زمانے کی ماہیت اور مقدرِ انسانی — اقبالیات، لاہور جولائی ستمبر ۹۱ء ص ۱
غزالہ ہاشمی — فلسفہ ابن رُشد — اقبال، لاہور جنوری ۹۳ء ص ۲۸۲
غلام مصطفیٰ قاسمی علامہ — علم و حکمت — الولی، حیدر آباد سندھ فروری مارچ ۹۳ء ص ۲
غلام مصطفیٰ قاسمی علامہ — انسان اور اس کی حقیقت — الولی، حیدر آباد سندھ جون ۹۳ء ص ۲
فہیم اعظمی، ڈاکٹر — حقیقت نگاری ایک مبہم اصطلاح — صریر، کراچی مئی ۹۳ء ص ۵
محمد احمد سبزواری — دانش اور ان کی ذمے داریاں — افکار، کراچی جون ۹۳ء ص ۱۰
محمد ارشاد — مجذوب فرنگی فلسفی نیطشے — فنون لاہور دسمبر ۹۲ء ص ۵۷
محمد باقر، ڈاکٹر — معاشرہ اور اصلاحِ معاشرہ — تہذیب الاخلاق، لاہور جون ۹۳ء ص ۵
محمد زکریا درک — سیلف امیج — تہذیب الاخلاق، علیگڑھ اپریل ۹۳ء ص ۳۶

محمد سعید حکیم — توحید اور اتحاد — سب رس، کراچی فروری ۹۳ء ص ۶

نعیم صدیقی — نئی دنیا کی تشکیل — سیارہ، لاہور سالنامہ جنوری فروری ۹۳ء ص ۱۴

وحید قریشی، ڈاکٹر — اکیسویں صدی کی تیاری مشکلات و مسائل — اردو نامہ، لاہور فروری ۹۳ء ص ۱۳

وہاب تسنیم — تحفظ حیات — تہذیب الاخلاق، علیگڑھ جون ۹۳ء ص ۲۴

تاریخ تہذیب ثقافت

ارشد ملتانی — تھل، تاریخ کے تناظر میں — الشعاب، ملتان مئی جون ۹۳ء ص ۴۹

اسامہ موعود — ہمارا تہذیبی المیہ — اردو نامہ، لاہور اپریل ۹۳ء ص ۳۳

اسلم صدیقی — تکوینی نظام الٰہی تاریخ کی روشنی میں — تہذیب الاخلاق، علیگڑھ مارچ ۹۳ء ص ۴۵

اکبر ایس احمد، پروفیسر — انسانیت کہاں گئی؟ امت مسلمہ آج کہاں ہے؟ — اخبار اردو، اسلام آباد جون ۹۳ء ص ۱۸
اردو ترجمہ: پرتو روہیلہ

انیس ناگی، ڈاکٹر — لاہور جو شہر تھا — اردو نامہ، لاہور فروری ۹۳ء ص ۲۱

خالد دوران/ ترجمہ محمد سہیل — اندلس کے ثقافتی اور سیاسی پہلوؤں کا ازسر نو جائزہ ۱۴۹۲ سے قبل اور بعد کا اخراج — المعارف، لاہور جنوری ۹۳ء ص ۴۱

خبیر ندوی — اسلامی ثقافت تعمیرات کے آئینے میں — تہذیب الاخلاق، علیگڑھ مارچ ۹۳ء ص ۴۰

خواجہ عبدالحیٔ فاروقی، مولانا — غالب نامہ — الولی، [illegible] سندھ اپریل ۹۳ء ص ۱۶

داؤد اشرف، ڈاکٹر — ٹیپو سلطان — سب رس، کراچی جون ۹۳ء ص ۴

رشید احمد صدیقی، پروفیسر — جینے کا سلیقہ — افکار، کراچی اپریل ۹۳ء ص ۴۷

رشید ملک — انڈالوجی ۹ — وادی سندھ دریافت کی کہانی نمبر (۱) — فنون، لاہور دسمبر ۹۲ء ص ۴۶

ریاض حسین، پروفیسر — ہندو پاک کے مسلمان مورخین کی نصابی کتب اور دو قومی نظریہ — اقبال، لاہور جنوری ۹۳ء ص ۲۹۴

شاہ بلیغ الدین — روشنی، مسند علم — سب رس، کراچی فروری ۹۳ء ص ۲

شاہ معین الدین ہاشمی — معاشرے میں نوجوانوں کی ذمہ داریاں — آگہی، کراچی جون ۹۳ء ص ۱۰۷

ظہور الحسن ناظم سیوہاروی — علم تاریخ — العلم، کراچی مارچ ۹۳ء ص ۶۶

عبدالغنی، ڈاکٹر — کیا مسلم کلچر کوئی چیز نہیں؟ — سیارہ، لاہور سالنامہ جنوری فروری ۹۳ء ص ۱۶۳
ڈاکٹر ابن فرید
بشیر ساجد
نعیم صدیقی

محمد رمضان انور — وادی کشمیر کی فروخت، ایک اہم تاریخی دستاویز — اردو نامہ، لاہور اپریل ۹۳ء ص ۴۰

محمد زبیر مانگٹ ریاست بہاول پور کا استحکام پاکستان میں کردار آگہی، کراچی اپریل ۹۳ء ص ۶۷

تاریخ فن و ادب

آفاق صدیقی، پروفیسر اردو مرثیہ نگاری کا ارتقاء مرزا سودا، میر تقی میر اور ان کے معاصرین آگہی، کراچی جون ۹۳ء ص ۵۶

ابنِ فرید، ڈاکٹر اردو نثر میں دینی خدمات سیارہ، لاہور سالنامہ جنوری فروری ۹۳ء ص ۴۱

انور سدید، ڈاکٹر ۱۹۹۲ء کے اردو ادب کا پاکستانی منظر نامہ صریر، کراچی فروری ۹۳ء ص ۵۹

رام لعل اردو افسانے کی نئی تخلیقی فضا سب رس، کراچی مئی ۹۳ء ص ۶۵

سیّد عبد الباری، ڈاکٹر عصر حاضر میں دعوتی و اصلاحی ادب سیارہ، لاہور سالنامہ جنوری فروری ۹۳ء ص ۴۷

عابد علی خاں انگارے اور اس کے بعد سب رس، کراچی مارچ ۹۳ء ص ۲۷

عبد الرؤف نوشہروی، پروفیسر پشتو زبان و ادب تاریخی جائزہ آگہی، کراچی مارچ ۹۳ء ص ۵۳

غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر ادبیاتِ اردو اور تُرکان عثمانی محفل، لاہور جنوری ۹۳ء ص ۱۴۷

قاضی اعجاز طور گوجرانوالہ ادب ۱۹۹۲ء مفیض گوجرانوالہ جون ۹۳ء ص ۱۹

قیصر تمکین ۱۹۹۲ء میں ادب کا جائزہ ادب لطیف، لاہور مارچ ۹۳ء ص ۱۱

کلثوم ابوالبشر، ڈاکٹر بنگلہ دیش میں اردو ادب کا ارتقاء و بتدریج ترقی ماہ نو لاہور جنوری ۹۳ء ص ۵

محمد احمد سبزواری ۱۹۹۲ء کی افکار فائل پر ایک نظر افکار، کراچی مارچ ۹۳ء ص ۲۴

محمد رضا کاظمی میر انیس کی اقلیم سخن آگہی، کراچی جون ۹۳ء ص ۶۹

ممتاز احمد خاں، ڈاکٹر ۱۹۹۲ء کا افسانوی ادب قومی زبان، کراچی جون ۹۳ء ص ۶۷

علمی ادبی سوانح و تذکرے

ابو عمار زاہد الراشدی مولانا غلام غوث ہزاروی، دینی حمیّت کا پیکر الشریعت، گوجرانوالہ جون ۹۳ء ص ۲۷

ثروت صولت جدید ترکی ادیبہ، سامحہ آئے وردی ماہ نو لاہور مارچ ۹۳ء ص ۵۶

حبیب خاں لوشین، جدید چین کے عظیم ادیب ماہ نو لاہور مئی ۹۳ء ص ۳۸

صابر آفاق، ڈاکٹر محسن احسان شخصیت اور شاعری مفیض گوجرانوالہ جون ۹۳ء ص ۶۰

عتیق صدیقی مرحوم نشاط النساء بیگم حسرت موہانی حیات اور شخصیت نگار پاکستان، کراچی مئی ۹۳ء ص ۴

کنیز بتول عبد الغفور شہباز کی شاعری پر ایک طائرانہ نظر ماہ نو لاہور فروری ۹۳ء ص ۳۸

محمد علی صدیقی، ڈاکٹر ضیاء کینیڈا میں ایک غریب الوطن شاعر افکار، کراچی جون ۹۳ء ص ۳۰

مقصود حسنی ورڈز ورتھ اور اردو کی نئی شاعری ماہ نو لاہور جنوری ۹۳ء ص ۱۵

وفا راشدی، ڈاکٹر اذکار و افکار محفل، لاہور جون ۹۳ء ص ۳۳

وفا راشدی، ڈاکٹر شمس العلماء علامہ ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ، حیات اور خدمات الولی، حیدرآباد سندھ جون ۹۳ء

ص ۲۳

وفا راشدی، ڈاکٹر شاہ عبداللطیف بھٹائی ماہ نو لاہور جون ۹۳ء ص ۳۴

اردو زبان و ادب

اختر ضیائی اردو رسم الخط/مکتوب لندن اخبار اردو، اسلام آباد جون ۹۳ء ص ۱۳

افتخار احمد خواجہ، ڈاکٹر تدریسی زبان اردو کیوں قسط نمبر (۲) اخبار اردو، اسلام آباد جنوری ۹۳ء ص ۹

اے بی اشرف، ڈاکٹر ڈاکٹر شوکت بولو (تمغۂ پاکستان یافتہ ترک) کی اردو خدمات اخبار اردو، اسلام آباد جون ۹۳ء ص ۲۰

اسے تماپوف، پروفیسر
ترجمہ: پروفیسر ریاض صدیقی سابق سوویت یونین میں اردو ادب کا مطالعہ اخبار اردو، اسلام آباد مارچ ۹۳ء ص ۴

جمیل جالبی، ڈاکٹر پاکستان کا دفتری نظام اور اردو اردو نامہ، لاہور جنوری ۹۳ء ص ۱۴

خلیل احمد اردو نامہ ترجمہ کاری اور اصطلاحات سازی اخبار اردو، اسلام آباد جنوری ۹۳ء ص ۱۶

رشید احمد کاکاخیل اردو اور اہلِ سرحد العلم، کراچی مارچ ۹۳ء ص ۹۵

ظہیر صدیقی، پروفیسر اردو کدھر؟ پہلی قسط ہماری زبان، دہلی ۲۲ جون ۹۳ء ص ۱

عبیداللہ بیگ اصطلاحاتِ ماحولیات اخبار اردو، اسلام آباد مارچ ۹۳ء ص ۱۹

عزیز ابن الحسن جامعہ عثمانیہ اور فرہنگ اصطلاحات جامعہ اخبار اردو، اسلام آباد مارچ ۹۳ء ص ۶

عطش درانی، ڈاکٹر اردو دنیا کی بڑی زبان اخبار اردو، اسلام آباد جنوری ۹۳ء ص ۷

عطش درانی، ڈاکٹر اردو میں تعلیم اصطلاحات اخبار اردو، اسلام آباد مارچ ۹۳ء ص ۱۰

عطش درانی، ڈاکٹر اردو میں صحیح الفاظ و اصطلاحات کا جائزہ اخبار اردو، اسلام آباد جون ۹۳ء ص ۱۵

کرین رہپرامان سوئزرلینڈ میں اردو اخبار اردو، اسلام آباد جون ۹۳ء ص ۱۶

محمد اسلام نشتر سقراط اردو کمپیوٹر اخبار اردو، اسلام آباد جنوری ۹۳ء ص ۱۳

محی الدین کٹی کیرالا میں اردو ہماری زبان، دہلی ۲۲ جون ۹۳ء ص ۲

مسعود احمد چیمہ کاروانِ اردو کا سفر اردو نامہ، لاہور جون ۹۳ء ص ۲۷

مصطفیٰ کمال، ڈاکٹر حیدرآباد (دکن) میں اردو کی ترقی (تعلیم اور سرکاری زبان کی حیثیت سے) اخبار اردو اسلام آباد مارچ ۹۳ء ص ۱۶

نعیم حامد علی سعودی عرب میں اردو شعر و ادب قومی زبان، کراچی مارچ ۹۳ء ص ۴۵

زبان، مسائل و مباحث

بشریٰ ثمینہ اردو ہندی جھگڑے کے اسباب ماہ نو لاہور جون ۹۳ء ص ۶۹

عبدالعزیز خالد اصوفی محمد افضل فقیر شیخ سعدی کا نعتیہ قطعہ سیارہ، لاہور سالنامہ جنوری فروری ۹۳ء ص ۱۲۰

فہیم اعظمی، ڈاکٹر قومی زبان کو محدود کرنے کی معصومانہ کوشش صریر، کراچی فروری ۹۳ء ص ۵

قومی زبان

نیشنل بینک میں
رقم اور مُنافع
کا تحفّظ

روپے اور فارن کرنسی کے ڈپازٹس اور پُرکشش شرح منافع پر
حکومتِ پاکستان کی ضمانت ۔ مستعد، ماہرانہ خدمات کے ساتھ
اندرون و بیرون ملک جدید شاخوں کا وسیع سلسلہ ۔

آپ کی خدمت ہمارا افتخار

نیشنل بینک آف پاکستان

اعلیٰ خدمت مکمل تحفظ

ہیڈ آفس ۔ آئی آئی چندریگر روڈ ، کراچی ۔ پاکستان

Telephones 2417989 - 2416781 - 10 lines Ext 405
Fax 2421236 - Telex 23732 NBP PK

مارچ ۹۴ء　　جلد: ۶۶　　شمارہ: ۳

بدل اشتراک

فی پرچہ ——— ۸ روپے

سالانہ عام ڈاک سے ۹۰ روپے

سالانہ رجسٹری سے ۱۶۲ روپے

بیرونِ مُلک

لانہ عام ڈاک سے ۱۰ پونڈ ۱۵ ڈالر

لانہ ہوائی ڈاک سے ۱۵ پونڈ ۲۵ ڈالر

سمن ترقی اُردُو پاکستان

ۂ تحقیق: ڈی ۱۵۹۔ بلاک ۷۔ گلشن اقبال

ی ۷۵۳۰۰۔ فون: ۴۶۱۴۰۶

مضمون نما

قومی زبان (۲) مارچ ۱۹۹۴ء

سرمایہ کاروں کے لئے سنہری موقع!

حبیب بینک کی

یہ اسکیم آپ کے گھریلو بجٹ کو متاثر کئے بغیر اضافی آمدنی کا ایک منفرد موقع فراہم کرتی ہے۔ پینشنروں، بیواؤں، کم اجرت پانے والے کارکنوں، تنخواہ دار اور ریٹائرڈ افراد کے لئے انتہائی مناسب ہے۔

نمایاں خصوصیات

- تمام مقیم و غیر مقیم پاکستانی، غیر ملکی افراد، کمپنیاں، ایسوسی ایشنز، کاروباری اور تاجر حضرات اس اسکیم میں سرمایہ کاری کر سکتے ہیں۔
- کم از کم ۵۰،۰۰۰ ہزار روپے یا دس ہزار پر تقسیم ہونے والی رقم کی سرمایہ کاری کی جا سکتی ہے۔ زیادہ کی کوئی حد نہیں۔ مدت تکمیل تین سال ہے۔
- ۳ سالہ سرمایہ کاری پر ۱۲،۵ فیصد سالانہ منافع کی ادائیگی ماہ بہ ماہ۔

آمدنی کا گوشوارہ

سرمایہ کاری	ماہانہ منافع
۵۰،۰۰۰/- روپے	۵۲۱/- روپے
۱۰۰،۰۰۰/- روپے	۱۰۴۲/- روپے
(ہر اضافی ۱۰۰،۰۰۰/- روپے پر ۱۰۴۲/- روپے ماہانہ منافع)	

- ادائیگی کا طریقہ کار۔ ماہانہ منافع کی رقم کھاتے داروں کی خواہش کے مطابق۔
  (ا) ان کے بینک اکاؤنٹ میں جمع کر دی جائے گی
  (ب) یا اگر وہ چاہیں تو بذات خود حاصل کر سکتے ہیں۔

مزید تفصیلات کے لئے ہماری نزدیکی شاخ سے رجوع کیجئے۔

بہتر خدمت کی روایت

حبیب بینک لمیٹڈ

PID (Islamabad)

قومی زبان (۳) مارچ ۱۹۹۴ء

مارچ کا مہینہ ہماری قومی و ملّی زندگی میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اِسی مہینے میں آج سے تقریباً چوّن برس پہلے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں مسلمانوں کے ایک جلسۂ عام میں حصول پاکستان کی قرار داد، اتفاق رائے سے منظور کی گئی جس کی قیادت و صدارت قائدِ اعظم نے فرمائی تھی۔ اِس لحاظ سے قوم کے لیے یہ ایفائے وعدہ اور خود احتسابی کا مہینہ ہے۔

خود احتسابی کا دائرۂ عمل ہمہ جہت ہے۔ اس کی نوعیت سیاسی بھی ہو سکتی ہے اور اس کا حوالہ تہذیب ثقافت اور زبان و ادب بھی بن سکتا ہے۔ ہم یہاں زبان کے حوالے سے گفتگو کرنا چاہیں گے۔ آپ کو یاد ہے کہ قیام پاکستان کی تحریک چلانے میں جس زبان نے کلیدی کردار ادا کیا ہے اور جسے برصغیر پاک وہند کے اِس سرے سے اُس سرے تک یکساں مقبولیت حاصل تھی وہ زبان اُردو ہے جو اب ۷۳ء کے آئین کی رو سے پاکستان میں قومی زبان کے درجہ پر فائز ہے۔ ۷۳ء کے آئین میں قومی زبان کے سرکاری دفاتر میں نفاذ کا ہدف اگست ۱۹۸۸ء قرار پایا تھا۔ اِس عرصے میں، قومی زبان کے دفتری نفاذ میں کچھ پیش رفت ضرور ہوئی لیکن بہ وجوہ یہ ہدف مکمل نہیں ہوسکا۔ وجہ یہ ہے کہ اربابِ حل و عقد اِس حقیقت کو قبول نہیں کر پائے ہیں کہ قومی اُمنگوں کے اظہار کا تمام تر وسیلہ صرف اور صرف قومی زبان ہے، کوئی درآمد شدہ زبان اِس کا بدل نہیں بن سکتی نہ ہی درآمد شدہ زبان میں دی جانے والی تعلیم قومی زندگی سے اپنا رشتہ استوار کر سکتی ہے۔

جب ۷۳ء کے آئین کی رو سے قومی زبان کے نفاذ کا فیصلہ کیا جا چکا ہے اور اِس سمت میں خاصی پیش رفت ہو چکی ہے پھر اِس مرحلے میں دو ذہن اور پس و پیش کیوں؟ پس و پیش نیت کا ضعف ظاہر کرتا ہے۔

اکیسویں صدی دستک دے رہی ہے۔ اس منزل میں ہمیں یہ عہد کرنا ہے کہ جب ہم اکیسویں صدی میں داخل ہوں تو قومی زبان کے نفاذ کا مسئلہ ادھورا نہ رہے، کیوں کہ سارے قومی مسائل اِسی سے ہم رشتہ ہیں۔

کچھ اردو کے بارے میں

مختار زمن

ایک دفعہ میں نے ایک چھوٹی سی کتاب بچّوں کے لیے لکھی مختلف صوبوں اور طبقوں کے بچوں کو بلایا تاکہ انھیں مسودہ سناؤں اور اُن کے خیال میں جو الفاظ مشکل ہوں اُنھیں نکال دوں کہ وہ کتاب کو آسانی سے پڑھ سکیں۔ جب میں یہ مسودہ ختم کر چکا تو ایک لڑکے نے پوچھا:

"آنکل! یہ جو آپ نے باورچی خانہ لکھا یہ کیا ہوتا ہے؟"

میں نے کہا "تمھاری امّی کھانا پکاتی ہیں؟"

"جی ہاں پکاتی ہیں"

"کہاں؟"

اس نے جھٹ کہا "کچن میں"

یہ بچّہ کراچی کا تھا۔ عمر تقریباً دس برس کی تھی۔ والد حکومت کے ایک اعلیٰ عہدہ دار تھے بڑے بھائی ڈاکٹر تھے۔ وہ اُس طبقے سے تعلق رکھتا ہے کہ "انکل" اور "کچن" تو جانتا ہے کہ دن رات ان سے واسطہ پڑتا رہتا ہے مگر "باورچی خانہ" اُس کے لیے نامانوس لفظ تھا .... یہ اُس بچے کی مثال ہے جہاں صرف نام بدل جاتا ہے۔ لیکن جس شے کا وہ نام ہے وہ شے نہیں بدلتی۔ مگر بعض صورتوں میں نام اور شے دونوں بچوں کی نظر سے غائب ہو جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ وقت کے ساتھ زبان میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ زبانیں بھی اسی طرح بدلتی ہیں جیسے فیشن، لباس، کھانا اور کھانے کے طور طریقے وغیرہ۔ مگر یہ معاملہ اکثر ایسے غیر محسوس طریقے پر ہوتا ہے کہ کبھی کبھی پتہ بھی نہیں چلتا ہم آج وہ نہیں جو ہمارے پردادا تھے اور خود پردادا وہ نہیں رہے تھے جو اُن کے پردادا تھے وغیرہ ...... بوڑھے لوگ اکثر ناک بھوں بھی چڑھاتے ہیں کہ دیکھیے صاحبزادے بالکل بدل گئے۔ ہمارے زمانے میں تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔ مگر کیا کیا جائے "زمانہ" خود تبدیل ہوتا رہتا ہے .... بقول اکبر

کہیں اور کی کیا وہ ہمیں نہ رہے

آج اگر میر تقی میر یا مرزا غالب جیسے اہلِ زبان اور زبان داں بھی کراچی (یا دلّی) آجائیں تو ہمیں بولتے دیکھ کر شاید میر صاحب منہ پھیر لیں کہ جواب جاہلاں باشد خموشی اور میرزا غالب بھی چکرا جائیں اور یہ کہیں کہ .... "ہیں! اے میاں تم کیا کہہ

قومی زبان (۶) مارچ ۱۹۹۴ء

رہے ہو؟ مرف مطلب زبان پر لاؤ۔ یہ فقیر سمجھا نہیں
تبدیلی یعنی تو وقت کا ساتھ دینا ہے۔ وقت کے پیچھے ہم بھی پڑے رہتے ہیں مگر اکثر ترقی بھی یہ کام کرتی ہے۔ جیسے اب چنے بھوننے کے لیے "جھڑبوجے" کی ضرورت نہیں اس لیے کہ بچوں نے یہ لفظ شاید ہی سنا ہو......... میں ایک دفعہ ایک بچی کو سمجھانا چاہتا تھا کہ روئی کیسے دھنکی جاتی ہے تب پنجہ دف بھرنے والے کے پاس گیا کہ وہ اپنی کمانی نکال کر لٹکائے اور تانت بجائے ... وہ بولا ارے صاحب آپ بھی بڑی پرانی بات کرتے ہیں کمان سے تو ابا بھرا کرتے تھے۔ اب تو ہم مشین سے بھرتے ہیں۔ کراچی بھر میں ممکن، مشکل سے ملے گی۔ ہاں دیہات میں ہو تو ہو...... میں نے سوچا اب عظیم بیگ پریم راگی کا (یہ نام بھی کم لوگوں کی یاد ہوگا) یہ گانا بھی ختم ہوگیا "دھنک رے دھنیے اپنی دھن۔ پرائی دھنی کا پاپ نہ پن۔ دھن۔ دھن۔ دھن۔ دھن" وغیرہ۔ روئی دھنکتے ہوئے دھنیے ہی کو دیکھ کر امیر خسرو نے یہ کہا تھا "رفت، رفت، رفت۔ ایں ہم رفت و آں ہم رفت۔ رفتندہ۔ رفتندہ وغیرہ" روئی دھنکنے کی یہ آواز اب بچے نہیں سن سکتے اس لیے انھیں مزہ بھی نہیں آسکتا اور وہ اڑتے ہوئے روئی کے گالے بھی نہیں دیکھ سکتے جو دھنیے کے کان ناک اور بالوں میں چپک جاتے تھے! کرچھا شاید صرف دیہات میں رائج ہے شہروں سے تو اب کھڈیاں غائب ہوتی جا رہی ہیں اس لیے کہ "فلش سسٹم" آگیا ہے۔ "اولتی" اب ٹپکتی نہیں چونکہ چھتوں کی ساخت بدل گئی ہے۔ جوتیاں "پھدڑی" نہیں کی جاتیں اس لیے کہ پھدڑی جوتیوں کا رواج ختم ہوگیا ہے۔ "ڈوئی" اور "دل گھسنی" اب شاذ و نادر استعمال ہوتی ہے۔ "ہنڈیا" بچوں کی پہنچ سے باہر ہے۔ "چکی" کی جگہ مشین لیتی جارہی ہے۔ ایسے الفاظ شاید لغت میں تو مل جائیں گے لیکن بچوں نے بہت سی اشیاء نہیں دیکھیں اور نہ اب ان کے بنانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ وہ اب متروک ہوچکی ہیں۔ اشیا کے متروک ہونے سے نام بھی کم از کم بچوں کے لیے متروک سمجھیے۔ ہاں لغت کی بات اور ہے...... بعض الفاظ دلی کے لال قلعے میں اکثر استعمال ہوتے تھے۔ اب ان کے معنی معلوم کرنے کے لیے لغت دیکھنی پڑتی ہے گو لفظ زبان پر چڑھا ہوا ہے مثلاً "حلوہ مانڈا" "مانڈا" وہ پتلی روٹی ہوتی تھی جس سے اکثر حلوہ ڈھانک دیا جاتا تھا بادشاہ اور امرا "تورہ" بھیجتے تھے جس میں تورے کے علاوہ حلوہ مانڈا بھی ہوتا تھا۔ اب نہ قلعے کی باتیں رہیں، نہ بادشاہ نہ تورہ بندی۔ مگر ساتھ ہی زبان اتنی پھیل چکی ہے کہ دلی، لکھنؤ، حیدرآباد کی اہمیت ختم ہوگئی۔ یہ سب ہندوستان میں رہ گئے ہندوستان میں ہندی کا بول بالا ہے اردو البتہ فلموں کی اور عوام کی زبان ہے مگر لہجہ اور لفظ بدل رہے ہیں اب کراچی اور لاہور اردو کے گڑھ اور مرکزی شہر ہیں۔ اردو پاکستان کی قومی زبان ہے۔ مگر تقسیم کا اثر بھی وسیع اور دیرپا ہے۔ معیار بدل رہا ہے یا بدل چکا ہے۔ ہندوستان میں جو اردو لکھی یا بولی جاتی ہے وہ پاکستان سے قدرے مختلف ہے۔ گو لکھنے والے آج بھی معیار کا خیال رکھتے ہیں لیکن بعض غلطیاں اتنی عام ہوچکی ہیں کہ اب انھیں صحیح کرنا بھی مشکل ہے۔ آپ اکثر پڑھیں گے کہ "فلاں خاتون ہار سنگھار کر کے آئی تھیں" حالانکہ اتنا کہنا کافی تھا کہ "بڑا سنگھار کر کے آئی تھیں"... ہار سنگھار تو ایک درخت ہوتا ہے جس کا سفید پھول اور لال ڈنڈی ہوتی ہے۔ بڑی کثرت سے کھلتا ہے۔ البتہ سولہ سنگھار اور بتیس ابرن محاورے ہیں۔ سنگھار میں سرمہ، مسی، مہندی وغیرہ شامل ہیں۔ ابرن کے معنی زیور کے ہیں مثلاً جھومر، جھانجھن، چمپاکلی وغیرہ۔

جب انگریزوں نے برصغیر پر قبضہ کیا تو انگریزی بھی آئی بڑے لکھنے والوں مثلاً حالؔی و نذیرؔ احمد وغیرہ نے بھی انگریزی کے الفاظ استعمال کیے۔ دراصل اردو ایسی زبان ہے جو دوسری زبانوں کے الفاظ ہمیشہ سے جذب کرتی چلی آئی ہے اور وہ بھی اس طرح کہ "جزو بدنِ اردو" ہوجاتے ہیں۔ جمہوریت ہو یا نہ ہو عوام یہاں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ وہ جس الفاظ کو چاہیں رائج کر دیتے ہیں

قومی زبان (۷) مارچ ۱۹۹۴ء

جسے چاہیں ٹاٹ باہر کر دیتے ہیں کہا جاتا کہ جہانگیر جیسے جلیل القدر بادشاہ نے کوشش کی کہ "نارنگی" کو لوگ "رام رنگی" کہیں۔ مگر اُسے بھی قبول عام کی سند نہ مل سکی۔ نارنگی ہی زبان پر رہی۔ اب پاکستان میں نارنگی اور سنترہ پیچھے چلے گئے۔ موسمبی، فروٹا، مالٹا اور کینو آ گے آ گئے۔ ان میں سے بعض نو ایجاد ہیں۔ ہمارے بڑوں نے "بیبی لس" وغیرہ کو کھپانا چاہا مگر کامیابی نہ ہوئی۔ لیکن ٹرین، روڈ، سگنل، موٹر، لاری، پلاس (پلائرس) وغیرہ رواج پا گئے .... اور اب انگریزی کے بغیر بولنے والوں کا کام ہی نہیں چلتا۔ دکانوں کے بورڈ تک انگریزی میں ہیں اردو کے پھیلانے میں ریڈیو اور ٹیلیوژن کا کردار بڑی کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ یاد دلاتا چلوں کہ یہ دونوں بھی انگریزی کے الفاظ ہیں۔ اردو والے فارسی عربی والوں سے ایک لحاظ سے مختلف ہیں کہ ان کے لیے انگریزی الفاظ کو بدلنے کی ضرورت کم پڑتی ہے۔ "ریڈیو" کو "رادیو" اور "ٹیلیوژن" کو "تلفزیون" کہنے کی کوئی ضرورت نہیں اس لیے کہ ہماری زبان اور ہمارا حلق بہت سے تلفظ اور حروف ادا کر سکتا ہے .... ایک دفعہ مجھے گوادر جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ایک تیسرے درجے کے چائے خانے میں چائے پینے کا موقع ملا۔ لاؤڈ اسپیکر لگا ہوا تھا۔ ریڈیو پر کوئی غزل گائی جا رہی تھی۔ چائے کی پیالی سامنے رکھے ایک مکرانی صاحب غزل کی تال پر طبلہ بجا رہے تھے اور مزہ اڑا رہے تھے۔ گویا ریڈیو وہ کام کر رہا تھا جو انجمن اور ادارے بھی نہیں کر سکتے۔ جب ٹیلیوژن آیا تو ڈراموں نے دھوم مچا دی۔ لیکن دو باتیں یاد رکھنے کی ہیں ریڈیو اور خصوصاً ٹیلیوژن پر خبریں پڑھنے یا لکھنے والوں کو صحیح محاورے استعمال کرنے چاہیں ورنہ وہ بہت سوں کی عاقبت خراب کر سکتے ہیں لوگ انھیں سنتے ہیں اور صحیح سمجھتے ہیں۔ اب دلّی اور لکھنؤ تو گیا۔ ریڈیو اور ٹیلیوژن ہی عوام کے لیے معیار مقرر کرتے ہیں۔ ادیبوں کے لیے تو نہیں مگر عام آدمیوں کے لیے وہ آمنّا و صدقنا کی کیفیت رکھتے ہیں۔ اردو میں کم از کم پاکستان میں علاقائی زبانوں سے بھی بہت سے الفاظ آ گئے ہیں۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ پاکستان کی اردو ہندوستان کی اردو سے مختلف ہوتی جاتی ہے ایسے ہی جیسے ایران کی فارسی اور ہندوستان کی فارسی ...... مگر میر، غالب، اقبال، فیض وغیرہ کو ہم اردو سے نہیں نکال سکتے اس لیے کہ وہ معیار کے مضامین اور اردو ادیبوں اور شاعروں کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں بالکل اس طرح جیسے شکسپیئر اور ملٹن کو انگریزی ادب سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ خواہ زبان میں فرق ہو لیکن انگلستان اور امریکہ، کناڈا اور آسٹریلیا نیوزی لینڈ کے لیے بھی یہ لوگ ہیرو کی حیثیت رکھتے ہیں اور مانے جاتے ہیں .... زبان جب ایک محدود علاقے سے نکل کر پھیلتی ہے تو مقامی اثرات کا قبول کرنا لازمی بات ہے گو لکھتے وقت معیار کا خیال رکھا جاتا ہے لیکن عام آدمی کے لیے یہی اردو، مع اپنے مقامی اثرات کے زبان پر چڑھ جاتی ہے اس سلسلے میں یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اخبارات بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ لوگ ادب نہیں پڑھتے مگر اخبار کثرت سے پڑھتے ہیں۔ صحافت کی زبان اور ادب کی زبان میں فرق ہو تو ہو لیکن دونوں میں حدِ فاصل کچھ دھندلی سی ہے مگر اخبار پھر بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ عوام کے لیے ہیں البتہ ادیب کو ذرا احتیاط کرنی پڑتی ہے۔ اخبار اپنے کو "عوامی" کہہ کر جان چھڑا لے گا۔ ادیب بہر حال ادیب ہے .... مجھے یاد ہے کہ ایک نقّاد نے لندن ٹائمس تک کی غلطیاں بیان کی تھیں اس لیے ادیب و شاعر کو سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے پڑتے ہیں...... "اب انگلش میڈیم اسکول" ہر گلی کوچے میں نظر آنے لگے ہیں۔ فیس لیتے ہیں اتنی کہ سر چکرا جائے۔ اچھے اسکول تو ہر جگہ مہنگے ہیں مگر ساتھ ہی سرکاری اسکول سوائے پاکستان کے کہیں بھی بُرے نہیں۔ انگلش میڈیم اسکولوں کی بڑی بھاری ذمہ داری ہے۔ کیا وہ دو قومیں بنانا چاہتے ہیں؟ کیا وہ انگریزی کو رائج کرنا چاہتے ہیں؟ کیا وہ صرف بڑے اور دولت مند بچوں کی فلاح چاہتے ہیں؟ اگر ان باتوں کا جواب نفی میں ہے تو ذہین بچوں کے لیے وظیفوں کی بھاری رقم فراہم کرنا ہوگی بلکہ اردو کو بھی انگریزی کی طرح اہمیت دینی ہوگی۔ حکومت کا فرض ہے کہ یہ باتیں واضح کر دے اس لیے کہ جمہوریت کے یہی معنی ہیں جمہوریت جمہور

کے لیے ہے۔ چند میروں کے لیے نہیں حکومت، خواہ کوئی بھی ہو اور کسی بھی پارٹی کی ہو۔ وہ تعلیم کی طرف جو توجہ دے رہی ہے وہ ہم سب کو معلوم ہے۔ بچوں کی تعلیم پر حکومت پیسہ خرچ کرتے ہوئے ہچکچاتی ہے، ہزار جھمیلے پیدا کرتی ہے مگر صاحب لوگوں کی موٹروں، ہوائی جہازوں اور سامان تعیش پر خوب خرچ ہوتا ہے۔ اب ان رویوں کو بدلنا ہوگا۔ قومی زبان کو اولیت دینی پڑیگی۔ اس لیے کہ یہ جمہور انگریزی اپنانے اور بولنے سے رہے اور یہ جمہوری دور ہے۔ میرا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ انگریزی کو یک قلم خارج کر دیا جائے۔ انگریزی بین الاقوامی زبان ہے سائنس کی زبان ہے۔ اپنی جگہ اہم اور کلیدی حیثیت رکھتی ہے مگر پاکستانی زبان نہیں بن [illegible] نہیں [illegible] ہے۔ اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ادیبوں، شاعروں اور اہل علم کو بھی اس طرف توجہ دینی چاہیے۔ صرف ادب لکھنے سے کام [illegible] نہیں [illegible] آگے بڑھ کر اپنی بات کرنے کا وقت ہے

یہ بزم مے ہے یہاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

ازراہ کرم مضامین میر اختصار کا خیال رکھیں

قومی زبان میں اعلیٰ تعلیم

مصنف: ڈاکٹر ذکی حسن
مترجم: صابر صدیقی

ایک بحث جو پاکستان میں مستقلاً پھر سے اُبھر رہی ہے۔ وہ قومی زبان کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنانے کا مسئلہ ہے۔ اس کی موافقت اور مخالفت میں ہمیشہ شدید جذبات کار فرما رہے ہیں۔ لہٰذا اس امر کا جائزہ لینا دلچسپی کا باعث ہوگا کہ ریاست حیدر آباد میں اس تجربہ کو کس طرح کامیاب بنایا گیا۔

تعلیم کے تیسرے مرحلے میں مادری زبان کو کام میں لانے کی موافقت میں کئی پُرزور دلائل موجود ہیں۔ ایک اُن میں سے یہ ہے کہ جب گھر، سوسائٹی اور تعلیم گاہ میں اظہار خیال کے لیے متواتر ایک ہی زبان کو کام میں لایا جاتا رہے گا تو شخصیت کی تخلیق کرنے اور اس کی شناخت کے بحران کو روکنے میں مددگار ثابت ہوگی۔ انفرادیت کی تخلیق اُس شخصیت کی تکمیل کے لیے ایک لازمی قدم ہے جو زندگی کے ایک مرحلہ میں رونما ہوتی ہے۔ یہ عنفوانِ شباب کے ابتدائی مرحلہ میں سامنے آتی ہے۔ اور اس کا انطباق اُن دوسرے بہت سے ہنگامہ خیز عوامل کے ساتھ ہوتا ہے۔ جو کسی نوجوان کے کردار میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔

دُوسری پُرزور دلیل جو مادری زبان کو کام میں لانے کی حمایت میں پیش کی جاسکتی ہے۔ وہ معلّمانہ ہے۔ جسے معروف و نامور ماہر تعلیم جناب خواجہ غلام السیّدین نے واضح طور پر اس طرح بیان کیا ہے۔

"میری رائے میں میر عثمان علی خاں کے دور حکومت کا انتہائی مستقل اور پائیدار کارنامہ جامعہ عثمانیہ کا قیام تھا جو برصغیر (پاک و ہند) کی علمی تاریخ میں ایک عظیم الشان یادگار کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک طرف تو یہ علمی میدان میں ایک سنگ میل ثابت ہوا ہے۔ اس لیے کہ جب تک تعلیم مادری زبان میں نہ دی جائے اس وقت تک طلبہ میں غور و فکر کی صلاحیت پیدا کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ سوائے اُن مُستثنیات کے جن میں ماہر اَلسنہ یا ہفت زبان ہونے کی قابلیت ہو۔ باقی تمام لوگوں کو تو اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لیے رٹنا پڑے گا لیکن یہ حقیقی تعلیم نہیں ہوگی۔ حقیقی تعلیم الفاظ پر نہیں علمیت پر، اور حافظہ پر نہیں غور و فکر پر مشتمل ہوتی ہے۔

"اس سے بھی زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ جب تعلیم کسی درآمد شدہ زبان میں دی جاتی ہے تو وہ تعلیم قومی زندگی سے اُس کا رشتہ قائم نہیں کرسکتی اور ایک قومی کلچر تخلیق نہیں پاسکتا۔ ابتدائی تعلیم سطحی اور غیر موثر رہتی ہے۔ اور اعلیٰ تعلیم کا قومی مقصد

در قومی مسائل سے کوئی تعلق قائم نہیں ہوتا اور یہ منتخب افراد ہی پیدا کرسکتی ہے۔ اور بہت سے وہ طلبہ جو ذہین ہوتے ہیں اور جن میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ اپنی ذاتی توانائیوں کو قومی ترقی میں صَرف کرسکیں اپنی اس تعلیم سے فائدہ حاصل نہیں کرسکتے۔

نوع بشر میں ہر طرح کی مساوات کے رجحانات کا مطالبہ ہے کہ تعلیم قومی زبان میں ہونی چاہیے۔ ہر معاشرہ اُس حد تک جانچا

میں سرتیج بہادر سپرو جیسے مقتدر و معروف افراد شامل تھے۔ اور معیار کو غیر معمولی قرار دیا گیا تھا۔

وہ طلباء جو انگلستان اور جرمنی چلے گئے تھے۔ وہاں انتہائی کامیاب ثابت ہوئے اور اُنہوں نے اپنے نصاب اُن اداروں کی روایات کی نسبت کم وقت میں ختم کر لیے تھے۔ ایک طالب علم نے میتھمیٹکس میں بین الاقوامی شہرت پائی۔ اُسے آئنسٹائن نے بے حد سراہا تھا......... وہ صاحب ڈاکٹر رضی الدین صدیقی تھے طلباء کے بلا روک ٹوک داخلہ لینے کی جامعہ عثمانیہ کی جانب سے حوصلہ افزائی ہونے کی وجہ سے انہیں حیدر آباد کی سوسائٹی میں زندگی کے ہر شعبہ میں اثر و نفوذ حاصل ہوا۔ انتہائی اہم اور نتیجہ خیز بات یہ تھی کہ طلباء کی ایک بڑی تعداد جنہوں نے جامعہ میں داخلے لیے تھے بالآخر حکومت کے مختلف شعبوں میں جذب ہو گئی یوں سوسائٹی یکلخت تعلیم یافتہ افراد پر مشتمل ہو گئی جو اتنی تعلیم یافتہ کبھی نہ ہوئی ہوتی۔ ہدایات کی زبان انگریزی ہی رہی بعینہٖ اس صورت میں جیسی کہ حالت بقیہ سارے برصغیر میں تھی۔

ریاست حیدر آباد برصغیر کا ایک پسماندہ علاقہ تھا جہاں اعلیٰ تعلیم کا حصول بیشتر نوجوانوں کے لیے ممکن نہ ہوا ہوتا اگر اُنہیں اُن کی اپنی مادری زبان میں سکھایا پڑھایا نہ جاتا۔ مزید برآں ایک حقیقت یہ بھی تھی کہ جامعہ عثمانیہ میں فیسیں کم سے کم رکھی جاتیں اور بڑی تعداد میں طلبا کو فری شپس اور اسکالرشپس کی سہولتیں بھی فراہم کی جاتی تھیں۔

اب اس اعلیٰ وارفع قابلِ قدر اور نامور تعلیمی ادارے کی تاریخی حیثیت اُس کی تکمیل اور نشوونما کی جدوجہد کے بارے میں کچھ بتانا دلچسپی کا باعث ہوگا کہ نظام حیدر آباد میر عثمان علی خاں نے جامعہ عثمانیہ کے قیام میں ذاتی طور پر بے حد دلچسپی لی تھی۔ دسمبر ۱۹۱۷ء مین کلکتہ میں منعقدہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں سر اکبر حیدری نے قومی زبان میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کی اہمیت اُجاگر کرتے ہوئے کہا تھا۔ "اردو زبان کا دامن اتنا کشادہ ہے کہ اُس میں ہر قسم کی علمیت کو ذہن نشین کرنے سمجھنے اور اُسے منتقل کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔" دوبارہ پھر ۱۹۲۵ء میں پنجاب یونیورسٹی کے کنووکیشن کے موقع پر انہوں نے بہت بڑے تجربات کا بطور خاص ذکر کیا کہ حیدر آباد نے جامعہ عثمانیہ کی تکمیل کی بھرپور ذمہ داری قبول کر لی تھی اور انہوں نے یہ بات محسوس کی کہ آخر کوئی تو بات تھی جو برصغیر کے دوسرے علاقے بھی اس پر رشک کر رہے تھے۔ اور اس کی ہمسری کے خواہاں تھے۔

بیشتر افراد جنہوں نے اُردو زبان میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کو سراہا اور تعاون کیا ہے اُن میں مولوی عبدالحق، ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور، راج گوپال اچاری، ڈاکٹر پی۔ سی۔ رائے، سرتیج بہادر سپرو حتیٰ کہ گاندھی جی کے نام سرفہرست ہیں۔ انہوں نے اُن تجربات کا خوش دلی کے ساتھ اپنے خطوط اور تقاریر میں ذکر کیا جو جامعہ عثمانیہ نے اپنا لنگر اُٹھا کر انجام دیے تھے۔

ریاست حیدر آباد کی تعلیمی سرگرمیوں کی اپنی ایک علٰحدہ تاریخ ہے اُنیسویں صدی کے وسط میں اعلیٰ تعلیمی اداروں اور اسکولوں کا ایک جال بچھا ہوا تھا۔ جو اُن برطانوی ٹیچرز، اساتذہ کے مشوروں کے مرہونِ منت تھے۔ جو نظام کے ملازم تھے۔ جامعہ عثمانیہ کا منبع ایک ادارہ دارالعلوم کالج تھا جسے بعد میں جامعہ عثمانیہ قرار دیا گیا۔ بیسویں صدی کے پہلے دس برسوں میں کئی مشیروں کی جانب سے یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ کالج کو جامعہ کا درجہ دے دیا جائے جس میں ذریعہ تعلیم اُردو ہو۔

دستیاب شدہ اور قابلِ ذکر خط و کتابت سے اس نوع کے ادارے کے قیام میں حکمرانوں کی دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔ اجلاسوں اور کانفرنسوں کے سلسلے سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ۱۹۱۵ء اور ۱۹۱۶ء میں منعقدہ حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس میں یہ تجاویز اپنے عروج پر تھیں جہاں اس بات کا اعلان کیا گیا تھا کہ ایک جامعہ کا قیام ضرور عمل میں آجائے گا۔ اس کا پہلا مسودہ ۲۶ اپریل ۱۹۱۷ء کو نظام کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا اور پھر جامعہ نے اپنا کام کرنا شروع کر دیا تھا۔

جامعہ عثمانیہ میں شروع کئے جانے والے مضامین میں ہیومینٹیز اور سائنس دونوں شامل تھے۔ پروفیشنل گروپ میں میڈیسن، انجینئرنگ، ایگریکلچر (زراعت) اور ویٹرنری سائنسیز کے مضامین شامل تھے۔ مزید برآں کئی کالجوں کا اس جامعہ سے الحاق ہو گیا جس میں ایک ووکیشنل ٹریننگ کالج بھی شامل تھا۔ جس نے ایم۔ ایڈ کی ڈگریاں دیں۔ ان تمام باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ جامعہ عثمانیہ ایک مکمل، جامع اور باضابطہ یونٹ تھی جو سائنس اور ہیومینٹیز کے بیشتر حصوں کا احاطہ کئے ہوئے تھی۔

جامعہ عثمانیہ سے منسلک تمام افراد کی فہرست فراہم کرنا تو ناممکن ہے البتہ ۱۹۴۰ء اور اس کے بعد جو افراد اس جامعہ سے وابستہ رہ چکے تھے۔ ان میں سے چند کے ناموں کا ذکر یہاں برمحل ہوگا...... شعبہ انگریزی میں پروفیسر حسین علی خاں، تاریخ میں پروفیسر ہارون خاں شیروانی، فلسفے میں خلیفہ عبدالحکیم، سوشیالوجی میں ڈاکٹر جعفر حسن، ریلیجس اسٹڈیز میں مولانا مناظر احسن گیلانی، زبانوں میں ڈاکٹر عبدالحق، اُردو میں ڈاکٹر سید سجاد، فارسی میں ڈاکٹر نظام الدین، اکانومکس میں جناب حبیب الرحمٰن، کیمسٹری میں ڈاکٹر مظفر الدین قریشی، فزکس میں ڈاکٹر وحید الرحمن، باٹنی میں جناب سعید الدین، میتھمیٹکس میں قاضی محمد حسن، قانون میں حسین علی مرزا، جیسی نادر روزگار شخصیتیں تھیں جب کہ رجسٹرار ڈاکٹر سید حسین تھے۔

ایک دلیل جو تیسرے مرحلے کی تعلیم میں قومی زبان کے استعمال کے خلاف پیش کی جاتی رہی ہے وہ ہے قومی زبان میں نصابی کتب کی دستیابی! کیونکہ یورپی زبانوں میں موجود زیادہ تر لٹریچر انگریزی زبان میں دستیاب ہے۔

جامعہ عثمانیہ کے بانی حضرات اس امر سے بخوبی واقف تھے اور اسی لیے حکومت اور نظام حیدر آباد کو پیش کی گئی سمری کے ایک اپنڈکس میں اسے شامل کر لیا گیا تھا۔ جس میں ایک دارالترجمہ (ٹرانسلیشن بیورو) کے قیام کی اجازت دینے کی درخواست کی گئی تھی۔ جو یورپی زبانوں سے تمام ضروری مواد کا ترجمہ کرنے اور نئی جامعہ میں تعلیم کے مقصد کی خاطر اس کی اشاعت کے فرائض بھی احسن طور پر انجام دے سکے۔

جوں جوں وقت گذرتا گیا یہ دارالترجمہ اپنی ذات میں خود ایک مکمل ادارے کی حیثیت اختیار کرتا گیا کیونکہ اس نے برصغیر کے کچھ انتہائی معروف و نامور شخصیتوں کی توجہ اپنی جانب مرکوز کرالی تھی جنھوں نے ان تمام ضروری کتب کے تراجم کرنے میں اپنا سارا وقت صرف کیا اور انھوں نے انگریزی زبان کے ذخیرے سے اُردو کو بطور ایک زبان مالا مال کر دینے کے لیے فنی اصطلاحات سے بہت کچھ مدد لی اور رہبری حاصل کی۔ جس سے اُردو کو بہت فائدہ پہنچا۔ بعض اوقات ریاست سے باہر کے ماہرین کے صلاح و مشورے بھی قبول کیے گئے۔ درحقیقت یہ مسئلہ دارالترجمہ کی ایک قومی مہم بن گیا تھا۔

جامعہ عثمانیہ کی یہ بہت مختصر سی تاریخ اپنے اختتام کو پہنچی۔ جس نے ۱۲ جنوری ۹۴ء کو اپنی پلاٹینم جوبلی منائی ہے۔ اور جو کامیاب و مکمل تجربے کی نمائندگی کرتی ہے۔ جس نے توقعات سے کہیں زیادہ اپنی کامیابیاں ثابت کر دی ہیں اور تمام تر مشکلات و مصائب کے خلاف عزم و ارادے کی ایک عظیم مثال پیش کی ہے۔ اس منصوبے نے تیسرے مرحلے کی ایجوکیشن میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے قومی زبان کا بڑی کامیابی سے استعمال کیا تھا۔ وہ لوگ جو پاکستان میں قومی زبان اس مقصد کی خاطر استعمال کرنے کے حق میں ہیں وہ جامعہ عثمانیہ کی جانب سے کئے جانے والے اقدامات کی گھمبیر افادیت سے ضرور آگاہ ہوں گے۔

دارالترجمہ کی تخلیقات میں کتابوں کی فہرست لغات اور مصطلحات کی فہرست کی شکل میں دستیاب ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اُن میں سے بعض فرسودہ قرار پائیں لیکن دوسری اور کتب خاص طور پر کلاسکس، اب بھی سُود مند ہیں۔

قومی زبان (۱۳) مارچ ۱۹۹۴ء

بابائے اُردو...... اور ...... جدوجہدِ اُردو
(۱۹۴۴ء)

ڈاکٹر محمد ظفیر الحسن

علم وادب والوں کے لیے یہ پُر آشوب وقت تھا پھر بھی اہلِ اردو انہماک سے اپنے کام میں مشغول رہے۔ کئی اردو کانفرنسیں اور مشاعرے ہوئے۔ انجمن ترقی اردو کی بعض نئی شاخیں کھولی گئیں۔ مثلاً سی۔پی، بنگلور۔ لاہور وغیرہ میں ڈاکٹر مولوی عبد الحق صاحب کی موجودگی میں ان کی ہدایت کے مطابق کئی صوبائی شاخیں قائم کی گئیں۔

ہندوستان میں جابجا مختلف اوقات میں یوم اقبال کی تقریبات، اردو کی مقبولیت اور علامہ اقبال کی ہر دلعزیزی کا ایک دلچسپ ثبوت ہے

دہلی میں آل انڈیا سائنس کانگریس کا ۵ جنوری کو سالانہ جلسہ تھا۔ بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبد الحق صاحب نے اردو داں سائنس والوں سے ملاقات کی اور سائنس پر کتابیں تالیف کرانے کے متعلق گفتگو کرنے کے بعد پروگرام مرتب ہوا (۱)

مولوی عبد الحق صاحب نے ۸ جنوری ۱۹۴۴ء کو ڈاکٹر مظفر الدین قریشی صاحب اور آفتاب حسن صاحب (ارکان سائنس کمیٹی) سے ہندوستانی کمیٹی (بہار گورنمنٹ) کی مجوزہ اصطلاحات پر گفتگو اور بحث کی۔ (۲)

انھوں نے ایک خط مورخہ ۲۳ دسمبر ۱۹۴۳ء بنام مولانا غلام رسول مہر صاحب میں تحریر فرمایا کہ "انجمن کی تیسری کل ہند اردو کانفرنس کا اجلاس ۱۹، ۲۰، ۲۱، جنوری ۱۹۹۴ء کو ناگپور میں ہوگا۔ اس کے لیے خاص انتظامات کیے گئے ہیں۔ بہت بڑا اجتماع ہوگا۔ بیس پچیس ہزار کا۔ بہت ضروری اور اہم تجاویز پیش ہوں گی۔ آپ کی شرکت بہت ضروری بلکہ لازمی ہے۔ کبھی تو آپ ہمارے جلسوں میں شرکت فرمائیے۔ آپ کے مشوروں سے ہمیں حقیقی فائدہ ہوگا۔ دعوت بھیجتا ہوں یہ درخواست ہے اور امید ہے کہ آپ میری درخواست رد نہ فرمائیں گے۔

مولانا غلام رسول مہر صاحب نے ضروری مشغولیتوں نیز خانگی مصروفیتوں کی وجہ سے معذرت کرلی۔ (۴)

ناگپور میں تیسری کل ہند کانفرنس مقررہ تاریخ پر منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر مولوی عبد الحق صاحب (انجمن کے آنریری سکریٹری) نے اپنی سالانہ رپورٹ میں کہا کہ ناگپور ہی وہ مقام ہے جہاں ۱۹۳۶ء میں بھارتیہ ساہتیہ پریشد کا وہ جلسہ ہوا جس نے اردو والوں کو ری نیند سے جگا دیا۔

بابائے اردو نے انجمن ترقی اردو کی بعض تازہ مساعی کا ذکر کیا۔ پنجاب یونیورسٹی کے اردو کے امتحانات کے لیے دہلی میں دو کالج قائم کیا گیا۔

یو۔پی میں اینگلو انڈین جماعت کو ترغیب دی گئی کہ ان کے مدارس میں اردو دوسری لازمی زبان ہو۔ بریلی اور آگرہ کے کالجوں میں اردو انجمن کی جماعتیں کھل گئیں۔ رانچی میں ایک اردو مرکز قائم کیا گیا وہاں کے عیسائی مدارس میں اردو شوق سے پڑھی جانے لگی۔ چھوٹا ناگپور میں آدی باسی مہا سبھا نے اپنے اسکول میں اردو کی تعلیم لازمی کر دی۔ ریورنڈ سمارٹ کو پچاس روپیہ مہینہ پر سہیل عظیم آبادی نے عیسائیوں میں اردو کی ترویج کی لیے رضامند کیا۔ اردو مرکز کے لیے زمین تحفتاً حاصل کی گئی۔ عیسائی بچوں کو اردو سکھانے اور انعام دینے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ اردو اسکولوں کی تعداد بڑھائی گئی۔ اس کے بعد سہیل عظیم آبادی سنتھال پرگنہ میں اردو کے قیام اور مرکز قائم کرنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ لیکن ان سب کے لیے روپے کی ضرورت تھی۔ بہت مجبور ہو کر انھوں نے بابائے اردو کو لکھا۔ مگر جواب حوصلہ شکن تھا۔ ۱۹ اپریل ۱۹۴۴ء کے خط میں لکھتے ہیں۔

"آپ جو دو سو روپیہ صوبہ سنتھال کے مدرسوں پر صرف کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کہاں سے آئیں گے۔؟ انجمن یہ رقم کسی حال میں نہیں دے سکتی۔ جنگ نے تمام خراب کر رکھا ہے۔ اس کی وجہ سے اخراجات بہت بڑھ گئے ہیں۔ اس سال کا بجٹ بنایا تو معلوم ہوا اخراجات آمدنی سے بڑھے ہوئے ہیں۔" (۴)

۱۹ جنوری ۱۹۴۴ء ۵ بجے شام کل ہند انجمن ترقی اردو کانفرنس ناگپور کے پنڈال (اردو پارک) میں منعقد ہوئی۔ حاضرین جلسہ کی تعداد تقریباً ۲۵۰ تھی۔ جلسہ کی صدارت بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب معتمد اعزازی انجمن ترقی اردو دہلی نے کی۔

جلسہ میں طے پایا کہ صوبہ میں انجمن ترقی اردو کی تشکیل کی جائے چنانچہ نواب صدیق علی خاں صاحب کا نام صدارت کے لیے اور عبدالسلام فاروقی صاحب کا نام سکریٹری کے لیے اتفاق رائے سے منظور ہوا۔ کئی تجویزیں بھی منظور ہوئیں ان میں ایک اہم تجویز یہ تھی۔

"کل ہند اردو کانفرنس کا یہ اجلاس حکومت صوبہ بہار اور پٹنہ یونیورسٹی کے اس طرز عمل کے خلاف جو ہندستانی کے پردے میں اس نام سے ایک مصنوعی، نامانوس زبان کو رائج کرنے کی کوشش پر مبنی ہے اپنی بیزاری کا اعلان کرتا ہے کانفرنس کی رائے میں اس قسم کا اقدام ملک و قوم کے لیے سخت مضر ثابت ہوگا۔ (۵)

۴ فروری ۴۴ء کو انجمن ترقی اردو ہزاری باغ اور شیخ پورہ، مونگیر (بہار) نے احتجاج بلند کیا کہ صوبہ بہار کی انجمن ترقی اردو کے متفقہ مطالبے کے باوجود حکومت بہار نے ہندستانی سے متعلق اپنی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اور یہ اب تک مدارس میں ذریعہ تعلیم بنی ہوئی ہے۔ جلسے میں ہز اکسیلنسی گورنر بہار سے درخواست کی گئی کہ وہ اس مسئلے کی طرف ذاتی توجہ فرمائیں، اور اردو بولنے والوں کے لیے اردو ہی ذریعہ تعلیم قرار دینے کا حکم جاری کریں۔

چنانچہ بابائے اردو ۵ فروری کو دہلی سے پٹنہ تشریف لائے اور ہندستانی کمیٹی (بہار گورنمنٹ) کے اجلاس پٹنہ میں شریک ہوئے۔ ہندستانی ڈکشنری کا کچھ حصہ پیش کیا۔ نیز بزم ادب پٹنہ کالج کے سالانہ جلسے میں اردو کے موضوع پر تقریر کی۔ (۶)

صوبہ بہار میں چند سال سے مدارس میں "ہندستانی" ذریعہ تعلیم کے طور پر رائج تھی ادبی حیثیت سے بھی بڑی حد تک اردو کی جگہ لے رہی تھی۔ حکومت بہار نے ہندستانی کی تشکیل کے لیے "ہندستانی کمیٹی" کے نام سے ایک کمیٹی قائم کی جس کی طرف سے بہت سی درسی کتابیں شائع ہو چکی تھیں۔ اور جو ابتدائی اور ثانوی درجوں میں ۱۹۴۳ء سے داخل نصاب تھیں۔

انجمن ترقی اردو صوبہ بہار نے اس کمیٹی کے کام کی نسبت وقتاً فوقتاً اظہار خیال بھی کیا تھا لیکن کوئی قطعی رائے اس امر کے بارے میں قائم نہیں کی تھی کہ اس صوبے کے اردو بولنے والے "ہندستانی" کو قبول کریں یا اُس پر اصرار کریں کہ اردو بولنے

الوں کے لیے اردو ہی کو ذریعہ تعلیم قرار دیا جائے۔ بہار اردو کانفرنس کے انعقاد کی غرض یہ تھی کہ یہ مسئلہ اور اردو سے متعلق دوسرے مسائل اس صوبے کے سربرآوردہ حامیان اردو، ممتاز ادیبوں اور ادبی اداروں کے نمائندوں کے سامنے پیش کیے جائیں اور کثرت آرا سے جو فیصلہ ہو انجمن ترقی اردو بہار اسے قبول کرے۔ اس کے لیے خاں بہادر نواب سیّد محمد اسمٰعیل، مسٹر محمد یونس، خاں بہادر شاہ محمد یحییٰ، سی آئی ای، مولوی عبدالجلیل ایم ایل اے، خان بہادر نواب شاہ واجد حسین ایم ایل سی، (صدر انجمن) مسٹر محمد شریف بیرسٹر، آنریبل سیّد حسین امام ممبر کاونسل آف اسٹیٹ اور خان بہادر سیّد محمد حفیظ نے اپنے ایک اعلان نامے کا اجرا کیا اور زبان کے مسئلے پر اجتماعی لائحہ عمل کی ضرورت کی جانب پورے صوبے کی توجہ مبذول کروائی۔ تمام حامیان اردو سے کانفرنس میں شریک ہونے اور اسے کامیاب بنانے کی پرزور اپیل کی اور سیاسی عقائد سے قطع نظر تمام صوبے اور بیرون صوبے کے ممتاز حامیان اردو اور حامیان "ہندستانی" سے شرکت کی درخواست کی گئی۔

کانفرنس کا پہلا اجلاس ۲۵ جولائی ۱۹۴۲ء کی صبح کو وھیلر سینٹ ہاوس میں ہوا۔ لیڈی انیس امام سابق صدر انجمن نے کانفرنس کا افتتاح فرمایا۔ راور اپنی پر جوش اور مدلل تقریر میں ہندستانی کی نہایت واضح الفاظ میں مخالفت کی۔

مولوی انیس الحق فخر الدین صاحب صدر مجلس استقبالیہ کی تقریر کے بعد مولانا ظفر علی خاں ایم ایل اے (سنٹرل) نے اپنا خطبۂ صدارت پڑھا اور زبانی تقریر کی۔ نیز انھوں نے تفصیل کے ساتھ ان کوششوں کا ذکر کیا جو مختلف شکلوں میں اردو کو نقصان پہنچانے کے لیے کی جارہی ہیں۔

اس کے بعد ہندستانی کے مسئلے پر اس رپورٹ کا خلاصہ بھی پڑھا گیا جو انجمن ترقی اردو صوبہ بہار کے ایما پر قاضی عبدالودود، سیّد محمود شیر شاہ جعفر حسین اور معتمد انجمن نے مل کر کرلیا۔

مولانا آزاد سبحانی نے اپنی تقریر میں ہندستانی کے مسئلے سے مفصل بحث کی اور اسے کسی شکل میں بھی قبول نہ کرنے کا مشورہ دیا۔

۱۹۳۶ء میں پٹنہ یونیورسٹی نے یہ طے کیا تھا کہ عام طلبہ کے لیے میٹریکولیشن کے امتحان کے واسطے ہندستانی ذریعہ تعلیم ہو۔ چنانچہ انجمن ترقیٔ اردو صوبہ بہار نے ایک عرض داشت وزیر تعلیم کے پاس بھیجی جس میں صاف صاف کہدیا گیا تھا کہ اگر ہندستانی سے متعلق بہار کی سب کمیٹی کی تجویز منظور نہیں کی گئی تو ہندستانی بہار کے حامیان اردو کو قبول نہیں۔ اس صورت میں بہار کے اردو بولنے والوں کے لیے اردو ہی ذریعہ تعلیم بنائی جائے۔ "(۷)

اس امر کا پس منظر یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے اردو کو مسلمانی زبان بنادیا۔ بہار کے گورنر نے شہروں کا دورہ کیا اور اردو کے خلاف دھواں دھار لیکچر دیے۔ انگریز عالموں نے ہندستانی زبانوں کی گرامر لکھی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اردو کسی علاقے کی زبان نہیں ہے۔" (۸)

ڈاکٹر تاراچند نے لکھا ہے کہ ہندستان کی چودہ زبانوں میں اردو ہی اکیلی وہ زبان ہے جو "ہندو اور مسلمانوں کی روایتوں کی ترجمانی کرتی ہے۔ اور آئین کی دفعہ ۳۴۷ کے تحت اسے ہر ریاست میں سرکاری زبان کا درجہ ملنا چاہیے۔ (۹)

مسٹر محمد یونس نے اپنے دورِ وزارت میں صوبہ کی بڑی اقلیت کی بے چینی اور اضطراب کو محسوس کرتے ہوئے اور اردو داں کی دشواریوں اور ضرورت کا پورا پورا اندازہ لگاتے ہوئے نہایت عادلانہ اور منصفانہ طرزِ عمل اختیار کیا۔ اور ہندی دیوناگری رسم خط کے دوش بدوش اردو رسم خط کے استعمال کی اجازت دیدی تاکہ ہندستانی کے برابر اردو بھی استعمال کی جاسکے۔ اردو رسم خط کے

استعمال کے متعلق ان کی وزارت نے ایک سرکاری اعلان شائع کیا کہ ۷ جون ۱۹۴۳ء سے تمام عدالتوں اور دفتروں میں اردو تحریر مستقل بنیاد پر جاری کردی جائے۔ (۱۰)

انجمن ترقی اردو شاخ دیوریا کی طرف سے ۲، ۳ اپریل ۴۴ء کو ایک شاندار اجلاس منعقد ہوا۔ جلسہ گاہ کا نام "چمنستان اردو" رکھا گیا تھا۔

کانفرنس کے پہلے اجلاس کی کارروائی ۲ اپریل کو ۹ بجے شروع ہوئی کانفرنس کے افتتاح کے لیے بابائے اردو مدعو تھے لیکن اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے تشریف نہ لاسکے۔ خیر بہوروی کی تحریک پر اجلاس کی صدارت حضرت جگر مراد آبادی نے فرمائی۔ یہ پہلا اتفاق تھا کہ حضرت جگر نے کسی کانفرنس کی صدارت قبول فرمائی ہو۔

۱۲ اپریل ۴۴ء کو انجمن ترقی اردو کراچی کے دفتر میں مجلس استقبالیہ کے عہدہ داروں کا انتخاب عمل میں آیا۔

آنریبل پیر الٰہی بخش صاحب وزیر تعلیم (صدر)

جناب آصف جاہ کارواں ایم اے (سکریٹری)

جناب مرزا عبدالغفور صاحب (معاون سکریٹری)

جناب غلام نبی صاحب اوج اڈیٹر نظام کراچی (پروپیگنڈہ سکریٹری)

جناب واحد الخیری صاحب انچارج دفتر

جناب ایم اے کریم صاحب خزانچی

۱۵ اپریل ۴۴ء کو جناب ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب اور جناب سید صلاح الدین صاحب مہتمم انجمن ترقی اردو کراچی تشریف لائے، اسی روز شام کو انجمن ترقی اردو کراچی کے دفتر میں کارکنان کانفرنس اور دیگر ہمدردان اردو کا ایک مخصوص مشاورتی جلسہ آنریبل پیر الٰہی بخش صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے زبان کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور اپیل کی کہ سندھ میں اردو کو پنجاب کی طرح رائج کیا جائے۔ متفقہ طور پر طے پایا کہ پورے صوبہ سندھ میں اردو کو مقبول عام بنانے کی مہم کا آغاز کیا جائے۔ اور کراچی میں اردو مرکز قائم کیا جائے۔ اس موقع پر جناب پیر سید علی محمد راشدی صاحب اور جناب عثمان علی انصاری انسپکٹر تعلیمات نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

۱۶ اپریل کی شام کو صدر منتخب جناب عبدالرحمٰن صدیقی سندھی ایم اے بیرسٹرایٹ لا ایم ایل اے (بنگال) تشریف لائے کراچی میں اسٹیشن پر آنریبل پیر الٰہی بخش صاحب صدر مجلس استقبالیہ اور دیگر اراکین نے ان کا پرجوش استقبال کیا۔

۱۷ اپریل ۴۴ء ۱۰ بجے دن کو مسلم خواتین ہال میں مجلس مضامین منعقد ہوئی۔ اسی دن ساڑھے چھ بجے شام کو عام اجلاس ہوا۔ جناب ماہر القادری صاحب نے نظم پڑھی۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے کانفرنس کا افتتاح کیا۔ آنریبل پیر الٰہی بخش صاحب نے اپنا خطبۂ استقبالیہ پیش کیا۔ صدر کانفرنس جناب عبدالرحمٰن صدیقی کے خطبے کو حاضرین نے بڑی دلچسپی اور توجہ سے سنا۔ اس اجلاس میں صوبۂ سندھ اور کراچی کے حامیان اور محبانِ اردو نے بڑے جوش و ولولے سے شرکت کی۔ ساڑھے نو بجے رات مشاعرے کی پہلی نشست ہوئی۔

دوسرے روز ساڑھے چھ بجے شام کو کانفرنس کا دوسرا اجلاس منعقد ہوا۔ تجویزوں پر مناسب تقریریں ہوئیں، جناب آصف جا

کاروائی، سکریٹری کانفرنس اور آنریبل جناب پیر الٰہی بخش صاحب صدرِ مجلس استقبالیہ نے جناب عبد الرّحمٰن صدیقی، ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب، شعرائے کرام ودیگر مہمانان وحاضرین مجلس کامناسب پیرایے میں شکریہ ادا کیا۔

ساڑھے نو بجے شب کو مشاعرے کی دوسری نشست جناب محمد اسحٰق صاحب ڈپٹی کلکٹر کراچی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ جناب ماہر القادری۔ خمار بارہ بنکوی اور ظریف دہلوی کے علاوہ مقامی شعرا نے بھی اپنے کلام سے محظوظ کیا۔

حیدر آباد سندھ میں انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم ہوچکی تھی۔ نیز ۱۹ اپریل ۴۴ء کو اس کی طرف سے ایک کتب خانہ اور دار المطالعہ قائم ہونے والا تھا۔ اس کا افتتاح ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کے دستِ مبارک سے ہونا تھا۔ چنانچہ وہ ۹ اپریل کی صبح حیدر آباد تشریف لے آئے تھے۔ بابائے اردو کی خدمت میں ایک "سپاس نامہ" پیش کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے "سپاس نامہ" کا مناسب لفظوں میں جواب دیا اور انجمن ترقی اردو۔ حیدر آباد اور باشندگان حیدر آباد کا شکریہ ادا کیا۔ اس انجمن کے سرگرم کارکن جناب سیّد علی اکبر شاہ اور سکریٹری جناب ریاض الدّین احمد تھے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے جامعہ عربیہ حیدر آباد سندھ کے سالانہ جلسہ میں بھی شرکت فرمائی اور انتظامیہ سے درخواست کی کہ اردو کو بھی لازمی مضمون کے طور پر جامعہ میں داخل کریں۔

۱۰ اپریل کو صبح ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کراچی واپس تشریف لے آئے۔ پھر ۱۴ اپریل ۴۴ء کو لاڑکانہ تشریف لے گئے۔ وہاں جناب قاضی فضل اللہ صاحب کے یہاں اُن کا قیام رہا۔

۱۶ اپریل کی صبح بابائے اردو تشریف سکھر لے گئے اور وہاں سے بذریعہ موٹر خیرپور آئے، شام کو بابائے اردو پھر سکھر تشریف لے گئے۔ اور اسی روز لاہور کے لیے روانہ ہوگئے۔

جناب پروفیسر نجیب اشرف ندوی صاحب آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو، بمبئی کی دعوت پر ۲۲ اکتوبر ۴۴ء کو انجمن اسلامیہ ہال بمبئی میں اردو کے حامیوں کا ایک جلسہ منعقد ہوا۔ جناب سیّد عبداللہ بریلوی نے صدارت فرمائی۔

اس انجمن نے اپنے قیام کے ایک مہینے بعد ہی انجمن ترقی اردو کے پہلے سکریٹری مولانا شبلی مرحوم کی یادگار منائی۔ کچھ دنوں بعد ہی ایک اور قابلِ ذکر اجتماع ہوا۔ جس میں ڈاکٹر تاراچند صاحب (الہ آباد یونیورسٹی) نے "اردو، ہندی، ہندستانی" کے موضوع پر بڑی عالمانہ تقریر کی۔

تیسرا جلسہ "اردو، ہندی" کے جھگڑے پر مولانا سیّد سلیمان ندوی صاحب کی تقریر سننے کے لیے کیا گیا۔ یہ تینوں جلسے ہر حیثیت سے کامیاب رہے۔ ان جلسوں کی کامیابی سے شہر بمبئی کی انجمن کی شہرت بڑھی اور وہاں کے کارکنوں کے حوصلے اور بھی بڑھ گئے۔ اور فیصلہ یہ ہوا کہ شہر بمبئی میں اعلیٰ پیمانے پر ایک اردو کانفرنس منعقد کی جائے۔ اس کا اعلان بھی ہوا۔ بابائے اردو جناب ڈاکٹر مولوی عبدالحق آنریری سکریٹری، انجمن ترقی اردو (ہند) سے اس کی صدارت کی درخواست کی گئی۔ جسے ڈاکٹر صاحب موصوف نے خندہ پیشانی سے قبول فرمایا لیکن کانفرنس کی تاریخ مقرر ہونے کے باوجود ملتوی ہوگئی۔ بعد ازاں یہ مجوزہ کانفرنس ۲۳، ۲۴، ۲۵ فروری ۱۹۴۵ء کو بمبئی میں شایانِ شان طور پر منعقد ہوئی۔

اس کانفرنس کے انتظام کے لیے ایک مضبوط اور سرگرم مجلس استقبالیہ بنائی گئی۔ جناب آصف فیض صاحب پرنسپل گورنمنٹ لاکالج بمبئی صدر منتخب ہوئے اور جناب شہاب دیسنوی، پرنسپل صابو صدیقی انسٹی ٹیوٹ بمبئی، سکریٹری کے عہدہ پر ہوئے۔

بمبئی کے اردو نواز طبقوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ وہاں کے جملہ اردو اخبارات نے اس کی تائید میں مضامین اور مقالے لکھے۔ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبد الحق صاحب کے کارناموں سے اہلِ بمبئی کو روشناس کرایا گیا۔ یہاں تک کہ ۲۳ فروری ۱۹۴۴ کو بمبئی کے جملہ اردو اخبارات نے اردو کانفرنس کے نام سے ایک خاص ایڈیشن شائع کیا۔

اس کانفرنس نے اس حقیقت کو ظاہر کر دیا کہ اردو کسی خاص علاقے یا صوبے اور کسی مخصوص قوم و ملت کی زبان نہیں ہے بلکہ ہندستان کی مقبول عوام اور مشترک زبان ہے۔

۱۹ نومبر ۱۹۴۴ء کو ایجرٹن پارک، پشاور میں "یوم اردو" کا جلسہ منعقد ہوا۔ علامہ شمس العلما تاجور نجیب آبادی نے صدارت میں فرمایا کہ میں سرحد والوں کی ادب پروری اور اردو نوازی کا مداح اس لیے ہوں کہ وہ ایسے ماحول میں بھی "اردو" بھولے نہیں، جب کہ ہر طرف بے چینی کا دور دورہ ہے۔ توصیفی کلمات میں "اردو سبھا" پشاور کے اراکین کی خدمات کا ذکر کر کے کہا کہ وہ اپنے آرام و آسائش کا خیال نہ کرتے ہوئے "اردو" کی خدمت میں منہمک ہیں۔ اور "بادِ مخالف" کے آگے سینہ سپر ہیں۔ اس جد و جہد سے کہ اردو قومی زبان ہے۔ جسے ہر ہندستانی محبت کی نظر سے دیکھتا ہے۔

علامہ ممدوح نے فرمایا کہ آج ہندستان کی کوئی ایسی درس گاہ نہیں جہاں اُردو بہ طور ثانوی زبان کے شریک درس نہ ہو۔ نظام آباد دکن عثمانیہ یونیورسٹی میں اُردو کو تمام زبانوں پر فوقیت حاصل ہے۔ وہاں کا ذریعہ تعلیم اُردو زبان ہے اور اردو اس کے علمی شعبے پر چھائی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ ہندستان کی ہر درس گاہ میں اردو کا چرچا ہے۔ کوئی درس گاہ ایسی نہیں جہاں بزمِ اردو کا قیام عمل میں نہ آیا ہو۔ آخر میں علامہ تاجور صاحب نے اجتماع سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اردو چھ سات صدیوں کی نشو و نما کے بعد اب اس منزل پر پہنچ گئی ہے کہ اسے کوئی طاقت مٹا نہیں سکتی کیوں کہ اس کی بنیادیں مستحکم اور اس کا عرش ادب غیر فانی شکل ہے۔

پنجاب میں میاں بشیر احمد صاحب بیرسٹر ایٹ لا۔ مدیر "ہمایوں" کی تحریک پر انجمن اردو پنجاب قائم ہوئی۔ پنڈت موہن دتا تریا کیفی اس انجمن کے صدر اور میاں بشیر احمد سکریٹری مقرر ہوئے۔ انجمن کا کام تسلی بخش طور پر انجام نہیں پا رہا تھا۔ چنانچہ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبد الحق صاحب نے اپنے گرامی نامہ مورخہ ۱۴ دسمبر کو اپنی لاہور آمد کی اطلاع میاں صاحب کو دی تاکہ وہاں پہنچ کر انجمن اردو کی تنظیم نو کی جائے۔ ۲۱ اور ۲۲ دسمبر ۱۹۴۴ء کو اس پر غور و خوض ہوا۔

میاں صاحب کی کوٹھی "المنظر" لاہور میں مختلف ادبی ضلع کے ادبا اور صاحبان علم مل بیٹھے۔ اخباری نمائندے بھی ان میں شریک ہوئے۔

بابائے اردو نے اپنی تقریر میں انجمن ترقی اردو پنجاب کی تنظیم نو کی وجہ اور ضرورت بیان کی اور اظہارِ خیال کیا کہ "جد اردو کے لیے میدان میں آ کر اسے عوام کی زبان تسلیم کرائیں۔ (۱۱)

اس کے بعد دو سال کے لیے حسبِ ذیل حضرات انجمن کے عہدہ دار اور مجلس عاملہ کے اراکین منتخب ہوئے۔

صدر: میاں بشیر احمد صاحب بیرسٹر ایٹ لا ایڈیٹر "ہمایوں"

سکریٹری: سید امتیاز علی صاحب تاج مدیر تہذیب نسواں و مالک دار الاشاعت۔ لاہور

مجلس عاملہ کے عہدہ داران:

مولانا ظفر علی خاں صاحب، ڈاکٹر شجاع الدین صاحب، بیرسٹر ایٹ لا مولانا عبد المجید سالک صاحب، خواجہ دل محمد صاحب، خا

مولوی محمد شفیع صاحب، ڈاکٹر سیّد عبد اللہ صاحب مولوی محمد صلاح الدّین احمد صاحب، جناب حمید نظامی صاحب، ڈاکٹر تصدق حسین صاحب، خالد بیر سیٹر ایٹ لا، پروفیسر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، فاطمہ بیگم صاحبہ،

۲۵ اد سمبر کو نظام ہوٹل، انار کلی میں چودھری برکت علی مالک "مکتبہ اردو" نے مولوی صاحب کے اعزاز میں عصرانہ دیا۔ نیز لاہور کے اردو پبلشروں کی طرف سے بھی اسی مقام پر مولوی صاحب کو عصرانہ دیا گیا۔

۳۱ دسمبر ۱۹۴۴ء میں انجمن ترقی اردو (بنگال) کے زیر اہتمام اسلامیہ کالج کلکتہ (موجودہ مولانا آزاد کالج) میں یوم حالی منایا گیا۔ اس جلسہ کی صدارت محترمہ سروجنی نائیڈو نے کی تھی۔ اسی جلسہ میں علامہ رضا علی وحشت کلکتوی نے حالی پر اپنا مقالہ "حالی کا تغزل" پڑھا جو رسالہ "اردو" جنوری ۱۹۴۵ میں شائع ہوا۔ (۱۲)

غرضیکہ بابائے اردو نے جو مثالی اور مجاہدانہ کارنامے اردو زبان کی حمایت و حفاظت اور اصلاح و ترقی کے سلسلے میں انجام دیے ہیں وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔

حواشی

(۱)۔

(۲) سالانہ رپورٹ ۱۹۴۴ء ص ۶۹

(۳) مکاتیب عبد الحق از جلیل قدوائی۔ اردو اکیڈمی سندھ کراچی ص۔ ۲۵۶

(۴) سہیل عظیم آبادی مرتبہ مناظر عاشق ہرگانوی۔ ساہتیہ اکادی نئی دہلی ۱۹۹۲ء ص۔ ۱۹

(۵) "ہماری زبان" دہلی یکم و ۱۶ فروری ۱۹۴۴ء ص۔ ۱۴

(۶) سالانہ رپورٹ۔ ۱۹۴۴ء ص۔ ۶۹

(۷) ماہنامہ۔ ندیم گیا۔ (پہلی بہار اردو کانفرنس) ضمیمہ ماہ اگست (ص الف۔ب)

(۸) یادِ یار مہرباں۔ مصنفہ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی۔ دہلی ص ۱۳۵

(۹) ایضاً ایضاً ص۔ ۱۳۵۔ ۱۳۶

(۱۰) مسٹر محمد یونس کے دورِ وزارت کا ایک عکس۔ مرتبہ اصغر امام فلسفی عظیم آبادی مطبوعہ دی آزاد پریس۔ سبزی باغ۔ پٹنہ ۱۹۸۷ء ص۔ ۳۰۔ ۳۱

(۱۱) "ہماری زبان" دہلی ۱۶ جنوری ۱۹۴۵ء ص۔ (۳،۴)

(۱۲) مغربی بنگال میں اردو زبان اور اس کے مسائل۔ مصنفہ انجمانی شانتی رنجن بھٹاچاریہ مطبوعہ انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دلی ۱۹۸۹ء ص ۶۱

مصنفِ اقبال اور سرگزشتِ الفاظ

احمد دین کی ایک نادر کتاب

ڈاکٹر معین الدین عقیل

احمد دین اپنی تصانیف "سرگزشت الفاظ" اور "اقبال" کی وجہ سے اردو دنیا میں معروف ہوئے، لیکن ان کے علاوہ ان کی تصانیف میں اور متعدد کتب ہیں، جو ان سے یادگار ہیں۔ ان تصانیف میں سے "اقبال" کو اپنے مبسوط مقدمہ اور حواشی کے ساتھ مشفق خواجہ نے مرتب کیا ہے اور ان کے حالات زندگی اور ان کی تصانیف کے بارے میں مفصل معلومات یکجا کی ہیں۔(۱) ان کے مطابق احمد دین نے کم و بیش ۲۵ کتب تصنیف یا تالیف و ترجمہ کیں، جن میں سے ۲۱ کتب مشفق خواجہ کو دستیاب ہوئیں، جب کہ ۴ کتب ان کی رسائی میں نہ آسکیں۔ یہ واقعہ ہے کہ احمد دین اپنے متعدد معاصر مصنفین کی طرح کثیر التصنیف تھے اور یہ بعید از امکان بھی نہیں کہ ان کی ساری تصانیف اب کہیں یکجا دستیاب ہوسکیں۔ اس صورت میں کہ مشاہیر علم و ادب کے حالات اور ان کے علمی و تصنیفی کاموں کی تفصیلات بالعموم معروف و معلوم رہتی ہیں، لیکن پھر بھی ان کی زندگی کے چند گوشے یا ان کے علمی و تصنیفی کام کُلی یا جزوی طور پر بعد میں بھی دستیاب ہوتے رہتے ہیں۔ اس لحاظ سے احمد دین کی کسی ایک یا زائد تصانیف کا بعد میں معلوم یا دستیاب ہوجانا کوئی غیر متوقع امر نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ ان کی کتاب "آئینہ جاپان" بھی اسی ذیل میں آتی ہے، جو کارخانہ پیسہ اخبار لاہور سے ۱۹۰۱ء میں ۲۲×۱۳ س م سائز پر شائع ہوئی تھی۔ یہ جاپان کے بارے میں ایک انگریزی کتاب کا اُن کا کیا ہوا ترجمہ ہے۔ ایک منقش حاشیہ میں سرورق کی ترتیب یہ ہے:

حرکت میں برکت ہے

آئینہ جاپان

یعنی

ملک جاپان کے ہر قسم کے تعلیمی، معاشرتی، ادبی، حرفتی، اخباری / جنگی وغیرہ ترقی کے حالات

مسٹر احمد دین صاحب بی اے ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی اسکول گوجرانولہ / کارخانہ پیسہ اخبار لاہور کے کے لیے

انگریزی سے ترجمہ کیے

پہلی مرتبہ ۱۹۰۱ء میں

مطبع خادم التعلیم پنجاب لاہور باہتمام کار پردازان طبع ہوا قیمت فی جلد ایک روپیہ

مصنف کے نام کے ساتھ ان کا ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی اسکول گوجرانولہ لکھا ہونا اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ وہ ۱۹۰۱ء کے آس پاس گوجرانولہ میں پیشۂ تدریس سے منسلک تھے، جہاں ان کے والد الہ دین بھی بسلسلۂ ملازمت مقیم رہے۔ پیشۂ تدریس سے ان کی وابستگی کی اور کوئی شہادت منظرِ عام پر نہ آئی تھی۔ مشفق خواجہ نے ۱۹۰۱ء کے بعد احمد دین کے ملازمت سے منسلک ہونے کا ذکر اور "ملازم دفتر اردو اخبار" ہونے کا حوالہ دیا ہے (۲) اس بارے میں بہر حال علم نہیں ہوتا کہ وہ دفتر "اردو اخبار" سے کب سے کب تک منسلک رہے (۳) اب یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ احمد دین نے وکالت کے بعد ۱۹۰۱ء کے آس پاس تدریس کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔

یہ کتاب "جامعہ ٹوکیو برائے مطالعات خارجی" (جاپان) کے مرکزی کتاب خانہ کے گوشۂ نوادرات میں محفوظ ہے۔ گوشۂ نوادرات میں، جو متعدد مشرقی و مغربی زبانوں کی قدیم و نایاب و کمیاب کتب و جرائد پر مشتمل ہے، اردو و فارسی و عربی کی قدیم و نایاب کتابیں بھی ایک بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ احمد دین کی تصنیف "اقبال" کی اشاعت ۱۹۲۶ء بھی یہاں موجود ہے۔ اس ذخیرہ میں بیشتر کتابیں اس جامعہ کے شعبۂ اردو کے بانی مبانی اور جاپان کے بابائے اردو پروفیسر ری ایچی گامو (GAMO REIICHI) (۱۹۰۱ء ـ ۱۹۷۷ء) کا عطیہ ہیں۔ اسی ذخیرہ میں جاپان کے حوالہ سے متنوع موضوعات پر اردو میں شائع ہونے والی ایسی متعدد کتابیں بھی موجود ہیں جو اب پاک و ہند کے کتب خانوں میں بھی دستیاب نہیں (۴) جاپان کے حوالہ سے چند کتب کا ایک توضیحی کیٹلاگ اس جامعہ کے شعبہ اردو کے پروفیسر موزو کی تاکیشی نے ترتیب دیا تھا، جو خود ان کی ملکیت میں ہیں (۵) ان ذخائر میں موجود مطبوعات کی فہرستوں میں اندراج نہ ہونے کے باعث بھی احمد دین کی یہ تصنیف معروف نہ ہوسکی۔

کتاب میں کوئی اندرونی سرورق، پیش لفظ اور فہرست عنوانات وغیرہ موجود نہیں۔ مذکورہ سرورق اور متن مکمل ہے۔ کتاب کی پشت پر آدھے آدھے صفحہ میں "پیسہ اخبار لاہور" اور "انتخاب لاجواب" کے اشتہارات شائع ہوئے ہیں۔ سرورق کا دوسرا اور تیسرا صفحہ سادہ ہے۔ صفحہ ۱ سے پہلا باب شروع ہوجاتا ہے۔ کتاب کا کل متن ۱ تا ۱۹۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ جگہ جگہ موضوعات کی وضاحت کے لیے متن میں "پنسل اسکیچ" تصاویر شامل ہیں۔ جن کی تعداد ۳۵ ہے۔ اور صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تصاویر انگریزی کتاب میں شامل تصاویر کا چربہ ہیں۔ یہ کسی طرح معلوم نہیں ہوتا کہ یہ کس انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔ داخلی و خارجی کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی کہ جس سے کتاب یا مصنف کے نام کا پتہ چل سکے۔ کتاب بہر حال انگریز صحافی کی تصنیف لگتی ہے، کیوں کہ مصنف نے جگہ جگہ جاپان اور انگلستان کے ماحول کا سرسری موازنہ کیا ہے۔ اس قدر شہادت بھی ملتی ہے کہ انگریزی تصنیف ۱۹ اپریل ۱۹۰۰ء اور اردو ترجمہ کی اشاعت ۱۹۰۱ء کے درمیانی مختصر مدت میں لکھی گئی اور شائع ہوئی۔ کیوں کہ مذکورہ تاریخ کے حوالہ سے ایک جملہ کتاب کے صفحہ ۱۹۱ پر تحریر ہے۔

کتاب کے موضوعات کا اندازہ فہرست ابواب سے ہوسکتا ہے، جو یہ ہے: جاپانیوں کی خانگی زندگی / جاپانی اخبار نویسی / جاپانی عدالت گستری / جاپانی تعلیم / جاپان بطور ایک مشرقی طاقت کے / جاپانی فنون و حرفت، ٹوکیو کے کاریگروں میں / جاپان کے فنون، صنائع، قدیم و جدید / جاپانی عورت / جاپانی جنگ (تماشے) / دیہاتی جاپان، کوہ آتش فشاں کا منظر / یوشی وارہ، جاپانی زندگی کا ایک ایسا

باب جو معرضِ تحریر میں نہیں آیا/ جاپان، جاپانیوں کے واسطے/ جاپان کی آئندہ حالت۔

یہ ترجمہ زبان کے لحاظ سے خاصہ رواں اور شستہ نثر میں کیا گیا ہے۔ بیشتر مقامات پر یہ گمان نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ ہے۔ نثر بے ساختہ اور اظہار فطری لگتا ہے۔ پھر بھی بعض مقامات پر انگریزی الفاظ یا جاپانی اصطلاحات کے لیے مترجم کو مناسب اردو الفاظ نہ مل سکے، یا خود مترجم کے لیے بعض الفاظ کا تجربہ و تصوّر محدود تھا، اس لیے بھی وہ ان الفاظ کا مناسب ترجمہ نہ کر سکے۔ مثلاً معروف انگریزی لفظ سلاد (SALAD)، جو اب اردو میں بکثرت استعمال ہوتا ہے۔ مترجم کے عہد میں اس کا استعمال عام نہ ہونے کے باعث اس نے اسے "کچے ساگ کا اچار" سمجھا ہے۔ غالباً اسے کچی سبزیوں کے مخصوص جاپانی "اچار" "TSUKEMONO" کے لیے مصنّف کے اختیار کردہ انگریزی لفظ سلاد کا مناسب اردو ترجمہ سمجھا گیا۔ مغربی اقوام کی مرغوب غذا "SPAGHETTI" کے مماثل جاپانیوں میں "UDON" مرغوب ہے۔ یہ ہماری سوئیوں کی طرح میدہ کی قدرے موٹی لڑیاں ہوتی ہیں، جنھیں جاپانی مختلف صورتوں میں کھاتے اور شوربوں میں پیتے ہیں۔ مترجم نے انھیں "تار کا ڈھیر" تحریر کیا ہے۔ انگریزی الفاظ "ILLITERACY" کے لیے لاعلمی؛ "SPIRIT" (مثلاً تعلیمی اسپرٹ، مذہبی اسپرٹ) کے لیے، اثر خاصہ، جوہر استعمال کیے ہیں۔ انگریزی لفظ "INSTITUTION" کے لیے انھیں کوئی موزوں و مکمل ہم معنی لفظ اردو میں نہ مل سکا، چنانچہ انھوں نے اسی انگریزی لفظ کو استعمال کرنا مناسب سمجھا اور اس موضوع پر ایک مختصر حاشیہ میں اپنی رائے دی ہے۔ بعض مقامات پر واحد سے جمع بنانے کا انداز بھی محلِ نظر لگتا ہے۔ جیسے عورت کے بجائے عورات، جو اُس عہد میں مروج تھا، لیکن مترجم نے توپ کی جمع اثواب اور جہاز کی جمع جہازات لکھی ہیں۔ ان امور سے قطع نظر زبان اور بیان کو مجموعی طور پر سلیس اور شگفتہ کہا جاسکتا ہے۔ یہاں بطور وضاحت چند نمائندہ اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں:

"یہاں تک تو جاپانی کھانا عمدہ اور معقول ہے۔ مگر ایک شے تقسیم کرنے پر اکثر اجنبی بس کرو بس کرو کہنے لگتے ہیں۔ ایک تار کے ڈھیر پر سفید اور پیازی لقمے دکھائی دیتے ہیں جن کے ہمراہ بہت چھوٹی سالاڈ (کچے ساگ کا اچار) اور موہنی صورت چٹنی ہوتی ہے۔ یہ کچی مچھلیاں ہوتی ہیں جن کی صورت تو نہایت عمدہ اور دل فریب ہوتی ہے لیکن وہ ازحد بے مزہ ہوتی ہیں۔ ان کے بعد کئی قسم کے کیک (چپاتیاں) چائے آتی ہے۔ اور سب سے آخر جب تم علیحدہ ہونا چاہو تو چاول مانگ کر جتا سکتے ہو۔"

ص ۸-۹

"نقاش نے ہم کو بتایا کہ پرانا سنہری لیکر نہایت قیمتی ہوتا ہے کیونکہ مناسب و کار آمد سطح حاصل کرنے کے واسطے سونے کی بہت سی مقدار حاصل کرنی پڑتی ہے۔ اس نے ہم کو سنہری لیکر کے چیری کے پھول اور درختوں کے عجیب و غریب نمونے دکھائے اور کہا "اس صندوق کی قیمت جو میں نے ابھی ختم کیا ہے تین سو ڈالر ہے۔ اور یہ آٹھ ماہ سے بنتا رہا ہے۔ اگر میں اس کو اسی طریقہ سے بناتا جیسا کہ پرانا لیکر بنایا جاتا ہے تو اس کی لاگت چھ سو ڈالر ہوتی۔ لیکن پھر اس کا کوئی گاہک نہ ہوتا۔"

ص ۷۷

"صبح کے آٹھ بجے پر چند منٹ گزرنے کے بعد یکایک نہایت خوفناک شور ہوا۔ تب ایک منٹ میں بیشتر اس کے کہ آدمی ایک چو (۱۲۰ گز) دوڑ سکے آدھی رات سے زیادہ تاریکی چھا گئی۔ اور نابینا کردینے والے گرم خاکستر اور ریگ گرنی شروع ہوئی اور شور کے ساتھ ہی ایسا ہولناک بھونچال آیا کہ ان میں سے اکثر زمین میں گر پڑے اور حیوانوں کی طرح چاروں ہاتھ پاؤں کے بل چلنے لگے اور زمین کی سطح میں سطحِ بحر کا سا تموج پیدا ہوگیا۔ دھماکہ پر دھماکہ سنائی دینے لگا۔"

ص ۱۴۰

حواشی

(۱) مطبوعہ: انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۷۹ء

(۲) ص ۲۷

(۳) "اردو اخبار" کے بارے میں یہ مزید اطلاع ملتی ہے کہ یہ اخبار ۱۹۰۳ء میں "فیض عام پریس" لاہور سے شائع ہونا شروع ہوا اور ۱۹۰۵ء میں خود اپنے مطبع "اردو اخبار پریس" سے چھپنے لگا۔ یہ ہفت روزہ تھا ابتداء میں اس کی اشاعت ۷۰۰ تھی، جو ۱۹۰۵ء میں بڑھ کر دو ہزار ہو گئی۔ اس کے مالک اور طابع منشی رام اگروال تھے، جن کا پٹیالہ سے تعلق تھا لیکن لاہور میں منتقل ہو گئے تھے۔ ۱۹۰۳ء میں ان کی عمر ۳۶ برس تھی۔ "فیض عام پریس" کے مالک کا نام عمر دین تھا۔ ۱۹۰۳ء میں "اردو اخبار" کے مدیر لالہ دیا رام عاکف تھے، جن کی عمر ۱۹۰۳ء میں ۵۰ سال تھی۔ ۱۹۰۵ء میں اس کے مدیر سندر داس راجپوت ہو گئے۔ جن کی عمر اس وقت ۲۸ برس تھی۔ احمد دین کا نام اس اخبار کی ادارت میں شامل نہیں رہا۔ سرکاری رپورٹ میں اسے ایک "عام سا غیر اہم اخبار" قرار دیا گیا ہے۔..... بحوالہ این جی بیریئر (GBARRIER_N) اور پی ویلیس (WALLACE_P)، ....
"THEPUNJABPRESS"، "۱۸۸۰ء - ۱۹۰۵ء (مشی گن، ۱۹۷۰)"

ص ۱۵۰

(۴) اسی طرح کا ایک ذخیرہ جاپان میں "جامعہ اوساکا برائے مطالعات خارجی" کے مرکزی کتب خانہ اور خصوصاً ذخیرہ پروفیسر سوا اے ایزو (متوفی ۱۹۷۸ء) .... میں بھی موجود ہے۔ ان دونوں کتب خانوں کے ذخیرہ کاموں اور ذخیرہ سوا میں موجود مطبوعات کی فہرستیں علی الترتیب ۱۹۸۱ء اور ۱۹۸۴ء میں شائع ہو چکی ہیں۔

(۵)(۳۴) "AREA AND CULTURE STUDIES" (ٹوکیو، ۱۹۸۴ء)، اس فہرست میں درج سب سے قدیم کتاب منشی محبوب عالم کی "جاپان اور جاپانی" ہے، جو کارخانہ پیسہ اخبار لاہور سے ۱۸۹۰ء میں شائع ہوئی۔

وہ گھر خالی ہے جس میں روح پرور "ہمدرد چائے" کی مہک نہ ہو!

مقدس سرزمین پاکستان میں روئیدہ نباتات "ہمدرد چائے" کی جان ہیں۔ ذہن رسا کی بیداری، فکر کی توانائی اور جسم کی جولانی کے لیے رُوح پرور ہمدرد چائے درآمدہ چائے کی جگہ چنیدہ نباتات، فطرت سے ہم آہنگ۔

ایک کپ گرم پانی میں آدھا چمچ رُوح پرور ہمدرد چائے ملائیے، چائے تیار ہے، نوشِ جاں فرمائیے۔

رُوح پرور
ہمدرد چائے

ایک نہایت نفیس چائے

ہمدرد لیبارٹریز (وقف) پاکستان

مدینۃ الحکمۃ تعلیم، سائنس اور ثقافت کا عالی منصوبہ

Adarts-HMD/HT-1/94

باقر مہدی کا تخلیقی سرمایہ "سیاہ/سیاہ"

ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی

اب جب کہ باقر مہدی کے شعری سفر کا پورا ارتقاء ان کے چار مجموعہ کلام اور ایک جامع اور مکمل انتخاب "سیاہ/سیاہ" کی ...رت میں سامنے آچکا ہے، یہ بہت ہی موزوں اور مناسب موقع ہے کہ اس انتخاب کے توسط سے ان کی پوری شاعری کی نوعیت ...ر قدر و قیمت کا تعین کیا جائے۔ باقر مہدی اپنے خیالات اور سماجی اور عملی سرگرمیوں کے اعتبار سے ترقی پسند ذہن کے مالک ...ے ہیں۔ مگر ایک شاعر کی حیثیت سے چونکہ وہ ہمیشہ وجودی مسائل سے دو چار اور ان ہی مسائل کے گرد رقصاں رہے، اس لیے ...بودی فکر کے مختلف پہلو، مثلاً اصول و اقدار کا ذاتی تعین، بغاوت، سوالیہ ذہن اور روایتی فکری رویّوں سے انحراف، کے باعث ان ...شاعری کی تفہیم، جدید شاعری اور نئی شعری جمالیات کے پس منظر میں ہی زیادہ بہتر طریقے پر ممکن ہے۔

باقر مہدی کی شاعری کے آغاز کا زمانہ ملک کی تقسیم اور آزادی کے بعد کا زمانہ ہے، جب ترقی پسند فکر سماجی وابستگی اور ...نسان کے وجودی مسائل کے درمیان کسی سوالیہ نشان کی زد پر تھی۔ برصغیر سے سیاسی اور سماجی اتھل پتھل نے معاشرتی، ...قداری اور تہذیبی مسلّمات کو نئے نئے شکوک و شبہات کے روبرو لا کھڑا کیا تھا اور تہذیبی عدم استحکام کو اپنے اظہار کے لیے زبان و ...بیان اور ہیئت و اسلوب کی نئی ساخت اور ڈھانچے کی تلاش تھی۔ اس دور کے بارے میں خلیل الرحمٰن اعظمی نے نئے نظم گو شعرا کے حوالے سے بعض بنیادی نکتے اٹھائے ہیں۔ اس لیے ان ہی کے الفاظ میں:

> "یہ دور برصغیر ہندو پاک میں تہذیبی، سیاسی، اخلاقی اور سماجی اقدار کی پامالی کا دور ہے ..... اس کیفیت نے اردو نظم کو بھی متاثر کیا ہے، اور اس کے نتیجے میں جو رجحان ابھر کر سامنے آیا ہے، وہ نظم میں شخصی طرز احساس اور انفرادی زاویۂ نظر پر اصرار ہے۔ طے شدہ نقطۂ نظر، طے شدہ موضوعات، طے شدہ نتائج تک پہنچنے کی پابندی، طے شدہ فنی اسالیب سے وفاداری، ان سب کی نفی اور ان سے انحراف و انقطاع کا عمل اس دور میں تیز ہوا ہے۔"

باقر مہدی کا پہلا مجموعہ ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا تھا۔ جیسا کہ "شہر آرزو" کے نام سے ظاہر ہے کہ یہ ایک رومانی ذہن کے نیم منحرف شاعر کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ یہ شاعر ابھی اپنے آپ کو اُس روایت سے آزاد نہیں کر سکا ہے جس میں اس کی ذہنی نشوونما ہوئی ہے۔ شخصیت میں انحراف اور بغاوت کے جراثیم تو ضرور ہیں مگر ان کی موجودگی کا اندازہ صرف فکری ارتعاشات

یا موضوعات سے نکالا جاسکتا ہے۔ غزل اور نظم کی اصناف میں روایتی لفظیات، تراکیب، اسلوب، حتیٰ کہ کلیشے سے نجات حاصل کرنے والی جست ابھی اس کے حصے میں نہیں آئی ہے۔ تاہم اس فنی پس ماندگی کے باوجود اگر باقر مہدی نے اسی شعری روایت کو اپنے وجود میں راسخ کیا ہوتا اور اس کی بنیاد پر اپنے شعری سفر کی اگلی منزلیں متعین کی ہوتیں تو شاید شاعر ہونے کی حیثیت سے ان کے کارنامے کی اہمیت قدرے مختلف ہوتی اور ان کی انفرادی صلاحیت کے اظہار کے پیچھے زیادہ ٹھوس اور مستحکم بنیادوں کا سہارا موجود ہوتا۔ خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔ باقر مہدی نے ایسے سہاروں کی پرواہی کب کی ہے اور بزرگوں کی متعین کردہ جمالیات کو ان کی طرز فکر ہی کی طرح کب مسترد نہیں کیا ہے۔ لیکن تنقید کو تو اپنے موضوع کے ارتقاء کے ساتھ ممکنہ ارتقاء کی بھی نشاندہی کرنی چاہیے اور شاعری کو سب سے پہلے شاعری کے طور پر دیکھنا چاہیے دانش وری اور بغاوت کے طور پر نہیں۔ تاہم باقر مہدی کا مطالعہ اس اعتبار سے نہایت دلچسپ اور نتیجہ خیز ہو سکتا ہے کہ جدید شاعری کے بیش تر لوازم کو اختیار کرنے کے باوجود یہ شاعر جدید شاعری کی کوئی خاص اہم اور نمایاں آواز کے طور پر اپنی پہچان کرانے میں کامیاب کیوں نہیں؟ اگر باغیانہ خیالات کا اظہار، عالمی سطح کی علمی اور فکری سرگرمیوں سے باخبری، ساری دنیا کے باغی کرداروں کو آئیڈیالائز کرنا اور فلسفیانہ موشگافیوں کو کسی شاعری کا سرمایۂ افتخار قرار دیا جاسکتا ہے تو باقر مہدی کی شاعری یقیناً بیش قیمت اور وقیع ہے اور اگر ایسا نہیں تو اُن اسباب پر غور کرنا چاہیے کہ ان تمام دانشورانہ وسائل کو اختیار کرنے کے باوجود ان کی شاعری جاذب توجہ اور اپنے معاصر شعری سرمائے میں اضافہ کی حیثیت کیوں نہیں رکھتی؟ لیکن اس سوال کا جواب قدرے بعد میں۔ سردست یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے کہ باقر مہدی کا ذہنی اور فنی ارتقا کن خطوط پر ہوا ہے اور "سیاہ اسیاہ" کی روشنی میں جس تدریجی ارتقا کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں اس میں باقر کا شاعرانہ کردار کیا رہا ہے۔

"شہر آرزو میں" روایتی اسالیب شاعری کا تسلسل اور کلاسیکی لفظیات کا تتبع بہت واضح ہے۔ اس مجموعہ میں روایت سے انحراف کی شعوری کوشش تو ضرور ملتی ہے مگر یہ کوشش نمایاں نہیں ہو پاتی۔ چنانچہ غزلوں کے اس قسم کے اشعار:

درد دل آج بھی ہے جوش وفا آج بھی ہے
زخم کھانے کا محبت میں مزا آج بھی ہے

گرمیٔ عشق نگاہوں میں نہیں ہے نہ سہی
مسکراتی ہوئی آنکھوں میں حیا آج بھی ہے

ہر جگہ بجلیوں کی یورش ہے
کیا کہیں! اپنا آشیاں نہ رہا

تمہاری زلف سے قصے کھے اسیری کے
تمہارے ذکر سے دار و رسن کی بات چلی

اور نظموں کے عنوانات "شہر آرزو"، "میرا عہد شباب"، "قیدی"، "ہم لوگ" اور "بھوک" وغیرہ یا تو روایت پرستی کی تصویر ہیں

پیش کرتے ہیں یا پھر اُس زمانے کے مقبول عام مسائل، طبقاتی کشمکش، مظلومیت اور سیاسی استحصال کی داستان سناتے ہیں۔ "شہر آرزو" میں بعض ایسی بھی نظمیں ہیں جن کو نسبتاً غنیمت قرار دیا جاسکتا ہے مثلاً "اُس نے کہا" اور "نئے انداز کا غم"۔ مگر ان میں سے بھی پہلی نظم نیم رومانی جذبات کی ناپختگی کی غماز ہے اور دوسری خالصتاً موضوعاتی نوعیت کی حامل اور رقت آمیز۔۔۔۔ اس مجموعہ کی دوسری نظموں کا حال کچھ ان نظموں سے بدتر ہی ہے۔ نظموں کی عام فضا شاعر کے ناپختہ جذبات اور سیاسی اور سماجی سطح پر جنم لینے والے عام اور رائج موضوعات سے آگے نہیں بڑھتی۔ اگر ان نظموں میں ہیئت کی پیچیدگی یا تہہ داری ہی فکری تہہ داری کے فقدان کا نعم البدل بن پاتی جب بھی معاملہ توجہ طلب ہوتا۔ اس کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے کہ محض ہیئت کا نیا پن یا اس کی پیچیدگی کسی نظم کی عظمت کا ضامن ہو سکتی ہے۔ اچھی شاعری کسی سکہ بند ہیئت کی پابند تو نہیں ہوتی مگر جب کوئی شخص پابند، روایتی یا نیم روایتی ہیئتوں میں کوئی نیا اسلوب نہ پیدا کر سکے تو ہیئتی تجربے سے اس بات کی امید بندھتی ہے کہ شاید ہیئت کی پیچیدگی، معنوی امکانات کی راہیں استوار کرے۔ اس لیے کہ پیش کی جانے والی کسی حقیقت کی معنویت کا سارا انحصار متن اور متن کی ہیئتی پیش کش سے زیادہ شاید کسی اور شعری وسیلے پر نہیں ہو سکتا۔

باقر مہدی کی نظموں میں شدتِ جذبات کبھی کبھی جذباتی ابال کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور جذباتی وفور کی بات ان کے پہلے مجموعہ کلام پر ختم نہیں ہو جاتی ان کے بعد کے تین مجموعوں کی شاعری بھی اس رجحان سے دامن چھڑانے میں پورے طور پر کامیاب نہیں معلوم ہوتی۔ البتہ بعد کے زمانے کی شاعری کو "شہر آرزو" کی اس مخصوص فضا سے بعض دوسرے اعتبارات سے مختلف قرار دیا جاسکتا ہے، اور یہ شاعری خواہ "کالے کاغذ کی نظمیں" کی ہو، "ٹوٹے شیشے" کی "آخری نظمیں" کی یا پھر "کالی غزلیں اور کالی نظمیں" کی، ایک ایسے ارتقا کا پتہ دیتی ہے جس میں شاعر نے روایتی اسلوب اور لفظیات سے بڑی حد تک نجات حاصل کر لی ہے۔ بعد کی شاعری میں جذباتی وفور ختم تو نہیں ہوا مگر اس نے غصہ، بغاوت اور احتجاج کا روپ اختیار کر لیا ہے اور عنفوان شباب کے اکھرے تاثرات نے طنز و تمسخر کا سلیقہ سیکھ لیا ہے۔ (واضح رہے کہ یہ طنز بھی محض طنز ہے، عموماً وہ طنز ملیح یا (IRONY) نہیں بن پاتا جس کے ذریعہ علامتی معنویت کی گنجائش پیدا ہوتی ہے) اس شاعری میں باقر مہدی ایک مکمل اینگری ینگ مین بن کر نمودار ہوتے ہیں، اپنے معاصر نظام پر برافروختہ اور سب کچھ بدل ڈالنے کا ولولہ رکھنے والے لیکن شاعر کی شخصیت کا یہ پہلو یکایک نمودار نہیں ہوتا، وقت اور امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا ہے اور اپنی شکل و صورت واضح کرتا ہے۔ یہی سبب ہے "کالے کاغذ کی نظمیں" میں ایک غصہ ور نوجوان کے جذبات پر مبنی نظموں کے ساتھ ساتھ ایسی نظمیں بھی شامل ہیں جن کو منظری اور تاثراتی نظموں کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اس طرح کی نظموں میں سے ایک نظم "شام" ہے جس کے دو بند اس طرح ہیں:

ایک خمیدہ سے پیڑ کے نیچے / میں بھی ساحل کے پاس بیٹھا ہوں / شاخیں موجوں پہ یوں\
جھکی سی ہیں / رخصتی لمحوں میں کوئی جیسے / رات کی بات کہنے والا ہو۔۔۔۔ یا یہ بند کہ\
روز یہ آفتابِ عالم تاب / ایک گردش میں مبتلا رہ کر / منزلِ صبر کے قریب آکر / سرخ رو ہو\
کے ڈوب جاتا ہے /

رعوں پر اخترالایمان کی جو پرچھائیں پڑ رہی ہے وہ اپنی جگہ، شاعر کا ناآزمودہ کار ہونا یہاں ظاہر ہوتا ہے جہاں وہ اپنے ڈکشن میں کی تعبیرات اور کلیدی الفاظ کے ساتھ ان کی صفات کا بھی برمحل استعمال نہیں کر پاتا۔ اگر آپ اس نظم کو DECONSTR کریں، تو ایک نگاہ میں آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ ایک ایسی نظم ہے جس کی بنیاد شام کے منظر اور

اس سے وابستہ اداس اور یاس انگیز صورت حال اور تاثر پر رکھی گئی ہے، مگر چونکہ اس کی لفظیات اسے ایسے مدلول کی طرف لے جاتی ہے جس پر شاعر کا کوئی قابو نہیں ہے. اس لیے اس یاس انگیز اور قنوطی فضا پر مبنی نظم میں "شامیں اکثر اداس رہتی ہیں" کے ساتھ "روزیہ آفتابِ عالم تاب" اور "سرخ رو ہو کے ڈوب جاتا ہے" جیسے متضاد صورت حال پیدا کرنے والے مصرعے بھی متن لکھنے والے کی مرضی کے خلاف اس طرح آجاتے ہیں کہ آفتاب کے ساتھ عالم تاب اور پھر یہ کہ اس کے غروب ہونے کے لیے سرخ رو ہونے کی صفات، نظم کے پورے متن کو منتشر متزلزل اور مصنف کے مدعا کو بالکل برعکس فضا اور تاثر سے دوچار کر دیتی ہیں اس نظم کے مقابلے میں "سورج" ہی کے موضوع پر ان کی ایک مختصر نظم زیادہ بھرپور، جامع اور کامیاب ہے:

اپنے چہرے پہ خونِ دل مل کے ارات کے بام سے اترتا ہے
جستجو کا وہی پرانا عصا/ہاتھ میں لے کے چلتا رہتا ہے
جیسے منزل سے بے خبر راہی/روشنی کی تلاش میں گم ہو

اس نظم کے مصرعوں میں نہ صرف تسلسل اور ارتقا کا ربط ہے بلکہ تمام مصرعے نظم کی فضا سے ہم آہنگ ہیں اور ایک مخصوص تاثر کی تکمیل بھی کرتے ہیں، اور "سورج" جیسے عام منظری نوعیت کے معروض کو ایک بھرپور تاثر میں تبدیل کر دیتے ہیں، ان دونوں مثالوں سے پتہ چلتا ہے کہ باقر مہدی شاید مختصر نظموں میں ہی اپنا اظہار شاعرانہ ذمہ داری اور فن کاری کے ساتھ کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ نظم ذرا سی طویل ہوئی اور ان کی سانس پھول جاتی ہے، استعارے اور پیکر تو دور کی بات ہیں ڈکشن کی غیر تہہ دار سطح تک ان کے جذباتی ابال اور سرعتِ اظہار کی زد میں آکر اُن کے قابو میں نہیں رہ پاتی۔ اب اسے "فروغِ شعلۂ حسنِ یک نفس ہے" نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے۔

"کالے کاغذ کی نظمیں" میں "ریت اور درد" کے عنوان سے ایک نظم شامل ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے اپنے مشہور انتخابِ نظم "نئی نظم کا سفر" میں باقر مہدی کی جو دو نظمیں شامل کی ہیں ان میں "گوڈو" کے علاوہ دوسری نظم "ریت اور درد" ہی ہے۔ اس کے علاوہ وحید اختر اور بعض دوسرے نقادوں نے بھی اس نظم کو غیر مشروط طور پر سراہا ہے۔ جدیدیت کے زیر اثر مواد اور موضوع سے زیادہ استعاراتی اور تہہ دار طرزِ اظہار کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوئی اس سے باقر مہدی کا عام شعری اسلوب برائے نام ہی کسب فیض کر سکا۔ تاہم ان کی جو دو چار نظمیں کسی حد تک اس اسلوب کی نمائندگی کرتی ہیں ان میں "ریت اور درد" بھی ہے۔ اس نظم میں زندگی اور وجود کے حوالے سے درد اور ریت کے مابین استعاراتی رشتے کو جس سلیقے سے نمایاں کیا گیا ہے وہ باقر مہدی کی شاعری میں ایک ممتاز فنی کارکردگی کی مثال پیش کرتا ہے۔ اس نظم میں ریت کے تلازمات، ویرانہ، آندھیاں، سراب، پیاس اور تودے، کسی نہ کسی طرح درد کے سارے تلازمات سے نہ صرف یہ کہ ہم آہنگ ہو جاتے ہیں بلکہ تلازموں اور پیکروں سے مرتب ہونے والی تصویر، دل کی ویرانی کے مجرد تصوّر کو ایک متحرک، مرئی اور مرتب استعارے میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اس نظم کی فنی سطح کی دو چار اور نظمیں جو باقر کے نام کو ایک شاعر کی حیثیت سے امتیاز بخش سکتی ہیں وہ "گوڈو"، "اتنا چاہا تھا" اور "ایک لمبی گونج" ہیں۔ ان نظموں میں موضوع کو آرٹ بنانے اور شعری زبان کے وسیلے سے حقیقت کو نئے سرے سے خلق کرنے کی ایسی صفات ملتی ہیں جس کی طرف اگر باقر مہدی نے مستقل مزاجی کے ساتھ توجہ دی ہوتی تو ان کا نام بھی صف اول کے نظم گو شعرا کے ساتھ لیا جاتا۔ یوں تو یہ نظمیں بھی بہت غیر معمولی نہیں مگر باقر مہدی کی شاعری کی انقلابی اور جذباتی فضا میں فنی طور پر مختلف ہونے کے سبب ممتاز بھی دکھائی دیتی ہیں۔

ان نظموں کے مقابلے میں اگر باقر مہدی کی جذباتیت زدہ نظموں کا مطالعہ کیجیے تو شاعر کی ولولہ انگیزی اور خود ضبطی کی کمی کو ہر جگہ صاف دیکھا جاسکتا ہے مثلاً ان کی ایک نظم ہے "ہائی بلڈ پریشر کی ایک نظم" اس نظم کے مصرعے اس طرح ہیں:

رگوں میں اچھلتا لہو/ کالی مٹی سے ملنے کو بیتاب ہے/ بے کسی موت کی راہ دکھلا کے/

چھپ۔ تک رہی ہے/ اور میں بے سبب نظم لکھنے میں مصروف ہوں/

اب ذرا اس موضوع پر ایک نوجوان شاعر کی غزل کا ایک ایسا شعر دیکھیے جس کا محرک نہ تو بلڈ پریشر ہے، نہ موت کا خوف اور نہ وہ اعلانیہ آہنگ جو اس نظم میں موجود ہے:

مٹی کی یہ دیوار کہیں ٹوٹ نہ جائے

رو کو، کہ مرے خون کی رفتار بہت ہے

اس شعر کا شاعر نہ تو اپنے موضوع کا تعین کرتا ہے (ویسے ایسا غزل میں کیا بھی نہیں جاسکتا) اور نہ دونوں مصرعوں میں کوئی ایسا لفظ استعمال کرتا ہے جو شعر کے محرک کی نشاندہی کرے۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ یہ شعر تو ایک بے پناہ شعر بن جاتا ہے مگر باقر مہدی کی نظم بلڈ پریشر کی نظم ہونے کے بجائے ہائی بلڈ پریشر کے عالم میں کہی ہوئی محض ایک اعصاب زدہ نظم بن کر رہ جاتی ہے۔

ابتدائی سطروں میں باقر مہدی کے باغیانہ اور انقلابی خیالات، عالمی سطح کی باغی شخصیتوں اور تحریکوں کے حوالے اور ان کو آئیڈیالائز کرنے کی کوشش اور عالمانہ اور دانش ورانہ موشگافیوں کا ذکر کیا گیا تھا اور یہ سوال اٹھایا گیا تھا کہ اس بھاری بھرکم فکری اور تحریکی پس منظر کے باوجود باقر مہدی کی شاعری بڑی اور عظیم تو کیا اوسط درجے کی شاعری بھی کیوں نہیں بن پاتی۔ اس سلسلے میں یہ تو عرض کیا ہی جاچکا ہے کہ ان تمام دانش ورانہ لوازم کے باوجود جذباتیت کی افراط اور خود ضبطی کا فقدان ان کی نظموں اور غزلوں کی سطح کو بلند نہیں ہونے دیتا۔ اس کا ایک ثبوت تو نظموں کے محرکات کا عنوان کے لفظوں سے ہی بے محابا طور پر واشگاف ہوجانا ہے۔ مزید برآں یہ کہ واشگاف انداز میں عنوان سے اپنے موضوع کو بے نقاب کرنے کے بعد وہ نظم کی بُنت اور ڈھانچے میں بھی اظہار کا کوئی سحر، کوئی التباس، یا پھر تہہ داری پیدا کرنے کی کوئی فنی تدبیر اختیار نہیں کر پاتے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان کی نظم ابھرے پن کی سطحیت سے بلند نہیں ہو پاتی اور نہ تازگی کے امکانات پیدا کر پاتی ہے۔ باقر مہدی کی بعض نظموں کے عنوانات اس طرح ہیں: "بھوک"، "ایک لمبی گونج"، "حرف میں چنگاری"، "قطرہ قطرہ تیزاب"، "ویٹ نام"، "فاشزم"، "ایک سرخ افسردہ چراغ" وغیرہ وغیرہ۔ ایک تو ان نظموں کے عنوانات موضوعاتی بالادستی اور بلند آہنگ جذباتیت کا اعلان کرتے ہیں، دوسرے یہ کہ ان عنوانات سے آگے بڑھیے تو نظموں کے خارجی ڈھانچے کے اندر کوئی ایسا داخلی ڈھانچہ (DEEP STRUCTURE) بھی مشکل سے تلاش کیا جاسکتا ہے جس کی مدد سے وہ شعری تمثال گری، پیکر تراشی، استعاراتی، معنویت یا فکری انضباط کا ثبوت پیش کر سکتے۔ باقر کی شخصیت میں طنز کے عنصر کی بات پہلے کہی گئی تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ یہاں طنز کو بھی ابھرے تمسخر کی سطح پر استعمال کرتے ہیں اور متضاد معنویت کی بنیاد پر پیدا ہونے والے طنزیہ لہجہ کو علامتی جہت دینے میں ناکام رہتے ہیں۔ متذکرہ بالا نظموں میں اگر آپ بلا انتخاب بھی دو ایک نظم کو پڑھ کر دیکھیں تو ان معروضات کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کی نظم "ویٹ نام" کے مصرعے اس طرح ہیں،

امریکی جٹ/ ابھرے، بھرے، گھنے گھنے جنگل پر، ننھی ننھی کلیوں جیسے گاؤں، کھلتے ہنستے

شہروں پر آتش بازی کرتے ہیں /ہم /بھوکے دیس کے بے کس شاعر حسرت سے سب کچھ
تکتے ہیں /امریکی گیہوں کھاتے ہیں /ہم کیا بولیں، کون ہماری سنتا ہے /اپنے لفظ بھی اک
مدت سے /جیبوں اور جسموں کی طرح /خالی ہیں /صرف اک چیخ ابھرتی ہے /آتش بازی بند
کروا /بھونی کے اک چھوٹے سے کمرے میں تنہا میں کیوں چیخ رہا ہوں /یونہی ..... چیخ چیخ
کے تھک جاؤں گا /سو جاؤں گا /مر جاؤں گا /ویٹ کانگ سے مل جاؤں گا /....."

اسی طرح کی ایک نظم "اک سرخ افسردہ چراغ" (مخدوم کی یاد میں) ہے۔

کیا ہوا /کیوں میرے کمرے کا /پرانا بلب بجھ کر رہ گیا /کیا چارہ گر کی جستجو میں /کھو گیا /اک
سرخ افسردہ چراغ /انقلاب آنے نہ آنے /لیکن اس کی راہ میں /ہم جوانوں کے بڑھے جائیں
گے یوں ہی قافلے /

ان دونوں نظموں کی بلند آہنگی اور جذباتی لے کچھ اتنی شدید ہو گئی ہے کہ موضوع سے فکری دلچسپی رکھنے کے باوجود کوئی شخص اسے شعری اظہار کا نام دینے میں تکلف محسوس کرے گا۔ اگر جوانوں کے بڑھتے ہوئے قافلے کا اعلان اور امریکی جارحیت اور بربریت کے نتیجے میں شاعر کے رقت آمیز چیخ یا اس کے مرنے کا اندیشہ، شاعری ہے تو انقلاب، زندہ باد اور خطیبانہ شعلہ بیانی شاعری کے دائرہ کار سے باہر کیوں ہے؟ باقر مہدی اپنے تنقیدی مضامین میں بعض شعری اور فنی قدروں کی بات بھی کرتے ہیں مگر ان کی اپنی شاعری فنی سطح پر اس کی کوئی مثال مشکل سے ہی پیش کر پاتی ہے۔ خطابت اور شاعری کا فرق یا بیانیہ شاعری اور شاعرانہ بیان کا تفاوت، تو وہ اپنے ممدوح مخدوم محی الدین کی شاعری پڑھ کر بھی بڑے عمدہ طریقہ سے سمجھ سکتے تھے اور پولینڈ کے انٹی پوئٹک گروپ کے نمائندہ شاعر ٹاڈیوز روز یوچ کی نظموں کا مطالعہ کر کے بھی، جس کی ایک نظم "میری شاعری" کو انھوں نے اپنے مجموعۂ کلام "ٹوٹے شیشے کی آخری نظمیں" کی تمہید کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اپنی ایک نظم "بڑے مسخرے ہو" میں باقر مہدی کہتے ہیں کہ:

"ہزاروں خریدے ہوئے نامی شاعر /قصیدہ نگاری میں یکتا /نئے حکمرانوں کی تعریف و
توصیف لکھنے میں /مصروف ہیں /...... بڑے مسخرے ہو /خوشی، غم، محبت، بغاوت، کے
معنی بدلنے سے /استعاروں کی دنیا میں ہل چل مچی بھی تو کیا ہے /چلو اپنے سرکس سے
نکلو /کہیں سے وہ چنگاری لاؤ /جو سارے قصیدوں کے دفتر جلا دے /"

اپنی متعدد نظموں کی طرح باقر مہدی نے اس نظم میں بھی سرکشی اور بغاوت کی ترغیب یا اعلان کے ساتھ اپنا شعری مؤقف بھی واضح کرنے کی کوشش کی ہے، چنانچہ الفاظ کے مروجہ معنوں میں ہلچل مچانے اور استعاروں کی دنیا سے شناسائی حاصل کرنے کے اعلان کے باوجود نہ تو وہ اپنے الفاظ میں کوئی استعاری جہت پیدا کر پاتے ہیں اور نہ اپنے خطیبانہ لہجے کو فنی تدبیر کاری کا مزا سکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاید یہی سبب ہے کہ اگر ان کا کوئی معاصر سریت یا التباس آفرینی کا اسلوب اپنانے کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو یہ رویہ ان کو سمجھوتہ یا مفاہمت کے مترادف معلوم ہوتا ہے۔ اپنی ایک نظم کا انتساب "پدم شری" سردار جعفری کے نام کرتے ہوئے (اسے نہ بھولنا چاہیے کہ یہاں پدم شری کا لفظ بھی باقر مہدی کے معروف طنزیہ انداز کی نمائندگی کرتا ہے) ان کی میر شناسی یا کبیر پسندی کو باقر مہدی نے ان کی انقلابیت اور اشتراکیت کے منافی قرار دیا ہے:

"یہ تصوّف کی اُجڑی پناہ گاہیں اچھُپنے کی کوشش... کامریڈا ایک قسم کی بزدلی ہے!"
اب بھلا اس دانش ور کو کون بتائے کہ زندگی کی برہنہ سچائیوں کے مقابلے میں تصوّف کی سرّی صداقت زیادہ معنی خیز اور تہہ دار ہے، اور چونکہ شاعری کا سرچشمۂ فیضان ہمیشہ سے سرّی روایتیں رہی ہیں اس لیے اگر سردار جعفری میر کے تصّوف کو یا کبیر کی بھگتی کو انقلابی روایت کے ساتھ ساتھ تعمیری امکانات کا سرچشمۂ فیضان بھی سمجھتے ہیں تو یہ ان کے کامریڈ ہونے کے منافی نہیں ہے۔

باقر مہدی کی شخصیت میں فکری طور پر INSPIRE ہونے کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وان گاف، گویرا، آکٹویا پاز اور چے گوارہ سے لے کر میر، آتش، یگانہ، راشد، مخدوم اور ایم، ایف حسین تک متعدد انقلابی شاعر اور مصوّر ان کی فکر کو مہمیز کرتے ہیں اور نتیجہ کے طور پر باقر کبھی کسی کی یاد میں، کسی کے خیالات سے متاثر ہو کر، کسی کی زمین کو اپنا کر، اور کبھی کسی کے آرٹ کو بنیاد بنا کر نظمیں اور غزلیں کہتے ہیں۔ باقر مہدی کی نظموں اور شعروں کے پیچھے سے جو ان کے سرچشمۂ فیضان شخصیتوں کی پرچھائیاں جھانکتی ہوئی نظر آتی ہیں وہ اسی اثر پذیری کا لازمی انجام ہے.... یہی سبب ہے کہ باقر مہدی کی بہت کم نظمیں اور غزلیں ایسی ہیں جو دوسروں کی چھاپ سے آزاد ہوں۔

انھوں نے اپنے انتخاب کلام میں کئی درجن غزلیں شامل کی ہیں۔ مگر ان میں غزل کی روایت میں گتھی ہوئی وہ عام قسم کا ایجاز یا علامتی اظہار بھی مشکل سے ملتا ہے جو اکثر شاعروں کے اشعار سے بلا کسی شعوری کاوش کے پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کی غزلوں میں اس طرح کے خوشگوار، تازہ کار اور رچاؤ کو ظاہر کرنے والے شعر بھی معدودے چند ہی ملتے ہیں:

مجھے دشمن سے اپنے عشق سا ہے
میں تنہا آدمی کی دوستی ہوں

زمیں پہ رہ کے کہیں ظلم سے پناہ نہیں
فلک بھی اب نہ رہا پھر ہماری ہجرت کیا

قیدی ہے اندھیروں میں امیدوں کی کرن تک
لیکن دلِ سرکش سے اُجالا نہیں جاتا

باقر مہدی کا ایک شعر ہے:

بحروں کو توڑ تاڑ کے نالے میں ڈال دو
بس دل کی لَے میں فکر کو ڈھل جانا چاہیے

لیکن اگر ہم ان سے یہ توقع رکھیں تو کوئی غلط بات نہ ہوگی کہ انھوں نے پہلے مصرعے میں بحر اور نالے کی جو رعایت یا مناسبت پیش نظر رکھی ہے، اس نوع کی رعایتوں اور تدبیروں کے بغیر فکر و خیال کا دل کی لے میں ڈھلنا آسان نہیں ہوتا۔ اگر باقر مہدی کی دانش وری جذباتیت، بلبلِ شوریدہ کا نالۂ خام نہ ہوتی اور ان کی فکر محسوس فکر بن پاتی تو ان کے خیالات مجرد تصورات بن کر نہ رہ جاتے، ان کا لہجہ ناہموار اور درشت نہ ہوتا اور ان کے بیان میں شاعرانہ بیان یا کم سے کم تحت البیان کی کیفیت ضرور پیدا ہو جاتی۔

ظاہر ہے کہ اس کیفیت کے فقدان کے باعث ان کے یہاں نئی فضا اور نئے منظر ناموں کی بہتات کے باوجود استعاراتی فضا برائے نام ہی ملتی ہے یہی ان کی دانشورانہ قوت ہے اور یہی شاعرانہ کمزوری۔

ہائیکو کے نئے حوالے

سرشار صدیقی

"سچائی" اور "حسن" کسی تائید یا تردد کے محتاج نہیں ہوتے۔ اچھی شاعری سچائی اور حسن دونوں کی نمائندہ ہوتی ہے اور
تحسین و تنقیص دونوں سے بالاتر۔ بے تعلق اور بے نیاز۔

شاعری کسی مخصوص زبان یا کسی خاص ہیئت کی پابند بھی نہیں۔ یہ احساس کی رَو ہے جس کے اظہار کے لیے ہر زبان اپنے
لیے فنی سانچے (TECHNICAL STRUCTURE) خود وضع کر لیتی ہے۔ یہ سانچے ابتداً صرف شخصی اور انفرادی ہوتے
ہیں جو رفتہ رفتہ قبول عام کی سند حاصل کرنے اور اپنے مخصوص عروضی نظام کی پذیرائی کے بعد شعری روایت کا حصہ بن جاتے ہیں۔
اور اصناف سخن کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔

"ہائیکو" جاپانی شاعری کی ایک قدیم صنف ہے اور اس کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ جاپان کے تمام قدیم و جدید شعراء نے
اس کے سرمائے کے اضافے میں بھرپور حصہ لیا ہے۔ روایت ہے کہ تین مصرعوں (۵-۷-۵ کی صوتی آہنگ کی ترتیب میں)
پر مختصر اور مکمل نظم دراصل پہلے جاپانی شاعری کی ایک اور قدیم تر صنف "ہائی کائی" کا ابتدائیہ ہوتی تھی۔ یہ تین مصرعے پوری
طویل نظم "ہائی کائی" کی تمہید یا تعارف کے طور پر لکھے جاتے تھے جو موضوع کے اعتبار سے مکمل نظم کی حیثیت رکھتے تھے۔ بعد
میں اس ابتدائی خود کفیل حصے کو ایک علیحدہ صنف سخن تسلیم کیا گیا اور اسے "ہائیکو" کا نام دیا گیا۔ استخراج کی ایک ایسی ہی مثال
اردو شاعری میں بھی موجود ہے۔ غزل جو اُردو شاعری کی سب سے زیادہ معقول، مقبول اور مستعمل صنف ہے یہ عربی قصیدے کی
تشبیب کے طور پر لکھی جاتی رہی ہے جسے پہلے فارسی اور پھر اُردو نے "غزل" کا نام دیا اور قصیدے سے الگ کر کے ایک علیحدہ
صنف سخن قرار دیا۔

اُردو ہائیکو ایک ایسا ہی خوشگوار فکری اور تخلیقی تجربہ ہے۔ جو پچھلے دس بارہ برس سے اردو کے ممتاز و معتبر شعراء کی توجہ کا
مرکز بن گیا ہے۔ اس مدت سے قبل بھی اردو ہائیکو خال خال نظر آتے رہتے تھے لیکن مقدار و معیار دونوں اعتبار سے ادب کے عام
قارئین کو متاثر نہیں کر سکے۔ اس کی ایک وجہ ان کی اشاعت میں عدم تسلسل اور طویل وقفہ بھی ہے۔ پھر یہ بھی قابل غور ہے کہ
نامعروف یا غیر معروف شعراء کی گاہ گاہ طبع آزمائی کو محض انفرادی اور اتفاقی زمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔ اسے عمومی اور اجتماعی
زمرے میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔

جیسا ابھی عرض کیا پاکستان میں ہائیکو سے عام شناسائی کا زمانہ اب سے دس بارہ سال قبل ہی شروع ہوا ہے اور اس کا
بنیادی سبب جاپانی سفارت خانے کے ثقافتی مرکز کراچی کے زیر اہتمام اردو ہائیکو مشاعروں کا پابندی سے انعقاد ہے۔ اس ضمن
میں یہ حقیقت بھی ناقابل فراموش ہے کہ مشاعروں کا یہ سلسلہ پروفیسر ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی کے مشوروں اور گہرے عملی تعاون
سے شروع ہوا جو کئی سال تک درس و تدریس کے سلسلے میں جاپان میں مقیم رہے۔ وہاں کے ادب و ثقافت کا خاموش مطالعہ کرتے

رہے اور واپسی میں پاکستانی شعراء کے لیے ہائیکو کا تحفہ لائے۔ پاکستان میں اردو ہائیکو کی مقبولیت اور شہرت میں تیسرا اور اہم ترین عنصر کراچی کے ممتاز، معتبر اور بزرگ شعراء میں جنھوں نے اس ادبی اور ثقافتی عمل میں سنجیدگی سے شریک ہو کر تخلیقی سطح پر اس نو دریافت صنف ہائیکو کو اردو شاعری کا تسلیم شدہ حصہ بنانے میں نمایاں کردار انجام دیا۔

اس سارے پس منظر کے باوجود اردو ہائیکو نگاری اب بھی تجرباتی دور سے گزر رہی ہے۔ کہیں اوزان کی پیچیدگی پیدا ہوتی ہے کہیں ساخت اور ہیئت کا مسئلہ آتا ہے اور کہیں جاپانی ہائیکو کے مروجہ موضوعات و مضامین سے اردو ہائیکو میں فطری گریز۔

اس صورت حال کے سلسلے میں پروفیسر احمد علی صاحب نے نہایت وضاحت کے ساتھ فیصلہ کن تجزیہ کیا ہے:

"اصناف شاعری کا تعلق ایک معاشرے کی روایات اور زبان کی اپنی خصوصیات سے براہ راست اور گہرا ہوتا ہے۔ جن کی قلم ایک نئی اور مختلف فضا میں بڑی مشکل اور محنت سے لگائی جا سکتی ہے اور اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب یا تو دونوں معاشروں میں مزاج کی یگانگت ہو یا لینے دینے والی دونوں زبانوں کے صوت ایک ہی نہیں تو مشترک ضرور ہوں"

جب یہ بات واضح ہے کہ جاپانی ہائیکو کی عمر صدیوں پر پھیلی ہوئی ہے اور اردو ہائیکو نے ابھی آنکھ کھولی ہے تو پھر ہمیں اعتراف کر لینا چاہیے کہ ہماری اکثریت ابھی مبتدی ہے اور صدیوں کی ہنرمندی کی منزلِ کمال کو صرف رسمی ریاضت یا تقلیدی کاوش سے حاصل کر لینے کا دعویٰ گمراہ کن خود پسندی ہے۔

اردو ہائیکو نویسی ابھی اپنے ابتدائی مراحل سے گزر رہی ہے اور اسے ہیئت، اسلوب، موضوع اور لفظیات کی تشکیل میں فطری طور پر کچھ وقت درکار ہوگا۔ اس مسلمہ حقیقت سے روگردانی کرنے اور ہائیکو کی تسلیم شدہ ہیئت کو نظر انداز کرنے والے اردو شعراء کی معتد بہ اکثریت تین مساوی الوزن مصرعوں کو بھی ہائیکو کا نام دے کر روایت اور جدت دونوں کے ساتھ بھونڈا مذاق کر رہی ہے۔ معتبر نقاد پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اسی بے راہ روی پر دکھ کا اظہار کرتے ہوئے ایسے شعراء کو اپنا فنی قبلہ درست کرنے کا مشورہ ان الفاظ میں دیا ہے:

"اردو ہائیکو کا ایک بڑا ذخیرہ ایسا ہے جس میں تینوں مصرعے برابر کے (ہم وزن) ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہیئت کے باب میں یہ ایک غیر مستحسن بدعت ہے۔"

اس فیصلہ کن رائے کے علاوہ اسی ضمن میں بزرگ نقاد پروفیسر احمد علی کا یہ تاثر بھی قابل غور ہے:

صرف تین سطروں کو یکجا لکھ کر ہائیکو کا نام دینا بھی جائز نہیں۔ اس کی عروضی اور لسانی کیفیات ظاہر کرنا ضروری ہے۔"

شاعری کسی زبان کی بھی ہو، اس میں اپنی زبان کے ارکان و اوزان ضروری ہوتے ہیں۔ چناں چہ جاپانی ہائیکو کا تکنیکی نظام سلیبلس (SYLLABLES) یعنی صوتی آہنگ پر مشتمل ہے۔ اردو ہائیکو میں استعمال کیا جائے تو مستثنیات کو چھوڑ کر ایسے نتا برآمد ہوتے ہیں جن کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے درست کہا ہے کہ:

"بعض مشاق عروضی شاعر نمونے کے طور پر چند ہائیکو کہنے میں کامیاب ہو جائیں لیکن اتنی بات طے ہے کہ بالعموم شاعر نہیں، صنعت گری کہلائے گی۔"

اس کے علاوہ فرمان صاحب کی اس رائے سے بھی کسے اختلاف ہو سکتا ہے کہ:

"جاپانی زبان کا صوتی نظام اردو سے بالکل مختلف ہے اتنا مختلف کہ جاپانی زبان کا عروضی نظام اردو کے عروضی نظام پر کسی طرح بھی منطبق نہیں ہو سکتا۔"

لسانی ماہرین ان تجزیات کی روشنی میں اگر اردو ہائیکو کا تنقیدی جائزہ لیا جائے تو سب سے پہلے ہمیں ان کے لیے کم از کم ہیئت (FORM) کی حد تک اپنے ذہن میں ایک نرم گوشہ ضرور رکھنا ہوگا۔ اردو شاعر جو طبعاً اردو کی مروّجہ بحور کا عادی ہوتا ہے اسے اتنی چھوٹ (ALLOWANCE) یقیناً دینی پڑے گی کہ وہ اردو بحور کے ارکان و اوزان کا پابند رہ کر اس طرح ہائیکو لکھ سکے کہ ہیئت اور ساخت میں وہ جاپانی ہائیکو کے مشابہ ہو گویا بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

"مصرعوں کی تعداد اور بہ اعتبار آہنگ ان کی ساخت و قامت میں جو اختصار و طوالت جاپانی ہائیکو میں ہے اسے اردو میں بہر طور برقرار رکھا جائے۔"

کراچی میں تابش دہلوی، شان الحق حقی، ادا جعفری، محشر بدایونی، راغب مراد آبادی، سحر انصاری وغیرہ بہترین ہائیکو لکھ رہے ہیں۔ میں نے بھی گاہ گاہ چند ہائیکو لکھنے کی مشق کی ہے۔ یہ ہائیکو صوتی آہنگ میں بھی ہیں اور مندرجہ بالا توضیحات کی روشنی میں اردو کی مروّجہ بحروں میں بھی لکھے گئے ہیں جو جاپانی نظام اوزان کی سخت گیر پابندیوں سے آزاد ہونے کے باوجود ہیئت ساخت اور مصرعوں کی تعداد و قامت میں جاپانی ہائیکو کے مماثل ہیں۔ میری رائے میں اردو شاعر کو اتنی اجازت ضرور ملنی چاہیے ورنہ اردو ہائیکو شعری جمالیات سے محروم ہو کر بازی گری کا مظاہر بن کر رہ جائے گا۔

اسی نیم خود مختاری بلکہ مشروط آزادی کے ہمدردانہ جذبہ کے تحت میں نے جناب واصل عثمانی کے لکھے ہوئے ہائیکو نہایت توجہ اور دل چسپی کے ساتھ پڑھے اور مجھے اندازہ ہوا کہ ان میں شعریت، خلوصِ فکر اور سلیقۂ اظہار کے وہ تمام عناصر موجود ہیں جو طویل ریاضت فن کے بعد ہی گرفت میں آتے ہیں۔

مضمون نیا ہو یا پرانا، موضوع معمولی ہو یا غیر معمولی، شاعر کا کمال فن یہ ہے کہ وہ خیال کی شعری تشکیل کرتے ہوئے اسے اپنی تراشیدہ لفظیات، اپنے مخصوص لہجے اور اپنے منفرد اسلوب سے شعری جمالیات کا پیکر عطا کر دے .... اور واصل عثمانی کی یہ خوبی اور خصوصیت ان کی غزلوں اور نظموں کے علاوہ ان کے ہائیکو میں بھی نمایاں ہیں۔ آغازِ کار ہی میں ان کے ہاں امکانات کی چمک موجود ہے اسی روشنی میں ہم ان سے مستقبل کی امیدیں وابستہ کر سکتے ہیں۔

اپنے اہم اور قابل ذکر معاصرین کی طرح واصل عثمانی نے بھی اپنی ہائیکو میں جاپانی موسم و مناظر کے مضامین پر پاکستانی طرزِ احساس کو ترجیح دی ہے۔ شاید اس لیے کہ اولاً وہ موسم و مناظر کی جاپانی کیفیات سے پوری طرح مانوس نہیں ہیں اور یہ کوئی فنکارانہ خامی بھی نہیں ثانیاً وہ بنیادی طور پر اردو شاعری کی مسلّمہ روایات کی فضا میں سانس لے رہے ہیں اور اسی جانی پہچانی فضا سے اکتسابِ فکر کرتے ہوئے ہائیکو کے لیے بھی براہ راست مواد حاصل کرتے ہیں۔ یہی سوچ کا فطری عمل ہے۔

واصل عثمانی اپنے عروضی رویّے میں بھی اپنے ان بعض ممتاز و معتبر معاصرین سے مماثلت رکھتے ہیں جنھوں نے ہائیکو کی جاپانی بحر (۵-۷-۵- صوتی آہنگ) میں کامیاب شروع کی ہے۔ اس کا اندازہ آپ کو ان چند نظموں سے ہو سکے گا:

برکھا رت تڑپائے
بادل، خوش بو، نرم ہوا
کچھ بھی یاد نہ آئے

قومی زبان (۳۶) مارچ ۱۹۹۴ء

کوئل کوک اٹھی
پھر وہ مجھ کو یاد آیا
دل میں ہوک اٹھی

اے ہمدم، دمساز
کب سے کان آہٹ پر ہیں
دے مجھ کو آواز

ان کے علاوہ خود اپنے تجرباتی اوزان میں بھی جن کا تعلق اردو عروض سے ہے خوبصورت ہائیکو تراشے ہیں۔ ذیل کی مثالوں میں ان کی جودت طبع قابل تحسین ہے:

کون سی لے بیدار ہوئی
زخم جگر سب کھل اٹھے ہیں
روح تلک سرشار ہوئی

پھول کھلے یا زخم کھلا
دل کو تسلی دیتا ہوں میں
تم سے بچھڑ کر کچھ تو ملا

بھول گیا وہ، تو بھی بھلا دے
یادوں کے انبار لگانے سے کیا حاصل؟
خط کا اک اک حرف جلا دے

دل کی دنیا ڈانواں ڈول
رات گئے یہ کون آیا ہے خاموشی سے
بول ذرا سناٹے بول

ندی بہتی رہتی ہے
لہر کنارے سے ٹکرا کر
نئی کہانی کہتی ہے

میں اردو ہائیکو کی ہیئت (FORM) کے شخصی تجربات کو بہ یک قلم مسترد کر دینے کے فیصلے سے پوری طرح اتفاق نہیں کرتا البتہ ایسا ہائیکو جس میں مصرعوں کی تعداد پہلے اور آخری مصرعوں کا ہموزن اختصار درمیانی مصرعے کی نسبتاً ایسی طوالت جو مستعملہ بحر کی اکائی اور روانی کو برقرار رکھے اور مجموعی طور پر موضوع کے جمالیاتی اظہار میں کامیاب ہو، اسے اس صنف کے زمرے میں شمار کیا جانا چاہیے۔ اس طرح اردو شعراء کے ایک بڑے طبقے کو جاپان کے نظام عروض کی پابندی سے قدرے رستگاری بھی حاصل ہوگی اور اس آسانی یا گنجائش کے نتیجے میں اردو ہائیکو زیادہ فروغ اور مقبولیت بھی حاصل کر سکے گا۔

یہاں اس امر کی وضاحت بھی برمحل ہوگی کہ جو اہل قلم صرف جاپانی صوتی آہنگ ہی میں لکھ رہے ہیں یا آئندہ لکھیں گے انھیں بہر حال فنی اعتبار سے اہمیت حاصل رہے گی۔

واصل عثمانی نے دونوں مکاتبِ فن کی ترجمانی کی ہے اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ دونوں اسالیب کے ذریعے اظہار و ابلاغ کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مجھے توقع ہے کہ وہ اس نودریافت صنف سخن کو بہت کچھ دے سکیں گے۔

ازراہ کرم مضمون کی پشت پر نام اور مکمل پتہ تحریر کریں

انجمن ترقی اردو کی چند مطبوعات

کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
فرہنگ اصطلاحات پیشہ نگاری	محمد احمد سبزواری	۲۰۰/-
داستان سحر البیان	ڈاکٹر احمد سجاد	۱۶۰/-
مضامین غلام ربانی	غلام ربانی	۱۰۰/-
اردو قومی یکجہتی اور پاکستان	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	۶۰/-
ایران بعہد ساسانیان	آرتھر کرسٹن سین ترجمہ ڈاکٹر محمد اقبال	۲۰۰/-
الف لیلہ ولیلہ (سات جلدیں)	ترجمہ: ڈاکٹر نور الحسن منصور	۸۹۰/-
تاریخ الحکما	جمال الدین ابوالحسن علی بن یوسف القفطی ترجمہ ڈاکٹر غلام جیلانی برق	۱۶۵/-
بابائے اردو	ڈاکٹر اسلم فرخی	۱۵/-
روسی ادب (دو جلدیں)	پروفیسر محمد مجیب	۲۴۰/-
قہر عشق	ولیم شیکسپیر / اشان الحق حقی	۱۲۰/-
جوامع الحکایات ولوامع الروایات (دو جلدیں)	ترجمہ: اختر شیرانی	۱۶۵/-
نوادر الالفاظ	سراج الدین علی خاں آرزو	۱۰۰/-
محمد تقی میر	ڈاکٹر جمیل جالبی	۵۰/-
تنقید عقل محض	امانوئل کانٹ ترجمہ ڈاکٹر عابد حسین	۱۸۰/-
سعادت یار خاں رنگین	ڈاکٹر صابر علی خاں	۱۳۰/-
حرفے چند (حصہ اول)	جمیل الدین عالی	۱۰۰/-
حرفے چند (حصہ دوم)	جمیل الدین عالی	۱۷۵/-
غالب کے خطوط (حصہ اول)	ڈاکٹر خلیق انجم	۱۵۰/-
غالب کے خطوط (حصہ دوم)	ڈاکٹر خلیق انجم	۱۵۰/-
غالب کے خطوط (حصہ سوم)	ڈاکٹر خلیق انجم	۵۰/-
غالب کے خطوط (حصہ چہارم)	ڈاکٹر خلیق انجم	(زیر
تنقید اور جدید اردو تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	۵۰/-
غزل نما	مرتبہ: ادا جعفری	۰۰/-
غالب آشفتہ نوا	ڈاکٹر آفتاب احمد خاں	۱۰/-
ابن انشا	ڈاکٹر ریاض احمد ریاض	۱۰/-
جدید اردو شاعری (حصہ اول)	عزیز حامد مدنی	
جدید اردو شاعری (حصہ دوم)	عزیز حامد مدنی	
جاپانی کہانیاں	شفیع عقیل	

انجمن ترقی اردو پاکستان
ڈی-۱۵۹ بلاک (۷) گلشن اقبال کراچی-۷۵۳۰۰

کچھ قاضی عبدالغفار کے بارے میں

ایم صہیب خاں

قاضی عبدالغفار اردو کی ایک اہم اور دلاویز شخصیت تھے۔ وہ ہماری علمی اور تہذیبی زندگی کا دلکش نمونہ تھے۔ انھوں نے ادب اور صحافت دونوں میں گراں قدر خدمات انجام دیں اور دونوں میں امتیاز حاصل کیا۔

ان کی پیدائش مراد آباد کے زمیندار گھرانے میں ہوئی تھی۔ ان کی عمر کے متعلق خاصا اختلاف نظر آتا ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ وہ ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے اور بعض ۱۸۸۹ء بتاتے ہیں لیکن قاضی صاحب نے اپنی ایک نجی گفتگو میں جو انجمن کے دفتر میں ہوئی تھی، جس میں احمق پھپھوندوی (محمد مصطفیٰ خاں مداح) علامہ خیر بہوروی اور راقم بھی موجود تھا۔ احمق صاحب نے ان کا سنِ پیدائش دریافت کیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ "مجھے اپنی عمر کے بارے میں کبھی یاد نہیں رہا ہاں میری ایک کتاب "عجیب" ہے اس میں میں نے اپنی عمر کے بارے میں درست لکھا ہے۔ "عجیب" کے مطابق ان کی عمر ۱۹۰۸ء میں ۲۳ سال تھی۔ اس حساب سے ان کا سنِ ولادت ۱۸۸۵ء قرار پاتا ہے۔ قاضی عبدالغفار کی چھوٹی صاحبزادی فاطمہ عالم علی کا بیان ہے کہ قاضی صاحب دسمبر ۱۸۸۹ء (۱) میں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن "عجیب" میں عمر کے متعلق ان کا بیان زیادہ وقیع اور قابلِ یقین ۱۸۸۵ء معلوم ہوتا ہے۔ البتہ دسمبر کے مہینے کو صحیح مان لیا جائے تو انتقال کے وقت (۱۶ جنوری ۱۹۵۶ء) قاضی صاحب کی عمر ۷۰ سال قرار دی جاسکتی ہے۔ میں نے چھ سال تک انجمن ترقی اردو ہند میں ان کے ساتھ کام کیا ہے۔ اور ان کے انتقال کے وقت میں موجود تھا۔ اس دسمبر ۱۸۸۵ء کو درست مانا جاسکتا ہے۔

قاضی عبدالغفار کے والد کا نام خان بہادر قاضی ابرار احمد تھا۔ وہ مراد آباد کے زمیندار گھرانے کی ایک اہم شخصیت تھے۔ مراد آباد میں درجہ اوّل کے کئی سال تک آنریری مجسٹریٹ رہے اور برسوں مراد آباد میونسپل کارپوریشن کے چیرمین بھی رہے۔ قاضی ابرار احمد کے دادا قاضی حامد علی نے ۱۸۵۷ء کے غدر میں ایک مغل شہزادے کو پناہ دی تھی جس کے جرم میں انھیں پھانسی دی گئی اور ان کی تمام جائیداد کو انگریزی حکومت نے ضبط کرلیا۔ ان کے جاں بحق ہونے کے بعد عدالت نے ان کو جب بے قصور ثابت کردیا تو ان کی جائیداد اور تمام مکانات واپس کردیے گئے۔ قاضی عبدالغفار کے والد نے پانچ شادیاں کیں۔ وہ والد کی دوسری بیوی ہدایت النساء بیگم کے بطن سے تھے۔ ان سے تین لڑکے اور چار لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ بڑے بیٹے قاضی عبدالغفار تھے۔ ابتدائی تعلیم مراد آباد میں حاصل کی اور یہیں سے ۱۹۰۵ء میں دسویں جماعت کا امتحان پاس کر کے والد نے اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیج دیا۔ اس وقت ایم اے او کالج علی گڑھ کے پرنسپل سر تھیوڈر ماریسن تھے۔ یہاں انھوں نے انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کی۔

قاضی صاحب کے والد کا عمل دخل انگریزی سرکار میں زیادہ تھا اور وہ انگریزی سرکار میں بہت مقبول تھے۔ اس لیے انھوں نے قاضی عبدالغفار کو نائب تحصیل دار مقرر کر دیا۔ اس کے بعد ترقی کر کے تحصیل دار ہو گئے اور اس عہدے پر دو سال کام کیا۔ طبعیت بے حد رنگین پائی تھی۔ صحافت سے شروع سے دلچسپی تھی۔ اس لیے ان کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر مولانا محمد علی نے ان کو اپنے اخبار "ہمدرد" کا نائب مدیر مقرر کر دیا۔

قاضی ابرار احمد کی چوتھی بیوی سے دو لڑکے قاضی مشتاق احمد اور قاضی نثار احمد پیدا ہوئے۔ قاضی مشتاق احمد آج کل دلی میں رہتے ہیں ان کے تین لڑکے اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ تینوں اولادیں زندہ ہیں۔ لڑکی کا نام قمر جہاں ہے۔ مشتاق صاحب نے لڑکی کی شادی مراد آباد میں ضامن علی خاں سے کر دی تھی۔ ضامن علی خاں دلی میں اے جی سی او کے دفتر میں ملازم تھے اور غالب ہاؤسنگ سوسائٹی کے اعزازی سکریٹری تھے چار سال ہوئے ان کا انتقال ہو گیا اور قمر جہاں جوانی میں بیوہ ہو گئیں۔ ان کے والد قاضی مشتاق احمد ذاکر نگر دلی میں اپنی لڑکی کے ساتھ رہتے ہیں۔ گزشتہ سال ضامن علی خاں کی بڑی بیٹی کی شادی ہو گئی ہے وہ بڑے ہر دل عزیز اور زندہ دل انسان تھے۔ میرے عزیز دوستوں میں تھے

قاضی عبدالغفار طالب علمی کے زمانے میں کوٹ پتلون شوق سے پہنتے تھے اور علی گڑھ کے زمانۂ طالب علمی میں شیروانی اور ترکی ٹوپی پہننے لگے تھے۔ سفر یورپ کے بعد کوٹ پتلون بالکل ترک کر دیا تھا، شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ پہننے لگے اور زندگی بھر یہی لباس پہنا، طبیعت میں نفاست بہت تھی۔ اس لیے لباس عام طور پر صبح و شام تبدیل کرتے تھے۔ طبعاً خاموشی پسند اور خود دار تھے گندمی رنگ، اونچا قد، چوڑی پیشانی، چہرے پر متانت اور خود اعتمادی ظاہر ہوتی تھی، وجیہ انسان تھے۔ خشخشی داڑھی سے ان کی شخصیت بڑی پر وقار لگتی تھی جس محفل میں جاتے لوگوں کی نگاہیں ان کی طرف اٹھ جاتیں۔ اچھے کھانے ان کو بہت پسند تھے۔

قاضی صاحب نے دو شادیاں کیں۔ پہلی شادی افضال بیگم سے کی جن سے چار لڑکے اور تین لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ چاروں لڑکے معذور پیدا ہوئے جن میں تین ایک ایک کر کے فوت ہو گئے البتہ منجھلے لڑکے اور شاد علی ۲۲ سال زندہ رہے۔ لڑکیوں میں سب سے بڑی لڑکی کا نام زہرہ بیگم تھا جن کی شادی سندیلے کے چودھری محمد سلطان صاحب سے ہوئی تھی۔ زہرہ بیگم کا ۱۹۶۰ء میں انتقال ہو گیا۔ افضال بیگم کے انتقال کے وقت دوسری لڑکی فاطمہ بیگم کی عمر دس دن کی تھی، ان کی شادی قاضی صاحب نے ہاشم علی خاں برجج ریاست حیدر آباد کے فرزند عالم علی صاحب سے کر دی۔ ہاشم اُس وقت نظام شوگر فیکٹری میں منیجر تھے۔ قاضی صاحب کی یہ صاحبزادی حیات ہیں اور حیدر آباد میں رہتی ہیں۔ قاضی صاحب نے دوسری شادی سکینہ بیگم عرف منّی بیگم سے کی جن سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ قاضی صاحب نے زہرہ بیگم کے چھوٹے صاحبزادے طارق سلطان کو گود لے لیا تھا جن کی تعلیم و تربیت قاضی صاحب نے کی۔

قاضی عبدالغفار بے مثل صحافی اور انشا پرداز تھے وہ اپنے اسلوب نگارش کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں!

> "میری لکھائی کا ڈھنگ ایسا ہے جیسے کسی مرض کا دورہ پڑے جب لکھنے کا دورہ پڑتا ہے تو لکھے چلا جاتا ہوں، صبح شام دوپہر اور نہیں لکھتا تو مہینوں ایسے گزر جاتے ہیں کہ قلم کو کاغذ سے دشمنی ہو جاتی ہے۔ اس دورہ کی کیفیت تو ایسی ہوتی ہے جیسے شرابی کا نشہ لیکن جب وقت گزر جاتا ہے تو جیسے بادل برس کر کھل جائے"

قاضی صاحب کی لکھائی کا ڈھنگ ان کی بیشتر تحریروں میں اسی طرح کا ثبوت فراہم کرتا ہے جیسا کہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں مولانا محمد علی کے اخبار "ہمدرد" سے ان کی صحافتی زندگی کا آغاز ہوا اور مولانا محمد علی سے انھوں نے صحافت کے وہ تمام گر سیکھے جو اس فن کے معیار کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہیں۔ مولانا محمد علی نے قاضی صاحب سے "ہمدرد" کے لیے سب سے پہلا مضمون "مزدور" لکھوایا تھا جو بالاقساط "ہمدرد" میں شائع ہوا تھا۔ مولانا کی نظر بندی کے بعد یہ اخبار بند ہو گیا۔ قاضی صاحب نے کلکتہ سے "جمہور" اور دلی سے "صباح" نکالا۔ آخر میں حیدر آباد سے "پیام" ۱۹۳۵ء میں نکالا۔ یہ اخبار اعلیٰ صحافتی معیار کی وجہ سے پورے ہندوستان میں مشہور ہو گیا تھا۔ اور اس اخبار نے رائے عامہ کو ایسا متاثر کیا تھا کہ بہت سے اہلِ قلم اور نوجوان طبقہ ان کے ادبی شہ پاروں پر سر دھنتے تھے اور ان کے مضامین سے فیض اٹھاتے تھے۔ اس اخبار نے پورے ہندوستان میں دھوم مچا رکھی تھی، لوگ صبح تڑکے اس کے پڑھنے کے لیے پہلے سے منتظر رہتے تھے۔

قاضی صاحب پکے محب وطن تھے۔ ساری عمر تنگ نظری اور تعصب کے خلاف جنگ کرتے رہے۔ حیدر آباد میں نواب مرزا اسماعیل کے عہد میں نجف علی خاں کی جگہ پر نظام سرکار میں محکمہ اطلاعات کے ناظم مقرر ہوئے جہاں تین سال تک اس عہدے پر فائز رہے۔

"نقش فرنگ" اور لیلیٰ کے خطوط قاضی صاحب کی انشا پردازی کے دو اعلا نمونے ہیں۔ نقش فرنگ سفر نامہ ہے۔ اس میں یورپ کی دلکش تصویریں پیش کی گئی ہیں۔ لیلیٰ کے خطوط سب سے پہلے نیرنگ خیال لاہور میں بالاقساط شائع ہوئے۔ جس نے یہ خطوط پڑھے وہ قاضی صاحب کی انشا پردازی کا قائل ہو گیا۔ لیلیٰ کے خطوط میں ایک عورت کی مظلومیت کی داستان ہے جس میں سماج کی بے انصافیوں پر طنز ہے۔ یہ انشائے لطیف کا شاہکار ہے مجنوں کی ڈائری لیلیٰ کے خطوط کا ضمیمہ ہے۔ یہ شاہکار نہ سہی مگر قاضی صاحب کے نگار خانے کی دلکش تصویر ہے اس میں مجنوں کی کیفیت کو دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مجنوں کی ڈائری کے بارے میں قاضی صاحب لکھتے ہیں۔

> "لیلیٰ کے خطوط" میں جو داستان میں بیان کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے موزوں طرز بیان وہی تھا جو لیلیٰ نے اختیار کیا عورت کی مظلومیت کا افسانہ ہندوستان کے ماحول میں کسی شریف گھر کی بیٹی یا بہو کی زبان سے بیان ہونا ممکن نہیں تھا۔ لامحالہ ایک بازاری عورت کے قلم سے وہ عبرت انگیز حقائق بیان کرانے پڑے جن کو ذرا کم بے حجاب اور زیادہ سنجیدہ طرز بیان بے اثر اور بے معنی کر دیتا......... اپنے مقصد میں مجھے کس حد تک کامیابی ہوئی اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکیں گے جنھوں نے لیلیٰ کے خطوط کو محض اس کی ادبی چاشنی کی خاطر نہیں بلکہ اس مقصدِ اعلیٰ کو پیشِ نظر رکھ کر پڑھا ہے جو لیلیٰ کے قلم کی روانی میں میری ساری داستان گوئی کی روح رواں ہے، (ص ٦)

"مجنوں کی ڈائری" کے علاوہ "عجیب"، "اس نے کہا"، "تین پیسے کی چھوکری" اور "سیب کا درخت" بھی اسی دور کی یادگار تصانیف اور ترجمہ ہیں۔

حیدر آباد کے قیام کے زمانے میں انھوں نے جمال الدین افغانی اور تقسیم ہند کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد اور حیات اجمل جیسی لافانی سوانح عمریاں لکھیں۔ ان کا شمار اس عہد کی بہترین سوانح عمریوں میں ہوتا ہے۔

انجمن ترقی اردو ہند سے وابستگی ۱۹۴۹ء میں ہوئی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ایما سے اس علمی ادارے کے جنرل سکریٹری مقرر ہوگئے۔ اور دلی سے علی گڑھ انجمن کے دفتر کو منتقل کرایا جنوری ۱۹۵۰ء سے باقاعدہ انجمن کے کاموں کا آغاز کیا جنوری ۱۹۵۰ء سے ہماری زبان کا دوبارہ اجرا کیا اس اخبار کے ذریعہ اردو تحریک کو زندہ کیا۔ ان کے سامنے انجمن کے لیے دو مقاصد تھے ایک تو علم و ادب کی خدمت دوسرے اردو زبان کا تحفظ وہ مرتے دم تک ان دونوں محاذوں پر بڑی مستعدی اور کامیابی سے جنگ کرتے رہے۔ اردو کے لیے پیچیدگیاں ان ہی کے زمانے میں پیدا کی گئیں۔ ان کی بیماری کا سلسلہ بھی جاری رہا اور اردو کی جدوجہد بھی جاری رہی اور اپنی آواز اردو کے حق میں گھر گھر پہنچاتے رہے۔ حکومت کو اردو کا مقدمہ سننے کے لیے مجبور کردیا۔ ۲۲ لاکھ دستخطوں کا ایک میمورنڈم صدر جمہوریہ ہند کی خدمت میں ڈاکٹر ذاکر حسین (یہ اُس وقت انجمن کے صدر اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے) کی قیادت میں پیش کیا۔ قاضی صاحب نے اردو کے حق کے لیے وزیروں گورنروں اور اردو کے خلاف حضرات سے بھی لڑائیاں لڑیں۔ اردو کے حق میں اردو کانفرنس منعقد کرائیں شاخوں کی از سر نو تقسیم کی۔ ہندوستان کے دورے کیے انجمن کے علمی اور ادبی کاموں کی طرف بھی قاضی صاحب نے خاص توجہ دی۔ مہاتما گاندھی نے راشٹر بھاشا کے سوال پر جو تقریریں کی تھیں وہ تقسیم ہند سے پہلے مختلف اخباروں میں چھپی تھیں ان سب کو قاضی صاحب نے جمع کر کے مرتب کیا تقسیم ہند کے بعد جب گاندھی جی کے خیالات نظر انداز کیے جانے لگے تو انھوں نے ان کی تقریروں کی اشاعت کو شدت سے محسوس کیا اور اسے مشترکہ زبان کے نام سے انجمن سے شائع کیا۔ گاندھی جی کے عقائد اور نظریات اسلام اور ہندو دھرم کے متعلق ان کی تحریروں کی شکل میں جس حالت میں تھے ان سب کو مرتب کر کے قاضی صاحب نے "مذہب اور دھرم" کے نام سے انجمن سے شائع کیا۔ ان دونوں کتابوں پر قاضی صاحب نے اپنا نام نہیں دیا۔ یہ ۱۴۶ صفحات کی نہایت قیمتی جذبہ عمل پیدا کرنے والی کتاب کو مرتب کر کے قاضی صاحب نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے بڑا کام کیا ہے۔ پروفیسر مختار الدین احمد کی احوال غالب اور نقد غالب کی منظوری ان کے زمانے میں ہوگئی تھی مگر یہ دونوں کتابیں ان کے انتقال کے بعد سرور صاحب کے عہد میں شائع ہوئیں۔ حیات اجمل ترقی پسند ادب اور اردو ہندی ڈکشنری علمی کتابیں شائع کیں، مجروح سلطان پوری اور مخدوم کے کلام کے انتخابات کی ابتدا انھوں نے ہی کی۔ مجروح کی غزل پر پیش لفظ لکھنا تھا جس کی ابتدا مجروح کے اس شعر سے کی تھی اور یہ شعر ان کو بہت پسند تھا اکثر ادبی محفلوں میں بھی اس شعر کو پڑھتے تھے۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے تھے اور کارواں بنتا گیا

اس طرح تیس کے قریب علمی، ادبی اور تنقیدی کتابیں شائع کیں اور اسی طرح ۶ سال کے اندر اردو کے مسائل بھی حل کرانے کی کوششیں جاری رکھیں اور اردو تحریک کے مسئلے کو حل کرنے کا نیا موڑ انھوں نے ہی دیا اس طرح اپنی طویل بیماری کے باوجود حکومت اور اردو مخالف حضرات سے بھی ٹکر لیتے رہے اور اردو کی حمایت آخر دم تک کرتے رہے بالآخر ۱۶ جنوری ۱۹۵۶ کو دل کا دورہ پڑنے سے ان کا انتقال ہوگیا۔

علامہ نظم طباطبائی حیدر آباد میں

شفقت رضوی

علی حیدر طباطبائی کے اجداد ایران سے برصغیر آئے اور لکھنؤ میں آباد ہوئے۔ ان کے دادا سید مہدی طباطبائی جلال آباد کے فوجدار تھے۔ والد سید مصطفیٰ حسین شاہ اودھ کے دربار میں سپاہی تھے جو فنون سپاہ گری میں یکتا سمجھے جاتے تھے۔ انھیں شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی۔ موسیقی کے بے حد دلدادہ تھے نظم کی دادی کا تعلق مختار الدولہ کے خاندان سے تھا اور ان کی والدہ معتمد الدولہ خاندان کی تھیں۔ ایک لحاظ سے ان کا رشتہ واجد علی شاہ نواب اودھ سے بھی تھا وہ نواب کی بیوی بوٹا بیگم کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔

نظم نے اپنی خود نوشت میں لکھا ہے کہ "۱۵ صفر ۱۳۵۱ھ کو اکاسی برس کا میرا سن ہوا" اس طرح ان کی تاریخ پیدائش ۱۵ نومبر ۱۲۷۱ھ (م ۱۷ نومبر ۱۸۵۳ء) قرار پاتی ہے۔ لکھنؤ میں پرانا حیدر گنج لکڑ منڈی ان کی جائے پیدائش ہے تعلیم کی ابتداء لکھنؤ میں ہوئی منشی منڈو لعل زار ان کے والد کے دوست تھے۔ نظم نے انھیں سے فارسی پڑھی۔ ملا طاہر صرفی سے عربی صرف و نحو کے درس لیے۔ ان کے والد واجد علی شاہ کے ساتھ میٹا برج چلے گئے تھے۔ انھوں نے نظم کو بھی کلکتہ بلوالیا۔ وہاں خاتمۃ الدّین مولانا مرزا علی علامہ عصر اور مجتہد وقت شہزادگان کو تعلیم دیا کرتے تھے ان سے درس نظامی کی تکمیل کی۔ شہزادوں کے انگریزی کے استاد محمد عسکری سے انگریزی زبان سیکھی اور اس کے عوض انھیں عربی پڑھائی۔ اپنے ذوق و شوق کی بنا پر زندگی بھر طلب و حصول میں مصروف رہے علم عروض پر ان کی گہری نظر تھی عربی اصولِ عروض کو وہ تمام ہندوستانی شعراء سے بہتر طور پر سمجھتے تھے چنانچہ انھوں نے لکھا!

"ایک بڑا کلمہ میں کہتا ہوں۔ نعوذ باللہ العظیم۔ بالکل صحیح ہے یعنی فارسی اور اردو والے عرب کے عروض کو نہ سمجھتے تھے۔ اس فن کو الجھا کر رکھ دیا تھا۔ یہی حال قافیہ کا ہے۔ میں نے "تلخیص عروض و قافیہ" لکھ کر تمام گتھیوں کو سلجھا دیا ہے اور حشو و زوائد کو چھانٹ دیا ہے" (رسالہ زمانہ کانپور: فروری ۱۹۳۳ء) مولانا حسرت موہانی جیسے بلند پایہ اور صاحب نظر شاعر بھی ان کی سخن دانی، سخن سنجی اور سخن فہمی کے قائل تھے وہ بیان کرتے ہیں:

"اردو شاعری میں مرحوم (نظم طباطبائی) کا پایۂ سخن بہت بلند تھا۔ راقم حروف کی رائے میں امیر، داغ، جلال، تسلیم و حالی کے بعد کے طبقے کے شعراء میں مائل دہلوی، نظم لکھنوی اور شاد عظیم آبادی بے شک استادِ کامل کہلانے جانے کے مستحق تھے۔ ۱۹۰۲ء سے لے کر ۱۹۳۳ء تک سیکڑوں بلکہ ہزاروں شاعروں نے راقم سے اصلاح کلام کی درخواست کی تھی لیکن راقم نے ہمیشہ اپنے

کو ازراہِ انکسار نہیں بلکہ واقعی اس خدمت کے ناقابل پایا اور ہر طالبِ اصلاح کو جواب لکھ بھیجا کہ استادِ کامل کی تلاش ہے تو مولوی سیّد علی حیدر طباطبائی کے شاگرد ہو۔ (رسالہ اردوئے معلیٰ' مئی جون ۱۹۳۳ء)

حسرت تمام باکمال لوگوں کی طرح نہ صرف ان کے علمی تبحر کے معترف تھے بلکہ ان کے ذاتی اوصاف کی بھی ستائش کرتے تھے ان کی شخصیت کے بارے میں حسرت نے لکھا ہے۔

"مولانا علی حیدر طباطبائی مرحوم کی ذات لکھنؤ کی تہذیب کا بہترین نمونہ تھی جس سے ملتے خلوص اور محبت کے ساتھ ملتے اور اپنے طرزِ عمل میں کبھی اور کسی حال میں فرق نہ آنے دیتے تھے راقم الحروف کو بار بار حیدر آباد میں مرحوم سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ ہر بار گھنٹوں علمی و ادبی گفتگو اور مشرقی تہذیب و شائستگی کے متعلق حرف و حکایت کا سلسلہ جاری رہا اور کبھی ایسا نہ ہوا کہ انھوں نے بغیر طعام و فواکہہ یا شربت و چائے کی دعوت کے رخصت ہونے دیا ہو" (حوالہ مذکورہ بالا)

وہ ۱۸۸۰ء مجتہد العصر خاتمۃ المجتہدین کے انتقال کے بعد میٹا برج میں واقع مدرسہ شاہ اودھ میں شہزادوں کو پڑھانے لگے اور اُن کی رہنمائی کے لیے "تشریح الافلاک" اور "تعریب الاطفال" لکھیں۔ اوّل الذکر ۱۳۰۰ھ میں مطبع اردو گائیڈ کلکتہ میں چھپی تھی۔ اسی زمانہ میں دربارِ واجد علی شاہ کے شعراء صولت، بیدار اور درخشاں سے صحبتیں رہیں وہیں عبد الحلیم شرر شاعری میں ان سے اصلاح لینے لگے تھے۔ وہ ۱۸۸۷ء تک مدرسہ شاہ اودھ میں عربی کے معلم رہے۔ انھیں سو روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ ۱۸۸۷ء میں واجد علی شاہ کے انتقال کے بعد مدرسہ بند ہوگیا۔ ان کی ملازمت جاتی رہی۔

مدرسہ میں ملازمت کے دوران وہ بغرض سیر و سیاحت حیدر آباد دکن گئے تھے۔ مصطفیٰ حسین بلال کے یہاں قیام کیا تھا جو نواب سالار جنگ کے مطبع کے داروغہ تھے۔ ان کی ملاقات جسٹس سیّد افضال حسین سے بھی ہوئی جن کا لکھنؤ سے تعلق تھا وہ نظم کی قابلیت سے بے حد متاثر ہوئے ان کا اصرار تھا کہ نظم حیدر آباد ہی میں رہ جائیں لیکن اس وقت انھوں نے میٹا برج کے قیام کو ترجیح دی تھی۔ مدرسہ شاہ اودھ کے بعد بیروزگاری کے زمانہ میں یہ بات ان کے علم میں آئی کہ ماریشش میں عربی کے ایک استاد کی ضرورت ہے۔ وہ ملازمت کی درخواست بھجوانے والے ہی تھے کہ سیّد افضال نے تار کے ذریعہ انھیں حیدر آباد طلب کیا اور سفر خرچ کے لیے سو روپیے روانہ کردیے۔ ان کے جذبہ خلوص و ہمدردی کی وجہ سے نظم نے ماریشش کا خیال ترک کیا اور حیدر آباد چلے گئے۔ اس وقت تقرری کے لیے کوئی جگہ خالی نہیں تھی اس لیے انھوں نے نظم کو آغا حیدر حسین کا بمشاہرہ سو روپیہ ماہانہ اتالیق مقرر کردیا۔

ریاست حیدر آباد میں نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کا دور حکمرانی تھا۔ انھوں نے شاہی خاندان کے بچوں کی تعلیم کے لیے مدرسہ اعزہ قائم کیا تھا ۱۸۸۹ء میں عماد الملک کے حکم سے نظم کا تقرر اس مدرسہ میں بمشاہرہ سو روپیہ ماہوار ہوا۔ ایک سال بعد جب کتب خانہ آصفیہ کا قیام عمل میں آیا تو انھیں اس کا مہتمم بنا دیا گیا۔ کتب خانہ آصفیہ کے انتظام میں وہ ہمہ تن مصروف ہوگئے۔ اسی عمارت میں رہنے لگے اور رات دن کتابوں میں بسر ہونے لگے۔ ان کی تدریسی صلاحیتوں کے سبب ۴ فروری ۱۸۹۱ء کو انھیں مدرسہ عالیہ میں عربی اور فارسی کا معلم مقرر کیا گیا۔ ۳۱ اکتوبر ۱۸۹۷ء میں نظام کالج میں فارسی کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ اس عہدہ پر فائز ہونے کے بعد ان کی تنخواہ دوگنی یعنی دو سو روپیہ ہوگئی۔ اس زمانے میں نظام کالج کا الحاق مدراس یونیورسٹی سے تھا۔ نظم کو اس یونیورسٹی کے بورڈ آف اسٹڈیز کا رکن منتخب کیا گیا تھا۔

حیدر آباد میں بھی ان کی تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رہا۔ کلکتہ میں انھوں نے طالب علموں کے لیے تشریح الافلاک اور

تقریب الاطفال لکھی تھیں۔ حیدر آباد میں اسی طرز کی کتابیں مبینات و معریات لکھیں جن کے بارے میں ان کا اپنا کہنا ہے کہ "انھیں لوگ کرامات سمجھتے ہیں" ان کی تحریک پر پہلی بار دیوانِ غالب مدراس یونیورسٹی کے بی۔اے کے نصاب میں شامل ہوا۔ طلبہ کی رہنمائی کے لیے انھوں نے دیوانِ غالب کی شرح بھی لکھی اس کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے:

"اس شرح کو دیکھ کر استاد السلطان سناد العلما آغا سیّد علی شوستری نے کہا کہ "اردو دیوان کی شرح لکھنا میری رائے میں اس کے لیے سبکی کا باعث ہوا۔ اسے چاہیے تھا کہ عربی کے کسی دیوان کی شرح لکھتا" یہ قول بھی مجھ تک پہنچا اور میں نے امراؤالقیس کے دیوان کی شرح بھی اردو لکھ ڈالی یہ عرب کا ملک الشعراء اسلام سے پہلے کا شاعر ہے۔ میں یہی سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں شرح لکھ کر میں نے اپنی زبان کی بڑی خدمت کی ہے" (رسالہ زمانہ کانپور؛ فروری ۱۹۳۳ء)

حیدر آباد میں قائم مدرسہ دار العلوم کے طلبہ پنجاب یونیورسٹی کے فاضل اور عالم کے امتحانات دیا کرتے تھے۔ یہ امتحانات حیدر آباد میں بھی منعقد ہوا کرتے تھے۔ لارڈ کرزن کے مقرر کمیشن کی سفارش پر یہ سہولت ختم کر دی گئی حیدر آباد کے طالب علموں کو امتحان دینے سے روک دیا گیا جبکہ ان کی تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ صورت حال انتہائی پریشان کن تھی۔ جب طلبہ کے ذریعہ یہ بات نظم کے علم میں آئی تو انھوں نے نظام کالج کے سینیئر پروفیسروں، ڈاکٹر رگھوناتھ اور ڈاکٹر نیشی سے مشورہ کیا۔ ان کی تجویز تھی کہ حیدر آباد میں ایسے امتحانات منعقد کیے جاسکتے ہیں اور طلبہ کو اسناد دی جاسکتی ہیں۔ ان پروفیسروں نے اس کی تائید کی اور تعاون پر رضامندی ظاہر کی چنانچہ مشاہیر علماء کا ایک بورڈ قائم کیا گیا جس کے تحت فاضل اور عالم کے معیار کے امتحانات منعقد کیے جانے لگے۔ نظم نے مدراس یونیورسٹی کے بورڈ آف اسٹڈیز میں بھی اسی طرز کے امتحانات کی تجویز منظور کرائی چنانچہ دبیر اور افضل العلماء کے امتحانات انھیں کی کوشش سے شروع ہوئے لیکن یونیورسٹی سینٹ نے ان کے لیے معیار قابلیت انگریزی کے ساتھ کامیاب ہونا قرار دیا جس کی وجہ سے کئی سال تک ان امتحانوں میں کوئی طالب علم شریک نہیں ہوا۔ اس صورت حال میں انھوں نے یونیورسٹی سینٹ کے اراکین سے فرداً فرداً مل کر انھیں قائل کیا کہ انگریزی کے ساتھ میٹرک کی کامیابی کی شرط ختم کی جائے۔ ان کی کوششوں سے یہ ترمیم منظور ہوئی اور طلبہ ہر سال بڑی تعداد میں ان امتحانات میں شریک ہونے لگے۔

مدراس یونیورسٹی نے ان کے مجموعہ کلام کا پہلا حصّہ بھی بی۔اے کے نصاب میں شامل کر لیا تھا۔

نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کے عہد حکومت میں نظم کو ترقی دے کر نظام کالج میں پروفیسر بنا دیا گیا اور ۱۹۱۷ء میں والئی ریاست کی سالگرہ کے موقع پر خطاب سے سرفراز فرمائے گئے۔ اس بارے میں ۲۹ رجب المرجب ۱۳۳۵ھ (م ۲۱ مئی ۱۹۱۷ء) روز دوشنبہ فرمان جاری ہوا

نقل فرمان

"میری سالگرہ کی تقریب میں جن چند خاص خاص لوگوں کو میں نے جو حال میں خطاب دیا ہے۔ ان میں ان چاروں کے نام بھی شامل کر لیے جائیں۔ (۱) سیّد عقیل صاحب عقیل یار جنگ، (۲) مولوی علی حیدر طباطبائی۔ حیدر یار جنگ، (۳) رضا علی بیگ نبیرہ انوار بیگ رضا یار جنگ، (۴) محمد احمد صاحب نواز جنگ سابق معتمد صدف خان" شرح دستخط میر عثمان علی خان،

فرمان کی اجرائی کے بعد محکمہ پولیٹکل امور کی جانب سے فرید الدولہ نے ایک یادداشت پیشگاہ خسروی میں گذرانی کہ سابق میں میر اکبر علی خان نبیرہ محکم جنگ کو حیدر یار جنگ کا خطاب دیا جا چکا ہے وہ اس وقت بھی بقید حیات تھے۔ خطاب حیدر نواز جنگ میں تبدیل کیا جاسکتا تھا وہ بھی حکیم سید علی خاں کو دیا جا چکا تھا۔ اس لیے استدعا کی گئی کہ اس بارے میں حتمی حکم جاری کیا

جائے چنانچہ ۶/شعبان المعظم ۱۳۳۵ھ (م ۲۵/مئی ۱۹۱۷ء) روز دوشنبہ کو حکم ہوا:

نقل حکم

"مولوی علی حیدر صاحب کو حیدر یار جنگ کا جو خطاب دیا گیا ہے اس کے مماثل خطاب اگر کسی دوسرے کا اس وقت ہے تو کچھ مضائقہ نہیں کیونکہ یہ خطاب کے ساتھ طباطبائی لکھا کریں گے"

آصف جاہ سابع نے اسی سال شہزادہ اعظم جاہ اور شہزادہ معظم جاہ کو عربی کی تکمیل دینے کے لیے ان کی خدمات نظام کالج سے دو سال کے لیے مستعار لیں اور انہیں صرف خاص کی ملازمت میں لے لیا۔ نظم نے شہزادوں کو عربی کا درس دیا۔ معظم جاہ کو شعر و سخن سے بے حد دلچسپی تھی۔ انہیں رموز عروض سے بھی واقف کروایا۔ نظم کا فیض تھا معظم جاہ نے شاعری میں مقام پیدا کیا۔ وہ شجیع تخلص کرتے تھے۔ ان کا دیوان بھی شائع ہو چکا ہے۔

ایک سال بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا اور نظم کو دارالترجمہ منتقل کر دیا گیا۔ اس بارے میں فرمان ہوا کہ

نقل فرمان

"مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی کی ضرورت صرف خاص میں باقی نہیں رہی۔ لہذا حکم دیا جاتا ہے کہ غرہ شوال ۱۳۳۶ھ سے ان کو دارالترجمہ میں بہ ماہوار ۵۰۰ روپیہ حالی شریک کر لیا جائے"

اس حکم کے بعد یہ پیچیدگی پیدا ہوئی کہ ان کی اصل ملازمت تو نظام کالج میں تھی ڈیپوٹیشن پر صرف خاص میں لیے گئے وہاں سے ڈیپوٹیشن پر دارالترجمہ بھجوائے گئے اس لیے تجویز ہوئی کہ ان کی ملازمت کو نظام کالج سے ختم کر کے یا تو صرف خاص میں یا دارالترجمہ میں مستقل کر دیا جائے۔

اس تجویز کے جواب میں آصف جاہ سابع نے حکم جاری کیا:

نقل حکم

"حیدر یار جنگ بہادر صرف خاص میں مستقل ملازمت پر مامور نہیں ہو سکتے۔ ان کو دارالترجمہ میں مستقل کر لیا جائے مگر ان کی عمر قابل وظیفہ ہو گئی ہے پھر کس بناء پر ان کے استقلال کی درخواست کی گئی ہے۔" (۲۵ شعبان المعظم ۱۳۳۷ھ (م ۲۶ مئی ۱۹۱۹ء)

سرکاری ریکارڈ کے مطابق ۱۶ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو ان کی عمر ۵۵ ہو جاتی۔ مروجہ قوانین کے مطابق وہ وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش کر دیے جاتے چونکہ ان کی اعلیٰ قابلیت سے دارالترجمہ استفادہ کرنا چاہتا تھا اس لیے کارگزار ناظم دارالترجمہ مولوی عنایت اللہ نے ان کی ملازمت میں توسیع کی تجویز سابق ناظم دارالترجمہ مولوی عبدالحق اور منتظم پیشی نواب امین جنگ کی سفارش کے ساتھ آصف جاہ سابع کے پاس پیش کی نواب امین جنگ نے تحریری سفارش میں لکھا تھا کہ:

"چونکہ دارالترجمہ کا قیام فی الحال آخر مہر ۱۳۲۹ فصلی تک فرمایا گیا ہے اس لیے اس تاریخ تک حیدر یار جنگ بہادر کی توسیع منظور ہونی مناسب ہے۔ (۲۶ ذی الحجہ ۱۳۳۷ھ)

تجویز منظور ہوئی۔ عمر کے ۵۵ سال مکمل کرنے کے بعد وہ وظیفہ کے مستحق ہوئے۔ نظام کالج کی تنخواہ اور مدت ملازمت

کے لحاظ سے ان کا وظیفہ ایک سو اڑسٹھ روپے تین آنے مقرر ہوا۔ وہ دارالترجمہ میں ۵۰۰ روپیہ ماہوار پاتے تھے اس لیے آخر مہر ۱۳۲۹ھ م ۱۶/ اگست ۱۹۲۰ء) کے بعد انھوں نے اس یافت کے لحاظ سے بھی وظیفہ مقرر کئے جانے کی درخواست دی۔ اس پر صدر اعظم نے ہی پُرزور سفارش کی تھی۔

۱۲ محرم الحرام ۱۳۳۸ھ کو فرمان ہوا:

نقل فرمان

"صدر اعظم کا قیاس درست ہے میرا منشا ہے حیدر یار جنگ بہادر طباطبائی کو ان کی دارلترجمہ کی جائیداد کی یافت کے لحاظ سے ہی وظیفہ دیا جائے۔ پس ان کو دو سو روپیہ نو آنے پانچ پائی کا وظیفہ دیا جائے"

اس طرح نظم طباطبائی کو جملہ وظیفہ تین سو ستتر روپے بارہ آنے پانچ پائی (۵-۱۲-۲۷۷ روپے) ملنے لگا۔

وظیفہ کی کارروائی مکمل ہونے کے باوجود جامعہ عثمانیہ کی مجلس اعلیٰ نے دارالترجمہ کے لیے نظم طباطبائی کی خدمات حاصل رنا چاہی۔ مجلس کی سفارش آصف جاہ سابع کے روبرو حکم کے لیے پیش ہوئی۔ آصف جاہ سابع نے انھیں ۵ ستمبر ۱۹۲۱ء تک ارالترجمہ میں ہنگامی بنیاد پر کام جاری رکھنے کی منظوری دے دی۔ اس مدت کے گذر جانے کے بعد ایک بار پھر جامعہ عثمانیہ کی بلس اعلیٰ کی جانب سے خدمات میں توسیع کی سفارش ہوئی۔ چونکہ آصف جاہ سابع نے پہلے ہی حکم دے دیا تھا کہ مزید توسیع نہیں ی جائے گی اس لیے یہ سفارش بارِ خاطر ہوئی اور ایک فرمان انتہائی سخت لہجہ میں جاری ہوا۔

نقل فرمان

"پیرانہ سالی کی وجہ سے حیدر یار جنگ بہادر زیادہ مدت تک کام نہیں کر سکتے۔ کیا دنیا میں ان کی مماثل لیاقت کا آدمی نہیں مل سکتا جو ان کی خدمت پر رکھا جائے۔ میرے خیال میں تو ان سے بڑھ کر ادب دنیا میں موجود ہیں جو آسانی سے دستیاب ہو سکتے ہیں" (۲۶/ ذی الحجہ ۱۳۳۹ھ)

مدّت ملازمت کے ختم ہونے اور مذکورہ بالا فرمان کے جاری ہونے کے درمیان ایک ماہ ۱۳ دن کا عرصہ گزر گیا۔ وصولی فرمان کے بعد ۱۸/ اکتوبر ۱۹۲۱ء کو کام ختم کر کے وہ دارالترجمہ کے ناظر ادبی کے عہدہ سے سبکدوش ہو گئے۔ جوش ملیح آبادی کی سرپرستی کی ناظر ایک نیا عہدہ انگریزی مترجم کا قائم کر کے ان کا تقرر کیا گیا تھا۔ نظم کے سبکدوش ہونے کے بعد جوش کو اس عہدہ پر ترقی دے کر ان کا سابقہ عہدہ ختم کر دیا گیا۔

نظم طباطبائی کو وظیفہ پر علیحدہ ہوئے ایک سال بھی پورا نہ ہوا تھا کہ دارالترجمہ میں ان کی ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی۔ آصف جاہ سابع کو بھی خیال ہوا کہ ان کی خدمات دوبارہ حاصل کی جائیں چنانچہ ۸/ ذی الحجہ ۱۳۴۰ھ (م ۲/ اگست ۱۹۲۲ء) کو فرمان جاری ہوا کہ

نقل فرمان

"میں نے گو حیدر یار جنگ بہادر طباطبائی کو پیرانہ سالی کا خیال کر کے ان کو وظیفہ پر علیحدہ کر دیا تھا مگر بعد کو معلوم ہوا اور ہم نے خود بھی دیکھا کہ ان کے قویٰ ابھی کام کرنے کے لائق ہیں اس لیے اس امر کے مدنظر دو سال کے لیے ان کی سابقہ خدمت پر ان کو ۱۵/ ذی الحجہ الحرام سنہ جاریہ سے بحال کرتا ہوں اس کا انتظام کیا جائے اور ان کو میرے حکم سے مطلع کیا جائے"

نظم نے ملازمت کی دو سالہ مدت مکمل کرلی تو
یہ گویا نظم طباطبائی کی قابلیت اور ان کی حسن کارکردگی کا کھلا اعتراف تھا۔
انھیں ایک سال کی توسیع دی گئی۔ بالآخر ۱۱ جولائی ۱۹۲۶ء کو وہ دارالترجمہ سے قطعی اور آخری بار سبکدوش ہوگئے۔ ۱۹۲۸ء میں انھوں نے حسنِ خدمت کے صلہ میں انعام کی گزارش کی ۱۸ / اپریل ۱۹۲۹ء کو جاریہ فرمان کے ذریعہ ان کی گزارش منظور ہوئی اور انھیں تین ہزار روپیہ نقد انعام دیا گیا اس کے علاوہ تاریخ طبری کے ترجمہ کا معاوضہ دو ہزار روپیہ اور تاریخ دکن کی نظر ثانی کا معاوضہ دو سو روپیہ بھی ملا۔

تاریخ دکن کے بارے میں نظم طباطبائی نے لکھا ہے۔
"اعلیٰ حضرات غفران مآب کے جشن طلائی کی تاریخ نواب فصاحت جنگ جلیل نے دو جلدوں میں لکھی تھی وہ تاریخ نواب سالار جنگ بہادر دام اقبالہ کی دیوانی کے زمانہ میں پیش گاہ خسروی سے اس فرمان کے ذریعہ بھیجی گئی کہ علی حیدر طباطبائی کو وہ تاریخ دے دی جائے کہ منتظر اصلاح دیکھیں۔ اس تاریخ کے متعلق میں نے بڑا کام یہ کیا کہ حیدر آباد افیئرز کی سب جلدیں اوّل سے آخر تک پڑھیں اور مضامین ضروری کا اضافہ کیا۔ سنتا ہوں کہ یہ تاریخ شائع ہونے والی ہے" (رسالہ زمانہ کانپور افروری ۱۹۳۳ء)

نظم طباطبائی نے بعد وظیفہ دارالترجمہ کو چھوڑ دیا لیکن دارالترجمہ نے انھیں نہیں چھوڑا۔ وہ حسب سابق مجلس اصطلاحات کے رکن رہے۔ اس کے اجلاسوں میں بلائے جاتے جس کا انھیں معاوضہ ملتا تھا۔ وہ انتقال کے دو روز قبل تک مصروف کار رہے مفوضہ فرائض کے ساتھ مطالعہ شعر گوئی اور تصنیف و تالیف کا کام بھی جاری رکھا دو شعری مجموعے "دیوان نظم طباطبائی" اور "صوت تغزل" ان کی یادگار ہیں ان کے علاوہ ایک مجموعہ قصائد بھی ہے۔ انگریزی سے منظوم ترجمے کے حوالے سے "گورِ غریباں" ان کا شاہکار نظم ہے جو گرے کی نظم کا ترجمہ ہے حسرت موہانی نے ان کا انتخاب شائع کیا تھا۔ اس کے بارے میں حسرت نے لکھا ہے۔
"مرحوم (نظم طباطبائی) کو بھی راقم کے مذاق سخن کا اتنا اعتبار تھا کہ ۱۹۱۱ء میں اپنے کُل کلام کا پریشان مسودہ جس کی اور کو نقل ان کے پاس نہ تھی علی گڑھ بھیجا تھا جس کا انتخاب اردوئے معلی کے ساتھ بطور ضمیمہ شائع کر دیا تھا۔ مرحوم نے اس انتخاب کو دیکھ کر لکھا تھا کہ میں خود بھی انتخاب کرتا تو انھیں غزلوں اور اشعار کا انتخاب کرتا" (اردوئے معلی: مئی جون ۱۹۳۳ء)

حیدر آباد میں قیام کے دوران نظم کے درجنوں عالمانہ مقالے مقتدر رسائل میں شائع ہوئے ان کی قابلِ قدر تالیفات میں شرح دیوان غالب (۱۹۰۵ء) مراثی انیس جلد اوّل (۱۹۲۲ء) جلد دوم (۱۹۲۴ء) انتخاب دیوان امراؤ القیس شامل ہیں۔ ان کا طویل "ادب الکاتب والانشاء" برسوں اردوئے معلیٰ میں بالاقساط شائع ہوتا رہا۔

نظم طباطبائی کی پہلی شادی کلکتہ میں ہوئی تھی۔ انھوں نے دوسری شادی حیدر آباد میں ایک تاجر میر عنایت حسین صاحبزادی سے کی۔ ان سے دو لڑکے اور چار لڑکیاں ہوئیں، ان کا قیام محلہ بالسٹی کھیت میں تھا۔ نظم نے حیدر آباد ہی میں زندگی گزاری۔ وہاں ان کا دل اس طرح لگ گیا تھا کہ لکھنؤ کبھی یاد نہ آیا بالآخر وہیں ۲۳ مئی ۱۹۳۳ء روز سہ شنبہ صبح پونے پانچ بجے انتقال کیا اور تکیہ قادری صاحب واقع ترپ بازار میں دفن ہوئے۔ کشن پرشاد نے ان کا مرثیہ لکھا جس میں ۱۶ بند ہیں۔ یہاں آخری بند نقل کیا جاتا ہے۔

ہندوستاں میں نظم کی ہستی تھی منتخب
لکھی ہیں شاد تم نے یہ تاریخیں بھی غضب
تھی گرم ان کے فیض سے یہ محفلِ ادب

بزم ادب جناں میں ہوئی پہنچے نظم جب (۱۳۵۲ھ)
صد حیف داغ داغ جگر کا بسر گیا (۱۹۳۳ء)
افسوس کیا ادیب یہاں سے گزر گیا (۱۳۴۲فصلی)

Energy Supports Life

Our track record portrays a spectacular success story of energy exploration in Pakistan.

We've completed with satisfaction four decades of our dedicated services in the vital energy sector of the country.

We're Pakistan's premier petroleum exploration and production company; discoverers and producers of the country's largest gas field—Sui and pioneers of gas industry in Asia

Our daily production of natural gas exceeds energy equivalent of 110,000 barrels of furnace oil. And we also produce substantial quantities of oil and LPG.

We have stepped up petroleum exploration through a number of joint ventures with leading oil companies.

Pakistan Petroleum Ltd.

NATIONAL PPL 1.91-R

ایرانی کہانی

سہ تار

جلال آل احمد/ محمد سلیم مظہر

بغیر کور کے ایک نیا سہ تار ہاتھوں میں لیے، گریبان کھولے وہ لاپروائی سے سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ "مسجد شاہ" کی سیڑھیوں سے تیزی سے نیچے اترا اور چھابڑی فروشوں اور اُن کی چھابڑیوں کے گرد نامعلوم چیزوں کی تلاش میں سرگرداں لوگوں کی بھیڑ سے بچ بچا کر قدم اٹھائے جا رہا تھا۔ اُس نے ایک ہاتھ سے 'ستار' کو سینے سے لگایا ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اُس کے تاروں کا خیال رکھے ہوئے تھا تاکہ کسی کے لباس کے بٹنوں میں نہ پھنسیں اور کسی قلی پر لدے ہوئے سامان میں الجھ کر ٹوٹ نہ جائیں۔

آخر کار آج اُس کی آرزو پوری ہو گئی تھی۔ اب اُسے کسی تقریب میں جاتے ہوئے دوسروں سے 'سہ تار' مانگنے اور پھر اُن کے خون بہا کے برابر کرایہ ادا کرنے اور ساتھ ہی احسان اٹھانے کی ضرورت نہیں تھی۔

اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور پیشانی پر گرتے ہوئے دائیں آنکھ کے آڑے آ رہے تھے۔ گال اندر کو دھنسے ہوئے اور چہرہ زرد تھا۔ لیکن قدموں میں عجیب توانائی تھی کہ وہ شوق اور مستی سے دوڑ رہا تھا کسی تقریب میں کسی خاص مناسبت سے جب وہ مدہوش ہو کر گیت گاتا اور ساز بجاتا تو اُس کی باطنی خوشیوں اور قلبی مسرتوں کے زیرِ اثر سامعین پر کیف و سرور کی حالت طاری ہو جاتی۔ لیکن اب وہ ایسے لوگوں میں سے کہ جنھیں خود نہیں معلوم تھا کہ وہ یہاں کس لیے گھوم پھر رہے ہیں، دوڑ کر اپنے آپ کو کسی ٹھکانے تک پہنچانے کے سوا کیا کر سکتا تھا وہ اس ستار کے بارے میں جواب اس کی اپنی ملکیت تھا، سوچ سوچ کے خوشی سے بے خود ہوئے جا رہا تھا۔

وہ خوش تھا کہ اب وہ وجد میں آ کر پوری قوت اور شوق سے ستار کے تار چھیڑے گا۔ تو اس کے دل میں یہ خلش نہیں ہوگی کہ کہیں تار نہ ٹوٹ جائیں اور ستار کا مالک روزِ روشن کو اس کے لیے سیاہ رات سے زیادہ تاریک نہ کر دے۔ اب وہ اس خوف سے بالکل آزاد ہو چکا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب وہ یوں فنکاری دکھائے گا اور اس طرح سے ستار کے تاروں کے ساتھ کھیلے گا اور وہ ہیجان پیدا کرے گا کہ خود بھی اُس کی تاب نہ لاتے ہوئے بے اختیار رو پڑے گا۔ اُسے یہ نہیں معلوم تھا کہ کیوں رو پڑے گا بس دل میں خواہش تھی کہ اس طرح ستار بجائے کہ خود رو دے۔ اُسے یقین تھا کہ جب وہ خود اپنے ستار کی دُھن پر رو پڑے گا تب ہی اُس نے اچھی طرح ستار بجایا ہوگا۔ ہمیشہ اُس نے دوسروں کے لیے ہی ستار بجایا تھا۔ ایسے لوگوں کے لیے جو اپنی گریزاں اور گمشدہ خوشیوں کو اُس کے ستار کی دُھنوں اور اُس کی غمگین آوازوں میں تلاش کرتے تھے۔

عیش و سرور کی محفلوں سے لبریز اُن تمام راتوں میں جب اُس نے گیت گائے اور ستار بجایا تھا، وہ محفلیں اور وہ عیش و سرور اُس کی ذات کے لیے صرف مصنوعی اور تکلیف دہ خوشی کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایسی تمام راتوں میں اپنے ساز کی دُھن پر اُسے کبھی رونا نہیں آیا تھا۔

ابھی تک وہ اس طرح ساز بجا ہی نہیں سکا تھا جو اُسے رلا دے۔ وہ محفلیں ایسی نہ تھیں، یا اسے پیسے دینے اور اپنے ہاں بلانے والے لوگ اس کے آنسوؤں کی قدر و قیمت نہیں جانتے تھے اور اُنھیں اپنا نہیں سکتے تھے۔ یا وہ خود اس خوف سے کہ کہیں ستار کے تار نہ ٹوٹ جائیں اپنی فنکاری اور توانائی سے کمتر ستار کے تار چھیڑتا رہا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ جس طرح وہ گا سکتا ہے اور ساز بجا سکتا ہے اب تک اس کے مقابلے میں سلامت اور احتیاط سے ہی ساز بجایا اور گیت گائے ہیں۔

اب وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ کہیں بھی گنجائش نہیں چھوڑے گا اور بالکل نہیں جھجکے گا۔ کیونکہ اپنے قول کے مطابق اب وہ ان "بے برکت" پیسوں سے ستار خرید سکا تھا، گویا وہ اپنی مراد پا چکا تھا۔ اب ستار اُس کا اپنا تھا، اب وہ بے خوف ہو کر اپنی مرضی کے مطابق اسے بجا سکتا تھا۔ اب وہ ایسی دھن بجا سکتا تھا جس پر خود بھی رو دے۔

وہ گزشتہ تین سال سے گیت گا رہا تھا، اسکول بھی اس وجہ سے چھوٹا تھا۔ وہ کلاس میں ہمیشہ سب سے پیچھے بیٹھتا اور زیر لب گنگناتا رہتا۔ اور کوئی اہمیت دے نہ دے مگر حساب کا استاد بہت سخت تھا اور یہ گنگناہٹ اسے اس قدر بُری لگتی کہ بعض اوقات اُسے کلاس سے نکلنا پڑتا۔ اُستاد نے تین چار مرتبہ تنبیہ بھی کی تھی کہ کلاس میں مت گنگنایا کرو لیکن بھلا یہ اس کے بس میں تھا۔ البتہ آخری سال کسی نے کلاس میں اُس کی گنگناہٹ نہ سنی۔ وہ رت جگے کاٹ کر اس قدر تھک چکا ہوتا کہ یا تو دوپہر تک بستر میں پڑا رہتا یا کلاس میں اونگھتا رہتا۔ لیکن یہ قصہ بھی دیر تک نہ چلا اور اُس نے جلد ہی پڑھائی چھوڑ دی۔

پہلے سال تو اس نے اپنے آپ کو بہت ہی تھکا دیا۔ ہر رات گیت گاتا اور ستار بجاتا اور ہر روز دوپہر تک سویا رہتا۔ لیکن پھر اُس نے آہستہ آہستہ اپنے شوق کو ذرا سی ترتیب دی اور اب ہفتے میں دو تین راتوں سے زیادہ لوگوں کی دعوتیں قبول نہیں کرتا تھا۔ کچھ مشہور بھی ہو گیا تھا اور ادھر اُدھر کے میوزیکل گروپس سے رابطہ کرنے کی بھی ضرورت نہیں رہتی تھی۔ لوگ اب اُسے پسند کرنے لگے تھے۔ اُس کے گھر جا کر اُس کی ماں کی منت سماجت کر کے منوا لیتے جس بنا پر اُسے بہرحال جانا پڑتا اور یوں اُن کی رات خوشی و مسرت سے گزر جاتی۔

اس کے باوجود اس کی منزل ابھی دور تھی، اس کے روز بروز کمزور ہوتے جانے پر ماں بہت فکر مند تھی، لیکن وہ خود اپنی صحت کو ذرا سی بھی اہمیت نہ دیتا۔ اُسے بس صرف یہی خیال رہتا کہ اس کے پاس اپنا ایک ستار ہو جسے وہ جس طرح چاہے بجا سکے۔ لیکن یہ آسانی سے ہوتا نظر نہیں آتا تھا۔ صرف حال ہی میں ایک کھاتے پیتے گھرانے کی شادی میں حاصل ہونے والے انعام میں سے کچھ رقم بچا کر وہ ایک نیا ستار خرید سکا تھا۔ اب جبکہ وہ ایک نئے ستار کا مالک بن چکا تھا، اُسے یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اور کس چیز کی خواہش کرے۔ بے شک اور بڑی بڑی آرزوئیں کی جا سکتی تھیں لیکن اس سلسلے میں اُس نے کچھ بھی نہیں سوچا تھا۔ ابھی وہ صرف اس فکر میں تھا کہ جس قدر جلد ممکن ہو وہ کسی جگہ پہنچ کر اپنے ستار کا اچھی طرح جائزہ لے اور اُسے خوب بجا کے دیکھے۔ حتیٰ کہ وہ اُس مصنوعی عیش و نشاط کے دوران بھی، جب ستار اُس کے ہاتھ میں ہوتا اور اُس کی دُھن پر گیت گاتے ہوئے اس قدر مدہوش اور بے سدھ ہو جاتا کہ کسی طرح بھی اپنی انگلیاں روک لینے کو اس کا جی نہ چاہتا، لیکن یہ کیسے ممکن تھا؟ گھر بیگانوں کا ہوتا، عیش و سرور بھی اُنھی کے لیے ہوتا وہ تو بس دوسروں کی محفل سجا سکتا تھا۔

اس تمام مدہوشی میں ابھی تک وہ اپنے لیے نہیں گا سکا تھا، اپنے دل کی تڑپ کا سامان پیدا نہیں کر سکا تھا۔
سردیوں کی طویل و سیاہ راتوں میں جب وہ اسی قسم کی محفلوں سے تھکا ماندہ واپس لوٹتا اور تاریکی میں اپنے گھر کا راستہ تلاش کرتا تو اس اندرونی تڑپ کی ضرورت اس قدر زندہ اور جاندار محسوس ہوتی کہ وہ محسوس کرتا کہ شاید اس کے بغیر وہ خود کو اپنے گھر تک بھی نہیں گھسیٹ سکے گا۔ کئی دفعہ ایسے مواقعے پر وہ گھبرا جاتا اور اپنی اس گمشدہ تڑپ کی تلاش میں معلوم نہیں اس کی کتنی راتیں مئے خانے میں گزر جاتیں۔
وہ بہت لاغر تھا، پہلی نظر میں تو شئی سا لگتا۔ لیکن جو جوش اور شوق آج اپنے دل میں محسوس کر رہا تھا اور جو تڑپ ایک گھنٹے پہلے سے اب تک، یعنی جب سے وہ ستار کا مالک بنا تھا، اُس کے اندر موجزن تھی، اس سے اس کے رُخسار کھل اٹھے تھے اور پیشانی چمک رہی تھی۔
اپنے خیالات میں مگن وہ "مسجد شاہ" کے بڑے دروازے پر پہنچ گیا اور جونہی اُس نے پاؤں مسجد کی دہلیز کے صاف پتھر پر رکھا۔ ایک عطر فروش لڑکا، جو مسجد کے چبوترے کے کنارے واقع اپنی دکان کی نگرانی کر رہا تھا اور گاہکوں کے انتظار میں تسبیح کے منکے پھیر رہا تھا، دکان کی گدی سے نیچے کودا اور اُس کی کلائی پکڑلی۔
بے دین، اس آلۂ کفر کے ساتھ مسجد میں؟ خدا کے گھر میں؟
اُس کی آرزوؤں کی مالا ٹوٹ گئی۔ اور وہ ذوق و شوق کا طوفان جو ابھی ابھی اُس کے دل میں موجزن ہوا تھا، محو ہو گیا۔ پہلے تو وہ ذرا سا چکرایا پھر آہستہ آہستہ اوسان بحال ہوئے تو سمجھ پایا کہ لڑکا کیا کہہ رہا ہے۔ ابھی کسی اور نے اُن کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔ لوگوں کی بھیڑ بھی نہیں۔ اور پھر سبھی چھابڑی فروشوں سے مول تول کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ اُس نے کچھ بھی نہ کہا بس کلائی چھڑانے کی کوشش کی تاکہ اپنا راستہ لے لیکن عطر فروش لونڈا چھوڑنے والا نہیں تھا۔ اُس نے اُسے کلائی سے پکڑا ہوا تھا اور مسلسل لعنت ملامت کرنے کے ساتھ ساتھ شور مچائے جا رہا تھا۔
بے دین، خدا کا خوف نہیں ہے، آخر شرم و حیا........ بھی کوئی چیز ہے۔
اُس نے پھر کوشش کی کہ کلائی چھڑا کے اپنے کام کو جائے، لیکن وہ لونڈا اس آسانی سے ماننے والا نہیں تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنی دکان پر گاہکوں کے نہ آنے کا نقصان اُس سے پورا کرنا چاہتا ہو۔ آہستہ آہستہ لوگ بھی متوجہ ہونے لگے اور اُن کے گرد جمع ہو گئے۔ لیکن کسی کو کچھ علم نہیں تھا کہ مسئلہ کیا ہے۔ ابھی تک کسی نے دخل اندازی بھی نہیں کی تھی۔ وہ بیچارہ بُری طرح پھنس گیا تھا۔
ایسا لگتا تھا جیسے کوئی حادثہ پیش آنے والا ہو۔ اُس کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا پہلے اُس نے دل میں اور دماغ میں جوش کی لہر محسوس کی، پھر یکدم غصے میں آپے سے باہر ہو گیا اور دوسرے ہاتھ سے لڑکے کے گال پر زوردار تھپڑ دے مارا۔ لڑکے کا سانس اکھڑ گیا اور وہ لعنت ملامت کرنا بھول گیا۔ اُس کا سر چکرایا اور کلائی چھوڑ کر دونوں ہاتھوں سے گال سہلانا شروع کر دیا۔ لیکن پھر جیسے اُسے کچھ یاد آ گیا ہو وہ تیزی سے اپنی جگہ سے اچھلا۔ وہ ستار کے ساتھ مسجد میں داخل ہو رہا تھا کہ لڑکے نے اُس کے کوٹ کا دامن جا کھینچا۔ اور دوبارہ کلائی پکڑلی۔
جھگڑا شروع ہو چکا تھا، بہت سے لوگوں نے چھڑانے کی کوشش کی لیکن لڑکا چلاتے ہوئے گالیاں دینے کے ساتھ ساتھ بے دینوں پر لعنت بھیج رہا تھا۔ خدا کے گھر کے آستانے کی توہین پر وہ بہت غصے ہو رہا تھا اور مسلمانوں کو مدد کے لیے پکار رہا تھا۔

کسی کو سمجھ نہ آیا کہ کیا ہوا۔ خود اُسے بھی پتہ نہ چلا۔ بس جب اُس کا ستار اپنے لکڑی کے بنے تونبے کے ساتھ زمین پر جا گرا اور ایک مختصر مگر زور دار آواز کے ساتھ ٹوٹ کر تین ٹکڑے ہو گیا اور اُس کے تار آپس میں اُلجھ گئے اور اکٹھے ہو کے دور جا گرے تو وہ حیران و مبہوت رہ گیا اور حسرت سے مجمعے کو دیکھنے لگا۔ عطر فروش لڑکے کو اطمینان ہو گیا کہ اُس نے اپنا دینی فریضہ ادا کر دیا ہے وہ دل سے خدا کا شکر ادا کر کے دوبارہ دکان کی گدی پر جا بیٹھا اور اپنے چہرے اور سر کے بالوں کو سنوار کر تسبیح ہاتھ میں لیے ذکر میں مشغول ہو گیا۔

اُس کی آرزوئیں بھی ستار کے کئی تاروں کی مانند باہم الجھیں اور اکٹھی ہو کر اُس ٹھنڈک میں جو اُس کے دل میں داخل ہو کر آہستہ آہستہ دماغ میں سرایت کر گئی تھی، برف بن گئیں اور وہ نیم جان ہو کر ایک کونے میں جا گرا۔ اُس کے ارمانوں کا جام بھی اس نئے ساز کے پیالے کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور یہ کرچیاں اُس کے دل کو زخمی کرنے لگیں۔

جلال آل احمد کے افسانوں کے مجموعہ "سہ تار" سے ترجمہ کیا گیا۔

مترجم: محمد سلیم مظہر، پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ فارسی تہران یونیورسٹی تہران، ایران لیکچرر شعبہ فارسی، پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور

ازراہِ کرم مضمون کی اوریجنل کاپی ارسال کریں

آج کل کا ایک دن

تحریر: گیبرئیل گارسیا مارکیز
ترجمہ: ظفر عظیم

سوموار کی صبح گرم اور خشک تھی۔ اور یلو ایسکوار جو بغیر ڈگری کا ڈینٹسٹ تھا۔ صبح جلدی اٹھنے کا عادی تھا، اپنا دفتر چھ بجے ول دیتا تھا۔ حسب معمول دفتر آکر اس نے پلاسٹر کے مولڈ پر لگے ہوئے نقلی دانت اور میز پر رکھے ہوئے گلاس کیس میں سے بند اوزار جنھیں وہ اونچائی نیچائی کے حساب سے حرکت دیتا تھا جیسے ان کی نمائش ہورہی ہو۔

ں نے بغیر کالر کی دھاری دار قمیض پہنی ہوئی تھی۔ جو گردن کے نزدیک ایک سنہری بٹن سے بندھی ہوئی تھی اور پینٹ کو سپنڈرز" کے ذریعے پہن رکھا تھا، وہ سیدھا اور محنتی شخص تھا اُس کا حلیہ عجیب و غریب تھا، ایسا جیسے بہرے آدمی خلا میں ور تے رہتے ہیں۔

جب اس نے میز پر تمام چیزوں کو رکھ لیا تو ڈینٹل کرسی کو اپنی طرف کھینچا اور پھر نقلی دانتوں کو پالش کرنے کے لیے بیٹھ گیا برمے کو اپنے پیروں سے چلاتے ہوئے (حتیٰ کہ اس وقت بھی جب اسے اس کی ضرورت نہ تھی) اپنے کام میں غرق تھا۔

آٹھ بجے وہ کچھ دیر کے لیے رکا اور کھڑکی سے آسمان کو دیکھنے لگا مکان کے چھجے کے بانس پر دو مفکر بگلے اپنے آپ کو سورج کی دھوپ میں خشک کر رہے تھے، فضا کو دیکھ کر اس نے اندازہ کیا بارہ بجے سے پہلے بارش ہوگی۔ وہ پھر اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔

اس کی محویت کو بچے کی تیز آواز نے توڑ دیا۔

"بابا"

"کیا ہے"

"منیر یہ جاننا چاہتا ہے کہ کیا تم اس کا دانت نکال دو گے۔"

"اس سے کہہ دو کہ میں یہاں نہیں ہوں"

وہ ایک سنہری دانت کو پالش کر رہا تھا۔ اس نے اسے ایک ہاتھ کی دوری پر رکھا اور بغور اپنی کارکردگی کو دیکھنے لگا۔

اس کا بچہ انتظار گاہ سے پھر چلایا "بابا" وہ کہہ رہا ہے کہ تم اندر ہو کیونکہ وہ تمہاری آواز سن رہا ہے۔

ڈینٹسٹ بدستور دانت کا معائنہ کرتا رہا۔ اپنا کام مکمل کر کے اس نے دانت کو میز پر رکھا اور کہنے لگا "اچھا اگر ہے تو کیا"
اور پھر برمے کو گھمانے لگا۔

ایک کارڈ بورڈ بکس جس میں وہ نامکمل چیزوں کو رکھتا تھا، دانتوں کے ایک پُل کے کئی حصّے نکالے اور ان پر سونے کی پالش شروع کر دی۔

"بابا"

"کیا ہے"

"وہ غصّے میں ہے، کہہ رہا ہے کہ اگر تم نے اس کا دانت نہیں نکالا تو وہ تمھیں گولی مار دے گا۔" ڈینٹسٹ نے نہایت اطمینان سے برمے کو چلانا ختم کیا اور اسے کرسی کے پاس سے دور ہٹایا۔ میز کی نچلی دراز کھولی۔ وہاں سے اپنے ریوالور کو ہاتھ میں تھاما اور پھر کہنے لگا اچھا اس سے کہو کہ وہ اندر آئے اور مجھے گولی مار دے۔

اس نے کرسی کو دروازے کے مقابل گھمایا۔ اس کا ہاتھ بدستور دراز کے کنارے پر دھرا تھا۔ میئر دروازے پر ظاہر ہوا اس نے اپنے بائیں جانب کے چہرے کو شیو کیا ہوا تھا۔ جبکہ دوسری جانب سوجن نمایاں تھی۔ پانچ روز پرانی داڑھی نظر آ رہی تھی۔ ڈینٹسٹ کو اس کی بجھی ہوئی آنکھوں سے کئی راتوں کا انہانا خوف نظر آیا۔ اس نے اپنی انگلیوں کی مدد سے دراز بند کی اور نرمی سے کہا،

"بیٹھ جاؤ"

"صبح بخیر"

"صبح بخیر"

جس دوران گرم پانی میں دانت نکالنے کے اوزار اُبل رہے تھے میئر نے اپنے سر کو کرسی کے ہیڈ سیٹ پر آہستہ سے رکھا۔ وہ کچھ افاقہ محسوس کرنے لگا۔ اس کی سانس بہت سرد تھی۔

یہ ایک خستہ حال دفتر تھا۔ ایک پرانی لکڑی کی میز پر ایک شیشے کے مرتبان میں چھوٹی بوتلیں رکھی تھیں۔ کرسی کی دوسری جانب ایک کھڑکی تھی جس پر کندھوں تک اونچا پردہ پڑا ہوا تھا۔ جونہی میئر نے ڈینٹسٹ کی آمد کو محسوس کیا اُس نے اپنی ایڑیاں کو ملایا اور منہ کھول دیا۔ اور یلوا ایسکوار نے اپنا سر روشنی کی جانب گھمایا اور متاثرہ دانت کا معائنہ کرتے ہوئے میئر کے جبڑے کو احتیاط کے ساتھ اپنی انگلیوں کے ذریعے بند کر دیا۔

"یہ بغیر سُن کیے ہوئے نکالنا ہو گا۔"

کیوں؟

"اندر منہ میں پھوڑے بن گئے ہیں۔"

میئر نے اس کی آنکھوں میں جھانکا "اچھا" اس نے کہا، اور مسکرانے کی کوشش کی۔ لیکن ڈینٹسٹ جواباً مسکرایا نہیں۔

اُس نے جراثیم کش اوزاروں کے بیسن کو کام کرنے کی میز کے قریب لایا اور اطمینان سے اوزاروں کو ایک چھوٹی چمٹی کی مدد سے پانی سے باہر نکالا۔ ہاتھ صاف کرتے ہوئے جو پانی کے قطرے گرے تھے، ان کو اس نے اپنے جوتے کی ایڑھی سے مسل دیا۔ اس دوران اس نے میئر کی طرف کوئی توجہ نہیں کی لیکن میئر اپنی نظریں اس پر جمائے ہوئے تھا۔

یہ عقل داڑھ تھی۔ ڈینٹسٹ نے اپنے پیر پھیلائے اور پھر گرم فورسیپ سے دانت کو پکڑلیا۔ منیر نے کرسی کے بازوؤں کو پکڑلیا۔ اپنی پوری قوت سے پیر فرش پہ جمائے اور پھر اسے ایک برفیلی چبھن اپنے گردوں میں محسوس ہوئی۔ لیکن اس نے کوئی آواز نہیں نکالی۔ ڈینٹسٹ نے صرف اپنی کلائی کو بغیر جنبش دیے ہوئے ہلایا۔ اور سرد مہری سے کہنے لگا "اب تم بیس لوگوں کو کھانا کھادینا۔"

منیر کو اپنے جبڑوں کی ہڈیوں میں ارتعاش محسوس ہوا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ لیکن جب تک اسے یہ محسوس نہ ہوا کہ دانت باہر آگیا ہے اس نے سانس نہیں لی۔ اسے اب درد کے مقابلے میں سکون محسوس ہورہا تھا۔ وہ پچھلے پانچ راتوں کی تکلیف کو بھول گیا۔

بیسن پر جھکتے ہوئے سانس لیتے ہوئے اس نے اپنے گریبان کو کھولا اور پھر اپنے پینٹ کی جیب سے رومال نکالنے کی کوشش کی۔ اتنے میں ڈینٹسٹ نے اسے ایک کپڑا دیا۔

"اپنے آنسو پونچھ لو" اس نے کہا۔ منیر نے ایسا ہی کیا۔ وہ کانپ رہا تھا۔

جب ڈینٹسٹ اپنے ہاتھ صاف کر رہا تھا تو اس نے گرتی ہوئی چھت اور گرد آلود مکڑی کے جالے کو دیکھا جس میں مکڑی کے انڈے اور مری ہوئی مکڑی پڑی تھی، اور پھر ہاتھ کو خشک کر کے واپس آگیا۔

اب آرام کرو اور نمک کے پانی سے غرارے کرلینا۔"

منیر اٹھا اور اپنی ٹانگوں کو پھیلائے ہوئے دروازے کی طرف چلا۔ اس کا گریبان ابھی تک کھلا ہوا تھا۔

"بل بھیج دینا۔"

"تمہیں یا ٹاؤن کمیٹی کو۔"

منیر نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔ اس نے سکون سے دروازہ بند کیا اور کہا، "ایک ہی بات ہے۔"

بادل / مصطفیٰ آفاق

ابھی میں بچہ ہی تھا

ابھی میں بچہ ہی تھا
کہ میری شادی ہو گئی
ابھی میں بچہ ہی تھا
کہ میرے گھر میں
بچوں کے رونے کی آوازیں گونجنے لگیں

ابھی میں بچہ ہی تھا
کہ میرے بچے بڑے ہو گئے
ابھی میں بچہ ہی تھا
کہ میرے گھر میں بہوئیں آئیں
اور بیٹیاں وداع ہو گئیں

ابھی میں بچہ ہی تھا
کہ میری بیوی کا چہرہ جھریوں سے بھر گیا
ابھی میں بچہ ہی تھا
کہ میرے گھر میں سرگوشیاں ہونے لگیں
"یہ بوڑھا تو مرتا ہی نہیں"

(سندھی سے ماخوذ

انا اخمتووا/ادیب سہیل

لینن گراڈ پر پہلی بمباری

یہ میرا تیسرا موسمِ بہار ہے لینن گراڈ سے دور
تیسرا...... لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ میرا آخری
موسمِ بہار ہوگا۔

لیکن میں مرتے دم تک یہ نہیں بھولوں گی
کہ میں نے درختوں کے سائے میں بہتے ہوئے
پانی کی صدا سے کس طرح محبّت کی۔

آڑو کے درخت میں پھل اپنے شباب پر ہے
بنفشی گُہر خوشبو بکھیر رہی ہے۔
کسی کی ہمّت ہوگی جو یہ کہہ سکے
کہ میں ایک بیگانہ سرزمین میں ہوں؟

(۱۹۴۴-۱۹۵۶)

وعدہ

ممکن ہے یہ وہی عورت ہو
جس نے اپنے محبوب کو رخصت کرتے ہوئے کہا۔

اپنے صدموں کو طاقت میں بدل دو،
اپنے آنسوؤں کو اسلحہ بنالو
ہم اپنے بچّوں سے قسمیہ وعدہ کرتے ہیں،
اور اُن سے بھی جو آسودہ خاک ہیں۔
کہ کوئی مجھے اپنے سامنے جھکنے پر مجبور نہ کرسکے گا۔

جولائی
۱۹۴۱ء لینن گرا

رفتار ادب

(تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

جہاتِ اقبال

ڈاکٹر تحسین فراقی
صفحات ۲۵۶ قیمت -/۱۰۰ روپے
بزمِ اقبال۔ ۲۔ کلب روڈ۔ لاہور

"جہاتِ اقبال" ڈاکٹر تحسین فراقی کی تازہ کتاب ہے۔ جو جہاتِ اقبال کی تفہیم کے سلسلے میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔ اس میں شامل مضمون "جلوہ خوں گشت و نگاہے بہ تماشا نہ رسید" قاری کے ذہن پر بہ حیثیت مجموعی اچھے نقوش مرتب کرتا ہے۔ یوں تو اس کتاب کے دوسرے مضامین میں بھی صاحبِ کتاب کا تنقیدی مزاج و مذاق بہ خوبی ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن زیرِ بحث مضمون اس لیے ان سب سے مختلف ہے کہ یہاں اُن کی تنقید کے پس پردہ کار فرما وہ بے چین آرزو ظاہر ہوتی ہے جس کی منزلِ آخر اقبال کے فکروفن کی حقیقی روح تک رسائی ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے اپنے اس مضمون میں اقبال کے ناقدین کے چار گروہ کی شناخت کی ہے ان چاروں گروہ کے بیشتر ناقدین کی ناکامی کے اسباب تک رسائی حاصل کرنے کی سعی میں جو استنباطِ نتیجہ کیا ہے، وہ بہت حد تک لائق اعتنا ہے۔ البتہ مجنوں گورکھپوری اور ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے لیے مدرّس نقاد کے الفاظ کا استعمال مناسب نہیں۔ اس میں کلیم الدّین احمد کو بھی شامل کرلیجیے۔ یہ تینوں حضرات صاحبِ الرّائے اور اُردو تنقیدی ادب کے ہراول تھے اِن کے تنقیدی سرمائے سے اُردو تنقید بڑی باثروت ہوئی ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ علامہ اقبال کی تفہیم جس طرح زید نے کی ہے اُسی طرح بکر بھی کرے۔ کسی ایک شے کی تفہیم کبھی دو یا زیادہ اشخاص نے ایک طرح سے نہیں کی اور ایسا ہونا ممکن بھی نہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ کسی ایک شخص کی آرا سے اختلاف یا اُس کی تحریر کے کسی حصّے پر حرف زنی تو کی جاسکتی ہے لیکن اُسے یکسر رد نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اصولِ تنقید کے منافی ہے۔ حضرت ذوقؔ نے اِس رمز کو سمجھ کر ہی یہ شعر کہا تھا:

گلہائے رنگ رنگ سے زینت چمن کی ہے
اے ذوقؔ اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

اختلاف ہی سے یکسانیت کی تنی ہوئی ڈور ٹوٹتی ہے اور دیوار میں دراڑ پڑتی ہے جس کے نتیجے میں نئے نئے روزن کھلتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اقبال پر اب تک جو کچھ لکھا گیا اور جو کچھ آگے بھی لکھا جائے گا وہ سب مل کر ہی علامہ اقبال کی فکری و فنی شخصیت

کی تکمیل کریں گے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نئی نسل کے نقاد ہیں، سوچ کی ایک خاص نہج رکھتے ہیں، وہ علامہ پر لکھے گئے ہزاروں ہزار صفحات سے نا مطمئن نظر آتے ہیں اُن کا خیال ہے کہ:

"اقبالیات کو ابھی ایسے عمق بین ناقد کی تلاش ہے جو قطرے میں دجلہ دیکھے اور دکھا سکے......"

ڈاکٹر تحسین نے اپنے اسی مضمون میں علامہ اقبال پر تحریر کردہ ہزاروں ہزار صفحات کو آج کی اصطلاح میں اُفقی صف کا نمائندہ شمار کیا ہے۔ بہ الفاظ دیگر انھیں ایسی تحریروں کی جستجو ہے جو علامہ کے کلام کی عمودی جہت کے حوالے سے تاویل کر سکے۔ ڈاکٹر تحسین صاحب شاید تفہیم کی اُس منزل کی تلاش میں ہیں جو اُفقی و عمودی سمتوں کا مقامِ اتصال ہو۔ اگر ایسا ہے تو پھر اُن کے مذکورہ مضمون کے منشا کو لبیک کہنا چاہیے۔ علامہ اقبال خود تمام عمر اِسی "مقامِ اتصال کی جستجو میں سرگرداں رہے اور اِسی توازنِ خیال کی تبلیغ کرتے رہے!

(ا۔ س)

دیدہ و شنیدہ

(خود نوشت)

سید شہاب الدّین دیسنوی

صفحات ۱۳۶ قیمت ۳۵/۰۰ روپے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

جناب سید شہاب الدّین نے اپنی خود نوشت تصنیف کا نام "دیدہ و شنیدہ" رکھا ہے، اِس کے مطالعہ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اِس میں "دیدہ" کا حصّہ زیادہ ہے۔ اگر شنیدہ ہے بھی تو دال میں نمک کے برابر۔ چنانچہ متن میں "شنیدہ کی اِس مقدار نے کتاب کے مطالعے میں حلاوت پیدا کر دی ہے۔

ہر خود نوشت کسی نہ کسی شخصیت سے متعلق اور ہر شخصیت، دوسری شخصیت سے مختلف ہوتی ہے، نتیجتاً ایک قاری ہر ایک خود نوشت کے مطالعے کے دوران ایک مختلف فضا اور ایک جداگانہ منطقے سے گزرتا ہے۔ جناب شہاب دیسنوی کی خود نوشت ہمیں ایک ایسی ہی نئی جداگانہ فضا سے ہمکنار کرتی ہے۔ جہاں جگہ جگہ دیسنوی صاحب کے تجرباتِ زندگی، اُن کے اطوارِ کارکردگی، اُن کی سادہ منشی اور اُن کے جذبۂ ایثار سے ہمارا سامنا ہوتا ہے۔

خود نوشت میں زندگی کے بہت سے اہم واقعات کے ساتھ کچھ غیر اہم بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ ان کی حیثیت کھیت میں فصل کے ساتھ اُگنے والے خودرو گھاس پھوس کے مصداق ہے۔ اِس سے کھیت کے مجموعی محاسن میں فرق نہیں پڑتا۔

شہاب دیسنوی صاحب کی خود نوشت "دیدہ و شنیدہ" کا آغاز نہایت سادہ تعارف سے ہوتا ہے اور جلد ہی قارئین پر یہ خوشگوار انکشاف ہوتا ہے کہ ان کا آبائی وطن علامہ سید سلیمان ندویؒ اور مولانا صباح الدّین عبد الرّحمٰن کا گاؤں دیسنہ ہے جو مخدوم شرف الدّین یحییٰ منیریؒ کی آخری آرام گاہ بہار شریف سے دس کیلومیٹر پر واقع ہے۔

یوں تو کتاب کے سارے مندرجات دلچسپ ہیں لیکن ایک واقعہ بہ طورِ خاص ہماری دلچسپی کو اپنی جانب مبذول کرتا ہے۔ وہ

واقعہ ۱۹۴۰ء میں قائد اعظم محمد علی جناحؒ سے شہاب صاحب کی (بمبئی میں) ملاقات سے تعلق رکھتا ہے یہ ملاقات قائد اعظم کی شخصیت کے کچھ مزید روشن پہلو کو ظاہر کرتی ہے۔ علاوہ ازیں اس کتاب میں شامل مضمون، بہ عنوان "غالب کا خط، رفیق زکریا کے نام" دلچسپ اور قابل مطالعہ ہے۔ اس سے صاحبِ کتاب کی تحریری صلاحیت کا جوہر کھلتا ہے اور اُن کی تحریر کا باغ و بہار رُخ سامنے آتا ہے۔

کہتے ہیں کہ آرائش بعض اوقات بُرائی اور بدصورتی کا پردہ بن جاتی ہے، لیکن اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں کہیں آرائش کا نام نہیں، ایک مسحور کرنے والی سادہ بیانی ہے جو مصنف کے مزاج کی عین مظہر ہے، مزاج کی یہ سادگی ہمارے لیے "دیدہ" کے زمرے میں اُس وقت آئی جب شہاب دیسنوی صاحب اب سے چند سال پہلے کراچی تشریف لائے اور ایک دن انجمن ترقی اُردو میں مدعو ہوئے۔ یہاں شخص و عکس کو یکجا دیکھ کر یہ باور آیا کہ شخص و عکس میں سرِ مو فرق نہیں۔

کتاب صاف ستھری طبع ہوئی ہے۔

(ا۔ س)

جیون سائے

مصنف ایرش فریڈ/مترجم منیر الدّین احمد
صفحات ۱۵۸ قیمت ۔/۱۲۵ روپے
۳۳۔ سی۔ ۳۔ گلبرگ۔ لاہور

ڈاکٹر منیر الدّین احمد ایک تخلیقی فنکار ہیں۔ اُن کے دو افسانوی مجموعے "زرد ستارہ" اور "شجرِ ممنوعہ" شائع ہو کر ادبی حلقوں میں مقبول ہو چکے ہیں، اُن کی زیرِ نظر کتاب "جیون سائے" مشہور جرمنی شاعر ایرش فریڈ کی سو نظموں کے تراجم پر مشتمل ہے۔ منیر الدّین احمد نے براہ راست جرمن زبان سے ترجمہ کیا ہے۔ وہ بارہ چودہ سال سے جرمنی میں مقیم ہیں اور وہاں کے منثور و منظوم ادب کو اُردو میں منتقل کرتے رہتے ہیں۔ وہ اس کلیے پر یقین رکھتے ہیں کہ ادب میں ترجمہ تازہ ہوا کے مترادف ہے اور ایک ادب کا ترجمہ دوسرے ادب کو باثروت بناتا ہے۔

منیر الدّین احمد نے جرمن شاعر ایرش فریڈ کے شعری نظریہ کے بارے میں واضح طور پر کتاب کے دیباچہ میں کہہ دیا ہے، کہ اُس کا تعلق بائیں بازو کی سوچ سے تھا۔ لیکن وہ خود کبھی کسی بائیں بازو کی تحریک کا ممبر نہیں رہا اس سے اس کی فکری جہت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ایرش فریڈ کی نظمیں سارے جہاں کے درد کا احاطہ کرتی ہیں۔ اِسی سبب سے اُس کی نظموں میں دردمندی بین الاقوامی لہر بن کر ظاہر ہوتی ہے۔

ایرش فریڈ کی نظموں کی ہئیت و ساخت مختصر ہے، ایک یا چند مصرعوں کی نشست و برخواست بدل بدل کر نظم کی تعمیر کرنا اور معنویت پیدا کرنا ایرش فریڈ کا محبوب فن تھا۔ مجھے ان نظموں کو پڑھتے ہوئے جرمن "افورزم" (AFFORISM) کی یاد آئی ہے جسے خود منیر الدّین نے اب سے بہت پہلے "قومی زبان" کے ذریعے متعارف کرایا تھا۔ مجھے ایرش فریڈ کی بیشتر نظموں کی کرنت میں "افورزم" کا اثر دکھائی دیتا ہے۔ مثال میں اُداس، سوالات، بامطلب اور دوسرے بہت سے تراجم پیش کیے جاسکتے ہیں"

بامطلب:

اگر جینا
با مطلب ہوتا
تو جینے کا
کوئی مطلب ہوتا۔
اگر اُمید کرنا
با مطلب ہوتا
تو اُمید کرنے کا
کوئی مطلب ہوتا ۔
اگر مرنے کی خواہش
با مطلب ہوتی
تو مرنے کی خواہش کا
کوئی مطلب ہوتا
تقریباً ہر بات کا کوئی مطلب ہوتا
اگر وہ نا مطلب ہوتی ۔

جرمنی کے اِس صاحب طرز شاعر کا تعارف اُردو ادب کے سرمائے میں یقینی ایک قابلِ قدر اضافہ اور منیر الدّین احمد کی مساعی لائق تحسین ہے۔

کتاب خوبصورت چھپی ہے، جس کو ادارۂ ادب لطیف لاہور نے چھاپا ہے۔

(ا۔ س)

ست رنگی آنکھیں

احسن سلیم

صفحات ۱۴۴ قیمت ۷۵/= روپے

پتا:- ۱۸۵۷۔ ایکس آرمی کے ٹی کے کالونی عبد القیوم روڈ حیدر آباد سندھ

"ست رنگی آنکھیں" ایک بے چین روح کی پکار ہے، جسے وجدان کے ہاتھ نے کم وقت میں رقم کیا ہے۔ یہ وجدان ہی کا ہاتھ ہے جو اتنی طویل شے کو ایک نشست یا ایک موڈ میں لکھ سکتا ہے۔

"ست رنگی آنکھیں" کے عنوان سے ذہن دھنک کی طرف جاتا ہے جس کے سات رنگ ہیں۔ لیکن انھیں سات رنگوں کے بطون سے بے شمار رنگ نمودار ہوتے ہیں۔ ان سب کا اظہار شعور کی رو کے ذریعے سے ہوا ہے، شعور کی رو ہموار و مسلسل نہیں۔ یہ اپنا سفر شگفتوں کی مدد سے طے کرتی ہے، کہیں کہیں یہ چھلاوہ کا احساس بھی دلاتی ہے، اس کی معیت میں ایک قاری اساطیر، تاریخ

روایت اور عصر کے بہت سے انجانے دیاروں سے گزرتا ہے۔

اس کتاب کو بہ یک نشست پڑھ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ صاحبِ کتاب کا جدیدیت سے لگاؤ سچا ہے، اس پر نام نہاد کا اطلاق کسی طور نہیں ہو سکتا، اس کی جدیدیت بے چین روح کی پرداختہ ہے۔ اس کتاب کے بارے میں کچھ اور کہا جائے یا نہیں ایک بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اس سے اُردو ادب میں ایک نئی تحریری روایت کی داغ بیل پڑتی ہے۔ اور نئے امکانات روشن ہوتے ہیں۔

اس کتاب کو کچھ صاحبانِ نظر نے ناول کہا ہے، کچھ اسے نثری نظم کے خانے میں داخل کرتے ہیں۔ صاحبِ تصنیف احسن سلیم اس کتاب کو تاریخ کا مکالمہ کہتے ہیں۔ دیکھا جائے تو یہ تینوں رُخ اس کتاب میں موجود ہیں، شروع سے آخر تک اس کا پیرایۂ بیان نثری نظم کا ہے، یہ اینٹی اسٹوری کی تکنیک میں لکھے گئے ناول سے مشابہ ہے اور اس کی عمارت مکالمے پر کھڑی ہے۔ مکالمے ہی مکالمے میں بہت سے حقائق سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے، ایک مثال شہزادہ سلیم کی ہے جسے ظاہرا ایک بزرگ کی دعاؤں کا مرہونِ منت سمجھا جاتا ہے، معاملہ کی چھان بین یہ بتاتی ہے کہ "ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ"

اس کتاب کو اگر نثری نظم کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس میں ' ایسے بہت سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ملیں گے کہ آپ کا دامن دل پکڑ کے کھڑے ہو جائیں گے جناب قمر جمیل نے اپنے تعارفی مضمون میں ایسے کتنے ہی خوبصورت ٹکڑوں کی نشاندہی کی ہے۔ اس کتاب کی جو بات بہ طور خاص اچھی لگی ہے وہ یہ کہ احسن سلیم ادب میں نئی جہت کے ہمہ دم متلاشی ہیں اور ایک نہ ختم ہونے والے پیاس سے رشتہ جوڑ لیا ہے۔

دشتِ تہہ آب

شنا گور کھپوری

صفحات ۹۶ قیمت ۱۰۰/- روپے

دارالادب ۱۴/۹۴، ۵ ڈی نارتھ کراچی، کراچی ۷۵۵۸

"دشتِ تہہ آب" جناب شنا گور کھپوری کا تیسرا شعری مجموعہ ہے۔ پہلا شعری مجموعہ "دُھند میں آفتاب" (۱۹۸۶ء) اور بعد ازاں "قصیدۂ مسجد الحرام" منظرِ عام پر آیا تھا۔ "قصیدۂ مسجد الحرام" کے بارے میں جناب حکیم محمد سعید دہلوی لکھتے ہیں کہ "اُردو شاعری میں نعت کے حوالے سے مدینہ منورہ کا ذکر تو ایک شعری روایت کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ لیکن کعبتہ اللہ کا قصیدہ اب تک کسی اُردو شاعر نے نہیں لکھا........"

"قصیدۂ مسجد الحرام" ہو یا "دشتِ تہہ آب" انھیں پڑھ کر جو بات ذہن نشین ہوتی ہے وہ یہ کہ قدرت نے شنا گور کھپوری کو لفظوں کی پرکھ اور اس کے برمحل استعمال کا سلیقہ عطا کیا ہے، جس کے سبب سے شعروں کی معنویت چمک اُٹھتی ہے۔

"دشتِ تہہ آب" چار کم سو صفحات پر مشتمل شعری مجموعہ ہے۔ اس کے کچھ صفحات "پروز پوئیٹری" کے لیے مختص کیے گئے ہیں اور باقی صفحات پر غزلیں ہیں، غزلوں میں جا بجا گہرے شعورِ درد کی رونمائی ہوئی ہے۔ اس لیے جا بجا لو دیتے ہوئے شعر سے سامنا ہوتا ہے۔ "پروز پوئیٹری" کے موضوعات بھی قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں۔ جو شاعری اپنی طرف متوجہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو سمجھ لینا چاہیے کہ اس میں کہیں نہ کہیں کوئی آگ ضرور پنہاں ہے۔

بہ حیثیت مجموعی شاہ گور کھپوری کا مختصر شعری مجموعہ "دشتِ تہہ آب" اردو ادب کے شعری سرمائے میں ایک قابلِ ذکر اضافہ ہے۔

(ا - س)

آگہی سزا ہوئی

غالب عرفان
صفحات ۱۴۴ قیمت ۱۴۰/۰ روپے
مکتبہ سائبان - ایل ۱۵ / ۷، ۵، سی ۱۴ نارتھ کراچی - کراچی

"آگہی سزا ہوئی" غالب عرفان کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ہے، غالب عرفان حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے، صوبہ بہار کے صنعتی شہر جمشید پور معروف بہ ٹاٹا نگر میں بچپن و لڑکپن گزارا، وہیں اعلیٰ تعلیم حاصل کی، پھر وہ اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ مشرقی پاکستان چلے آئے اور وہاں ساحلی شہر چاٹگام میں بود و باش اختیار کی، سقوطِ ڈھاکا کے بعد ۱۹۷۴ء میں کراچی آ گئے۔

غالب عرفان کا ذوقِ شعری جمشید پور کی دین ہے اُن کی شاعری چاٹگام میں پروان چڑھی، رَس پر کراچی میں آئی۔ چاٹگام کی سر کشیدہ سرزمین نے ان کی شاعری کو بہت کچھ دیا۔ سر کشیدہ میں نے اس لیے کہا کہ کلپنا کی قیادت میں "آرمری ریڈ" انگریزوں کے خلاف (غالباً) ۱۹۴۲ء میں اسی سرزمین پر ہوا تھا۔

پورے بنگال کا شعری مزاج ہمیشہ سے سر کشیدہ رہا ہے لہذا یہاں پروان چڑھنے والے ذہن کو اس سے کچھ نہ کچھ تو اثر لینا ہی تھا...... سو غالب عرفان کی شاعری کا ایک امتیاز سر کشیدگی بھی ہے اُن کی شاعری کا دوسرا رنگ سقوطِ مشرقی پاکستان کا المیہ ہے جو وہاں سے آنے والے ہر شاعر کے ہاں اپنی جھلکیاں دکھلاتا ہے اور اُن کے کلام کو ایک انفرادیت بخشنے کا سبب بنتا ہے غالب عرفان کے کلام کے مطالعہ میں اِن دو باتوں کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

(ا - س)

قومی زبان (۶۷) مارچ ۱۹۹۴ء

کچھ وقت غیر ملکی اردو کتابوں کے ساتھ

ڈاکٹر انور سدید

چند برس قبل میں نے "قومی زبان" میں کچھ وقت ہندوستانی کتابوں کے ساتھ" کا سلسلہ شروع کیا تو اسے بھارت اور پاکستان دونوں ممالک میں بے پناہ پذیرائی حاصل ہوئی، پاکستان میں اس لیے کہ متعدد اہلِ قلم اور اہل ادب کو بھارت میں چھپنے والی کتابوں کی خبر "قومی زبان" کے اس سلسلے ہی سے ہوتی تھی، یہاں میں جناب منظور الٰہی، جناب عبد العزیز خالد اور غلام الثقلین نقوی صاحب کی مثال پیش کر سکتا ہوں جنھوں نے مجھے اس کالم کی داد اکثر دی اور میری حوصلہ افزائی کی۔ اس کالم کو جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔ میں عرض کر تا کہ شکریے کے حقدار مشفق خواجہ صاحب ہیں جنھوں نے اس کالم کی تجویز بنائی اور اسے عملی جامہ پہنانے کا ذریعہ مجھے سونپا، شکریے کے حقدار جمیل الدّین عالی صاحب بھی ہیں جو "نانغے" کی وجوہ قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔

بھارت میں اس کالم کی پذیرائی کا باعث یہ تھا کہ بھارتی کتب پر "قومی زبان" کی رائے کو وقیع اور غیر جانبدار سمجھا جاتا۔ اسے ایسا تبصرہ کہا جاتا جس میں ذاتی تعلقات اور "پبلک ریلیشنگ" کی بو شامل نہیں ہوتی، مجھے کئی بھارتی ادیبوں نے لکھا کہ "قومی زبان" میں تبصرہ پڑھ کر انھیں نہ صرف خوشی ہوئی بلکہ مزید لکھنے اور کتاب چھپوانے کی تحریک بھی ہوئی۔

گزشتہ برس میں نے "کچھ وقت بنگلہ دیش کی کتابوں کے ساتھ" گزارا تو یورپ اور امریکہ کی اردو بستیوں سے آواز آئی کہ مشرق کی جانب رخ کرنے کے بعد اب مجھے مغرب کی جانب بھی دیکھنا چاہیے۔ اردو کے بہت سے ادیب ان دیسوں میں بھی بستے ہیں اور ان کی کتابیں بھی شائع ہو رہی ہیں۔ آپ اسے شکایت کہیے یا اعتراض لیکن بات درست تھی، اس لیے اب میں نے ارادہ کیا ہے کہ اس کالم کا موضوع صرف بھارتی کتابیں نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کا عنوان عالمی اردو کتابوں سے منسلک کر دینا مناسب ہے۔ عنوان کی اس ترمیم کے ساتھ میں نے غیر ملکی کتابوں تک رسائل کی کوشش شروع کر دی ہے۔ آپ زیرِ نظر تحریر کو اس سلسلے کا پہلا کالم (شمارہ) سمجھ سکتے ہیں۔ واضح رہے کہ اس کالم میں اہمیت اس بات کو دی گئی ہے کہ مصنف عرصے سے دیارِ غیر میں مقیم ہے۔ لیکن اگر کتاب کی طباعت پاکستان یا بھارت سے ہوئی ہے تو اسے چنداں اہم نہیں سمجھا گیا۔ اور اہمیت مصنف کی سکونتِ مکانی کو ہی دی گئی ہے۔

نسانہ کہیں جسے اسید عاشور کاظمی

لندن کی یاترا سے جب کوئی ادیب یا شاعر واپس آتا ہے تو وہ اس مسرت کا اظہار ضرور کرتا ہے کہ انگریزی زبان کے اس ملک میں اردو کا ایک دیس بھی آباد ہے مشاعروں میں حاضری اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ مشاعرہ گاہ میں تل رکھنے کی جگہ بھی نہیں رہتی۔ ادبی سیمینار ہوتے ہیں تو ان میں بھارت اور پاکستان کے ادیبوں کے علاوہ پوری دنیا میں اردو لکھنے والے چنیدہ ادیبوں سے ملاقات اور تبادلۂ خیالات کے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں، اردو ادب کی سب اصناف مغربی دنیا میں آباد ادیبوں میں مقبول ہیں اور ان میں کچھ جواہر پاروں کو ادبی رسائل میں بھی نمایاں طور پر شائع کیا جاتا ہے تو ان سے ملاقات کا شرف پاکستان کے ادیبوں کو بھی حاصل ہو جاتا ہے۔

سید عاشور کاظمی نے اس دفعہ ایک انوکھا کام یہ کیا کہ مغرب میں بکھرے ہوئے ادیبوں کے افسانے تلاش کیے، تعارف کے لیے حالاتِ حیات کی بازیافت کی اور پھر بیالیس مختصر اردو افسانوں کا مجموعۂ فسانہ کہیں جسے ترتیب دے دیا۔ ترتیب و تدوین کے دوران ہی کتاب کا مقدمہ لکھنے کی ضرورت لاحق ہوئی تو انھوں نے مغربی افسانے کا دقیق مطالعہ کیا اور ایک خیال افروز مقدمہ لکھا۔ یہ مقدمہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ عاشور کاظمی نے ہمیں چند صفحات میں مغربی افسانے سے پوری طرح متعارف کرا دیا ہے۔ اور بالواسطہ طور پر ہمیں یہ موقع بھی فراہم کیا ہے کہ اس کتاب کے وسیلے سے ہم مغرب میں رہنے والے اردو افسانہ نگاروں کے طرزِ احساس اور اندازِ اظہار کو سمجھ سکیں اور بالواسطہ طور پر ان کا موازنہ مغربی افسانہ نگاروں اور افسانوں سے کر سکیں، باقر نقوی صاحب نے عاشور کاظمی کی شخصیت کو ایک (SWITCH BUTTON) دو طرفہ بٹن سے کنٹرول ہونے والی شخصیت قرار دیا ہے۔ میں "فسانہ کہیں جسے" کو ایک ایسی کتاب شمار کرتا ہوں جس میں مغربی اور مشرقی کرنوں کا ارتقاء ایک نقطے پر ہوتا ہے اور اس مرکزی نقطے پر عاشور کاظمی خود کھڑے ہیں، جنھیں روشن کرنے کے لیے بٹن دبانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کتاب اتنی منور ہے کہ آپ اس کی روشنی دور سے دیکھ سکتے ہیں، اس کی کرنوں میں نہا سکتے ہیں۔

اس کتاب میں نہ صرف ضمیر الدین احمد، مقصود الٰہی شیخ، ڈاکٹر مصطفےٰ کریم، ہرچرن چاؤلہ، حمیدہ معین رضوی، محسنہ جیلانی، رضاء الجبار، انور خواجہ، خالد سہیل، رفعت مرتضیٰ، محسن شمسی، نصر ملک اور حسن اجمل مسرت جیسے ادیبوں ہی کو شامل نہیں کیا گیا جو اردو ادب میں اپنا مستقل مقام بنا چکے ہیں بلکہ متعدد ایسے افسانہ نگاروں کو بھی نمایاں کیا گیا ہے جن کے نام پاکستان میں زیادہ معروف نہیں لیکن جن کے فن پاروں میں جوہر موجود ہے۔ اور جن کے باطن میں صورت واقعہ گھمسان برپا کر دیتی ہے تو ایک افسانہ تخلیق ہو جاتا ہے۔ یہ میری محرومی ہے کہ میں ابرار ترمذی، رحیم انجان، شائستہ ایمن، شاہدہ تبسم، فیصل فارانی، انور نسرین اور گلشن کھنہ جیسے افسانہ نگاروں سے پہلے زیادہ متعارف نہیں تھا۔ لیکن اب اس کتاب نے میری محرومی کا ازالہ کر دیا ہے۔

مغرب میں آباد قلم کاروں پر ایک عمومی اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ لندن اوسلو اور واشنگٹن میں آباد ہو جانے کے باوجود ابھی تک دہلی لکھنو اور لاہور کے کلچر کے افسانے لکھ رہے ہیں، لیکن اب کچھ عرصے سے اس رجحان میں نمایاں تبدیلی آ رہی ہے۔ اور ایسے مسائل پر جاندار افسانے لکھے جانے لگے ہیں جو مشرق کے باسیوں کو مغرب میں درپیش ہیں۔ عاشور کاظمی نے واضح کر دیا ہے کہ ہمیں مغرب میں آباد نئی نسل کو بے راہ روی سے بچانا ہے۔ اس لیے لازم ہے کہ ہم فن کے دائرے میں مشرقی اقدار پر زور دیں اور مغرب کا معاشرہ اشاروں اور کنایوں اور علامتوں میں پیش کریں۔ اس کتاب میں یہ کاوش بعض افسانوں میں شعوری نظر آتی ہے لیکن بعض افسانہ نگاروں نے اس اہم مقصد کو لاشعوری طور پر افسانے کی بنت میں شامل کر دیا ہے۔ مثلاً ہرچرن چاؤلہ کا افسانہ "ققنس" کا مرکزی کردار ہر زمانے میں زندہ رہنے والے کردار کا افسانہ ہے یہ کردار جب یورپی معاشرے سے دوچار ہوتا اور اس

کی زد میں اپنے بیٹے کو دیکھتا ہے تو وہ بڑی خوبی سے زندہ رہنے کی راہ تلاش کر لیتا ہے یہ کردار نہ سانپ کو مارتا ہے اور نہ لاٹھی کو توڑتا ہے۔ لیکن سانپ کو گھر سے باہر نکل جانے کا راستہ دکھا کر اور لاٹھی میں لچک پیدا کر کے وہ پورے خاندان کی آسودگی کی راہ ہموار کر لیتا ہے۔

اس مختصر سے تبصرے میں افسانوں کا تجزیہ تو ممکن نہیں لیکن ڈاکٹر مصطفےٰ کریم کا افسانہ "نایافت" تمکین قیصر کا "بعد کی خبر" مقصود الٰہی شیخ کا "دو جھوٹے" شائستہ ایمن کا "بے عنوان رشتہ" اور رفعت مرتضیٰ کا "قاتل" چند ایسے افسانے ہیں جو ذہن پر انمٹ تاثر چھوڑتے ہیں، یہاں یہ اعتراض ضروری ہے کہ میں نے تاحال اس کتاب کے سب افسانے نہیں پڑھے۔ یہ کتاب آہستہ آہستہ پڑھنے اور دیر تک سوچ کی لہر کو موجزن رکھنے والی کتاب ہے البتہ افسانہ نگار افتخار نسیم کی عدم شرکت پر مجھے حیرت ہوئی ہے "فسانہ کہیں جسے" انسٹی ٹیوٹ آف تھرڈ ورلڈ اینڈ لٹریچر" نے لندن سے شائع کی ہے۔ یہ کتاب بھارت اور پاکستان کے کتب فروشوں سے بھی دستیاب ہے۔

کرن کرن اُجالا/رشیدہ عیاں

"حرف حرف آئینہ" کے بعد رشیدہ عیاں کی نئی کتاب "کرن کرن اُجالا" چھپی تو انھیں پاکستان نے خراجِ تحسین ان الفاظ میں پیش کیا۔

"ان کی غزلوں میں کثرت سے ایسے اشعار ہیں جو فکر کا بانکپن "اسلوب کا تنوع اور اظہار کا دلاویز رنگ رکھتے ہیں" (محشر بدایونی...... رشیدہ عیاں کی غزل)

ہندوستان نے ان کی انفرادیت کا اعتراف اس طرح کیا:

"رشیدہ عیاں نہ صرف زبان و فن پر گرفت رکھتی ہیں بلکہ غزل کی روایت کے استفادے سے آگے وہ درایت کی روشنی میں اپنی انفرادیت کا تعین بھی کرتی ہیں" (مجروح سلطان پوری..... کرن کرن اُجالا)

برطانیہ نے پیش گوئی کے انداز میں حال کا احوال یوں سنایا ہے:

"رشیدہ کے سامنے اب وسیع تر افق ہے، وسیع تر فکر ہے، وہ عالمی تناظر میں سوچ رہی ہیں"

(سید عاشور کاظمی.... "حرمتِ لفظ کی خاطر")

یہ آخری بات اس لیے اہم ہے کہ لندن میں لکھی جانے والی بیشتر غزل روایت کی جامد پیروی میں تخلیق ہوتی ہے اور اکثر کہا جاتا ہے کہ مشاعروں پر بھی دہلی، لکھنؤ اور لاہور کے مشاعروں کا گمان ہوتا ہے دوسری بات یہ کہ غزل چونکہ تجربے کو بیضوی صورت عطا کر دیتی ہے اس لیے اس کے باطن سے عالمی تناظر کو بازیافت کرنا آسان نہیں۔ "عالمی تناظر" تجربے کی عمومی بیضویت میں گم ہو جاتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رشیدہ عیاں کو غزل کے فن پر عبور حاصل ہے۔ وہ تجربے کا ذاتی اور اس کا انفرادی زاویہ اپنے مخصوص انداز میں اُبھارتی ہیں لیکن اس حقیقت کا اعتراف بھی کرنا پڑے گا کہ ان کا عالمی تناظر غزل میں بالواسطہ انداز ہی میں ظاہر ہوا ہے۔ قاری اسے اپنے ذوق اور ظرف کے مطابق معلوم پس منظر کی روشنی میں دریافت کرتا ہے۔ ان کے تجربے میں مشرقی احساس دبے پاؤں آتا ہے اور مغرب کے آنگن کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ اس عالم میں رشیدہ عیاں پر افسردگی طاری ہو جاتی ہے اور غزل داخلی طور پر الم گزیدہ محسوس ہونے لگتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کا یہ شعر دیکھیے جو بظاہر

امریکی معاشرے کا آئینہ دار ہے لیکن اس میں غم مشرقی انداز میں لو دیتا ہے۔

موسم پیری جب آیا زندگی کے باغ میں
پیڑ اپنے ہیں، نہ اب کوئی شجر اپنا ہے

ذیل کے شعر میں ترکِ وطن کرنے والوں کی مجبوریوں کی طرف دردمندانہ اشارہ موجود ہے۔

کم اُجرتوں پہ لوگ رضامند ہوگئے
کیسے شکم کی آگ سے لاچار ہوگئے

رشیدہ عیاں نے اپنی غزل کا لینڈ سکیپ بدلنے کی بھی کاوش کی ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھیے:

ساحل کے شانے ہیں بھیگے سے
ان پہ سمندر سر رکھ کر رویا ہوگا

پوری کتاب پڑھ کر تازگی کا احساس ہوتا ہے۔

"کرن کرن اُجالا" انسٹی ٹیوٹ آف تھرڈ ورلڈ آرٹ اینڈ لٹریچر نے شائع کی ہے۔

تم کو دیکھیں .... ہرچرن چاؤلہ

افسانہ نگار ہرچرن چاؤلہ پاکستان کے ایک دور افتادہ قصباتی شہر داؤد خیل میں پیدا ہوئے، آزادی کے بعد جوانی کچھ حصہ دہلی میں گزارا اور اب ناروے کے شہر اوسلو میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انھیں اپنے وطن کی یاد جب کبھی ستاتی ہے تو وہ اوسلو سے ہوائی جہاز میں اڑتے ہیں اور دہلی کو مس کرنے کے بعد لاہور اور پھر لاہور سے داؤد خیل پہنچ جاتے ہیں۔

فروری ۱۹۸۸ء میں ہرچرن چاؤلہ پاکستان آئے تو انھوں نے اپنے اس سفر کو ذہن میں محفوظ رکھنے کی بجائے کاغذ پر اتارا اور ان یادوں کو "تم کو دیکھیں......" کا عنوان دیا۔ اسٹار پبلی کیشنز، آصف علی روڈ دہلی نے اسے کتابی صورت دی اور اب یہ کتاب جو اوسلو کے ایک ادیب کا نظر نامہ، یاد نامہ احباب نامہ اور سفر نامہ ہے تبصرے کے لیے میرے سامنے ہے۔

"تم کو دیکھیں......" میں ہرچرن چاؤلہ نے دو سطحوں پر سفر کیا ہے۔ ایک سفر زمینی ہے دوسرا خیالی، ان کا ایک سفر حال کے لمحے میں طے ہوتا ہے دوسرا سفر ماضی کی گم شدہ زمینوں کی سیاحت کرتا ہے...... اس طرح اس سفر نامے میں ایک حقیقت سامنے نظر آتی ہے۔ دوسری حقیقت افسانہ نگار کے نہاں خانۂ باطن سے ابھرتی ہے اور منظر کو روشن کر دیتی ہے۔ ہرچرن چاؤلہ کبھی کاغذ کے نئے سکوں سے زادِ سفر سمیٹتے ہیں کبھی سونے کے پرانے سکوں کو ٹٹولتے ہیں کہ یہ سکے جعلی تو نہیں۔ لیکن پھر انھیں اطمینان ہو جاتا ہے کہ زمانے کا چلن تبدیل ہو چکا ہے اور کاغذ سونے کی طرح رائج الوقت سکہ بن چکا ہے۔ اس قسم کی طمانیت اس سفر نامے میں ہر جگہ موجود نظر آتی ہے۔

"تم کو دیکھیں" ایک تارکِ وطن کا سفر نامہ ہے۔ سفر نامہ نگار تقریباً ۴۱ برس کے بعد اپنی چھوڑی ہوئی زمین کی گود میں دوبارہ پناہ لیتا ہے تو اسے احساس ہے کہ یہ زمین اسے دائم پناہ نہیں دے سکتی اور اس پر جو محبت نچھاور ہو رہی ہے وہ چند روزہ ہے اور عارضی ہے۔ لیکن پھر بھی افسانہ نگار اس ایک لمحے کو قیمتی تصور کرتا اور اس کا لمس اپنی رگ و پے میں اتار لینے کا آرزو مند ہے۔ اسے دکھ یہ ہے کہ اب ہم مشرق اور مغرب ہیں جو کبھی مل نہیں سکتے "لیکن اسی لمحے ہرچرن چاؤلہ کو خیال آتا ہے:

"یہ مشرق اور مغرب کے نہ مل سکنے کی بات جن کے لیے کہی گئی تھی وہ آپس میں مل رہے ہیں... لیکن ہمارے اختراع کردہ مشرق اور مغرب جدا ہو گئے ہیں..... دیواریں ہونی چاہییں مگر ان میں دونوں اطراف سے تازہ ہوا کے آنے کے لیے کھڑکیاں اور دروازے لگانے میں کیا حرج ہے"

اس سفر نامے کی سب سے بڑی خوبی ہرچرن چاؤلہ کا اسلوب سادہ ہے مگر یہ پُر خلوص اسلوب ہے وہ لفظوں سے مرمریں محل نہیں سجاتے بلکہ ایسی جذباتی تصویریں نکھارتے ہیں کہ پڑھتے پڑھتے آنکھیں نم ہوجاتی ہیں میں دیکھ رہا ہوں کہ ہرچرن چاؤلہ میانوالی میں اپنے موسی کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے ایک لمبے دھڑنگے نوجوان کو بتا رہا ہے.. میں انڈیا سے آیا ہوں۔ میرا نام ہرچرن چاؤلہ ہے.... یہ گھر...... نوجوان راستے سے ہٹ گیا ہے۔ ہرچرن چاؤلہ کے لیے گھر نے آغوش وا کر دیا ہے..... اور میں سوچ رہا ہوں یہ سفر نامہ کیسا دل دوز سچ سامنے لا رہا ہے۔ ایک اجنبی کے سامنے اس کا چھوڑا ہوا وطن کس طرح بچھ بچھ گیا ہے۔

این فرینچ
کریم اور لوشن
آپ کے سراپا کے لیے
ریشم سا احساس
Anne French
Anne French
MPL

گرد و پیش

علامہ تاجور نجیب آبادی کی یاد میں

۳۱ جنوری ۹۴ء کو شمس العلماء تاجور نجیب آبادی کی صد سالہ تقریبِ ولادت کے موقع پر اُن کی یاد میں علامہ کی پوتی سمیّہ درانی کے مکان پر ایک ادبی نشست ہوئی جس کی صدارت جناب شان الحق حقی نے کی۔ اس میں مشتاق احمد یوسفی ہاجرہ مسرور، ممتاز زمن، ڈاکٹر ریاض الدین، مشفق خواجہ، شمیم جاوید، پرویز حسنین کاظمی، پروفیسر عتیق احمد اور متعدد ادیبوں نے شرکت کی۔

ڈاکٹر ریاض الاسلام نے ۵۰-۱۹۴۹ میں لاہور میں علامہ سے تعلقات کی روداد بیان کی اور یہ بتایا کہ علامہ نہ صرف یہ کہ نوجوانوں کی علمی و ادبی معاملات میں رہنمائی کرتے تھے، بلکہ عملی زندگی کے مسائل سلجھانے میں بھی اُن کی مدد کرتے تھے، سحاب قزلباش نے علامہ سے متعلق اپنی یادداشتیں ایک مضمون کی صورت میں پیش کیں اور یہ بتایا کہ جب انھوں نے اپنی آٹو گراف بک علامہ کے سامنے رکھی تو انھوں نے اس پر یہ شعر فی البدیہ لکھا:

سحاب ابرِ کرم بن کے چھائے گی اک دن
جہاتِ دہر کو گلگوں بنائے گی اک دن

جناب آفتاب قزلباش نے بھی اس موقع پر ایک مختصر مضمون پڑھا۔ مضمون دلچسپ ہے، لہٰذا اس کی تلخیص پیش کر دینا قومی زبان کے قارئین کے لیے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا انھوں نے اپنے مضمون "علامہ تاجور" کا آغاز اس طرح کیا ہے:

"اللہ بخشے میری والدہ مرحومہ کہا کرتی تھیں" بھئی ہمارا حال تو تھیٹر کی اس کمپنی کا تھا کہ آج اِس شہر میں ہیں کل اُس شہر کے منڈوے میں ہیں" والد مرحوم جہانیاں جہاں گشت تھے بیوی بچوں کی ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے کے لیے وہ روزی کی تلاش میں آج کلکتے میں ہیں کل آغا حشر انھیں زبردستی بمبئی لے گئے ہیں۔ مگر لاہور میں ہم اکثر جم کر رہا کرتے تھے۔

غالباً ۱۹۲۷ء کا زمانہ تھا، ہم لوگ لاہور پہنچے تو خان بہادر شیخ نور الٰہی صاحب نے ہمیں داتا صاحب کے مزار کے پاس ایک مجاور صاحب سے کہہ کر ایک مکان کرائے پر دلوا دیا۔ شیخ صاحب ہر جمعرات کو پابندی سے داتا صاحب کے ہاں فاتحہ خوانی کے لیے آتے تھے ایک دن شیخ صاحب ایک صاحب کو اپنے ساتھ لائے وہ عالم متبحر فاضلِ اجل اور پنجاب میں اپنی تصانیف، اشاعتی اداروں اور اپنے علم و فضل کی وجہ سے بے حد قابلِ عزت بزرگ تھے۔ اُن کا نام نامی بعد میں والد صاحب نے بتایا کہ بھئی یہ مولانا تاجور ہیں بے چارے ایسے مہربان ہیں کہ شکایت کرنے آئے تھے۔ "آپ لاہور میں ہیں اور میں آپ سے بے خبر شیخ صاحب نے کل طے ہوا تھا کہ وہ مجھے آپ کے ہاں لے چلیں گے مگر آج حاضر ہو گیا۔"

مولانا نے والد صاحب سے کہہ کر ہمیں بُلوایا۔ ہم نے سلام عرض کیا ہم تینوں بھائی مولانا صاحب کی محبت اور شفقت سے بہت خوش ہوئے۔ جاتے ہوئے ہمیں اب یاد نہیں ہر ایک کو مولانا نے کچھ نقد بھی عطا کیا تھا۔ پھر گھر جا کر بچّوں کا رسالہ بھی بھجوایا جس میں خود علامہ کے اشعار تھے:

ہم مچھر بن کر کاٹیں گے
اور خون تمھارا چاٹیں گے

اُس وقت ہمیں نظم یا شعر کی کوئی تمیز نہیں تھی۔ بہر حال ہم خوب ہنسے اور ہر ایک کو یہ شعر زبانی یاد ہو گیا!

کچھ دن کے بعد والد صاحب مجھے اور میرے مرحوم منجھلے بھائی آغا سرخوش کو لے کر علامہ تاجور کے ہاں گئے۔ مولانا نے بہت خاطر مدارات کی۔ سرخوش نے کہا "آپ کا رسالہ بہت اچھا تھا۔" مولانا نے بہت پیار سے پوچھا۔ "تم نے پڑھا" سرخوش نے یہ شعر اُنھیں پڑھ کر سُنایا۔ مولانا بہت خوش ہوئے۔

میں اُن دنوں نویں جماعت میں اسلامیہ ہائی اسکول بھاٹی گیٹ میں پڑھتا تھا۔ میرے ہم جماعت مجھے چڑانے کی کوشش کرتے تھے۔ کبھی کہتے "ہندستانی بڑے شیطانی" اور کبھی کہتے "تو ہندستانی ہے۔" یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ میں جواب میں کہتا کہ آخر تم کون سی ولایت کے ہو۔ صرف میرزا ادیب جو اُس وقت میرزا دلاور علی اور میرے ہم مکتب تھے، مجھے زیادہ مہربانی سے نوازتے تھے۔ اُنھیں سے میری بڑی دوستی تھی۔ وہ ماشاءاللہ اُس وقت بھی ادبیات سے لگاؤ رکھتے تھے۔ اور یہ جان کر کہ آغا شاعر صاحب میرے والد ہیں مجھ سے زیادہ ربط رکھتے تھے۔

مولانا تاجور میرے والد مرحوم کا بڑا ادب کرتے تھے انھوں نے انگریزی کتاب کا ترجمہ والد صاحب سے کرایا جو "تمھارا آسمان" کے نام سے شائع ہوا اور جسے اپنے اشاعتی ادارے یا غالباً عطر چند کپور پبلشر کے ذریعے چھپوایا۔ اِس طرح مولانا والد صاحب کی امداد کر دیا کرتے تھے۔ اُن کے پاس ادبی حضرات آتے رہتے تھے اور وہ اُسی طرح کی خدمت انجام دیتے تھے جس طرح آج کل میرے مکرم مشفق خواجہ انجام دیتے ہیں۔

مولانا کھرے پٹھان تھے اور صاف بات کہہ دیتے تھے۔ اِس لیے وہ اپنے ہم عصروں میں زیادہ پسندیدہ اور مقبول نہ تھے۔ مولانا سالک سے اُن سے اکثر خفگی ہو جاتی تھی۔ سالک صاحب اپنے دوستوں میں بے تکلفی اور خوش گفتاری کی وجہ سے مشہور تھے۔ جب مولانا تاجور زیادہ خفا ہو جاتے تھے تو وہ صلح صفائی کے عجب عجب طریقے نکالتے تھے ایک رات وہ مولانا تاجور کے ہاں گئے۔ مولانا اس وقت بھی اُن سے کبیدہ تھے مولانا سالک نے اُن کی توند پر اپنی بیت رکھی اور کہا مولوی اب خفگی تھوک دے۔ اگر خفگی معافی سے دور ہو سکتی ہے تو مجھے معاف کر دے مولانا تاجور ہنس پڑے اور پھر اُسی طرح آپس میں چہکنے لگے۔

مولانا تاجور مسلسل اُردو کی خدمت میں مصروف رہے۔ پنجاب کے نوآموز لکھنے والوں کا دل بڑھاتے اور اُن کی نظمیں غزلیں اپنے رسالوں میں اصلاح کے بعد شائع کرتے رہے۔

مولانا جوان شعرا کی بھی ہمت افزائی کرتے تھے۔ احسان دانش ہر چند کہ اُس وقت پُر گو اور پختہ مشق شاعر بن چکے تھے لیکن مولانا کی قدر دانی کا سلسلہ جاری تھا وہ مولانا کے رسائل میں "زیب و زینت کے ساتھ چھپتے رہے" تھے۔ مجھے کنور مہندر سنگھ بیدی صاحب نے بتایا تھا کہ جب وہ چیفس کالج میں پڑھتے تھے۔ اُنھیں شعر گوئی کا شوق ہوا تو وہ کچھ لڑکوں کے ساتھ مولانا کے ہاں حاضر ہوئے۔ مولانا نے اس شفقت سے آؤ بھگت کی کہ وہ ان کے ہو رہے۔

تقسیم ہند کے بعد جب بیدی صاحب دلی سے لاہور گئے تو فیض صاحب کے علاوہ کہیں اُن کا آنے جانے کا جی نہیں چاہتا تھا پھر بھی جب اُنھوں نے سنا کہ مولانا تاجور بیمار ہیں تو عیادت کے لیے اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے مولانا بیدی صاحب کو گلے لگا کر رونے لگے، سب کو پوچھا پھر اپنے کسی صاحبزادے کو چُنّی (گھریلو نام ہوگا) آواز دے کر بُلایا اُس وقت اُنھیں سانس کی شدید تکلیف تھی۔ وہ اُن کی شفقت اور احسانات کے پیش نظر آبدیدہ وہاں سے باہر نکلے۔

مجھے یاد آیا جب میرے والد ماجد کا انتقال دلی میں ہوا تھا تو کچھ دن کے بعد مولانا تاجور تعزیت کے لیے دلی آئے تھے۔ ہم تینوں بھائیوں اور سحاب کو گلے سے لگایا، دلاسہ دیا۔ اللہ ایسے اشراف کہاں چلے گئے۔ "پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ!"

جناب شان الحق حقی نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا کہ علامہ تاجور نجیب آبادی اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ انھوں نے جس پیمانے پر اُردو زبان و ادب کی خدمت کی اُس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں وہ بیک وقت قادر الکلام شاعر، ایک صاحبِ نظر محقق و نقاد اور شگفتہ بیان طنز و مزاح نگار تھے، اُردو زبان کے مسائل پر اُن کی نظر بہت گہری تھی۔ زبان کے مسائل پر انھوں نے جو مضامین لکھے ہیں وہ آج بھی ویسے ہی تروتازہ ہیں جیسے آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے تھے اُنھوں نے مزید کہا کہ علامہ کی تمام تحریروں کو کتابی صورت میں شائع کرنے کی ضرورت ہے۔

محترمہ سمیّہ درّانی نے اس موقع پر "تاجور فاؤنڈیشن" کے قیام کا اعلان کیا، اور کہا کہ علاّمہ کی جو تحریں مختلف رسائل و جرائد میں منتشر ہیں۔ اُنھیں موضوع وار مرتب کر کے شائع کیا جائے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ مولانا نے اُردو کی کلاسیکی شاعری کا جو انتخاب شائع کیا تھا اُسے بھی دوبارہ شائع کیا جائے۔

محترمہ سمیّہ درّانی نے علامہ تاجور نجیب آبادی کی یاد میں گھر پر جو تقریب منعقد کی وہ کسی ہال میں منعقد ہونے والے بڑے جلسے سے کم نہ تھی، "تاجور فاؤنڈیشن" کے قیام کا حاضرین تقریب نے خیر مقدم کیا۔ اگلا قدم اس کے مجوزہ پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کا ہے۔

محترمہ سمیّہ درّانی نے "تاجور فاؤنڈیشن" کے قیام کا اعلان جس جوش و جذبہ کے ساتھ کیا ہے اُس کے پیشِ نظر توقع رکھنی چاہیے، کہ جلد ہی علاّمہ کے سلسلے میں کوئی نتیجہ خیز کام سامنے آئے گا۔ اور قارئین ان کی بے شمار منتشر تحریروں کو یکجا کتابی صورت میں دیکھ سکیں گے۔

اِس موقع پر ممتاز گلوکار ندیم محی الدّین نے علامہ تاجور نجیب آبادی کی غزلیں گا کر سُنائیں اور سامعین کو محفوظ کیا۔

مولانا کی اس "صد سالہ تقریبِ ولادت" کے موقع پر جو دعوت نامہ تقسیم کیا گیا اس کے اندرونی دو صفحات پر مولانا سے متعلق ایک مختصر تعارفی مضمون ہے۔ جس کی افادیت و اہمیّت کے پیشِ نظر من و عن پیش کیا جارہا ہے۔

نہ دِل بدلا، نہ دِل کی آرزو بدلی، نہ وہ بدلے
میں کیسے اعتبارِ انقلابِ آسماں کرلوں

(تاجور)

شمس العلماء احسان اللہ خاں تاجور نجیب آبادی ۱۸۹۴ء میں نینی تال میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن نجیب آباد ضلع بجنور تھا۔ دارالعلوم دیوبند سے انھوں نے درسِ نظامیہ کی تکمیل کی اور مزید تعلیم کے لیے ۱۹۱۴ء میں لاہور آگئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔

پنجاب کے اورینٹل کالج سے انھوں نے مولوی فاضل اور منشی فاضل کی اسناد حاصل کیں۔ ۱۹۲۱ء میں دیال سنگھ کالج لاہور میں اردو اور فارسی کے استاد مقرر ہوئے۔ اس کے بعد تمام عمر اسی کالج میں تعلیم دیتے رہے۔

تاجور کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا اس صدی کی تیسری دہائی میں ان کا شمار اپنے عہد کے ممتاز شعراء میں ہونے لگا۔ شاعری کے ساتھ ساتھ تنقید و تحقیق اور طنز و مزاح میں بھی انھوں نے قابلِ قدر کار نامے انجام دیے۔

تاجور نے تقریباً نصف صدی تک اردو زبان و ادب کی خدمت کی وہ اُن چند اہلِ علم میں سے ہیں جنھوں نے اردو نشر و اشاعت میں علمی و عملی، دونوں سطحوں پر کام کیا۔ وہ "مخزن" اور "ہمایوں" جیسے اہم رسالوں کے مدیر رہے۔ ۱۹۲۹ء میں اَدبی دنیا اور ۱۹۳۴ء میں شاہکار جیسے بلند پایہ رسائل جاری کیے۔ ان رسائل کے ذریعے تاجور نے ایک طرف اردو زبان و ادب کو گھر گھر پہنچایا اور دوسری طرف بے شمار نئے ادیبوں کو منظرِ عام پر آنے کا موقع دیا اردو ادب کی تاریخ میں یہ دونوں رسالے رجحان ساز جریدوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۱۹۲۵ء میں انھوں نے "اردو مرکز" کے نام سے ایک علمی ادارہ قائم کیا۔ اس میں کام کرنے کے لیے انھوں نے اصغر گونڈوی، جگر مراد آبادی یاس یگانہ، اور پنڈت دتہ تریا کیفی جیسے ممتاز شاعروں کو لاہور میں یکجا کیا۔ ان کے تعاون سے متعدد اہم کتابیں شائع کی گئیں۔ اس ادارے کا اصل کار نامہ اردو کلاسیکی شاعری کے موضوع وار انتخابات ہیں۔ ان انتخابات سے نئی نسلوں کو اپنے شعری سرمائے کے بہترین حصوں سے آشنا ہونے کا موقع ملا۔

اس صدی کی تیسری دہائی ہی میں تاجور نے "انجمن اربابِ علم" کے نام سے سر شیخ عبد القادر کی سرپرستی میں ایک ادبی انجمن قائم کی۔ اس انجمن کے زیرِ اہتمام مشاعرے بھی ہوتے تھے اور علمی و ادبی مجالس بھی منعقد ہوتی تھیں۔ اس کی شاخیں پنجاب کے کئی اضلاع میں قائم کی گئیں۔ یہ انجمن پنجاب میں اردو کی ترویج کا ایک بڑا ذریعہ ثابت ہوئی اور نوجوان نسل کی ادبی تربیت میں اس نے بہت اہم کردار ادا کیا۔

تاجور اپنے عہد کے مستند علماء ادب میں سے تھے جس کے اعتراف میں حکومت وقت نے ۱۹۴۰ء میں انھیں شمس العلماء کا خطاب دیا۔ کالج کے شاگردوں سے قطع نظر شاعری میں بھی ان کے بے شمار شاگرد تھے جن میں سے بعض نے بہت نام پیدا کیا۔ مثلاً سید عابد علی عابد، جگن ناتھ آزاد، عبد الحمید عدم، احسان دانش، شورش کاشمیری اور ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ۔

تاجور نے اردو زبان کی خدمت گزاری میں بابائے اردو مولوی عبد الحق اور سر شیخ عبد عبد القادر کی طرح تاریخی کار نامہ انجام دیا ہے۔ علامہ تاجور کا انتقال ۳۱ جنوری ۱۹۵۱ء کو ہوا۔

تاجور ادیب گر ادیب تھے۔ ان کی توجہ سے بے شمار ادیبوں کی تصانیف شائع ہوئیں۔ لیکن ان کی اپنی تحریریں کبھی کتابی صورت میں مرتب نہ ہو سکیں۔

بیسویں صدی میں کاروانِ اردو کے سفر کی روداد اور ترقی و ترویج اردو کی کہانی تاجور کے تذکرے کے بغیر تشنہ اور ادھوری رہے گی۔ "تاجور فاؤنڈیشن" کے قیام کا مقصد تاجور کے بکھرے ہوئے افکار کو یکجا و محفوظ کرنا ہے تاکہ تاریخ اردو ادب لکھتے ہوئے آج اور کل کا مؤرخ بیسویں صدی کی پہلی چار دہائیوں کے اس ادیب، شاعر، ادبی صحافی، مزاح نگار اور ماہرِ تعلیم کو اس کے صحیح قد و قامت میں دیکھ کر اپنا ریکارڈ درست کر لے۔

ساکنانِ شہر قائد کی ایک منفرد اور یادگار تقریب

۱۳ا جنوری ۹۴ء کو "ساکنانِ شہر قائد کی ادبی کمیٹی نے، شیخ زید اسلامی مرکز میں ایک "تقریبِ سپاس" کا اہتمام کیا جس میں بیالیس بزرگ شعرا کو اُن کی پچاس سالہ ادبی خدمات کے اعتراف میں "نشانِ سپاس"، اور فی کس پانچ ہزار کی رقم بے طور نذرانہ پیش کی گئی۔

تقریب کی صدارت ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے فرمائی، اسٹیج پر صاحبِ صدر کے ساتھ "صاحبانِ اعزاز" بھی تشریف رکھتے تھے۔ نظامت کے فرائض جناب سرشار صدیقی، جناب سحر انصاری جناب پیرزادہ قاسم اور جناب اظہر عباس ہاشمی نے باری باری نجام دیے۔ تلاوت قاری مجید اللہ اور نعت محترمہ منیبہ شیخ نے پڑھی۔ جناب اظہر عباس ہاشمی نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا۔

یہاں قارئین کی دلچسپی کے لیے اُن تمام قابلِ احترام حضرات کے اسمائے گرامی رقم کیے جارہے ہیں جو "نشانِ سپاس" کے مستحق ٹھہرے، جن کے ناموں سے یہ اعزازات منسوب ہیں اور جنھوں نے شعرائے کرام میں اعزازات تقسیم کیے۔

جن شعرا کو ایوارڈ دیے گئے ان کے اسمائے گرامی،

(۱) ڈاکٹر جلیل قدوائی
(۲) ڈاکٹر شان الحق حقّی
(۳) ہاشم رضا
(۴) منظور حسین شور
(۵) تابش دہلوی
(۶) سیّد اشتیاق اظہر
(۷) سوز شاہجہان پوری
(۸) راغب مراد آبادی
صہبا لکھنوی
خواجہ حمید الدّین شاہد
افسر ماہ پوری
محمود احمد برکاتی
پروفیسر اقبال عظیم
فدا خالدی
عبدالغنی شمس
حکیم انجمن فوقی بدایونی
لیث قریشی
محشر بدایونی

جن شخصیتوں سے نشانِ سپاس منسوب ہیں

(۱) شہیدِ ملت خان لیاقت علی خاں
(۲) سردار عبدالرّب نشتر
(۳) سیّد حسین امام
(۴) نور الامین
(۵) علاّمہ سیّد سلیمان ندوی
(۶) چودھری خلیق الزماں
(۷) ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی
(۸) علاّمہ نیاز فتحپوری
(۹) پیر الٰہی بخش
(۱۰) بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق
(۱۱) ڈاکٹر محمود حسین
(۱۲) نواب صدیق علی خاں
(۱۳) میر خلیل الرحمٰن
(۱۴) ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری
(۱۵) علامہ عبدالعزیز میمنی
(۱۶) سر عبداللہ ہارون
(۱۷) بابا ذہین شاہ تاجی
(۱۸) مجنوں گورکھپوری

(۱۹) اقبال صفی پوری
(۲۰) شمارخ احمد زیبا
(۲۱) امید فاضلی
(۲۲) کوکب شادانی
(۲۳) محب عارفی
(۲۴) احمد ہمدانی
(۲۵) حمید نسیم
(۲۶) جوہر سعیدی
(۲۷) انجم شادانی
(۲۸) جمیل نقوی
(۲۹) حنیف اسعدی
(۳۰) طالب مراد آبادی
(۳۱) نظیر شاہجہان پوری
(۳۲) مہدی علی صدیقی
(۳۳) شہرت بلگرامی
(۳۴) بغدادی بیگم
(۳۵) ڈاکٹر بدر فاروقی
(۳۶) برق اجمیری
(۳۷) ساقی جاوید
(۳۸) العزم احسن حریف
(۳۹) شکیل احمد ضیا
(۴۰) کنیز فاطمہ حیا
(۴۱) سعید الزماں عباسی
(۴۲) انور دہلوی

(۱۹) علامہ سیماب اکبر آبادی
(۲۰) پیر السید عبد القادر گیلانی
(۲۱) جی۔ اے الانا
(۲۲) ڈاکٹر اے۔ بی۔ اے حلیم
(۲۳) سید شمس الحسن
(۲۴) آئی آئی چندریگر
(۲۵) مولانا ظفر احمد انصاری
(۲۶) جمشید نوسروان جی
(۲۷) اے۔ کے بروہی (اللہ بخش بروہی)
(۲۸) الطاف حسین (سابق ایڈیٹر ڈان)
(۲۹) ڈاکٹر ممتاز حسین
(۳۰) مفتی محمد شفیع
(۳۱) سید الطاف علی بریلوی
(۳۲) علامہ شبیر احمد عثمانی
(۳۳) علامہ رشید احمد ترابی
(۳۴) عطیہ فیضی
(۳۵) رئیس امروہوی
(۳۶) سید فخر ماتری
(۳۷) ڈاکٹر افضال قادری
(۳۸) آرزو لکھنوی
(۳۹) مولانا عبد الحامد بدایونی
(۴۰) بیگم لیاقت علی خاں
(۴۱) مولانا رازق الخیری
(۴۲) شاہد احمد دہلوی

معروف شخصیات جنھوں نے نشان ہائے سپاس پیش کیے۔

(۱) جناب ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی
(۲) جناب جسٹس (ریٹائرڈ) قدیر الدین احمد
(۳) جناب جسٹس (ریٹائرڈ) فخر الدین جی ابراہیم
(۴) جناب جسٹس (ریٹائرڈ) اے حلیم
(۵) جناب محمود اے ہارون
(۶) جناب حکیم محمد سعید

(۷) جناب عبدالستار ایدھی
(۸) جناب پروفیسر احمد علی
(۹) جناب پروفیسر کرار حسین
(۱۰) جناب سید محمد تقی
(۱۱) جناب جسٹس (ریٹائرڈ) ایس اے نصرت
(۱۲) جناب ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
(۱۳) جناب حسن مثنیٰ ندوی
(۱۴) جناب جمال میاں فرنگی محلی
(۱۵) جناب ائیر مارشل (ریٹائرڈ) ایم نور خان
(۱۶) جناب جنرل (ریٹائرڈ) مرزا اسلم بیگ
(۱۷) جناب جمیل الدین عالی
(۱۸) محترمہ بیگم تزئین فریدی
(۱۹) جناب ایس ایس جعفری
(۲۰) جناب ڈاکٹر منظور احمد
(۲۱) جناب ڈاکٹر سید اسلم
(۲۲) جناب حکیم محمد احسن
(۲۳) جناب مشتاق احمد یوسفی
(۲۴) جناب ایم اے رنگون والا
(۲۵) جناب لطیف ابراہیم جمال
(۲۶) محترمہ بیگم شائستہ اکرام اللہ
(۲۷) محترمہ ڈاکٹر فاطمہ شاہ
(۲۸) محترمہ بیگم گل مینوالا
(۲۹) جناب گلی جی
(۳۰) جناب ڈاکٹر احسان رشید
(۳۱) جناب ڈاکٹر معصوم علی ترمذی
(۳۲) جناب ڈاکٹر منظور الدّین احمد
(۳۳) جناب ڈاکٹر سید ارتفاق علی
(۳۴) جناب خالد اسحاق
(۳۵) جناب آئی اے حنفی
(۳۶) جناب اشرف تابانی
(۳۷) جناب ڈاکٹر این ایم قاضی
(۳۸) جناب محمد جسیم خان
(۳۹) جناب ڈاکٹر غلام محمد
(۴۰) جناب نصر اللہ خاں
(۴۱) جناب عبدالستار افغانی
(۴۲) جناب ڈی جی میمن

وفیات

ڈاکٹر محمد اجمل، پروفیسر کرم حیدری اور ساقی جاوید کی رحلت

پروفیسر احمد علی کی جُدائی کا غم ابھی تازہ ہی تھا کہ ساقی جاوید، ڈاکٹر محمد اجمل اور پروفیسر کرم حیدری کے انتقال کی خبر آئی، اس لحاظ سے جنوری ۹۴ء کا مہینہ علمی و ادبی حلقہ کے لیے بڑا سوگوار ثابت ہوا۔

ساقی جاوید ۱۵/ مارچ ۱۹۲۵ء ناگپور میں پیدا ہوئے۔ وہیں سے انھوں نے بی۔ اے کیا، نقل مکانی کر کے کراچی آگئے
تدریسی شعبے سے وابستگی کے ساتھ ایم اے کی تعلیم مکمل کی،
ساقی جاوید ایک عرصے سے شاعری کر رہے تھے۔ شاعری کی دُنیا میں نیک نام تھے، دو شعری مجموعے "آشوب روزگار" اور
"چاند میری زمین" شائع ہوئے، اوّل الذکر نظموں پر مشتمل ہے آخر الذکر میں ملی نغمے شامل ہیں، اُن کا ایک ملی نغمہ "چاند میری
زمین" ملک گیر شہرت کا حامل ہوا۔ جسے ملک کے نامور گلوکار اُستاد امانت علی خاں مرحوم نے گایا تھا۔
ڈاکٹر محمد اجمل ۱۷/ ستمبر ۱۹۱۹ء کو پیدا ہوئے گورنمنٹ کالج لاہور سے ۱۹۳۹ء میں نفسیات میں بی۔ اے اور ۱۹۴۱ء میں
فلسفہ میں ایم۔ اے کیا۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لندن سے حاصل کی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور سے تدریسی
کیریر کا آغاز کیا۔ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے محکمۂ تعلیم میں سکریٹری کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیں۔ ۳۱
جنوری ۹۴ء کو ۷۴ برس کی عمر میں پنڈی میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوا۔
ڈاکٹر محمد اجمل کی تصانیف میں "سقراط" تحلیلی نفسیات اور "روزمرّہ نفسیات" ہیں انھوں نے ویل ڈیوراں کی کتاب کا ترجمہ
"نشاط فلسفہ" کے نام سے کیا تھا۔ "مقالات اجمل" کے نام سے ان کے مضامین کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر محمد اجمل کے
لکھنے پڑھنے کا سلسلہ آخری عمر تک جاری رہا۔ ڈاکٹر محمد اجمل صاحب مفکر تھے۔ یہ خلا مشکل سے پورا ہو سکے گا۔
پروفیسر کرم حیدری مرحوم ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ادیب، شاعر، محقق، اور ماہر تعلیم ہونے کے علاوہ تحریک
پاکستان کے سرگرم کارکن تھے۔ ۱۹۱۰ء میں مری میں پیدا ہوئے۔ اُردو، فارسی، عربی، پنجابی، اور پوٹھواری زبانوں پر دسترس
رکھتے تھے۔ ان کا انتقال ۱۳ جنوری ۹۴ء کو پنڈی میں ہوا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر اسّی سال تھی۔
پروفیسر کرم حیدری کو ملی اور ادبی خدمات کے صلے میں "تحریکِ پاکستان گولڈ میڈل" اور رائٹرز گلڈ ایوارڈ سے بھی نوازا
تھا۔
ادارہ قومی زبان دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومین کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور اُن کے لواحقین کو صبرِ جمیل
کی توفیق بخشے۔

علامہ سید عباس حیدری عابدی کا انتقال

۱۳/ جنوری ۹۴ء کو علامہ سید عباس حیدری عابدی اِس دارِ فانی سے رحلت کر گئے ان کا انتقال دل کا دورہ پڑنے سے کراچی
میں ہوا۔ انتقال کے وقت اُن کی عمر ۹۲ سال تھی۔ وہ بڑے پائے کے عالم اور ذاکر تھے۔ علم و ادب سے اُن کا گہرا شغف تھا، ان کا
شمار شہر قائد کی مشہور شخصیات میں ہوتا تھا، اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور لواحقین کو صبرو جمیل کی توفیق
فرمائے۔

ممتاز صحافی جناب ابن الحسن انتقال کر گئے

ممتاز صحافی اور کالم نگار میجر (ریٹائرڈ) ابن الحسن کا جمعہ ۱۸ فروری ۹۴ء کی شام کو طویل علالت کے بعد انتقال ہو گیا، انتقال کے وقت
مرحوم کی عمر ۶۹ سال تھی، مرحوم نے والدہ، چار بھائی، چار بہنیں، بیوہ، تین بیٹے اور ایک بیٹی سوگوار چھوڑی ہے انھیں جمعہ کی
شب بعد نماز تراویح گزری قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

جناب ابنِ الحسن مرحوم نے قیام پاکستان کے فوری بعد صحافی کی حیثیت سے کیریر کا آغاز کیا، بعد ازاں پاکستانی فوج سے وابستہ ہوگئے ۱۹۶۴ء میں نیشنل بینک آف پاکستان میں بحثیت ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز شمولیت اختیار کی ۱۹۷۰ء میں پاکستان اکنامسٹ کے بانی ایڈیٹر بنے۔ ۱۹۸۲ء تک پاکستان اکنامسٹ کے ایڈیٹر رہے، پھر کئی اُردو اور انگریزی روزناموں اور رسالوں میں باقاعدگی سے ہفتہ وار کالم لکھتے رہے۔ ۱۹۸۸ء میں صوبائی کابینہ میں گورنر سندھ کے مشیر کی حیثیت سے شامل کیے گئے انھیں گراں قدر صحافتی خدمات کے اعتراف میں ستارۂ امتیاز دیا گیا۔

ادارہ "قومی زبان" دعاء گو ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور اُن کے پس ماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

امیر حمزہ خاں شنواری انتقال کر گئے۔

پشتو زبان و ادب کے نامور شاعر و دانشور جناب امیر حمزہ خاں شنواری اللہ کو پیارے ہوئے۔ اُنھیں ہفتے، تاریخ ۱۹ فروری ۹۴ء کو اُن کے آبائی گاؤں اشرف خیل خوکہ خیل میں سپردِ خاک کیا گیا۔ جنازے میں پندرہ ہزار کے قریب لوگوں نے شرکت کی، اس سے عوام میں مرحوم کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی تصنیف و تالیف کی تعداد خاصی ہے۔ ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں صدارتی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ مرحوم کی علمی و ادبی خدمات ارباب علم و فن سے خراجِ عقیدت پاتی رہیں گی دُعا ہے کہ اللہ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور لواحقین کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

شمیم صہبائی متھراوی

گذشتہ سال جُدا ہم سے ہوگئے یہ لوگ

(۱۹۹۳ء)

(۱۷)

"صد حیف ارتحالِ لیاقت قریشی"

۱۹۹۳ء

مرے دل پہ چُھریاں سی چلتی ہیں اِس سے
لو نام ہجرِ لیاقت قریشی
شمیم ان کا سالِ جدائی اچانک
ملا "جامِ ہجرِ لیاقت قریشی"

۱۴۱۳ھ

(گوہر پبلشرز کراچی اور ادبی ماہنامہ "کرن" کراچی کے مدیر اعلیٰ جناب لیاقت قریشی نے ۳۰ مارچ ۱۹۹۳ء مطابق ۶ شوال المکرم ۱۴۱۳ھ بروز منگل کراچی میں انتقال فرمایا)

(۱۸)

"ڈاکٹر حافظ محمد الیاس مایلِ جناں"

۱۹۹۳ء

توڑ کر گلشنِ ہستی سے ہر اک رشتہ شمیم
خُلد میں صاحبِ عظمت ہیں محمد الیاس
از پئے مصرعِ تاریخ فنا بولا سروش

"عالمِ نعمتِ جنّت ہیں محمد الیاس"

۱۴۱۳ھ

(ایک انسان دوست شخصیت اور ہمدرد کے مینیجنگ ڈائریکٹر، ڈاکٹر حافظ محمد الیاس نے ۳/اپریل ۱۹۹۳ء مطابق ۱۰ شوال ۱۴۱۳ھ بروز ہفتہ بعمر ۷۲ سال کراچی میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کو پی ای سی ایچ سوسائٹی کے قبرستان میں سپرد لحد کیا گیا)

(۱۹)

"غم آگیں ارتحالِ مالک رام"

۱۹۹۳ء

تھے وہ نامی ادیب اردو کے
ہو گئی جن کی زندگی کی شام
سالِ رحلت شمیم اُن کا ملا
"حسرت انگیز داغِ مالک رام"

۱۹۹۳ء

(مشہور اردو محقق اور غالبیات کے متخصص جناب مالک رام نے ۱۶/اپریل ۱۹۹۳ء مطابق ۴ بیساکھ ۲۰۵۰ بکرمی بروز جمعہ بعمر ۸۷ سال دہلی میں انتقال فرمایا)

(۲۰)

"ڈاکٹر محمد باقر مکینِ گلشن جنّت"

۱۹۹۳ء

جب چلے سوئے حریم جنّت
گلشنِ دہر کو باقر تج کر
اے شمیم آئی ندائے غیبی
"مسّتِ جنّت ہیں محمد باقر"

۱۴۱۳ھ

(معروف محقق، مصنّف، دانشور، افسانہ نگار اور شاعر پروفیسر محمد باقر (قلمی نام ملک نسیم رضوانی، تخلص نسیم) نے ۲۵/اپریل ۱۹۹۳ء مطابق ۲ ذیقعدہ ۱۴۱۳ھ بروز اتوار بعمر ۸۳ سال لاہور میں انتقال فرمایا۔ تدفین قبرستان ماڈل ٹاؤن لاہور میں عمل میں آئی)

(۲۱)

"صائب امروہوی معزّزِ بزمِ باغِ جنّت"

۱۹۹۳ء

محفل شعر و ادب ویراں ہے
ہو گئے دہر سے رُخصت صائب
ان کی تاریخ اجل پائی شمیم
"نیک رو شاعرِ جنّت صائب"

۱۴۱۳ھ

(ممتاز شاعر اور ہومیو ڈاکٹر محمد علی خاں امروہوی نے ۲۹ اپریل ۱۹۹۳ء مطابق ۷ ذیقعدہ ۱۴۱۳ھ بروز جمعرات بعمر ۷۲ سال کراچی میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کو لانڈھی کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا)

(۲۲)

"پرچۂ رُخصتِ نوّاب نقوی امروہوی"

۱۹۹۳ء

وہ مشہور تھا نام نوّاب سے
ابھی جس سخن ور کی میّت اُٹھی
شمیم ان کی برجستہ تاریخِ مرگ
ہے "اُف داغِ نوّاب امروہوی"

۱۴۱۳ھ

(بزرگ صاحبِ فن شاعر جناب نوّاب نقوی امروہوی نے ۲ مئی ۱۹۹۳ء مطابق ۹ ذیقعدہ ۱۴۱۳ھ بروز اتوار راولپنڈی میں انتقال فرمایا)

(۲۳)

"غم انجامِ ارتحالِ محمد یونس"

۱۹۹۳ء

چل بسا ایک ادیب اور صحافی افسوس
بن گئی جائے لحد جائے محمد یونس
ان کی رحلت پہ کہا، ہاتفِ غیبی نے شمیم
"باغ دنیا سے گئے وائے محمد یونس"

۱۴۱۳ھ

قومی زبان (۸۵) مارچ ۱۹۹۴ء

(بزرگ ادیب و صحافی اور فوج کے مشہور جریدے "الہلال" کے سابق مدیر جناب محمد یونس نے ۳ مئی ۱۹۹۳ء مطابق ۱۰ ذیعقدہ ۱۴۱۳ھ بروز پیر راولپنڈی میں رحلت کی)

(۲۴)

"اُف وفاتِ مرزا مقبول بیگ بدخشانی"

۱۹۹۳ء

وہ اٹھ گیا "تاریخِ ایران" لکھی جس نے
کہتے ہیں سبھی اک تصنیف ہے لاثانی
تاریخِ شمیم ان کی ہاتف نے کہی آکر
"عالم سے گئے وائے مقبول بدخشانی"

۱۴۱۳ھ

(مصنّف "تاریخِ ایران" اور دائرہ معارف اسلامیہ مرزا مقبول بیگ بدخشانی نے ۲۲ مئی ۱۹۹۳ء مطابق ۲۹ ذیعقدہ ۱۴۱۳ھ بروز ہفتہ لاہور میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کی تدفین قبرستان سمن آباد لاہور میں عمل میں آئی)

(۲۵)

"مرقدِ ڈاکٹر محمد نسیم عثمانی صاحب"

۱۹۹۳ء

چل بسا ایک ماہر تعلیم
گنجِ تربت ہو اس کی نورانی
سال رحلت شمیم نے ڈھونڈا
"انتقالِ نسیم عثمانی"

۱۴۱۳ھ

(ممتاز ماہر تعلیم، ریسرچ اسکالر اور وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج کے شعبۂ اسلامیات کے پروفیسر ڈاکٹر محمد نسیم عثمانی نے ۲۴ مئی ۱۹۹۳ء مطابق یکم ذوالحجہ ۱۴۱۳ھ بروز پیر بعمر ۵۰ سال کراچی میں رحلت فرمائی۔ مرحوم کا جسدِ خاکی ڈالمیا سیمنٹ فیکٹری کے قریب واقع قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا)

(۲۶)

"وائے ارتحالِ آغا سکندر"

۱۹۹۳ء

وہ اداکار اُٹھ گیا جس نے لیا
اپنی کم عمری میں شہرت کا خراج
مصرعِ سالِ فنا لکھ دو شمیم
"چل دیے آغا سکندر ہائے آج"

۱۴۱۳ھ

(ٹی وی، فلم اور تھیٹر کے معروف اداکار آغا سکندر نے ۲۵ مئی ۱۹۹۳ء مطابق ۲ ذولحج ۱۴۱۳ھ بروز منگل بعمر ۳۸ سال لاہور میں انتقال کیا۔ اُنھیں مومن پورہ کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا)

(۲۷)

"علمِ تاریخِ فراقِ رانی"

۱۹۹۳ء

تھی اداکارہ بہت مشہور جو
کہہ کے فرقت کی کہانی اُٹھ چلی
یوں پکارا ہاتفِ غیبی شمیم
"محفلِ ہستی سے رانی اُٹھ چلی"

۱۴۱۳ھ

(معروف اداکارہ رانی (اصلی نام ناصرہ بیگم) نے ۲۷ مئی ۱۹۹۳ء مطابق ۴ ذولحج ۱۴۱۳ھ بروز جمعرات بعمر ۵۲ سال کراچی میں انتقال فرمایا۔ مرحومہ کا جسدِ خاکی لاہور لیجایا گیا اور جمعرات کی شام مسلم ٹاؤن کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا)

(۲۸)

"نور افروز تربتِ قمر اجنالوی"

۱۹۹۳ء

جب چلے فردوس کی جانب قمر اجنالوی
چھٹ گیا ہم سے معاً اک شاعرِ شیریں بیاں

قومی زبان (۸۷) مارچ ۱۹۹۴ء

ہاتف غیبی پکارا اُن کی رحلت پر شمیم
"کر گئے رحلت قمر اجنالوی جادو زباں"

۱۴۱۳ھ

(معروف صحافی شاعر و مصنف، جناب قمر اجنالوی نے ۳۱ مئی ۱۹۹۳ء مطابق ۸ ذی الحج ۱۴۱۳ھ بروز پیر فرینکفرٹ (جرمنی) کے ایک اسپتال میں انتقال کر گئے۔ مرحوم کا جنازہ پاکستان لایا گیا اور تدفین ۵ جون کو ہفتہ کے دن لاہور کے ایک قبرستان میں عمل میں آئی)

(۲۹)

"حیفِ غمِ موسیقار کمال احمد مرحوم"

۱۹۹۳ء

نامی موسیقار تھے وہ مُلک کے
جن کی رحلت سے غم بے حد ملا
سالِ تاریخ اُن کا جب ڈھونڈھا شمیم
"داغ دل گیر کمال احمد" ملا

۱۴۱۳ھ

(معروف موسیقار جناب کمال احمد نے ۶ جون ۱۹۹۳ء مطابق ۱۴ ذوالحج ۱۴۱۳ھ بروز اتوار بعمر ۵۵ سال لاہور میں رحلت کی۔ مرحوم کو شام تک میانی صاحب کے قبرستان میں سپرد لحد کیا گیا)

(۳۰)

"فراقِ شاہد اکبر آبادی کا غم"

۱۹۹۳ء

چل بسے شاہد اکبر آبادی
خلد میں جن کو تخت و تاج ملا
ہے یہ تاریخِ مرگ ان کی شمیم
"داغ شاہد بھی آہ آج ملا"

۱۴۱۳ھ

نازشاعر وادیب، جناب شاہد اکبر آبادی نے ۸ جون ۱۹۹۳ء مطابق ۱۶ ذوالحج ۱۴۱۳ھ بروز منگل کراچی میں رحلت فرمائی۔ انھیں بش نگر قبرستان میں سپرد قبر کیا گیا)

(۳۱)

"ملال آگیں تاریخِ انتقال حبیب اللہ حادی"

۱۹۹۳ء

اُٹھے حادی ۔ ثنا گوئے محمد
خبر مجھ کو سناتا ہے یہ راوی
شمیم ان کے لیے تاریخ لکھ دو
"غمِ مرگِ حبیب اللہ حادی"

۱۴۱۳ھ

(ممتاز نعت گو شاعر جناب حبیب اللہ حادی جائسی نے ۱۲ جون ۱۹۹۳ء مطابق ۲۰ ذوالحج ۱۴۱۳ھ بروز ہفتہ بعمر ۷۹ سال لاہور میں انتقال فرمایا اور تدفین بھی وہیں ہوئی)

(۳۲)

"اندوہ و ملال رحلتِ قمر ہاشمی ٹونکی"

۱۹۹۳ء

قمر ہاشمی دہر سے جب اُٹھے
اُنھیں خُلد کی روشنی مل گئی
شمیم ان کی تاریخ رحلت مجھے
"بہشتی قمر ہاشمی" مل گئی

۱۴۱۳ھ

(ممتاز شاعر و ادیب سیّد اسماعیل قمر ہاشمی ٹونکی نے ۱۶ جون ۱۹۹۳ء مطابق ۲۴ ذی الحج ۱۴۱۳ھ بروز بُدھ بعمر ۷۰ سال کراچی میں انتقال فرمایا)

(جاری)

نئے خزانے

ڈاکٹر وفا راشدی

ادب، مسائل و مباحث

احمد سہیل — ادب کی عمرانیات — ادبِ لطیف، لاہور مارچ ۹۳ء ص ۵

ابنِ فرید، ڈاکٹر — الیاس احمد گدی اور دوسرے سقوطِ ماسکو اور ترقی پسند ادب — سیارہ، لاہور سالنامہ جنوری فروری ۹۳ء ص ۲۷۸

اسرار احمد سہاروی، پروفیسر — فکر و نظر کے نئے زاویے — مضیض، گوجرانوالہ جون ۹۳ء ص ۱۸۳

اعجاز راہی، ڈاکٹر — جیلانی کامران سے ایک مکالمہ "نئی اردو فکشن کے اصول" کی روشنی میں — فنون، لاہور دسمبر ۹۲ء ص ۸۰

انور نذیر علوی — انشائیہ کیا ہے — ماہِ نو، لاہور مارچ ۹۳ء ص ۶۰

مشکور حسین یاد — انشائیہ، اصنافِ ادب کا سرچشمہ — ماہِ نو لاہور جون ۹۳ء ص ۵۲

ایوب ندیم — جدید اردو نظم، فکر اور طرزِ احساس — ماہ نو لاہور مئی ۹۳ء ص ۲۱

جگن ناتھ آزاد، پروفیسر — اصلاحِ شعر — طلوعِ افکار، کراچی مئی ۹۳ء ص ۲۷

ریاض صدیقی، پروفیسر — ادب میں جنسی حسیت کا نمود قسط نمبر (۱) — طلوعِ افکار، کراچی مارچ ۹۳ء ص ۳۹

ریاض صدیقی، پروفیسر — ادب میں جنسی حسیت کی نمود قسط نمبر (۲) — طلوعِ افکار، کراچی اپریل ۹۳ء ص ۴۵

شفیق احمد عزیز — جنگ اور ادب — ادبِ لطیف، لاہور اپریل ۹۳ء ص ۶۲

شمس الرحمٰن فاروقی — کلاسیکی غزل کی شعریات کا تعارف - ۳ — فنون، لاہور دسمبر ۹۲ء ص ۶۳

طاہر فاروقی — مختصر افسانے کے موضوع پر منشا یاد سے مکالمہ — ماہ نو لاہور مئی ۹۳ء ص ۴۰

ظہیر انور — سماجی ڈرامے، ڈرامے کی ایک نئی شاخ — روحِ ادب، کلکتہ ستمبر ۹۲ء ۶۳

عابد علی خاں — ادب اور آرٹ — سب رس، کراچی مارچ ۹۳ء ص ۳۷

عبادت بریلوی، ڈاکٹر — اردو ادب میں جدید رجحانات — محفل، لاہور جون ۹۳ء ص ۱۷

قومی زبان (۹۰) مارچ ۱۹۹۴ء

عبدالخالق بلوچ، پروفیسر بلوچی ادب میں تحقیق و تنقید قومی زبان، کراچی جنوری ۹۳ء ص ۶۵
فہیم اعظمی، ڈاکٹر تخلیقی تحریر کے اوصاف قومی زبان، کراچی جنوری ۹۳ء ص ۲۳
فہیم اعظمی، ڈاکٹر فروغ ادب اور تعلیمی مراکز صریر، کراچی جنوری ۹۳ء ص ۵
فہیم اعظمی، ڈاکٹر اردو ادب میں منفی روّیہ صریر، کراچی مارچ ۹۳ء ص ۵
فہیم اعظمی، ڈاکٹر ادب میں اقدار و معیار کا مسئلہ صریر، کراچی اپریل ۹۳ء ص ۵
قیصر تمکین ہم کیوں لکھتے ہیں افکار، کراچی اپریل ۹۳ء ص ۱۲
محمد اقبال نجمی ادب اور انصاف مفیض، گوجرانوالہ مارچ جون ۹۳ء ص ۵
محمد طاہر علی حافظ ادب اور تجربہ روح ادب کلکتہ، مارچ ۹۳ء ص ۴۲
محمد علی صدیقی، ڈاکٹر آزادیٔ ادب اور حقوق انسانی افکار، کراچی مارچ ۹۳ء ص ۱۲
مصطفیٰ کھوڑو/رمیش کمار سندھی ادب میں جدید رجحانات قومی زبان کراچی اپریل ۹۳ء ص ۵۵
ناصر عباس نیّر نئے انشائیہ نگاروں کا شعور تخلیق صریر، کراچی اپریل ۹۳ء ص ۲۷
ناصر عباس نیّر ماہیا اور اردو میں ماہیا نگاری اوراق، لاہور جون ۹۳ء ص ۷۲
نعیم صدیقی سلطنت ادب میں آزادی کی پہلی آواز سیارہ، لاہور سالنامہ جنوری فروری ۹۳ء ص ۷

لسانیات

پرویش شاہین سرائیکی اکھان الشعاب، ملتان مئی جون ۹۳ء ص ۵۲
جمال علوی اردو اور ترکی کا لسانی رشتہ ادب لطیف، لاہور مئی ۹۳ء ص ۲۲
حیدر سندھی، ڈاکٹر بروشکی ایک قدم اور زندہ زبان صحیفہ، لاہور ستمبر ۹۲ء ص ۵۱
ریاض صدیقی، پروفیسر قدیم ہڑپا زبان اوراق، لاہور جون ۹۳ء ص ۶۲
سعید احمد عثمانی الفاظ اور اصطلاحات کی روشنی میں صریر، کراچی فروری ۹۳ء ص ۱۳
سلیم اختر، ڈاکٹر زبان کا آغاز اور تشکیل اقبال لاہور اپریل ۹۳ء ص ۵
سیما اشفاق ماہر کی چند لسانی تصریحات الشاہ، حیدر آباد سندھ ۹۳/۲ء ص ۲۷
عقیلہ شاہین قلم۔ بالقلم، کیا عام زبانوں کے رسم الخط آرابی (قدیم عربی) سے نقل کیے گئے ہیں تہذیب الاخلاق، علیگڑھ جون ۹۳ء ص ۳۷
مرزا سلیم بیگ اردو پر عربی کے اثرات الشاہ، حیدر آباد سندھ ۹۳/۲ء ص ۲۱
وقار زیدی تقریری زبان کی اہمیت العلم، کراچی مارچ ۹۳ء ص ۲۳

تحقیق و تنقید

احمد خان ایم اے اندلس کے ایک معقول گھرانے کا ایک کتب خانہ الولی، حیدر آباد سندھ اپریل ۹۳ء ص ۵
اطہر شیر قاضی عبدالودود اپنے گھر میں طلوع افکار، کراچی جنوری ۹۳ء ص ۳۶

قومی زبان (۹۱) مارچ ۱۹۹۴ء

انوار احمد، ڈاکٹر	قاضی عبدالستار کے تین ناولٹ	طلوعِ افکار، کراچی فروری ۹۳ء ص ۳۱
برج پریمی، ڈاکٹر	فرانسیسی ادب سعادت حسن منٹو اور فرانسیسی ادب	فنون، لاہور جنوری اپریل ۹۳ء ص ۶۲
توقیر محمد صدیقی	مصحفی اور انشاء	محفل، لاہور جون ۹۳ء ص ۴۵
جعفر بلوچ	شام و سحر کی حمدیں و نعتیں	شام و سحر، لاہور جنوری ۹۳ء ص ۱۷
حفیظ لدھیانوی	ڈاکٹر ریاض مجید کی نعتیہ شاعری	مفیض، گوجرانوالہ جون ۹۳ء ص ۹۵
حمید قیصر	دیے کی آنکھ روشن رہے گی	مفیض، گوجرانوالہ جون ۹۳ء ص ۸۱
ذورا اعجاز	اردو گنتی، ایک نیا آہنگ	صریر، کراچی مئی ۹۳ء ص ۱۶
رانا غلام شبیر	رام ریاض بے باک شاعر	ماہِ نو لاہور جنوری و ص ۴۶
رشید احمد گوریجہ، ڈاکٹر	ناصر کاظمی، ایک گم گشتہ نوا	ماہِ نو لاہور جون ۹۳ء ص ۴۴
رشید ملک	امیر خسرو اساطیر کے نرغے میں	المعارف، لاہور مئی جون ۹۳ء ص ۵۵
رؤف امیر	ہندوستان کا ایک جدید غزل گو ظفر گورکھپوری	فنون، لاہور دسمبر ۹۲ء ص ۱۹۶
سلیم اختر، ڈاکٹر	شام و سحر کے مقالات	شام و سحر، لاہور جنوری ۹۳ء ص ۲۵
سید عطاالرحیم، ڈاکٹر	تحقیقی مقالہ کس طرح لکھا جائے	قومی زبان، کراچی مارچ، ۹۳ء ص ۷
شبیہ الحسن	رفتارِ شام و سحر، اشاریہ جنوری تا دسمبر ۹۲ء	شام و سحر، لاہور جنوری ۹۳ء ص ۹
عبدالرزاق قریشی	مقالے کی تسوید	آگہی، کراچی اپریل ۹۳ء ص ۱۰
علی محمد خاں، ڈاکٹر	زبانِ اردو کا فیض، عمر فیضی	ماہِ نو لاہور مارچ ۹۳ء ص ۳۶
…لم اعظمی، ڈاکٹر	وفا براہی اور ان کا فن	سیارہ، لاہور سالنامہ جنوری فروری ۹۳ء ص ۸۶
قدرت نقوی	سب رس میں نعت و منقبت	صحیفہ، لاہور ستمبر ۹۲ء ص ۱
کلثوم ابوالبشر	ڈاکٹر عندلیب شادانی کی نصابی اور ترجمہ شدہ کتابیں	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ مارچ ۹۳ء ص ۲۹
نجیب جمال ڈاکٹر	یگانہ کے معرکے (قسط نمبر ۱)	صحیفہ، لاہور ستمبر ۹۲ء ص ۲۹
محمد حسان ملک	یوسفی کی مزاح نگاری	ماہِ نو لاہور مارچ ۹۳ء ص ۵۱
محمد ارشاد	مجذوب فرنگی نمبر ۲/ بیادِ اختر حسین جعفری	فنون، لاہور جنوری اپریل ۹۳ء ص ۲۷
محمد سلیم، پروفیسر	تذکرہ ماہ و سال امالک رام	سیارہ، لاہور سالنامہ جنوری فروری ۹۳ء ص ۱۵۰
محمد امین، ڈاکٹر	اردو ہائیکو اور بشیر سیفی	اردو ادب، لاہور اسلام آباد جون ۹۳ء ص ۱۵
محمد انصار اللہ، ڈاکٹر	اردو کی ابتدائی شاعری یا گیت	سب رس، کراچی جون ۹۳ء ص ۷
مسعود ہاشمی	قدیم اور جدید مرثیہ	محفل، لاہور جون ۹۳ء ص ۴۱
مظفر حنفی، ڈاکٹر	کچھ اردو ڈرامے کے بارے میں مغربی بنگال کے خصوصی حوالے سے	قومی زبان، کراچی مارچ ۹۳ء ص ۴۱
منصور آفاق	افضل عاجز کی ایک سرائیکی غزل	فنون، لاہور دسمبر ۹۲ء ص ۱۹۱

میرزا ادیب — شام و سحر کے اداریے — شام و سحر، لاہور جنوری ۹۳ء ص ۲۱
نجیب جمال، ڈاکٹر — یگانہ کے معرکے نمبر (۲) — صحیفہ لاہور اکتوبر دسمبر ۹۲ء ص ۶۱
نعیم الرحمن، پروفیسر — قاموس تلمیحات — اردو، کراچی مارچ ۹۲ ص ۶۵

تنقید فن تنقید

آغا سہیل، ڈاکٹر — شام و سحر کے افسانے — شام و سحر، لاہور جنوری ۹۳ء ص ۵۳
آغا محمد سعید — منٹو، پل صراط پر — ادبِ لطیف، لاہور مئی ۹۳ء ص ۷
احسان رانا — لغزشِ نظر سے لغزشِ پا تک — مفیض، گوجرانولہ جون ۹۳ء ص ۹۱
احسن فاروقی، ڈاکٹر — نثر اور نثر نگاری — محفل، لاہور جنوری ۹۳ء ص ۲۸
احمد ندیم قاسمی — سیف زلفی، جدید لہجے کا شاعر — شام و سحر، لاہور جنوری ۹۳ء ص ۳۱
احمد ندیم قاسمی — امکانات کی شاعری — تخلیق، لاہور اپریل ۹۳ء ص ۱۰۳
اسرار احمد سہاروی، پروفیسر — حافظ لدھیانوی کی نعتیہ رباعیات — مفیض، گوجرانولہ جون ۹۳ء ص ۱۷۸
اطہر سلیمی — سید عشقی کی غزل — محفل، لاہور فروری ۹۳ء ص ۸۲
امتیاز احمد — پہلی موت، ایک تجزیہ — قومی زبان، کراچی مئی ۹۳ء ص ۳۳
انور جمال، پروفیسر — قمر یزدانی کا اسلوبِ نعت — مفیض، گوجرانولہ جون ۹۳ء ص ۷۲
انور سدید، ڈاکٹر — تسلیم مجازی کی نعتیں — شام و سحر، لاہور جنوری ۹۳ء ص ۳۵
ایس حسن — ایلیٹ کی تنقید نگاری ایک بنیادی جہت — اوراق، لاہور جون ۹۳ء ص ۴۹
ایوب شاہد، ڈاکٹر — نعیم صدیقی کی ایک نعت — سیارہ، لاہور سالنامہ جنوری فروری ۹۳ء ص ۹۹
جمشید چشتی — احمد ندیم قاسمی بحیثیت نعت گو — ماہِ نو لاہور مارچ ۹۳ء ص ۴۷
جمیل آذر، پروفیسر — اردو ادب میں سائنسیات کا تعارف — صریر، کراچی فروری ۹۳ء ص ۱۱
جمیل جالبی، ڈاکٹر — نکات الشعراء کا تنقیدی مطالعہ — اردو، کراچی مارچ ۹۳ء ص ۱۳
حسرت کاسگنجوی، ڈاکٹر — مٹی کا دیا، ایک منفرد سوانح حیات — محفل، لاہور فروری ۹۳ء ص ۶۰
حسرت کاسگنجوی، ڈاکٹر — احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری — آگہی، کراچی جون ۹۳ء ص ۶
حمایت علی شاعر — ضیا اپنی فطرت سے باریک بینی — افکار، کراچی جون ۹۳ء ص ۳۹
حمید نسیم — ضیا جالندھری ایک بڑا شاعر — فنون، لاہور جنوری اپریل ۹۳ء ص ۳۷
حمیدہ معین رضوی — اختر ضیائی کی شاعری کا پس منظر — ادبِ لطیف، لاہور مارچ ۹۳ء ص ۴۹
حیدر قریشی — عذرا اصغر کے افسانے تنہا برگد کا دکھ — تخلیق، لاہور اپریل ۹۳ء ص ۱۰۴
دردانہ قاسمی — کرشن چندر اور سماجی شعور — قومی زبان، کراچی اپریل ۹۳ء ص ۴۷
ذکیہ سرور — اردو انشائیے کا مستقبل — انشعاب، ملتان مئی جون ۹۳ء ص ۶۴

قومی زبان (۹۴) مارچ ۱۹۹۴ء

رشید نثار ضیا جالندھری کی غزل ماہِ نو لاہور مارچ ۹۳ء ص ۴۲

زاہد حسن امجد اسلام امجد کی نئی شعری جمالیات ماہ نو لاہور مارچ ۹۳ء ص ۸۸

ساحر شیوی کالی داس گپتا رضا کے برجستہ اشعار طلوعِ افکار، کراچی مئی ۹۳ء ص ۲۹

سجاد حارث شام و سحر کی نظمیں شام و سحر، لاہور جنوری ۹۳ء ص ۴۷

سجاد مرزا اقبال ساجد اور اس کا اثاثہ ماہِ نو لاہور مارچ ۹۳ء ص ۲۸

سعادت سعید، ڈاکٹر نخلِ نوادر وجدانی علامتیں فنون، لاہور جنوری اپریل ۹۳ء ص ۱۲۰

سعادت علی صدیقی پریم چند، کفن کے آئینے میں روحِ ادب، کلکتہ ستمبر ۹۲ء ص ۵۱

سعید انجم زمانی مکانی جنت جہنم، منیر الدین احمد کے افسانے فنون، لاہور جنوری اپریل ۹۳ء ص ۱۱۴

سلیم اختر، ڈاکٹر ساختیاتی تنقید صریر، کراچی مئی ۹۳ء ص ۸

سلیم شاہجہان پوری دل شاہجہانپوری اپنی غزل کے آئینے میں العلم، کراچی مارچ ۹۳ء ص ۴۳

سہیل احمد خان، ڈاکٹر فکشن اور تنقید قومی زبان، کراچی مئی ۹۳ء ص ۲۵

سیف اللہ خالد دوآبہ سیپیاں ماہِ نو، لاہور جون ۹۳ء ص ۲۶

شبیر احمد قادری فتراک کے قطعات فنون، لاہور جنوری اپریل ۹۳ء ص ۱۲۳

شرما تاثیر بازگشت اوراق لاہور جون ۹۳ء ص ۸۶

شکیب ایاز، پروفیسر عنوان چشتی کے چند اشعار محفل، لاہور جنوری ۹۳ء ص ۶۱

شمیم حنفی، ڈاکٹر ادب کی ہماری شاعری قومی زبان، کراچی جنوری ۹۳ء ص ۱۷

صباحت مشتاق یلدرم کا ایک افسانہ ماہِ نو لاہور جون ۹۳ء ص ۶۳

طارق عزیز، ڈاکٹر شام و سحر کی غزلیں شام و سحر، لاہور جنوری ۹۳ء ص ۴۱

ظفر سعید یا خدا، ایک جائزہ روحِ ادب، کلکتہ مارچ ۹۳ء ص ۵۱

عبدالرحمن عابد ارشد ملتانی کی غزل الشعاب، ملتان مئی جون ۹۳ء ص ۵۷

عبدالمغنی، ڈاکٹر روش صدیقی کی غزل گوئی طلوعِ افکار، کراچی مئی ۹۳ء ص ۲۰

فرمان فتحپوری، ڈاکٹر ماہر القادری کی غزل گوئی سب رس، کراچی مئی ۹۳ء ص ۵

فضل گلبر گوی مسعود جاوید کی آزاد نظمیں سیارہ، لاہور سالنامہ جنوری فروری ۹۳ء ص ۹۰

قاضی عبدالرحمن عابد کلرک کا نغمہ محبت امیراجی کی ایک نظم اوراق، لاہور جون ۹۳ء ص ۳۱

کرار حسین، پروفیسر صبا اکبر آبادی ایک سچا شاعر شام و سحر، لاہور جنوری ۹۳ء ص ۲۶

گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر نظریہ شونیہ اور ساختیاتی فکر صریر، کراچی مارچ ۹۳ء ص ۸

گوپی چند نارنگ مارکسیت، ساختیات اور پس ساختیات صریر، کراچی اپریل ۹۳ء ص ۹

گوپی چند نارنگ دریدا اور مارکسیت طلوعِ افکار، کراچی مئی ۹۳ء ص ۱۷

محمد باقر ہاشمی پروفیسر تفہیمی کے جائزہ پر ایک نظر طلوعِ افکار، کراچی اپریل ۹۳ء ص ۵۳

محسن رعنا رضوی	سحر البیان جمالیاتی تناسب کے تناظر میں	روحِ ادب کلکتہ مارچ ۹۳ء ص ۶۲
محمد علی صدیقی، ڈاکٹر	مجاز، شخصیت اور شخصیت سے فرار	قومی زبان، مارچ ۹۳ء ص ۱۷
مقصود حسنی	اسلوب، تنقیدی مطالعہ	صحیفہ، لاہور ستمبر ۹۲ء ص ۶۰
مقصود حسنی	شاعری کا نظریۂ انسان	ادب لطیف، لاہور مئی ۹۳ء ص ۱۸
ممتاز احمد خان، ڈاکٹر	آگ کا دریا، ایک جائزہ	قومی زبان، کراچی، مارچ ۹۳ء ص ۳۱
مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر	ساختیات	صریر، کراچی فروری ۹۳ء ص ۹
موسیٰ مجنون	خدا سب دیکھتا ہے بنام مٹھی میں جگنو	روحِ ادب کلکتہ ستمبر ۹۲ء ص ۷۶
ناصر عباس نیر	ساختیاتی تنقید اور ساخت شکنی کے چند پہلو	صریر، کراچی مارچ ۹۳ء ص ۱۹
نظیر صدیقی، پروفیسر	رشید احمد صدیقی کے خطبات	قومی زبان، کراچی جنوری ۹۳ء ص ۴۵
نظیر صدیقی، پروفیسر	مصحفی اور انشاء	شام و سحر، لاہور جنوری ۹۳ء ص ۳۳
نیر مسعود ڈاکٹر	مرثیے کی تنقید	اردو، کراچی، مارچ ۹۲ء ص ۲۹
میاں نذیر	ہمان دانش کا عاشقہ ایک افسانہ	ماہ نو، لاہور جنوری ۹۳ء ص ۵۶
نجیب جمال، ڈاکٹر	حالی کی تنقید ایک مطالعہ	ماہ نو لاہور جون ۹۳ء ص ۵۵
وزیر آغا، ڈاکٹر	ساختیات، ساخت شکنی اور ساختیاتی تنقید کے چند پہلو	صریر، کراچی جنوری ۹۳ء ص ۸
وزیر آغا، ڈاکٹر	گفتار از بشیر سیفی	اردو ادب، اسلام آباد جون ۹۳ء ص ۶
وزیر آغا، ڈاکٹر	ڈی کنسٹرکشن	اقبال، لاہور اپریل ۹۳ء ص ۳۴
وفا راشدی، ڈاکٹر	پروفیسر اسرار احمد سہاروی کا سرمایۂ حیات تنقیدی جائزہ	مفیض، گوجرانوالہ جون ۹۳ء ص ۱۹۳
یوسف حسن	آہن گر، آئینہ گر، تنویر سپرا کی شاعری	فنون، لاہور جنوری اپریل ۹۳ء ص ۱۰۳

ترجمہ فنِ ترجمہ

رشید امجد، ڈاکٹر	میراجی کے تراجم	اردو، کراچی ۷ ا مارچ ۹۲ء ص ۴۰
میرزا ادیب	اردو ادب میں دو خوبصورت ڈراموں کا اضافہ	
مترجم: ڈاکٹر فہیم اعظمی		صریر، کراچی جولائی ۹۳ء ص ۶۸

خود نوشت

افتخار احمد عدنی	یادوں کا سفر۔ جگر مرادآبادی	قومی زبان، کراچی جنوری ۹۳ء ص ۳۱
افتخار احمد عدنی	یادوں کا سفر، بابا ذہین شاہ تاجی	قومی زبان، کراچی مئی ۹۳ء ص ۳۷
افتخار احمد عدنی	یادوں کا سفر، بابا ذہین شاہ تاجی	قومی زبان، کراچی جون ۹۳ء ص ۵۷
حافظ عبدالحق	یادِ ماضی	محفل، لاہور فروری ۹۳ء ص ۹۳
خالدہ حسینی	مولانا امینی، چند یادیں چند باتیں	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، جنوری ۹۳ء ص ۴۹

مصنف	عنوان	رسالہ	
خلیق ابراہیم خلیق	دہلی کہ ہے روم ایشیا کا	ارتقا، کراچی ۱۰/۹۳ء ص ۱۹۶	
سعید ظفر	وادِ ابتلا	اردو نامہ، لاہور جون ۹۳ء ص ۲۲	
شان الحق حقی، ڈاکٹر	بے زبان بے کھوٹ کپٹ ساتھی قسط نمبر (۱۳)	افکار، کراچی جنوری ۹۳ء ص ۱۷	
شان الحق حقی، ڈاکٹر	ابتدائی ورزشِ سخن قسط نمبر (۱۴)	افکار، کراچی فروری ۹۳ء ص ۱۷	
شان الحق حقی، ڈاکٹر	مزید سخن ورزیاں قسط نمبر (۱۵)	افکار، کراچی مارچ ۹۳ء ص ۱۷	
شان الحق حقی، ڈاکٹر	بدعات و بدیعات قسط نمبر (۱۶)	افکار، کراچی اپریل ۹۳ء ص ۱۷	
شان الحق حقی، ڈاکٹر	بھٹیار خانے سے شاہی محل تک قسط نمبر (۱۷)	افکار، کراچی مئی ۹۳ء ص ۱۳	
شان الحق حقی، ڈاکٹر	خیال کی رو، بے روزگاری سے نظم نگاری تک قسط نمبر (۱۸)	افکار، کراچی جون ۹۳ء ص ۱۵	
عبد الحمید کمالی	مشاہدات و تاثرات	اقبال، لاہور جنوری ۹۳ء ص ۱۲۹	
غلام الثقلین نقوی	والدِ محترم	اوراق، لاہور جون ۹۳ء ص ۲۷۸	
غلام مصطفےٰ خان، ڈاکٹر	مخدومی نواب حبیب الرحمٰن خان شروانی	اردو، کراچی مارچ ۹۲ء ص ۵	
مسعود جاوید	ہائی ہیل جو تھا نہیں ہے	سیارہ، لاہور سالنامہ جنوری فروری ۹۳ء ص ۴۱۷	
میرزا ادیب	روشنی کی ایک تابناک کرن قدرت اللہ شہاب	اردو نامہ، لاہور مارچ ۹۳ء ص ۲۵	
نواب بہادر یار جنگ	میں مطالعہ کس طرح کرتا ہوں	تہذیب الاخلاق لاہور جون ۹۳ء ص ۱۳	
نیاز فتحپوری، علامہ	والد مرحوم، میں اور نگار	نگارِ پاکستان، کراچی جون ۹۳ء ص ۴	
نیاز فتحپوری، علامہ	میری زندگی کے چار حادثات	نگارِ پاکستان، کراچی جون ۹۳ء ص ۶۲	
وفا راشدی، ڈاکٹر	داستانِ وفا، کلکتے کا ادبی ماحول قسط نمبر (۲)	العلم، کراچی ستمبر ۹۲ء ص ۷۵	
وفا راشدی، ڈاکٹر	داستانِ وفا کلکتے کا ادبی ماحول قسط نمبر (۳)	العلم، کراچی دسمبر ۹۲ء ص ۶۶	
وفا راشدی، ڈاکٹر	داستانِ وفا ٹیگور اور نذرل کی سرزمین قسط نمبر (۴)	العلم، کراچی ۹۳ء ص ۲۹	
وفا راشدی، ڈاکٹر	داستانِ وفا داتا کی نگری میں قسط نمبر (۵)	العلم، کراچی اپریل جون ۹۳ء ص ۳۶	
ہرچرن چاؤلہ	البم	اوراق، لاہور جون ۹۳ء ص ۲۸۸	

سفر نامہ

مصنف	عنوان	رسالہ
اعزاز احمد آذر	تمنا بے تاب، محمد سعید شیخ کا سفر نامہ ارض مقدس	ماہِ نو لاہور جنوری ۹۳ء ص ۵۲
بیگم حسرت موہانی	سفر نامۂ عراق	نگارِ پاکستان، کراچی مئی ۹۳ء ص ۲۸
پروین عاطف	دادا ہنیکن (ہالینڈ) قسط نمبر (۲)	تخلیق، لاہور اپریل ۹۳ء ص ۸۱
جاوید چوہدری	جب برف گرے گی	مفیض گوجرانوالہ جون ۹۳ء ص ۱۵۷
رام لعل	جان نواز کوچے (۱۹۸۴ء) قسط نمبر (۲)	تخلیق، لاہور اپریل ۹۳ء ص ۷۵
رشید امجد، ڈاکٹر	پرتورو ہیلہ کا سفر گشت	فنون، لاہور جنوری اپریل ۹۳ء ص ۱۱۰

سلیم اختر، ڈاکٹر شہر ہول ماہ نو فروری ۹۳ء ص ۵۹
سید ضمیر جعفری بحر اوقیانوس کے اُس پار قسط نمبر (۷) چہار سو راولپنڈی فروری ۹۳ء ص ۵۷
سید ضمیر جعفری کچھ وقت کنگرو دیس میں ماہ نو، لاہور مئی ۹۳ء ص ۵۱
سید ضمیر جعفری راوی جہلم سے دریائے فرات تک محفل، لاہور جون ۹۳ء ص ۲۰
سید ظل الرحمن ایران میں تاریخ طب کی عالمی کانگریس تہذیب الاخلاق، علی گڑھ جنوری ۹۳ء ص ۳۶
سید قاسم محمود کویت میں سات دن سائنس میگزین، کراچی جنوری فروری ۹۳ء ص ۹
فرمان فتحپوری، ڈاکٹر پندرہ دن چین میں ارتقا، کراچی ۱۰/۹۳ء ص ۱۸۰
محمد باقر، ڈاکٹر ہم دلی یا ہم زبانی؟ قومی زبان، کراچی جون ۹۳ء ص ۵۵
محمد عارف، ڈاکٹر لندن کی تاریخی عمارات اردو نامہ، لاہور فروری ۹۳ء ص ۱۶
محمد عارف، ڈاکٹر آکسفورڈ، ایک قدیم درسگاہ اردو نامہ، لاہور مارچ ۹۳ء ص ۱۹
محمد عارف، ڈاکٹر سوئے حرم اردو نامہ، لاہور اپریل ۹۳ء ص ۲۹
مسعود الرحمن خاں ندوی سودی عرب ۱۹۹۲ء مشاہدہ، مطالعہ تجزیہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ مارچ ۹۳ء ص ۱۵
مشتاق احمد خاں جنگ عظیم کے دوران ایک تاریخی سفر کی روداد تہذیب الاخلاق، لاہور مئی ۹۳ء ص ۲۲
نسیم سید جہاں دریا ملتے ہیں (کینیڈا) تخلیق لاہور اپریل ۹۳ء ص ۸۷
ہمایوں جمیل خاں علامہ شبلی نعمانی ایک صاحبِ نظر سیاح؟ سفر مصر روم شام کی روشنی میں روحِ ادب، کلکتہ مارچ ۹۳ء ص ۶۹

خطوط

حسرت کاسگنجوی، ڈاکٹر فضل احمد کریم فضلی کے چند خطوط محفل، لاہور جون ۹۳ء ص ۲۵
رشید حسن خاں ذاتی خطوں سے متعلق چند معروضات فنون، لاہور دسمبر ۹۲ء ص ۳۹
مالک رام آخری خط بنام احمد ندیم قاسمی فنون، لاہور جنوری اپریل ۹۳ء ص ۲۶
مالک رام بنام نادم سیتاپوری سب رس کراچی مئی ۹۳ء ص ۳۸
میر عابد علی خاں خواجہ شاہد کے نام سب رس، کراچی مارچ ۹۳ء ص ۴۹

ملاقات

تحسین فراقی، ڈاکٹر ممتاز محقق مشفق خواجہ سے گفتگو سیارہ، لاہور سالنامہ جنوری فروری ۹۳ء ص ۱۸۱
حسن رضوی حبیب جالب کا ایک یادگار انٹرویو سب رس، کراچی جون ۹۳ء ص ۲۵
حمید الدین شرفی، ڈاکٹر عابد علی عابد سے انٹرویو سب رس، کراچی مارچ ۹۳ء ص ۱۷
خالق تنویر، پروفیسر اختر حسین جعفری سے ایک گفتگو فنون، لاہور جنوری اپریل ۹۳ء ص ۷۲
رحمن نشاط تخلیق میں موضوع اور ہیئت کی اہمیت (شمس الرحمن فاروقی سے ایک گفتگو) قومی زبان، کراچی اپریل ۹[illegible]

مالک رام نمبر

نیشنل بینک میں رقم اور مُنافع کا تحفّظ

روپے اور فارن کرنسی کے ڈپازٹس اور پُرکشش شرح منافع پر حکومتِ پاکستان کی ضمانت۔ مستعد، ماہرانہ خدمات کے ساتھ اندرون و بیرون ملک جدید شاخوں کا وسیع سلسلہ۔

آپ کی خدمت ہمارا افتخار

نیشنل بینک آف پاکستان

اعلیٰ خدمت مکمل تحفظ

ہیڈ آفس آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ پاکستان
Telephones. 2417989 - 2416781 - 10 lines Ext 405
Fax 2421236 - Telex 23732 NBP PK

خصوصی شمارہ
قیمت: ۱۲ روپے

کراچی

ماہنامہ قومی زبان

اپریل ۱۹۹۴ جلد ۶۶ شمارہ: ۴

مضمون نما

بدل اشتراک
فی پرچہ ——— ۸ روپے
سالانہ عام ڈاک سے ۹۰ روپے
سالانہ رجسٹری سے ۱۶۲ روپے
بیرونِ ممالک
سالانہ عام ڈاک سے ۱۰ پونڈ ۱۵ ڈالر
سالانہ ہوائی ڈاک سے ۱۵ پونڈ ۲۵ ڈالر

انجمن ترقی اردو پاکستان
شعبۂ تحقیق: ڈی ۱۵۹۔ بلاک ۷۔ گلشن اقبال
کراچی ۷۵۳۰۰۔ فون: ۴۶۱۴۰۶

سرورق کی تصویر کے لیے جناب مسعود احمد برکاتی کا شکریہ

قومی زبان کے اس خصوصی شمارے کی قیمت -/۱۲ روپے ہے

تصنیفات و تالیفاتِ مالک رامؔ

تصنیفات و تالیفات

تصنیفات:

۱- ذکرِ غالب ۱۹۳۸ء
۲- عورت اور اسلامی تعلیم 1951ء
۳- تلامذۂ غالب ۱۹۵۸ء
۴- مرزا غالب (انگریزی) ۱۹۶۸ء
۵- تذکرۂ معاصرین (۱) ۱۹۷۲ء
۶- " " (۲) ۱۹۷۶ء
۷- " " (۳) ۱۹۷۸ء
۸- " " (۴) ۱۹۸۲ء
۹- ایرانی شاہنشاہی کے ڈھائی ہزار سال ۱۹۷۱ء
۱۰- "وہ صورتیں الٰہی" ۱۹۷۴ء
۱۱- قدیم دلّی کالج ۱۹۷۵ء
۱۲- فسانۂ غالب ۱۹۷۷ء
۱۳- حالی (انگریزی) ۱۹۸۲ء
۱۴- اسلامیات ۱۹۸۴ء
۱۵- گفتارِ غالب ۱۹۸۵ء

نوٹ:

ان تصنیفات میں "عورت اور اسلامی تعلیم" اور مرزا غالب کئی زبانوں میں شائع ہوئے۔ ان کے ساتھ کچھ تصانیف کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔

مرتب کردہ کتابیں۔

۱- سبد چین (فارسی، غالب) ۱۹۳۸ء
۲- کلیاتِ غالب (فارسی، غالب) غیر مطبوعہ

۳- دیوان اردو (غالب) ۱۹۵۷ء
۴- خطوط غالب (منشی مہیش پرشاد) ۱۹۶۲ء
۵- گلِ رعنا (غالب) ۱۹۷۰ء
۶- غبار خاطر (مولانا ابوالکلام آزاد) ۱۹۶۷ء
۷- تذکرہ (مولانا ابوالکلام آزاد) ۱۹۶۸ء
۸- خطبات آزاد (مولانا ابوالکلام آزاد) ۱۹۷۴ء
۹- نذر عرشی (اردو، انگریزی) ۱۹۶۵ء

(پروفیسر مختار الدین احمد کے اشتراک سے)

۱۰- نذر ذاکر (اردو، انگریزی) ۱۹۶۷ء
۱۱- نذر عابد (اردو، انگریزی) ۱۹۷۴ء
۱۲- نذر زیدی (اردو، انگریزی) ۱۹۸۰ء
۱۳- نذر حمید (اردو، انگریزی) ۱۹۸۱ء

اس کے علاوہ اور بھی کتابیں (ایک درجن سے بھی زائد) ہیں جن کو مالک رام نے ترتیب دی۔

انعامات و اعزازات

۱- "گلِ رعنا" پر یوپی حکومت کا انعام ۱۹۷۱ء
۲- "تذکرہ معاصرین" پر یوپی اردو اکادمی کا انعام ۱۹۷۳ء
۳- "وہ صورتیں الٰہی" پر یوپی اردو اکادمی کا انعام ۱۹۷۴ء
۴- ساہتیہ کلا پریشد دلّی کا اردو ایوارڈ ۱۹۷۵ء
۵- "تذکرہ معاصرین" پر بہار اردو کا اکادمی پٹنہ کا انعام ۱۹۷۵ء
۶- غالب انسٹیٹوٹ نئی دلّی کا مودی غالب ایوارڈ ۱۹۷۶ء
۷- میر اکادمی لکھنؤ کا امتیاز میر ایوارڈ ۱۹۷۷ء
۸- میر اکادمی لکھنؤ کا افتخار میر ایوارڈ ۱۹۸۱ء
۹- "تذکرہ معاصرین" پر یوپی اردو اکادمی لکھنؤ کا انعام ۱۹۸۲ء
۱۰- "تذکرہ معاصرین" پر ساہتیہ اکادمی کا اردو ایوارڈ ۱۹۸۳ء
۱۱- "تلامذۂ غالب" پر بہار اردو اکادمی پٹنہ کا انعام ۱۹۸۴ء
۱۲- اردو خدمات پر بہار اکادمی پٹنہ کا سب سے اعلیٰ ایوارڈ ۸۵-۱۹۸۴ء
۱۳- ڈاکٹر ذاکر حسین عالمی اردو انعام برائے قومی یک جہتی ۱۹۸۷ء

بہ شکریہ افکار ملی دہلی

جناب مالک رام

ڈاکٹر اسلم فرخی

جناب ایم ایچ عسکری

جناب مسعود احمد برکاتی

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

دہلی کی یادگار تصویر: عبداللطیف اعظمی، شاہد علی خان، مسعود حمد برکاتی، [illegible]

"اردو ادب کے بڑے محقق" کا فقرہ جس کے نام کے آگے سجتا تھا اور جس کے لیے اسے لکھ کر دل کو تفاخر محسوس ہوتا تھا وہ جناب مالک رام تھے۔ ناقدین ادب اس عصر کے جن چار محققین کو اُردو تحقیق کا ستون گردانتے ہیں اُن میں ایک نام جناب مالک رام کا ہے۔ باقی تین بڑے محققین قاضی عبدالودود مولانا امتیاز علی عرشی اور مسعود حسن رضوی ادیب ہیں۔

افسوس کہ مالک رام صاحب اب ہم میں نہیں۔ ۱۶ اپریل ۱۹۹۳ء کو ان کا انتقال دلّی میں ہوا۔ ان کے انتقال سے اُردو تحقیق کی دنیا میں ایک ایسا خلا رونما ہوا ہے جس کی تلافی تادیر ممکن نہ ہوسکے گی۔

جناب مالک رام کے موضوعات تحقیق میں غالب کو اختصاص حاصل ہے۔ تمام عمر غالب کے متعلق مواد و ماخذ کی جستجو میں لگے رہے، جہاں کہیں اس کے ہونے کی بھنک لگی وہ اُس دروازے پر دستک دینے چلے گئے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں غالب کو بہ ہر رنگ و بہ ہر جہت دیکھنے کی سعی کی، اُن کی تصانیف "ذکرِ غالب" اور "تلامذۂ غالب" غالبیات کے ضمن میں معلومات کا نچوڑ ہے

غالب کی بازیافت میں آنجہانی مالک رام نے اکیلے جتنا کچھ کیا اُتنا بہت سے مل کر بھی نہیں کر پاتے۔ یہ جو ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی ذات میں انجمن تھے تو یہ کہاوت اُن پر اس لیے صادق آتی ہے کہ انھوں نے ایک بھری پُری انجمن کے کرنے کا کام تنہا انجام دیا ہے۔

جناب مالک رام کی تصنیف "تذکرہ معاصرین" جو چار جلدوں میں شائع ہوئی ہے اس کے بارے میں اہل الرائے کا خیال ہے کہ یہ معاصرین کے تذکرے کے باب میں ایک سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے اور ایک نیا معیار قائم کرتی ہے۔

"عورت اور اسلامی تعلیم" مالک رام صاحب کی معرکتہ الآرا تصانیف میں شمار ہوتی ہے جس کسی نے اسے پڑھا، وہ "اسلامیات" میں اُن کے استدراک و استشہاد کا قائل ہوا۔ علمائے حق کا خیال ہے کہ اس موضوع پر کوئی مسلمان عالم بھی ایسی کتاب لکھتا تو اس انہماک، استدراک اور استناد کا کا ہے کو اس درجہ خیال رکھتا۔

جناب مالک رام کا مسلک حیات انسان دوستی اور شائستگی پر قائم ہے۔ اِن کی تحریر کی لے دھیمی اور ایک ایسے دریا کی مثال ہے جو ہموار علاقے سے گزرتا ہے اور سُبک روی جس کی پہچان ہے۔

جناب مالک رام کی موہنی شخصیت کے بارے میں دو رائے نہیں ہو سکتی جو اُن سے ملا اُن کا گرویدہ ہوا۔ اُن کی پرستاری کا دم بھرنے لگا، اور اُن کی ملنسار طبیعت کا رطب اللسان ہوا۔ ان کی طبیعت میں انکساری اس حد تک تھی کہ وہ اپنے چھوٹوں سے بھی ملتے تو انھیں بڑا بنا دیتے تھے بہ یک زبان "سب اچھا کہیں جسے" کا اعزاز مالک رام صاحب کے حصّے میں آیا۔ زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو شاید ایسے ہی موقع کے لیے کہا گیا ہے۔

قطعۂ تاریخ وفات
جناب مالک رام

شان الحق حقی

قصر اردو کا گرا اور اک عماد
آ پڑی اک اور اُفتاد گراں
مرگ مالک رام پر ہے دل ملول
حق ہے گر ہو خود ادب ماتم کناں
یہ بھی کھانا تھا ہمیں اک تیر غم
ہاتھ سے رکھی قضا نے کب کماں
لے گئے اپنا وہ ذوق جستجو
جستجو اب کیجیے ان کی کہاں
تھی گراں قدروں کا سنگم ان کی ذات
تھا ادب کا تیرتھ ان کا آستاں
یاد آئے گی وہ شفقت وہ خلوص
نقش ہیں دل پر سب ان کی خوبیاں
پُر کرے گا کون اب ان کی جگہ
بسکہ ہے تحقیق اک کار زیاں
باصفا و پا کباز و صلح کل
کارناموں کی ہے لمبی داستاں
"وہ محقق وہ مورخ نامور" (۱۴۱۴ھ)
"آہ وہ غالب شناس نکتہ داں" (۱۹۹۳ء)

قومی زبان (۱۱) اپریل ۱۹۹۳ء

جمیل الدین عالی
معتمد اعزازی

ہمارے مالک رام صاحب

مالک رام صاحب اُردو کے آدمی تھے اور ان کی بیشتر تصانیف ہندوستان کے علاوہ پاکستان میں بھی متعارف اور متداول ہیں۔ ویسے ایک طرح "ہمارے" آدمی بھی تھے۔ ولادت موضع پھالیہ، ضلع گجرات، (۱۹۰۶) انتقال نئی دہلی (۱۹۹۳) قیام ملازمت کے سلسلے میں بیرون ہند بہت رہا۔ تقسیم کے بعد نئی دہلی میں ہی ٹھہر گئے تھے۔ حالانکہ میں نے ان سے عرض کیا کہ تقسیم ہند کے فسادات اپنی جگہ آپ کی اردو سے وہ وہ نسبتیں ہیں کہ اگر پاکستان میں قیام کرتے تو کراچی لاہور پورا پاکستان آپ کو سر آنکھوں پر بٹھاتا۔

۴۳۔۱۹۴۲ء میں مجھے حضرت سائل دہلوی کی خدمت میں زیادہ وقت گزارنے کا موقع ملا کیونکہ رشتہ دار ہونے کے علاوہ میں ان کا اعزازی کاتب (سیکرٹری) بھی ہو گیا تھا۔ میں انٹر میں پڑھتا تھا۔ ان کی بینائی جا رہی تھی۔ ان کی خط کتابت کئی اعزازی کاتب کرتے تھے۔ برادرم انوار دہلوی (اب نہ جانے کہاں ہیں) پنڈت رتن ناتھ خار دہلوی، پنڈت من موہن ناتھ گلزار ذکائی دہلوی..... کئی شاگرد اور میں فخر شاگردی سے محروم مگر بڑا لاڈلا، چہیتا بھتیجا..... (ان پر میرا خاصا تفصیلی خاکہ کئی بار چھپ چکا ہے) اس زمانے میں کہ جنگ کے سبب بیرونی ڈاک بڑا وقت لیتی تھی ایک لیٹر ہیڈ پر خاصا طویل خط آتے تھے۔ سر خط پر چھپا ہوا ہوتا "مالک رام بوہرہ" اس وقت مالک رام صاحب (غالباً قاہرہ) میں تعینات تھے۔ غالب کی مہروں پر کام کر رہے تھے۔ (بعد میں "غالب کی مہریں" شائع بھی ہوئی جو غالب کے ذہنی رجحان وارتقا کی بڑی دلچسپ کہانی ہے...) ان کے سوالات اور سائل صاحب کے جوابات نے مجھے احوال غالب سے زیادہ واقفیت حاصل کرنے پر آمادہ کیا۔ ملاقات کب ہوئی۔ ۱۹۸۲ء میں جب میں کسی ادبی دورے پر پہلی بار ہندوستان گیا۔ ان سے ملاقاتیں ۱۹۸۲ء کے بعد چند ہی ہوئیں ۱۹۸۲ء تا ۱۹۹۰ء پانچ دورے دہلی کے ہوئے ہیں ہر مرتبہ ایک بار ان کی خدمت میں حاضر ہوتا اور بہت کچھ سیکھ کر آتا۔ خط کتابت رہی مگر زیادہ نہ رہی لیکن! انہیں پڑھا خاصا ہے..... اور وہ ایک نہایت ہی "یادگار" قسم کی شخصیت لگتے ہیں۔ اُن کے یا ان کی تحقیق کے مخالفین (معدودے چند سہی) ہندوستان میں تو ہیں ہی (شاید اپنی اپنی سچائی میں بجا طور پر..... اور انہیں وہیں جواب آں غزل بھی ملتا رہا ہے مگر یہاں ان پر حرف گیری میری یاد میں نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ اب تو وہ ایک زندہ لیجنڈ ہو گئے تھے۔ پاکستانی ادب انہیں دیکھنے کے کس قدر متمنی تھے یہ ہم سب جانتے ہیں۔ میں نے ان کے لیے وہیں سے واہگہ اور واہگہ سے خصوصی اجازت کے ساتھ لاہور کار میں ہی لانے کا انتظام کئی بار کیا۔ ان کی صحت نے اجازت نہ دی۔ فضائی سفر سے شاید عارضہ قلب میں بے یقینی کے سبب ممکن نہ رہا تھا۔

قومی زبان (۱۲) اپریل ۱۹۹۴ء

مالک رام صاحب کے علمی کارنامے عملاً تین شعبوں پر محیط ہیں ۱) غالبیات ۲) اسلامیات ۳) اذکار و احوال ..... (اب برادرم مشفق خواجہ صاحب کا زبانی اشارہ یہ کام آتا ہے جو وقت تحریر ان سے فون پر حاصل کیا ہے)۔

ان کی ایک کتاب "اسلام اور عورت" ہے۔ اسلام میں عورت کا مقام جس تفصیل و دلیل کے ساتھ مالک رام صاحب نے متعین کیا ہے وہ پاک و ہند کے کم مصنفین کر سکے ہیں۔ اس کے ترجمے عربی میں ہو کر دنیائے عرب میں عام ہوئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی بیشتر تصانیف کو ایڈٹ کیا۔ (ترجمان القرآن مع حواشی چار جلدوں میں) "غبار خاطر" کو بھی ایڈٹ کیا۔ حواشی کے ساتھ۔ اس طرح کہ مولانا جابجا اعلیٰ درجے کے شعر نقل کرتے تھے مگر شاعر کا نام نہیں لکھتے تھے۔ مالک رام صاحب نے ان شعرا کے نام درج کئے اور ان کتابوں کے حوالے بھی دیے جن کا ذکر مولانا کی اس کتاب میں آیا ہے۔ (ہمارے ہاں مولانا ابوالکلام آزاد پر سب سے جامع اور بہت خوبصورت کام مولانا ابو سلمان شاہجہان پوری کا کہا جاتا ہے) خطوط ابوالکلام دو جلدوں میں ایڈٹ کئے (ایک جلد چھپ گئی) غالب کے منہ بولے بیٹے زین العابدین خان عارف کی بہو نواب بگا بیگم بنت نواب ضیاالدین خان نیّر درخشاں اور زوجہ باقر علی خان کامل) پر ایک خصوصی مقالہ لکھا جو ابھی چھپا نہیں ہے۔ وہ رشتے میں میرے والد کی پھوپھی تھیں غالب انہیں خود بیاہ کر لائے تھے۔ بڑی عمر پائی۔ ۱۹۴۵ء میں انتقال کیا۔ میں نے انہیں خوب دیکھا ہے۔ جب ان کا احوال لکھ رہے تھے چند باتیں مجھ سے بھی پوچھیں۔ معلوم نہیں اس مقالے میں میرے بیانات کا حوالہ کتنا ہے لیکن یقیناً وہ غالبیات ..... احوال ..... میں ایک بہت دلچسپ اضافہ ہو گا (اس سے پہلے صرف پروفیسر حمید احمد خان مرحوم سابق شیخ الجامعہ پنجاب نے ان پر بھرپور طریقے سے لکھا ہے) غالب کے خطوط مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم کے مقدمے میں کچھ ذکر میں نے کر رکھا ہے) بہت سے تقریباً ساٹھ ستر دیگر مقالے بھی غیر مطبوعہ ہیں۔ لیکن ابھی تو ہم نے مطبوعہ کی گنتی شروع کی ہے.....

۴) "نثر ابوالکلام آزاد"۔ مولانا کی بہترین تحریروں کا انتخاب ۵) تذکرۃ المعاصرین ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۷ء تک انتقال کرنے والے معاصرین کا احوال ۶) تذکرہ ماہ و سال ..... جتنے ادیبوں کا سال پیدائش سال وفات مل سکا "وے صورتیں الٰہی" یہ پرانے شعرا و ادبا کے خاکے ہیں ۸) قانون حمورابی اور بابلی تہذیب و تمدن ..... یہ ایک سلسلہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ کبھی تقسیم سے بہت پہلے بابائے اردو نے ایک جریدہ "تاریخ و سیاسیات" شروع کیا تھا۔ ان کی تحریر پر مالک رام صاحب نے بھی یہ موضوع لیا اور خوب تحقیق کی۔ ایک وقت یہ مضامین انہیں بھی دستیاب نہ تھے۔ مشفق خواجہ صاحب کے پاس موجود ..... انہوں نے فوٹو اسٹیٹ کروا کے بھیج دیے کتاب بن گئے۔ بقول مالک رام صاحب "ملا کی دوڑ مسجد تک، پاکستان میں میری مسجد تو مشفق خواجہ ہے" یہ اُن کی آخری کتاب ہے۔

ایک کتاب کا نام "اسلامیات" میں نے نہیں دیکھی۔ مشفق خواجہ صاحب بتاتے ہیں کہ مقالوں کا مجموعہ ہے اور مقدمے میں مولانا عبدالماجد دریا بادی لکھتے ہیں کہ (خاکم بدہن) "مصنف کا علم تبصرہ نگار (مولانا مرحوم) کے علم سے زیادہ ہے"۔

یہ ہمیشہ ایک معمہ رہا کہ مالک رام صاحب کو اسلام سے اتنا شغف کیوں تھا۔ ان کی زندگی میں شبہ یہ کیا جاتا تھا کہ دل سے مسلمان ہیں۔ بھارتی حالات کے سبب کھل کر ظاہر نہیں کرتے۔ ایک افواہ یہ تھی کہ قادیانی ہیں اس لیے ظاہر نہیں کرتے حالانکہ قادیانی چند برس سے پاکستان میں تو "احتیاط" کر سکتے ہیں بھارت میں کریں بھی تو کیوں کریں ..... بہرحال مسلمان مانے جانے کے لیے اعلان اسلام ضروری کہا جاتا ہے وہ انہوں نے نہیں کیا۔ میں نے ان چند ملاقاتوں کے بعد ایک مرتبہ ادباً پوچھا تو ٹال گئے..... اب جاننا چاہا کہ آخری مراسم کیسے ادا ہوئے تو بتایا گیا کہ ارتھی جلائی گئی.....

مگر علمی ادبی خدمات کے حوالے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کون کس مذہب سے تعلق رکھتا تھا اور کیا ظاہر کرتا تھا۔ پنڈت دیا شنکر نسیم، پنڈت برج نرائن چکبست، پنڈت رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری پنڈت آنند نرائن ملا۔ پنڈت دتاتریہ کیفی کے بغیر اردو تاریخ تحقیق و ادب بالکل نامکمل..... مالک رام صاحب ایک بڑے اردو ادیب تھے اور ان سے ہمارا ایسی حوالہ بنتا ہے (پنڈت آنند نرائن ملا کو اللہ ابھی اور بہت دن زندہ رکھے (پچاسی برس سے زیادہ کے ہوگئے ہیں۔ پانچویں دہائی میں جب بھارت میں اینٹی مہم زوروں پر تھی انہوں نے کھلا بیان دیا کہ مذہب چھوڑ دوں گا مگر اردو کو نہیں چھوڑوں گا)۔ مالک رام صاحب کا کام غالبیات پر ہی اتنا ہے کہ ایک علیحدہ کتاب کا تقاضہ کرتا ہے۔ غالب، ذکر غالب، گفتار غالب، افسانہ غالب، دیوان غالب کا مالک رام ایڈیشن سبدچین کا مالک رام ایڈیشن (گو سبدچین فارسی کی کتاب ہے) ان پر ان کی زندگی میں ہی کئی گلدستے آئے۔ انجمن ترقی اُردو ہند کے صدر رہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بورڈ آف گورنر پر اعزازی کام کیا۔ کئی اردو بورڈوں کے رکن ساہتیہ اکادمی ہند کے بڑے موثر عہدیدار ..... ایک بڑی وسیع پھیلی ہوئی اور روشن شخصیت ..... بھارت میں اردو کے بدترین دور ابتلا سمیت شروع سے اب تک ایک بڑے جواں مرد مبلغ و محافظ اردو..... انجمن ترقی اُردو پاکستان ۵ ا جون ۹۳ء کو نیپا آڈیٹوریم میں انہیں خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ایک جلسہ کر رہی ہے مگر ان کا حق یوں نہ ادا ہوگا۔ ضرورت ہے کہ ان پر کوئی پاکستانی محقق ایک بھرپور کتاب لکھے۔ فی الوقت بھارت میں ہر مذہب کے تمام اردو دوستوں کو یہ پیغام پہنچے کہ پاکستان میں اپنی قومی زبان اور پاک بھارت میں رابطے کی سب سے بڑی زبان کے خادم محسن کو پورے احترام اور محبت کے ساتھ یاد کیا جا رہا ہے۔ اس اظہاریے میں ان کی دل آویز اور جامع کمالات شخصیت کا احاطہ ممکن نہیں۔ جیا تو ان کا خاکہ لکھوں گا......

۱) یہ جلسہ بہت بڑا اور کامیاب تھا۔

(اظہاریہ بشکریہ روزنامہ "جنگ" کراچی جمعہ ۲۸ امئی ۹۳ء)

قومی زبان (۱۴) اپریل ۱۹۹۴ء

مالک رام کا آخری خط (ندیم کے نام)

نئی دہلی۔ ۲۰ دسمبر ۱۹۹۲ء

محب گرامی سلمکم اللہ تعالیٰ، آداب

یاد آوری کا دلی شکریہ۔ آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ آپ کے مختصر گرامی نامے سے میں کتنا متاثر ہوا ہوں۔ آج کل کی دنیا میں یہ چیز نادر ہی نہیں ناپید ہے۔

زندہ باشی و جاوداں باشی

میری صحت پچھلے پانچ چھ برس سے رو با نحطاط ہے۔ ۱۹۸۶ء میں دونوں آنکھوں کا موتیا کا آپریشن ہوا۔ عمل جراحی تو ٹھیک رہا لیکن بینائی میں کوئی خاص بہتری نہیں ہوئی۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ کچھ بنیادی نقص ایسا تھا کہ اس کے پیش نظر اب اس کے بہتر ہونے کا کوئی امکان نہیں رہا۔ سوائے صبر و شکر کے اور کیا چارہ تھا۔ قہر درویش بجان درویش۔ خاموش ہو رہا، اور کر بھی کیا سکتا تھا! لیکن رفتہ رفتہ حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ اب یہ حالت ہے کہ اٹکل سے کچھ لکھ تو لیتا ہوں لیکن چشمے کے باوجود جب تک ہاتھ میں مکبر شیشہ نہ ہو پڑھنے میں دشواری محسوس ہوتی ہے۔

عام کمزوری کا یہ عالم ہے کہ کچھ نہ پوچھیے۔ سب سے زیادہ تکلیف ٹانگوں میں ہے۔ لڑکھڑاہٹ کا یہ حال ہے کہ سہارے کے بغیر چار قدم نہیں چل سکتا۔ چلتا ہوں تو گر جاتا ہوں۔ ڈاکٹر کا حکم ہے کہ ہاتھ میں لکڑی لیے بغیر بالکل نہ چلو۔ اگر گر گئے تو کولہے کی ہڈی ٹوٹ جائے گی اور اس عمر میں اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ چنانچہ جب تک کوئی ساتھ نہ ہو گھر سے باہر جانے پر قدغن ہے۔ اور کون ہر وقت میرے ساتھ باہر جانے کو بیٹھا ہے! آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ بعض اوقات گھر سے ہفتوں نہیں نکلتا۔

غرض یہ ہے روداد۔ راضی برضا ہوں۔ وہ جس حال میں رکھے اس کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔ پرسوں (۲۲ دسمبر کو) عمرِ رائیگاں کے ۸۶ برس پورے کر لوں گا۔ سب سے زیادہ رنج اس بات کا ہے کہ زادِ راہ کے لیے آج تک کچھ نہیں کیا۔ لیکن اب پچھتائے کیا ہوتا ہے!

دعا کرتے رہیے کہ انجام بخیر ہو۔ آمین! نہ خود اپنے پر بار بنوں، نہ دوسروں پر، ثم آمین!

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

قومی زبان (۱۵) اپریل ۱۹۹۴ء

آہ مالک رام

جلیل قدوائی

فردا و دی کا تفرقہ اک بار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

(غالب)

۱۶ اپریل ۱۹۹۳ء، یوم جمعہ، میرے نہایت پیارے دوست مالک رام کا جن کا نصف صدی سے زائد عرصہ تک چمنستان غالب میں طوطی بولتا تھا، (۱) انتقال ہوگیا۔ اتنے ہی عرصہ پر محیط میری اُن کی دوستی تھی، اگرچہ ان کے بہت سے دوسرے دوستوں کے برخلاف، میرے اُن کے درمیان مراسلت دیر دیر سے ہوتی تھی جو سمجھیے نہ ہونے کے برابر تھی۔ سجاد انصاری کے قول کے مطابق وہ دوستی ہی کیا جو مخاطبت کی محتاج ہو۔ (۲) تاہم میرے پاس اُن کے خطوط مناسب تعداد میں ہونے چاہیے تھے۔ افسوس کہ میرے مزاج کے احتیاط کے باوجود میرے کئی عزیز اور قابلِ قدر اور محبوب دوستوں کے خطوط کی طرح اُن کے بھی بہت سے خطوط میری زندگی کے انتشار کے سبب تلف ہوگئے۔ ذیل کا خط کوئی ڈیڑھ سال پہلے کا لکھا ہوا میرے نام اُن کا آخری خط ہے:

(۱)

سی ۵۰۴، ڈیفنس کالونی
نئی دہلی ۱۱۰۰۲۴
یکم مئی ۱۹۹۲ء
مالک رام

بھائی جان۔ آپ کے خط سے جو مسرت ہوئی آپ اس کا اندازہ نہیں کرسکتے۔ دو دو عیدیں ہوگئیں۔ عید الفطر اور آپ کا گرامی نامہ۔

اس سے ۱۹۳۶ء۔ ۱۹۳۷ء کے درمیان کے وہ دن یاد آگئے جب میں نیا نیا مرکزی بیورو میں عارضی طور پر آیا تھا اور آپ سے ملاقات ہوئی۔ اللہ اللہ کیا دن تھے!

میری ولادت ۲۲ دسمبر ۱۹۰۶ء کی ہے۔ پچاسی پورے کرچکا، ۸۶ ویں سے بھی چار

مہینے اوپر گزر گئے۔ (۳) دعا کیجیے اللہ تعالیٰ اپنا فضل و کرم شامل حال رکھے اور جو دن باقی ہیں وہ بھی بخیر و عافیت سے گزر جائیں۔ نہ کسی اور پہ بار بنوں نہ اپنے آپ پر۔ آمین ثمہ آمین۔ اگر افسوس ہے تو اس کا کہ زادِ راہ بنانے میں ناکام رہا۔ اگر وہ حساب لیے بغیر بخش دے تو اُس سے کیا بعید ہے۔ لیکن اگر حساب کتاب کیا گیا تو خیر نہیں کیوں کہ دکھانے کے لیے کچھ ہے ہی نہیں۔ طالب دعا ہوں۔

بیگم صاحبہ آداب قبول فرمائیں۔

والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

کیا اُن کو اپنی مرگ ناگہاں کی پیشگی سُن گُن مل گئی تھی؟ اور کیا یہی قانون فطرت ہے کہ مرنے والے کو کچھ دن پہلے سے نوٹس دے دیا جاتا ہے، کیوں کہ کم و بیش یہی عالم آج کل راقم پر بھی گزر رہا ہے۔ میں نے جواب میں انھیں کچھ اس قسم کی تحریر ارسال کی کہ مجھ جیسے ہیچ میرز کے لیے آپ جیسے بالغ نظر، عالم و فاضل، دانا و بینا شخص کو یہ یاد دلانا۔

سورج کو چراغ ہے دکھانا

کی مثل ہوگا کہ علامہ سید سلیمان ندوی نے غالباً سیرت النبی ﷺ کی تیسری جلد میں لکھا ہے کہ خداوند تعالیٰ کا فضل و کرم ۳/۴ حصہ ہے اور قہر و غضب ۱/۴ حصہ۔ یوں بھی جس کسی کو توجہ اور تواتر سے کلام پاک کی تلاوت کرنے کی توفیق نصیب ہو وہ کم از کم اتنا ضرور دیکھے گا کہ جہاں جہاں خداوند تعالیٰ نے اپنے جلال اور قہر و غضب کا ذکر کیا ہے بیشتر اُس کے آس پاس یا کچھ آگے جا کر توبہ و استغفار وغیرہ کی شرط کے ساتھ گناہوں کی معافی کا بھی اظہار کیا ہے اور بعض بعض جگہ تو ایسے انداز لطف و کرم کے ساتھ کہ پڑھنے والے کی روح وجد کرنے لگتی ہے۔ اسی طرح بہت سی متفق علیہ احادیث موجود ہیں مثلاً حضور ﷺ نے فرمایا "سزاؤں کو دفع کرو جہاں تک بھی اُن کو دفع کرنے کی گنجائش پاؤ۔" (۴) مسلمانوں سے سزاؤں کو دور رکھو جہاں تک بھی ممکن ہو اگر کسی ملزم کے لیے سزا سے بچنے کا کوئی راستہ نکلتا ہے تو اسے چھوڑ دو، کیوں کہ حاکم کا معافی میں غلطی کر جانا اس سے بہتر ہے کہ وہ سزا دینے میں غلطی کر جائے۔" (۵) ظاہر ہے کہ جس طرح خداوند تعالیٰ نے حضور ﷺ پر وحی جلی کے ذریعے قرآن پاک نازل فرمایا اسی طرح حضور ﷺ پر وحی خفی کے ذریعے ہی اس رحمت و شفقت کی تلقین فرمائی ورنہ حضور صلعم تو یہ سب کچھ خود اپنی طرف سے تو نہیں فرماتے تھے۔ تو اس سے خداوند تعالیٰ کی صفت عفو و کرم کے بارے میں کیا رائے قائم ہوتی ہے؟ پھر بندے کو خداوند تعالیٰ کی خوشنودی اور غفاری حاصل کرنے میں تاخیر یا تامل کیوں ہو؟

مگر آپ کے معاملے میں مشکل یہ ہے کہ بقول استاد داغ:

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

یعنی آپ کے بارے میں اب تک یہی پتہ نہ چلا کہ:

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب
آخر تو کیا ہے؟ اے نہیں ہے!

میں نے اپنے دل میں سوچ لیا تھا جو سوچ لیا تھا (۶) مگر اتنی طویل ملاقات اور دوستی کے باوجود بقول حضرت اکبر الہ آبادی آپ سے بھی:-

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں
فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

مگر اب کہ آپ نے از خود یہ ذکر چھیڑا ہے تو مجھے بھی حوصلہ ہوا، لسان الہند حضرت عزیز لکھنوی کے اس شعر کے مطابق:-

تم نے چھیڑا تو کچھ کھلے ہم بھی
بات، پر بات یاد آتی ہے

کہ آپ سے پوچھوں کہ کیا میرا وہ خیال جس کی طرف چند ' اور پہلے میں نے اشارہ کیا وہ غلط تھا۔ میں اس لیے اور بھی شبہ میں پڑ گیا کہ اپنے خط میں آپ نے لکھا ہے کہ "اگر حساب کتاب لیا گیا۔" اب یہ اگر مگر چھوڑ کر اپنے آئندہ خط میں براہ کرم اس مسئلہ پر صاف صاف لکھیے تاکہ بات آگے بڑھے۔

میں یہ سب کچھ لکھنے کے بعد اُن کے جواب کا منتظر تھا کہ اچانک اُن کی سناؤنی ملی! اور افسوس کہ بات جہاں تھی وہیں رہ گئی۔ میں اپنی آنکھوں کی خرابی کے باعث اخبارات پڑھنا بند کر چکا ہوں۔ ہندوستانی اخبارات یوں بھی اپنی گوشہ نشینی کی وجہ سے ہاتھ نہیں لگتے۔ ہندوستان کے دوستوں نے بھی اُن کے مرنے کی تو خبر لکھی اور افسوس ظاہر کیا مگر اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ لکھا، حتیٰ کہ پروفیسر مختار الدین احمد آرزو نے بھی یہی کچھ لکھا جو اوپر مذکور ہوا، ہاں مجھے یہ توجہ دلائی کہ اس سانحہ پر کچھ لکھوں۔ صرف کراچی کے ماہنامہ "سب رس" نے لکھا کہ "دہلی میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے"۔ مگر "ڈان" نے لکھا کہ ان کا کریا کرم ہوا۔ غرض کہ خود ان کی زبان یا تحریر سے اس مسئلے پر روشنی نہ پڑی جو میں چاہتا تھا۔

میں علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے ملازمت ترک کرنے کے بعد حکومت ہند کے پبلک انفارمیشن بیورو میں بہ مقام شملہ جو حکومت مذکور کا گرمائی مستقر تھا (۷) یکم مئی ۱۹۳۶ء کو دیسی زبانوں کے انچارج جرنلسٹ کی حیثیت سے شامل ہوا تھا۔ مجھے صحافت کا کوئی خاص تجربہ نہ تھا مگر بیورو کے ڈپٹی ڈائریکٹر خان بہادر سید نجم الدین احمد جعفری (عزیزی اور اب مجی ایس ایس جعفری کے والد ماجد) میری اس وقت کی ادبی و شعری حیثیت و شہرت سے بہت متاثر تھے۔ (۸) اور میری سرکاری ملازمت کے لیے مقررہ عمر زائد ہوجانے کے باوجود مجھے حکومت نے عمر کی پابندی سے مستثنیٰ کرا کے بیورو میں لانے میں کامیاب ہوگئے۔ (۹) پہلے اس شعبہ میں صرف اردو اور ہندی میں کام ہوتا تھا مگر دوسری عالم گیر جنگ کے دوران اردو کے ساتھ ایرانی اور عربی کا کام بھی شامل کر کے ایک انفارمیشن افسر اور ایک اسسٹنٹ انفارمیشن افسر کے تحت کر دیا گیا۔

اردو اور مشرقی زبانوں کی اہمیت کا اندازہ انگریزی حکومت میں لگائیے کہ اس میں گزیٹیڈ افسر شامل کیے گئے اور ہندی نیز بنگالی، تامل اور گجراتی زبانوں میں مزید کام ایک ایک اسسٹنٹ انفارمیشن کے تحت کیا گیا بہرحال کام بڑھنے سے عملہ بڑھا اور ملازمت کے مواقع بھی۔

سالک رام سے میری ملاقات میرے تقرر کے کچھ دن بعد ہی ہو گئی تھی۔ وہ صحافت میں خاصا تجربہ رکھتے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں کے نیاز مند اور مولانا سالک، خصوصاً مہر صاحب کے حاشیہ نشین تھے۔ اردو کے علاوہ فارسی، بالخصوص عربی ادب، کلام پاک نیز احادیث، اسلام اور اسلامی تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی۔ ان سب سے زیادہ یہ کہ تحقیق سے دلچسپی تھی۔ اس وقت وہ ذریعۂ معاش کی طرف سے کچھ غیر مطمئن تھے اور غالباً انفارمیشن بیورو میں ان کی آمد اپنے اسی مسئلے کے حل کے سلسلے میں تھی۔

اس کے باوجود ہمہ وقت خوش باش، چنچل، حاضر جواب، حوصلہ مند اور پُر اعتماد نظر آتے تھے۔ اور ہر ایک سے برابر کی سطح پر ملتے تھے۔ عینک لگاتے اور مسلمانوں کا لباس یعنی شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ پہنتے تھے۔ اُن کے سر پر بالوں کی کم و بیش اسی وضع کی ٹوپی ہوتی جو بعد میں تھوڑی سی ترمیم کے بعد جناح کیپ کہلائی۔ "قومی زبان" کے جولائی ۱۹۹۳ء کی اشاعت کے سرورق پر ان کی جو تصویر شائع ہوئی ہے اس میں متذکرہ ٹوپی سر پر ہو تو لباس اور عام پوشش کے اعتبار سے عموماً رہی۔ اُن کی ساری عمر کی وضع کہی جاسکتی ہے۔

یہ خبر عام تھی کہ وہ سر محمد ظفر اللہ خاں (اس زمانے کے وائسرائے کی کونسل کے ممبر محکمۂ تجارت) کے بڑے چہیتے ہیں اور ان کی اسلامی تقاریر کے لیے پس منظری مواد فراہم کرتے ہیں۔ سر ظفر اللہ خاں سے قریبی روابط ہی کے نام پر اکادکا لوگ یہ کہتے بھی سُنے جاتے تھے کہ وہ مسلمان ہو چکے ہیں۔ مگر مصلحتاً اعلان نہیں کرتے۔ (اس وقت تک متحدہ ہندوستان میں کم از کم پنجاب سے باہر احمدی یا قادیانی اصحاب کو شدت کے ساتھ خارج از اسلام نہیں قرار دیا گیا یا سمجھا جاتا تھا)

کچھ عرصے کے لیے وہ عارضی طور پر ہمارے محکمہ میں لے لیے گئے تھے اور آہستہ آہستہ مجھ سے بہت قریب اور بے تکلف ہو گئے۔ موسم سرما میں نئی دہلی میں فاصلوں کی وجہ سے کم نم مگر گرمی میں چھوٹی جگہ ہونے کے سبب شملہ میں وہ ملاقات کے لیے غریب خانے پر بھی آنے لگے۔ صحت قائم رکھنے کی وجہ سے پہاڑ پر پیدل چلنا ضروری ہوتا ہے۔ میدان میں عموماً سواری کی مشکلات بھی ملنے ملانے میں مانع رہتی ہیں مگر پہاڑی پر سواری کی پابندی سے آزاد ہو کر زیادہ سے زیادہ فاصلہ بھی پیدل چل کر ہنسی خوشی طے کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ہم دونوں ایک دوسرے سے جلد ہی کم و بیش مثلیٰ بالطبع ہو گئے۔

جہاں تک یاد آتا ہے وہ سول سیکرٹریٹ اور آرمی ہیڈ کوارٹر میں واقع مال روڈ کے درمیانی حصّہ کے ایک سمت بہت ہی نشیبی علاقہ میں رہتے تھے جو شاید انّنڈیل کہلاتا تھا۔ وہاں وسیع کشادہ سبزہ زار تھا اور شملہ کا ایک مشہور کلب تھا جس پر کرکٹ اور ہاکی کے میچ ہوا کرتے تھے۔ بڑی گہما گہمی رہتی تھی اور چھٹی کے دن تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہاں سارا شملہ جمع ہو گیا ہو۔ میں ان سے چار چھ میل دور بلوبیلنڈز میں رہتا تھا جو پہاڑ پر کوئی فاصلہ نہ سمجھا جاتا۔ ہاں انھیں نشیب سے آنے میں چڑھائی بہت طے کرنی پڑتی کیوں کہ میری قیام گاہ ذرا بلندی پر تھی شملہ میں لوگ چھٹی کا دن بادلوں یا بارش کے علی الرغم اپنی اپنی برساتیوں اور ربر کے جوتوں میں اور چھاتے لے کر یا تو لمبے فاصلوں کو پیدل طے کرتے ہوئے سیر و تفریح کے لیے نکل جاتے یا دن بھر کے لیے دوستوں سے ملنے ملانے ایک دوسرے کے گھر چلے جاتے۔ ان لوگوں کو اس طرح طولانی بات چیت، چہل پہل اور بشرط ضرورت سنجیدہ گفتاری کے اور تبادلۂ خیال کے لیے خوب وقت مل جاتا تھا۔

غالب سے مالک کو اسی زمانے سے عشق تھا۔ ادھر میرے اسکول کے زمانے میں میرے اردو کے استاد مولوی منظور احمد نے جن کا تذکرہ اپنی "حیات مستعار" کی پہلی جلد میں کر چکا ہوں مجھے اعلیٰ اردو شعر و ادب کا چسکا لگا دیا تھا۔ حتیٰ کہ میں نے ایس ایل سی (میٹرک) کا امتحان اردو میں امتیاز کے ساتھ پاس کیا تھا۔ "نسخۂ حمیدیہ" ابھی شائع نہیں ہوا تھا، ہاں بجنوری کا مقالہ شائع ہو چکا تھا اور "یادگار غالب" بھی دیکھ چکا تھا۔ بی اے تک پہنچتے پہنچتے میں نے نہ صرف اپنی ایک بیاض کی ابتدا غالب کے اپنے کے

ہونے انتخاب سے کی تھی بلکہ غالب کے ایک سستے ایڈیشن میں اس کا بعض غیر مطبوعہ کلام جو ان دنوں رسالوں میں اِدھر اُدھر نظر سے گزرتا تھا اور اس کے ادق اشعار کے معنی پرچوں پر نقل کر کے چپکاتا تھا۔ ایک ملاقات کے دوران مالک رام نے یہ دستاویزات میرے پاس دیکھیں تو بے حد خوش ہوئے اور یہ مصرع پڑھا

خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو!

جس بیاض کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے اس قسم کی میں نے بعد میں کئی بیاضیں تیار کیں جن کا ذکر کرتا رہتا ہوں۔ غالب کے سلسلے میں جس بیاض کا میں نے ذکر کیا اس کے اندرونی سرورق کی شکل یوں تھی:۔

۷۸۶

(انتخابِ غالب)

سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ ہوں جو یا جواہر کے
جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو

(غالب)

"ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں: وید مقدس اور دیوانِ غالب۔"

"جس طرح نبوت بطنِ مادر سے شروع ہوتی ہے، عشق بھی عہدِ طفلی سے آغاز ہوتا ہے۔"

"شاعری انکشافِ حیات ہے۔ جس طرح زندگی اپنی نمود میں محدود نہیں، شاعری بھی اپنے اظہار میں لاتعین ہے۔"

(ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم)

"تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر
بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم"

(اقبال)

مالک رام نے دیکھا تو لوٹ پوٹ ہوگئے میں احباب کو یقین دلاتا ہوں کہ اپنے اس بیان سے مجھے کوئی ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا میں نے غلط کہا کہ "احباب کو یقین دلاتا ہوں" اس لیے کہ میرے احباب بہت کم ہیں اور وہ "احباب" اس لیے ہیں کہ میرے مزاج سے اچھی طرح واقف ہیں۔ مجھے "ناظرین" یا "اصحاب" لکھنا چاہیے تھا۔ مگر کیا کیا جائے۔ یہ واقعہ یوں ہی پیش آیا تھا۔ اور میں خود یہ بھی عرض کر دوں کہ میرا وہ انتخاب کچھ ایسا قابلِ ذکر نہیں تھا۔ اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب میں نے سالہا سال بعد "انتخاب غالب" "نسخۂ قدوائی" کراچی میں سید ہاشمی فرید آبادی مرحوم کے مشورے سے ۱۹۶۰ء میں بابائے اردو کی نود سالہ جوبلی کے موقع پر شائع کیا۔ یہ انتخاب دوسرا تھا اور اس میں خاصی سرگرمی اور کوشش شامل تھی۔ مالک رام کا تو یہ حال تھا کہ غالب کے ہر ذکر پر بغیر

قومی زبان (۲۰) اپریل ۱۹۹۴ء

معمولی جوش میں آجاتے تھے، بقول اصغر:-

نام ان کا آگیا کہیں ہنگام باز پرس

ہم تھے کہ اڑ گئے صف محشر لیے ہوئے

ایک بار کہا "قدوائی صاحب زندگی ہے تو کبھی آگرہ کی سرزمین پر فقیروں کا بھی پھیرا ہوگا (۱۰) اور غالب کی قیام گاہ اور اس کے نواح اور عمارتوں اور کھنڈروں اور وہاں کی خاک اور ذرہ ذرہ سے غالب اور ان کی زندگی اور زمانے کے حالات و واقعات جمع کر کے شائع کروں گا، ایسے جیسے اب تک کسی اور نے نہیں شائع کیے ہوں گے۔ یہ یا اسی قسم کے الفاظ تھے اور خدا کی شان کہ اپنا یہ قول بالآخر جیسا کہ ہم سب کو معلوم ہے سچ کر دکھایا نیز غالب ہی نہیں اس کے سینکڑوں شاگردوں کو بھی زندہ جاوید بنا دیا۔

بیورو کی ملازمت میں وہ غالباً چند ہی ماہ رہے پھر سنا کہ وہ اسکندریہ جانے والے ہیں۔ میں نے اس واقعہ کی تحقیق نہیں کی۔ نہ یہ معلوم ہوا کہ غالب کے سلسلے میں وہ کیا کر رہے ہیں مگر غالباً شملہ ہی میں یہ خبر گرم ہوئی کہ ظفر اللہ خاں صاحب کے پاس اسکندریہ سے ہندوستان کے ٹریڈ کمشنر کی طرف سے ایک ایسے مسلمان کی مانگ آئی ہے جو نہ صرف عربی لکھنے اور بولنے میں اہل اسکندریہ سے ٹکر لے سکے بلکہ اسلام، اسلامی تاریخ اور عربی ادب کا بلند مذاق بھی رکھتا ہو۔ پھر معلوم ہوا کہ ظفر اللہ خان صاحب نے ٹریڈ کمشنر کو جواب میں لکھا کہ یہاں ایسا کوئی مسلمان نہیں مل سکتا اس لیے میں ایک ہندو مالک رام کو مقرر کر کے بھیج رہا ہوں۔ جو سینکڑوں مسلمانوں پر بھاری ہے۔ چنانچہ یہ مصر چل دیے اور ہم سب سے ملے بغیر نکل گئے بہت عرصہ کے بعد وہاں سے خط بھی کہ روانگی فوری ہوئی اس لیے سب سے ملاقات نہ کر سکا۔ بعد کے خطوط میں اپنے علمی منصوبے کی ابتداء، اس کی ترقی کی رفتار، حتیٰ کہ "ذکر غالب" پھر اس کے دوسرے ایڈیشن کے بارے میں بھی کبھی لکھتے رہے۔

سالہا سال بعد یعنی ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کے بعد بلا کسی پیشگی اطلاع کے ایک شام کراچی میں میرے گھر کے دروازے پر ایک دستک ہوئی۔ باہر نکلا تو کیا آپ یقین کریں گے؟ میں نے دیکھا تو میرے پرانے یار، وفادار مجھے اور میری یاد کو اسی طرح اپنے دل میں بسائے مالک رام اپنی بالوں والی مسلمانوں کی ٹوپی سر پر اوڑھے شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ میں ملبوس کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی اپنے پرانے جوش کے ساتھ داہنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے السلام علیکم اور بغل گیر ہو گئے۔ میں ان دنوں جیکب لائن میں رہتا تھا اور انھیں میرا پتہ معلوم تھا۔ وہ ہندوستان جا رہے تھے اور ان کا جہاز کراچی کی بندرگاہ پر مقیم ہوا تھا۔ کہنے لگے یہ کیسے ممکن تھا کہ آپ کو جوے بغیر چلا جاتا۔ کیا بتاؤں اس وقت دونوں کے دلوں کا کیا حال تھا۔ استاد ذوق کا شعر یاد آ رہا تھا بلکہ کئی بار پڑھا گیا اور کس جوش بلکہ ایک پاگل پن سے:-

اے ذوق کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا

بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

ملاقات اتنی بے توقع اور اچانک تھی کہ اس کے دھچکے سے ہمیں شادی مرگ ہو جاتی تو بعید نہ تھا مگر خدا کا شکر ہے کہ یہ کوئی سانحہ یا واقعہ پیش نہیں آیا۔ میرے ہم سایہ میں کٹرک ہال تھا وہاں کوئی مشاعرہ منعقد ہونے والا تھا اور میں اس میں شریک ہونے کے لیے جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ پھر بھی ہم دونوں کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے ساتھ بیٹھے۔ میں نے انھیں مشاعرے میں چلنے کی ترغیب دی مگر انھوں نے اپنی مصروفیت اور مجبوری کا ذکر کیا کچھ خطرات بھی تھے۔ آخر بادل ناخواستہ میں نے انھیں رخصت کیا۔ وہ عالم آج تک نظروں میں ہے کہ دل ایک دوسرے کو چھوڑنے پر تیار نہیں تھے مگر بقول حسرت:-

دو ملے اور ملے پھر آتا ہے جدا ہوتے ہیں

چلتے وقت میں نے انھیں اپنا دوسرا مجموعہ کلام "نوائے سینہ تاب" نذر کیا جو انھیں دنوں پریس سے آیا تھا۔ انھوں نے اسے چوم کر وصول کیا۔

مجھے اسکندریہ میں اور ہندوستان سے باہر اُن کے سرکاری انتظامی کاموں کے متعلق کچھ نہیں معلوم وہ ان معاملات پر کچھ لکھنے سے ہمیشہ گریز کرتے تھے۔ مگر خود یہ واقعہ کہ ابتداً وہ ایک اوسط درجہ کی اسامی قبول کر کے اپنے ملک سے باہر گئے اور اتنی ترقی کی کہ اپنے دفتر کے سپرنٹنڈنٹ ہوئے، پھر آہستہ آہستہ اسسٹنٹ ٹریڈ کمشنر مقرر ہوگئے۔ اور ہندوستان واپس آکر ڈپٹی سیکریٹری اور جوائنٹ سیکریٹری کے اعلیٰ عہدوں پر رہ کر سرکاری ملازمت سے نیک نامی کے ساتھ ریٹائرڈ ہوئے خود اپنے اندر کتنے اور کیسے کچھ معنی نہیں رکھتا ہے۔

مگر اس سے بھی زیادہ اور علمی اعتبار سے بڑے معنی رکھتی ہیں ان کی وہ سرگرمیاں جو وہ اپنی قابل قدر انتظامی صلاحیتوں سے بہتر سے بہتر کام لینے کے علاوہ غالب سے اپنے ابتدائی عہد کی تکمیل کے سلسلے میں مسلسل اور پوری توجہ سے جاری رکھ سکے اسی کے ساتھ انھوں نے علم و ادب اور تحقیق کے شعبوں میں نئے نئے اضافے کر کے اور فارسی اور عربی کی دنیا میں اپنے لیے بقائے دوام حاصل کرلی۔

حقیقت یہ ہے کہ ان کارناموں کی فہرست اتنی طویل ہے کہ پوری طرح شمار میں نہیں آسکتی۔ صرف غالب پر کسی ایک تنہا اہلِ قلم نے اتنا کام نہیں کیا۔ "ذکر غالب" (چار ایڈیشن ہر بار زیادہ سے زیادہ پرازمعلومات) "تلامذۂ غالب"، "گفتار غالب"، "فسانہ غالب" تصنیف کرنے کے علاوہ انھوں نے "دیوان غالب" کا اپنا ایڈیشن نکالا۔ "سبد چین" کو مرتب کیا اور غالب کے معتقدین، ممدوحین اور رفقا پر کام کیا وغیرہ۔ ڈاکٹر عابد حسین نے "ذکر غالب کے چوتھے ایڈیشن میں اس کتاب پر یہ فیصلہ غلط نہیں دیا ہے کہ فارسی اور اردو کے اس عظیم شاعر پر آج تک جو کچھ لکھا گیا اس کی پوری روح اس میں سمٹ آئی ہے۔

ان کے دوسرے کاموں میں مولانا ابوالکلام آزاد جیسے جیّد عالم ترجمان القرآن کے علاوہ اُن کا "تذکرۂ معاصرین"، خطبات، خطوط، غبار خاطر وغیرہ کی ترتیب شامل ہے۔ خود اُن کی اپنی معرکتہ الآرا تصانیف "عورت اور اسلامی معاشرہ" اور اسلامی مضامین پر ان کا مجموعہ "اسلامیات" ان کے علاوہ ہیں، تذکرہ نویسی ہمارے قدیم شعرا کا دلچسپ مشغلہ تھا جس کی بنیاد پر ہمارے ادب کی ابتدائی تاریخ نویسی شروع ہوئی۔ مالک رام نے عرصہ کے بعد اُسے دوبارہ رواج دیا خصوصاً معاصر ادبا و شعرا کے حالات "تذکرۂ معاصرین" کے نام سے لکھے غالباً چار جلدیں اس کی بھی شائع کیں مگر افسوس کہ اُن کی موت نے اس کام کا سلسلہ مسدود کردیا۔ انھوں نے زندہ مصنفین اور اہلِ قلم کی خدمات کے اعتراف میں علمی مجلدات پیش کرنے کی جو روایت قائم کی اُس سے ان کی عالی حوصلگی اور دل کشادگی پر روشنی پڑتی ہے! کیا کسی کو یقین آسکتا ہے کہ ایک انسان جسے ایک ہی زندگی ملتی ہے اور اس کا بھی زیادہ تر حصّہ روز مرّہ کے سستے، اوچھے معمولات یعنی خرافات میں صرف ہوجاتا ہے اتنا بڑا سرمایہ علم و ادب اپنے پیچھے چھوڑ سکتا ہے؟ مالک رام کے لیے ایسے کارنامے غالباً پچاس ہیں۔ غیر مرتب مطبوعہ مضامین اور نامکمل مسوّدات خدا جانے کتنے چھوڑے ہوں گے۔ مولانا شبلی نے حسرت کو اُن کی مختلف النوع مصروفیتوں کو دیکھ کر جس میں شعر و ادب اور سیاست و ادارت کے علاوہ کھدّر بھنڈار کو پھیلانے کا کام بھی شامل تھا کہا تھا۔ "تم آدمی ہو یا جن؟" مجھے یقین ہے کہ تجارت اور سفارت جیسے ذمہ دارانہ فرائض کے ساتھ مولانا شبلی نے مالک رام کو ان کے علمی کارناموں کے پہاڑ جیسے انبار کو دیکھا ہوتا تو انھیں دیو کہا ہوتا، اگر مہا دیو نہیں!

اب میں اپنے عزیز دوست کی اس داستان کو جس میں کچھ رام کہانی بھی شامل ہے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ختم کرتا ہوں اس شعر پر جو شاید انیس یا مرزا ثاقب قزلباش نے کسی ایسے ہی موقع کے لیے کہا تھا:

وہ ایک مشتِ پر کی اسیری سہی مگر
خاموش ہو گیا تھا چمن بولتا ہوا!

ہمارے ہاں کسی بلند مقام، جیّد عالم و فاضل شخصیت کے دنیا سے اٹھ جانے پر "موت العالم موت العالَم" کہنا عام ہے مگر اتفاق سے میری زبان پر یہ شعر آگیا جسے بہتر سمجھتا ہوں۔ پہلے مصرعے میں شاید حافظے نے کچھ غلطی کی ہو۔ اپنے دوست کو جو تھوڑے بہت کچھ اور خط فوری طور پر جمع ہوسکے وہ بھی پیش کرتا ہوں۔

حواشی

(۱)

خوب طوطی بولتا ہے اِن دنوں صیّاد کا

(غالباً استاد ذوق)

(۲) کہیں لکھ چکا ہوں کہ یہ فقرہ سجاد انصاری نے خواجہ منظور حسین کو ایک بار لکھا تھا۔ مؤخرالذکر نے وہ خط مجھے دکھایا تھا۔
(۳) یہ موصوف کے سجّے ہیں۔ میں عربی اور ہندی یا فارسی حروف میں جمع نہیں کرتا جیسے کہ ہر لفظ میں ہیں، گ اور ذ۔
(۴،۵) علی الترتیب ابن ماجہ و ترمذی، بحوالہ "تفہیم القرآن" از مولانا مودودی، جلد سوم
(۶) اسی قسم کی بات مگر ذرا کھل کر اپنے اور مالک رام کے شملہ میں قیام کے زمانے کی ایک خبر کے طور پر میں نے اس مضمون میں آگے چل کے لکھی ہے۔ حسن اتفاق کہوں یا سوئے اتفاق کہ بعد میں مجلدہ "نذر مختار" مرتبہ مالک میں علی جواد زیدی صاحب کے مضمون "مالک بہ نام مختار" میں ایک خط کا یہ اقتباس پڑھا۔ دسمبر کے اواخر میں اسلامی مذاکرات کی بین الاقوامی کانفرنس لاہور میں ہونے والی ہے۔ اس کے لیے مجھے (مالک رام) کو بھی دعوت موصول ہوئی ہے۔ خدا معلوم کیوں؟ دنیا میں کیسی کیسی غلط فہمیاں پھیل جاتی ہیں، (۱۱/۹/۱۹۵۷ء) سوچ میں پڑگیا۔
(۷) کچھ آگے چل کر ایک چھوٹا شملہ بھی تھا جو حکومت پنجاب کا گرمائی مستقر تھا۔
(۸) اس سے کوئی دس گیارہ برس پہلے ۱۹۲۵ میں جب میں بی اے۔ سال اوّل کا طالب علم تھا رام بابو سکسینہ اپنی ASHORT-HISTORY OF URDU LANGUAGES میں میرا ذکر رشید صدیقی نیاز فتح پوری، احسن مارہروی وغیرہ کے ساتھ کر چکے تھے۔ نیز انھوں نے بریلی سے جہاں وہ ڈپٹی کلکٹر تھے اپنی کتاب مجھے بندہ کی درخواست کے ساتھ جس میں مجھے A DISCERNINGCRITIC کہا گیا تھا بھیجی تھی۔ اور اب تو میں اپنی مادر علمی میں لیکچرر تھا۔ واضح ہو کہ ایک ہی انتخابی کمیٹی نے رشید صاحب کو ریڈر اور مجھے لیکچرر مقرر کیا تھا، بلکہ کمیٹی نے خود انتخاب کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور سارا معاملہ علامہ اقبال اور سید سلیمان ندوی صرف دو خارجی ممبروں پر منحصر کر دیا تھا۔
(۹) برسبیل تذکرہ یہ معلوم کرنا ناظرین کی دل چسپی کا موجب ہوگا کہ حکومت ہند کی سی آئی ڈی کے ڈپٹی ڈائریکٹر، آپ یقین کریں یا نہ کریں، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے حقیقی برادر خسرو خاں بہادر مظہر تھے جو بیشتر اہم امور میں وائسرائے کے براہ راست مشیر اور سفر میں تو ہمیشہ پا بہ رکاب رہتے تھے، اُن کا محکمہ نچلے عملے کی زبان میں چوری ٹھگی کا دفتر کہا جاتا تھا، ان ہر دو خان بہادروں کا مرکزی سکریٹریٹ میں بڑا شہرہ تھا اور انھیں ہر قسم کی مشکل سے مشکل گتھیوں کے سلجھانے کا خاص طور پر ایسے مسلمان اُمیدواروں کو اوسط درجہ کی ملازمتوں پر کام سے لگانے میں بڑی مہارت تھی جن کا تقرر بہ ظاہر بہت دشوار نظر آتا تھا۔

(۱۰)

کعبہ سنتے ہیں کہ گھر ہے بڑے داتا کا ریاضؔ
زندگی ہے تو فقیروں کا بھی پھیرا ہوگا!

(۲)

پوسٹ بکس ۲۸۷-اسکندریہ (مصر)

۲۹/ جون ۱۹۴۷ء

حضرۃ الاخ المعظم والمکرم دام ظلکم العالی- السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ

آپ کا ۱۸ مئی کا گرامی نامہ بہت دن سے مل چکا ہے- لیکن کچھ منصبی معروفیتوں اور کچھ خانگی پریشانیاں جواب دینے میں مانع ہوئیں- چاروں چھوٹے بچے کالی کھانسی سے بیمار رہے بلکہ ابھی تک بیمار ہیں- دعا فرمائیں کہ شافی مطلق انھیں صحت عاجلہ و کاملہ ارزانی فرمائے- آمین-

باور فرمائیے آپ سے ملاقات نہ ہوسکنے (۱) کا مجھے خود بہت افسوس ہے لیکن حالات کچھ ایسے تھے کہ میں کچھ نہ کرسکا ورنہ اتنی مدت کے بعد ہندوستان جا کے آپ سے ملاقات کئے بغیر واپس چلا آنا میرے تصوّر میں بھی نہیں آسکتا- اب خدا معلوم کب واپسی ہو- ہندوستان کے حالات کچھ ایسی سرعت سے بدل رہے ہیں کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کیا ہونے والا ہے- غالباً آپ کو معلوم ہے کہ میری موجودہ ملازمت تاحال عارضی ہے- اس لیے خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ مستقبل میں کیا ہونے والا ہے- "فکرِ ما، در کارِ ما آزارِ ما" کے اصول پر عمل پیرا ہوں اور اپنے آپ کو زیادہ پریشان نہیں کرتا کہ اس سے کوئی فائدہ تو ہو ہی نہیں سکتا- پھر جان کو روگ لگانے سے کیا حاصل-

لاہور کے فسادات کی خبریں متواتر ریڈیو پر سنائی دے رہی ہیں خدا سب کو ہدایت دے ....

یہ پڑھ کر بہت افسوس ہوا کہ آپ اپنی ادبی سرگرمیاں برقرار نہیں رکھ سکے- اگر میں یہ کہوں تو کسی حد تک معذور بھی ہوں کیوں کہ ماحول ہی دوسرا ہے- یہاں اردو فارسی کی کتابیں تک مہیا نہیں ہوسکتیں- لیکن آپ تو نسبتاً سازگار فضا میں رہتے ہیں- آپ کو تو ایسا کچھ کرنا چاہیے کہ تھوڑا بہت لکھتے رہیں (۲) میری تالیف ذکرِ غالب کا دوسرا ایڈیشن تیار ہے میں اس کی کتابت احمد حسن صاحب (۳) کے ذمہ کر آیا تھا اور ان کے آخری خط سے معلوم ہوتا تھا کہ پہلی کاپیاں لکھی جاچکی ہیں- اس کے بعد ایک مہینے سے زیادہ ہوگیا ان کا خط تک نہیں ملا اور مجھے فساد کی وجہ سے تشویش سی ہورہی ہے- خدا اپنا رحم فرمائے-

اس کے علاوہ غالب سے متعلق متفرق مضامین جمع کر کے شائع کرنے کا ارادہ ہے ذکرِ غالب کا پہلا ایڈیشن سو صفحے پر چھپا تھا دوسرے ایڈیشن میں بہت کچھ اضافہ ہوا ہے ایک باب کامل نیا لکھا گیا ہے- اور اب ضخامت دو سو صفحے کے لگ بھگ ہوچکی ہے- مضامین کا مجموعہ ڈھائی سو صفحے پر مشتمل ہوگا- اور بس

خدا کا شکر ہے کہ آپ نے یہ خوش خبری سنائی کہ آپ دوسرا نکاح کر چکے ہیں اور

اس سے ہر طرح مطمئن ہیں۔ ایک اچھی اور دل پسند بیوی دنیا کی بہترین نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت ہے۔ میری طرف سے مخلصانہ ہدیہ مبارکباد قبول فرمائیں اور میری دلی دعا ہے کہ خدائے پاک و برتر آپ دونوں کو اپنی اولاد کے سر پر تادیر سلامت رکھے تاکہ انھیں اپنے ہاتھوں پروان چڑھتا دیکھ سکیں۔ ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد۔

کیا میں آپ کو لکھ چکا ہوں کہ بفضلہ تعالیٰ میرے پانچ بچے ہیں تین لڑکیاں اور دو لڑکے، لڑکیاں تینوں بڑی ہیں اوشا، ارونا اور بشریٰ، لڑکے آفتاب اور سلمان تینوں چھوٹے بچے یہاں کی پیدائش ہیں۔ اس لیے ان کے نام بھی فارسی عربی ہیں۔ دعا فرمائیں کہ خدائے کریم انھیں اپنی حفظ و امان میں رکھے اور اپنی ہدایت کی راہوں پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

اپنے گھر میں سلام عرض کر دیں اور بچوں کو دعا و پیار۔

مطلع فرمائیں کہ آپ کے پاس اردو شاعروں کے کون کون سے تذکرے موجود ہیں۔ بلکہ آخری دور کے فارسی شاعروں کا کوئی تذکرہ ہو تو اسے بھی شاملِ فہرست کر لیں۔

خاکسار

مالک رام

حواشی

(۱) یہ عدم ملاقات کا افسوس تقسیم ہند سے پہلے کا ہے۔ میرے مضمون میں ہماری کراچی میں جس ملاقات کی خوشی کا ذکر ہے وہ قیام پاکستان کے بعد کی تھی ۱۹۵۲ء میں یہ افسوس مصر میں سرکاری ملازمت قبول کر کے مجھ سے ملے بغیر وہاں چلے جانے کا بھی نہیں ہے

(۲) میں نے علی گڑھ میں لیکچررشپ ختم کر کے حکومت ہند میں شرکت کے بعد پندرہ برس شعر و ادب سے ازخود کنارہ کشی کی قسم کھائی تھی۔ دہاں کچھ دل گرفتگی کے حالات پیدا ہو گئے تھے۔ بعد میں یہ قسم ٹوٹ گئی۔ ان حالات کا شاید کہیں ذکر بھی کر چکا ہوں۔ ادب کی طرف اپنی واپسی میں مشفق خواجہ کا بڑا ہاتھ ہے جس کے لیے اُن کا شکر گزار رہتا ہوں۔

(۳) ہم دونوں کے ایک مخلص دوست قدیم تذکرہ نویسوں کی زبان میں "معلوم نیست کہ فی الحال کجاست!"

(۳)

پوسٹ بکس ۲۸۷۔ اسکندریہ

۱۶ جولائی ۱۹۵۲ء

جلیل بھائی! چار پانچ مہینے بہت ہی مصیبت میں گزرے۔ اب طویل داستان لکھ کے آپ کی طبیعت کو منغض نہیں کرنا چاہتا یوں سمجھیے کہ بالکل خلاف توقع چھٹی کو منقطع کر کے مارچ کے وسط میں واپس آنا پڑا۔ بڑی لڑکی جسے یہاں چھوڑ گیا تھا سخت بیمار ہو گئی۔ تار ملنے پر ہم واپس آ گئے۔ الحمد للہ کہ اب وہ پہلے سے بہت اچھی ہے۔ آپ بھی دعا فرماتے

رہیے گا کہ حضرت شافی مطلق اس کا حافظ و نگہبان ہو اور اسے صحت عاجلہ و کاملہ عطا فرمائے۔ آمین

"نوائے سینہ(۱) تاب" کا جو نسخہ آپ نے عطا فرمایا تھا۔ وہ میں بمبئی میں چھوڑ آیا۔ پڑھا اور اس سے لذت اندوز ہوا۔ اللھم زدفزد۔ میں نے صدر یار جنگ کی طرح ایک مضمون سائل دہلوی پر لکھا ہے۔ بمبئی کے پرچے نوائے ادب میں چھپ رہا ہے۔ کیا آپ کے وہاں یہ پرچہ آتا ہے۔ اسی پرچہ کی آخری اشاعت میں میرا مضمون غالب کے استاد عبد الصمد سے متعلق شائع ہوا ہے۔

اپنی علمی و ادبی سرگرمیوں سے متعلق کبھی کبھی لکھتے رہیے گا۔ جناب بیگم صاحبہ کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہوں۔

بچوں کو پیار اور دیدہ بوسی۔ والسلام والاکرام۔

خاکسار

مالک رام

حواشی

(۱) میرے اس دوسرے مجموعہ کلام کی بابت میرے مضمون میں ذکر آچکا ہے۔

جلیل

(۴)

۱۳/اگست ۱۹۵۳ء

میرے فراموش کار بھائی۔ پرسوں رام پور سے حیرت صاحب کا(۱) خط ملا۔ اس میں انھوں نے ایک عجیب بات لکھی۔ فرماتے ہیں کہ جلیل صاحب اس بات سے بہت شرمندہ ہیں کہ تمھارے خط کا جواب نہ دے سکے اور پھر جوں جوں وقت گزرتا گیا، یونہی حجاب بڑھتا گیا۔

یہ پڑھ کر کچھ تعجب بھی ہوا اور کچھ افسوس بھی۔ تعجب اس بات کا کہ آپ نے میرے تعلق کو بھی رسمی خیال فرمایا۔ ایک اشارہ کافی ہوگا۔ اگر یہ ایسا سرسری تعلق ہی ہوتا، تو مجھے کیا پڑی تھی کہ پار سال اتنے شوق اور آرزو سے آپ کو تلاش کر کے دیدار کے لیے دولت کدہ پر حاضر ہوتا۔(۲)

اور افسوس اپنی غفلت پر، کہ میں نے کیوں نہ دوبارہ لکھا کہ آپ کو یہ حجاب نہ رہتا۔

خیر مضیٰ مامضیٰ

بلکان کردیا۔ بہرحال شکر ہے حالت رو باصلاح ہیں۔ ثم الحمد اللہ

میں نے آپ کی بعض تحریریں "ماہ نو" میں اور "اردو" میں دیکھی ہیں۔ میں نے خود اس دوران میں کچھ زیادہ لکھا ہی نہیں۔ شاید تین مضمون ہندوستان کے بعض پرچوں میں چھپے۔ کراچی میں جو کچھ چھپا وہ تو نظر سے گزرا ہی ہوگا۔

پاکستان میں تمام احباب کے لیے مندرجہ صدر عنوان استعمال کرتا ہوں۔ مصلحتاً اسے کہیں نقل کرلیجیے۔ تاکہ بوقت ضرورت کام آئے۔

جناب بیگم صاحبہ کی خدمت میں آداب عرض کرتا ہوں۔ بچوں کو پیار و دیدہ بوسے۔

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

حواشی

(۱) عبدالمجید حیرت شملوی مرحوم۔ مشہور غزل گو اور سرکاری ملازمت کے زمانے کے ہمارے مشترک دوست۔ غیر منقسم ہند کے مرکزی اسمبلی میں سپرنٹنڈنٹ تھے ان پر میرے مجموعہ "چند اکابر چند معاصر" میں میرا مضمون شامل ہے۔ مولانا عرشی رام پوری مرحوم نے ان کے بارے میں انھیں ایک خط میں لکھا تھا، میں اب تک آپ کو شاعر جانتا تھا۔ صاحب طرز استاد نہیں سمجھتا تھا۔ آپ کی ان غزلوں کے بعد میں نے باور کرلیا کہ آپ اس وقت کے تمام غزل گویوں کے پیشوا ہیں۔ میں نے اسے ایک بار لکھا تھا۔ غزل صرف آپ کہتے ہیں ہم لوگ جھک مارتے ہیں ان کے "آئینہ حیرت" پر میں نے اخبار "ڈان" کراچی میں مکمل تبصرہ کیا تھا، وفات سے پہلے طویل بیماری میں بے انتہا تکلیف اُٹھائی۔

(۲) کراچی میں ایک شام اچانک، مصر سے ہندوستان جاتے ہوئے۔ ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر (۱) خط نمبر ۲

(۵)

۲۰/اپریل ۱۹۷۰ء

محب عزیز تسلیمات

آپ میری مسرت کا اندازہ نہیں لگا سکتے، جو اچانک آپ کا گرامی نامہ ملنے سے حاصل ہوئی۔ وقت تو خوش باد کہ وقتِ ما خوش کردی،

آخری ملاقات کراچی ہی میں ۱۹۵۲ء کے اوائل میں ہوئی تھی، جب میں مصر سے مراجعت کے دوران میں دو تین دن کے لیے کراچی رکا تھا۔ اللہ اللہ اس پر بھی ۱۸ برس کا زمانہ گزر گیا۔ لیکن سچ مانیے، میں اس مدت میں آپ کے خیال سے غافل نہیں رہا۔ اور کم و بیش آپ کی ادبی سرگرمیوں سے متعلق باخبر رہا ہوں۔ اللّٰھم زد فزد

میں بھی اپریل ۱۹۶۵ء میں کار سرکار سے سبکدوش ہوگیا تھا۔ لیکن جس دن وہاں سے نکلا، اسی دن ساہتیہ اکاڈیمی میں شعبۂ اردو کا انچارج بن گیا اور مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی تصنیفات کی ترتیب و تدوین کا کام میرے سپرد کردیا گیا۔ یہ کام میری پسند کا تھا اور

ماحول بھی سراسر علمی وادبی لیکن اکتوبر ۱۹۶۷ء میں مجھے وہاں سے مستعفی ہونا پڑا۔ میرے عزیزوں کا کوئی ۴۰ - ۴۲ برس پرانا موٹر کاروں کے پرزوں کا وسیع کاروبار ہے۔ انھیں ایک آدمی کی ضرورت تھی۔ انھوں نے اصرار کیا اور میں انکار نہ کرسکا۔ لہذا اکاڈیمی سے استعفیٰ دے کر میں اس فرم کا مینیجنگ ڈائریکٹر بن گیا آج کل اسی جگہ کام کر رہا ہوں۔ بحمدہٖ تعالیٰ کوئی شکایت کا مقام نہیں۔

تینوں لڑکیوں کی شادی ہوچکی ہے۔ اور وہ اپنی اپنی جگہ بفضلہ تعالیٰ خوش و خرم ہیں۔ دو لڑکے (آفتاب اور سلمان) آوارہ گردی کر رہے ہیں۔ بڑا لور پول یونیورسٹی میں تعلیم پا رہا ہے، اور چھوٹا کنیڈا میں ہے، جہاں اس کی بڑی بہن ہے۔ ہم دونوں میاں بیوی یہاں اکیلے ہیں۔ بہرحال شکر ہے کہ کسی قسم کی تشویش نہیں۔ اگر کچھ ہے، تو چھوٹے لڑکے سے متعلق، اور وہ بھی بیکار کہ جب وہ خود مطمئن ہے تو ہم کیوں فکر کریں۔ البتہ کبھی کبھی تنہائی کا احساس ضرور ہوتا ہے، یہ بھی لازمۂ حیات ہے (۱)

میری طرف سے بیگم سلمہا سے آداب کہیے۔ بچّوں کو دعا اور پیار (۲) محمود صاحب مدظلہ کو مضامین کا شکریہ الگ سے لکھ رہا ہوں۔

والسلام والاکرام
خاکسار
مالک رام

حواشی

(۱) وہ دور جس سے ہم میاں بیوی بھی گزر رہے ہیں ایک بیٹے کی شرارت دیکھیے۔ ماں سے کہتا ہے یہ آپ دونوں کا دوسرا "ماہ عسل" ہے۔
(۲) محمود اکبر آبادی صاحب کے کن مضامین کا حوالہ ہے یاد نہیں آرہا۔

جلیل

(۶)

۲۹ اگست ۱۹۷۰ء

محب مکرم، آپ کی شکایت ہے کہ میں نے بہت دن سے آپ کا گرامی نامہ جواب طلب خطوط میں ڈالے رکھا، لیکن میں اپنے حالات کا اسیر ہوں اور اس سے گلوخلاصی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ کیا کروں! اللہ رحم فرمائے آپ بھی دعا کیجیے سب سے چھوٹی بچی بشریٰ پرسوں (۳۱ اگست کو) لندن سے آرہی ہے۔ جیسا کہ لکھ چکا ہوں اس کے میاں وہاں وزارتِ سیاحت کے تحت اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہیں۔ برخوردار خود ستمبر میں آئیگا۔ اور پھر

دونوں ایک ساتھ واپس جائینگے۔ تین سال کے بعد آرہے ہیں۔ میں تو پار سال کچھ دن کے لیے یورپ گیا تھا اور ان سے ملا تھا، البتہ اس کی والدہ آج کل بہت خوش ہے۔

آپ کے بچوں کے حالات پڑھ کر دلی مسرت ہوئی۔ ماشا اللہ سب اپنی اپنی جگہ پر خوش و خرم ہیں اللہ کریم انھیں اپنے حفظ و امان میں رکھے اور وہ آپ کے لیے اور آپ کے سب احباب کے لیے باعث فخر و مسرت ثابت ہوں۔ آمین

اگر خدا کو منظور ہے، تو ملاقات ضرور ہوگی۔ کتنی مرتبہ اس طرف آنے کا ارادہ کیا، حالات بھی پیدا ہوئے، لیکن کوئی بات سدِّ راہ ہوگئی۔ اب فروری /مارچ ۱۹۷۱ء میں وہاں کا آنے کا ڈول بن رہا ہے۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے!

آپ مجھ سے کچھ بڑے ہیں۔ میں آئندہ دسمبر میں ۶۴ کا ہوںگا۔ میں ۱۹۶۵ء میں سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوا تھا۔ اس کے بعد تقریباً تین برس سرکاری ادبی اکاڈیمی میں شعبۂ اردو کا انچارج رہا۔ ۱۹۶۷ء کے اواخر میں وہاں سے مستعفی ہوگیا۔ کیونکہ میرے عزیزوں کا ایک بہت بڑا کاروبار ہے، وہ مجھے اس کے انتظام کے لیے چاہتے تھے چنانچہ میں آج کل اس فرم کا مینیجنگ ڈائریکٹر ہوں کام تو ایسا مشکل نہیں، لیکن اس میں وقت بہت ضائع ہوتا ہے۔

بہر حال خدا کا شکر ہے کہ اطمینان کی زندگی ہے۔ گزشتہ کا غم نہیں، آئندہ کی فکر ہے۔ آج تک جو کچھ اس نے کیا، بہت اچھا کیا، اور یقین ہو کہ آئندہ بھی جو کچھ وہ کرے گا اچھا ہی ہوگا

بیگم جلیل سلام قبول فرمائیں، عزیزوں کو دعوات

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

(۷)

۱۰ فروری ۱۹۷۲ء

برادرِ عزیز بہت دن کے بعد آپ کی تحریر سے آنکھیں روشن ہوئیں۔ میں نے آپ کے ارشاد کے مطابق دو ایک جگہ پتہ لگانے کے لیے کہا ہے خدا کرے، تسلّی بخش جواب موصول ہوجائے۔ تاکہ میں خوشخبری سنا کر آپ کی اور بیگم قدوائی سلمہا کی تشویش دور کرسکوں آمین (۱)

تو بدیں آرزو مرا برساں

افسوس کہ حالات کی یہ نوبت آئی، لیکن کارکنانِ قضا و قدر کی مصلحتوں میں ہم کون دخل دینے والے!

بیگم سلمہا سلام قبول فرمائیں۔ عزیزوں کو پیار اور دیدہ بوسی اور دعا کہیے گا۔

والسلام والاکرام

مالک رام

(عزیزہ پروین (۲) یہ خط جلیل قدوائی صاحب کو بھیج دو۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کا حامی و ناصر رہے آمین، مالک رام)

حواشی

(۱) ہند پاک جنگ جس کے نتیجہ میں بنگلہ دیش ظہور میں آیا میرا بیٹا کیپٹن خالد (اب بریگیڈیئر خالد احمد قدوائی) جنگی قیدی ہوگیا تھا اور عرصۂ دراز تک اس کی کوئی ہمیں خبر نہ ملی۔ موصوف کو لکھا تھا کہ ممکن ہو تو اس کا پتہ چلانے میں ہماری مدد کریں۔

(۲) میری سب سے بڑی بیٹی ڈاکٹر پروین جو انگلستان میں رہتی ہے اُن دنوں اس سلسلے میں مالک رام اور میرے درمیان مراسلت کا ذریعہ تھی۔

جلیل

(۸)

۱۶ اگست ۱۹۸۴ء

محب گرامی آداب

چند دن ہوئے پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے آپ کا تحفہ تین کتابوں کی شکل میں پہنچایا۔ (کیفیات حج بیت اللہ، چشمۂ آفتاب، چند اکابر چند معاصر)۔ بیان نہیں کر سکتا کہ کتنی مسرّت ہوئی، اور چشم تصوّر نے کیا کچھ نہیں دیکھا! آج سے پچاس برس پہلے کا زمانہ سامنے آگیا۔ زندہ باشی وجاوداں باشی! اب ہم لوگ جس منزل میں ہیں، ماضی کی یہ یادیں کتنی قیمتی اور خوشگوار معلوم ہوتی ہیں۔ خلوص تھا، محبّت تھی، بےغرضی تھی آج جب کہ ہر طرف خود غرضی کا دور دورہ ہے، تعلقات کی بنا ذاتی مفاد اور ریاکاری پر ہے، وہ دن کیوں نہ یاد آئیں اور انسان انھیں کیسے بُھلا دے!

بہرحال دلی شکریہ قبول کیجیے وقتِ تو خوش کہ وقتِ ما خوش کردی۔ بیگم قدوائی بھی شکریہ قبول فرمائیں۔

اب دو درخواستیں:

(۱) میں اپنے ہم عصر ادبی احباب کے بارے میں یادداشتیں قلمبند کر رہا ہوں۔ اس کے لیے اپنے تفصیلی حالات عنایت فرمائیے۔ یہ ذرا جلد درکار ہوگا۔ ایک تصویر بھی بھجوائیے۔

(۲) کتاب کے آخری سرورق پر چند کتابوں کے نام دیکھے ان میں سے مندرجہ ذیل اگر بآسانی مہیا ہوسکیں تو انھیں دیکھنے کی خواہش ہے:

(۱) تنقیدیں اور خاکے (۲) ذکر اور تبصرے (۳) شعرائے بد نام (۴) مکتوباتِ عبدالحق (۵) مرقع مسعود (غالباً یہ سرراس کی مسعود سوانح عمری ہوگی)

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

(۹)

۱۳ نومبر ۱۹۸۴ء

برادرم۔ آپ کا اکتوبر کا گرامی نامہ ملا بہت دن ہوگئے۔ سچ مانیے اس نے مجھے رُلا دیا۔ اب کون ان باتوں کو سمجھے گا یا ان کا قدردان ہوگا (۱) میں اس کا جواب لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ ۳۱ اکتوبر کو یہ سانحہ پیش آگیا۔ (۲) اس نے دل و دماغ سُن کر دیے۔ ابھی تک حواس باختہ ہوں لیکن خیال آیا کہ آپ سوچتے ہونگے، عجیب بد تمیز آدمی ہے کہ خط کا جواب تک نہ دیا۔ میں ۱۹۶۵ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوا، تو اسی دن ساہیتہ اکادمی (ACADEMY OF LETTER) میں اردو ایڈیٹر مقرر ہوگیا۔ تین سال بعد استعفیٰ دیا اور ایک تجارتی فرم سے منسلک ہوگیا، آج تک یہ سلسلہ چل رہا ہے۔ دفتر جانے کی قید نہیں کام مشاورتی ہے۔ وہ لوگ کاغذ گھر پر بھیج دیتے ہیں اور میں حتی الامکان جو سمجھ میں آتا ہے اپنی رائے لکھ کر بھیج دیتا ہوں، اگست ۱۹۷۴ء میں دل کا عارضہ لاحق ہوا۔ کچھ دن حالت بہت مخدوش رہی۔ اللہ تعالیٰ نے فضل کیا اور گھر واپس آگیا۔ دو چار مہینوں کے بعد ڈاکٹر دیکھ لیتا ہے۔ اور میرے ملک سے باہر نہ جانے کی یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب اجازت نہیں دیتے (۲) ان کا کہنا ہے کہ سفر میں تو کوئی مضائقہ نہیں ہے لیکن باہر جا کر نہ آرام ملے گا (۳) نہ خوراک کے پرہیز کی پابندی ہوسکے گی۔ پاکستان سے ہر سال دو تین دعوت نامے موصول ہوتے ہیں۔ دوستوں سے معافی چاہتا ہوں ہر ایک کو اپنی بپتا لکھ بھی نہیں سکتا۔ اور اب تو میرے پاس پاسپورٹ بھی نہیں۔ جب پہلے پاسپورٹ کی میعاد ختم ہوگئی تو میں نے نیا پاسپورٹ لیا ہی نہیں (۴)

میری پیدائش ۲۲ دسمبر ۱۹۰۶ء کی ہے۔ انشاء اللہ اگلے مہینے ۷۸ برس پورے ہو جائینگے۔ دعا کیجیے کہ وہ اپنی حفظ و امان میں رکھے اور کچھ نیک کام کرنے کی توفیق اور فرصت ارزانی فرمائے۔ آمین! اب تک تو لغویات میں کٹ گئی۔

آپ کی تاریخ ولادت کیا ہے؟

بیگم ہرمزی بیگم کے خاندان کا کچھ بتائیے (۵)۔ بچوں کے نام اور کام سے آگاہ کیجیے دعا کرتا ہوں کہ خدائے بزرگ و برتر سب کا نگہبان رہے۔ آمین

میرے پانچ بچے ہیں: تین بیٹیاں اور دو بیٹے۔ دو بیٹیاں یہیں دلّی میں ہیں ایک

بیٹی اور چھوٹا بیٹا (سلمان) ٹورنٹو (کنیڈا) میں ہے۔ بڑا (آفتاب) انگلستان میں، بحمدہ تعالیٰ
سب اپنی اپنی جگہ مطمئن ہیں۔ ثم الحمد اللہ
بیگم صاحبہ سلام نیاز قبول کریں۔

والسلام والاکرام
خاکسار
مالک رام

حواشی

(۱) یہ موصوف کا میرے خط کا جواب ہے مگر اپنے خط کا مضمون اس وقت مجھے یاد نہیں آرہا۔
(۲) ان کے بڑے داماد کی وفات کا حادثہ جانکاہ۔
(۳) یہ دو الفاظ کو ملا کر لکھنے کا۔ پرانا دستور مالک رام کی تحریروں میں اکثر پایا جاتا ہے۔
(۴) میں نے لکھا تھا۔ ہندوستان سے نہ جانے کتنے لوگ خواہی نہ خواہی پاکستان آتے رہتے ہیں۔ آپ پر یہاں آنے اور میرے ساتھ قیام کرنے پر کیا پابندی ہے؟
(۵) یہ دوسری بیگم کے بارے میں ہے ضروری معلومات غالباً فراہم کردی گئی تھیں۔ چونکہ انھوں نے لکھنے پڑھنے خصوصاً بچوں کا ادب فراہم کرنے پر نام پیدا کیا اس لیے معاونین کے تذکرہ میں انھیں بھی شامل کرنے کا ارادہ ہوگا۔

جلیل

(۱۰)

۱۵ مارچ ۱۹۸۵ء

محبِ گرامی آداب

۱۸ فروری کے عطفوطت نامے کا شکریہ قبول فرمائیے۔

اسے دیکھ کر حیرت ہوئی۔ گزشتہ نومبر میں یہاں سے ایک دوست کراچی جارہے تھے۔ میں نے ان کے ہاتھ اپنی تازہ کتاب "اسلامیات" کے کچھ نسخے جناب مشفق خواجہ کو بھیجے کہ وہ انھیں وہاں دوستوں میں تقسیم کردیں۔ انھیں میں ایک نسخہ آپ کے لیے بھی تھا، اور اس میں ایک خط بھی رکھا تھا جس میں کتابوں کی اور آپ کے حالات والے خط کی رسید تھی۔ خط میں بھی دریافت کیا تھا کہ آپ نے اپنی تاریخِ ولادت نہیں لکھی، نہ خاندان کے مختصر حالات (۱) میں خود کتنے دن سے لکھنے کا ارادہ کررہا تھا لیکن صحت کی خرابی کے باعث نہیں لکھ سکا کہ آپ نے یاد فرمایا۔ معذرت طلب ہوں کہ میرا خط آپ کو نہیں ملا۔ مشفق خواجہ صاحب سے دریافت فرمائیے۔ میں بھی انھیں لکھ رہا ہوں۔

میری آنکھوں میں بہت دن سے موتیا کی شکایت ہے۔ سہل انگاری اور مصروفیتِ کار کے باعث آپریشن کا وقت نہیں ملا۔ اب ڈاکٹر نے تنبیہ کی کہ اگر آپریشن نہ کرایا گیا تو خدا نخواستہ آنکھیں بالکل بیکار ہوجائیں گی۔ لہذا ۲۳ مارچ کو بائیں آنکھ کا آپریشن ہوگا۔ انشاء اللہ آپ سے بھی دعا کی درخواست کرتا ہوں اللہ کریم اس مرحلے سے بخیر و عافیت سے گزارے آمین (۲)

میں نے گزشتہ ۲۲ دسمبر کو ۸۷ برس پورے کر لیے۔ الحمد اللہ پانچ بچے ہیں تین بیٹیاں اور دو بیٹے تینوں بیٹیوں کے فرض سے سبکدوش ہوچکا تھا اور مطمئن تھا ۱۹۷۸ء میں بڑی لڑکی کا شوہر ایک حادثے کا شکار ہوگیا۔ اس کے تین بچے ہیں، دو لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ لڑکا سب سے چھوٹا ہے والد کی وفات پر کوئی سال بھر کا تھا۔ دوسری دونوں بحمد تعالیٰ اپنے گھر بار کی اور خوش و خرم ہیں۔ بڑا لڑکا انگلستان میں اور چھوٹا کینیڈا میں بس گئے ہیں۔ شادی دونوں نے نہیں کرائی۔ کہتے ہیں ساری دنیا آبادی کے بڑھنے کا شکایت کررہی ہے، ہم شادی کر کے تشویش میں کیوں اضافہ کریں! ہم دونوں میاں بیوی دائم المرض یہاں اکیلے ہیں اور دعا طلب۔ وہ آرتھرائٹس کی مریضہ اور میں قلب کا۔

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

حواشی

(۱) خواجہ صاحب سے دریافت کیا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ صاحب نہیں آنے ظاہر ہے کہ کتابیں اور خط کیسے ملتے

(۲) یہ خط ملنے پر دعا صدق دل سے کی تھی۔

مالک رام بظاہر مختصر قد و قامت کے درمیانہ درجہ کے جُثہ والے انسان تھے مگر درحقیقت اپنی انسانیت نوازی اور بلند اخلاق و کردار اور علمی عظمت کی وجہ سے ایک بہت بڑے انسان تھے۔

(ڈاکٹر تنویر احمد علوی)

مالک رام دو نسلوں اور دو زمانوں کے درمیان ایک پل تھے۔

(پروفیسر شمیم حنفی)

مالک رام

پروفیسر مختار الدین احمد
شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مالک رام صاحب اردو کے ان مصنفین میں ہیں جن کی شہرت متحدہ ہندوستان یعنی بھارت، پاکستان، بنگلہ دیش ہی میں نہیں بلکہ مغربی ایشیا، یورپ، امریکہ کے ان دور دراز علاقوں تک بھی پہنچ گئی ہے جہاں اردو بولنے والے اور لکھنے والے آباد ہیں۔ کئی سال پہلے کنیڈا میں ان کے علمی و ادبی کارناموں پر انھیں خراج تحسین ادا کرنے کے لیے ایک جلسے کے انعقاد کی رُوداد اخباروں میں چھپی تھی۔

ان کے ادبی کارناموں کی ابتدا صحافت سے ہوئی، "آریہ گزٹ"، "بھارت ماتا" اور "نیرنگ خیال" کے صفحات اس کے گواہ ہیں۔ وہ بہت اچھے ترجمہ نگار ہیں، انھوں نے ٹیگور کی کتاب "گیتان جلی" کے ایک حصے کا بہت کامیاب ترجمہ کیا اور جس نے دیکھا اس نے پسند کیا۔ جب اقبال کی اسرار خودی و رموز بیخودی پر بجنوری مرحوم کے انگریزی مضمون کا ان کا کیا ہوا ترجمہ "نیرنگ خیال" میں شائع ہوا تو علامہ اقبال نے اسے بہت پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور یہ ترجمہ ہی وسیلہ بنا ان دونوں کے تعلقات کی استواری کا۔ وہ نامور محقق ہیں اور جن لوگوں کی نظر سے ان کے مضامین اور کتابیں گزری ہیں وہ ان کی سعی و تلاش اور دقتِ نظر کے قائل ہیں۔ وہ کامیاب انشا پرداز ہیں، ان کی نثر میں تازگی ہے اور حسن۔ تحقیقی مضامین میں بھی شگفتگی برقرار رہتی ہے، وہ اعلیٰ درجے کے خاکہ نگار ہیں، ان کے موقلم کی بنائی ہوئی تصویریں ان کے ممدوحین کا ایسا فنکارانہ جیتا جاگتا مرقع پیش کرتی ہیں کہ ان کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ ان کے لکھے ہوئے خاکے جزئیات نگاری پر ان کی قدرت کے گواہ ہیں۔ وہ ممتاز مکتوب نویس ہیں ان کے خطوط قلم برداشتہ ہوتے ہیں۔ ان میں اختصار کے باوجود جامعیت ہے اور ان میں بے تکلفی اور برجستگی کی فضا ملتی ہے اور وہ ماہر غالبیات ہیں جنھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ غالب اور عہدِ غالب کے مطالعے میں گزارا، جنھوں نے شیخ محمد اکرام، مولانا غلام رسول مہر، قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، مہیش پرشاد، مسعود حسن رضوی جیسے نامور متخصصین غالب کی صف میں اپنے لیے نمایاں مقام پیدا کیا، بلکہ کمیت و کیفیت کے لحاظ سے ان کی تحریریں ان میں سے کئی اصحاب کی تحریروں پر بھاری ہیں۔

مالک رام صاحب کی علمی و ادبی خدمات پر ایک بڑی تعداد میں مضامین اور متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں، اور آج کی محفل

میں بھی کچھ حضرات ان پہلوؤں پر روشنی ڈالیں گے خود میں بھی ان پر دو تین مضامین لکھ چکا ہوں، اس وقت تو ان کے بارے میں اپنے کچھ مختصر تاثرات پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

مالک رام صاحب کی زندگی میں بڑا نظم وضبط ہے کام شروع کرنے اور وقت پر ختم کرنے کی ان میں حیرت انگیز صلاحیت ہے۔ اگر انھوں نے کسی رسالے کے ایڈیٹر سے مضمون لکھنے کا وعدہ کرلیا تو وہ اسے وقت مقررہ پر لکھ کر بھیج دیں گے، سیمینار کے لیے مضمون لکھنا ہے تو جلسے کے افتتاح سے پہلے مضمون کے ساتھ موجود ہوں گے، ریڈیو پر تقریر کرنی ہے تو تقریر تیار کر کے وقت سے پہلے وہ نشر گاہ پہنچ جائیں گے۔ ساغر نظامی، روش صدیقی، سلام مچھلی شہری اور رفعت سروش ان کی اس صفت کے بڑے مداح رہے، ممکن ہے کمال احمد صدیقی صاحب کو بھی اسی قسم کا تجربہ ہوا ہو۔ یہی حال جلسوں، سیمیناروں اور علمی و ادبی مذاکروں کا ہے۔ انھیں مضمون پڑھنا ہو، تقریر کرنی ہو، یا صدارت کرنی ہو وہ وقت پر وہاں موجود ہوں گے۔

ابھی کچھ دن پہلے ایوان غالب کے سیکریٹری پروفیسر نذیر احمد صاحب نے انھیں مولانا امتیاز علی عرشی کے سیمینار کی صدارت کے لیے مدعو کیا۔ عرشی مرحوم سے وہ حقیقی بھائیوں کی طرح محبت کرتے تھے، انھوں نے بخوشی شرکت کا وعدہ کیا۔ مجھے دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ علالت کے باوجود جلسے کے مقررہ وقت سے آدھا گھنٹہ پہلے ایوان غالب کے ہال میں تشریف فرما تھے۔ وہ دن بھر سیمینار میں بیٹھے رہے اور اختتام جلسہ کے بعد بھی دیر تک منتظمین اور مہمانوں سے گفتگو کرتے رہے۔ انجمن ترقی اردو کا جلسہ ہو یا جامعۂ اردو کا، جامعۂ ملیہ کی سلکشن کمیٹی ہو یا غالب اکیڈمی یا کسی اور ادارے کی تقریب میں نے کبھی انھیں تاخیر سے آتے نہیں دیکھا۔ انھیں جلسوں کی کارروائیوں میں ہمیشہ سرگرم عمل پایا، طویل نشستوں کے بعد بھی انھوں نے کبھی بیدلی و بیزاری یا اکتاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ انجمن اور جامعۂ اردو کے جلسوں میں بحث پر جس ماہرانہ انداز میں وہ گفتگو کرتے تھے اور دلچسپ نکتے اٹھاتے تھے اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کاغذات اچھی طرح پڑھ کر اور پورے طور پر تیار ہو کر آئے ہیں۔ جب وہ بحث کو منظور کر لیتے تو ہم شرکاء جلسہ کو اطمینان ہو جاتا تھا کہ اب اس میں کوئی جھول نہیں رہا اور سخت گیر آڈیٹر بھی اس پر اعتراض نہیں کر سکے گا۔

ان کا دن طلوع آفتاب سے بہت پہلے شروع ہو جاتا ہے۔ اب تو اپنے اطباء کے مشورے پر انھوں نے صبح کی سیر ترک کر دی ہے ورنہ وہ صبح کاذب کے وقت ہی میل دو میل کی سیر کر آتے تھے۔ ایک زمانے سے جب دہلی آتا ہوں تو انھی کے ساتھ قیام پذیر ہوتا ہوں۔ رات کے دس بجے وہ عام طور پر آرام کرنے چلے جاتے ہیں لیکن کبھی باتوں میں گیارہ بارہ بھی بج گئے تو صبح کے پانچ بجے انھیں بیدار پایا اور آدھا گھنٹے کے بعد انھیں چائے کی میز پر۔ ریڈیو کی خبریں وہ اس پابندی سے سنتے ہیں جس طرح عابد شب زندہ دار وظیفہ پڑھتا ہے۔ ناشتے اور کھانے کی میز پر وہ ٹرانسسٹر لے کر بیٹھتے ہیں۔ ناشتہ کھانا بھی ہو رہا ہے مہمان کی تواضع مدارات بھی، ہلکی پھلکی باتیں بھی ہو رہی ہیں اور خبریں بھی سنی جا رہی ہیں۔ پہلے ہندوستان کی، پھر پاکستان کی اور آخر میں بی بی سی اردو خبریں۔

اپنے لکھنے پڑھنے کے کام میں وہ ایسے منہمک رہتے ہیں کہ انھیں کسی تکلف کے بغیر فنا فی العلم والادب کہا جا سکتا ہے۔ کام کے لیے ان کے یہاں موسم، فضا، ماحول کی کوئی قید نہیں۔ میں نے انھیں کبھی یہ کہتے نہیں سنا کہ موسم سخت گرم ہے ذرا دو چھینٹیں پڑ جائیں تو یہ مضمون لکھوں یا وہ کام کروں۔ سخت گرمیوں کی دوپہر میں کولر کے بغیر انھیں لکھتے پڑھتے دیکھا اور دہلی کی دسمبر، جنوری کی کڑکڑاتی سردی میں بھی انھوں نے انگیٹھی کا تکلف نہیں کیا۔

میں نے ایک بار انھیں لکھا کہ میرے کام وقت پر نہیں ہوتے، سیمینار کا مقالہ آخری رات لکھتا ہوں اور ریڈیو کی تقریر کچھ ٹرین پر اور کچھ نشرگاہ پہنچ کر مکمل کرتا ہوں۔ بہت سے کام یا تو ہوتے نہیں یا ادھورے رہ جاتے ہیں، کوئی ترکیب بتائیے۔ جواب حسب معمول فوراً آیا انھوں نے لکھا آپ کے مرض کا علاج میں بتا رہا ہوں کرنا نہ کرنا آپ کا کام ہے۔ آپ نمازیں پابندی سے وقت پر پڑھیے اور زیادہ بہتر ہو اگر پانچوں وقت مسجد جا کر نمازیں باجماعت ادا کیجیے حیران ہوا کہ یہ مشورہ مالک رام دے رہے ہیں یا بہار کے مشہور محقق اور اہل حدیث عالم مولانا عبدالمالک آروی۔

مالک رام صاحب بڑے خلیق اور متواضع انسان ہیں، ساتھ ہی ساتھ صاف گو اور کھرے آدمی، رائے پوچھی جائے تو وہ ایمانداری سے دیتے ہیں اور لگی لپٹی سے کام نہیں لیتے کوئی بیس سال ہوئے رشید احمد صدیقی مرحوم کے مکان پر جامعۂ اردو کا ایک غیر رسمی جلسہ ہو رہا تھا امیر جامعۂ اور نائب امیر جامعۂ کے لیے ڈاکٹر رفیق زکریا اور مالک رام صاحب کے نام تجویز ہوئے، شیخ الجامعۂ کے عہدے کے لیے رشید صاحب کے ذہن میں دو نام تھے پروفیسر نذیر احمد اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں، وہ دونوں کو عزیز رکھتے تھے اور اس منصب کا اہل سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے خود ڈاکٹر مسعود حسین صاحب کا نام پیش کر کے یہ مسئلہ حل کر دیا، ٹریزرر یعنی خازن کے لیے رشید صاحب نے میرا نام تجویز کیا مالک رام صاحب اپنے مخصوص لہجے میں بولے، آپ انھیں جامعۂ اردو کا خازن بنائیں گے تو وہ اپنا چیک گم کر دیتے ہیں جامعہ کے حسابات کیا دیکھیں گے۔ (اسی زمانے میں میرا پانچ ہزار روپوں کا ایک چیک گم ہو گیا تھا یہ بعد کو ایک نئی شائع شدہ کتاب میں رکھا ہوا مل گیا) مجھ سے لوگوں نے یہ بات کچھ بڑھا چڑھا کر کہی اور ان سے بدظن کرنا چاہا کہ انھوں نے تمھاری مخالفت کی۔ میں نے کہا انھوں نے بالکل صحیح بات کہی بھلا میں کہاں اور ٹریزرر شپ کا جنجال کہاں۔ میں نے شاید اکبر الہ آبادی کا یہ مصرع بھی پڑھا تھا:

"ہرن پر لادی جاتی ہیں کہیں گھاس"

وہ میرے جامعۂ اردو میں پرووائس چانسلر ہونے سے بھی کچھ خوش نہیں ہیں اور ہند و بیرون ہند میرے آنے جانے اور کانفرنسوں اور سیمیناروں میں میری شرکت سے ناراض اور برہم۔ وہ ازراہ شفقت مجھے بھی اپنے بعض دوسرے دوستوں کی طرح بہت سمجھاتے ہیں کہ یہ سب تضیع اوقات ہیں اطمینان سے جم کر کام کیجیے۔

کچھ دن پہلے انھوں نے میرے ساتھ کام کرنے کے دو منصوبے بنائے۔ میں نے آمادگی و پسندیدگی کا اظہار کیا اسی دوران مجھے ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کے لیے شرق اُردن جانا پڑا۔ ایئرپورٹ جاتے وقت ان سے ملا، ٹکٹ بدست تھا اس لیے کچھ نہ بولے۔ صرف یہ کہا "وہاں سے دو تسبیحیں لیتے آئیے گا۔ میں خریداری کے معاملے میں بہت کچا ہوں اور بازار جانے سے گھبراتا ہوں۔ اتفاق سے عمان میں سرخ دانوں کی دو نہایت خوبصورت تسبیحیں مل گئیں اور میں ان کے سامنے سرخرو ہو سکا۔ وہ فرمائش شاذ و نادر ہی کرتے ہیں۔ جب میں گزشتہ سال سعودی عرب جا رہا تھا تو کہنے لگے ایک اچھی جائے نماز لیتے آئیے گا اور دیوار پر لگانے کے لیے مخمل پر سورۂ فاتحہ یا آیت الکرسی لکھے ہوئے ٹکڑے۔ وہ ایک بڑی تصویر اونٹوں اور عرب بدوؤں کی ایسی چاہتے تھے جس سے عربوں کی تہذیب کی عکاسی ہوتی ہو۔ جب اردن سے واپس آیا تو چند دن قیام کر کے ڈھاکا یونیورسٹی کی پی ایچ ڈی اردو کی ایک طالبہ کا زبانی امتحان لینے بنگلہ دیش چلا گیا۔ میں نے انھیں اس سفر کی اطلاع نہیں دی تھی لیکن انھیں کسی سے معلوم ہو گیا ایک ہفتے کے بعد بنگلہ دیش سے واپس آیا تو ان کے دو عنایت نامے رکھے ہوئے ملے ایک کی آخری سطر یہ ہے:

"آپ کرنے کا کام نہیں کرتے، ادھر اُدھر آوارہ گردی میں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں لیکن کیا کہوں اور کیا کروں!"

خواتین و حضرات "آوارہ گردی" سے آپ کچھ اور نہ سمجھیں مالک صاحب کی مراد اُردو اور بنگلہ دیش کے میرے حالیہ سفر سے ہے اور بس۔

اب ایسی محبت و شفقت کرنے والے لوگ روز روز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔

مالک رام صاحب کی تالیفات و تصنیفات کی تعداد پچاس تک پہنچ گئی ہے۔ ضعیفی، علالت اور گوناگوں مصروفیات کے باوجود لکھنے پڑھنے کا کام اب بھی جاری ہے۔ چند ماہ پہلے مولانا ابوالکلام کے خطوط کی پہلی جلد ۵۰۰ سے زائد صفحات پر مشتمل انھوں نے مکمل کی۔ آج کل وہ "تذکرہ ماہ و سال" کی ترتیب میں مصروف ہیں۔ اس پر وہ عرصۂ دراز سے کام کر رہے ہیں۔ اس میں تقریباً چار ہزار مصنفین و شعراو مشاہیر کی تاریخ ہائے ولادت و وفات نہایت تلاش و جستجو سے جمع کی گئی ہیں اور ایسے مصادر استعمال کیے گئے ہیں جو استناد کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ کتاب کوئی چار سو صفحات پر مشتمل ہوگی۔ ان کے علاوہ ان کے کچھ علمی و ادبی کام ہیں جو ادھورے رہ گئے ہیں اور تکمیل فرصت چاہتے ہیں مثلاً

"کلیات غالب" (فارسی)، "ممدوحین غالب"، "خم خانۂ جاوید" (جلد ششم و بعد)، "تذکرۂ نعت گویاں" (فارسی) "ترجمہ سفرنامہ ہند و چین" از سلیمان تاجر، "ترجمہ تحریرات افلاطون"، "ترجمہ تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی مصنفہ گارساں دتاسی"

یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ مالک رام صاحب کو امام احمد بن حنبلؒ سے گہری عقیدت ہے ممکن ہے ان سے عقیدت پیدا کرنے میں مولانا آزاد کی کتاب "تذکرہ" کو کچھ دخل ہو۔ امام احمد بن حنبل سے اپنی دلچسپی کا اظہار انھوں نے مجھ سے ۵۳ء میں اسکندریہ میں کیا تھا۔ میں جب ۵۴ء میں ہالینڈ میں مقیم تھا تو وہاں لائیڈن یونیورسٹی لائبریری کے ایک عربی مخطوطے میں امام صاحب کے مفصل حالات ملے۔ میں نے ان اوراق کا عکس انھیں بھیج دیا، پا کر بہت مسرور ہوئے اور شکریے کا بہت اچھا خط انھوں نے تحریر کیا۔ انھوں نے مسند احمد بن حنبل (جو متعدد مجلدات میں ہے) ایک بار نہیں کئی بار پڑھی۔ یہ رتبۂ بلند تو اس عہد کے دینی مدارس کے عالم کو بھی کبھی شاید ہی ملا ہو۔

امام احمد بن حنبل سے ان کی شیفتگی دیکھ کر مجھے کچھ ایسا خیال ہوتا ہے کہ مالک رام صاحب اگر کسی مسلمان خانوادے میں پیدا ہوتے اور ان کا گھرانا حنفی یا شافعی یا مالکی ہوتا بھی تو وہ ترک کر کے حنبلی مسلک اختیار کر لیتے۔

تلاش و جستجو مالک رام صاحب کی فطرت میں داخل ہے۔ وہ حاصل کیے ہوئے معلومات پر آسانی سے مطمئن نہیں ہوتے۔ وہ کسی موضوع پر لکھنے سے پہلے امکان بھر کوشش کرتے ہیں کہ سارے مصادر دیکھ لیں۔ اس کے لیے نہ ان کی کتابوں کا ذخیرہ انھیں کافی معلوم ہوتا ہے نہ دہلی کے کتب خانوں سے ان کی تشفی ہوتی ہے۔ وہ C-۵۰۴ ڈیفنس کالونی میں بیٹھے دور دراز علاقوں تک شبخون مارتے رہتے ہیں۔

"تلامذۂ غالب" ان کا اہم کارنامہ ہے جس میں مرزا غالب کے ۱۸۱ تلامذہ کے حالات و اشعار انھوں نے جمع کیے ہیں۔ اس کتاب کی ترتیب کا ابتدائی کام انھوں نے ہندوستان سے ہزاروں میل دور، مغربی ایشیا کے ممالک مصر و عراق میں بیٹھ کر کیا جہاں اردو کی کتابیں کبریت احمر کا درجہ رکھتی ہیں۔ بس ان کا مختصر سا کتب خانہ ان کے ساتھ تھا۔ اس زمانے میں انھوں نے سینکڑوں خطوط، کتب خانوں کے اہل کاروں، تحقیقی کام کرنے والوں، اپنے ملنے والوں کو معلومات کے حصول، کتابوں کی فراہمی اور مندرجات کے نقول کے لیے لکھے ہوں گے۔ اس زمانے میں ہندوستان کے متعدد کتاب فروشوں سے ان کا تعلق رہا اور تذکرے، دواوین اور اپنی ضرورت کی کتابیں ان سے منگواتے رہے۔ اگر کسی شخص کے بارے میں انھیں معلوم ہوگیا کہ وہ غالب کے کسی شاگرد کے خاندان

سے تعلق رکھتا ہے یا وہ اس خاندان سے متعلق تو نہیں لیکن اس کے پاس تلامذۂ غالب میں کسی کی تحریر، تصویر، دیوان، بیاض، تصنیف ہے یا اس شاعر کے سلسلے میں کچھ معلومات ہیں تو جب تک وہ حاصل نہیں کر لیتے چین سے نہیں بیٹھتے۔

کراچی کے ممتاز غزل گو جناب سیّد کرّار نوری، نواب سیّد محمد رضا آگاہ دہلوی (۱۸۳۹-۱۹۱۷ء) کے پر پوتے تھے۔ دیوان آگاہ کا کوئی نسخہ ہندوستان میں موجود نہیں تھا۔ آگاہ کے دو دیوانوں میں "دیوان نعت" کسی طرح امریکہ پہنچ گیا۔ "دیوان غزلیات" کرّار نوری کے پاس محفوظ رہ گیا۔ مالک رام صاحب نے جب تک ان سے مکمل دیوان کا عکس حاصل نہیں کر لیا۔ انھیں اطمینان نہیں ہوا۔ انھوں نے انتخاب اشعار کے لیے آگاہ کے پانچ ساڑھے پانچ ہزار شعر پڑھ کر ان کا انتخاب کیا، حالانکہ انھیں آگاہ کے تھوڑے سے اشعار کا انتخاب اپنی کتاب میں درج کرنا تھا جو وہ تذکروں اور دوسرے مصادر سے کر سکتے تھے۔ نوری مرحوم کہتے تھے کہ مالک رام صاحب کے پہلے خط کا جواب نہیں دے پاتا تھا کہ ان کا دوسرا خط آجاتا تھا۔ جواب بھیجتا تھا کہ مزید استفسارات آجاتے تھے۔

اپنی کتاب کی اشاعت کے بعد ہی مالک رام صاحب دوسرے ایڈیشن کی تیاری کرنے لگتے ہیں۔ ان کی تصانیف کے وہ نسخے جو ان کے زیر مطالعہ رہے میوزیم میں محفوظ کر دینے کے لائق ہیں۔ یہ ان کے قلم کے ترمیمات و اضافات و حواشی سے رنگے ہوتے ہیں۔

تلامذۂ غالب کا نقشِ اوّل تو وہ ہے جو میرے مشورے پر پہلے انجمن ترقی اردو ہند کے رسالے "اردو ادب" میں بالاقساط چھپتا رہا۔ ترمیم و اضافے کے بعد نقش ثانی ۱۹۵۶ء کے اواخر میں تیار ہوا اور عرش ملسیانی مرحوم کی کوششوں سے جالندھر میں فروری ۱۹۵۸ء میں چھپا۔ مالک رام تلامذۂ غالب کے اپنے نسخے پر حک و اصلاح، ترمیم و اضافہ کرتے رہے۔ یہ عمل چھبیس تیس سال جاری رہا اور ستمبر ۱۹۸۴ء کے اواخر میں اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن مکتبہ جامعہ نئی دہلی سے ۵۷۶ صفحات پر شائع ہوا۔ شاعر نے کہا تھا:

نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اوّل

اب ہمارے سامنے کتاب کا نقش ثالث ہے جو بہت سی خوبیوں کا آئینہ دار ہے۔ انھوں نے بعض اغلاط کی تصحیح کی ہے، شعرا کے حالات و اشعار میں اضافے کیے ہیں اور جہاں کچھ شعرا کو تلامذۂ غالب کی فہرست سے انھوں نے خارج کیا ہے، وہاں تحقیق و تلاش کے بعد غالب کے کچھ نئے شاگردوں کا اضافہ بھی کیا ہے۔

"ذکر غالب" مختصر سا رسالہ تھا جو چھوٹی تقطیع کے ۱۰۴ صفحات پر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کا پانچواں ایڈیشن پیش نظر ہے۔ ہر ایڈیشن میں ترمیم و اضافے کا عمل جاری رہا ہے۔ موجودہ ایڈیشن ۱۹۷۶ء میں ۲۷۹ صفحات پر شائع ہوا اس میں بیش قیمت معلومات کا اضافہ ہوا ہے۔

اب آخر میں مالک رام صاحب کی ایک تحریر کا مختصر اقتباس:

"رب زدنی علما میرا وظیفۂ حیات رہا ہے۔
مجھے حق حاصل ہے کہ اپنے رب کی نعمتوں کا شکر ادا کروں، جس نے اتنے ڈھیر سے علوم سے میری علمی پیاس بجھانے کا سامان پیدا کر دیا۔ "فبای آلاء ربکما تکذبان" میں نے اپنی بساط بھر اس کے حکم ومما رزقنھم ینفقون کی تعمیل میں اس علم کی نشر واشاعت میں کوتاہی نہیں کی۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ غرض پوری زندگی تین لفظوں میں محدود ہے۔

خام بدم، پختہ شدم، سوختم

میں کیسے یقین دلاؤں کہ میرا بال بال اپنے رب ودود کا شکر گزار ہے۔ میں اپنی ابتدا جانتا ہوں اور جو کچھ میں آج ہوں، میں

اس سے بھی ناواقف نہیں۔ اب کہ سفینہ کنارے پر آلگا ہے، صرف یہی دعا کرتا ہوں: "ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم"
اور میری، اراکین غالب انسٹی ٹیوٹ اور جمیع شرکاء جشن مالک رام کی دعا ہے:

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

(یہ مقالہ اس استقبالیے میں پڑھا گیا جو جناب مالک رام کے اعزاز میں ۱۲ اگست کو نائب صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر شنکر دیال شرما کی کوٹھی پر ان کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس کا اہتمام غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی نے کیا تھا۔)

باتیں اُن کی

"انسان کو اشرف المخلوقات پیدا کیا گیا تھا۔ اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ جو کچھ دنیا میں ہے انسان کو اس پر حاکم بنا دیا گیا۔ لیکن اگر وہ اپنی نادانی سے انہیں چیزوں کے آگے سجدے کرنے لگے اور انہیں اپنے اوپر مسلط کر لے تو اس سے بڑھ کر اور کون سی ذلت ہو سکتی ہے"!

"مشرک بزدل اور ڈرپوک ہوتا ہے۔ چونکہ موحد کا بھروسہ اور تکیہ محض اللہ تعالیٰ پر ہوتا ہے اس لیے وہ ماسوا اللہ سے نہیں ڈرتا۔ اس میں شعور اور جرات کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ وہ خیال کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی پیدا کیا ہے یہ سب میری فرمانبرداری اور مدت کے لیے ہے سخر لکم مافی السموات ومافی الارض جمیعاً (الجاثیہ ۴۵: ۱۳) زمین و آسمان کی سب چیزیں تمہارے ماتحت کی گئی ہیں۔ سائنس کی جدید ترقیاں اس دعوی کی صداقت کی شاہد ہیں اور نہ معلوم ابھی مستقبل کے پردے میں اور کیا کچھ پوشیدہ ہے! مومن کو یقین ہوتا ہے کہ دنیا میرے لیے ہے اس لیے میرا خدا مجھے تمام شر و آفات سے بچائے گا۔ اس کے برخلاف مشرک ہر چیز سے ڈرتا اور خوف کھاتا ہے۔"

مالک رام
(عورت اور اسلامی تعلیم سے ماخوذ)

مالک رام اردو زبان کی ایک نمائندہ علامت تھے مگر اردو ایک زبان ہی نہیں ایک مشترکہ تہذیب بھی ہے۔ مالک رام اس تہذیب کے ایک نمایاں نمونہ تھے۔ وہ جامع الصفات شخصیت کے مالک اور محققوں کے رہنما تھے۔

(ڈاکٹر عبدالغنی)

مالک رام ایک بلند پایہ ادیب، ایک بلند پایہ محقق (۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

محترم صدر خواتین و حضرات!

آپ اس سے پہلے کئی تقریریں اور مقالے سُن چکے ہیں۔ اِن تقریروں اور مقالوں میں مالک رام صاحب کے حُسنِ اخلاق، ن سلوک، تواضع، وضع داری، علم دوستی اور ادب نوازی کی جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں، میں ان کی پوری پوری تصدیق کرتا ں اس لیے کہ مجھے بھی مالک رام سے ایک دو بار نہیں درجنوں بار ملاقات کا شرف حاصل رہا ہے اور اُن کا سبھاؤ واقعی، میرے ساتھ ماتھا جیسے میں بڑا ہوں وہ چھوٹے ہیں۔ بڑے آدمیوں کا یہی تو بڑا وصف ہے کہ وہ چھوٹوں کو بڑا بنا دیتے ہیں، مخاطب کو اپنے منے چھوٹا نہیں ہونے دیتے۔ گھنٹے دو گھنٹے کی ملاقاتوں کے علاوہ مجھے انھوں نے ازراہِ محبت، صبح کے ناشتے سے لے کر رات کے ھانے تک، پورے پورے دن دو بار اپنے گھر رکھا اور خاندان کے سارے افراد سے مجھے اور میری بیگم کو اس طرح ملوایا جیسے ہم اُنھیں کے خاندان کے فرد ہوں۔

اسی طرح کا تجربہ، اس محفل میں شریک ان سب حضرات کو ہوا ہوگا، جو مالک رام سے کبھی ملے ہیں۔ جناب ڈاکٹر اسلم فرخی ر محترم مسعود احمد برکاتی صاحب نے مالک رام سے اپنی ملاقاتوں میں اُن کے حسنِ عمل و حسنِ تپاک کی جو تصویر پیش کی ہے وہ ظ بہ لفظ صحیح ہے بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا وہ بطور انسان اُس سے بھی بڑے تھے جتنا کہ ہم انھیں اپنے الفاظ میں ظاہر کر رہے ہیں، وہ فی الواقع ایک بڑے آدمی، بڑے ادیب، بڑے محقق اور بڑے انسان تھے۔ مجھ پر ان کی محبت بہت ارزاں تھی چنانچہ میری ن کی خط و کتابت تیس سال سے زائد پر محیط ہے، علالت و رحلت سے چند روز پہلے بھی مجھے ان کا ایک خط موصول ہوا تھا۔ افسوس کہ وہ ہم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے اور اردو کے ایوان کی روشنی مدھم کر گئے۔

جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا مالک رام بہت سے اوصاف کے مالک تھے، تصنیف و تالیف اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔ انھوں نے کتنی کتابیں لکھیں، کتنی مرتب کیں اور کن کن موضوعات پر قدم اٹھایا، اس کی ایک اچھی تفصیل جمیل الدین عالی صاحب، اپنے گزشتہ کالم میں دے چکے ہیں اس لیے میں اُن کے سلسلہ تالیف و تصنیف کی داستان چھیڑنا اس جگہ غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ البتہ یہ ضرور عرض کروں گا کہ وہ ایک نہایت ممتاز، نہایت بالغ نظر اور قابل قدر محقق تھے۔ اپنے ہم عمروں اور ہم عصروں میں، میں اُن کی ادبی تحقیق کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔

اس کا سبب ہے۔ میں نے محسوس کیا اور دیکھا ہے کہ ہمارے ہاں لوگ عموماً ادبی تحقیق میں اہم اور غیر اہم میں فرق نہیں کرتے۔ کوئی تحریر ہاتھ لگ جائے تو پھر یہ نہیں دیکھتے کہ یہ ادب ہے بھی یا نہیں بلکہ اپنے عزم اور ذہنی توانائی کا سارا زور اس کی

قدامت بیان کرنے میں صرف کر دیتے ہیں۔ مالک رام کے ہم عصروں میں قاضی عبدالودود صاحب ممتاز ترین محقق تھے، اُن کا تبحر علمی ان کا مطالعہ اور ان کا حافظہ غیر معمولی تھا، لیکن وہ بہ اعتبار افادیت، اردو ادب کو اتنا کچھ نہ دے سکے جتنا کہ مالک رام صاحب نے دے دیا ہے وجہ صرف یہ ہے کہ قاضی صاحب اپنی تحقیق میں اہم و غیر اہم میں فرق کرنے کے قائل نہ تھے جو کچھ ہاتھ لگا اسے چھان پھٹک کر کے ہمارے سامنے پیش کر دیتے تھے۔ اس کے برعکس مالک رام صرف اہم باتوں پر اپنی توجہ صرف کرتے تھے۔

۵۹-۱۹۵۸ء کی بات ہے۔ حسن مثنیٰ ندوی صاحب اور ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی "مہر نیمروز" نامی ماہنامہ نکالتے تھے۔ اس وقت قاضی عبدالودود صاحب "آوارہ گرد اشعار" کے عنوان سے رسالوں میں اپنے مضامین شائع کرا رہے تھے۔ عموماً سارے کے سارے اشعار ایسے ہوتے تھے کہ وہ عروضی اعتبار سے تو شعر کہے جاسکتے تھے ورنہ شاعری اور شعریت سے ان کا کوئی تعلق نہ ہوتا تھا۔ میں سوچا کرتا تھا کہ اگر قاضی صاحب اِن بے مصرف اشعار کے بجائے ادب کے کسی اہم پہلو کو اپنی تحقیق کا موضوع بنالیتے تو کتنا اچھا ہوتا چنانچہ میں نے اس خیال سے "مہر نیمروز" میں قاضی صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے نہایت مؤدّبانہ انداز میں ایک مضمون لکھا اتفاق تھا کہ اُسی زمانے میں قاضی صاحب نے لندن سے واپسی پر کراچی میں کچھ دنوں قیام کیا، "مہر نیمروز" کا تازہ تازہ پرچہ آیا تھا، ان کی نظر سے بھی گزرا۔ صد درجہ ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا چنانچہ ایک دن جب صدر شعبہ اردو اُستاذی ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب انھیں بطور مہمان جامعہ کراچی کے شعبہ اردو میں لائے اور میرا اُن سے تعارف کرایا گیا تو قاضی صاحب مجھ پر ایک دم برس پڑے میں نے قاضی صاحب پر جو مضمون لکھا تھا اس میں اہم و غیر اہم کی بات کرتے ہوئے ادب میں اُن کے مضامین کی افادیت کا بھی سوال اٹھایا تھا، قاضی صاحب نے "افادیت" کے لفظ کو پکڑ لیا اور غصّے میں زور زور سے اُردو کے بجائے انگریزی میں بولنے لگے۔ مجھے ان کے الفاظ اب تک یاد ہیں۔

I BETTER UNDERSTAND THE MEANING OF UTILITY-

I HAD BEEN THE STUDENT OF ECONOMICS AT OXFORD FOR YEARS-

میں نے ڈرتے ڈرتے پھر کہا قاضی صاحب معاشیات اور ادب کی افادیت کے مفہوم میں فرق ہے۔ اس پر وہ اور بھی بپھر گئے۔ غضب یہ ہوا کہ کشفی صاحب نے میری تائید کرتے ہوئے افادیت کے حوالے سے دو چار سوالات مزید کر دیے، اس پر قاضی صاحب کا غصہ دیکھنے کے لائق تھا۔ خدا بھلا کرے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا جنھوں نے نہایت خوبصورتی سے محفل کو مزید خراب ہونے سے بچالیا۔

بات ذرا دور جا پڑی، میں یہ کہہ رہا تھا کہ مالک رام اردو کے اِن باشعور ادبی محققوں میں تھے جو اہم اور افادی و غیر افادی میں فرق کرتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ہمیشہ مولانا الطاف حسین حالی اور مولانا شبلی کے طرز پر ادب کے اہم موضوعات اور ادب کی اہم شخصیت ہی اپنی تحقیقی تحریروں کے لیے منتخب کیا، اور ان کا یہی انتخابِ نظر اُن کو اردو ادب کا نہایت اہم محقق بنا گیا۔ تحقیقی کام بہتوں نے کیا ہے اور بعض نے اُن سے زیادہ کیا ہے لیکن موضوع کی افادیت کے پیشِ نظر مالک رام کو جو رتبہ اعتبار ملا وہ کم لوگوں کو میسر آیا۔

ادبی تحقیق کے سلسلے میں اسی امتیاز کا نتیجہ تھا کہ مالک رام نے اردو شاعری کے اہم ترین سُتون غالب کو اپنے مطالعے اور تحقیق کا موضوع خاص بنایا اور اتنا کچھ کر گئے کہ دوسروں سے نہ ہوسکا، ہر چند کہ غالب کی زندگی اور شاعری کے بارے میں اس کثرت سے لکھا گیا ہے کہ کسی اردو شاعر پر نہیں لکھا گیا۔ جی؟ آپ نے صحیح کہا (۱) یقیناً علامہ اقبال کے بارے میں غالب سے زیادہ لکھا گیا

ہے، لیکن یہ نہ بھولنا چاہیے، لکھنے اور لکھوانے میں بڑا فرق ہے، غالب پر جو کچھ ہے وہ سب لکھا گیا ہے جب کہ اقبال پر زیادہ تر لکھوایا گیا ہے۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ مالک رام کے شعور ادبی نے اہم و غیر اہم میں ہمیشہ فرق کیا اور انھیں موضوعات پر اپنی تحقیقی قوت صرف کی، جن کی افادیت و اہمیت ہمیشہ تسلیم کی جائے گی۔ غالب کو بھی انھوں نے اسی خیال سے اپنالیا اور ان کے مختلف پہلوؤں پر ایسی قیمتی تحریریں یادگار چھوڑ گئے جو ہر اعتبار سے اعلیٰ درجے کے تحقیقی شعور و تنقیدی بصیرت کی حامل ہیں اور خاص بات یہ ہے کہ ان کی سادہ تحریریں اپنے آپ کو قاری سے اسی طرح پڑھوا لیتی ہیں جس طرح حالی اور مولوی عبدالحق کی تحریریں۔

یہی بات ابوالکلام آزاد کے بارے میں اُن کی تحریروں کے متعلق کہی جاسکتی ہے۔ ابوالکلام آزاد سے آپ سیاسی طور پر اختلاف کرلیں، لیکن صاحبِ اُسلوب نثر نگار اور عالم زبان و ادب کی حیثیت سے اُن کو ہمیشہ تسلیم کیا جائے گا وہ پہلے بھی ہماری جامعات میں پڑھائے جاتے تھے اور آئندہ بھی پڑھائے جائیں گے، لیکن اُن کی تحریروں کی قرأت و تدریس سب جانتے ہیں کہ رجب علی بیگ سرور اور ڈپٹی نذیر احمد کی بعض تحریروں کی طرح خاصی مشکل ہے اس لیے کہ ہر صفحے کے دامن پر فارسی و عربی کے فقرے یا اشعار ٹنکے ہوتے ہیں، ظاہر ہے جب تک کوئی شخص عربی و فارسی سے واقف نہ ہو اُن تحریروں سے نہ تو لطف اندوز ہوسکتا ہے اور نہ کسی دوسرے کو پڑھا سکتا ہے۔ مالک رام نے اُردو نثر کے اس بھاری پتھر کو بھی اٹھایا۔ چوم کر رکھ نہیں دیا بلکہ اس پتھر میں جتنی چنگاریاں یا شرارے تھے ان سب کو بیرون سنگ لاکر ان کی روشنی عام کردی۔

کم و بیش یہی کیفیت اُن کی مذہبی تحریروں کی ہے جو اسلام اور اسلامیات سے متعلق ہیں دوسری تحریروں کو چھوڑ کر میں اس جگہ صرف اُن کی کتاب "عورت اور اسلامی تعلیم" کا ذکر کروں گا مشکل سے دو ڈھائی سو صفحے ہوں گے لیکن اس میں قرآن کی روشنی میں اسلام میں عورت کا مرتبہ جس خوبصورتی اور عالمانہ انداز سے متعین کردیا گیا ہے اردو میں اس کی مثال مجھے نظر نہیں آتی ہے۔ مجھے ان کا یہ عالمانہ کام "محمڈن لا" کے مصنف، ملا کی یاد دلاتا ہے ملاؔ، (۲) مذہباً پارسی تھے، لیکن انھیں یہ دیکھ کر دکھ ہوتا تھا کہ اسلامی قوانین کے بارے میں فتووں کی شکل میں بہت کچھ موجود ہے لیکن دوسرے مذاہب کی طرح کوئی ایسا کوڈی فیکشن (CODIFICATION) موجود نہیں ہے جس کی دفعات کے حوالے عدالتوں میں کسی مقدمے کی سماعت کے وقت دیے جا سکیں۔ چنانچہ ملاؔ اس کام کے لیے ملک سے باہر گئے بغداد اور قاہرہ سمیت عرب ممالک میں برسوں رہ کر عربی اور اسلامیات سے پوری واقفیت حاصل کی اس کے بعد محمڈن لا کی مجلدات تیار کیں۔ آج بھی یہ مجلدات ایل ایل بی کے نصاب میں شامل ہیں اور اسلامی قانون کے سارے ماہرین اس سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔

مالک رام کی کتاب "عورت اور اسلامی تعلیم" اسی قبیل کی اور اُسی پائے کی کتاب ہے اور مجھے یقین ہے لوگ اس سے مستفیض ہو رہے ہوں گے۔ میں نے اس کتاب کے بیشتر اجزا "نگار" میں بالاقساط شائع کردیے ہیں۔

غرضیکہ مالک رام صرف ادب کے نہیں اسلامیات کے بھی بڑے اسکالر تھے اور اُن کی تصانیف دونوں شعبوں میں تادیر ہماری رہنمائی کرتی رہیں گی افسوس کہ وہ اب ہم میں نہیں رہے، خدا انھیں سورگ باشی کرے، بیکنٹھ میں جگہ دے اور ان کی آتما کو پرسکون رکھے۔

حواشی

(۱) ۵ جون ۱۹۹۳ء کو نیپا آڈیٹوریم میں مالک رام کے تعزیتی جلسے کی تقریر جو قومی زبان کے مدیر جناب ادیب سہیل کے ایما پر بعد کو قلم بند کی گئی (ف۔ف)

(۲) پورا نام ڈاکٹر یدوال جی ملا ہے۔ ان کی تالیف "محمدن لا" اردو میں "شرع محمدی" کے نام سے شائع ہو چکی ہے

حرفے چند

اسلوب احمد انصاری

۱۵، اور ۱۶ اپریل ۹۳ء کی درمیانی شب میں متبحر عالم، محقق اور اور تاریخ داں مالک رام صاحب مرحوم نے داعیِ اجل کو لبیک کہا، اور وہ خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ وہ ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اور اس حساب سے ستاسی سال کی عمر کو پہنچے۔ ان کے انتقال سے اس ملک اور معاشرے میں، جسے چاہیں تو آپ اردو معاشرہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ثقافت، رواداری اور بھلمنساہت کی ایک دیرینہ اور قابلِ قدر روایت ختم ہوگئی۔ وہ اگلوں کی وضع داری کا آخری نمونہ تھے۔

اپنے بچپن اور اسکول کی طالب علمی کے ابتدائی دور میں، نیرنگِ خیال لاہور، کے اقبال نمبر ۳۲ء میں شائع شدہ مالک رام صاحب کا عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کے مضمون کا اردو ترجمہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ مضمون انگریزی میں اقبال کی مثنویوں، اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی پر لکھا گیا تھا۔ اور رسالہ بہ عنوان EAST AND WEST میں شائع ہوا تھا۔ مالک رام صاحب نے ترجمے کے علاوہ اس پر حواشی بھی لکھے تھے جس سے اس تعارفی اور توضیحی مضمون کی افادیت میں اضافہ ہوگیا تھا۔ جہاں سے ترجمہ شروع ہوا تھا، اس کے بالمقابل صفحے پر عبدالرحمٰن بجنوری اور مالک رام صاحب کی تصویریں بھی چھپی تھیں۔ جو اب تک ذہن میں تازہ ہیں۔ ہائی اسکول کا امتحان پاس کرنے کے بعد ۴۰ء میں "سبدِ چین" اور "ذکرِ غالب" (۳۸ء) کو دیکھنے کا اتفاق ہوا، برسوں بعد احوالِ غالب ۵۳ء (مرتبہ مختار الدین احمد) میں مالک صاحب کا غالب کا وہ قلمی مرقع پڑھنے کا موقع ملا، جسے تخیلی باز آفرینی کا شاہکار کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اس میں انھوں نے غالب کے مزاج، معمولاتِ زندگی، ان کے دور کی شہری فضا، ان کے وسیع اور متنوع مراسم اور ان کی شاعرانہ انفرادیت کی، معلوم حقائق کی روشنی میں، ایسی اچھوتی غیر رسمی اور جیتی جاگتی تصویر پیش کی گویا یہ غالب کے کسی معاصر کے نجی تاثرات کا ماحصل ہو۔ بہ الفاظِ دیگر اس میں ایک FICTIONAL STRUCTURE تیار کر کے غالب کی زندگی کے ایک ایک نقش کو اس میں اُبھارا ہے۔ ۵۶ء میں نقوش کے شخصیات نمبر میں مالک رام صاحب پر مختار الدین احمد کا سوانحی تاثراتی خاکہ پڑھا۔ یہ ان سے غائبانہ تعارف کے مختلف نقوش تھے۔ جو یکے بعد دیگرے زمین میں جذب ہوتے چلے گئے۔ اور ان کی یکجائی سے جو تصویر ابھری، وہ ایک انتہائی باوقار عالم، متین و مہذب بامروت اور مرنجاں مرنج انسان کی تصویر تھی۔ چنانچہ ان سے ملنے اور بالمشافہ گفتگو کی شدید خواہش دل میں پیدا ہوئی۔ ایک قریبی عزیز سے جو مالک رام صاحب سے سرکاری سطح پر خاصا میل جول رکھ چکے تھے، اپنی اس خواہش کا اظہار کیا۔ نتیجے کے طور پر کچھ مدت بعد جب مالک رام صاحب علی گڑھ تشریف لائے، تو ان عزیز کی معیت میں غریب خانے پر ملنے کے لیے آئے۔ ان کی مروت، منکسر المزاجی اور حسنِ اخلاق کا یہ پہلا مظاہرہ تھا، جس کا تجربہ

راقم الحروف کو ہوا۔ پھر تو دید اور باز دید کا سلسلہ ایسا چل نکلا جو ان کی مدتِ حیات تک جاری رہا۔ ان کا برابر یہ معمول رہا کہ جب بھی علی گڑھ کا پھیرا کرتے، چاہے وقت کتنا ہی تنگ کیوں نہ ہوتا۔ اور مصروفیت کیسی کیوں نہ ہوتی، ملاقات کی سبیل ضرور نکالتے۔ یا تو خود آجاتے، یا اپنی آمد کی اطلاع راقم الحروف کو کرا دیتے اور وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوجاتا۔ اس پر مستزاد یہ کہ اپنی ہر تصنیف و تالیف کا ایک نسخہ راقم الحروف کی بے بضاعتی کے باوصف اسے ضرور بھیجتے، اور اس طرح اسے مفتخر کرتے۔ ان کے انتقال کا قلق ایک عالم، محقق اور انشاء پرداز کے جدا ہوجانے ہی کا قلق نہیں ہے۔ بلکہ ایسا لگتا ہے، جیسے اپنے کسی قریبی عزیز، خاندان کے کسی بزرگ اور سرپرست اور ہر کام میں ہر جہت سے مشکل کشائی کرنے والے نے آنکھیں موند لی ہوں، اور اس کا سایہ سر سے اٹھ گیا ہو، وہ ہر صاحبِ احتیاج کی دامے، درمے سخنے مدد کے لیے ہمیشہ بہ طیبِ خاطر مستعد اور آمادہ رہتے تھے۔ علمی اور تحقیقی کاموں میں بھی۔ اور روزمرہ زندگی کے بکھیڑوں میں بھی۔ بہ ظاہر ان میں ایک طرح کا روکھا پن اور لاتعلقی سی محسوس ہوتی تھی۔ ان کے لب و لہجہ پر پنجابیت کا خاصا غلبہ تھا، لیکن ان کے دل میں بڑی وسعت، کشادگی اور گہرائی تھی۔ ان کے باطن کی اچھائی ہر اس شخص کو متاثر کرتی تھی، جس کا ایک دفعہ ان سے رابطہ قائم ہوجاتا تھا۔ وہ ایک بے ریا انسان تھے۔ خلوص و محبت اور دلاسائی کا پیکرِ مجسم۔ میانہ قد گندمی رنگ، ہلکے پھلکے چھریرے سے بدن، ذہانت و طباعی کے حامل، متوازن اور ٹھیرے ہوئے پر سکون مزاج کے انسان کی تصویر یہ سطور لکھتے وقت بار بار نظروں کے سامنے پھر رہی ہے۔

مالک رام صاحب بہ حیثیت محقق زیادہ متعارف ہیں۔ ان کی بنیادی پہچان یہی ہے گو ان کی علمی شخصیت کے بعض اور پہلو بھی لائقِ توجہ ہیں۔ وہ چونکہ اولاً تاریخ کے ادمی تھے۔ اس وجہ سے ان میں واقعات کا کھوج لگانے کی چیٹک شروع ہی سے تھی۔ وہ اسے تحقیق و احتساب کی بجا طور پر خشتِ اول قرار دیتے تھے۔ غالباً اس کا اثر یہ بھی تھا۔ کہ ان کے مزاج اور انداز میں ایک طرح کی LITERALISM در آئی تھی۔ وہ تحقیق و استدلال کی راہ چل کر مثبت نتائج تک پہنچنے کی تگ و دو میں لگے رہتے تھے۔

ان کے اولین کارنامے سبدِ چین اور ذکرِ غالب کی طرف اشارہ کیا جاچکا ہے۔ جس میں انھوں نے غالب کے حالات کو صحت کے ساتھ متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا ایک شاخسانہ بعد میں تلامذۂ غالب کی صورت میں سامنے آیا۔ جس میں انھوں نے غالب کے تقریباً ڈیڑھ سو شاگردوں کے حالات درج کر کے انھیں گویا ذہن سے محو ہوجانے سے بچالیا۔ گو اس امر میں یقین خاصا دشوار کام ہے۔ بابلی تہذیب و تمدن، ۵۳ء کی دو جلدیں بھی ان کے ذوقِ تحقیق پر دال ہیں۔ انھوں نے مولوی مہیش پرشاد کے مرتبہ کردہ خطوطِ غالب کی از سرِ نو تدوین کی غالب کے دور اور ان کے معاصرین پر بے شمار مضامین کے علاوہ "گلِ رعنا" کے عنوان سے خود غالب کا انتخاب کردہ فارسی کلام بھی شائع کیا۔ فضلی کی کربل کتھا کا وہ نادر نسخہ جسے مختار الدین احمد ہزاروں کھکھیڑیں اٹھا کے بعد جرمنی کے کسی کتب خانے سے برآمد کر کے لائے تھے۔ اس کی ان دونوں نے تحشی اور تدوین کی مولوی ابوالکلام آزاد کی تذکرہ، غبارِ خاطر اور خطبات کی بھی تدوین کی۔ اور اول الذکر کے سلسلے میں بعض ایسے اشعار کے صحیح مآخذ کی نشاندہی کی، جو مصنف کے حافظے سے چھوٹ گئے تھے۔ غالباً مولوی صاحب کی تصانیف سے گہرے شغف اور سروکار ہی کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ امام حنبل کی شخصیت سے انھیں بغایت دلچسپی پیدا ہوگئی۔ جو تادیر قائم رہی۔ ۷۲ء میں انھوں نے تذکرۂ معاصرین، شائع کی اور ۸۲ء میں تحقیقی مضامین کے عنوان سے ان کی ایک اہم تالیف سامنے آئی۔ جس پر نقد و نظر جلد ۱۰ شمارہ ۱۱ علی گڑھ ۸۸ء میں پروفیسر نذیر احمد نے سیر حاصل تبصرہ کیا۔ مالک رام صاحب نے کچھ مدت تک تحریر، کے عنوان سے ایک علمی ادبی سہ ماہی رسالہ بھی جاری کیا۔ جو غالباً دس سال سے زیادہ نہیں چلا۔ اسی سے منسلک علمی مجلس کا قیام بھی عمل میں آیا۔ جس کے اشاعتی

پروگرام کے تحت خاصی تعداد میں کتابیں بھی شائع ہوئیں۔ جن میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر کلیاتِ میر ہے۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکا۔ اور پھر اسے بوجوہ بند کرنا پڑا۔ کچھ عرصے سے مالک رام صاحب اردو ادیبوں، شاعروں اور محققوں کا ایک سوانحی اشاریہ بھی تیار کر رہے تھے۔ جس کے لیے انھوں نے سینکڑوں ہزاروں کارڈ مرتب کیے تھے۔ تذکرۂ ماہ وسال، کے عنوان سے اس اشاریہ کی پہلی جلد ابھی حال ہی میں منظر عام پر آئی تھی۔ اپنی محدود اہمیت کے باوجود اس کام کا ایک ضمنی سا افادی پہلو بھی ہے۔

مالک رام صاحب کی فطری دل چسپی اور شغف کا ایک میدان اسلامیات ہے۔ وہ قرآنِ حکیم اور احادیث نبوی ﷺ جو فہم و ادراک رکھتے تھے۔ اور اس میں ایقان وایمان بھی وہ کسی بھی صاحب نظر سے مخفی نہیں۔ راقم الحروف کے اندازے کے مطابق وہ توحید اور رسالت دونوں میں کامل اور پختہ یقین رکھتے تھے۔ اور اس عقیدے کا انعکاس ان کی تحریروں میں بھی جھلکتا ہے۔ "عورت اور اسلامی تعلیم" (۵۱ء) ان کی ایک ایسی تالیف ہے۔ جو اس پر برہانِ قاطع ہے۔ انھوں نے پوری تحقیق اور معروضیت کے ساتھ، متعلقہ مواد کو چھان پھٹک کر اسلامی قوانین کی روشنی میں عورت کے مرتبے اور ان کے حقوق کو جو اسلام نے عورت کو دیے ہیں پیش کیا۔ بعض دوسرے مشاہیر علماء کی طرح وہ بھی اولاً نصِ صریح سے استناد کرتے ہیں، اور ثانیاً ان احادیث سے جو اس کی تصدیق و توثیق کریں۔ اس سے ضمنی طور پر جو اصول مستنبط ہوتا ہے یہ کہ حدیث نصِ صریح سے مطابقت نہ رکھتی ہو، اور عقلِ سلیم سے متناقض ہو، وہ موضوع یعنی FABRICATED سمجھی جائیگی اور اسی بناء پر ضعیف اور غیر معتبر یعنی INAUTHENTIC ٹھیرے گی۔ مالک رام صاحب کی تحریروں کے بالاستیعاب مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اسلام اور بنی ﷺ کریم کی سیرت پر صدق دل اور معروضی انداز سے تفکر و تدبر کیا ہے۔ اور اپنے نتائج فکر کو احترام، عقیدت اور عالمانہ متانت اور سنجیدگی کے ساتھ پیش کیا ہے، اور کہیں بھی اس طرح ڈنڈی نہیں ماری، جیسا کہ اکثر مستشرقین کا یہ شمول منٹگمری عام وطیرہ رہا ہے۔ اپنے مجموعۂ مضامین، اسلامیات، (۸۴ء) میں انھوں نے بہت سے اہم مسائل کا احاطہ اور استفسار کیا ہے۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ میں نے انھوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ اس کلمے میں آپ کا خاص طور سے نام لینے کا مقصد نبی کریم ﷺ کی انسانی شخصیت پر زور دے کر آپ کے پیروؤں کو شرک سے باز رکھنا تھا۔ کہ اسلام میں گناہ کبیرہ ہے، اور دوسرے مذاہب میں یہ شرک اس احتیاط کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے ان کے داعیان کے لیے راہ پایا گیا ہے، افصح العرب، میں انھوں نے حضور ﷺ کے خطوط اور خطبات کی جامعیت اور فصاحت و بلاغت کا آشکارا کیا ہے۔ خلقِ عظیم، میں سیرتِ طیبہ کے اس حیرت انگیز پہلو پر زور دیا ہے کہ آپ نے ایک مدت دراز تک دشمنوں کے مظالم اور تشدد سہنے کے باوجود ہر موقع پر ان سے انتہائی نرمی، کشادہ جبینی، اور حلم فروتنی کا برتاؤ روا رکھا۔ فتح مکّہ کے بعد مکّے میں داخل ہونے پر آپ نے لاتثریب علیکم الیوم کا اعلان فرما کر علوئے ہمت اور عفو و درگزر کا ایسا تابناک مظاہرہ کیا، جس کی نظیر چشم گردوں نے نہ اس سے پہلے کبھی دیکھی تھی۔ اور نہ اس کے بعد دیکھی۔ یہ اعلان دراصل اس بشارت ربّانی کی توثیق و تصدیق تھا: "وَمَا اَرسلنٰکَ الّا رحمۃً للعالمین" (سورۃ الانبیا) اسی طرح آپ کا آخری خطبہ انسانیت کے لیے حریت اور آزادی کا وہ منشور تھا جس کی گونج آج تک رہ رہ کر سنائی پڑتی اور روح کو تازگی اور تنومندی بخشتی ہے۔ خلافت کے بارے میں مالک رام صاحب کا یہ موقف قرینِ صحت ہے کہ اسلام میں ملوکیت کے لیے تو کوئی گنجائش ہے ہی نہیں۔ لیکن اسلامی جمہوریت بھی اپنی نوعیت میں جداگانہ ہے یہ ایک طرح کی منضبط یعنی CONTROLLED جمہوریت ہے جو بے ٹوک ملوکیت اور بے لگام جمہوریت کے بین بین ایک ایسا نظام ہے جو عدل و انصاف معاشرتی اور معاشی مساوات اور انسان

دوستی پر اپنی اساس رکھتا ہے اور استحصال کا جس میں کہیں دور دور بھی گزر نہیں۔ شوریٰ کی گنجائش اور اہمیت اس میں حتمی طور پر موجود ہے۔ معاشرتی زندگی میں عورت کے حقوق کے ضمن میں مالک رام صاحب نے چار شقیں قائم کی ہیں: تعددِ ازدواج، طلاق و خلع، نکاح، بیوگان اور وراثت، اور ان چاروں کے ضمن میں انھوں نے ہندو دھرم شریعت موسوی، عیسائیت اور اسلامی قوانین کے باہمی موازنے سے تشفی بخش طریقے پر یہ ثابت کیا ہے کہ اسلامی احکام نہ صرف سب سے زیادہ مبنی بر انصاف، ظلم اور انتشار کا قلع قمع کرنے والے اور انسانی مساوات اور آزادی کے نقیب ہیں۔ اور انسانی فکر و عمل کو افراط و تفریط سے بچا کر صراط مستقیم اور جادۂ اعتدال پر رکھنے والے ہیں۔ بلکہ یہ کہ آج عقلیت اور آزادی کے نام پر جو بھی اقدامات کیے جا رہے ہیں وہ ایک طرح سے اسی راستے کی توسیع ہیں جن کی طرف رہنمائی سب سے پہلے اسلام نے کی تھی اپنے منصفانہ اور معروضی رویے کی روشنی میں قرآن اور احادیث نبوی ﷺ کے بحرِ زخار میں غواصی کرنے کے بعد اور بے لاگ تقابلی مطالعے کی بنیاد پر مالک رام صاحب نے اسلامی شریعت کو ہر لحاظ سے قابلِ ترجیح قرار دیا ہے۔ اور ان کا کہنا یہ ہے اور انھوں نے ڈنکے کی چوٹ یہ کہا ہے کہ ہم چاہے زبان سے اس امر کا اقرار و اعتراف نہ کریں، لیکن دراصل ذہنی ارتقاء کا ہر قدم اسی منزلِ مقصود کی طرف لاشعوری طور سے جادہ پیما ہے۔ جس کی نشان دہی اسلام نے آغاز کار میں کی تھی۔

مالک رام صاحب کا ایک اور قابلِ قدر کارنامہ قلمی مرقعوں کا وہ مجموعہ ہے جو یہ صورتیں الہیٰ، کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ غالب پر ان کے بے مثل سوانحی خاکے کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ یہ ایسا ہی انوکھا اور لازوال ہے۔ جیسا مولانا محمد علی پر رشید احمد صدیقی کا مرقع۔ دونوں نے اپنے اپنے ممدوحین کو وقت کی گرفت سے نکال کر ابدیت سے ہمکنار کر دیا ہے یہ مجموعہ اسی مرقع سے شروع ہوتا ہے۔ یہ سب مرقعے جو مالک رام صاحب نے ان مقتدر علمی اور ادبی شخصیتوں کے بارے میں میں لکھے ہیں۔ جن سے ان کے قریبی روابط رہے۔ خاصے کی چیزیں ہیں۔ ان سے اس رمز آشنایانہ ربط و تعلق اور نجی سطح پر وابستگی اور قربت کا اظہار ہوتا ہے۔ جو انھیں اپنے بعض بزرگوں اور معاصرین سے رہی تھی۔ اس نورانی قافلے میں نواب صدر یار جنگ سائل دہلوی، سید سلیمان ندوی، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی اور جگر مراد آبادی خاص طور سے قابلِ ذکر اور ان کے مرقعے نظروں میں کھبنے والے ہیں۔ ذاتی تاثرات پر مبنی یہ خاکے بڑے ہی دلپذیر اور انوکھی سج دھج کے حامل ہیں۔ ان میں جو غیر رسمی پن ہے گفتگو کے لین دین کا جو انداز ہے جو اپنائیت اور تلطف ہے، فکر و نظر کی جو گہرائی ہے، اور تہذیب و شائستگی اور اخلاص ہے وہ صدر درجہ قابلِ ستائش ہے۔ لیکن یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کے پاک ارواح کے اجتماع میں نیاز فتح پوری اور ان سے بھی بڑھ کر یگانہ چنگیزی کی موجودگی بڑی ہی INCONGRUOUS معلوم ہوتی ہے۔ یگانہ چنگیزی کی دریدہ دہنی کا جو لب لباب مولانا عبد الماجد دریا بادی مرحوم کے حوالے سے صفحہ ۱۶۷ پر دیا گیا ہے وہ سولہ آنے درست ہے غالب پر موصوف کی کتاب ان کے ذہن و ظرف و ذوق کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ ان کا آتش کو غالب سے بڑا شاعر قرار دینا غیر متوازن رائے کا پتا دیتا ہے۔ ذاتی پرخاش اور چپقلش کے نتیجے کے طور پر مولانا عبد الماجد دریا آبادی کی شخصیت پر کیچڑ اچھالنے کی نیاز فتح پوری کی کوشش ان کی شخصیت کو خاصا داغ دار کر دیتی ہے۔ اسلام کی ان کی فہم بھی باوجود ادعائے عقلیت پسندی خاصی مشتبہ ہے۔ ان کے کمالات پر محاکے کا ہر گز یہ محل نہیں۔ سوائے یہ کہنے کے کہ جن مقدمات پر انھوں نے اسلام کی تفہیم و تنقید کے سلسلے میں اپنے استدلال کی بنیاد رکھی ہے، وہ سراسر FALLACIOUSLOGIC کے ضمن میں آتے ہیں۔ ان دونوں میں یگانہ چنگیزی اور نیاز فتح پوری کے سلسلے میں مالک رام صاحب نے جو تعصب، جانبداری اور غلو برتا ہے، وہ ان کی عمومی سلامت روی اور حق شناسی سے لگا نہیں کھاتا۔ مجموعی طور پر ان

رقعوں سے تو یہ ظاہر ہو ہی جاتا ہے کہ مالک رام صاحب تحقیق و تفتیش کے لیے بے آب و گیاہ میدان میں اپنی بیاحی کا گاہے گاہے معطل کر کے اس فضا میں سانس لینا جانتے تھے، جو انسانی تعلقات اور اس کی نفاستوں اور نرمیوں کی فضا ہے۔ شاید یہ کہنے میں بھی کوئی حرج نہیں کہ ان رقعوں میں تخئیلی کارفرمائی کی وہ چمک دمک نہیں ملتی جو رشید احمد صدیقی کے رقعوں کی جان و جواز اور ان کی مابہ الامتیاز خصوصیت ہے۔ ان میں بھی وہی LITERALISTSTANCE نمایاں ہے جس کا ذکر شروع کیا گیا تھا، بہر یہ صورتیں الہیٰ، ایک دلچسپ اور پُر لطف کتاب ہے۔ جسے ایک سے زائد بار پڑھنے کو دل چاہتا ہے اور جو تنہائی کے لمحوں میں ایک اچھی مونس ثابت ہو سکتی ہے۔

اپنی سرکاری ملازمت کی ذمے داریوں کے سلسلے میں مالک رام صاحب کو سالہا سال ہندوستان سے باہر رہنا پڑا۔ خصوصاً مصر اور عراق میں۔ ان دونوں ملکوں میں قیام کے دوران انھیں اپنی عربی زبان کی استعداد پر صیقل کرنے کا خاطر خواہ موقع ملا۔ مغربی ممالک میں وقت گزارنے کا جو اتفاق انھیں ہوا۔ اس سے انھوں نے یہ کام لیا کہ انگریزی زبان کے علاوہ فرانسیسی سے بھی اچھی واقفیت بہم پہنچائی۔ انھوں نے تحقیق و تفتیش کے کام کے ضمن میں مستشرقین کے طریقہ کار یعنی METHODOLOGY سے بھی کافی استفادہ کیا۔ بہت سے دوسرے وسیع المشرب برادرانِ وطن کی طرح مالک رام صاحب نے بھی اپنے آپ کو اردو زبان کے کاز سے پوری طرح ہم آہنگ کر رکھا تھا۔ وہ ہر محاذ پر اس کی حمایت اور خدمت کو اپنا فرض سمجھتے اور اسے زندہ رکھنے اور فروغ دینے کی تجویز کا غیر معمولی دانش مندی اور اخلاص کے ساتھ خیر مقدم کرتے تھے۔ باجود فارسی اور عربی کے ممتاز عالم ہونے کے ان کی تحریریں ان زبانوں کے غریب الفاظ و تراکیب کے بوجھ سے گراں بار نہیں ہیں۔ وضاحت، گتھا پن، اور حشو و زوائد سے اجتناب، ان کے خاص امتیازات ہیں۔ ان کے مزاج میں کلاسیکل سہل پن کی طرف جھکاؤ پایا جاتا ہے وہ ہمیشہ اپنے مفہوم کے براہ راست ابلاغ پر نظر رکھتے ہیں اور ان کا انداز دلنشین اور سریع الفہم ہوتا ہے جسے محاورے کے شُستہ پن سے سہارا ملتا ہے۔ ان کے ہاں وہ عبارت آرائی اور فقرہ طرازی نام کو نہیں ہے۔ جو بالعموم اردو لکھنے والوں کی بین خامی اور کوتاہی قرار دی جاسکتی ہے۔ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مواد کی سمائی کا گُر وہ خوب جانتے ہیں۔

مالک رام صاحب کی ذات پچھلی پیڑھی کی ثقہ اور صالح روایات کی امین تھی۔ ان کے ظاہر و باطن کے درمیان کوئی خلیج حائل نہیں وہ زبان پر ہی وہی لاتے جو ان کے دل میں ہوتا اور اس طرح ان کا کردار ریاکاری کے داغ سے منزہ تھا۔ راقم الحروف نے انھیں کبھی خشمگیں، آزردہ اور برہم نہیں پایا۔ انھوں نے جھلاہٹ میں کبھی کوئی اوچھی بات نہیں کہی۔ انسانی خامیوں کو انگیز کرنے اور درگزر سے کام لینے کا ان میں حیرت انگیز ملکہ تھا۔ حسِ مزاح کی یہی شناخت ہے۔ اسے ان کی وسیع المشربی کی دین سمجھنا چاہیے۔ وہ ہر اچھے کام میں نہ صرف شریک رہتے تھے بلکہ اس میں پہل کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ تعلقات کی استواری اور انھیں نبھانا بڑے دل گردے کا کام ہے اور وہ اس کا خاص سلیقہ رکھتے تھے راقم الحروف کو ذاتی طور سے اس کا علم ہے کہ جو لوگ ان کے درپے آزار رہتے اور انھیں طرح طرح سے مطعون کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ ان کے حق میں بھی کلمۂ خیر کہنے سے وہ اپنے کو باز نہیں رکھ سکتے تھے۔ اپنے نفس پر فتح پائے بغیر اس کام کا انجام پانا نہایت دشوار ہے۔ کس کس قماش کے لوگوں کی وہ مدد کرتے اور کیسے کیسے آڑے وقتوں میں ان کے کام آتے تھے۔ اسے ضبطِ تحریر میں لانے اور اس کی تفصیل بیان کرنے کے لیے ایک دفتر درکار ہے چاہے علمی گراں مائیگی کو نقد و نظر اور احتساب کا پیمانہ بنائیے۔ اور چاہے ذاتی خوبیوں اور اوصاف کے آئینے میں انھیں دیکھیے اور پرکھیے۔ مالک رام صاحب ہر اعتبار سے ایک جامع حیثیات شخصیت تھے۔ جس کام میں وہ ہاتھ ڈالتے اور جس

منصوبے کو وہ اٹھاتے یہ اطمینان رہتا تھا کہ اس میں کوئی خامی کجی اور انحراف راہ نہ پا سکے گا۔ جو ذمے داری بھی وہ اپنے سر لیتے، اسے انجام تک پہنچانے کی دھن انھیں نچلا نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔ راقم الحروف کی مالک رام سے یاد اللہ ایک طویل مدت کو محیط ہے۔ اس دوران اس نے انھیں ہمیشہ اپنے اصول و ضوابط کا پابند غیر متعصب، متواضع اور تعلقات کی پاسداری کرنے والا پایا۔ ان کی شخصیت میں جو صلابت اور ہم آہنگی تھی، وہ خال خال ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ ان کی تبحر علمی کے سلسلے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جس پائے کے وہ عالم اور محقق تھے۔ اس سے کم کھرے اور مخلص انسان نہیں تھے۔ انھوں نے بہت معمولی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ لیکن اپنی بے پناہ لگن منکسر المزاجی شیرازہ اور توازن اور اپنے مشاغل میں کامل استغراق اور انہماک کی بدولت وہ آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔ سلامت روی، صدق مقال اور نظم و ضبط کا التزام وہ اپنی زندگی میں بھی کرتے تھے اور اپنے علمی کاموں کی انجام دہی میں بھی اور دونوں سطحوں پر یہ اخلاص اور میانہ روی ان کے کام آئی۔ ان کا سوگ منانے والوں کو ایک ذی علم انسان کے اٹھ جانے کا بھی اتنا ہی دکھ ہے جتنا ایک مخلص، بے ریا اور شریف النفس انسان سے جدائی کا۔

(بشکریہ "نقد و نظر" علی گڑھ)

عورت اور اسلامی تعلیم ..... ایک جائزہ

ثناء الحق صدیقی

میں مالک رام کے نام اور کام سے غالباً ۱۹۴۲ء میں واقف ہوا تھا۔ یہ واقفیت "نیرنگ خیال" کے اقبال نمبر کے ذریعہ ہوئی تھی جو ۱۹۳۲ء میں میں شاعر مشرق کی زندگی میں شائع ہوا تھا۔ اس نمبر میں مالک رام نے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے ایک انگریزی مضمون کا اُردو ترجمہ "مثنویات اقبال" کے عنوان سے پیش کیا تھا۔ ترجمہ کیا تھا مضمون نگار اور مترجم دونوں کی قابلیت اور صلاحیتوں کا نہایت صاف و شفاف آئینہ تھا۔ اقبال کی فارسی مثنویاں "اسرار خودی" اور "رموزِ بے خودی" ۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۸ء میں منظر عام پر آئی تھیں۔ آخر الذکر سال میں ڈاکٹر بجنوری انفلوئنزہ میں مبتلا ہو کر فوت ہو گئے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے یہ مضمون دوسری مثنوی کے شائع ہونے کے فوراً بعد ہی تیار کر دیا تھا اور اتنی کم مدت میں ہی دونوں مثنویوں کی روح کشید کر کے حوالہ قرطاس کر دی تھی۔ تقریباً سوا سال بعد ۱۹۳۲ء میں جب مالک رام نے اس مضمون کو اُردو میں منتقل کر کے ماہنامہ "نیرنگ خیال" میں اشاعت کے لیے دیا اس وقت اُن کی عمر زیادہ سے زیادہ ۲۴، ۲۵ سال کی ہوگی۔ ادبی مضامین کے ترجمہ میں اتنی پختگی و شگفتگی اور اس قدر لطف و دلکشی کا پیدا ہونا نہایت کہنہ مشق ادیبوں اور مصنفوں کے یہاں بھی بہت کم دیکھنے میں آتا ہے چہ جائیکہ ایک نوجوان ادیب کے یہاں۔ بہر حال ابتدائی تعارف ہی میں تو اس اُبھرتے ہوئے ادیب کی غیر معمولی صلاحیتوں سے بے حد متاثر ہوا۔ اس کے بعد ذکر غالب اور تلامذہ غالب کے مطالعہ نے اس تاثر کو اور گہرا کر دیا۔

غالباً ۱۹۵۶ء میں مالک رام صاحب کی کتاب "عورت اور اسلامی تعلیم" زیر مطالعہ آئی۔ اُس کو دیکھ کر تو میں ایک دم چونک پڑا۔ کبھی کتاب کے عنوان کو دیکھتا تھا اور کبھی اُس پر لکھے ہوئے مصنف کے نام کو۔ یقین نہیں آتا تھا کہ یہ کسی غیر مسلم کی لکھی ہوئی ہوگی۔ اگرچہ علامہ سید سلیمان ندوی نے تو مسودہ کو دیکھ کر ہی مالک رام صاحب کو اطلاع دی تھی کہ "اگر مجھے یہ معلوم نہ ہوتا کہ مضمون کس کا لکھا ہوا ہے تو میں اُسے پڑھ کر یہی خیال کرتا کہ یہ کسی مسلمان عالم کا لکھا ہوا ہے۔" لیکن میں اپنے متعلق پوری پابندی سے یہ کہنے کے لیے تیار ہوں کہ کتاب میں بے تحاشہ قرآن کریم اور احادیث نبوی کے حوالے دیکھ کر سرورق پر مالک رام کا نام ہوتے ہوئے بھی میں خود کو یہ باور کرانے پر آمادہ نہ کر سکا کہ اس کی تالیف میں کسی بہت بڑے مسلمان عالم کا ہاتھ نہیں ہے۔ مگر بہت عرصہ تک مالک رام صاحب کی تحریروں کا مطالعہ کرنے اور اُن کی شخصیت اور صلاحیتوں سے کسی قدر واقفیت حاصل کرنے کے بعد تعین کرنا پڑا کہ یہ تصنیف لطیف اُن ہی کی محنت کا ثمرہ ہے۔ سچ ہے:

این سعادت بہ زورِ بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اگرچہ کتاب ہذا کا موضوع نہایت اہم ہے چونکہ بہت کم مسلمان علما نے اس طرف توجہ کی ہے اس لیے قدرتی طور پر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ آخر مالک رام صاحب کو خاص طور پر اس موضوع سے متعلق اتنی تحقیق کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ علامہ نیاز فتح پوری نے تو اپنے رجحان طبیعت کے مطابق کتاب کے تعارف میں کسی قدر تذبذب کے ساتھ سبب تالیف یہ بتایا ہے۔

"مالک رام صاحب نے تعلیماتِ اسلام میں خصوصیت کے ساتھ اس موضوع کو کیوں پسند کیا اس کا علم تو مجھے نہیں لیکن ہو سکتا ہے کہ اس کا سبب یہ ہو کہ اس طرح "عورت" اور عورت کے ذکر سے ان کے ادبی ذوق کی بھی ایک حد تک تسکین ہوتی تھی۔"

لیکن یہ کوئی مناسب توجیہ نہیں ہے اس لیے جس انداز سے اس موضوع پر خامہ فرسائی کی گئی ہے اُس سے کسی بھی ادیب کے ادبی ذوق کی تسکین نہیں ہو سکتی۔ جب خالص مذہبی نقطہ نظر سے اس پر بحث کی گئی ہے اور ہر موقع پر آیات قرآنی اور احادیث نبوی کے حوالے دیے گئے ہیں تو یقین ہے کہ اس انداز کو دیکھ کر خود نیاز صاحب بھی اس کو مالک رام کے ادبی ذوق کی تسکین تو کیا اس کو اُن کی ادبی بدذوقی پر محمول کریں گے۔

اس سلسلہ میں ہمارے سامنے خود مالک رام کا بیان موجود ہے جو انہوں نے اپنی گرانقدر تصنیف "وہ صورتیں الٰہی" میں پیش کیا ہے وہ لکھتے ہیں "۱۹۳۲ء یا شاید ۱۹۳۳ء کی بات ہے میں نے مطالعے کے اثنا میں محسوس کیا کہ قرآن میں عورت کی زندگی سے متعلق بہت تفصیلی تعلیم دی گئی ہے لیکن کسی ایک مقام پر نہیں ہے بلکہ مختلف سورتوں میں منتشر حالت میں ملتی ہے۔ جی میں آئی کہ کیوں نہ اسے یکجا کر کے اس پر ایک مضمون لکھا جائے۔ میں نے نیاز صاحب کو اپنے اس ارادے کی اطلاع دی اور یہ بھی درخواست کی کہ اگر ہو سکے تو عنوانات مقرر کر دیجیے جن کی روشنی میں یہ مضمون مرتب کروں۔ انہوں نے جواب دیا کہ فہرست عنوان خود تیار کیجیے۔ اس سے چند مہینے پہلے رسالہ جامعہ (دہلی) میں کسی کا ایک مضمون اس موضوع پر شائع ہوا تھا۔ اُنہوں نے اسے دیکھنے کی بھی ہدایت کی۔ غرض میں نے عنوان مقرر کر کے اُن کی خدمت میں بھیج دیے۔ اُنہوں نے اُس سے اتفاق کیا۔ اور فرمایا کہ جب مضمون مکمل ہو جائے تو اُسے نگار میں اشاعت کے لیے بھیج دیجیے۔ "میں نے شروع سے یہ طے کر لیا کہ اساسی طور پر تمام مسائل کا استخراج قرآن سے کروں گا۔ اور حدیث محض نص کی تشریح اور توضیح کے لیے پیش کروں گا اور یہ بھی تاحد امکان بخاری اور مسلم سے، زیادہ سے زیادہ صحاح ستہ سے اتنی پابندی کے باوجود لکھنے بیٹھا تو بات سے بات پیدا ہونے لگی اور وہ جو خیال تھا کہ پورا مقالہ رسالے میں دو یا تین قسطوں میں چھپ جائیگا کسی طرح درست ہوتا نظر نہ آیا جب مضمون خلاف توقع لمبا ہونے لگا تو میں نے پھر لکھا یہ تو میرے اندازے سے بہت طویل ہو گیا ہے۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ "اس کی فکر نہ کریں۔ جو جی میں آئے اسے قلم بند کر ڈالیں۔ ترمیم بعد میں کر لیجیے گا۔ قصہ کوتاہ میں نے کوئی سو سوا سو صفحے میں اسے ختم کیا۔ اور مسودہ ان کی خدمت میں بھیج دیا۔ "نیاز صاحب نے پورا مضمون دیکھا اور اُسے واپس کرتے ہوئے لکھا کہ بعض مسائل پر مزید غور و خوض درکار ہے مثلاً مجھے یاد ہے کہ اُنہوں نے متعہ سے متعلق لکھا تھا کہ شیعی نقطۂ نگاہ معلوم کرنے کے لیے فلاں فلاں کتاب کا مطالعہ کرو"۔

نیاز صاحب کے پاس سے مسودہ واپس آنے کے بعد اُن کی اجازت لے کر مالک رام صاحب نے سید سلیمان ندوی صاحب کی خدمت میں بھیج دیا تاکہ ایک عالم دین کی نظر سے گذر جائے۔ سید صاحب نے مسودہ کو دیکھ کر مضمون کی نہ صرف بے تعریف کی بلکہ یہ تک لکھ دیا۔

"اگر مجھے یہ معلوم نہ ہوتا کہ مضمون کس کا لکھا ہوا ہے تو میں اُسے پڑھ کر یہی خیال کرتا کہ یہ کسی مسلمان عالم نے لکھا ہے"
سید صاحب نے بعض مسائل سے اختلاف تو کیا لیکن اُن اختلافات کی نشان دہی نہیں کی۔ اور لکھا کہ ملاقات کے وقت ان پر گفتگو ہو جائے گی۔

۱۹۳۹ء میں مالک رام صاحب حکومت کی طرف سے مصر چلے گئے۔ وہاں اُنہیں عربی زبان سے واقف ہونے کا بہتر موقع میسر آیا۔ اُدھر کتاب کا مسودہ بھی جو سید سلیمان ندوی صاحب کے پاس چھوڑ دیا گیا تھا ملک احمد حسن کے ذریعہ مصر پہنچ گیا۔ اور مصنف نے اُس پر مزید غور و خوض کیا۔ بعض حصے دوبارہ لکھے۔ ۱۹۴۵ء میں اس مضمون کا کچھ حصہ "عورت اور اسلام" کے عنوان سے نگار کے تین شماروں میں شائع ہوا۔ پھر ۱۹۵۱ء میں نیاز صاحب نے آخری باب کو چھوڑ کر پورا مضمون "عورت اور اسلامی تعلیم" کے عنوان سے اپنے تعارف کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کیا۔ یہی وہ تحفہ ہے جو مالک رام نے مسلمانوں کی خدمت میں پیش کیا ہے۔

تعارف اور عرض مولف کے بعد پوری کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ ان ابواب میں عورت کو مختلف حیثیتوں میں دکھایا گیا ہے۔

پہلا باب۔ اس میں عورت بیٹی کی حیثیت سے پیش ہوئی ہے۔ دوسرا باب۔ بیوی کے مسائل سے متعلق ہے۔ تیسرے باب میں ماں کی حیثیت بتائی گئی ہے۔ چوتھا باب۔ مطلقہ۔ بیوہ سے متعلق ہے اور پانچویں اور آخری باب میں ترکہ کی تقسیم کی گئی ہے جس میں عورت کے حصہ کا بھی تعین کیا گیا ہے۔

چونکہ عورت کی زندگی کا آغاز بیٹی کی حیثیت سے ہوتا ہے اس لیے بنیادی مسائل اسی مرحلہ کے ذیل میں بیان کئے گئے ہیں۔ اس باب کو چھ ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے دور جاہلیت کے معاشرہ میں عورت کی حیثیت کو واضح کیا گیا ہے تاکہ یہ بتایا جاسکے کہ اسلام نے عورت کو کس پستی سے اُٹھا کر کتنی بلندی پر پہنچایا۔ اسی سلسلہ میں یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ قرآن نے ہر جگہ اعمال صالحہ کے اجر میں عورت کو مرد کے برابر درجہ دیا ہے۔ پھر مسلمان عورت کی اندرون خانہ اور بیرون خانہ زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور حصول علم کو اُس کے لیے فرض بتایا گیا ہے۔ اس کی تائید میں یہ مشہور حدیث پیش کی گئی ہے:

"طالب العلم فریضة علیٰ کُلِّ مسلم و مسلمة
علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ ساتھ ہی ماں باپ کی تنبیہ کے لیے قرآن کی وہ آیت پیش کر دی گئی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ:

"یقیناً وہ لوگ سخت نقصان اُٹھانے والے ہیں جنھوں نے اپنی اولاد کو اپنی حماقت سے جاہل اور بے علم رکھ کر ہلاک کیا"۔
تعلیم کے لیے بھی یہ بتایا گیا ہے کہ وہ نافع ہونا چاہیے ورنہ وہ بھی موجب ہلاکت ہوگا۔ کہتے ہیں:

ایسی تعلیم دینا جو اولاد میں شرک اور توہمات کے خیالات پیدا کر دے اور جس سے اُن کے اعمال تباہ ہو جائیں یہ بھی اُن کے قتل سے کم نہیں۔" نیز "اگر کوئی شخص اپنی اولاد کو ایسی تعلیم دیتا ہے جو اُسے شرک گناہ اور فسق و فجور کی طرف لے جاتی ہے تو وہ گویا اس حکم کی تعمیل نہیں کرتا کہ اے مومنو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ ظاہر ہے کہ مشرکانہ اور پُر معصیت تعلیم دے کر وہ اُنہیں آگ کی طرف ڈھکیل رہا ہے۔" قرآن میں عورت کو اپنی زینت و آرائش کو چھپانے کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلا یبدین زینتھنّ الاّ ماظھر منھا

"اور اپنی زینت اور آرائش کی نمائش نہ کریں سوائے اس کے جو ضرورت یا مجبوری میں کھل جائے۔" اس پر گفتگو کرتے ہوئے مصنف موصوف کہتے ہیں:

"اس پر بہت بحث کی گئی ہے کہ "الاّ ماظھر منھا" (سوائے اس کے جو ضرورت سے یا مجبوری سے کھل جائے) میں جسم کے کون کون سے حصے شامل ہیں۔ قدما کی اکثریت کی رائے میں اس میں عورت کے ہاتھ اور چہرہ شامل ہیں۔ لیکن اس پر بحث تحصیل حاصل ہے۔ قرآن نے کوئی حد بندی نہیں کی۔ اور یہی اس کے حکیم ہونے کی دلیل ہے ..... پس دیکھنا یہ ہے کہ عورت اپنے آپ کو نمائش کے لیے ظاہر کر رہی ہے یا ضرورت سے اگر مقصود نمائش ہے تو ہاتھ اور چہرہ بھی ممنوعات کے حکم میں ہیں اگر واقعی ضرورت ہے تو پورا جسم دکھانے میں کوئی حرج نہیں۔" یہ حکم تو گھر کے اندر کے لیے ہے باہر جاتے وقت عورت کو جلباب استعمال کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کی وضاحت مالک رام صاحب ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"جلباب وہ چادر ہے جو عورتیں اپنے سارے لباس کے اوپر اوڑھتی ہیں اور "خمار" یعنی اوڑھنی سے بڑی ہوتی ہے جو صرف سر پر اوڑھنے کے کام آتی ہے۔ حکم دیا "یُدنین علیھنّ من جلابیبھنّ" (اپنی چادر اپنے اوپر ڈال لیا کریں) یہاں مِن تبعیض کا ہے جیسا کہ "بیضاوی" نے بھی لکھا ہے "یعنی وہ چادر کا کچھ حصہ اپنے منہ پر ڈال لیں یا لٹکا لیں" مراد یہ ہے کہ جب عورت گھر سے نکلے تو ضروری ہے کہ وہ اپنے جسم و لباس کی آرائش چھپانے کے لیے بڑی سی چادر اوڑھ لے۔ لیکن یہاں مزید ہدایت یہ کی کہ وہ اس کا کچھ حصہ اپنے اوپر ڈال لے۔ جس سے صاف مراد یہ ہے کہ وہ اپنے چہرہ کو پوشیدہ کر لے۔ یہی پردہ ہے۔"

دوسرے باب میں عورت کو بیوی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور چونکہ اس کے مسائل بہت زیادہ ہیں اس لیے یہ باب بھی سب سے طویل ہے اور اس میں چھتیس ذیلی عنوانات ہیں۔ جن میں خاص خاص نکاح کے مقاصد۔ محرکات نکاح۔ تعدد ازدواج اور اس کی شرائط۔ اعلان نکاح۔ مہر۔ بیوی کے حقوق، حسن معاشرت وغیرہ ہیں۔ طلاق اور خلع کو اس باب میں شامل نہیں کیا گیا بلکہ اس کے لیے ایک علیحدہ باب قائم کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ دونوں مسئلے بے حد نازک ہیں اور علماء کے درمیان ان میں خاصا اختلاف ہے۔

ان تمام مسائل سے متعلق مصنف موصوف نے نہایت تفصیل سے بحث کی ہے۔ پہلے احکام قرآنی بتائے ہیں پھر احادیث نبوی سے اُن پر روشنی ڈالی ہے اور پھر ان دونوں ماخذات پر غور و فکر کرنے کے بعد اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ یوں تو جملہ مسائل پر ہی مصنف نے نہایت جچی تلی رائے دی ہے لیکن دو مسئلوں سے متعلق پورے تدبر سے کام لیا ہے۔ (۱) مہر اور (۲) تعداد ازدواج مہر کے بارے میں لکھتے ہیں:

نکاح کے ساتھ سب سے پہلی جو چیز وابستہ ہے وہ مہر ہے۔ مہر وہ رقم یا چیز ہے جو مرد اپنی منکوحہ کو بلا کسی معاوضہ کے بطور ہدیہ دیتا ہے۔ فرمایا:

واتو النساء صَدُقٰتھنّ نِحلۃً

اور عورتوں کے مہر خوش دلی سے بلا کسی معاوضہ کے اُنھیں دے دو قرآن نے مہر کے لیے لفظ "نِحلۃً" استعمال کر کے اس کی حقیقت واضح کر دی ہے کہ یہ خاوند کی طرف سے بیوی کو تحفہ بے بدل ہے ..... لیکن یہ ضروری نہیں کہ مہر نقد روپیہ ہی کی صورت میں ہو۔ شارع علیہ السلام نے اس پر اصرار فرمایا ہے کہ مہر ضرور ہونا چاہیے تاکہ عورت کو اپنی اہمیت اور برتری کا احساس

ہو اور مرد کو بھی بیوی کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو..... مہر ایسی رقم نہیں کہ خاوند چاہے تو ادا کرے چاہے تو نہ کرے۔ جیسے بعض طبقوں میں بڑی بڑی رقمیں مہر میں مقرر کی جاتی ہیں۔ حالانکہ خاوند اور بیوی دونوں کے ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ رقم کبھی ادا نہیں کی جائے گی۔ یہ سراسر اسلام کی تعلیم کے خلاف ہے۔ حضرت رسول کریم صلعم نے فرمایا کہ اگر کوئی عورت سے نکاح کرے اور اُس نے نیت یہ رکھی ہو کہ وہ مقررہ مہر ادا نہیں کرے گا تو وہ گویا زانی ہے......... عدم ادائی کے گناہ سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ مہر کی رقم اتنی ہی مقرر ہو جسے خاوند آسانی سے ادا کر سکے۔ اسی لیے آپ نے حکم دیا کہ "لا تغالوفی الصور النساء" (مسند احمد بن حنبل) کہ تم اپنی بیویوں کے مہر زیادہ نہ مقرر کرو۔ "تعداد ازدواج پر تفصیلی بحث کرنے کے بعد مصنف نے آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ:

"لیکن "الّا تعدلو فواحدۃ" کہہ کر یہ بھی بتا دیا کہ اصولاً ایک ہی بیوی چاہیے۔ زیادہ کی اجازت محض ضرورت کی لیے ہے اور وہ بھی عدل کی شرط کے ساتھ۔ بہر حال بعض حالات میں تعداد ازدواج کی اجازت ہے۔ یہ حکم نہیں کہ اس کی تعمیل لازم ہو۔ دنیا کی کسی مذہبی کتاب نے بھی تعداد ازدواج کی ممانعت نہیں کی۔ اگرچہ اُن کے یہاں بھی ایک بیوی کی فضیلت کا بیان ہے۔ اس کے علاوہ اقوام عالم کے متعدد برگزیدہ اور محترم بزرگوں اور نبیوں نے ایک سے زیادہ شادیاں کر کے یہ ثابت کر دیا کہ تعداد ازدواج نہ قابل اعتراض ہے نہ روحانی ترقی کے منافی۔"

تیسرے باب میں عورت کی حیثیت ماں کی دکھائی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اسلامی معاشرہ میں ماں کا کیا مقام متعین کیا گیا ہے۔ ویسے تو ماں اور باپ دونوں ہی کی تعظیم و تکریم کا جو حکم قرآن کریم میں ہے اُس کے مطابق اُن کا درجہ اللہ کی عبادت کے بعد ہے چنانچہ مصنف نے اس سلسلہ میں وہ آیات پیش کر کے اولاد کو اللہ تعالیٰ کے اس حکم سے آگاہ کر دیا ہے۔

وَقَضیٰ رَبکَ الا تَعبُدوا ...

(ترجمہ) اور تیرے رب نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ اُس کے سوائے کسی دوسرے کی عبادت نہ کر اور والدین سے حسن سلوک اور احسان سے پیش آ۔ اگر ان دونوں میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے کبرسنی کو پہنچیں تو اُن سے کبھی اُف تک نہ کہہ اور نہ ہی اُن سے کبھی سختی سے پیش آ۔ بلکہ دونوں سے نرمی اور ادب سے گفتگو کر اور ان کے سامنے اپنے دل میں جذبات رحم لیے ہوئے عاجزی اور فرمانبرداری سے جھک جا اور دعا کر کہ اے میرے رب جیسے اُنہوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا اُسی طرح اُن پر رحم فرما۔" باری تعالیٰ کا یہ ارشاد دُہرا کر لائق مصنف نے کہا ہے۔

"والدین سے برتاؤ کے بعض اصول بیان کئے ہیں۔ سب سے پہلے حُسن و احسان کی تلقین کی ہے۔ چونکہ بڑھاپے میں انسان کے قویٰ کمزور ہو جاتے ہیں اس لیے وہ مخالفت پر جلد مشتعل ہو جاتا ہے۔ مزاج میں خود رائی پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لیے وہ سختی سے اور بھڑکتا ہے۔ فطرت انسانی کی تبدیلیوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ہدایت کی کہ والدین سے سختی سے پیش نہ آؤ۔ اُن کی خواہشات کا احترام کرو اور اُن کے کاموں کی مخالفت نہ کرو۔ ان پر کبھی اعتراض نہ کرو۔ بلکہ ان سے گفتگو میں بھی نرمی اور ادب ملحوظ رکھو۔ "لیکن قرآن نے والدہ کا حق خدمت زیادہ بتایا ہے کیونکہ بچے کے لیے باپ کی بہ نسبت وہ زیادہ مصیبت برداشت کرتی ہے اور اُس کی پرورش اور تربیت کا زیادہ بار بھی اُس کے کندھوں پر پڑتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آکر سوال کیا یا رسول اللہ! مجھے کس کے ساتھ حسن معاملہ اور محبت کرنا چاہیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا "ماں کے ساتھ" اُس نے پھر سوال کیا۔ پھر کون؟ فرمایا "ماں کے ساتھ" پوچھا پھر کون؟ "فرمایا ماں کے ساتھ" اُس کے بعد جب اُس نے پوچھا کہ

پھر کون؟ تو فرمایا "پھر تیرا باپ" لیکن اگر ماں باپ خلاف شرع کام کرنے کو کہیں تو اُس میں اُن کے حکم کی تعمیل نہ کرو۔ لیکن دنیا میں اُن (متفق علیہ) کی رفاقت کا حق عمدگی سے ادا کرو۔ یعنی باوجود یکہ مشرکانہ عقائد رکھتے ہیں اُن کی رفاقت کی نہ صرف تاکید کی بلکہ "سَبِیلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ" کہہ کر بتایا کہ والدین کی خدمت قرب الٰہی کے حصول میں معاون ہوتی ہے۔"

چوتھے باب میں طلاق کے مسائل اور مطلقہ بیوہ کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔ اسی سلسلہ میں خلع کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ مالک رام صاحب کہتے ہیں۔

"اس سے بظاہر یہ خیال پیدا ہوگا کہ اسلام میں طلاق بہت آسان چیز ہے اور شوہر پر کوئی پابندی ہی نہیں۔ وہ جب چاہے بیوی کو طلاق دیدے۔ ایسا خیال کرنا غلطی ہوگی۔ کیونکہ اسلام طلاق کو پسند نہیں کرتا۔ اُس کے نزدیک یہ آخری قدم ہے۔ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ خدا نے جتنی چیزیں انسانوں کے لیے حلال کی ہیں اُن میں طلاق اُسے سب سے زیادہ ناپسند ہے (ابوداؤد) ایک اور جگہ فرمایا کہ خدا نے دنیا میں کوئی ایسی چیز پیدا نہیں کی جو اُس کی نظر میں طلاق سے زیادہ ناپسند ہو۔ (دار قطنی)

پانچویں اور آخری باب میں وراثت کے احکام بیان کئے گئے ہیں۔ اس کی ابتدا اسلامی معیشت کی خوبی کے اعتراف سے ہوئی ہے۔ مالک رام صاحب کس قدر صاف گوئی اور قطعیت سے کام لیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"اسلام نے دولت کی تقسیم میں اعتدال قائم رکھنے کے لیے چند ایسے بنیادی اصول بنائے ہیں کہ اگر اُن پر عمل کیا جائے تو آج کل کا معاشری ہیجان بڑی حد تک خود بخود فرو ہو جائے۔ سب سے پہلے زکوٰۃ کا حکم دیا کہ امیر اپنی آمدنی پر نہیں بلکہ اپنے راس المال پر ایک خاص شرح سے ٹیکس دیں جو قومی بیت المال میں جمع ہو کر تمام رعایا کی ضرورتوں پر خرچ ہو۔ زکوٰۃ کے مقرر اور واجب ٹیکس کے علاوہ لوگوں کو صدقات دینے کا حکم دیا تاکہ مال امیروں کے پاس سے نکل کر غریبوں اور مستحقوں تک پہنچتا رہے۔ پھر سود لینے اور دینے کی مخالفت کی۔ دراصل بہت سی خرابیوں کی جڑ سود میں پنہاں ہے۔ سود لینے والا اور سود دینے والا دونوں آخرکار نقصان میں رہتے ہیں۔ چوتھا حکم وصیت سے متعلق دیا کہ آسودہ حال لوگ اپنی موت سے پہلے ایک تہائی جائداد تک وصیت کریں۔ اس مال سے رفاہ عامہ کے بیسوں کام چل سکتے ہیں۔ اور سب سے آخر میں وراثت کے احکام کچھ ایسے طریقے پر وضع کئے کہ اُن پر عمل کرنے سے سرمایہ چند ہاتھوں میں جمع نہیں رہ سکتا۔"

معیشت کے یہ بنیادی اصول بتانے کے بعد مصنف نے وصیت کے مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ پھر قرض، اصول وراثت اصول تقسیم اولاد اور والدین کے حصول میاں بیوی کے حصول اور کلالہ کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ اور آخر میں ایک اعتراض کا نہایت حکیمانہ انداز سے جواب دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک ایک اعتراض کا جواب بھی دے دیا جائے۔ بعض لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ جب اصولاً لڑکے اور لڑکی کو درجے میں ایک سطح پر رکھا تھا تو اُن کے حصے برابر کیوں نہ مقرر کئے۔ اس سے تو یہ ثابت ہوا کہ لڑکی کا درجہ لڑکے سے کم تر ہے۔

"یہ اعتراض قلت تدبیر کا نتیجہ ہے۔ حصے لڑکی اور لڑکے کی ضروریات کو مد نظر رکھ کر مقرر کئے گئے ہیں۔ عورت کا متکفل مرد ہے۔ مرد کا فرض ہے کہ وہ بیوی اور اولاد پر خرچ کرے۔ اس کے مقابلے میں عورت چاہے تو اپنی ذاتی ضروریات پر بھی خرچ نہ کرے۔ پس مرد کا حصہ زیادہ اس لیے رکھا کہ اس کی ذمہ داری زیادہ ہے اور عورت کا حصہ کم اس لیے رکھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ اپنی

ذات کے علاوہ کسی اور پر خرچ کرنے پر مجبور نہیں۔"

یہ نکتہ سمجھانے کے بعد مالک رام صاحب اپنی کتاب کو قرآن کریم کا یہ ارشاد سنا کر ختم کر دیتے ہیں:

تلک حدود اللہ "یاد رکھو یہ اللہ کی قائم کردہ حدیں ہیں۔ پس جو اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرے گا، اللہ اُسے جنت کے باغوں میں داخل کرے گا۔ جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں اور وہ ہمیشہ وہاں رہیں گے اور یہ کتنی بڑی کامیابی ہے اور جو اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اللہ کی قائم کردہ حدوں کو توڑے گا اُسے نار جہنم میں ڈالا جائے گا وہ ہمیشہ رسوا کن عذاب سہے گا۔"

یہ محض چند جھلکیاں ہیں جو اس تصنیف لطیف کی دکھا دی گئی ہیں پوری طرح استفادہ کرنے کے لیے تو ضروری ہے کہ کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے۔ تاہم اتنی بات ان چند جھلکیوں سے بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ مالک رام صاحب نہ صرف اُردو کے ایک اچھے ادیب اور غالب و کلام غالب کے شیدائی تھے بلکہ اُن کا دین اسلام کا مطالعہ کافی وسیع تھا۔ قرآن کریم اور احادیث نبوی کو اُنھوں نے گہرائی میں اُتر کر سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ اور وہ دین کے معاملات سے سرسری طور پر گذرنے کے عادی نہیں تھے بلکہ اس میں پورے تفکر و تدبر سے کام لیتے تھے۔ یہ کتنی بڑی سعادت ہے جو من جانب اللہ اُن کو عطا ہوئی تھی۔ ذٰلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

قومی زبان (۵۷) اپریل ۱۹۹۴ء

مالک رام جیسے وضع دار اب پیدا نہیں ہوں گے

مرزا ادیب

کراچی سے میرے محترم اور عزیز دوست مشفق خواجہ کا خط آیا ہے جسے پڑھ کر دل کو ایک دھچکا سا لگا ہے۔ ان لمحوں میں یہ خط میرے سامنے پڑا ہے۔ خواجہ صاحب نے اپنے اس خط میں جو خبر دی ہے اگر وہ آپ تک پہنچی نہیں ہے تو اب پہنچ جائے گی۔ خواجہ صاحب نے لکھا ہے۔

اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر شائع ہوئی ہے کہ مالک رام کا انتقال ہو گیا ہے یہ اردو دنیا کے لیے ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔ ایسے کام کرنے والے اور ایسے وضع دار اب پیدا نہیں ہوں گے۔

خواجہ صاحب نے بالکل درست کہا ہے کہ یہ واقعہ ارتحال اردو دنیا کے لیے ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔ واقعی ایسے وضع دار لوگ اب پیدا نہیں ہوں گے۔

مالک رام اردو ادب کی ان چند شخصیتوں میں شامل تھے جن کا نہ صرف پاک و ہند میں بلکہ برصغیر کے حدود کے باہر بھی احترام کیا جاتا ہے احترام کرنے والے صرف مالک رام کا احترام کرتے ہیں انھیں اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ ان کے مذہبی عقاید کیا ہیں...... رہتے کہاں ہیں...... کن حالات میں اپنی زندگی کے شب و روز بسر کر رہے ہیں ان کے لیے فقط یہ جاننا کافی ہے کہ یہ مالک رام ہیں۔ مالک رام ماہر غالبیات، ایک درجن سے زیادہ نہایت وقیع کتابوں کے مصنف، اعلیٰ درجے کے محقق، اپنے خیالات و معتقدات کے اعتبار سے وسیع قلب و نظر کے مالک، درویش صفت، مرنجاں مرنج، ہر ایک سے محبت کرنے والے، ہر ایک پر شفقت کرنے والے۔

میں سمجھتا ہوں ایک بڑی شخصیت یونہی پیدا نہیں ہو جاتی، اس کے پیچھے ایک عظیم تہذیب کارفرما ہوتی ہے جو اپنا حسن، اپنا جمال و جلال، اپنی عظمتیں، اپنے انسانی فضائل اس شخصیت کی تشکیل میں صرف کر دیتی ہے۔ اگر کہیں ایسے انسان نظر آ جائیں تو سمجھ لیں کہ یہ اسی تہذیب کے پروردہ ہیں۔

پروفیسر رشید صدیقی نے ایک مقام پر فرمایا ہے کہ اردو، غالب اور تاج محل ان تینوں کو مغلیہ تہذیب نے پیدا کیا ہے اگر ایسا ہے اور یقیناً ایسا ہے تو بلا جھجک کہہ سکتا ہوں کہ مالک رام جیسی شخصیتوں کو اس تہذیب نے وجود بخشا ہے جسے ہم اردو

تہذیب کہہ سکتے ہیں۔

اردو تہذیب کو صحیح معنوں میں سمجھنے والے مولانا صلاح الدین احمد تھے جو خود بھی اسی تہذیب کی زندہ علامت تھے۔

مالک رام کے بارے میں میری معلومات فقط چند بنیادی باتوں تک محدود ہیں۔ مثلاً یہ کہ ۲۲ دسمبر ۱۹۰۶ء کو دنیا میں آئے تھے۔ زندگی کا ایک اہم حصہ مصر کے دارالحکومت قاہرہ میں بہ سلسلہ ملازمت گزارا جہاں عربی زبان اور عربی ادب کا گہرا مطالعہ کیا۔ اس گہرے مطالعے کے وسیع اثرات ان کے بعد کی تصانیف میں در آتے ہیں۔

مالک رام کا ذہن، مالک رام کا قلم ساری زندگی متحرک رہا ہے، ان میں نمایاں ترین حیثیت بطور ماہر غالبیات کے ہوتی ہے۔ ادھر توجہ کریں تو کئی کتابیں سامنے آجاتی ہیں۔

(۱) فسانۂ غالب (۲) ذکرِ غالب (۳) گفتارِ غالب (۴) تلامذۂ غالب۔ غالب کے متعلق مالک رام نے متعدد مقالات بھی تحریر کیے ہیں جو ابھی کسی کتاب میں شامل نہیں۔

غالب پر کام کرنے والے ان کی غالب سے متعلق تحقیقی کاوشوں سے بے نیاز نہیں ہوسکتے۔

ان کی ایک کتاب کا نام اسلامیات ہے۔ ایک اور تصنیف کا نام اسلام اور عورت ہے۔

مالک رام نے علم و ادب کے جن شعبوں میں اپنی تخلیقی ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔ ان میں سے ترتیب و تدوین کو بھی ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے مجموعۂ خطوط "غبار خاطر" کو ازسر نو ترتیب دیا ہے اور ان تمام اشارات کی توضیح کردی ہے جو دوران مطالعہ قاری کے سامنے آتے ہیں۔

غالب کی سبد چین اور اردو دیوان غالب مرتب کیا ہے۔ مہیش پرشاد کے خطوط غالب کو بھی نئے سرے سے ترتیب دیا۔

ان کا ایک بڑا اہم کام "تذکرۂ معاصرین" ہے۔ اس تذکرے کی غالباً پانچ جلدیں چھپ چکی ہیں۔ یہ ختم ہونے والا کام نہیں ہے۔ کیونکہ مالک رام ان اہل قلم کے احوال و کوائف فراہم کرنا چاہتے تھے جو ان کے عہد میں دنیا سے چلے گئے ہیں۔

مالک رام ایک بڑی شخصیت تھے ان پر جتنا کام بھی کیا جائے وہ کم سمجھا جائے گا۔ اب تک جو کام اس ضمن میں ہوا ہے اس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

اردو کے نامور شاعر علی جواد زیدی نے ایک کتاب ترتیب دی ہے جس کا نام ہے "مالک رام ...... ایک مطالعہ" اس میں مالک رام کے شخصی پہلوؤں اور ان کے کارناموں کا احاطہ کیا گیا ہے۔

غالب اکیڈمی نئی دہلی نے ۱۹ اگست ۱۹۸۷ء کو مالک رام کمیٹی کے زیرِ اہتمام مالک رام کل ہند سیمینار منعقد کیا تھا۔

اس کمیٹی نے جسے غالب اکیڈمی نے تشکیل دیا تھا ایک کتاب بھی "مالک نامہ" کے عنوان سے چھاپی تھی۔

مالک رام صرف ایک اسکالر، ایک محقق، ایک ادبی مورخ نہیں تھے۔ اپنے وجود میں ایک زندہ عہد تھے۔ ایک زندہ تہذیب، ایک زندہ تاریخ تھے۔

ان کے چلے جانے سے ہر اس شخص کو دکھ ہوگا جسے اردو سے محبت ہے، جو اس تہذیب سے محبت کرتا ہے۔

ذکرِ مالک رام

پروفیسر محمد اسلم

محبِ مکرم ڈاکٹر مختار الدین احمد کے مکتوبِ والا سے یہ رنج افزا خبر ملی کہ ۱۵-۱۶ اپریل ۱۹۹۳ء کی درمیانی شب صبح تین بجے دہلی کے ایک ہسپتال میں اُردو کے منفرد ادیب، ماہرِ غالبیات اور علومِ اسلامیہ کے فاضل جناب مالک رام کا انتقال ہو گیا۔ کل من علیہا فان و یبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔ موصوف کا تعلق مسلمانوں کے علوم و فنون اور عظیم روایات سے فیضیاب ہونے والے ہندوؤں کی آخری نسل سے تھا۔ اب تو ہندوؤں کی فرقہ پرست سیاسی جماعتوں نے ہندوؤں میں مسلمانوں کے خلاف اتنا زہر پھیلا دیا ہے کہ شاید ہی کوئی ہندو مسلمانوں سے اتنا قریب آئے کہ وہ ان کے علوم و فنون سے فیضیاب ہو اور ان کی عظیم روایات اپنائے۔

۱۹۷۴ء میں موسم گرما کی تعطیلات میں راقم الحروف دہلی گیا۔ ان دنوں میرے خسرِ محترم مولانا سعید احمد اکبر آبادی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ریٹائر ہونے کے بعد "ہمدرد" کے زیر اہتمام چلنے والے ادارے انڈین انسٹیٹیوٹ آف میڈیسن اینڈ میڈیکل ریسرچ تغلق آباد دہلی سے منسلک ہو چکے تھے۔ میں ایک ماہ تغلق آباد میں ان کے ساتھ رہا۔ ایک روز مولانا فرمانے لگے کہ کلکتہ سے مشہور اسکالر پروفیسر محمد زبیر دہلی آئے ہوئے ہیں اور شام کو وہ غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین میں ایک مقالہ پیش کریں گے۔ تغلق آباد سے ایک بس خاص طور پر وہاں جائے گی اس لیے میں بھی ان کے ساتھ وہاں جانے کے لیے تیار ہوں۔

نمازِ عصر سے قریب ہم غالب اکیڈمی پہنچے۔ اس وقت سامعین اکیڈمی کے آڈیٹوریم میں جمع ہو رہے تھے۔ ان میں حکیم عبدالحمید دہلوی، مفتی عتیق الرحمن عثمانی، قاضی سجاد حسین کرتپوری، مفتی ضیاء الحق دہلوی اور حکیم عبدالوہاب ظہوری کے علاوہ دہلی یونیورسٹی کے بہت سے اساتذہ موجود تھے۔ ان سامعین میں مالک رام صاحب بھی شامل تھے۔ میں اس سے پہلے ان سے نہیں ملا تھا حالانکہ ماہنامہ برہان دہلی میں میرے مضامین دیکھ کر اور مولانا اکبر آبادی کے سفرناموں میں میرا ذکر پڑھ کر وہ مجھے خوب جانتے تھے۔ مولانا نے میرا ان سے تعارف کرایا تو وہ بڑی گرمجوشی کے ساتھ ملے اور اپنے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے کے لیے کہا۔

تھوڑی دیر بعد جلسے کی کارروائی کا باقاعدہ آغاز ہوا اور مہمان مقرر اسٹیج پر تشریف لائے۔ ان کی عمر اس وقت میرے اندازے کے مطابق اسی برس سے بھی کیا کم ہو گی۔ وہ انگریزی زبان میں ایک طویل مقالہ لکھ کر لائے تھے جس کا عنوان "اسلام میں عورت کا مقام" تھا۔ یہ مالک رام صاحب کا خاص موضوع تھا اور وہ اس موضوع پر ایک کتاب بھی لکھ چکے تھے۔ مہمان مقرر نے بڑھاپے اور نقاہت کے باوجود کھڑے ہو کر مقالہ پڑھنا شروع کیا۔ ضعفِ بصارت کی بنا پر وہ تھوڑی دیر کے لیے رک جاتے اور لفظ کو غور سے

دیکھنے کے بعد پڑھتے۔ مقالہ بڑا طویل تھا اور سامعین بور ہو رہے تھے۔ اندازاً نصف گھنٹے کے بعد مہمان مقرر نے سامعین سے کہا کہ اگر وہ اجازت دیں تو وہ بقیہ مقالہ بیٹھ کر سنا دیں۔ اس پر مالک رام صاحب نے قدرے اونچی آواز میں، جو ظاہر ہے کہ مہمان مقرر تک نہیں پہنچی ہوگی فرمایا کہ ویسے ہی بیٹھ جائیں اور پانی بھی پئیں۔ مالک رام صاحب کے قریب بیٹھے ہوئے حضرات ان کے اس جملے سے بہت محظوظ ہوئے۔ میں نے پنجابی زبان میں ان سے کچھ کہا تو وہ بہت حیران ہوئے کہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی جیسے نستعلیق قسم کے بزرگ کا خویش پنجابی زبان میں بات کر رہا ہے۔ میں نے ان کی حیرانی دور کرنے کی غرض سے کہا کہ پنجاب کا رہنے والا ہوں۔ مولانا صاحب سے یہ رشتہ ان کی ذاتی محبت کی وجہ سے قائم ہوا تھا۔ لیکچر کے اختتام پر سامعین نچلی منزل میں چائے پینے کے لیے گئے تو مالک رام صاحب اپنے احباب سے گھل مل گئے۔

ان دنوں ان کی عمر ۶۴ برس تھی اور ان کے چہرے پر سرخی دوڑ رہی تھی۔ وہ اس روز بوشرٹ اور پتلون پہنے ہوئے تھے۔ اپنے لباس اور چہرے مُہرے سے وہ حاضرین میں بڑے نمایاں نظر آ رہے تھے۔ ان کی شکل و شباہت سے کوئی انہیں ہندو باور نہیں کر سکتا تھا۔ یوں بھی وہ عقیدے کے اعتبار سے بہت سے "مسلمانوں" سے زیادہ موحد تھے اور وہ غالب کی زبان میں فخریہ انداز میں یہ کہہ سکتے تھے:

گویا جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں

مالک رام صاحب سے یاد آیا کہ جن دنوں راقم بریڈفورڈ میں مقیم تھا ہمارے ہی مکان میں دھرم کمار وہرہ نام کے لاہور کے ایک ہندو بھی رہتے تھے۔ وہ خواص و عوام میں وہرہ صاحب کے نام سے جانے پہچانے جاتے تھے اور راقم کے علاوہ اس گھر میں رہنے والے بیشتر افراد ایک طویل مدت تک انہیں مسلمان ہی سمجھتے رہے۔ ان کا رہن سہن کھانا پینا اور بول چال بالکل مسلمانوں جیسی تھی۔ وہ بوقتِ ضرورت قسم بھی اللہ پاک اور قرآن شریف کی کھایا کرتے تھے۔ جب ایک مدت کے بعد لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ وہرہ صاحب مسلمان نہیں ہیں تو ایک روز کسی نے ان سے پوچھا کہ غیر مسلم ہو کر وہ اللہ پاک اور قرآن شریف کی قسم کیوں کھاتے ہیں؟ انہوں نے جواب میں کہا کہ مسلمان چونکہ بھگوان اور گیتا کو نہیں مانتے اس لیے اگر وہ ان کی قسم کھائیں تو مسلمانوں کو ان کی بات کا یقین نہیں آئے گا۔ اس لیے وہ مسلمانوں کو اپنی بات کا یقین دلانے کے لیے اللہ پاک اور قرآن شریف کی قسم کھاتے ہیں کیونکہ مسلمانوں کا ان پر ایمان ہے۔

وہرہ صاحب کے پہچانے جانے کا واقعہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ ایک بار وہ کینٹین میں بیٹھے ناشتے میں کوئی ایسی چیز کھا رہے تھے جو مسلمان نہیں کھاتے۔ ایک مسلمان نوجوان کو انہیں وہ چیز کھاتے دیکھ کر بڑا اچنبھا ہوا اور اس نے ان سے کہا کہ وہرہ صاحب یہ تو ہمارے ہاں حلال نہیں ہے۔ انہوں نے کہا "آپ کے ہاں حلال نہ ہوگی"۔ اس پر اس نوجوان نے کہا کہ "آپ" سے کیا مراد ہے۔ کیا آپ مسلمان نہیں ہیں؟ انہوں نے کہا کہ نہیں۔ اس پر اس نوجوان نے کہا لیکن ہم تو اب تک آپ کو مسلمان ہی سمجھتے رہے ہیں۔ اس پر وہرہ صاحب نے کہا کہ یہ تو ان کی مہربانی ہے۔

ایک بار مالک رام صاحب کسی کانفرنس میں شرکت کے لیے کابل گئے ہوئے تھے۔ وہاں دو تین مسلمانوں نے ان سے کہا کہ کہیں وہ درپردہ مسلمان تو نہیں ہو گئے؟ انہوں نے فوراً جواب دیا کہ اگر وہ مسلمان ہو جائیں تو انہیں اس پر کیا اعتراض ہے۔

مالک رام صاحب کے گھر میں آیت الکرسی اور قرآنی آیات کے قطعات آویزاں تھے۔ جناب خالد شمس الحسن نے ایک وڈیو کیسٹ تیار کی ہے جس میں ان قطعات کی بھی عکاسی کی ہے۔ ان کے ڈرائنگ روم کا ماحول خالصتاً اسلامی تھا اور اس میں ہندو

معاشرے کی کوئی معمولی سی بھی جھلک دکھائی نہیں دیتی تھی۔ جو مسلمان انہیں ملنے آتے تھے ان کے لیے جانماز بھی رکھی ہوئی تھی۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے۔ ان کا معاملہ خدائے عظیم و خبیر کے ساتھ ہے۔ قرآن حکیم کی سورۃ الفتح کی پچیسویں آیت میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں موجود ہیں جنہیں تم نہیں جانتے یعنی ان کے ایمان کا صرف خدا کو علم ہے۔ شاید مالک رام بھی اسی زمرے میں شامل ہوں۔

ایک بار موسم گرما کی تعطیلات میں راقم تغلق آباد دہلی میں تھا۔ وہاں "ہمدرد" کے کئی علمی اور تحقیقی ادارے تھے۔ اب تو وہاں باقاعدہ ہمدرد یونیورسٹی بن گئی ہے۔ بستی حضرت نظام الدین میں غالب اکیڈیمی بھی "ہمدرد" ہی کے زیر انتظام چل رہی ہے۔ حکیم عبدالحمید دہلوی ان تمام اداروں کے روح رواں ہیں۔ راقم نے مانچسٹر یونیورسٹی میں قیام (۱۹۶۲ء - ۱۹۶۰ء) کے دوران حضرت مجدد الف ثانی پر ایک تحقیقی مقالہ لکھا تھا جس کا ایک حصہ اُردو میں ترجمہ ہو کر "دین الٰہی اور اس کا پس منظر" کے عنوان سے ۱۹۶۹ء میں ندوۃ المصنفین دہلی سے چھپ گیا تھا۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کی یہ رائے ٹھہری کہ حضرت مجدد الف ثانی پر میری ایک تقریر کرائی جائے۔ انہوں نے حکیم عبدالحمید دہلوی سے ذکر کیا تو انہوں نے غالب اکیڈیمی میں اس تقریر کا انتظام کر کے اخبارات میں اطلاع شائع کرادی۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان مرحوم کو اس جلسے کی صدارت کے لیے بلایا گیا۔

اس روز سامعین میں حکیم عبدالحمید دہلوی، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، قاضی سجاد حسین کرتپوری، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، حکیم عبدالوہاب طوری، مفتی ضیاء الحق دہلوی، عبدالحق فاروقی نبیرہ مولانا عبدالشکور لکھنوی اور مالک رام صاحب بھی شامل تھے۔ بھارت کے ماحول کے مطابق یہ بڑا اختلافی موضوع تھا۔ ہم حضرت مجدد الف ثانی کو دو قومی نظریے کا بانی مانتے ہیں جو ہندوؤں کے ساتھ کسی بھی قیمت پر اشتراک و تعاون کے قائل نہیں تھے اور بھارت کے نام نہاد "سیکولر" ماحول میں ان کے لیے جگہ بنانی بڑی مشکل تھی۔ اس لیے میں نے اپنی تقریر کے آغاز میں ہی یہ کہہ دیا کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان واہگہ اور اٹاری کے مابین سرحد پر زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا (S,LAND NO MAN) کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں سفید دھاری دونوں ملکوں کی سرحد متعین کرتی ہے۔ اس سفید دھاری کے آر پار نظریات کا اتنا فرق ہے کہ جغرافیے کے ساتھ تاریخ بھی بدل جاتی ہے۔ جن لوگوں کو اس سفید دھاری کے ایک جانب ہیرو مانا جاتا ہے دوسری جانب وہ "وِلن" سمجھے جاتے ہیں۔ اس لیے سامعین یہی سمجھیں کہ میں غالب اکیڈیمی کی بجائے پاکستان کی حدود میں کھڑا ہو کر بات کر رہا ہوں اور انہیں یہ بتا رہا ہوں کہ ہم پاکستانی مجدد الف ثانی کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔

میری تقریر ایک گھنٹے تک جاری رہی۔ اس کے بعد صدر محترم نے خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا۔ جلسے کے اختتام پر سامعین چائے کے لیے نچلی منزل میں تشریف لے گئے۔ یہاں مولانا اکبر آبادی نے بہت سے افراد کے ساتھ میرا تعارف کرایا۔ مالک رام بھی چائے کی پیالی تھامے ہوئے میرے قریب تشریف لائے اور دل کھول کر میری تقریر کی داد دی۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی اپنے علاج کے سلسلے میں کراچی آئے ہوئے تھے کہ یہیں ۲۴ مئی ۱۹۸۵ء کو نماز مغرب سے چند منٹ قبل ان کا انتقال ہو گیا۔ اگلے روز صبح کے بلیٹن میں آل انڈیا ریڈیو سے ان کی وفات کی خبر نشر ہوئی تو مالک رام صاحب نے راقم کے نام فوراً ایک تعزیتی خط لکھا جس کے آخر میں یہ تحریر تھا۔ "میری یہ دعا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ انہیں اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔ انہوں نے نقوش کے شخصیات نمبر میں نواب سراج الدین احمد خان سائل کی وفات کا ذکر کرتے

ہوئے لکھا تھا۔ "اللہ کریم انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور اعلیٰ علیین میں جگہ دے"۔

اگلے روز میں نے پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے کے طلبہ سے کہا کہ وہ مجھے اعلیٰ علیین لکھ کر دکھائیں تو پوری کلاس میں سے ایک بھی طالب علم صحیح جواب نہ دے سکا۔ اس پر میں نے انہیں کہا کہ دیکھیے ایک "ہندو" نے میرے نام ایک خط میں یہ الفاظ لکھے ہیں۔ مولانا اکبر آبادی سے عزیزداری کی وجہ سے وہ مجھے اپنا عزیز سمجھتے تھے اور راقم کے نام خطوط میں ہمیشہ دعائیہ کلمات لکھا کرتے تھے۔

راقم کے ایک دوست عبدالوہاب خان سلیم ان دنوں نیویارک میں مقیم ہیں۔ جن دنوں وہ لاہور میں مقیم تھے ان کی بہت سے اہل علم کے ساتھ خط و کتابت رہتی تھی۔ سلیم صاحب نے مجھے ایک خط دکھایا جس میں یہ مرقوم تھا "میں انشاء ۲۵ مارچ کو کراچی سے چلوں گا اور لاہور میں تین روز قیام کے بعد انشاء اسلام آباد روانہ ہوں گا۔" میں نے سلیم صاحب سے پوچھا کہ یہ انشاء کیا ہے؟ انہوں نے جواب میں کہا کہ یہ خط ترقی پسند ادیبوں کے ایک باوا آدم نے انہیں لکھا ہے۔ وہ چونکہ اللہ پر ایمان نہیں رکھتا، اس لیے وہ انشاء اللہ کی بجائے صرف انشاء لکھنے پر اکتفا کرتا ہے۔ اب میں اس ترقی پسند ادیب کی تحریر کا موازنہ جناب مالک رام کی تحریر سے کرتا ہوں تو اس نام نہاد مسلمان کے مقابلے میں مالک رام مجھے مُومنِ کامل نظر آتے ہیں۔

مالک رام صاحب کی یہ بڑی خواہش تھی کہ ان کی نعش ہندوؤں کے طریقے کے مطابق جلانے کی بجائے مسلمانوں کے شعار کے مطابق بستی حضرت نظام الدین میں دفن کی جائے اور اگر وہاں کسی وجہ سے قبر کے لیے جگہ نہ مل سکے تو پھر جامعہ ملیہ دہلی کے قبرستان میں سپرد خاک کی جائے۔ انہوں نے اپنی وفات سے دو تین روز قبل اپنے اہل خانہ سے کہا کہ وہ دہلی کے فلاں فلاں مسلمان کو بلا لائیں۔ شاید وہ ان کے سامنے اپنی اسی وصیت کا اظہار کرنا چاہتے تھے لیکن اہل خانہ نے ان کی یہ خواہش پوری نہ ہونے دی۔ ان کا یہ خیال ہوگا کہ کہیں ان مسلمان عمائدین کے سامنے وہ اسلام لانے کا اظہار نہ کردیں اور پھر تدفین کے بارے میں وصیت کر جائیں۔ اگر ایسا ہو جاتا تو ان کے لواحقین اپنے ہندو رشتہ داروں کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے۔ چنانچہ مالک رام صاحب کی خواہش کے برعکس ان کی نعش نئی دہلی کے برقی قوت سے چلنے والے شمشان میں سپرد آتش کی گئی۔

ایک دن میری اہلیہ مجھ سے کہنے لگیں کہ دیکھیے مالک رام ہندو ہونے کے باوجود مسلمانوں کے طریقے کے مطابق دفن ہونے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں اور بھارت کے نام نہاد مسلمان عصمت چغتائی جسٹس ہدایت اللہ اور محمد کریم چھاگلہ ہندوؤں کے شعار کے مطابق نعش جلائے جانے کی وصیت کرتے ہیں۔

دراصل میرے اور مالک رام صاحب کے درمیان وجہ اشتراک "وفیاتِ الاعیان" کا ذوق تھا۔ میں پاکستان میں فوت ہونے والے مشاہیر کا باقاعدہ ریکارڈ رکھتا ہوں اور وہ پاکستان اور بھارت میں فوت ہونے والے اہل علم و دانش کے بارے میں معلومات جمع کرتے تھے۔ وہ ہر سال کے اختتام پر "تذکرہ معاصرین" کے عنوان سے ایک کتاب شائع کرتے جس میں گذشتہ سال مرنے والوں کے مکمل کوائف شامل ہوتے تھے۔

ادھر میں نے "الواح الصنادید" کے عنوان سے ماہنامہ برہان دہلی میں مضامین کا ایک طویل سلسلہ شروع کیا جس میں مختلف قبرستانوں میں مدفون مشاہیر کی قبروں کے کتبے نقل کر کے چھاپنے شروع کیے۔ میرے ان مضامین سے انہوں نے خوب استفادہ کیا اور اپنی تصنیف تذکرہ ماہ و سال میں ان مضامین کے جابجا حوالے دیے۔

مالک رام صاحب کو اُردو زبان و ادب کا چسکا نواب سراج الدین احمد خاں سائل کی صحبت میں پڑا تھا۔ انہوں نے نقوش کے

قومی زبان (۶۴) اپریل ۱۹۹۴ء

شخصیات نمبر میں نواب صاحب کی شخصیت پر ایک بڑا عمدہ مضمون لکھا جس میں ان کی رفیقہ حیات لاڈلی کا بھی ذکر تھا۔ لاڈلی بیگم استاد داغ دہلوی کی سالی اولیاء بیگم کی نواسی تھی جسے داغ نے گود لے لیا تھا۔ سائل کے مکان کے باہر ایک تختی نصب تھی جس پر "مکان لاڈلی بیگم" لکھا تھا۔ جب میں نے لاہور میں لاڈلی کی قبر تلاش کی اور ان کی لوح مزار کی عبارت ماہنامہ برہان دہلی میں شائع کرائی تو مالک رام صاحب کو اس سے بڑی خوشی ہوئی جیسے انہیں کوئی گمشدہ خزانہ مل گیا ہو۔

راقم نے پاکستان میں پہلے چالیس برسوں میں فوت ہونے والے ۲۰۰۷ مشاہیر کا تذکرہ "وفیات مشاہیر پاکستان" کے عنوان سے شائع کیا۔ اس کے بعد ۶۰۰ مرحومین کا تذکرہ "وفیات اعیان پاکستان" کے نام سے شائع کیا۔ ان دونوں کے نسخے مالک رام صاحب کو بھجوائے۔ انہوں نے اپنے مکتوب مرغوب میں میرا شکریہ ادا کیا اور پھر آخری تصنیف تذکرہ ماہ و سال میں ان کے جابجا حوالے دیے۔ جب ان کی یہ کتاب چھپی تو انہوں نے اپنے دستخطوں کے ساتھ ایک نسخہ مجھے بھیجا۔

میں نے اپنی تصنیف "خفتگانِ کراچی" ان کی خدمت میں بھجوائی تو انہوں نے اس موضوع پر کتاب دیکھ کر بڑی تحسین فرمائی۔ افسوس کہ وہ میری تصنیف خفتگانِ خاک لاہور کی اشاعت سے چند روز پہلے وہاں پہنچ گئے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ ان کی روح یہ شعر ضرور پڑھتی ہوگی:

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

"وہ ایک ادیب ہی نہیں بلکہ انسانیت کے پرستار تھے۔ انہوں نے اسلام سمیت تمام مذاہب کا مطالعہ کیا تھا جس نے ان کی فکر و نظر میں وسعت اور ایک ایسا توازن پیدا کر دیا تھا کہ وہ سچے معنوں میں سیکولر نظریہ کی مثال بن گئے تھے۔ تنگ نظری تعصب اور اختلافات سے بے نیاز مالک رام ہر طالب حق کو مخلصانہ مشورے دینے میں کوئی پس و پیش نہ کرتے تھے"۔

(ڈاکٹر خلیق انجم)

"مالک رام کی وراثت محض چند کتابیں ہی نہیں بلکہ وہ معیار اور مزاج بھی ہے جو انہوں نے اپنی بے پناہ کاوش اور تحقیق سے اردو تحقیق کو عطا کیا۔ اردو تحقیق کو ایک نئے اسلوب اور آہنگ سے آشنا کرنے کا سہرا مالک رام کے سر ہے۔"

(پروفیسر محمد حسن)

"انہوں نے تذکرہ نویسی میں نئی روح پھونکی۔ غیر ضروری الفاظ سے گریز اُن کی تحریر و تحقیق کا خاصہ ہے۔ انہوں نے تحقیق کو تصنیف کے ہم پلہ بنایا۔"

(ڈاکٹر گوپی چند نارنگ)

خوشبوؤں میں بسی کچھ یادیں۔ مالک رام سے منسوب

یوسف ناظم

ان کی زندگی میں کئی مرتبہ جی چاہا کہ ان کے بارے میں کچھ لکھوں لیکن شاید ان کا رُعب تھا جو مجھ پر طاری رہا اور مجھے خوف زدہ کرتا رہا کہ کہیں میرا ضیر تربیت یافتہ اشہبِ قلم (جسے اسپ خامہ بھی کہا جاتا ہے) احترام کی وہ دیوار نہ پھاند جائے جو ان کی محبت اور بے تکلفانہ رویے کے باوصف درمیان میں موجود تھی۔ یہ دیوار میں نے خود اُٹھائی تھی اپنے سائے کے لیے۔ وہ میرے محترم تھے اس لیے نہیں کہ وہ سب کے محترم تھے بلکہ اس لیے کہ جانے کیوں مجھے یقین سا ہو گیا تھا کہ میں انھیں ناپسند نہیں ہوں۔ میں مالک رام صاحب کا ذکر کر رہا ہوں مالک رام صاحب جس قبیل کے لوگوں میں شامل تھے اُن میں کچھ تو خداداد وصف ہوتا ہے اور کچھ اُن کا رکھ رکھاؤ ہوتا ہے۔ کہ وہ پہلی ہی ملاقات میں اپنے ملنے والوں کے دل میں جاگزیں ہو جاتے ہیں۔ دل تک پہنچنے کے لیے وہ کس روٹ کا انتخاب کرتے ہیں پتہ ہی نہیں چلتا۔ چپکے سے دل کے اندر داخل ہو جانا اس قبیل کے لوگوں کا وتیرہ تھا اور مالک رام اسی وتیرے کے مالک تھے گفتگو شروع کرنے سے پہلے ہی "اپنائیت" کے حصار میں مخاطب کو رام کر لینا اُن کے نزدیک کوئی بات ہی نہیں تھی اور اس کے بعد گفتگو سے تو اپنائیت کا یہ حصار اتنا محدود اور مختصر ہو جاتا تھا کہ پہلی ہی ملاقات میں مالک رام "ہمدم دیرینہ" معلوم ہونے لگتے تھے۔ فاصلہ، ان کے پاس شاید تھا ہی نہیں صرف قُربت ہی قُربت تھی اور ایسی قُربت جو قُرابت سے بھی زیادہ مستحکم اور مضبوط ہو۔ یہ میرا احساس یا اندازہ نہیں ایقان تھا۔ انھوں نے آسمان سے علم کی فضیلت اور زمین سے کششِ ثقل، حاصل کی تھی۔

میری ان سے پہلی ملاقات انھیں کے مکان پر ہوئی۔ ڈیفنس کالونی دلّی میں۔ سنہ ہوگا ۱۹۷۰ کے ارد گرد۔ اُن دنوں میں کوئی ماہ کے لیے دلّی میں مقیم تھا۔ صفدر جنگ انکلیو کے ایک سرکاری ہوسٹل میں اور ہر تیسرے چوتھے دن ناخواندہ آسمان کی طرح محترم علی جواد زیدی کے گھر پہنچ جاتا تھا (وہ ان دنوں جانکیہ پور میں رہا کرتے تھے) علی جواد زیدی مزاجاً بُرد بار قسم کے آدمی واقع ہوئے ہیں۔ ناخواندہ مہمانوں سے اُنھیں خاصی دلچسپی ہے اور انھیں کے سلوک سے مجھے معلوم ہوا کہ ناخواندگی بھی ایک طرح کی نعمت ہوتی ہے۔ انھوں نے مجھے دلّی کے ادبی حلقوں میں متعارف کرا دیا اور مالک رام صاحب کے گھر پر تو اس وقت لے گئے جب ہم صرف دوپہر کا کھانا کھاتے ہیں شاید انھوں نے پہلے ہی سے ملاقات کا وقت طے کر رکھا ہو کھانے کی میز پر جہاں تک مجھے یاد ہے مالک رام صاحب کی رفیقۂ حیات کے علاوہ ان کی بیٹی بشریٰ بھی موجود تھیں اور میں کہ (تقریباً) غریب الوطن تھا ایسا مسعود اور نامسعود ہوا کہ میری ساری ہوم سکنیس تادمِ قیام رفع ہو گئی۔ میں تو خیر صرف ہم طعامی کے فرضِ منصبی سے خوش اسلوبی کے اتر مدہ برا ہو رہا تھا لیکن صاحبِ خانہ اور اصل مہمان ہم کلام تھے اور اُن دونوں کی گفتگو کی روشنی میں میں نے محسوس کیا کہ

اسلامیات کے تعلق سے کتنے اندھیرے میں ہوں مالک رام صاحب کو "اسلامیات" سے حد درجہ شغف تھا۔ مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میں ان کی ہمہ جہتی شخصیت کے اِس پہلو کے بارے میں دو لفظ بھی لکھوں۔ (ایاز قدرِ خود بشناس۔ ایاز بھی کیا آدمی تھا ایسے موقعوں پر کتنا کام آتا ہے) لیکن جس زمانے میں میں مالک رام صاحب سے ملا میرا حافظہ اتنا ناقص نہیں تھا جتنا اب ہے اور اُس وقت مجھے یاد تھا کہ اُن کی تصنیف "عورت اور اسلامی تعلیم" کی بڑی دھوم تھی۔ میں نے شاید وقفہ آب خوری میں دبی زبان سے اِس کا ذکر کر دیا صاحبِ خانہ نے پہلے میری طرف تعجب سے دیکھا اور پھر فرمایا ارے آپ نے یہ ڈش تو لی ہی نہیں۔ ممکن ہے میں نے اپنے بارے میں جو عرض کیا اسے آپ زیب داستان سمجھیں لیکن یہ سچ ہے کہ مرحوم سے پہلی ملاقات کا نقش میرے دل پر ہے۔ میں اسے نقش کالحجر اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ میں سنگ دل نہیں ہوں، پھر مرحوم سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ غالب انسٹیٹیوٹ، دلّی اردو اکادمی انجمن ترقی اردو اور ایک مرتبہ حضرت امیر خسرو سے متعلق کسی سیمنار میں۔ خود ان کے اعزاز کی ایک تقریب میں جو غالباً جشن الماس کی تقریب تھی اور جناب حسن نظامی ثانی نے اُن کا ایک نہایت ہی پُر اثر اور دلکش خاکہ اُسی دن لکھ کر پڑھا تھا۔ اس خاکے میں کیا نہیں تھا۔ مزاج کی چاشنی، عقیدت کی خوشبو اور حقیقت کی روشنی سبھی کچھ تھا۔ یہ خاکہ سن کر مرحوم مالک کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں اور ہر کسی نے آگے بڑھ کر فاضل خاکہ نگار کو مبارک باد دی تھی (میں نے تو اُن سے وہ قلم مانگا تھا جس سے انھوں نے یہ خاکہ لکھا تھا) قدر دانی اور دوستداری کا یہ بے ریا منظر مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ ایسی تقریبات میں تو ممدوح خواہ کسی مٹی کا بنا ہو اُس کا دل بھر آتا ہے اور اِس تقریب کے ممدوح تو سرتاپا انکسار، مجسم نیاز، حضرت مالک رام، وہ بڑی مشکل سے خود پر قابو پا سکے۔ اُن کے گرد میمنہ اور میسرہ کے محاذ پر جو احباب تھے انھوں نے اس بات کا خیال رکھا کہ قلب پر حملہ نہ ہو۔

مالک رام کی تصنیفات اور تالیفات بے شمار ہیں ماہر غالبیات کی حیثیت سے اُنھوں نے کتنوں کو مغلوب کیا ہے اور کتنے اُن کے علم و فضل کے قتیل ہیں۔ سب جانتے ہیں لیکن میں شخصی طور پر ان کی اُس تالیف کا قایل ہوں جسے تالیف قلوب کہا جاتا ہے۔ یہ ان کا خاص میدان تھا۔ اس تالیف میں اُن کے علم کی روشنی تھی اور ان کے حلم کی مہک تھی۔ علم اور حلم کا ایسا حسین امتزاج کم سے کم میں نے کسی دوسری شخصیت میں نہیں دیکھا۔ پرانے لوگ ایسی ہی صحبتوں کے لیے سرگرداں رہا کرتے تھے اور فخر سے کہا کرتے تھے میاں ہم نے کیسے کیسے جید سخن وروں اور اساتذہ کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ مالک رام کی صحبت جسے بھی ملی ہے وہ بجا طور پر خوش نصیب ہونے کا اعلان کر سکتا ہے۔ اُن کا اصلی میدان "تحقیق" تھا جس میں اصلاح کا کاروبار نہیں ہوتا ہے اگر مالک رام شاعر ہوتے تو اُن کے بالمشافہ اور غائبانہ شاگردوں کی شاید الگ سے مردم شماری کروانی پڑتی۔ بہرحال محققین کے قبیلے میں ادب و احترام کا جو بھی طریقہ ہے ہندوستان کے اور پاکستان کے سارے محققین کو میں نے اُن کا مقتدی پایا۔ ان کی تدقیق اور ژرف نگاہی کے سبھی قایل تھے۔ مجھے اپنے قلیل المطالعہ ہونے کا اعتراف ہے (اس کے علاوہ کوئی دوسری صورت سے بھی نہیں) اور تحقیق، جیسے موضوع سے تو میرا رابطہ اس حد تک ہے کہ میں لفظ تحقیق کے ہجے جانتا ہوں لیکن جن صاحبانِ تحقیق سے مجھے سلام دعا کا شرف حاصل ہے اُنھیں میں نے مالک رام نام کا ادب سے لیتے دیکھا ہے۔ میں صرف چند ملاقاتوں کو "مدت سے صحبت رہنے" کا نام نہیں دے سکتا کیونکہ میں نے صرف پرچھائیاں دیکھی ہیں لیکن اوس کی وہ دو ایک بوندیں بھی جو مجھے ملی ہیں مجھ جیسے قانع شخص کو سیراب کرنے کے لیے کافی ہیں۔ میں نے کہیں پڑھا تھا (پڑھنے کے لیے تو مطالعہ ضروری ہے اس لیے پڑھا نہیں سنا ہوگا) کہ سمندر میں کشتی رانی (بوٹنگ) یقیناً ایک ولولہ انگیز عمل ہوگا لیکن ساحلِ سمندر پر بیٹھ کر سمندر کا نظارہ کرنا بھی ایک مسرت انگیز عمل ہے۔ میں اس فلسفے پر ایمان لے آیا۔ اپنے اس خسارے کو میں یوں بھی عمرے کا نام تو دے ہی

سکتا ہوں مج نہ سہی۔

مالک رام صاحب کو میں نے ایک موقعہ پر دل گرفتہ اور رنجیدہ بھی دیکھا۔ اسے بھی کئی سال ہوگئے۔ دلّی کے کسی رسالے میں اُن کے بارے میں ایک تضحیک آمیز مضمون شایع ہوگیا تھا۔ اس کا ان کے دل پر بہت اثر تھا۔ میں شاید انھی دنوں اُن سے کسی محفل میں ملا تھا۔ وہ بجھے بجھے سے تھے۔ میرا خیال ہے انھیں علم ہوگا کہ کون ہے جو پردے سے لگا بیٹھا ہے اور سامنے آنے سے گریز کر رہا ہے لیکن انھوں نے مجھے یقین ہے اپنے قریب سے قریب ترین دوست کو بھی اس صاحبِ کردار شخص کا نام نہیں بتایا ہوگا۔ ہوسکتا ہے انھیں صرف شبہ ہو اور چونکہ وہ مالک رام تھے اس لیے بدگمانی کے گناہ سے اپنا دامن آلودہ کرنا انھیں گوارا نہ ہوا ہوگا۔ یہ بات یوں بھی چند دنوں میں خاک تلے دب گئی۔

۱۹۸۴ء یا ۸۵ء میں وہ جب شدید بیمار ہوتے تو ان کے پُرستاروں اور عقیدت مندوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ پتہ نہیں کون کون کہاں کہاں سے اُن کی عیادت کے لیے اُن کے گھر پہنچا۔ مشفق خواجہ کی حد تک میں جانتا ہوں کہ وہ کراچی سے اُن کے مزاج پرسی کے لیے ہندوستان آئے۔ خود مالک رام صاحب کو مشفق خواجہ سے گہرا لگاؤ تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تعشق کے لیے متعلقین کی ملاقات کوئی لازمی شرط نہیں ہے۔ حضرت مالک رام اور جناب مشفق خواجہ اسی قسم کے افلاطونی عشق کی ڈور میں بندھے ہوئے تھے۔ یہ کوئی ۴۰ سالہ عشق تھا اور اسی تعشق میں مشفق خواجہ کو ہندوستان کے سفر کے لیے ہری جھنڈی دکھائی اور میں نے دو بڑے محققین کو بغل گیر ہوتے دیکھا اس یادگار ملاقات سے پہلے میں نے مخدوم محی الدّین اور فیض احمد فیض کو بمبئی میں سر سنگار سمند کے ایک مشاعرے میں بغل گیر ہوتے دیکھا تھا۔ وہ دونوں بھی پہلی بار ملے تھے جذبہ ایک تھا لیکن وہ اتفاقی ملاقات تھی۔ فیض خاص طور پر مخدوم سے ملنے نہیں آئے تھے۔ "مالک و مشفق، کی ملاقات کو تو کچھ دوسرا ہی عنوان دینا چاہیے۔ اردو کے کئی شعر مجھے یاد ہیں لیکن کوئی ایسا شعر یاد نہیں ہے جو اخلاص اور مودت کے صرف محسوس کیے جانے والے جذبے کو الفاظ کا پیرہن دے سکے۔ میں اس یادگار ملاقات کا چشم دید گواہ ہوں۔ دونوں دم بخود تھے۔ خموشی گفتگو تھی اور بے زبانی زبان۔ غالب کا یہ شعر شاید کسی حد تک ترجمانی کرسکے۔

نہ کہہ کسی سے کہ غالب نہیں زمانے میں
حریفِ رازِ محبت مگر در و دیوار

دونوں کو شاید علم تھا کہ یہی پہلی اور آخری ملاقات ہے۔ بہرحال وہ "پرسش" تھی اور پائے سخن درمیان میں نہیں تھا۔

مالک رام صاحب سے اپنی دو ملاقاتوں کا ذکر اور کروں گا کہ ہوسِ سیر و تماشا بہت ہے مجھ کو۔ مجتبیٰ اور شاہد علی خاں ساتھ تھے۔ مجھے معلوم ہے کہ شاہد علی خاں سے مل کر مالک رام کھل اُٹھتے تھے۔ معلوم نہیں شاہد علی خاں میں انھوں نے کون سی محبوبیت دیکھی تھی۔ شاہد نام ہونا تو کافی نہیں ہوسکتا۔ بہرحال اس معاملے میں انھوں نے کس قسم کی تحقیق کی کچھ کہا نہیں جاسکتا وہ اپنے سکریٹری کو املا کروا رہے تھے ہمیں بلا کر اُسے کچھ دیر کے لیے آزاد کیا اور باری باری سے ہمیں نوازتے رہے۔ کافی کمزور ہوگئے تھے لیکن لکھنا پڑھنا ترک نہیں کیا تھا۔ بلکہ تیز ترک گامزن کے عالمانہ فلسفے اور سپاہیانہ فارمولے پر عمل پیرا تھے۔

آخری ملاقات پچکور ہریانہ میں ہوئی نومبر ۱۹۹۱ء میں۔ ہریانہ اردو اکادمی نے اُن کی خدمت میں اُن کی طویل ادبی خدمات کے اعتراف میں عالی ایوارڈ پیش کیا تھا۔ (جو خود اکادمی کے وقار میں اضافے کا باعث تھا) بڑی شان دار تقریب تھی۔ ہریانہ کے گورنر دھنک لال منڈل نے انعامات تقسیم کیے اور مالک رام کو اُن کے منصب کے مطابق عزت دی۔ (میں وہاں کیوں حاضر تھا۔

نہیں بتاؤں گا خود ستائی ہوتی ہے) میں گور نر ہاؤز کے پنڈال میں جب اُن سے ملا تو گو کئی لوگ اس ملاقات اور گفت و شنید میں حارج ہوئے لیکن میں نے محسوس کر لیا کہ مالک رام مجھے وہاں پا کر بہر حال مسرور ہوئے۔ (متعجب تو ہوئے ہی تھے) صابر دت کو دیکھ کر زیادہ متعجب ہوئے)

وہ شجر سایہ دار تو تھے لیکن ایسا شجر جس پر پھول ہی پھول کھلے ہوئے تھے۔ محبت اور یگانگت کے پھول۔ خوشبوؤں میں نہاتے ہوئے۔ وہ خوشبو جو مشامِ جان کو معطّر کر دے۔ اور عطر کا نام تھا عطرِ مالک۔ شمامتہ العنبر سے زیادہ دیرپا خوشبو کا عطر۔

کراچی سے مشفق خواجہ نے جو بات لکھی وہ میرے اِس مضمون پر حاوی ہے "مالک رام کی وفات میرے لیے بڑا ذاتی سانحہ ہے آپ کو معلوم ہے کہ وہ مجھ پر کس قدر مہربان تھے اور یہ بھی جانتے ہیں کہ میرے دل میں اُن کی کیا جگہ تھی اور پھر آپ میری اور اُن کی آخری ملاقات کے عینی شاہد بھی ہیں کچھ نہ پوچھیے کہ مالک رام صاحب کی وفات کی خبر نے مجھے کتنا آزردہ کیا یہاں انجمن ترقی اُردو کی طرف سے ایک بہت بڑا تعزیتی جلسہ کیا گیا۔ پاکستان کی تاریخ میں یہ پہلا جلسہ تھا جو کسی ہندوستانی اور وہ بھی غیر مسلم ادیب کے لیے منعقد ہوا۔ اب "قومی زبان" (انجمن کا رسالہ) کے مالک رام نمبر کی ترتیب کا کام جاری ہے۔۔۔۔۔۔

ایک مضمون آپ بھی لکھ دیجیے۔۔۔۔۔۔ اس مضمون کے خالق مشفق خواجہ ہی ہیں!!

قومی زبان (۶۹) اپریل ۱۹۹۴ء

مالک رام...... ایک بڑی علمی و ادبی شخصیت

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

مالک رام صاحب کے انتقال پُرملال سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ برصغیر پاک و ہند ہی پر کیا موقوف ہے پوری اردو دنیا میں محسوس کیا جائے گا اور وہ بھی مکمل طور پر نہیں سچ ہے کہ ایک عالم کی موت ایک دنیا کی موت ہے۔ مجھے احساس ہے کہ میں مالک رام صاحب کی ہمہ جہت شخصیت پر خراج عقیدت پیش کرنے کا اہل نہیں ہوں۔ انھیں خراج عقیدت صرف وہی شخص پیش کر سکتا ہے جو ان کی وسیع و بسیط دنیائے علم و کمال کے ساتھ انصاف کر سکتا ہو۔ میں مالک رام کا ایک عام قاری ضرور ہوں اور ۳۵۔ ۳۰ سال سے انتہائی احترام کے ساتھ ان کے کام کا مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ میں کبھی مالک رام صاحب سے بالمشافہ ملاقات کی سعادت بھی حاصل نہ کر سکا۔ شاید اس کوتاہی کی بڑی وجہ یہی ہو کہ عربی، فارسی ادبیات، اسلامیات، غالبیات، آزادیات اور تاریخ کے شعبوں میں مالک رام صاحب کی اعلیٰ اور ارفع کارگزاری نے میری دل و دماغ پر ان کی ہیبت طاری کر رکھی تھی۔ واللہ اعلم اب اُس حجاب کو کیا ہوا؟ شاید خراج عقیدت کی منزل حجابات اُٹھا دیا کرتی ہے۔ مجھے احساس ہے کہ جہاں مالک رام صاحب کے بارے میں گفتگو کرنا خاصہ مشکل کام ہے وہاں ایک آسانی کی بھی صورت ہے اور وہ یہ کہ وہ "ذکر غالب" جیسی کتاب کے مصنف ہیں۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی فرد کو غالب سے عقیدت ہو اور وہ مالک رام سے اجتناب برت سکے۔ "ذکر غالب" سے پہلے حالی کی "یادگارِ غالب" اور اس کے بعد عبدالرحمٰن بجنوری کا مشہور مقدمہ "دیوانِ غالب کا برلن ایڈیشن اور اس کے بعد چغتائی ایڈیشن غلام رسول مہر کی تصنیف "غالب" اور شیخ محمد اکرام صاحب کی تصنیف "غالب نامہ" اور بعض دیگر اہم تصانیف شائع ہو چکی تھیں لیکن "ذکر غالب" کی بات ہی کچھ اور ہے۔ یہ کتاب بقول ڈاکٹر سید عابد حسین "اس تمام تحقیقات کا نچوڑ ہے جو اب تک (یعنی ۱۹۶۴ء تک) غالب کی سیرت کے متعلق ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں مالک رام صاحب نے نئے ماخذوں کو کھنگال کر نئی معلومات فراہم کی ہیں جو کہیں اور نہیں ملتیں۔"

"غالبیات" میں اُن کے کارنامے بے شمار ہیں، "غالب"، "گفتارِ غالب"، "افسانۂ غالب"، "دیوانِ غالب" کا مالک رام ایڈیشن ۱۹۵۷ء سید حسن کا مالک رام ایڈیشن ۱۹۳۸ء "خطوطِ غالب" ۱۹۶۳ء اور ان سب کتابوں کا لب لباب ایک مضمون بعنوان "مرزا غالب" مشمولہ احوال غالب مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد یہ مضمون کیا ہے یوں لگتا ہے مالک رام کے تخیل کی پیداوار ہیں ا غالب کو جس SITUATION میں ڈالتے ہیں غالب کی شخصیت کے نئے نئے پہلو تراش لیتے ہیں کیا اعلیٰ تحریر ہے۔ یہ مضمو

اب میں مالک رام پر گفتگو کا باقاعدہ آغاز کرتا ہوں۔

مالک رام صاحب کی تازہ ترین تصویر میرے سامنے ہے۔ وہ شمالی ہند کے فرقاء میں مقبول رامپوری یا نہرو کیپ سے مشابہہ ٹوپی کے ساتھ علی گڑھ شیروانی زیب تن کیے ہوئے ہیں جس کا آخری بٹن تک بند ہے بڑے سائز کے فریم والے عینک سے ذہین آنکھوں کی شوخی ہویدا ہے اور وہ ہونٹوں پر رقص کرتی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ یہ کہتے ہوئے نظر آرہے ہیں کہ "میں ان دنوں اپنے مضمون "مرزا غالب" مشمولہ "احوالِ غالب" کی آخری سطر لکھنے میں مصروف ہوں۔ بالآخر غالب سے بالمشافہ ملاقات ہو ہی گئی۔" میرے مضمون "مرزا غالب" میں سب کچھ قیاسی تھا۔ اب سب بالمشافہ گفتگو کی بنیاد پر مالک رام کی تصویر کہ یہی میرے لیے مالک رام کی دستیاب شبیہہ ہے اور بس۔ مجھے وہ ڈاکٹر ایم۔ اے انصاری یا کرنل بشیر حسین زیدی کے ہم شبیہہ نظر آتے ہیں۔ مالک رام کی کچھ کتابیں بھی میرے سامنے ہیں "ذکرِ غالب"، "تلامذۂ غالب"، "تذکرہ المعاصرین"، "اسلامیات"، "مکاتیب آزاد"، "خطبات آزاد"، کے متون اور حاشیے اور کچھ رسائل میں شائع شدہ مضامین خاص طور پر "احوالِ غالب" مرتبہ پروفیسر مختار الدّین احمد کی کتاب غالب سے متعلق ایک تخیلی مضمون۔ اسے خیالیہ کہا جاسکتا ہے۔ میں مالک رام کو صرف اس مضمون کی بنیاد پر محققینِ غالب میں ایک بہت ممتاز مزاج شناس غالب سمجھتا ہوں۔

مالک رام صاحب پاکستانی پنجاب میں پھالیہ (گجرات) کے مقام پر ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے اور انھوں نے ۸۷ سال کی عمر پائی اور حق تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنی عمر کے ساتھ اعلیٰ وارفعیٰ تحقیقی کام کے ذریعے انصاف کیا۔ اگر میں اُن کے بارے میں اپنی گفتگو صرف "ذکرِ غالب"، "تلامذۂ غالب"، "تذکرۂ المعاصرین" اور "احوالِ غالب" میں شامل ان کا تاریخی اہمیت کے مضمون "مرزا غالب" تک محدود رکھوں تب بھی حق ادا نہ ہوسکے گا۔ وہ غالبیات کے حوالے سے بھی دیگر شعبوں میں بھی ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔

وہ برصغیر میں آزادیات کے سب سے بڑے عالم تھے۔ انھوں نے مولانا آزاد کی بیشتر تصنیفات کو ایڈٹ (EDIT) کیا "ترجمان القرآن" (چار جلدیں) "خطبات آزاد" (دو جلدیں)، "غبار خاطر" اب رہا سوال "اسلامیات" کا تو میرے پاس ان کی کتاب بہ عنوان "اسلامیات" میں مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت مضامین شامل اشاعت ہیں اس کتاب میں مالک رام کے پیش لفظ ہی سے اسلام کے بارے میں ان کے خیالات کا اظہار ہو جاتا ہے۔ مضامین کی فہرست اس طرح ہے۔

لاالٰہ الااللہ محمد رسول اللہ

الاسلام

اسلامی خلافت

خُلقِ عظیم

افصح العرب اور

عورت مذاہب عالم میں

میرا خیال ہے کہ اسلام اسلامی خلافت اور عورت مذاہبِ عالم میں اعلیٰ پائے کے مضامین ہیں اور اس دور میں جب اسلام کے بارے میں بعض ناقابلِ قبول تاویلات بڑی شدومد کے ساتھ پیش کی جارہی ہیں۔ مالک رام نے اسلام کی جس سلیقہ، خلوص اور معروضیت کے ساتھ تفہیم کی ہے وہ ہم سب کے لیے لائق توجہ ہے۔

"......اس سلسلہ میں خود ستائی کے لیے نہیں، بلکہ بطور تحدیثِ نعمت میں ایک بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا مطالعہ کی وسعت اور ان (متذکرۂ بالا) مصنفین کا رہین منت ہونے کے باوجود میں آزادانہ غور و فکر سے کبھی دست بردار نہ ہو سکا۔ میں نے "افلا یتدبرون القرآن" (۸۲:۴) کے حکم کی تعمیل میں مسائل پر خود غور و فکر کیا ہے اور مجھے خوب معلوم ہے کہ کہیں کہیں میں نے جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ دوسرے علمائے کرام کے نتائج سے مختلف بھی ہیں۔"

اس پیش لفظ میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"....اگر کوئی مجھ سے سوال کرے کہ تم نے تفسیر و حدیث کی کون کون سی کتاب کا مطالعہ کیا ہے تو یہ حقیقت ہے کہ میں ان سب کتابوں کے نام بھی نہیں گنوا سکوں گا۔ اس لیے اگر میں نام بنام سب کا شکریہ ادا کرنے کی کوشش بھی کروں تو کامیاب نہیں ہو سکتا یقیناً بعض نام ذکر کرنے سے رہ جائیں گے۔ چراغ سے چراغ جلتا ہے انسان شعوری طور پر اور بسا اوقات غیر شعوری طور پر بھی اپنے مطالعے سے استفادہ کرتا ہے اور یہاں تو نصف صدی کا قصہ ہے۔ دو چار برس کی بات نہیں۔ پس لازم تھا کہ میں بھی اپنے پیش رووں کی خوشہ چینی کرتا......

......تفاسیر کے عظیم الشان ذخیرہ پر غائر نظر ڈالنے سے آپ ایک نتیجہ پر ضرور پہنچیں گے کہ ان میں افراط و تفریط بہت ہے ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است اگر مفسر کو تصوف سے شغف ہے تو وہ جا بجا آیات قرآنی سے مسائل تصوف کا استخراج کا موقع نکال لیتا ہے۔ اگر اسے فقہ سے دلچسپی ہے تو اس کی یہ خواہش رہے گی کہ قرآن کو کتاب المسائل بنا دے.... یہی حال معقولات کا ہے اگرچہ صدر اسلام ہی میں اور خاص طور پر بنی امیہ میں بیرونی دنیا سے تعلقات قائم ہو گئے تھے لیکن جب عہد عباسیہ میں دوسری زبانوں کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہوا تو اسلامی علماء کا من جملہ اور امور کے یونانیت اور تفلسف سے تعارف ہوا۔ اس سے ان کی آنکھوں میں چکا چوند سی پیدا ہو گئی۔ انھوں نے قرآن کا اس یونانی فلسفہ کی روشنی میں مطالعہ شروع کیا اور ستم یہ ہوا کہ انھوں نے گھوڑے کو گاڑی کے آگے کی بجائے اس کے پیچھے لگا دیا۔ یعنی یہ نہیں کیا کہ یونانی فلسفہ کو صداقتِ قرآن کی رو سے پرکھیں بلکہ یہ کہ قرآن کسی حد تک یونانی فلسفے کے میزان پر پورا اترتا ہے۔ تصور کیجیے کہ کیا نتیجہ نکلتا ہو گا۔"

یہ تھا ملک رام کی اسلام شناسی کا ایک تعارف خود ان کے قلم سے۔ مجھے اس سے غرض نہیں کہ وہ ہندو تھے یا مسلمان۔ مجھے اس سے غرض ہے کہ وہ خود کو آخری سانس تک ملک رام لکھتے رہے۔ انھوں نے مولانا ماہر القادری کے رسالہ "فاران" میں کچھ مضامین نا تو رام کے نام سے بھی لکھے اور ان مضامین میں سے تین مضامین بہ عنوان "خلق عظیم" "یا افصح العرب" اور "البلاغ"

خلافت" ان کی مشہور کتاب "اسلامیات" میں شامل ہیں جسے میں ہر انصاف پسند، مغربی فکر کے حامل اور خدا کی مخلوق سے محبت کرنے والے فرد کی شیلف (SHELF) پر دیکھنے کا متمنی ہوں۔ کاش اس کتاب کا مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو اور اس زمانہ میں جب اسلام کے بارے میں اکبر الہ آبادی کا یہ شعر:

غنیموں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

طنز و مزاح سے عاری اور "حقیقت" سے قریب تر ہو چلا ہے اس نوع کے کام کی ضرورت شاید پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔

مالک رام جیسے اردو کلچر کے مزاج شناس کا انتقال پر ملال اس لیے بھی باعث افسوس ہے کہ ان کی "موت" سے موجودہ پاکستان اور ہندوستان کے مابین ایک بڑا تہذیبی پل منہدم ہو چکا ہے۔ جو مولانا سلیمان ندوی کی کتاب "مسلمانوں کے عہد میں ہندوؤں کی تعلیم" میں درج دسیوں ہندو مفسرین، محدثین، معلمین قرآن اور معلمین عربی و فارسی کے ناموں کی موجودگی میں مالک رام کی تحریریں پڑھ کر مولانا سلیمان ندوی کے دعویٰ پر یقین آجاتا ہے۔ اب تو ہندوستان کے مسلمان گھروں میں بھی اُردو رسم الخط میں اسلامی کتب کا مطالعہ کرنے والے معدوم ہوتے جا رہے ہیں اور بعض مسلمان اسکالرز اردو کی ابتدا کے بارے میں معروف نظریات پر کلہاڑیاں چلا رہے ہیں۔ تاکہ اس کارِ خیر سے ان کی سرکاری ملازمت پکی ہو جائے۔ میں اس انتہائی سنجیدہ موقع پر بعض مضحکہ خیز تحریروں کا ذکر اس وجہ سے بھی مناسب خیال نہیں کرتا کہ اس طرح آپ خواہ مخواہ مسکرانے یا ہنسنے پر مجبور ہوں گے اور یہ ایک ایسے جلسے میں جو "بیاد مالک رام" منعقد ہو رہا ہے اور انجمن ترقی اردو (پاکستان) و ادارہ یادگارِ غالب کے زیر انتظام ہو رہا ہے شاید کچھ زیادہ مناسب نظر نہ ہوگا لیکن میں اس قدر ضرور عرض کروں گا کہ مالک رام کی رحلت صرف ہندوستان کا قومی سانحہ نہیں ہے بلکہ ہم پاکستانیوں کے لیے افسوسناک خبر ہے کہ ایک ایسا شخص جو تقابلی مذاہب کا بہت بڑا شناور ہو وہی "عورت اور اسلامی تعلیم" جیسے موضوع پر انصاف کر سکتا تھا۔ افسوس کہ اب وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں۔

مالک رام صاحب کی غالب پر پہلی کتاب آج سے ۵۵ سال پہلے (غالباً ۱۹۳۸ء میں آئی) شائع ہوئی اس کے بعد "سبد چین" نے ایڈٹ کیا اور پھر "ذکرِ غالب" اور پھر "تلامذۂ غالب" اور محمد مرتضیٰ بیان یزدانی میرٹھی کی "حل المطالب" کی تدوین۔ میری رائے میں جو بات "احوال غالب" (پہلا ایڈیشن ۱۹۵۳ء اور دوسرا ۱۹۸۶ء) میں شامل مضمون "مرزا غالب" کی ہے وہ غالب پر مالک رام کی کسی تحریر کی نہیں۔ تاہم یہ میری رائے ہے اور مجھے آپ یہ حق ضرور دیں گے کہ میں کوئی غلط یا نامناسب رائے رکھ سکوں شاید یہ رائے میرے لیے غلط یا نامناسب نہ ہو۔ علم کا رچاؤ ایسے ہی PLURALISM یا کثرتِ تعبیر سے پیدا ہو سکتا ہے۔ اکہراپن خواہ جس میدان سے متعلق ہو بہر حال غلط اور غیر تخلیقی صورتحال کی غمازی کرتا ہے جس سے تعفن پیدا ہوتا ہے۔ سارا لطف ہی اس بات میں ہے کہ میں مالک۔ ام جیسے قاموسی عالم کے ایک مضمون بہ عنوان "مرزا غالب" جس کی ضخامت صرف ۳۲ صفحات ہے کے بارے میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ وہ اردو کے ہم عصر محققین میں سب سے زیادہ تخلیقی ذہن کے مالک تھے۔ بذلہ سنج تھے اور غالب کے مزاج کے اس درجہ آشنا کہ یوں لگتا ہے کہ وہ جب چاہتے غالب کے ذہن کی بازیافت پر قادر تھے۔ شاید کسی تاریخ ساز شخصیت کے بارے میں گہرا علم اُس شخصیت کو حسب خواہش اس کی بازیافت اور اس کے ذہن سے سوچنے اور اُس کی آنکھوں سے دیکھنے کے قابل بنا دیتا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ "احوال غالب" میں شامل مالک رام صاحب کے مضمون "مرزا غالب" کے چند اقتباسات پیش کروں لیکن شاید موقع کی مناسبت "زعفران زاری" کی اجازت نہیں دیتی۔ یوں لگتا ہے کہ مالک رام صاحب

TIMEMACHINE کے ذریعے عہد غالب میں چپکے سے داخل ہو گئے اور اُن سے اپنی ملاقاتوں کا حال اس طرح بیان کرنا شروع کر دیا کہ پھر کوئی بات خیالی نہ رہی۔ سب دیدنی ہو گئی۔

اللہ رے کمال۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ مالک رام نے اردو کے بعض شگفتہ اسلوب کے رسیا ادیبوں کی نادانستہ طور پر آبیاری کی ہے۔ اس رُخ پر کام کرنے کی ضرورت کا احساس انہی دنوں ہوا۔ اور خواہ مخواہ ذہن میں اسلوب کے حوالے سے رشید احمد صدیقی، مالک رام اور خورشید الاسلام کے اسلوب کے تقابلی مطالعہ کی جانب دھیان گیا۔

خیر مالک رام کی علمیت کے بارے میں، میں کہوں گا تو مالک رام کی IMAGE میں کیا فرق پڑ سکتا ہے۔ آپ نے "خطبات آزاد" میں مالک رام کے حواشی کا مطالعہ کیا ہوگا۔ قرآنی آیات، احادیث، سیرت، صحابیات اور اسلامی تاریخ پر اس قدر گہری نظر سے ٹکراؤ ہوتا ہے کہ کسی نسل کے لیے مولانا آزاد کے خطبات کی اہمیت اُسی وقت عیاں ہو سکتی ہے جب ان کے تلازموں کی فہم ممکن ہو سکے۔ مالک رام نے یہ ہفت خواں طے کر لیا ہے۔

"موت العالِم موت العالَم" ٹھیک ہی کہا گیا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ آج کی محفل میں میرے دوست مشفق خواجہ بھی اپنا حجاب توڑیں گے لیکن وہ حسبِ دستور اس محفل میں موجود بھی نہیں ہیں۔ مالک رام اور مشفق خواجہ میں شگفتگی اور تحقیقی مزاج کی خاصی حد تک مطابقت ہے اور میں نے اب تک دو محقق ہی ایسے دیکھے ہیں جو اپنا تحقیقی کام کرتے ہیں تو ریاضی کے مسائل حل کرتے نظر آتے ہیں اور معاصرین پر لکھتے ہیں تو دوسروں کو اپنے زاویۂ نظر سے محظوظ کرتے رہتے ہیں میں آپ کے سامنے بیان کرتا چلوں کہ یوں تو میں مالک رام صاحب کی تحریروں کو گزشتہ ۳۵ سال سے پڑھ رہا ہوں لیکن "ذکرِ غالب" یقینی طور پر اُن کی پہلی کتاب ہے جس کے دوسرے ایڈیشن میں اس وقت تک غالب پر ہونے والی تحقیق کا نچوڑ اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ دماغ عش عش کر اٹھتا ہے۔

مالک رام صاحب کی تفہیم کے متعدد حوالے ہیں۔ لیکن اسلامیات کا حوالہ اس قدر اہم اور اس سے فوری طور منسلک غالب کی تہذیبی وجمالیاتی بازیافت کا حوالہ اس قدر بڑا حوالہ ہوتے ہوئے ہفتاد و دوملت کے تعصبات سے پاک ہے اور یہ بذات خود بہت بڑا خراج عقیدت ہے۔

مجھے افسوس ہوا کہ ایک حالیہ شائع شدہ تحقیقی مقالہ کے حصہ کتابیات میں غالبیات کے ایک ماہر کی حیثیت سے مالک رام کا وجود ہی نہیں پھر بھلا "ذکر غالب"، "تلامذۂ غالب"، "افسانۂ غالب"، "گفتارِ غالب" اور "مرزا غالب" جیسی اعلیٰ کاوشوں کا ذکر کس طرح آ سکتا تھا۔ اس حصّہ میں بعض غیر اہم کتابوں کا اندراج ملتا ہے اور ہاں ایک ایسی شرح غالب کا بھی جس میں غالب کے مندرجہ ذیل شعر کی اس طرح تشریح کی گئی ہے:

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہوں شاید
مر گیا غالبِ آشفتہ نوا کہتے ہیں

"وحشت کلکتوی اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ غالب کے دوست اور معتقدمین تھے غالب اس شعر میں اپنے ان دوستوں سے توقع باندھ رہے ہیں کہ وہ میرے مرنے پر میرا مرثیہ کہیں گے اور میری شخصیت اور فن کو خراج تحسین ادا کریں گے وغیرہ وغیرہ"

اب تشریح نگار صاحب کو کون بتائے کہ وحشت کلکتوی ۱۸۸۱ء میں پیدا ہوئے تھے غالب کے انتقال کے ۱۲ سال بعد۔ وحشت کلکتوی کی رحلت ۱۹۵۶ء میں ہوئی مذکورہ شرح جس کا عنوان "خوش مطالب" ہے (۱۹۷۱ء میں یعنی غالب صدی کی

تقریبات کے دو سال بعد شائع ہوئی تھی۔)

اب اگر وحشت کلکتوی کو غالب کا دوست بتانے والی شرح غالب پر ایک تحقیقی مقالہ کی کتابیات میں شامل ہو اور مالک رام کی تصنیف "ذکرِ غالب" غائب ہو تو پھر آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مالک رام سے ان کی زندگی میں "بیادِ مالک رام" جلد اوّل جیسی بے مثل کتاب کی اشاعت کے باوجود انصاف نہ ہوسکا شاید برصغیر میں مُردہ پرستی کی خواص درجہ رائج ہو چلی ہے کہ انصاف کے لیے موت کی شرط بلا چوں چرا قبول کر لی گئی ہے۔

حضرت مالک رام صاحب نے مولانا آزاد کی تصنیفات، مکتوبات، خطبات اور یہاں تک کہ ترجمان القرآن کی حواشی لکھ کر مجھے مولانا عبدالماجد دریاآبادی کے ایک جملہ سے استفادہ کا موقع دیا ہے کہ مبصر اور شارح کا علم خود صاحب تصنیف و ترجمہ سے کم نہیں ہے خاص طور پر خطباتِ آزاد کے حواشی پڑھ کر مجھے یہ بات شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ اگر مولانا آزاد کی تصنیفات پر مالک رام کے حواشی نہ ہوتے تو واللہ اعلم مولانا آزاد کی طرف سے منسوب کردہ کون سا شعر کس شاعر کے کھاتے میں جا پڑتا۔

مولانا آزاد یقیناً طور پر خوش قسمت تھے کہ انھیں مالک رام جیسا شارح اور حواشی نگار مل گیا اور اس طرح مولانا آزاد کے غیر واضح اشاروں کو بھی واضح اور ٹھوس علم کی کمک حاصل ہو گئی۔ سچ یہ ہے کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ مولانا آزاد کے انتقال کے وقت مالک رام صاحب ۵۹ سال کے تھے اور انھوں نے گزشتہ ۲۸ سال اسلام، غالب اور مولانا آزاد کی تفہیم میں صرف کر دیے اور دنیائے مذہب، ادب اور سیاست کو اس درجہ مالا مال کیا کہ آج نہیں کچھ عرصہ بعد ہی یہ اندازہ لگایا جا سکے گا کہ مالک رام مسلم برصغیر کے دو عظیم الشان ذہنوں غالب اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تفہیم کے لیے ناگزیر حوالہ بن چکے ہیں اور انھوں نے اس کام کے لیے اسلام اور اسلامی تہذیب سے علمی طور پر بہت پائیدار رشتے استوار کیے اتنے پائیدار کہ آج ان رشتوں کے بارے میں غور کرتے ہوئے ہم بجا طور پر یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ علم قابلِ حصول دولت ہے اور اس کے لیے صرف خلوص اور انتھک محنت درکار ہے۔

کیا یہ ستم نہیں کہ اب مالک رام کا علم تو کجا خود مالک رام کی تفہیم بھی ایک مستقل بالذات علم کی صورت اختیار کرتی جا رہی ہے؟

سچ تو یہ ہے سب کا مالک رام ہے

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن

بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں "غالب" قدیم و جدید علوم کے جامع، جن چند تازہ کار اشخاص کے ہاتھ لگے، ان میں مولانا غلام رسول مہر، ایس ایم، اکرام، مالک رام، مولانا امتیاز علی خان عرشی، قاضی عبدالودود اور پروفیسر حمید احمد خاں کے نام بہت نمایاں ہیں۔ مالک رام اس سلسلے کی آخری بڑی کڑی اور نشانی تھے۔ رفیق عزیز ڈاکٹر اجمل نیازی نے بتایا کہ ۱۵ اپریل کو ان کی سناؤنی بھی آ گئی اور آج وہ بھی ہم میں نہیں۔ سدا رہے نام اللہ کا!

ان کا یکم مارچ ۱۹۹۳ء کا ایک خط میرے سامنے ہے، میرے پاس، یہ ان کی آخری تحریر ہے، جو ان کلمات پر ختم ہوتی ہے۔

میری صحت بہت سقیم ہو گئی ہے۔ پیری و صد عیب کے مصداق آئے دن کوئی نہ کوئی تکلیف اُبھر آتی ہے۔ بہر حال دعا کرتے رہیے کہ انجام بخیر ہو، آمین......

والسلام والاکرام، خاکسار مالک رام

ایک نسبتاً پرانی تحریر بھی یاد آتی ہے، دیکھیے کیا خوب لکھا ہے:

مالک رام

۱۰ اگست ۱۹۸۸ء

مکرم من، آداب

گرامی نامے کا شکریہ

الحمد للہ کہ تحقیقی مضامین کا نسخہ آپ کو مل گیا۔ اس میں بعض متنازعہ فیہ مسائل ہیں غور فرمائیے اور اپنی رائے سے مطلع کیجیے۔

میں کسی زندہ شخص پر مقالہ لکھنے کے حق میں نہیں۔ بہر حال مزاجِ یار کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہی پڑے گا۔

والسلام و الاکرام

خاکسار مالک رام

(پروفیسر سیّد معین الرحمٰن ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی صدر شعبۂ اُردو گورنمنٹ کالج، لاہور)

میں کیسے یقین دلاؤں کہ میرا بال بال اپنے رب ودود کا شکر گزار ہے، میں اپنی ابتدا جانتا ہوں اور جو کچھ میں ہوں، اس سے بھی ناواقف نہیں۔ اب کہ سفینہ کنارے پر آلگا ہے صرف یہی دعا کرتا ہوں ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم (۲:۱۲۷)

مالک رام، نئی دہلی
۱۲ ستمبر ۱۹۸۲ء

عجب نہیں کہ ان کی یہی دعا، ان کی مغفرت اور آخرت میں ان کی بلندیٔ درجات کا باعث بن جائے ..... وہ ایک فراخ دل، کشادہ مشرب اور انسان دوست عالم باعمل تھے، غالبیاتی تحقیق میں ان کا نام بالخصوص بہت اہمیت اور قدر کا حامل تھا۔

مالک رام۔ پھالیہ ضلع گجرات (پاکستان) میں ۲۲ ستمبر ۱۹۰۶ء کو پیدا ہوئے اور ۱۹۳۰ء میں انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے تاریخ میں ایم۔اے کیا ۱۸ مئی ۱۹۳۱ء کو میاں میر لاہور چھاؤنی میں شریمتی ودیاوتی سے ان کی شادی ہوئی۔ اوشا، اروناّ اور بشریٰ ان کی تین بیٹیاں ہیں اور دو بیٹے بڑے کا نام آفتاب اور چھوٹے کا نام سلمان ہے۔

انہوں نے کہیں لکھا ہے کہ یہ حدیث مبارکہ نظر سے گزری کہ اگر بیٹی کا نام بشریٰ رکھا جائے تو پھر اسے اللہ تعالیٰ کی جانب سے بیٹے کی بشارت سمجھنا چاہیے۔ دو بیٹیوں کی ولادت کے بعد انہوں نے تیسری کا نام بشریٰ رکھا اور اس کے بعد اللہ نے انہیں اولاد نرینہ سے نوازا۔

مالک رام ۱۹۴۷ء میں انڈین فارن سروس سے وابستہ ہوئے اور ۱۹۶۵ء میں وزارت خارجہ حکومت ہند نئی دہلی سے پینشن پر سبکدوش ہوئے۔ انہوں نے متعدد تصنیفات و تالیفات اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ان کی سب سے پہلی تالیف "سبد چین" ہے غالب کا یہ فارسی مجموعہ انہوں نے ۱۹۳۸ء میں مرتب اور شائع کیا۔ میرے پاس ان کی آخری تالیف "تذکرہ ماہ و سال" ہے جس پر یکم جون ۱۹۹۲ء کی تاریخ کے ساتھ ان کے دستخط ثبت ہیں۔

اپنی پچپن برس سے متجاوز تصنیفی زندگی میں انہوں نے بہت کچھ لکھا اردو میں بھی اور انگریزی میں بھی غالب ان کا مرکزی موضوع رہا، ابوالکلام آزاد سے ان کا گہرا شغف بھی بہت سامنے کی بات ہے، اسلام سے بھی انہیں گہری وابستگی تھی جس کا اظہار ان کی معروف کتاب "عورت اور اسلامی تعلیم" میں ہوا ہے جس کے ایک سے زیادہ ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ اس کتاب کا انگریزی اور عربی میں ترجمہ ہوا ہے۔ عربی ترجمہ قاہرہ سے ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا، انگریزی ترجمہ پہلے حیدرآباد دکن سے اور پھر ۱۹۸۱ء میں نیویارک سے چھپا۔

وہ بہت وسیع المشرب انسان تھے۔ انہوں نے بہت مرتب زندگی بسر کی اور اپنے ہم عصروں میں ہمیشہ معزز اور مقبول رہے۔ تلوک چند محروم نے ان کے بارے میں سچ کہا ہے:

کون مالک رام سا ہر دل عزیز
ہند سے تا مصر و روم و شام ہے
مذہب و ملت کے جھگڑوں سے الگ
سچ تو یہ ہے سب کا مالک رام ہے

قومی زبان (۲۷) اپریل ۱۹۹۳ء

"مالک رام کی وفات پر تعزیت کے لیے میرا دھیان فوری طور پر ڈاکٹر مختار الدین احمد (علی گڑھ) کی طرف گیا، جو مالک رام سے بے حد قریب تھے۔ میری تعزیتی سطور کے جواب میں، اُن کا جو نامہ حُزن و حسرت پایا، اُس پر "قومی زبان" کے قارئین کا بھی یکساں حق ہے۔ اسے ذیل میں نقل کرتا ہوں

(ڈاکٹر سید مُعین الرحمٰن)

علی گڑھ ۱۰ مئی ۱۹۹۳ء

محبّی پروفیسر سیّد معین الرحمٰن صاحب، السّلام علیکم

مکرمت نامہ مورخہ ۲۱ اپریل، یہاں ۵ مئی کو موصول ہوا۔ کیا کہوں مالک رام صاحب کی وفات کا کس قدر صدمہ ہوا۔ چالیس سال کے اُن کے تعلقات تھے۔ اُن سے پہلی ملاقات وسط اکتوبر ۱۹۵۳ء میں اسکندریہ میں ہوئی تھی اور آخری ملاقات چند مہینے پہلے دہلی میں۔

اُن کی صحت کچھ دنوں سے خاصی خراب تھی لیکن اس طرح کہ وہ اپنے پڑوس کے مول چند ہسپتال میں داخل ہو جاتے اور پانچ سات دنوں کے بعد خوش و خرم واپس آجاتے اور اپنے روزانہ کے معمولات میں معروف ہو جاتے۔ اس دوران علالت میں وہ مضامین لکھتے رہے۔ کتابیں بھی مُرتب کر کے شائع کراتے رہے اور جلسوں میں بھی شریک ہوتے رہے۔ تقریریں بھی کرتے رہے اور جلسوں کی صدارت بھی۔

"تذکرۂ ماہ وسال" (نومبر ۱۹۹۱ء) خطوط ابوالکلام (اگست ۱۹۹۱ء) نثرِ ابوالکلام (۱۹۹۲ء) عمرِ رفتہ دسمبر (۱۹۹۲ء) یہ سب کتابیں اُنھوں نے اپنی علالت کے دوران مرتب کیں اور اپنی نگرانی میں شائع کرائیں۔ آخری مہینوں میں وہ خطوط کم لکھنے لگے تھے۔ میرے استفسار پر انھوں نے عذر کیا کہ وقت کم رہ گیا سوچتا ہوں غیر مکمل شدہ کو مکمل کروں، اس لیے خطوط لکھنے کی فرصت بہت کم نکال پاتا ہوں۔

اپریل ۱۹۹۳ء کے اوائل میں معلوم ہوا کہ سانس کی تکلیف پیدا ہو گئی ہے اور وہ ہسپتال میں ہیں۔ پانچ سات دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ قلتِ اشتہا کی شکایت ہے۔ بھوک بالکل نہیں لگتی۔ میں نے ان پر حملۂ قلب کے مقابلے میں (جس سے متاثر ہو کر وہ چار پانچ بار ہسپتال پہنچے اور شفایاب ہو کر واپس آئے) ان معمولی عوارض کو اہمیت نہیں دی۔ خیال بلکہ یقین سا تھا کہ چند دنوں میں پھر سابقہ دستور کے مطابق ہنسی خوشی گھر واپس آجائیں گے۔

جمعہ ۱۶ کی شب کے تین بجے وہ مول چند ہسپتال میں وفات پا گئے دوسرے دن ۱۷ (اپریل ۱۹۹۳ء) کی صبح کو گھر لائے گئے۔ بارہ بجے لودی کالونی لے جائے گئے اور تین بجے اُنھیں نذرِ آتش کر دیا گیا۔

مجھے ۱۷ کی شب کو اطلاع ملی۔ علی الصباح ٹیکسی کر کے بی بی بچّوں کے ساتھ دہلی پہنچا تو سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ اُن کا وہی کمرہ تھا وہی کتابیں تھیں دیواروں پر غالب اقبال اور ذاکر حسین کی تصویریں تھیں۔ مینٹل پیس پر سفارت خانہ ایران کا پیش کردہ اسم جلالت اللہ کا طغریٰ خوب صورت فریم میں رکھا ہوا تھا اور سیدھے ہاتھ کو آیتہ الکرسی شریف اور اُلٹے ہاتھ کو سورہ الحمد مخمل پر کڑھا ہوا بڑی تقطیع کے فریم میں یہ سب کچھ تھا لیکن مالک رام نہ تھے۔

اُن کا ڈرائنگ روم وہی تھا جس میں وہ اُٹھتے بیٹھتے پڑھتے لکھتے اور ہنستے بولتے رہتے تھے لیکن اُن کے نہ رہنے سے ہر چیز بے جان اور افسردہ نظر آتی تھی۔ بچّیوں اوشا اور بشریٰ نے فرش پر دیوار کے سہارے اُن کی ایک بڑی سی تصویر رکھ دی تھی جس

میں شیروانی اور ٹوپی میں بیٹھے وہ مسکرا رہے تھے۔

اُن کی زندگی میں جب اُن سے ملنے جاتا تو وہ دیکھتے ہی کہتے تھے "آئیے، آئیے، ... ئے"۔ ۱۸ کی صبح کو جب گیا تو ایسا محسوس ہوا کہ تصویر کہہ رہی ہے:

بہت دیر کی مہرباں آتے آتے۔

مالک رام جیسے جامع الاخلاق و جامع الصفات صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ اُن کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے اُس کا پُر ہونا دشوار ہے۔ اروناؔ اور سلمان کینیڈا میں ہیں سلمان کچھ دن پہلے یہاں سے گئے ہیں۔ آفتاب انگلستان میں ہیں۔ میں نے ایک دن اُن سے آفتاب کے کوائف پوچھے۔ بولے: "وہ ہندوستانی ہے۔ انگلستان میں رہتا ہے اور انگریزوں کو جرمن پڑھاتا ہے"۔

خطوطِ ابوالکلام کی دوسری جلد زیرِ ترتیب تھی۔ خدا کرے اس کا مسودہ انہوں نے مطبع کو یا ساہتیہ اکادمی کو بھیج دیا ہو۔ اُن کا کتب خانہ بڑا قیمتی ہے جسے انہوں نے حکیم عبدالحمید صاحب دہلوی کو اپنی زندگی ہی میں دے دیا تھا۔ اب وہ ہمدرد یونیورسٹی کو منتقل ہو جائے گا یا حکیم صاحب کی قائم کردہ غالب اکیڈمی کو بھیج دیا جائے گا۔

غالبیات سے متعلق اُن کی بیشتر کتابیں جناب کالی داس گپتا رضا صاحب کے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ مالک رام کے بارے میں آپ کے تاثرات مختصر ہیں لیکن بہت اچھا مضمون ہے۔ اس کی عکسی کاپیاں دوستوں کو بھیج دی ہیں۔ اُمید ہے آپ بخیر ہوں گے۔

والسّلام

مختار الدین احمد

"میرے دل میں مالک رام کی قدر و منزلیت کا بنیادی سبب یہ تھا کہ مالک رام ایک سچے اور بلند پایہ انسان تھے گویا مجسم انسانیت۔

(حیات اللہ انصاری)

"مالک رام صاحب پوری اردو دنیا کے مشیر و معاون تھے۔

(جی ڈی چندن)

"ان کے ذکر کے بغیر تاریخ ادب اردو نامکمل ہے۔"

(شاہد علی خان)

قومی زبان (۹۷) اپریل ۱۹۹۴ء

مالک رام کے نام کام اور ادبی مقام کو دوام حاصل ہے

ڈاکٹر انور سدید

ابھی ابھی محمد عالم مختار صاحب نے ٹیلی فون پر بتایا ہے کہ اردو ادب کی ایک سعید شخصیت مالک رام آنجہانی ہو گئے ہیں ہائے ہائے! مالک رام کے نام ان کے ادبی مقام اور غالبیات میں ان کے کام اور اس کام کے دوام سے میں ایک عرصے سے شناسا تھا ان کی ادبی جہات سے جو تصویر بنتی تھی بے حد مرصع وہ بے حد منوّر تھی لیکن دلی میں غالب سیمینار میں اس سے ملاقات ہوئی تو میں حیران رہ گیا کہ ایک شخص جس نے اپنے جسم کے استخوان پر سیاہ شیروانی چڑھا رکھی تھی میرے جیسے خاک افتادہ کا ذکر اس طرح کر رہا تھا جیسے میں ان کا طالب علم نہیں ہوں بلکہ وہ میری کج مج بیانیوں سے استفادہ کرنے والے ہوں۔ انجمن ترقی اردو کے جلسے میں ڈاکٹر خلیق انجم نے انہیں صدر کی کرسی پر رونق افروز کر رکھا تھا پاکستان سے مدعو کیے گئے مندوبین کو مالک رام صاحب کے ساتھ ڈائس پر جگہ دی گئی تھی میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے ان کے پہلو میں جگہ ملی میں ابھی اپنے اس اعزاز کی مسرتیں جمع کر ہی رہا تھا کہ مالک رام صاحب نے ایک مجلّد کتاب جس پر کاغذ کا خوبصورت غلاف چڑھا ہوا تھا میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا

"یہ آپ کی تصنیف "اردو ادب کی تحریکیں" ہے اس پر دستخط کر دیجیے" میں اس وقت مالک رام کی سعید شخصیت کو یاد کر رہا ہوں تو یہ الفاظ اب بھی میرے کانوں میں رس گھول رہے ہیں یہ کتاب شاید انہیں مشفق خواجہ صاحب نے انجمن ترقی اردو پاکستان (کراچی) سے بھجوائی تھی یا شاید انھوں نے اپنے ذرائع سے مہیا کی تھی لیکن میرے لیے اچنبھے کی بات یہ تھی کہ مالک رام صاحب اسے اپنے ساتھ اس محفل میں لائے تھے اور ذرّہ فرومایہ پر اپنا انکسار اس طرح نچھاور کر رہے تھے کہ وہ کبھی اپنے آپ کو دیکھتا کبھی اپنی ناچیز تصنیف کو دیکھتا کبھی مالک صاحب کی طرف دیکھتا اور پھر اپنی کم مائیگی کا احساس کر کے گردن نیچے ڈال دیتا۔

۱۹۸۸ء میں دلی جانے کا اتفاق ہوا تو میرے دل میں جن ادیبوں کی قدم بوسی کی آرزو تھی ان میں مالک صاحب سرفہرست تھے وہ ان ممتاز ادیبوں میں سے تھے جن کی تحریریں ان کی اپنی شخصیت کا نقش ہوتی ہیں جن کی روشن خیالی اور وسیع القلبی سے انسانیت میں اعتماد پیدا ہوتا ہے جو تنگ نظری اور تعصب سے دور رہنے کی تلقین و تبلیغ نہیں کرتے بلکہ اپنے عمل سے ثابت کرتے ہیں کہ ادیب وسیع المشرب اور عالی ظرف ہوتا ہے اور وہ اپنے عقیدے کے مدار میں رہ کر بھی دوسرے عقائد کے لوگوں کے لیے اپنے دل میں محبت اور احترام کے جذبات پیدا کر سکتا ہے مالک رام ایک ایسے ہی عظیم ادیب تھے ان کی عظمت بالکل غیر اشتہاری اور غیر متنازعہ تھی۔

ریاض مجید دلی سے لوٹے تو میں نے پوچھا "کس کس ادیب سے مل کر آپ کو سچی خوشی ہوئی؟" ریاض مجید نے بلا تامل

جواب دیا "پنڈت مالک رام سے" ...... میں نے سوال کیا "اس کی وجوہ کیا ہیں؟" ریاض مجید بولے "ادب اور انسانیت سے ان کی بے لوث اور بے ریا محبت" پھر بولے شمالی ہندوستان کی مشترکہ تہذیب ان کی رگ و پے میں رچی ہوئی ہے اور ان کے بعض عقیدے مسلمانوں جیسے ہیں" یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کے لیے پھر بولے "ہم ان کے دولت خانے پر سلام روستائی کے لیے حاضر ہوئے آپ نے اپنے مخصوص شیریں لہجے میں اندر آواز دی "بشریٰ! مہمانوں کے لیے چائے بھجواؤ" پھر فرمانے لگے بشریٰ میری بیٹی کا نام ہے" ہماری خاموشی کا مفہوم انھیں معلوم تھا انھوں نے وضاحت فرمائی کہ اوشا اور ارونا کے بعد جب میری تیسری بیٹی پیدا ہوئی تو میں اسکندریہ (مصر) میں متعین تھا دل میں بیٹے کی آرزو تھی کسی نے بتایا کہ بیٹی کا نام اگر بشریٰ رکھا جائے تو حق تعالیٰ بیٹا عطا کرتا ہے" مالک رام صاحب کی یہ آرزو پوری ہوئی ان کے ہاں بشریٰ کے بعد دو بیٹے پیدا ہوئے انھوں نے ایک کا نام آفتاب اور دوسرے کا نام سلمان رکھا اس تسمیہ پر ان کے خاندان کے اروڑہ کھتریوں نے تعجب کا اظہار کیا تو انھوں نے جواب دیا۔

"میرے گھر والوں نے بھی تو میرا نام مالک رام رکھا تھا"

مالک رام ان ہندوؤں میں سے تھے جو اسلام کی حقانیت کے قائل تھے انھوں نے اسلامی علوم اور قرآن پاک کا مطالعہ فکر و نظر کی طہارت سے کیا تھا اور اس مطالعے کے لیے عربی زبان پر عبور حاصل کیا تھا اسلامیات کے سلسلے میں ان کی دو کتابوں کا حوالہ بہت زیادہ دیا جاتا ہے ایک "عورت اور اسلامی تعلیم" اور دوسری "اسلامیات" اوّل الذکر کتاب میں انھوں نے عورت کی چار حیثیتوں کو اسلامی احکامات اور ہدایات کی روشنی میں نمایاں کیا اور اس کے لیے قرآن و حدیث سے بہ کثرت استدلال کیا گیا ہے عورت کی یہ چار حیثیتیں ہیں اوّل بیٹی دوم بیوی سوم ماں اور چہارم وارثہ ...... ڈاکٹر عبدالمغنی نے لکھا ہے کہ مالک رام نے صحیح نقطہ نظر سے مسئلے کا حل دریافت کرنے کی سعی کی ہے اور اس معاملے میں ان کی سلیم الطبعی اور بصیرت قابل رشک ہے اسلامیات میں بھی اصولی موضوعات ہیں مثلاً ایک مضمون کلمۂ توحید پر اور دوسرا اسلامی خلافت پر ہے۔ مضمون "الاسلام" میں لفظ اسلام کے اصطلاحی مفاہیم کو روشن کیا گیا ہے اور عالمی سطح پر انسانی یکجہتی کے مسلمات یہ پیش کیے گئے ہیں۔

۱۔ "اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کی جائے"

۲۔ کسی کو اللہ تعالیٰ کا شریک نہ بنایا جائے

۳۔ انسانوں کے ساتھ ایسا برتاؤ واجب نہیں جس سے ایک انسان دوسرے انسان کو اپنا پروردگار سمجھنے لگے۔

یہ چند باتیں میں نے اس لیے عرض کی ہیں کہ مالک رام اہل ہنود میں سے تھے لیکن ان کا اسلام کا مطالعہ اتنا وسیع تھا کہ اس موضوع پر کتابیں لکھنے پر قادر ہوئے ان کی کتابوں کو علمی ادبی اور مذہبی حلقوں میں محبت کی نظر سے دیکھا گیا اور یہ باور کیا جانے لگا کہ وہ روایتی مسلمانوں سے زیادہ مسلمان نظر آتے ہیں ریاض مجید نے ان کے گھر میں جس مشرقی تہذیب کا جلوہ دیکھا اس کی اساس پر کہنے لگے کہ "مالک رام مجھے تو اندر سے مسلمان نظر آتے ہیں" جگن ناتھ آزاد نے اس بات پر فخر کا اظہار کیا ہے کہ "انھوں نے قرآن مجید پڑھنے کی آرزو کی تکمیل کی کوشش کی تو مالک رام ان کے معاون بن گئے چنانچہ قرآن کی تعلیم میں جگن ناتھ آزاد انھیں اپنا استاد تسلیم کرتے ہیں مالک رام بنیادی طور پر تحقیق کے آدمی تھے ڈاکٹر گیان چند جین نے انھیں سب سے بڑا ماہر غالبیات تسلیم کیا ہے غالب پر ان کی تحقیق کا شمار نہیں ہے تدوین کے سلسلے میں انھوں نے مولانا ابوالکلام کی کتابوں "تذکرہ" "غبار خاطر" اور خطبات پر قابل قدر کام کیا ان کے متون کی تصحیح کے علاوہ تحشیہ نگاری بھی کی۔ شخصیات کے مطالعے

انھیں جو دسترس حاصل تھی اس کے بعض نادر نمونے "وہ صورتیں الہیٰ" میں جمع ہیں اور اب بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک عظیم مرقع نگار تھے سہ ماہی "تحریر" میں انھوں نے وفات پاجانے والے ادیبوں کے بارے میں ایسی نادر معلومات جمع کردیں کہ اب یہ مضامین ہی ان ادیبوں کے حالات و کوائف کے بنیادی ماخذات بن گئے ہیں۔ میرے نزدیک ان کی عظمت کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ تحقیقی اغلاط کو قبول کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ ڈاکٹر حنیف نقوی نے ان کی کتاب "تلامذۂ غالب" کی اغلاط بتائیں تو انھوں نے جزوی اختلاف کے ساتھ انھیں قبول کیا اور کتاب کے اگلے ایڈیشن میں ان کی تصحیح کی اور دلچسپ بات یہ ہے کہ حنیف نقوی کی کتاب کا دیباچہ بھی مالک رام نے ہی لکھا افسوس اب وہ اس دنیا میں نہیں۔

United

PID 1 19 8/90

"مالک رام...... ایران سے ہندوستان تک"

پروفیسر کلیم سہسرامی
راجشاہی یونیورسٹی۔ بنگلہ دیش

ملک سے باہر کسی سے عارضی ملاقات کبھی ایسی دیرپا ثابت ہوتی ہے کہ تمام زندگی تعلقات کا سلسلہ قائم رہتا ہے اور آہستہ آہستہ اس میں کچھ ایسی استواری پیدا ہو جاتی ہے جس سے انسانی زندگی کے بہت ہمارے تاریک گوشے روشن ہو جاتے ہیں۔ ۱۹۶۵ء کی ہند و پاک جنگ ختم ہوتے ہی میں راجشاہی یونیورسٹی کے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے فارسی میں ڈاکٹریٹ کے لیے تہران یونیورسٹی گیا ہوا تھا، وہاں تعلیمی مشاغل کے ساتھ ادبی سرگرمی کا بھی سلسلہ تھا۔ ماہانہ مشاعرے باری باری پاکستان کے صاحب ذوق شخص کے گھر منعقد ہوا کرتے تھے، جس میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری مرحوم اور جناب مہدی مسعود (سفارت پاکستان کے کاؤنسلر پابندی کے ساتھ اور کبھی کبھی ن۔م راشد صاحب شریک ہو کرتے تھے، جب ۱۹۶۹ء کا آغاز ہوا تو ہندوستان و پاکستان میں غالب صدی کے پروگرام کی اطلاع ملی، پاکستانی طلبہ وطالبات نے بھی "ہفتۂ غالب" کی تقریب کے لیے ساتھ تقریریں ریڈیو تہران میں ریکارڈ کرا کے ریڈیو زاہدان کے اردو پروگرام کے لیے بھیجدیں۔ غالب کے ناتے مشیت ایزدی کی طرف سے ایسی صورت پیدا ہو گئی کہ برصغیر کے معروف معتبر غالب شناس جناب مالک رام صاحب اسی سال تہران تشریف لائے۔ زیر نظر مضمون میں مالک رام صاحب کے ساتھ ایران سے ہندوستان تک اپنے تعلقات کی سرگزشت پیش ہے:

"یک جہان و آن ہم از خون تمنا ساختی

۱۹۶۹ء جون کا آخری مہینہ یا جولائی کا اوائل تھا، تہران یونیورسٹی میں گرمیوں کی تعطیل تھی، ایک دن ڈاکٹر اظہر دہلوی نے بتایا کہ مالک رام صاحب تہران پہنچ چکے ہیں، کل دن کے دس بجے تہران یونیورسٹی کے سامنے کتابوں کی دوکان میں خریداری کے لیے آئیں گے، اگر ملنا چاہتے ہو تو آجاؤ میں نے کہا، انہیں پڑھا تو بہت ہے لیکن دیکھا نہیں، اسی لیے ضرور آجاؤں گا۔ چنانچہ حسب وعدہ بر وقت تہران یونیورسٹی کے بالمقابل پہنچ گیا، اظہر صاحب موجود تھے، دس پندرہ منٹ بعد ایک ٹیکسی رکی اور اس میں سے ایک سن رسیدہ لیکن دراز قد شخص شیروانی، ٹوپی میں ملبوس نکلے اظہر صاحب نے ان سے میرا تعارف کرایا تو وہ بہت خوش ہوئے، پھر ہم دونوں ان کے ساتھ کتابوں کی دوکان کا چکر لگاتے رہے۔ کچھ کتابیں دیکھیں اور کچھ خریدیں۔ پھر انہیں تہران یونیورسٹی کے احاطے میں لے گئے مختلف فیکلٹیوں کی سیر کرائی، پیدل چلتے رہے، اس کے بعد یونیورسٹی کی نو تعمیر مسجد میں لے گئے، جس پر سنگ مرمر کی ایک تختی پر یہ الفاظ کندہ تھے کہ جنرل ایوب خان صدر پاکستان نے اس کا سنگ بنیاد رکھا، کچھ آگے گئے تو برآمدے میں شیشے کی چند الماریاں تھیں جن میں فارسی مخطوطات نمائش کے لیے رکھے ہوئے تھے۔ مالک رام صاحب

نے نہایت توجہ سے انھیں ملاحظہ فرمایا، اس کے بعد ایک بڑے سے کشادہ صحن میں داخل ہوئے جس میں وضو کے لیے حوض بنا ہوا تھا، اس سے گزر کر اصل مسجد کا برامدہ شروع ہوا جہاں ہم سب جوتے اتار کر مسجد کے اندرونی ہال میں داخل ہوئے، چاروں طرف نظر دوڑائی۔ گنبد کی چھت میں جلی خط نسخ میں عربی کی عبارتیں لکھی ہوئی تھیں، ڈاکٹر اظہر نے مالک رام صاحب کی توجہ اس طرف مبذول کراتے ہوئے کہا کہ دیکھیے خطاطی کا فن اب بھی ایران میں زندہ ہے، کلام مجید کی آیتیں کس قدر نفیس انداز میں لکھی ہوئی ہیں۔ مالک رام صاحب نے ایک نظر دوڑائی اور چند منٹ بعد فرمایا کہ یہ کلام اللہ کی آیات نہیں ہیں، مجھے بڑا تعجب ہوا کہ ایک مسلمان کے نزدیک یہ کلام مجید کی آیتیں ہیں اور ایک غیر مسلم کے خیال میں نہیں۔ میں نے خموشی کے ساتھ ان کے ہمراہ ہال کا چکر لگاتے ہوئے بار بار کوشش کی کہ کہیں سے کلام اللہ کی آیتوں کا کوئی ٹکڑا مل جائے تو بقیہ عبارت پڑھنا مشکل نہیں لیکن اپنی کاوش میں ناکام ہو کر سوچتا رہا کہ اگر یہ کلام اللہ کی آیات نہیں ہیں تو اور کیا ہیں؟ میرا ذہن شیعی دینیات کی طرف کچھ دیر کے لیے منتقل ہو گیا۔ ہم لوگ جب مسجد سے باہر نکلے تو نہایت ادب کے ساتھ مالک رام صاحب سے استفسار کیا کہ مسجد کے اندر جن آیات کے متعلق آپ نے ابھی فرمایا کہ ان کا تعلق کلام اللہ سے نہیں ہے تو وہ کیا ہیں؟ انھوں نے مسکرا کر فرمایا کہ پہلے تم بتاؤ کہ تمھارے علم میں کیا ہیں؟ میں نے جواب دیا کہ اگر یہ کلام اللہ کی آیات نہیں ہیں تو پھر یہ "نادعلی" ہے جس کا تعلق شیعی معتقدات سے ہے۔ انھوں نے فوراً میری تائید کی اور بہت خوش ہوئے۔ ہم لوگوں سے رخصت ہو کر اپنے ہوٹل چلے گئے۔ اور عصر کے وقت اپنی خدمت میں حاضر ہونے کا وعدہ لیا۔ میں اپنی قیام گاہ پر چلا آیا۔ شام کو ڈاکٹر صابر آفاقی کو لے کر ان کے ہوٹل پہنچا۔ صابر صاحب کا تعارف کرایا کہ ان کا تعلق مظفر آباد سے ہے آزاد کشمیر سے ہے۔ تہران یونیورسٹی میں کشمیر کی تاریخ قدیم "راج ترنگینی" پر کام کر رہے ہیں۔ پھر ہم دونوں مالک رام صاحب کو لے کر میدان سپاہ چلے گئے، اس کے بعد بازار بزرگ کی سیر کرائی جو بذاتِ خود ایک بھول بھلیاں ہے انھیں یہ بھی بتایا کہ اس بازار بزرگ کی اندرونی راہوں سے گزر کر اس کے ایک کنارے پر ایک ذاتی کتاب خانہ ہے جس کا نام "کتاب خانۂ ملک" ہے، جہاں قلمی کتابوں کا خاصی تعداد میں بیش بہا ذخیرہ ہے، مالک رام صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ تب یہاں چلنا چاہیے ہم لوگوں نے عرض کیا کہ راستہ ہمیں معلوم نہیں کل دوسرے احبا کو لیکر آئیں گے جو ان گلی کوچوں سے واقف ہیں، ویسے بھی شام کو یہ جلد بند ہو جاتا ہے۔ چنانچہ دوسرے دن ڈاکٹر اظہر دہلوی اور پروفیسر سید امیر حسن عابدی صاحب (جو آج کل دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے استاد ممتاز ہیں) اور شبیر اختر صاحب (وائس پرنسپل پاکستان انٹر کالج تہران) کو لے لیا گیا، اتفاق سے عابدی صاحب باشگاہ دانشگاہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہم لوگوں کا یہ قافلہ یونیورسٹی کے سامنے والی سڑک سے صبح ناشتے کے بعد روانہ ہوا، تہران ہی نہیں ایران کی راہوں کی انسائیکلوپیڈیا شبیر اختر صاحب اسی قافلے کے رہنما تھے، ہم لوگ کئی ٹیکسیوں میں بیٹھ کر بازار بزرگ پہنچ گئے، اور پھر خراماں خراماں پُرپیچ گلیوں سے گزرتے ہوئے ملک لائبریری پہنچ گئے، یہ ایران کے ایک صاحب ذوق شخص کا ذاتی کتاب خانہ ہے اور قلمی نسخوں کے لیے مشہو.. بہت سارے اسکالر پہلے ہی سے لائبریری میں مشغول تحقیق تھے، ہمارے قافلے کو دیکھ کر چونکے، شبیر اختر صاحب نے مالک رام صاحب کو کتابوں کی فہرست دکھائی اور ان کی خواہش کے مطابق دو کتابوں کی سلپ لائبریری کے ملازم کے حوالے کی، اس نے کچھ دیر کے بعد دونوں کتابیں لاکر مالک رام صاحب کے سامنے رکھ دیں، مالک رام صاحب نے اس سلسلے کی تیسری کتاب دیکھنا چاہی، وہ بھی آگئی، اس کے بعد چند اور قلمی نسخے کی مالک رام صاحب نے فرمائش کی، لائبریرین نے انکار کر دیا کہ ایک دن میں ہر شخص کو صرف تین کتابیں دی جا سکتی ہیں، شبیر اختر صاحب نے اسے بتایا کہ ہندوستان سے ایک مشہور اور بزرگ محقق، وسط

ایشیا اور ترکی کے کتب خانوں میں کلام مجید کے قلمی نسخوں کا جائزہ لیتے ہوئے آئے ہیں، آپ کے یہاں کے نسخوں کو دیکھنے کے بعد یہ فیصلہ کریں گے کہ کون سا نسخہ قدیم ترین ہے اس لیے ازراہ کرم انھیں کم از کم دو مطلوبہ قلمی نسخے دکھا دیئے جائیں، غرض ایسا ہی ہوا، "ملک لائبریری" سے واپسی میں پھر ہم لوگ قافلے کی صورت میں واپس ہوئے، پلٹ کر جب ہم لوگ ساتھیوں کو گننے لگے تو معلوم ہوا کہ پروفیسر عابدی صاحب کہیں پیچھے رہ گئے ہیں، تلاش شروع ہوئی تو کسی دکان میں ایران کے تفصیلی نقشے کا جائزہ لیتے ہوئے پائے گئے، دوسری بار جب پھر گم ہوئے تو کسی کتاب کی دوکان میں پائے گئے، مالک رام صاحب نے فرمایا کہ یہ کوئی نئی بات نہیں، دلّی میں بھی پروفیسر عابدی صاحب ہم لوگوں سے اسی طرح بچھڑ جاتے ہیں، ایسا حادثہ ان کے ساتھ ہوتا رہتا ہے، واپسی میں مجھ سے وعدہ لیا کہ شام کو آجاؤ پھر کہیں چلیں گے، میں اور صابر آفاقی صاحب ان کے ہوٹل پہنچ گئے، منتظر بیٹھے ہوئے تھے، ٹیکسی کے ذریعہ انھیں تہران کے کچھ اور علاقوں میں لے گئے، شہر کے اندر شاہ کا محل دکھایا، مسجد سپہ سالار کی زیارت کرائی، یہاں کی لائبریری بند ہو چکی تھی، میں نے ان سے ذکر کیا کہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری صاحب بھی آج کل یہیں یونسکو کے سربراہ ہیں، اگر وہ ان سے ملنا چاہیں تو میں فون پر وقت متعین کرلوں، مالک رام صاحب نے فرمایا کہ یہ اچھا موقع ہے ضرور اختر صاحب سے ملا جائے، میں نے رات کو فون پر اختر صاحب کو اطلاع دی وہ بہت خوش ہوئے اور ملاقات کا وقت دوسرے دن مقرر ہو گیا، میں اور صابر آفاقی صاحب انھیں ٹیکسی میں لے کر اختر صاحب کے یہاں پہنچے، دونوں حضرات ایک دوسرے سے گلے لگ ملے چائے اور ناشتے کے ساتھ جو گفتگو شروع ہوئی تو غالب و مومن کی شاعری اور نثری اہمیت سے لے کر مولانا ابوالکلام آزاد اور نیاز فتح پوری کی ادبی کارگزاری کلام غالب کا نسخۂ بھوپال نہ جانے کتنے موضوعات کو ان دونوں بزرگوں نے ایک گھنٹے میں سمیٹ لیا۔ پھر ہم لوگ جب مالک رام صاحب کو ہوٹل پہنچا کر واپس آنے لگے تو روک لیا کہ میاں رات کے ۸ بجے ہیں کھانے کا وقت ہو گیا، کھانا کھاتے جاؤ۔ انکار و اصرار کے باوجود انھوں نے اجازت نہ دی، گویا دو دن میں نے اور آفاقی صاحب نے ان کے ساتھ ہوٹل میں کھانا کھایا، جب ہم لوگوں نے کہا کہ آپ خواہ مخواہ زیر بار ہوں گے تو فرمایا کہ وہ حکومت ہند کے مہمان ہیں، کبھی ہم لوگ بھی مہمانی قبول کرلیں، اس میں دونوں ملک یعنی ہندوستان اور پاکستان تو حائل نہیں ہوتے۔ غرض کھانے کے دوران اور بھی بہت ساری ادبی گفتگو ہوتی اور ہم دونوں اس سے مستفید ہوتے۔ ایک دن صبح کے دس بجے میں اور شبیر اختر صاحب مالک رام صاحب کو "کاخ گلستاں" لے گئے، اس کا باغ، فوارے، عمارت قابلِ دید ہیں۔ اس میں وہ تمام نادر تحفے بڑے قرینے سے سجائے گئے ہیں جنھیں مختلف ممالک کے بادشاہوں اور حاکموں نے مختلف دور میں ایران کے مختلف حکمرانوں کو پیش کیا تھا، تمام تحفوں پر پیش کش کرنے والوں کے نام بھی درج ہیں۔ ہال سے نکل کر جب ہم لوگ "کاخ گلستاں" کے بیرونی حصے میں آئے تو ایک تصویر میں نے مالک رام صاحب کے ساتھ لی اور دوسری شبیر اختر صاحب نے پھر انھیں "موزۂ مردم شناسی" لے گئے یعنی ایسے عجائب گھر میں جہاں انسانوں کی نقلی تصویر میں کچھ جان ڈال دی گئی ہو، یہاں ایک دیوار پر کربلا کا منظر بھی پیش کیا گیا ہے جس کے پس منظر میں خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں اور یزیدی فوج کے مقابل حسینی فوج کا نقشہ بڑی ہی ہنرمندی سے بنایا گیا ہے مالک رام صاحب ایرانیوں کی اس دستکاری سے بہت متاثر ہوئے۔ جب ہم لوگ انھیں واپس لے کر ہوٹل پہنچے تو یہ مسئلہ درپیش آیا کہ ان کے ساتھ بہت ساری کتابیں ہیں جنھیں ہوائی جہاز سے لے جانا، ان کے لیے ممکن نہیں، چنانچہ میں نے اور شبیر اختر صاحب نے مشترکہ طور پر یہ ذمہ داری لے لی، اور ٹیکسی کے ذریعے کتابیں اپنے یہاں لے آئے۔ اس میں مقصد یہ تھا کہ نادر و نایاب کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ان سے فائدہ اٹھایا جائے اور ان کا پیکٹ بنا کر مالک رام صاحب کے مکان کے پتے پر

ڈیفنس کالونی نئی دلی بھیج دیا جائے۔ غرض ہر ہفتے چار پانچ کتابوں کا ایک یا دو پیکٹ بھیجنا شروع کیا۔ اس سلسلے میں ۱۲ اگست کو انھیں خط لکھ دیا تھا کہ کتابوں کے بنڈل بھیج رہا ہوں۔ مالک رام صاحب نے میرے خط کا فوراً جواب دیا جس کی نقل نیچے درج ہے:

DEFFNCECOLONY ۹۱ – C

۳ - NEWDELHI

اگست ۱۹۶۹ء

عزیز محترم، دعوات

۱۲۔ اگست کا گرامی نامہ کا شکریہ۔ آپ کی پریشانیوں کا حال پڑھ کر افسوس ہوا۔ دعا ہے کہ خدا تعالیٰ آپ کو اور آپ کے اہل و عیال کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ پردیس اور اس پر یہ مکروہات! خدا خیر کرے۔ .... کتابوں کی ترسیل کے سلسلے میں آپ کو بہت زحمت ہوئی۔ میں نے اکمل صاحب سے اس لیے کہا تھا کہ آپ کو اس تکلیف سے نجات مل سکے لیکن آپ کی محبت اور مروت آپ پر غالب آئی۔ بہر حال اس سلسلے میں آپ کا ممنون احسان ہوں، کتابیں جب چل پڑی ہیں تو دیر سویر پہنچ جائیں گی، تشویش کیا ہے؟ ... خود اختر راہی ... چوہدری صاحب سے مل کر بہت خوشی ہوئی، خدا انھیں خوش خرم رکھے آمین۔ ملنے پر میرا سلام پہنچا دیجیے ... اختر صاحب اور آفاقی صاحب سے بھی سلام کہیے،

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

جب میرے بھیجے ہوئے کتابوں کے پارسل مالک رام صاحب کو مل گئے تو انھوں نے ایک خط کے ذریعے مطلع فرمایا اور اس کی رسید بھیجی، یہ خط بھی قارئین کرام کی دلچسپی کے لیے نقل کیا جاتا ہے۔

۱۹ ستمبر ۱۹۶۹ء

کرم فرمائے من جناب کلیم صاحب، آداب

چند دن ہوئے میں نے ایک خط آپ کی خدمت میں لکھا ہے۔ خدا معلوم آپ تک پہنچا یا نہیں،

آپ کے مرسلہ پانچوں پارسل موصول ہو گئے، سب کتابیں محفوظ تھیں، لیکن آپ نے ایک ظلم کیا کہ کتابوں پر جو کاغذ لگایا وہ اکہرا تھا، اور زیادہ مضبوط بھی نہیں تھا۔ اس لیے عرض راہ میں قدرتاً پھٹ گیا۔ یہ ڈاکخانہ والے جیسے ظالم اور بے پروا ہوتے ہیں، وہ تو آپ جانتے ہی ہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ سب جلدیں خراب ہو گئیں،

آپ کا مقالہ مکمل ہو کر داخل ہو چکا ہوگا اور اب آپ واپسی کی تیاری میں ہوں گے، دعا ہے کہ خدا آپ کو اپنے عزائم میں کامیاب اور خوش و خرم رکھے آمین!

والسلام والاکرام

مالک رام

مالک رام صاحب سے تہران میں جس تعلق کی داغ بیل پڑی تھی وہ آہستہ آہستہ استوار ہوتی گئی یہاں تک کہ سقوط مشرقی

قومی زبان (۸۷) اپریل ۱۹۹۴ء

پاکستان کے سلسلے میں میرے بزرگ تھسان کارن پڑا تو میری خیروعافیت کے لیے وہ برابر تشویش کا اظہار کرتے رہے اور کئی بار محترمی پروفیسر مختار الدین احمد صاحب (مقیم علی گڑھ) سے میری خیریت دریافت کی۔ اور اضطراب و اضطرار کا یہ عالم تھا کہ میرے لیے دعائیں بھی فرماتے رہے جس کا ذکر کئی مرتبہ پروفیسر صاحب موصوف نے کیا۔ اس طرح ان کا وقار و احترام میرے دل میں اور بڑھتا گیا۔ ۱۹۸۰ء دسمبر میں جب میں غالب انسٹی ٹیوٹ دلی کی دعوت پر بین الاقوامی سیمنار میں شرکت کے لیے دلی گیا تو بڑے خلوص سے ملے۔ سیمنار ختم ہوتے ہی میں اور ڈاکٹر محمد بشیر حسین (پنجاب یونیورسٹی میں فارسی کے پروفیسر) مخدومی پروفیسر نذیر احمد صاحب کی دعوت پر ان کے ہمراہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فارسی سیمنار میں جانے لگے تو ہم دونوں سے وعدہ لیا کہ وہاں سے واپسی پر دلی آنا ہوگا اور ان کے یہاں چائے کی دعوت پر شریک ہونا پڑے گا۔ چنانچہ میں اور ڈاکٹر بشیر حسین علی گڑھ سے لوٹ کر دلی آئے، اور ۲ جنوری ۱۹۸۱ء کو مالک رام صاحب کے یہاں شام کی چائے پر شریک ہوئے اس میں پاکستانی سفارت خانے کے پریس کاؤنسلر انجمن ترقی اردو ہند کے ایم حبیب خان وغیرہ بھی شریک تھے، مالک رام صاحب نے ازراہ سرپرستی ہم لوگوں کو اپنی تصانیف بھی نذر کیں اور اپنے دست قلم سے نام بھی لکھ دیے۔ غرض تہران کی ملاقات کی تجدید اس طرح ہوئی۔ پھر دلی اور بنگلہ دیش کے درمیان ہم دونوں کی خط و کتابت گاہے گاہے ہوتی رہی، بقول مرزا رفیع سودا:

سرسری ان سے ملاقات ہے گاہے گاہے
صحبت غیر میں گاہے، سر راہے گاہے

مالک رام صاحب سے ہندوستان میں آخری بار میری کئی ملاقاتیں ہوئیں جب میں غالب انسٹی ٹیوٹ دلی کے بین الاقوامی غالب سیمنار میں شرکت کے لیے دسمبر ۱۹۹۱ء کے تیسرے ہفتے میں دلی گیا۔ ان کی صحت بہت خراب ہوگئی تھی، کافی کمزور ہوگئے تھے، زیادہ دیر تک جلسے میں بیٹھ نہیں سکتے تھے، اور خاص طور پر راتوں کو کسی ادبی جلسے یا کھانے کی دعوت میں شریک نہیں ہوتے تھے، غالب سیمنار کے فوراً بعد مولوی عبدالحق صاحب پر انجمن ترقی اردو ہند (دہلی) کے زیر اہتمام ۲۸ دسمبر سے ۳۱ دسمبر ۱۹۹۱ء تک چار روزہ سیمنار تھا، اس میں بھی مجھے اور میرے ہمراہ شام بارکپوری صاحب کو شریک ہونا تھا۔ پاکستان سے ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، جناب مسعود برکاتی، (ہمدرد والے) عزیز گرامی طاہر مسعود وغیرہ بھی تشریف لائے ہوئے تھے، پہلے دن مقالہ خوانی کی صدارت مالک رام صاحب نے انجمن ترقی اردو کی عمارت کے ہال میں فرمائی۔ ان کی مفید باتوں سے ہم سب مستفید ہوئے، جب مجھ سے گفتگو ہوئی تو فرمانے لگے غالب سے لے کر عبدالحق سیمینار تک بنگلہ دیش کی نمائندگی صرف آپ کرتے ہیں، اس سے آپ کی ادبی سرگرمی کے ساتھ یہ اندازہ لگتا ہے کہ بنگلہ دیش میں بھی اردو کا مستقبل روشن ہے۔ میں نے عرض کیا، دیکھیے میرے ملک کے یہ دوسرے نمائندہ شام بارکپوری صاحب بھی یہاں موجود ہیں۔ ۱۳ دسمبر کی سہ پہر میں "غالب اکیڈمی" بستی نظام الدین نے اپنے ہال میں مالک رام کی عمر ۸۵ سال پورے ہونے پر ایک جلسہ کا اہتمام کیا تھا اور عبدالحق سیمینار کے نمائندوں کو بھی خاص طور پر مدعو کیا تھا، بنگلہ دیش کی نمائندگی کے لیے میں اور شام صاحب دونوں اس میں شریک تھے، بلکہ میں نے تو مالک رام صاحب کے اعزاز میں ایک تقریر بھی کی جس میں اپنے ذاتی تعلقات اور تہران کی ملاقات پر روشنی ڈالی۔ ان کی صحت و سلامتی کے لیے دعائیں بھی کیں تاکہ قارئین کے ساتھ ساتھ اردو ادب بھی ان کی گراں قدر خدمات سے فیض یاب ہوسکے۔ ایک اور دل چسپ بات رہی جاتی ہے جس کا بیان انتہائی ضروری ہے اور اس کا تعلق جناب مالک رام کی عاجزی و انکساری سے ہے، ہریانہ اردو اکیڈمی کی طرف سے ہریانہ بھون دلی میں ایک دن صبح کا اجلاس تھا اور وہ ... کا

کھانا مالک رام صاحب اپنی پیری کے باوجود ایک کنارے کھڑے ہوئے کھا رہے تھے، ان کی معاونت کے لیے میں اور طاہر مسعود صاحب ان کے پہلو میں کھڑے ہوئے تھے، بر سبیل تذکرہ مشفق خواجہ صاحب کا نام زبان پر آگیا، بڑی لجاجت اور سادگی سے فرمانے لگے کہ دیکھیے خواجہ صاحب نے اپنی کتاب "تحقیق نامہ" میرے نام انتساب کی اور میرے بارے میں ایسی بات لکھ دی جس کا میں اہل نہیں، مجھے اس قدر زیر بار کیا کہ اس پیری میں اس کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ مجھے تو بس ادب سے سرسری طور پر دل چسپی ہے اور خواجہ نے تحقیق کے میدان میں جو نام پیدا کیا ہے وہ قابل رشک بھی ہے اور لائق تقلید بھی۔ ہم لوگوں نے عرض کیا کہ خواجہ صاحب کی تحقیق اپنی جگہ بجا لیکن ہم لوگ آپ کی تحریروں سے نہ سیکھیں گے تو اور کس سے! آپ کی ذات گرامی ہم لوگوں کے لیے دنیائے تحقیق میں مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ زیر لب مسکرائے اور فرمایا آپ بھی خواجہ صاحب ہی کے ساتھ ہوگئے۔ اسی گفتگو میں میری کتاب "بنگال میں غالب شناسی" کی توصیف بھی کی اور کچھ مفید مشورے بھی دیئے میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور اس طرح تہران کے بعد ہندوستان میں مالک رام صاحب سے میری ملاقات کی آخری زنجیر ٹوٹ گئی "حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا"

ازراہ کرم مضامین میں اختصار کا خیال رکھیں

ذکرِ مالک رام

از ضیاء الدین اصلاحی

اردو کے مشہور عالم و فاضل نامور محقق و مصنف اور غالب و ابوالکلام کے عارف و شیدائی جناب مالک رام کی وفات پر پوری اردو دنیا سوگوار اور اشکبار ہے، ان سے راقم کے جو گہرے اور مخلصانہ تعلقات تھے اس کی بنا پر اس کے لیے بھی ان کی جدائی بہت شاق ہے۔

وہ پھالیہ ضلع گجرات میں جواب مغربی پنجاب (پاکستان) کا حصہ ہے۔ ۲۲ دسمبر ۱۹۰۶ء کو بوہرہ کھتریوں کے ایک خاندان میں پیدا ہوئے انکے والد لالہ نہال چند فوج کے محکمۂ سپلائی میں ملازم تھے۔ لیکن مالک رام ابھی بارہ دن ہی کے تھے کہ والد کے سایۂ شفقت سے محروم ہوگئے۔ والدہ نے پرورش و پرداخت کی چار برس کی عمر سے تعلیمی سلسلہ شروع ہوا جو ایم۔ اے اور ایل۔ ایل بی کرنے کے بعد ۱۹۳۳ء میں منقطع ہوا۔ اس سے قبل ۱۹۳۱ء میں ان کی شادی ہو گئی تھی۔

مضمون نگاری اور رسالوں کے مطالعہ کا چسکا بچپن سے تھا۔ ابتدا میں شعر و شاعری سے بھی کچھ دلچسپی رہی ان کا پہلا باقاعدہ مضمون نیرنگ خیال لاہور میں چھپا یہ ٹیگور کی گیتانجلی کے بعض ٹکڑوں کا ترجمہ تھا اس کے بعد ۱۹۲۲ء کے نگار میں "ذوق اور غالب" کے عنوان سے ان کا مضمون شائع ہوا جس میں آگے چل کر ماہر غالبیات ہونے والے نے غالب پر ذوق کو ترجیح دی تھی، لاہور میں قیام کی بنا پر نیرنگ خیال کے مدیر حکیم محمد یوسف حسن سے مالک رام کے تعلقات ہو گئے تھے۔ ۱۹۳۰ء میں ان کی خواہش پر ساٹھ روپے ماہوار پر نیرنگ خیال کی مجلس ادارت میں شامل ہو گئے پھر لاہور ہی سے شائع ہونے والے "آریہ گزٹ" سے متعلق ہوئے اس سے علیحدگی کے بعد ۱۹۳۶ء میں روز نامہ "بھارت ماتا" سے منسلک ہوئے۔ یہ بند ہو گیا تو دلی کا رخ کیا اور ہوم ڈیپارٹمنٹ کے محکمۂ اطلاعات عامہ سے وابستہ ہوئے پھر جالندھر کی ایک فرم میں بھی ملازمت کی۔

پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خان سے مالک رام کی اچھی یاد اللہ تھی۔ ان کی کوشش سے یکم اپریل ۱۹۳۹ء کو حکومت ہند کے محکمہ تجارت میں ان کا تقرر ہو گیا تین مہینے کے ٹریننگ کے بعد یکم اگست ۳۹ء کو انڈین گورنمنٹ ٹریڈ کمشنر کے دفتر میں سپرنٹنڈنٹ ہو کر اسکندریہ چلے گئے اور آزادی کے بعد جب انڈین فارن سروس کی تشکیل ہوئی تو اس میں لے لیے گئے اور مصر، عراق، ترکی اور بلجیم وغیرہ میں رہے۔ سرکاری طور پر ان کو شام، فلسطین، سوڈان، افغانستان، فرانس، سوئٹزرلینڈ، جرمنی، ہالینڈ اور انگلینڈ جانے کا بھی اتفاق ہوا اور بعد میں روس اور ایران کا بھی سفر کیا۔ سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے

بعد ساہتیہ اکاڈیمی میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیفات کی ترتیب و تدوین کی خدمت پر مامور ہوئے اور اردو سیکشن کے انچارج ہوئے۔ اکاڈیمی سے ضابطہ کا تعلق ختم ہوجانے سے دلی سے ایک تماہی رسالہ "تحریر" کے نام سے نکالا جو بڑا معیاری اور بلند پایہ تھا۔ لیکن جب اس نے بھی دم توڑ دیا تو جالندھر موٹر ایجنسی لمیٹڈ کے مینیجنگ ڈائرکٹر ہوگئے۔

اردو کے فروغ و ترقی کے لیے جو سرکاری وغیر سرکاری کمیٹیاں بنیں ان میں ان کی شمولیت ضروری سمجھی جاتی تھی انجمن ترقی اردو ہند اور غالب اکیڈمی کے وہ برابر ممبر رہے اور انجمن کے کئی برس تک صدر بھی رہے گجرال کمیٹی اور اردو یونیورسٹی کمیٹی کے بھی وہ رکن تھے اور جامعہ اردو علی گڑھ کے ممبر کے علاوہ پروچانسلر بھی تھے اردو کی مدۃ العمر خدمت کرنے کی وجہ سے ان کے تعلق سے ان کو بڑے سے بڑا اعزاز ملا اور ان کی کتابوں پر مختلف اداروں نے انعام دینے میں فخر محسوس کیا۔ دراصل ان کی ذات اعزاز و انعام سے بالاتر تھی۔

مالک رام صاحب مطالعہ کے بڑے حریص اور شوقین تھے۔ کتب بینی کی عادت بچپن سے تھی جس میں سرکاری ملازمت کی مشغولیت بھی مانع نہیں ہوئی مطالعہ میں کثرت اور انہماک کی وجہ سے بصارت کمزور ہوگئی تھی اس لیے میگنیفائنگ گلاس استعمال کرتے تھے میری آمدورفت ان کے یہاں اس وقت شروع ہوئی جب وہ بوڑھے ہوگئے تھے مگر جب بھی ان کے کمرے میں داخل ہوا تو پڑھتے لکھتے ہی پایا۔ کرسیوں اور میزوں پر کتابوں کا انبار لگا رہتا تھا۔

پنجابی مادری زبان تھی اور اردو سے ان کو عشق تھا فارسی، عربی، انگریزی اور فرانسیسی پر بھی عبور حاصل تھا غالباً ہندی اور بنگالی سے بھی واقفیت تھی اس لیے ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور چونکہ حافظہ بھی اچھا تھا اس لیے جو کچھ پڑھتے تھے اسے مستحضر رکھتے تھے طبیعت میں سلامت روی، اعتدال، اور بے تعصبی تھی اور اصل مقصود علم کی طلب و جستجو تھا اس لیے کسی زبان و مذہب سے متعلق کتاب بھی ہوتی وہ اس کا مطالعہ کر کے اپنی علمی تشنگی بجھاتے۔ کالج کی طالب علمی کے زمانہ میں انہیں قرآن مجید۔ مطالعہ کا شوق ہوا تو عربی سیکھی اور ایک صاحب سے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھنا شروع کیا معلم کی مشغولیت کی وجہ سے اس کا سلسلہ جاری نہیں رہ سکا تو شوقین متعلم نے خود ترجمہ قرآن کی مدد سے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ عرب ملکوں میں رہنے کی وجہ سے عربی میں ان کی استعداد بہت اچھی تھی اور وہ عربی بولنے پر بھی قادر ہوگئے تھے قرآن مجید میں غور و فکر کا سلسلہ آخری عمر تک قائم رہا۔

تاریخ و ادبیات پر ان کی گہری نظر تھی اور مذاہب کا تقابلی مطالعہ ان کا دل پسند مشغلہ تھا۔ غالب و ابوالکلام پر وہ اتھارٹی مانے جاتے تھے۔ اپنی ملازمت کے سلسلے میں انہیں کئی ملکوں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ جہاں جاتے وہاں کے کتب خانوں سے استفادہ کرتے اور عجائب گھروں کی سیر کرتے۔

مالک رام کی علمی و ادبی زندگی کا آغاز صحافت سے ہوا اور تصنیف و تالیف سے ان کا اشتغال ہمیشہ قائم رہا اس لیے ان کی فتوحات کا دائرہ وسیع ہے لیکن تحقیق کا میدان ان کی اصل جولان گاہ رہا ہے اور اس میں ان کے کارنامے ناقابل فراموش ہیں۔ اگست ۶۷ء میں ماہنامہ آج کل دہلی کا "اردو تحقیق" نمبر شایع ہوا جس میں اردو تحقیق کے چار ستونوں کے ساتھ ان کی بھی تصویر چھپی تھی اور اسی نمبر میں جناب علی جواد زیدی نے ان چاروں ستونوں کو یہ خراج عقیدت پیش کیا تھا:

"جہاں تک تحقیق کے میدان میں رہنمائی کا تعلق ہے۔ ہمارے سامنے ہندوستان میں چار محقق کے نام بیک وقت آتے ہیں قاضی عبدالودود، مالک رام، امتیاز علی عرشی، سید مسعود حسن رضوی ادیب"۔

اور اردو ادب کے میر کارواں پروفیسر آل احمد سرور نے خطوط غالب کے دیباچہ میں لکھا ہے:

"اردو کے محققوں میں مالک رام صاحب کئی حیثیتوں سے امتیاز رکھتے ہیں وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کے ہر پہلو کا غائر مطالعہ کرتے ہیں تمام ضروری مواد مہیا کرتے ہیں اور نہایت سلجھے ہوئے اور شگفتہ انداز میں یہ مواد پیش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں جذباتیت سرے سے نہیں بلکہ ہمدردی کے باوجود ایک معروضی نظر کی کوشش ہے۔"

اردو تحقیق کے تین ستون تو کب کے گر چکے تھے اور اب یہ چوتھا ستون بھی زمین بوس ہو گیا "افسوس کہ از قبیلۂ مجنوں کسے نماند۔"

مالک رام صاحب کے علمی تصنیفی اور تحقیقی کاموں میں بڑی وسعت تنوع اور رنگا رنگی ہے ان کی ہر تصنیف علمی، ادبی اور تحقیقی حیثیت سے معیاری اور بلند پایہ ہے غالب ان کی تلاش و تحقیق کا خاص موضوع تھا اور اسی کو ان کے سب کاموں میں اولیت فضیلت حاصل ہے۔ غالب پر ۵۰ سے زیادہ مضامین انہوں نے لکھے ہوں گے جن کے دو مجموعے عیار غالب اور فسانہ غالب چھپ گئے ہیں ۱۹۳۷ء میں پہلی مرتبہ غالب کی کتاب "سبد چین" ایڈٹ کر کے شائع کی جس میں مرزا کا وہ کلام دیا ہے جو ان کی زندگی میں چھپنے والے کلیات میں شامل ہونے سے رہ گیا تھا اسی کتاب کے مقدمے کے لیے انہوں نے غالب کے حالات لکھنا شروع کیے جو اس قدر پھیل گیا کہ ۱۹۳۸ء میں "ذکر غالب" کے نام سے اسے علیحدہ کتابی صورت میں شائع کیا۔ اس کتاب کو بڑی مقبولیت نصیب ہوئی اور اس کے ۱۵ ایڈیشن نکلے ہر ایڈیشن نئی تحقیقات پر مشتمل ہوتا تھا غالب پر جو دو چار اچھی اور مستند کتابیں لکھی گئی ہیں انہی میں اس کا بھی شمار ہوتا ہے بلکہ حسن تالیف و ترتیب میں یہ زیادہ بڑھی ہوئی ہے اس کا ہندی ترجمہ بھی ہوا۔ متعلقات غالب میں ان کی تصنیف "تلامذہ غالب" ایک معیاری اور مستند کتاب ہے اس کے پہلے ایڈیشن میں ۱۴۶ اور دوسرے میں لگ بھگ پونے دو سو تلامذہ غالب کے حالات و انتخاب کلام درج ہے متون کے سلسلہ میں دیوان غالب، خطوط غالب، دستنبو اور گل رعنا شائع کیا موخر الذکر میں غالب کے اردو فارسی کلام کا انتخاب ہے جو انہوں نے خود کلکتہ کے مولوی سراج الدین احمد کی فرمائش پر کیا تھا اس کو ڈھونڈ نکالنا اور عالمانہ مقدمہ و حواشی کے ساتھ شائع کرنا مالک رام صاحب کا عظیم الشان کارنامہ ہے لیکن اول الذکر دونوں کتابوں کے سلسلے میں اہل نظر کو ان سے بعض بجا شکایتیں رہیں۔ تاہم غالب پر ان کے سارے کام مجموعی حیثیت سے بہت اہم اور بڑی قدر و قیمت کے حامل ہیں جس کا اندازہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کے اس تجزیہ سے بخوبی کیا جا سکتا ہے:

"غالبیات کے سلسلے کا ایک وقیع نام ہے مالک رام کا۔ پچھلی نصف صدی سے جن کا ایک ایک لمحہ غالب کے لیے وقف رہا ہے اور جن کے لیے غالب اور اردو ایک ہی حقیقت کے دو رخ بن گئے ہیں مالک رام تقریباً پچاس کتابوں کے مصنف و مولف و مرتب ہیں ان کی تحقیقات کا دائرہ خاصا وسیع ہے ان کی خدمات کا اعتراف صرف یہ کہہ دینے سے نہیں ہو جاتا کہ انہوں نے "ذکر غالب" یا "تلامذہ غالب" یا "فسانۂ غالب" لکھیں یا غالب کی بعض تصانیف کو مرتب کیا یا غالب کے معاصرین، ممدوحین و رفقا پر مضامین قلم بند کیے بلکہ یہ کہ غالبیات کی موجودہ مستحکم بالشان روایت میں ان کا کام اس بنیادی نوعیت کا ہے کہ اگر اسے الگ کر دیا جائے تو ہمیں اس میں بہت کمی محسوس ہو گی مالک رام کا کام اس پایے کا ہے کہ اسے زندگی بھر کی لگن اور انہماک کی مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے اس بات کی پوری معنویت غالبیات کی اعلیٰ علمی روایت کو نظر میں رکھے بغیر واضح نہیں ہو سکتی۔"

انہوں نے کلیات غالب فارسی کی ترتیب کا کام بھی کر لیا تھا مگر اس کی اشاعت نہ ہو سکی۔

غالب کی طرح مولانا ابوالکلام آزاد کے علوم و معارف کی تحقیق و تدوین نے بھی مالک رام صاحب کی عظمت میں چار چاند لگا دیے ساہتیہ اکاڈیمی نے ترجمان القرآن کی جو چار جلدیں شائع کی ہیں ان کی ترتیب و تدوین کے کام میں دوسروں کے ساتھ تعاون کیا

شرکت بھی رہی ہے لیکن غبار خاطر، تذکرہ اور خطبات آزاد کے متون کی تصحیح و تحقیق کا کام انہوں نے تن تنہا انجام دیا ہے۔ علامہ سیوطی نے جمع الجوامع کے نام سے احادیث کا جو مجموعہ مرتب کیا تھا شیخ علی متقی کی کنزالعمال اسی کی ترتیب و تنقیح ہے لیکن اہل علم کا خیال ہے کہ "سیوطی نے اپنی کتاب لکھ کر دنیا والوں پر احسان کیا اور شیخ علی متقی نے کنزالعمال لکھ کر خود سیوطی پر احسان کیا" یہی بات اگر اس موقع پر بھی کہی جائے تو بیجا نہ ہوگا چنانچہ مولانا ئے مرحوم کے ایک بڑے قدرداں جناب ابوسلمان شاہجہاں پوری رقمطراز ہیں:

"غبار خاطر مولانا کی بہترین علمی و فنی تحریروں کا مجموعہ ہے لیکن اس کے افادہ و فیضان کا دائرہ مکمل نہ تھا اس دائرے کی تکمیل جناب مالک رام صاحب کے حواشی سے ہوتی ہے نادر الوجود اشعار کی طرح جو مولانا نے اس میں استعمال کیے ہیں سیکڑوں اشخاص و کتب تھیں جن کے وجود و کمال پر کوئی روشنی نہ پڑتی تھی اور بے شمار منقولات تھے جن کی صحت کا یقین تھا لیکن عین الیقین نہ تھا فاضل مرتب کی تحقیق نے ہمیں ان کے وجود و کمال سے آشنا کیا ہے اور منقولات کی صحت کو عین الیقین کے مقام پر پہنچا دیا ہے"۔

تحقیق و تحشیہ کے کام میں بعض نقائص اور غبار خاطر سے اجمل خاں صاحب کے ضروری مقدمہ کو حذف کر دینے کے باوجود حق یہ ہے کہ یہ کام مالک رام صاحب سے بہتر شاید کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکتا تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے متعلقات پر مالک رام نے متعدد وقیع مقالے بھی لکھے ہیں جن کا ایک مجموعہ "کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں" ۱۹۸۹ء میں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی نے شایع کیا ہے یہ گیارہ مضامین پر مشتمل ہے۔

متون کی تہذیب، تدوین اور تحقیق کے سلسلے میں انہوں نے اور بھی گوناگوں کام انجام دیے ہیں جن میں کربل کتھا بڑا اہم ہے اس کو پروفیسر مختار الدین احمد کے اشتراک سے مرتب کر کے شایع کیا ہے۔

مالک رام صاحب کی دلچسپی اور تحقیق کا ایک میدان مذہب اسلام بھی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے علوم و معارف کی تدوین و تحقیق کا کام اس اعلیٰ اور بلند معیار پر وہ اسی لیے انجام دے سکے ہیں کہ انہیں اسلامیات پر عبور تھا وہ عربی زبان سے بخوبی واقف تھے اور انہوں نے قرآن مجید اور احادیث نبوی کا مطالعہ براہ راست کیا تھا اس لیے اسلام کے بارے میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ذاتی مطالعہ و تحقیق اور معروضی نقطہ نظر کا نتیجہ ہے انہیں دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں مذہب اسلام سے زیادہ دلچسپی تھی خصوصاً عورتوں کے بارے میں وہ اسلامی تعلیم و ہدایت سے زیادہ متاثر تھے ان کی کتاب "عورت اور اسلامی تعلیم" اسی تاثر کا نتیجہ ہے جو ان کی برسوں کی محنت، مطالعہ اور تحقیق کا نچوڑ ہے۔ "اسلامیات" بھی ان کی محققانہ کتاب ہے جو اسلام کے بارے میں چھ اہم مفید مضامین کا مجموعہ ہے بعض خامیوں سے قطع نظر یہ دونوں کتابیں مصنف کی غیر جانبداری بے تعصبی اور مذہب اسلام سے ہمدردی کا ثبوت ہیں ان میں جو حقائق بیان کئے گئے ہیں ان پر مسلمان فضلا کی نظر بھی شاید ہی گئی ہو

سرِ خدا کہ عارف و سالک بکس نہ گفت
در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

انہی خوبیوں کی بنا پر مولانا عبدالماجد دریا بادی مرحوم فرماتے ہیں:

"صراحت کے ساتھ اگر اپنا نام بر بار نہ لکھتے رہیں تو کوئی شخص بھی ان مالک رام اور عبدالمالک کی تحریروں میں فرق واما کر ہی نہیں سکتا۔"

خاکہ نگاری میں بھی ان کو کمال حاصل تھا وہ لوگوں کا سراپا بیان کرنے اور اشخاص کی تصویر کشی میں بڑی مہارت رکھتے تھے ان کی کتاب "وہ صورتیں الٰہی" خاکہ نگاری اور مرقع آرائی کا اچھا نمونہ ہے۔ تذکرہ نگاری سے بھی ان کو خاص مناسبت تھی ذکر غالب اور تلامذہ غالب اسی ضمن میں آتی ہیں لیکن اس سلسلہ میں ان کا زیادہ اہم کارنامہ تذکرۂ معاصرین ہے جس کی چار جلدیں شایع ہو چکی ہیں اور ایک جلد کے بقدر مواد چھپنے سے رہ گیا ہے "تذکرہ ماہ و سال" کی اہمیت بھی مسلّم ہے ان کتابوں میں بعض غلطیاں بھی راہ پا گئی ہیں لیکن علی جواد زیدی کے بقول:

"ان تمام تذکروں اور خاکوں کا جمع ہونا معمولی بات نہیں اس جاں سوز کام کے لیے مالک رام ستایش کے مستحق ہیں..... تذکرۂ معاصرین کا سلسلہ دور حاضر کے ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں بے حد مواد مہیا کرتا ہے اس سلسلے میں تذکرہ نویسی ایک نئے اور ترقی یافتہ روپ میں ظاہر ہوتی ہے جس لگن اور خلوص سے مالک رام نے اپنے زمانے کے ادیبوں، شاعروں اور بعض صحافیوں کے حالات یکجا کر دیے ہیں اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں اس طرح کے معلومات کی فراہمی سے سابقہ پڑا ہے"۔

اردو میں یادگار صحیفوں کی اشاعت کی روایت مالک رام صاحب ہی نے قائم کی ہے اس کی بدولت نذر عرشی، نذر ذاکر، نذر عابد، نذر زیدی اور نذر حمید جیسی باوقار کتابیں شایع ہوئیں یہ صحیفے اس عہد کے بڑے ممتاز اصحاب علم کی نگارشات سے مزین ہیں تنے سارے مضامین کو مالک رام صاحب ہی حاصل بھی کر سکتے تھے لیکن انہوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ جن موقر اصحاب کمال کو یہ مضامین نذر کیے گئے ہیں انکے حالات و کمالات کا پورا مرقع بھی پیش کیا ہے اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی انہوں نے "نذر" کے مجموعے شایع کیے ہیں اور غالب اور حالی پر بھی انگریزی میں کتابچے لکھے ہیں۔

جس طرح مالک رام صاحب نے دوسروں کی خدمات علم و ادب کے اعتراف میں یہ یادگار صحیفے شایع کیے اسی طرح خود ان کے کمالات کے اعتراف کے لیے ارمغان مالک کی دو جلدیں شایع ہوئیں جن کو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے منتخب اہل علم کے ایک بورڈ کے تعاون سے مرتب کر کے ۱۹۷۱ء میں شایع کیا تھا انگریزی میں یادگار صحیفے کو علی جواد زیدی صاحب نے ایڈٹ کیا تھا وہی "مالک رام ایک مطالعہ" کے بھی مرتب ہیں جو ۱۹۸۶ء میں شایع ہوئی ہے اس میں ان کے مبسوط مقدمہ کے علاوہ غالبیات، اسلامیات، تذکرہ نگاری، تحقیق، مرقع نگاری، نثر نگاری اور تدوین ابوالکلام کے زیر عنوان دو درجن سے زیادہ مضامین شامل ہیں۔

مالک رام صاحب کسی ادارہ اور اکیڈمی سے وابستہ نہیں تھے۔ حیرت ہوتی ہے کہ سرکاری ملازمت کے علم و ادب کش ماحول میں رہ کر انہوں نے تن تنہا یہ سارے علمی، ادبی اور تحقیقی کام کس طرح انجام دیے؟

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق
ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

مالک رام صاحب اردو کے بہت اچھے نثر نگار تھے اب ایسی سلیس صحیح اور خوبصورت نثر لکھنے والے بہت کم لوگ رہ گئے ہیں۔ انہیں قدرت نے تصنیف و تالیف کا خاص سلیقہ اور بڑا عمدہ ذوق عطا کیا تھا اس لیے ان کی تحریریں خوبی و دلکشی اور رعنائی و بانکپن سے معمور ہوتی ہیں سادگی اور اصلیت کے باوجود ان کی نثر میں شگفتگی، سلاست، روانی، برجستگی اور پرکاری ہوتی ہے جو حشو و زوائد طوالت، تکرار، پیچ پیچ اور ژولیدہ بیانی سے پاک ہوتی ہے الفاظ اور جملے نپے تلے اور موقع و محل کے اعتبار سے ہوتے ہیں کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ بات کہنے کا ہنر وہ خوب جانتے تھے۔ مختصر ہونے کے باوجود ان کی تحریریں جامع پُر مغز، بلیغ اور

جاندار ہوتی ہیں ان کے موضوعات خشک علمی و تحقیقی ہوتے تھے اس کے باوجود تحریر کی دلآویزی اور اثر انگیزی کو قائم رکھتے اور شگفتگی بے ساختگی اور برجستگی میں کمی نہ آنے دیتے ان کی عالمانہ باوقار اور سنجیدہ تحریریں لطافت و حلاوت سے معمور ہوتی تھیں کبھی کبھی طنز و مزاح کی لطیف آمیزش سے بھی ان کی نثر میں بڑی کیفیت و جاذبیت پیدا ہو گئی ہے مواد و معلومات کو سمیٹ کر اچھے ڈھنگ اور خاص سلیقے سے پیش کرنے میں مالک رام صاحب کو بڑی مہارت ہے ان کی ساری کتابیں مواد و معلومات سے پُر اور مناسب و موزوں ترتیب و تبویب کا اچھا نمونہ ہے۔

اپنے دور کے اکثر اکابر اور نامور فضلاء و مشاہیر سے ان کے اچھے روابط تھے دارالمصنفین سے ان کے روابط بہت قدیم تھے جس زمانے میں انہوں نے علمی میدان میں قدم رکھا اس زمانے میں دارالمصنفین اور مولانا سید سلیمان ندوی کے آوازۂ شہرت سے پورا ملک گونج رہا تھا اس لیے مالک رام صاحب کی نگاہ بھی ان کی جانب اٹھی غالب کے خطوط میں جب "سبد چیں" کا ذکر پڑھا تو ان کو اس کی تلاش ہوئی اور مولانا سید سلیمان ندوی کو خط لکھ کر اس کے متعلق دریافت کیا انہوں نے بتایا کہ کتب خانہ حبیب گنج میں اس کا نسخہ موجود ہے اس کے لیے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی سے رجوع کیا جائے معارف میں مالک رام صاحب کے مضامین بھی چھپتے تھے اس کے سلیمان نمبر میں بھی ان کا مضمون شامل ہے اور ان کی جب بھی کوئی کتاب شائع ہوتی تو اسے دارالمصنفین کو ضرور بھیجتے یہ معمول آخر تک قائم رہا اپنی کتاب "عورت اور اسلامی تعلیم" کو پریس کے حوالے کرنے سے پہلے مولانا سید سلیمان ندوی کے پاس بھیج کر مشورہ و اصلاح کے طالب ہوئے ان کے خلاف جب مولانا امداد صابری نے مقدمہ دائر کیا تو مالک رام صاحب نے نواب سائل دہلوی مرحوم کے ذریعہ سے صلح و صفائی کی پیشکش کی جس میں ان کو کامیابی ہوئی۔

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور جناب صباح الدین عبدالرحمٰن صاحبان سے ہمیشہ ان کے خوشگوار تعلقات اور برابر خط و کتابت رہی انہوں نے "نذر" کے نام سے جو صحیفے شائع کیے اور خود ان کو جو صحیفہ نذر کیا گیا ان سب کی مجلس ارکان میں شاہ صاحب کا نام اور حصہ مقالات میں صباح الدین صاحب کے مضامین شامل ہیں مجھے یاد نہیں کہ پہلی مرتبہ کب میرے کان میں مالک رام صاحب کا نام پڑا لیکن فروری ۱۹۶۵ء میں دارالمصنفین کی گولڈن جوبلی بہت دھوم سے منائی گئی جس میں ارباب دول کے ساتھ ملک کے گوشہ گوشہ سے آئے ہوئے مشاہیر علماء و فضلاء بھی شریک ہوئے اسی موقع پر مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے ساتھ جب انہیں پہلی مرتبہ دیکھا تو ان کی پاکیزہ صورت اور پُر کشش شخصیت نے اپنی جانب متوجہ کر لیا مجھ پر ان کی قابلیت اور وسعت علم و نظر کا سکہ اس سے پہلے ہی سے بیٹھا ہوا تھا مئی ۱۹۶۱ء کے معارف میں مقریزی اور ان کے خطوط پر میرا ایک مضمون شائع ہوا اس میں میں نے مقریزی کی کسی تصنیف کو غیر مطبوعہ بتایا تھا یہ مضمون مالک رام صاحب کی نظر سے گزرا تو انہوں نے اس وقت کے ایڈیٹر معارف مولانا شاہ معین الدین احمد مرحوم کو لکھا کہ مقریزی کی یہ کتاب طبع ہو چکی ہے شاہ صاحب نے جب ان کے گرامی نامہ کا مجھ سے تذکرہ کیا تو مجھے پسینہ آ گیا مگر شاہ صاحب نے میری دلجوئی کے لیے فرمایا کہ تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ اتنے بڑے آدمی نے تمہارا مضمون پڑھا۔

ساہتیہ اکاڈیمی سے مالک رام صاحب نے جب غبار خاطر کا محقق و محشی ایڈیشن شائع کیا تو راقم نے معارف میں اس کا تعارف کراتے ہوئے لکھا کہ "حواشی میں فاضل مرتب سے بعض اغلاط سرزد ہو گئے ہیں۔" اسے پڑھ کر انہوں نے پھر شاہ صاحب کو تحریر فرمایا کہ اغلاط سے تو اذات تو صرف اللہ تعالیٰ کی ہے اگر ان کی نشان دہی کر دی جائے تو آئندہ اڈیشن میں تصحیح کر دی جائے گی

شاہ صاحب نے ان کا گرامی نامہ میرے حوالے کرتے ہوئے فرمایا "مالک رام صاحب بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں اس لیے اغلاط کی دو چار مثالیں ضرور دینی چاہیے تھی میں نے عرض کیا کئی غلطیاں ہیں معارف کے مختصر تبصرے میں ان کی صراحت کی گنجائش کہاں ہوتی ہے شاہ صاحب نے فرمایا اب تم خود ان کو خط لکھو جس میں غلطیوں کی نشاندہی کر دو محترمی سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب بھی موجود تھے انہوں نے فرمایا کہ میں بھی کچھ اغلاط کی نشاندہی کرتا ہوں انہیں بھی اپنے خط میں شامل کر لینا اس طرح ان کے تعاون سے تقریباً ۵۰ غلطیاں قلم بند کر کے ان کی خدمت میں بھیجی گئیں جن کو ملاحظہ فرمانے کے بعد انہوں نے مجھے شکریہ کا خط لکھا اور یہ بھی تحریر فرمایا کہ اکثر سے مجھے اتفاق نہیں ہے لیکن جن سے اتفاق ہے آیندہ اڈیشن میں ان کے مطابق صحت کر دی جائے گی۔

اس خط سے میرے دل میں ان کی بڑائی جاگزیں ہو گئی اور اس کے بعد ان سے برابر خط و کتابت کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ کبھی کبھی سنین وغیرہ کی تحقیق اور بعض دوسرے امور دریافت کرنے کے لیے وہ مجھ ہیچ مداں کی جانب رجوع بھی فرمانے لگے۔ ۱۹۸۲ء میں ہمدرد نگر نئی دہلی میں بین الاقوامی قرآن کانگریس کا انعقاد ہوا جس میں سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کے ساتھ میں بھی شرکت کے لیے گیا تھا کانگریس کے اجلاس پانچ چھ روز تک ہوتے رہے مالک رام صاحب تقریباً روزانہ شرکت کے لیے اپنے دولت کدہ سے جو ڈیفینس کالونی میں تھا تشریف لایا کرتے تھے اور ان سے متعدد علمی امور و مسائل پر گفتگو رہی ان صحبتوں سے ان کے عجز و انکسار، شرافت، شائستگی، بے تعصبی، رواداری، فراخدلی، خورد نوازی، عالمانہ شان اور تحقیقی مزاج کا اچھی طرح اندازہ ہوا۔

ذکرِ مالک رام
(۲)

از ضیاء الدین اصلاحی

۱۹۸۶ء میں جناب علی جواد زیدی نے ان کی متنوع علمی تحقیقی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں ایک یادگار صحیفہ شایع کیا
س کے لیے غالباً انہی کے ایما سے عورت اور اسلامی تعلیم پر مجھے بھی اظہار خیال کی دعوت دی گئی حالانکہ ان کو علم تھا کہ اس کے
بعض مندرجات سے مجھے اتفاق نہیں۔ میں اس فرمایش کو مسترد نہیں کر سکا اور اپنے حقیر معروضات بے تکلف پیش کر دیے مجھے
یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ مضمون کے معترضانہ حصے انہوں نے اور زیدی صاحب نے جوں کا توں شایع کر دیا بعد میں ان سے اس پر
گفتگو ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ ہر تبصرہ نگار کا حق ہوتا ہے کہ وہ اپنی رائے بے کم و کاست ظاہر کرے۔ اس سے اختلاف تو کیا جا
سکتا ہے لیکن اس میں تصرف کا کسی کو حق نہیں۔

مالک رام سے میرے تعلقات بڑھے تو انہوں نے اصرار کیا کہ دلی آؤں تو ان سے مل لیا کروں یا انہیں اپنی قیامگاہ کا پتہ بتا
دوں تو وہ خود مل لیا کریں گے دلی میں میرا قیام عموماً اپنے ایک عزیز کے یہاں ہوتا تھا وہاں انہیں کیا زحمت دیتا میں نے خود ان
سے ملاقات کو اپنا معمول بنا لیا اور اگر کبھی جلدی میں اس کا موقع نہیں ملتا تو انہیں میرے دلی جانے کا پتہ چل جاتا تو اشارتاً..... اس
کا ذکر کر دیتے ایک دفعہ میں نے اپنے بزرگ کرم فرما مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی مرحوم سے ملنے ان کی جماعت کے دفتر گیا تو
وہیں مالک رام صاحب کو فون کیا کہ آپ جس وقت گھر موجود رہیں اس وقت میں ملاقات کے لیے حاضر ہو جاؤں انہوں نے دریافت
کیا تم کہاں سے فون کر رہے ہو جب میں نے بتایا تو انہوں نے یہ مصرع پڑھا:

ترى آواز مکے اور مدینے

پھر مولانا کی خدمت میں سلام پیش کرنے اور اپنے لیے دعا کی درخواست کرنے کو کہا۔ ایک دفعہ مولوی عبید الرحمن خاں
شروانی مرحوم ہمدرد نگر میں جناب اوصاف علی صاحب کے یہاں سے انہیں فون کر رہے تھے۔ میں نے نواب صاحب سے عرض
کیا کہ میرا سلام پیش کر دیں تو مالک رام صاحب نے فرمایا کہ صرف سلام سے کام نہیں چلے گا ممکن ہو تو ملاقات بھی کریں۔

اس سال انجمن ترقی اردو ہند نے جنوری میں ان کا یوم ولادت منانے کا پروگرام بنایا تھا ڈاکٹر خلیق انجم نے مجھے اس میں
شریک ہونے اور ان پر کوئی مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی میرے لیے یہ بڑے فخر و سعادت کی بات تھی لیکن ڈاکٹر صاحب کا پہلے
خط آیا کہ آیا اب پروگرام فروری میں ہوگا پھر ملک کے حالات کی وجہ سے اس وقت بھی اسے ملتوی کرنا پڑا "محقق و ماہر غالبیات
مالک رام" کے عنوان سے میں مقالہ تیار کر چکا تھا خیال تھا کہ اسے مالک رام صاحب کے پاس ملاحظہ کے لیے بھیج دوں مگر چند

مہینے میں بیس میں گزر گئے اور مالک رام صاحب اپنے مالک و داتا کے پاس پہنچ گئے دنیا کی زندگی بھی کتنی ناپائدار ہے۔

ایک مرتبہ جناب صباح الدین عبدالرحمن صاحب دہلی کے کسی سیمینار میں شریک ہو کر دارالمصنفین واپس آئے تو شاہ معین الدین صاحب سے اس کی روداد بیان کرتے ہوئے کہنے لگے کہ مالک رام صاحب نے مجھے دیکھ کر فرمایا کہ میں نے اپنے مضمون میں آپ کے جدامجد کی خبرلی ہے اس پر صباح الدین صاحب مرحوم کو بڑی ناگواری تھی اور اس کی وجہ سے مجھ پر بھی بہت دنوں تک یہ اثر رہا کہ مولانا شبلی کے بعض معاندین کی طرح انہیں بھی ان سے عناد ہے لیکن جب ان سے تعلقات ہوئے تو محسوس ہوا کہ بعض امور میں اختلاف کے باوجود وہ مولانا کے پورے عظمت شناس ہیں دراصل مالک رام صحیح معنوں میں عالم تھے اس لیے وہ دوسروں سے علمی اختلاف بھی رکھتے تھے لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ وہ ان کے قدرداں اور عظمت شناس نہیں تھے درست نہیں ہے۔

تنقید اور نکتہ چینی کو برداشت کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے اچھے اچھے لوگ ایسے موقع پر چراغ پا ہو جاتے ہیں لیکن مالک رام صاحب کو میں نے اس معاملہ میں بڑا عالی ظرف پایا ان سے اگر اختلاف کیا جاتا تھا تو اپنی عالمانہ شان اور تحقیقی مزاج کی بنا پر وہ کبھی اس کا برا نہیں مانتے تھے بڑے مصنفین کی طرح ان کی شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہو جس پر اعتراضات نہ کیے گئے ہوں قاضی عبدالودود وغیرہ سے لے کر ہر درجہ کے لوگوں نے ان سے جا و بے جا اختلاف کیا ہے مگر وہ اس پر چیں بر جبیں نہیں ہوئے اعتراض درست ہوتا تو معترض کے شکر گذار ہوتے اور فوراً اسے قبول کر لیتے لیکن غلط اعتراض کا جواب دینے میں اپنا وقت ضائع نہ کرتے اپنی کتاب "تلامذہ غالب" پر ہونے والی تنقیدوں کا ذکر کرتے ہوئے خود لکھتے ہیں:

"ان ۲۵ برسوں میں "تلامذہ غالب" سے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے اس کتاب سے متعلق بھی اور بعض شاگردوں سے متعلق انفرادی طور پر بھی ان میں سب سے مفید اور مفصل مضمون ڈاکٹر حنیف نقوی (بنارس ہندو یونیورسٹی) کا تھا میں نے کم و بیش سب مضامین سے استفادہ کیا ہے اور میں ان اصحاب کا احسان مند ہوں اگرچہ افسوس ہے کہ ان کے سب مشورے قبول نہ کر سکا۔

علامہ شبلی کی طرح بعض لوگوں نے ان کی بھی خوبیوں کو نظر انداز کر کے صرف لغزشوں اور فروگزاشتوں ہی کی طرف اپنی توجہ مبذول کی یہاں تک کہ ان کے خلاف ایک کتاب بھی شایع کی گئی مگر مالک رام صاحب کو نہ اس سے کوئی پریشانی ہوئی اور نہ انہوں نے ایسے لوگوں کی شکایت سے اپنی زبان آلودہ کی علی جواد زیدی صاحب نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

علامہ شبلی کی طرح مالک رام کے لیے بھی یہ شرف مخصوص ہوا کہ ان کے مثبت اکتسابات کے مقابلے میں ان کی لغزشوں اور فروگذاشتوں کی طرف زیادہ توجہ کی گئی اور ایک خاصی کتاب وجود میں آگئی مجھے یقین ہے کہ انہیں اس احساس سے تسکین ہوئی ہوگی کہ ایسے شرف اچھے ادیبوں اور محققوں کی قسمت ہی میں لکھ دیے گئے ہیں آزاد اور شبلی کے پرستاروں سے زیادہ اسے کون محسوس کر سکتا ہے کہ اعتراضات کی مسلسل بوچھار کا مخاطب بننے کے لیے بھی بلند پائیگی کی راہوں سے گزرنا پڑتا ہے۔"

مالک رام صاحب حسن صورت و حسن سیرت کے جامع تھے وہ وجیہہ و شکیل اور جامہ زیب بھی تھے اور خلیق، ملنسار، متواضع، وسیع المشرب اور انسان دوست بھی، ان کا دل شرافت، مروت، ہمدردی اور خلوص و محبت کا گہوارہ تھا، ان کی زندگی تکلف سے بری اور نمود اور نمایش سے خالی تھی حرص و طمع کی بجائے قناعت پسند تھے بڑے سرکاری افسر اور اردو کے صف اول کے اہل قلم میں بھی ممتاز ہونے کے باوجود ان میں نہ غرور تھا نہ تمکنت جھوٹ اور مکاری سے نفرت وعدے کے سچے اور پکے تھے بڑے اصول پسند تھے بے اصولی کو پسند نہیں کرتے تھے خود بھی قاعدے اور ضابطے کی پابندی کرتے اور دوسروں سے بھی اسی کی توقع رکھتے ہمیشہ

مستعد اور چاق و چوبند رہتے ہر وقت اپنے کام میں منہمک اور دھن میں مست رہتے نہ کبھی فضول باتوں اور لایعنی کاموں میں اپنا وقت ضایع کرتے اور نہ دوسروں کی شکوہ شکایت اور غیبت کرتے اسی اصول پسندی اور وقت کی قدر کرنے کے نتیجہ میں انہوں نے کمیت و کیفیت دونوں اعتبار سے گوناگوں علمی و تحقیقی کام انجام دیے۔

مالک رام صاحب نے بڑی مرنجاں مرنج طبیعت پائی تھی کسی سے بغض و کینہ نہیں رکھتے اپنے مخالفین کے معاملہ میں بھی عفوو درگذر سے کام لیتے کبھی غضب و اشتعال میں آکر صبر و ضبط نرمی اور اعتدال پسندی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتے صلح کل ان کا مزاج تھا دوسروں کے درمیان بھی صلح و آشتی کرا دیتے اپنے سے چھوٹے لوگوں پر بھی شفقت فرماتے اور برابر ان کی حوصلہ افزائی کرتے ان میں ضد اور ہٹ دھرمی نہیں تھی اپنی کسی غلطی پر اصرار نہیں کرتے جو لوگ ان کی غلطیوں سے انہیں مطلع کرتے ان کے احسان مند ہوتے۔

ان سے کوئی غلط کام کرنا آسان نہ تھا وہ نہ کسی کی حق تلفی کرتے اور نہ بیجا رعایت کرتے صاف گوئی اور دو ٹوک بات کہنے کے عادی تھے دیانت کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ ان سے کلکتے کی کسی بڑی کمپنی کے مالک کے امپورٹ لائسینس کے لیے جناب دوارکا داس شعلہ نے سفارش کی مالک رام صاحب کی نظر میں کمپنی کے مالک واقعی اس کے مستحق تھے اس لیے انہوں نے ان کا کام کر دیا کچھ عرصے کے بعد انہوں نے اپنے ایک نمائندے کے ذریعہ دوارکا داس کے پاس چھ بڑے کوزے رس گلوں کے بھجوائے اور کہا کہ کچھ مالک رام صاحب کو بھی پہنچا دیے جائیں دوارکا داس ایک کوزہ لے کر مالک رام کے پاس گئے ان کو جب صورت حال کا علم ہوا تو انہوں نے رس گلے لینے سے انکار کر دیا اور کہا ان صاحب سے میرا کوئی واسطہ نہیں میں نے ان کا کام اس لیے کیا تھا کہ وہ مستحق تھے اگر وہ واقعی مستحق نہ ہوتے تو میں صرف کہہ دیتا کہ یہ میرے بس کی بات نہیں اگر اس قسم کے مستحق لوگ اور بھی تمہارے پاس آئیں تو بلا تکلف انہیں میرے پاس بھیج دو ان کی جو خدمت مجھ سے ممکن ہوگی ضرور کروں گا۔

دوسروں کا کام کر دینے میں انہیں بڑی لذت ملتی تھی ایک مرتبہ میں دلی گیا اور ان سے ملنے کے لیے حاضر ہوا تو برسبیل تذکرہ کہا کہ اس دفعہ میں نے صرف اپنے لڑکے محمد طارق کے داخلہ کے لیے سفر کیا مجھے خیال بھی نہیں تھا کہ وہ اس کام میں کسی قسم کا دخل دیں گے اور میرا تعاون کریں گے مگر انھوں نے اپنے امکان بھر ہر مدد کی اور بڑی دلچسپی لی۔

بڑے منکسر المزاج اور وضعدار شخص تھے۔ حق دوستی نبھانے کے لیے خود طرح طرح کی تکلیفیں برداشت کرتے دلی کی ایک اردو کانفرنس میں دوارکا داس کو لے کر گئے مالک رام کے پاس دعوت نامہ موجود تھا وہ چاہتے تو اسٹیج پر فروکش ہوتے مگر دوارکا داس کے پاس دعوت نامہ نہیں تھا اگر یہ کسی کو اشارہ کر دیتے تو انہیں بھی دعوت نامہ مل جاتا مگر مالک رام صاحب نے یہ احسان لینا گوارہ نہیں کیا اور دوارکا داس کی مروت میں جاڑے کے دنوں میں کھلی گھاس پر بیٹھ کر ٹھنڈک کھاتے رہے۔

مالک رام صاحب کی انسان دوستی کی راہ میں ہندو مسلمان کی تفریق حائل نہیں ہوتی تھی جناب محمد باقر سابق پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور ان کے بچپن کے بے تکلف دوست تھے دونوں ایک دوسرے کے گھر برابر آیا جایا کرتے تھے مالک رام صاحب کے ڈی اے وی کالج لاہور میں داخلہ لینے کے بعد باقر صاحب لاہور جاتے تو وہ انہیں زبردستی اپنے ساتھ ہوسٹل میں لے آتے حالانکہ ان دنوں کالج کے ہوسٹل میں کسی مسلمان کو ٹھہرانا سنگین جرم تھا مگر مالک رام صاحب خطرہ مول لے کر انہیں اپنے ساتھ ٹھہراتے اتفاق سے ایک دفعہ وہ ہوسٹل میں بیمار ہو گئے تو مالک رام صاحب نے ہندو ڈاکٹر سے ان کا غلط نام بتا کر دوا دی اگر کہیں یہ راز فاش ہو جاتا تو مالک رام صاحب کو ہوسٹل خالی کرنا پڑتا۔

مذاہب کے تقابلی مطالعہ نے مالک رام کو بڑا وسیع النظر بنا دیا تھا اور ہر مذہب و ملت اور طبقہ و مشرب کے لوگوں سے اچھے تعلقات رکھتے تھے اپنی رواداری اور بے تعصبی کی بنا پر انہوں نے اسلام اور اسلامی علوم و مسائل کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس میں اعتدال و انصاف کو ملحوظ رکھا ہے اور اسلام کی جن خوبیوں اور صداقتوں کو محسوس کیا ہے انہیں بے خوف و خطر بیان کیا ہے ان کی طبیعت اور مزاج پر اسلام کا بڑا اثر تھا اور وہ اس کی اکثر تعلیمات کے مداح تھے انہوں نے اپنے صاحبزادوں کے نام آفتاب و سلمان اور ایک صاحبزادی کا نام بشریٰ رکھا تھا حقیقت کا علم تو خدا کو ہے لیکن ایک دفعہ وہ مجھ سے کہنے لگے بعض لوگ مجھے قادیانی اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں خیر مجھے بھی اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ وہ میری بخشش کرے گا۔ وہ ہماری قدیم شرافت، وضعداری اور ملی جلی گنگا جمنی تہذیب کا ایک دلکش نمونہ تھے اب ان خوبیوں کے لوگ عنقا ہو گئے ہیں۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
جب خاک کے پردے سے انسان نمایاں ہوتا ہے

قومی زبان (۱۰۱) اپریل ۱۹۹۴ء

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

مسعود احمد برکاتی

اردو کے ایک اہم خدمت گار اور محسن یکایک ہم سے جدا ہو گئے۔ مالک رام صاحب اپنی عمر اور علالت کی وجہ سے یوں تو گویا کئی برسوں سے کمر باندھے ہوئے تیار بیٹھے تھے، لیکن اس کے باوجود علالت شدید کی کوئی اطلاع آئے بغیر ایک چھوٹی سی خبر میں اس روشن چراغ کے گل ہو جانے کی اطلاع دل کو ملول اور ذہن کو مجروح کر گئی۔ اور یہ خبر بھی کیا تھی، خبر کی معذرت تھی کہ ہمارے عظیم و ضخیم اردو اخباروں میں اردو کے ایک عظیم و قدیم محسن کے لیے بس اتنی ہی جگہ ہو سکتی ہے۔ شاید نقطۂ نظر یہ ہے کہ اردو کوئی ایسی چیز نہیں جس کی خدمت کی جائے، اردو سے تو خدمت لی جانی چاہیے اور وہ ہمارے اخبارات خوب لیتے ہیں۔

بہرحال مالک رام صاحب اپنی عمر کے ۸۷ برس میں اس عدم ہستی نما سے ہستی عدم کی جانب چلے گئے اور اپنے پیچھے علم و ادب کا وہ ذخیرہ چھوڑ گئے جو ان کو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔

جب کسی بہت عمدہ کتاب کو میں خستہ و شکستہ حالت میں دیکھتا ہوں تو میرا دل بہت دکھتا ہے کہ اس معنوی وجود کو اس کے کم زور و ناقص جسد مادی نے خطرے میں ڈال دیا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا بکھرتا ہوا جسم اس کی روح یعنی اس میں موجود علم کو بھی ہوا میں اڑا دے۔ اسی طرح کسی فاضل و کامل کو جب جسمانی طور پر ضعیف و مضمحل دیکھتا ہوں تو دل کی حالت عجیب ہوتی ہے اللہ میاں سے شکوہ کرنے کو دل چاہتا ہے کہ علم و دانش کے یہ "کنٹینر" تو نے اتنے مضبوط کیوں نہ بنائے کہ ان کی روشنی کبھی نہ بجھتی، لیکن شکوے کا جواب بھی مجھے جلد ہی القا ہو جاتا ہے کہ علم و دانش کی جو روشنی ان حضرات سے نکل رہی ہے وہ کبھی نہیں بجھے گی۔ روشنی جب کسی جگہ اپنے قدم جما لیتی ہے تو پھر وہ کسی "کنٹینر" کسی جسم، کسی ظرف کی محتاج نہیں رہتی۔ جسم مر جاتے ہیں، ظرف ٹوٹ جاتے ہیں، لیکن روشنی اپنا آزاد وجود برقرار رکھتی ہے اور اس کے دائرے میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

مالک رام کا جسد خاک بلکہ راکھ ہو چکا ہے لیکن ان کا معنوی وجود اس زبان کی زندگی تک باقی رہے گا جس کی ثروت کے لیے انھوں نے نصف صدی تک اپنی زندگی کو وقف رکھا اور اس سلسلے میں کسی مصلحت یا مصالحت سے کام نہیں لیا، حال آنکہ وہ مزاجاً صلح جو انسان تھے۔ ذاتی زندگی میں رشتوں کا احترام کرتے تھے اور تصادم سے دور رہتے تھے، لیکن توازن برقرار رکھتے تھے۔ وہ خوش اخلاق تھے، خوش اطوار تھے، لیکن ان کا انکسار اپنے کو نمایاں نہیں کرتا تھا۔ وہ لفظاً اور معناً اتنا نہیں جھکتے تھے کہ کسر بن جائیں، لیکن سادگی اور بے ریائی ان کے مزاج کا حصہ تھی۔ ناہمواری ان کو پسند نہیں تھی۔ وہ ایک ہموار انسان تھے۔ یہ ہمواری ان کی سیرت کا بھی جزو تھی اور ان کے ادبی کاموں اور علمی رویے میں بھی منعکس ہوتی تھی۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں اور تحقیقی نتائج میں اچانک یا اونچی اڑان کو نہیں اپنایا۔ ان کی تحریریں ایک نرم رو دریا کی طرح بہتی ہیں۔ ان کو شور دریا کے مقابلے میں سمندر کا

سکوت زیادہ پسند تھا۔ کسی موضوع پر لکھ دینے اور اس کو چھپوا دینے کے بعد بھی وہ اس موضوع سے بے تعلق نہیں ہو جاتے تھے، بلکہ پرانے یار کی طرح گاہے گاہے اس موضوع کی صحبت میں وقت گزارتے تھے اور جب کوئی نئی چیز سامنے آتی تھی تو اس کو خوش آمدید کہتے تھے۔ اپنے نتائج فکر اور نتائج تحقیق کو کبھی حرف آخر نہیں سمجھتے تھے۔ ایک اچھے محقق کی یہ پہچان ہے کہ وہ نہ خوف فساد خلق میں مبتلا ہو اور نہ اپنے آپ سے ڈرے۔ اپنے آپ سے ڈرنے کا مطلب یہ ہے کہ خود اپنا بت بنا کر اس کے خلاف کچھ پڑھنے بلکہ سننے سے بھی خود کو محروم کر لے۔ وہ اچھے محقق تھے اور جانتے تھے کہ خطا تحقیق کی ماں ہے۔ چناں چہ وہ ہمیشہ نئے مواد کی تلاش میں رہتے تھے۔ مطالعے کے علاوہ دوستوں سے تبادلِ خیال، مراسلت، نئی کتابوں کی تلاش، ان کے علمی سفر کو نئی منزلوں سے آشنا کرتی رہتی تھی۔ انھوں نے اپنی کئی کتابوں کے بعد ایڈیشنوں میں اپنی رائے سے رجوع کیا ہے اور مواد میں حک و فک کرتے رہے ہیں۔ "ذکرِ غالب" کے دوسرے ایڈیشن میں انھوں نے تحقیق کو بہت آگے بڑھایا ہے۔ اسی طرح "تلامذۂ غالب" میں شاگردوں کی تعداد میں اضافے کے علاوہ کمی کرنے میں بھی تامل نہیں کیا۔ نئے مواد کی روشنی میں کسی صاحب کی شاگردی مستحکم نہ ہو سکی تو کتاب کے نئے ایڈیشن میں ان کو شاگردی کے اعزاز سے محروم کرنے میں مروت نہیں کی۔ مروت اور عداوت دونوں تحقیق کی قاتل ہیں۔

نئے مواد کی تلاش میں وہ دوستوں سے مشورے کے علاوہ اس کی فراہمی کی فرمائش بھی بلاتکلف کرتے تھے اور ان کا انداز ایسا تھا کہ فرمائش پوری کرنے والے کو خوشی ہوتی تھی۔ اپنی تصانیف کی عطا میں بھی فراخ دل تھے۔ جب بھی جاؤ کتابوں کے ڈھیر بلکہ ڈھیروں میں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر وہ کتابیں نکالتے جو اس عرصے میں شائع ہوئی ہیں اور آپ کو نہیں پہنچیں۔

مالک رام صاحب کا زیادہ وقت اپنے دیوان خانے ہی میں گزرتا تھا اور اس میں کوئی سوفا، کتابوں سے خالی نہیں ہوتا تھا۔ فرش پر بھی کتابوں کی ڈھیریاں لگی ہوتیں، جن سے بچ بچا کر کسی کرسی تک پہنچنا پڑتا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح کانٹے دار جھاڑیوں سے دامن بچا کر نکلنا پڑتا ہے۔ یوں بھی لوگ کتابوں سے اسی طرح بچتے ہیں جیسے کانٹوں سے کیوں کہ کانٹے کی چبھن تو تھوڑی دیر کے لیے خراش پیدا کرتی ہے، لیکن کتاب پڑھنی پڑ جائے تو دل میں مستقل پھانس بن جاتی ہے۔ جان و دل کسے عزیز نہیں ہوتا۔

تذکرۂ معاصرین مالک رام صاحب کا یادگار کام ہے، اس لیے کہ انھوں نے کم و بیش دس سال تک کے ہر قلم کار کے انتقال کے بعد اس کے متعلق اپنے تاثرات و جذبات ہی قلم بند نہیں کیے بلکہ اس کی زندگی کے حالات اچھی خاصی تفصیل اور ممکنہ صحت کے ساتھ محفوظ کر دیے ہیں۔ اس کام میں ان کو جو محنت ہوئی اس کا اندازہ کرنا بھی آسان نہیں ہے لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور تقریباً سوا دو سو مشاہیر پر فوری حوالے کا مواد فراہم کر دیا ہے۔ "تذکرۂ معاصرین" کی پہلی جلد مرحوم نادم سیتا پوری صاحب کی عنایت سے پڑھنے کو ملی تھی۔ ۱۹۷۰ء کی جنگ کی وجہ سے پاکستان، ہندوستان میں تبادلہ کتب بند تھا، نادم صاحب کے ایک دوست ہندوستان کی قید سے رہا ہو کر آئے تھے اور اپنے ساتھ یہ کتاب لائے تھے۔ اب پہلی جلد ہی نایاب ہے۔ گزشتہ سال دہلی میں مالک رام صاحب سے آخری ملاقات میں بھی میں نے پہلی جلد کی تازہ اشاعت کی طرف توجہ دلائی تو فرمانے لگے کہ ہاں شاہد علی خاں صاحب (مکتبہ جامعہ) بھی بہت تقاضا کر رہے ہیں، مگر میں نظرِ ثانی کے بغیر اس کے نئے ایڈیشن کی اجازت نہیں دے رہا ہوں۔ یہ کہہ کر انھوں نے اپنی ایک تازہ کتاب "تذکرۂ ماہ و سال" عنایت کی۔ یہ شاعروں ادیبوں اور اب دوستوں کی آمد و رفت کی تاریخوں کا مجموعہ ہے اور بہت کارآمد ہے۔ سیکڑوں ادیبوں کی ولادت اور وفات کی تاریخوں کا ایک جگہ مل

جانا بڑی سہولت کا باعث ہوتا ہے۔ اس میں اغلاط نے بھی خاصی راہ پائی ہے، لیکن اغلاط سے بچنے کے خیال سے کوئی کام نہ کرنے سے ناقص کام کر کے دوسروں کا بہتر کام پر اکسانا اچھا ہے۔

مالک رام صاحب نے سیکڑوں شخصیات پر لکھا ہے۔ "تذکرۂ معاصرین" کی چاروں جلدوں کے علاوہ تلامذۂ غالب کی ۱۸۲ شخصیات کا کھوج لگانا اور ایک ایک دانہ سمیٹ کر لڑی میں پرونا غیر معمولی استقلال چاہتا تھا۔ ذکر غالب صحت مواد کے لحاظ سے درجہ اوّل پر ہے اور پڑھنے والے کی دل چسپی کے اعتبار سے "یادگار غالب" کے بعد اس کا نمبر ہے۔ یادگار غالب کو مہر، اکرام، عرشی اور مالک رام نے تلاش و تحقیق میں پیچھے چھوڑ دیا، لیکن اس کے دل چسپ مطالعہ ہونے کا کوئی جواب اب تک نہیں۔

مالک رام صاحب نے تدوین کتب میں جو کارنامے انجام دیے ہیں وہ تصنیف و تالیف سے کسی طرح کم تر درجے کے نہیں ہیں۔ غبار خاطر، تذکرہ خطبات آزاد کی ترتیب و تدوین میں جو مشقت انھوں نے اٹھائی اس کی توقع موجودہ دور میں کسی اور سے مشکل ہی سے کی جاسکتی ہے۔ بظاہر ایک کتاب کے متن کی تصحیح اور چند حواشی لکھ دینا کوئی بڑا کارنامہ نہیں معلوم ہوتا، لیکن مالک رام صاحب نے مولانا آزاد کی ہر کتاب کی تدوین کے لیے سیکڑوں کتابیں کھنگالیں۔ مولانا آزاد کے لکھے ہوئے اشعار، اعلام و اسما، آیات، مقامات کی تصحیح کی، اصل ماخذ سے ان کے حوالے نکالے۔ جہاں کہیں مولانا آزاد سے تسامح ہو گیا تھا اس کی نشان دہی کی۔ کسی شعر کا ایک مصرع لکھا تو اس کا دوسرا مصرع لکھا۔ شاعر کا نام رہ گیا تھا تو وہ تحقیق کر کے لکھا۔

"ترجمان القرآن" مولانا آزاد کی ادھوری تفسیر ہے۔ اس کے متعلق مالک رام صاحب نے اپنے ایک مضمون میں جو کچھ لکھا ہے وہ پڑھنے کے قابل ہے۔ لکھتے ہیں:

> "اپنے طویل تفکر اور تدبر کے نتائج انھوں نے اپنی شہرۂ آفاق تالیف "ترجمان القرآن" میں محفوظ کیے ہیں۔ افسوس یہ کہ تفسیر مکمل نہ ہوسکی۔ وہ نصف سے کچھ زیادہ شائع کر سکے تھے کہ سیاسی سرگرمیوں نے ان کے اوقات اور صلاحیتوں پر غاصبانہ قبضہ جمالیا۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ:

> "گویا ترجمان القرآن محض ترجمہ و تفسیر ہی نہیں بلکہ ایک نئی تفسیر کی رہنمائی بھی کرتی ہے۔ میرے نزدیک ترجمان القرآن کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس نے یونانیت اور اسرائیلیات سے کاملاً اجتناب کیا اور علوم و دعوت قرآن کو دوبارہ اپنی اصلی اور سیاسی شکل میں پیش کر دیا جو شارع کا مقصود اور صدر اوّل اعتقاد تھا۔"
>
> (کتاب "کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں" صفحہ: ۶۷)

مالک رام صاحب نے اسلامی موضوعات پر بھی لکھا ہے۔ دو مستقل کتابیں "عورت اور اسلامی تعلیم" اور "اسلامیات" کے نام شائع ہو چکی ہیں، لیکن ان کی معلومات کے مستند اور معتبر ہونے کے علاوہ جو چیز میں نے بطور خاص نوٹ کی وہ ان تحریروں میں ان کا لہجہ ہے۔ مالک رام صاحب نے ان تحریروں میں جو لہجہ اختیار کیا ہے وہ خاص اہمیت رکھتا ہے اور خصوصی مطالعے کا موجب ہے۔ ان تحریروں کے لہجے میں کہیں عقیدے میں شرکت کا احساس نہیں ہوتا، لیکن اسی کے ساتھ اسما، اصطلاحات اور فنون میں صحت بیان کے ساتھ ساتھ پورا پورا احترام موجود ہے۔ یہ بڑا کٹھن مرحلہ تھا، لیکن مالک رام صاحب اس سے بڑی کامیابی سے نمٹے ہیں۔

مالک رام صاحب نے ابتداً اسلامی موضوعات پر اپنے مضامین پر اپنا نام نہیں دیا تھا۔ سیرت سے متعلق ان کا ایک مضمون ماہ نامہ فاران کراچی میں "رام ناتھ ایم اے" کے نام سے چھپا تھا۔ اس کی نقل ان کے پاس نہیں تھی، ان کی فرمائش کے مطابق میں نے کراچی سے اس کا عکس ارسال کیا تھا۔ ۱۹۸۴ء میں ایک دن ہم دونوں بھائی (برادرم محترم حکیم محمود احمد برکاتی اور میں) مالک رام صاحب کے گھر بیٹھے تھے۔ وہ اپنے اسلامی مضامین ہی کا ذکر کر رہے تھے۔ کہنے لگے میں نے ابتدا میں ایسے مضامین پر ہندوؤں کے ڈر سے اپنا نام نہیں لکھا تھا۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ان مضامین کے مسودے میں نے مولانا سلیمان ندوی اور مولانا نیاز فتح پوری کو بھی دیکھنے کے لیے بھیجے تھے۔ سید صاحب نے حاشیوں پر بعض اشارے لکھ کر واپس کیے تھے۔

ایک کاتب صاحب نے جن کا نام اس وقت ذہن سے نکل گیا بتایا تھا کہ مالک رام صاحب پہلے روزانہ بلا ناغہ تلاوت کلام پاک کیا کرتے تھے۔

آخر میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی زبانی یہ دل چسپ واقعہ پڑھ لیجیے:

> غالباً ۱۹۶۴ء میں، میں نے قرآن شریف پڑھنے کا عزم کیا۔ ظاہر ہے کہ مالک رام سے بہتر قرآن پڑھانے والا کہاں سے میسر آتا۔ میں نے ان سے درخواست کی۔ انھوں نے قبول کر لی گویا
>
> پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے
>
> "اس زمانے میں وہ مولانا آزاد کی تصانیف "ترجمان القرآن" "غبار خاطر" اور "تذکرہ" کی ترتیب و حواشی کے کام میں مصروف تھے اور اسی سلسلے میں باقاعدہ ساہتیہ اکیڈمی کے دفتر میں بیٹھا کرتے تھے۔ میں قریب ہی پریس انفارمیشن بیورو میں انفارمیشن آفیسر تھا۔ طے یہ پایا کہ میں لنچ کے اوقات میں ان کے پاس پہنچ جایا کروں گا۔ میں نے پابندی کے ساتھ ان کی خدمت میں پہنچنا شروع کیا اور کلام پاک پڑھنے کی میری دیرینہ آرزو پوری ہونے لگی۔
>
> اس سلسلے کو چند ہی روز گزرے تھے۔ ایک دن میں آموختہ سنا رہا تھا کہ ان کی میز پر ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ یہ ٹیلی فون میرے لیے تھا۔ بتانے والا بتا رہا تھا کہ میرے ایک عزیز کا حادثہ ہو گیا ہے۔ وہ سڑک پار کر رہے تھے کہ ایک تیز رفتار بس کی جھپٹ میں آ گئے۔ انھیں نازک حالت میں ولنگٹن ہسپتال میں پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ سنتے ہی میرے حواس گم ہو گئے۔ سبق چھوڑ کر میں نے فوراً اسکوٹر پر پاؤں رکھا اور ہسپتال جا پہنچا۔ میرے عزیز کی حالت مخدوش تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ چند ماہ کے علاج کے بعد صحت یاب ہو گئے، لیکن کلام پاک کی تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع نہ ہو سکا۔
>
> اس ضمن میں جو بات مجھے آج تک متاثر کر رہی ہے اور جس پر میں آج تک عمل پیرا ہوں یہ ہے کہ مالک رام صاحب نے سورۂ فاتحہ شروع کرانے سے قبل ہی مجھے قرآن شریف کو ہاتھوں میں اٹھانے اور میز پر رکھنے کے آداب سے آشنا کیا۔ کلام پاک کا احترام

تو مجھے ابتداہی سے گھر میں سکھایا گیا تھا، لیکن مالک رام صاحب نے میری تعلیم قرآن کی ابتدا اس احترام سے کی اور سورۂ فاتحہ پڑھانے سے قبل ہی مجھے روحِ مذہب سے آشنا کرنے کی کوشش کی۔"

(مالک نامہ، ص:۱۱)

مالک رام صاحب کی مادری زبان پنجابی تھی۔ وہ ضلع گجرات کے قصبے پھالیہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم سکھوں کے مقامی گوردوارے میں ہوئی۔ مذہب ہندومت تھا۔ لیکن سیرت شخصیت اور کلچر میں اردو رچی بسی تھی۔ نہایت شریف انسان اور بہت اچھے دوست تھے۔

(انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی کے زیرِ اہتمام تعزیتی اجلاس میں ۱۵ جون ۹۳ء کو پڑھا گیا)

Energy Supports Life

Our track record portrays a spectacular success story of energy exploration in Pakistan.

We've completed with satisfaction four decades of our dedicated services in the vital energy sector of the country

We're Pakistan's premier petroleum exploration and production company; discoverers and producers of the country's largest gas field—Sui and pioneers of gas industry in Asia

Our daily production of natural gas exceeds energy equivalent of 110,000 barrels of furnace oil. And we also produce substantial quantities of oil and LPG.

We have stepped up petroleum exploration through a number of joint ventures with leading oil companies.

Pakistan Petroleum Ltd.

مالک رام صاحب کی زندگی کے آخری ایّام

ایم حبیب خاں

مالک رام صاحب نے اپنی ساری زندگی علم و ادب کی خدمت میں گزاری انھوں نے اپنے پیچھے علم و ادب کا ذخیرہ چھوڑا ہے جو ہمیشہ ان کی یاد تازہ کرتا رہے گا۔ ان کی زندگی بڑی با عمل اور مشرقی تہذیب و وضعداری کا ایسا نمونہ تھی جس پر اردو تہذیب فخر کرے گی۔ ان ہمہ جہت شخصیت نے کسی ایک میدان تک محدود نہیں رکھا۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر لکھا۔ غالب پر کئی کتابیں لکھیں جن میں "ذکر غالب" اور "تلامذۂ غالب" سوانحی تحقیق کی ایسی اہم اور قابل قدر کتابیں ہیں جو غالب کی دوسری سوانح عمریوں "یادگارِ غالب" "غالب" اور "غالب نامہ" سے زیادہ معتبر ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد پر کئی کتابیں لکھیں اور آزاد شناسی میں اہم مقام حاصل کیا۔ مالک رام صاحب بنیادی طور پر محقق تھے۔ خاکہ نگاری پر قلم اٹھایا تو اس فن میں بھی مہارت پیدا کی اور ایسے معرکے کے خاکہ لکھے کہ اردو میں ان سے پہلے ایسے خاکے نہیں لکھے گئے۔ حبیب الرحمن خاں شروانی، یاس چنگیزی، "غالب" اور سائل دہلوی" کے خاکوں میں جو تفصیلات ملتی ہیں وہ کہیں اور نہیں ملتیں۔ زبان سادہ سلیس اور شگفتہ ہونے کی وجہ سے خاکے کے پورے خدوخال ہمارے سامنے اس طرح آجاتے ہیں جیسے کسی فوٹوگرافر نے یہ تصویر عکسیرے سے کھینچی ہوں اور اس طرح خاکہ نگار کا حلیہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ غرض ہر ادیب، شاعر اور عالم دین کے حالات اس طرح تحقیق کر کے شگفتہ اور دل نشیں انداز میں پیش کیے ہیں کہ کتاب کا ہر خاکہ زندگی کی تصویر معلوم ہوتا ہے۔ "وہ صورتیں الٰہی" اور "تذکرۂ معاصرین" کی جلدیں اس کی اہم مثالیں ہیں۔ اسلامیات پر بھی بڑی گہری نظر تھی "عورت اور اسلامی تعلیم" ان کی اہم کتاب ہے۔

مالک رام صاحب مجھے اپنے گھر کا ایک فرد سمجھتے تھے اور مجھ پر ہمیشہ ان کی شفقت رہتی۔ اسی لیے مجھے ان کے قریب رہنے کے جو مواقع ملے اسے میں اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں۔ وہ بڑے فراخ دل اور ضرورت مندوں کے کام آنے والے انسان اب اس دنیا میں مشکل سے ملیں گے۔ انھوں نے بہت سے ادیبوں اور محققوں کو ان کی ضرورت پڑنے پر قرض دیا اور اس کا ذکر تک کسی سے نہیں کیا۔ اردو کے علمی اور ادبی اداروں نے ان کتابوں پر انعامات دیے لیکن اس رقم کو کبھی اپنی ذات پر خرچ نہیں کیا بلکہ اس رقم سے ضرورت مند ادیبوں کی مدد کرتے رہتے۔ میرے علم میں بہت سے واقعات ہیں جن کا یہاں ذکر کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ ان کی علمی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں ان کی زندگی میں تین جشن منائے گئے جن میں غالب اکیڈمی، انجمن ترقی اردو اور غالب انسٹیٹیوٹ نئی دلی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

مالک رام صاحب کو لکھنے پڑھنے کا ایسا عشق تھا کہ وہ بغیر کھائے تو زندہ رہ سکتے تھے لیکن مطالعے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ موتیا بند کی بیماری عمر کے آخری حصے میں عام طور پر ہر لکھنے پڑھنے والے کا مقدر بن جاتی ہے۔ مالک رام صاحب کو بھی

۱۹۸۸ء میں موتیا بند ہوگیا۔ موتیا بند دونوں آنکھوں میں تھا۔ ڈاکٹر نے پہلے ایک آنکھ کا آپریشن کیا اور تاکید کردی کہ کچھ دنوں تک لکھنے پڑھنے کا کام موقوف رکھیں گے وہ نہیں مانے ڈاکٹر سے دس دن بعد لکھنے پڑھنے کی اجازت مانگی۔ ڈاکٹر نے یہ سمجھ کر اجازت دے دی کہ وہ اخبار اور خطوط وغیرہ لکھنا پڑھنا چاہتے ہیں۔ اجازت ملتے ہی باقاعدہ مطالعہ شروع کر دیا۔ ایک روز رات کے وقت اس آنکھ میں سخت تکلیف ہوئی ڈاکٹر سے فوراً رجوع کیا گیا۔ اگر بروقت ڈاکٹر کی امداد حاصل نہ ہوتی تو اُس آنکھ کی بینائی جاسکتی تھی۔ اس بے احتیاطی کا خمیازہ انھیں دو مہینے سے زاید بھگتنا پڑا اور محدّب شیشے کی مدد سے لکھنا پڑھنا ان کی عادت بنگیا۔ اس محدّب شیشے کا استعمال وہ مرتے دم تک کرتے رہے۔ ڈاکٹر نے تین مہینے بعد دوسری آنکھ کا آپریشن کیا جو کامیاب رہا۔

۱۹۹۱ء کے شروع سے ان کی تندرستی گرنا شروع ہوئی اور وہ بیمار رہنے لگے لیکن انھوں نے لکھنا پڑھنا ترک نہیں کیا۔ اسی سال تذکرہ "ماہ وسال" جو ان کی برسوں کی محنت تھی ترتیب دیا، جسے مکتبہ جامعہ نے بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ اسی سال خون کا دوران دونوں ٹانگوں کی طرف کم ہونے لگا جس سے چلنے پھرنے میں تکلیف ہونے لگی۔ لکڑی کی چھڑی کو سہارا بنایا اور اس کی مدد سے گھر میں چلتے پھرتے لیکن گھر سے باہر جب اردو کی محفلوں میں شرکت کرنے جاتے تو اپنے نواسے وکرم سالوجا کو ساتھ لے جاتے اور وہ ان کے ساتھ رہتے ۱۹۹۲ء میں جب طبیعت جلدی جلدی خراب ہونے لگی تو مول چند اسپتال میں داخل کرائے جاتے اور وہاں سے صحت یاب ہوکر گھر واپس آجاتے۔ یہ اسپتال ان کے مکان واقع ڈیفنس کالونی سے بہت قریب تھا۔ اور یہاں کے ڈاکٹر ان کی بیماری اور مزاج سے اچھی طرح واقف ہوگئے۔ کبھی کبھی رات میں اچانک طبیعت خراب ہوجاتی تو گھر پر دیکھنے آجاتے اور ان کے علاج سے انھیں شفا ہوتی۔ ۲۲ دسمبر ۱۹۹۲ء کو ان کا یوم ولادت تھا، میں صبح کے وقت انھیں مبارک باد دینے پہنچا تو بہت خوش ہوئے "عمورابی اور بابلی تہذیب" چند مہینے پہلے شائع ہوچکی تھی لیکن اس کی کاپیاں ان کو کافی تاخیر سے ملیں۔ تو ابوالکلام آزاد کا انتخاب جسے ہریانہ اردو اکیڈمی نے شائع کیا ان کی آخری کتاب ہے۔

جنوری ۱۹۹۳ء میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کی علالت کی خبریں اخباروں میں شائع ہوئیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم خواجہ صاحب کے شاگرد ہیں انھیں دیکھنے گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ دیکھ کر بہت دکھ ہوا کئی مہینے سے اٹھنا بیٹھنا موقوف تھا ہر وقت بستر پر لیٹے رہتے۔

خلیق انجم صاحب نے خواجہ احمد فاروقی صاحب کا گوشہ مرتب کیا جسے کتاب نما نے شائع کیا۔ اس کی ترتیب واشاعت میں، بھی انجم صاحب کا معاون رہا۔ میں نے اس کا ذکر مالک رام صاحب سے کیا کہ اگر چند سطریں آپ لکھ دیں تو بڑا کرم ہوگا۔ مالک رام فوراً تیار ہوگئے اور فروری ۹۳ء میں خواجہ صاحب کے بارے میں حسب ذیل سطریں لکھ کر دیں یہ ان کی آخری تحریر ہے۔

"اردو میں خالص انشا پرداز بہت کم ہوتے ہیں اس سے میری مراد یہ ہے کہ ہمارے بیشتر اساتذہ نے مختلف میدانوں میں، تخصص کا درجہ حاصل کیا ہے۔ کوئی محقق ہے کوئی مورخ لیکن اگر ان کے خاص میدان کے باہر ان سے متعلق بات کریں تو نہ خود ان سے انصاف ہوگا نہ پڑھنے والے کو یقین آئے گا صرف انشا کے بل بوتے پر بہت کم لوگوں نے اپنا لوہا منوایا ہے۔ میں ان ہی میں خواجہ احمد فاروقی کا شمار کرتا ہوں۔ وہ انشا کے استاد ہیں ان کی زبان اور اسلوب کی تحریر میں اور عبارت کے دروبست میں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو انھیں کامیاب اور ممتاز انشا پرداز کا درجہ دینے کے لیے کافی ہیں۔ اس میں انشا اللہ خاں کا نام تاریخ ادب اردو میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

یہ تھی مالک رام صاحب کی آخری تحریر جو انھوں نے انتقال سے ڈیڑھ ماہ پہلے لکھی تھی۔ مارچ میں خواجہ صاحب

کتاب نما کے گوشے کی رسم اجرا خواجہ صاحب کے مکان پر ہوئی جس میں مالک رام صاحب نے مجھ سے شرکت کے لیے کہا کہ میں ایک بار ان کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ گوشے کی رسم اجرا مرکزی وزیر ارجن سنگھ صاحب نے ادا کی۔ مالک رام صاحب ارجن سنگھ سے تھوڑی دیر پہلے پہنچے میں ان کو خواجہ صاحب کے اس کمرے میں لے گیا جہاں وہ بیماری کی وجہ سے بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ خواجہ صاحب مالک رام کو دیکھ کر آبدیدہ ہوگئے۔ مالک رام صاحب نے کہا کہ خواجہ صاحب میں آج صرف اس لیے آیا ہوں کہ آپ مجھے دیکھ لیں اور میں آپ کو۔ اس کے بعد ہوسکتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکیں۔ خواجہ صاحب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے میں مالک رام صاحب کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے اٹھا لایا اور ان کو باہر کرسی پر لاکر بٹھا دیا تھوڑی دیر بعد ارجن سنگھ صاحب بھی تشریف لے آئے۔ ۱۶ اپریل ۹۳ء کو مالک رام کا انتقال بروز جمعہ صبح تین بجے مول چند اسپتال میں ہوا۔ جنوری کے مہینے میں ان کی طبیعت جلدی جلدی سے خراب ہونے لگی تھی۔ کبھی ٹھیک ہوجاتے کبھی بیمار۔ مارچ میں دل کی بیماری کے علاوہ سانس پر بھی زور ہونے لگا۔ ڈاکٹر گھر پر دیکھنے آتے رہے علاج جاری رہا۔ یکم اپریل کی صبح میں گھر گیا تو ناشتہ کر رہے تھے ان کے چھوٹے صاحبزادے سلمان صاحب بھی موجود تھے اور مالک رام صاحب ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ تیسرے دن شام کو ملنے گیا تو پتا چلا کہ ایک روز قبل ان کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی اور سلمان صاحب ان کو اسپتال میں داخل کر آئے۔ اس بار وہ اسپتال میں داخل ہونا نہیں چاہتے گھر والوں نے زبردستی ان کو داخل کرایا۔ اس بار مول چند اسپتال میں ایسے داخل ہوئے کہ ۱۶ اپریل کو انتقال ہوگیا۔ گھر والوں نے دیکھنے کے لیے سخت پابندی لگا رکھی تھی کسی کو دیکھنے کی اجازت نہیں تھی اور یہ معلوم بھی نہ تھا کہ وہ اتنی جلدی ہم سے جدا ہوجائیں گے۔ میں ایک روز شام کو دیکھنے زبردستی چلا گیا کمرے میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ بہت کمزور ہوگئے تھے لیکن دماغی حالت بالکل صحیح تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ کی دونوں صاحبزادیاں دیکھنے کے لیے منع کرتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آپ کو پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں سیدھے اِدھر آجایا کریں۔ یہ بات انتقال سے ۵ دن پہلے کی تھی۔ اس کے بعد حالت ابتر ہوتی چلی گئی۔ اور ۵ دن بعد یعنی ۱۶ اپریل کو ان کا انتقال ہوگیا۔

این فرینچ
کریم اور لوشن
آپ کے سراپا کے لیے
ریشم سا احساس
Anne French
MPL

مالک رام - ایک شفیق محقق

ڈاکٹر صابر آفاقی

یہ ۱۹۶۹ء کے غالباً اکتوبر کا واقعہ ہے۔ ڈاکٹر کلیم سہسرامی ایک دن میرے ہاسٹل (امیر آباد۔ طہران) تشریف لائے۔ کہنے ...ے میں تمھیں ایک بڑی شخصیت سے ملوانے کے لیے آیا ہوں۔ میں نے پوچھا کونسی شخصیت کی بات آپ کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر کلیم نے کہا بعد میں بتاؤں گا بس جلدی تیار ہو جائیے۔

ہم ہوٹل پہنچے تو مالک رام انتظار کر رہے تھے ان سے اچانک ملاقات کر کے مجھے بیحد خوشی ہوئی۔ بلکہ شادیٔ مرگ کی سی ...یفیت طاری ہو گئی۔ مالک رام دھیمے لہجے اور محبت بھرے انداز میں گفتگو کرتے رہے۔ انھوں نے روسی ٹوپی پہن رکھی تھی اور ...ئی لمبے لمبے فرغل اور گاؤن خرید رکھے تھے۔ کہنے لگے میں غالب کی صد سالہ تقریبات میں شرکت کے لیے روس گیا تھا۔ وہاں سے ...رنسی باہر نہ لے جانے کی ممانعت ہے۔ اس لیے جتنا روبل ملا تھا اس میں یہ چیزیں خرید لی ہیں۔ انھوں نے پہلے تو ہمیں ڈھیر سارا ...ن ہوا گوشت کھلایا پھر ایرانی قہوہ پلایا مختلف موضوعات اور امور پر گفتگو ہوتی رہی۔ یہ جان کر بڑی خوشی کا اظہار کیا کہ راقم کشمیر کی ...یخ راج ترنگنی پر کام کر رہا ہے۔ ہم ۱۰ بجے تک مالک رام کے ساتھ بیٹھے رہے اور ان کے جواہر گفتگو سے دامن بھرتے رہے۔

دوسرے روز میں اور کلیم شام کے ۴ بجے ان کے ہوٹل پہنچے۔ مالک رام تیار بیٹھے تھے۔ ٹیکسی لے کر تخت جمشید کے ساتھ ...ے خیابان پر ایک مکان کے سامنے اتر گئے۔ گھنٹی دی گیٹ کھلا مکان کی دوسری منزل پر ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے ...ک رام کا استقبال کیا اور ایک بڑے مہمان خانے میں بیٹھ گئے۔ پھر گویا دبستان کھل گیا کچھ دیر کے لیے بیگم حمیدہ اختر بھی ...ں آکر بیٹھ گئیں۔ دونوں بزرگوار ادب شاعری ادبی تحریکوں اور سیاست پر بات کرتے رہے۔ ڈاکٹر اختر حسین کی تنقید بھی زیر ...ث آئی۔ قہوہ چلتا رہا اور گفتگو نکھرتی گئی جناب مالک رام نے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری سے ان کی مختصر سوانح بھی مانگی۔ جس ...ے ...ے میں وعدہ ہوا کہ وہ لکھ کر بھیج دیں گے۔ یہ تاریخی ملاقات تین گھنٹوں پر محیط رہی۔

اپنی دھرتی کی کشش عجیب ہے۔ مجھے صابر دت اس لیے اچھا لگتا ہے کہ اس کا ضمیر میر پور کی خاک سے اٹھا پنجابی کا شاعر گور ...ن سنگھ گلشن اس وجہ سے پیارا ہے کہ وہ مظفر آباد میں پیدا ہوا تھا۔

مالک رام سے اس واسطے عقیدت ہے کہ اس نے کٹھالہ شیخاں (گجرات) میں جنم لیا۔ میرے مورثِ اعلیٰ اسی گجرات سے ...ت کر کے مظفر آباد آئے تھے۔ مالک رام آزادی کے وقت ترک وطن کر کے دہلی میں جا بسے تھے۔ ان سے ادبی و علمی تعلق تو ...ن یہ پیوندی ہم وطنی بھی بہت استوار نکلی۔ میں ڈاکٹریٹ کر کے ۱۹۷۲ء میں وطن آگیا۔ لیکن مالک رام سے میری خط و

کتابت بدستور رہی۔ مالک رام سے میں طرح طرح کی فرمائش کرتا جن دنوں میں ہندی از خود سیکھ رہا تھا مالک رام نے بہت سارے قاعدے اور ابتدائی کتابیں بھیجی تھیں جو آج بھی ان کی یاد دلاتی ہیں انھوں نے اپنے دستخطوں سے غبار خاطر کا نسخہ بذریعہ ڈاک بھجوایا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کمال کے انشا پرداز اور ادیب تھے، اگر سادہ مکتوب نگاری کے موجد غالب ہیں تو مرصع نامہ نویسی کی ایجاد آزاد کی مرہون منت ہے۔ آزاد کے مجموعہ مکاتیب۔ غبار خاطر کو مالک رام نے اپنے خاص سلیقے سے مرتب کیا ہے۔ مالک رام نے اس کا مقدمہ تحریر کیا ہے۔ اور حواشی لکھی ہے جن میں اشعار اور اسامی اور مقامات کی تشریح کی ہے اور آخر میں "فہرست کتب وارده متن" دے دی ہے فہرست اعلام فہرست اماکن اس کے علاوہ ہے حواشی کوئی سو صفحات سے پر پھیلے ہوئے ہیں۔

غالب نامہ کے بعد یہ حواشی مالک رام کا دوسرا بڑا کارنامہ ہے جناب مالک رام نے تین جلدوں میں تذکرہ معاصرین قلم بند کیا ہے اور اس میں بلا امتیاز مذہب وملت اور ملک تمام اردو شعرا کا تذکرہ بڑی دلسوزی سے قلم بند کر دیا ہے جو ۱۹۷۰ کے بعد اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

مالک رام کے سامنے تذکرہ نگاری کے کچھ مخصوص اصول اور معیار تھے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ مرنے والے کے بارے میں یہ بات بڑے دھیان سے لکھتے تھے کہ وہ کون سے قبرستان میں دفن ہوئے۔ باقی صدیقی اور ناصر کاظمی کے بارے میں انھوں نے مجھے لکھا تھا کہ ان دونوں شاعروں کی قبریں کہاں ہیں تذکرہ معاصرین جلد ۲ میں انھوں نے صرف اتنا لکھا ہے۔

۲ مارچ ۱۹۷۲ء کو لاہور میں انتقال ہو گیا (ناصر کاظمی)

۲ جنوری ۱۹۷۲ء میں راولپنڈی میں رحلت کی (باقی صدیقی)

تذکرہ معاصرین جلد ۲ میں ۷۳ شعرا کا حال درج ہوا ہے۔ اسی جلد دوم میں مشق سخن میں میرے استاد گرامی حضرت ابر احسنی گنوری کا تذکرہ دیا گیا ہے جو آٹھ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

میں دسمبر ۱۹۸۶ء میں بھارت سے گیا تو دہلی میں عرصہ تک قیام رہا۔ جس کے دوران شمس الرحمن فاروقی امرتا پریتم، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر امیر حسن عابدی، خلیق انجم، محمود سعیدی، پروفیسر عبد اللطیف اعظمی، نور الحسن انصاری، نذیر برنی، نور الحسن نقوی، فکر تونسوی جیسے معروف اہل قلم سے ملاقاتیں کیں۔ ایوان غالب اور غالب انسٹی ٹیوٹ کا دورہ کیا۔ کوچہ قاسم جان میں غالب کے بوسیدہ مکان کی زیارت کی غالب، نظام الدین اولیاء، باقی باللہ، شاہ ولی اللہ اور شیخ عبد الحق محدث دہلوی کے مزارات پر حاضری دی۔

میں ۱۳ دسمبر کو جب ڈیفنس کالونی میں مالک رام صاحب کے دولت کدہ میں داخل ہوا تو وہ برآمدے میں انتظار کر رہے تھے نہایت گرم جوشی اور بزرگانہ شفقت سے گلے لگایا۔ احوال پرسی کی۔ پھر اندر کتب خانے میں لے گئے۔ کہنے لگے نوائے وقت میں پڑھا تھا کہ تم راولپنڈی منتقل ہو گئے ہو۔ میں نے کہا جی ہاں راولپنڈی آ گیا ہوں عارضی طور پر پاکستانی ادب کے حوالے سے ایک گھنٹہ تک گفتگو رہی۔ فرمانے لگے میرے پاس کرنے کے کئی کام ہیں۔ مسودات پڑے ہوئے ہیں۔ مگر افسوس کہ بینائی جاتی رہی اور اب پڑھنے لکھنے سے تکلیف ہوتی ہے ایک عظیم غالب شناس اور ذمہ دار تذکرہ نگار سے یہ میری آخری ملاقات تھی۔

دہلی میں اس ملاقات کی یادگار اسلامیات پر وہ کتاب ہے جس پر جناب مالک رام کے دستخط ثبت ہیں۔

مالک رام غیر متعصب ہندو ادیب تھے۔ انھوں نے اپنے وطن مالوف کھالہ شیخاں میں قرآن حکیم اور احادیث کا وسیع مطا

کیا تھا۔ تاریخ اسلام پر گہری نظر تھی۔ اور وہ اسلام کی عالم گیر صداقتوں کے دل و جان سے معترف تھے۔

زیر نظر کتاب "اسلامیات" مالک رام کے چھ مضامین کا مجموعہ ہے جو مکتبہ جامعہ نئی دہلی کی طرف سے ستمبر ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔ کتاب میں شامل مضامین کے عنوان اس طرح ہیں، لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

الاسلام

اسلامی خلافت، خلق عظیم

افصح العرب اور عورت مذاہب عالم میں" ملاقات کے دوران مالک رام نے بتایا کہ ان کے آخری مضمون کا عربی ترجمہ ہوا ہے اور وہ مصر میں شائع ہو گیا ہے۔

وطن لوٹنے کے بعد بھی بے قاعدہ طور پر ہی ان سے خط و کتابت جاری رہی۔ وہ اپنے خوبصورت مکاتیب سے اس خاکسار کو نوازتے رہے۔

۲۵ نومبر ۱۹۹۱ء کو جناب مالک رام نے میرے زیر طبع مجموعہ کلام .... نئے موسموں کی بشارت کے لیے جو فلیپ مرحمت فرمایا۔ اس میں وہ رقم طراز ہیں غرض صابر عمل اور حرکت کے شاعر ہیں اور بڑی بات یہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اسی زبان میں جو ہم بولتے ہیں جس میں ہم سوچتے ہیں۔ اس میں نہ ابہام ہے، نہ پیچیدگی۔ ازدل خیزد بر دل ریزد اس کا طرۂ امتیاز ہے۔

(مالک رام)

انجمن ترقی اردو کی چند مطبوعات

کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
فرہنگ اصطلاحات بینکاری	محمد احمد سبزواری	۲۰۰/-
داستان سحر البیان	ڈاکٹر احمد سجاد	۱۶۰/-
مضامین غلام ربانی	غلام ربانی	۱۰۰/-
اردو، قومی یکجہتی اور پاکستان	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	۶۰/-
ایران بعہد ساسانیان	آرتھر کرسٹن سین ترجمہ/ڈاکٹر محمد اقبال	۲۰۰/-
الف لیلہ و لیلہ (سات جلدیں)	ترجمہ: ڈاکٹر نور الحسن منصور	۸۹۰/-
تاریخ الحکما	جمال الدین ابوالحسن علی بن یوسف القفطی ترجمہ: ڈاکٹر غلام جیلانی برق	۱۶۵/-
بابائے اردو	ڈاکٹر اسلم فرخی	۱۵/-
روسی ادب (دو جلدیں)	پروفیسر محمد مجیب	۲۴۰/-
قہر عشق	ولیم شیکسپیر/احسان الحق حقی	۱۲۰/-
جوامع الحکایات ولوامع الروایات (دو جلدیں)	ترجمہ: اختر شیرانی	۱۶۵/-
نوادر الالفاظ	سراج الدین علی خاں آرزو	۱۰۰/-
محمد تقی میر	ڈاکٹر جمیل جالبی	۵۰/-
تنقید عقل محض	امانول کانٹ ترجمہ: ڈاکٹر عابد حسین	۱۸۰/-
سعادت یار خاں رنگین	ڈاکٹر صابر علی خاں	۱۳۰/-
حرفے چند (حصہ اول)	جمیل الدین عالی	۱۰۰/-
حرفے چند (حصہ دوم)	جمیل الدین عالی	۱۲۵/-
غالب کے خطوط (حصہ اول)	ڈاکٹر خلیق انجم	۱۵۰/-
غالب کے خطوط (حصہ دوم)	ڈاکٹر خلیق انجم	۱۵۰/-
غالب کے خطوط (حصہ سوم)	ڈاکٹر خلیق انجم	۱۵۰/-
غالب کے خطوط (حصہ چہارم)	ڈاکٹر خلیق انجم	(زیر طبع)
تنقید اور جدید اردو تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	۵۰/-
غزل نما	مرتبہ: ادا جعفری	۱۰۰/-
غالب آشفتہ نوا	ڈاکٹر آفتاب احمد خاں	۵۰/-
ابن انشا	ڈاکٹر ریاض احمد ریاض	۱۵۰/-
جدید اردو شاعری (حصہ اول)	عزیز حامد مدنی	۱۲۰/-
جدید اردو شاعری (حصہ دوم)	عزیز حامد مدنی	(زیر طبع)
جاپانی کہانیاں	شفیع عقیل	۸۵/-

انجمن ترقی اردو پاکستان
ڈی - ۱۵۹ بلاک (۷) گلشن اقبال کراچی - ۷۵۳۰۰

ایک ستون اور گرا

(مرحوم کا آخری مضمون جو انھوں نے انتقال سے چند روز پہلے لکھا)

شانتی رنجن بھٹا چاریہ، کلکتہ

ایک ستون اور گرا مالک رام بھی بھگوان کو پیارے ہو گئے۔

اُردو زبان و ادب سے جن کا تھوڑا بہت بھی لگاؤ ہے اُن میں غالباً ایسا کوئی نہیں ہے جو مالک رام کے نام سے واقف نہ ہو۔ لہٰذا یہ غم تمام اُردو والوں کا مشترکہ غم ہے۔

میرے خیال سے آج وہ وقت نہیں آیا ہے کہ ہم مالک رام کی علمی ادبی خدمات کا جائزہ لیں۔ وہ کتنے بڑے ادیب اور محقق تھے پر باتیں کریں اور ادب میں اُن کا کیا مقام ہے پر بحث کریں۔

آج تو ہم غمگین ہیں۔ ہمارے دلوں پر اُداسی چھائی ہوئی ہے۔ لہٰذا ایسی حالت میں ہم جذبات میں بہہ جائیں گے اور اُن کے ساتھ درست معنوں میں انصاف نہیں کر پائیں گے۔ مالک رام جی میرے بھی ملنے والوں میں سے رہے ہیں اور مجھ سے اُن کے تعلقات خوشگوار ہی رہے ہیں۔ اپنے علمی ادبی کئی کاموں کے لیے وہ مجھ سے خط و کتابت بھی کرتے رہے آج بھی اگر میرے نام آئے ہوئے مختلف حضرات کے خطوط (حالانکہ سب خطوط نہ میں جمع رکھتا ہوں اور نہ میرے ہاں اتنی جگہ ہے کہ سب خطوط کو محفوظ رکھ سکوں) کی تلاشی لوں تو مالک رام جی کے ۲۰، ۲۵، خطوط ضرور نکل آئیں گے۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) کے وہ عرصے تک صدر رہے ہیں اور اس سلسلے میں جب بھی کسی کام سے "اُردو گھر" نئی دہلی گیا تو اُن سے ملاقاتیں رہی ہیں۔ اس کے علاوہ کئی ادبی جلسوں، کانفرنسوں، اور سیمیناروں میں اُن کو سُنتا رہا اُن کی صدارت میں مضامین پڑھتا رہا ہوں۔ اُن سے مختلف ادبی اور غیر ادبی مسائل پر باتیں کرتا رہا۔

لیکن آج میں ایک اور بات سوچ رہا ہوں۔ وہی بات جو پچھلے تقریباً ایک دہائی سے جب جب ایسا کوئی واقعہ پیش آیا میرے سامنے ایک بہت بڑا سوالیہ نشان بن کر اُبھرا ہے۔ حال ہی میں جب میرے ایک دیرینہ ساتھی اور اردو زبان کے ایک مجاہد سرنیواس لاہوٹی انتقال کر گئے تب بھی یہی سوال میرے سامنے اُبھر آیا تھا۔ جہاں تک اردو ادب کا تعلق ہے یقیناً سرنیواس لاہوٹی اور مالک رام میں زمین آسمان کا فرق ہے اور اُن دونوں میں کوئی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ مالک رام نے ادب کی جو خدمت کی ہے اُن کے مقابلے میں سرنیواس لاہوٹی کچھ بھی نہیں ہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ سرنیواس لاہوٹی نے اُردو زبان کے لیے جو قربانیاں دی ہیں اُردو کے لیے صاف دل سے اور دل کی گہرائیوں سے میدان عمل میں جس طرح وہ ڈٹ کر لڑتے رہے ہیں ایسا

یہ پاک اور نذر لڑام کو شاید اب ڈھونڈنے سے ملنا مشکل ہے۔ اُن کو بجا طور پر ایک مجاہد اردو کہا جا سکتا ہے۔ لیکن کون بڑا ہے اور کون چھوٹا کس نے اُردو کے لیے زیادہ قربانیاں دی ہیں اُن پر نہ میں اس موقع پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں اور نہ ہی یہ ایسی کسی بحث کا وقت ہے۔

میں صرف ایک بات کو دہرانا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ اُردو کے غیر مسلم قلمکاروں کی تعداد میں پچھلے کم از کم دو دہائی سے مسلسل کمی ہوتی جا رہی ہے اور کوئی نیا غیر مسلم قلمکار کا نام اس دوران سامنے نہیں آیا ہے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

تقسیم ہند سے پہلے وہ علاقے جو آج بھارت کے تحت ہیں اُن میں سے کئی علاقوں میں اُردو کو انتظامیہ میں ایک مقام حاصل تھا۔ سابق ریاست حیدر آباد جسے نظام اسٹیٹ کہا جاتا تھا اُس ریاست میں تو سرکاری زبان ہی اُردو تھی۔ اس کے علاوہ اُتر پردیس، مدھیہ پردیس، پنجاب (جو تقسیم سے دو ٹکڑے ہو گیا ہے) صوبہ بہار اور دہلی میں سرکاری زبان نہ ہونے کے باوجود اُردو نیم سرکاری زبان ضرور رہی ہے۔ روزمرہ کی تہذیبی، کاروباری اور سماجی زندگی میں اُردو کا چلن عام تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان سب علاقوں میں بے شمار غیر مسلم بھی اُردو زبان میں تعلیم پاتے رہے ہیں۔ دوسروں کی مثال کیوں دوں جب کہ میں خود بھی اُس کی ایک زندہ مثال ہوں۔ میرے والد مرحوم ملازمت کی تلاش میں صوبہ بنگالہ سے دُور بہت دُور حیدر آباد چلے گئے تھے اور وہاں ریاستی ریلوے یعنی نظام اسٹیٹ ریلوے (N۔S۔R) میں ملازم تھے۔ اُن دنوں ریاست حیدر آباد میں بنگالیوں کے ۱۲، ۱۵ گھرانے ہی تھے (میں تقسیم ملک سے پہلے کی بات کہہ رہا ہوں۔ تقسیم کے بعد اور خاص کر ریاست حیدر آباد کے حکومت ہند میں شامل ہو جانے اور لسانی صوبوں کی تشکیل نو کے بعد اب صرف سابق ریاست حیدر آباد کے تلنگانہ علاقے میں بنگالیوں کی تعداد ہزاروں ہزار ہے)۔ اس لیے اُن دنوں ریاست حیدر آباد میں بنگلہ زبان کی تعلیم کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہاں ریاستی سرکاری زبان اردو کے علاوہ تلیگو مراٹھی اور تمل زبانوں کے پڑھنے کا انتظام تھا۔ لیکن میرے پتا جی نے میرے لیے اُردو کا انتخاب کیا۔ اس لیے کہ اُردو نہ صرف ریاستی سرکاری زبان تھی بلکہ اُردو ہی وہ زبان تھی جس کو ریاست حیدر آباد کے باہر کل ہند پیمانے پر بھی جانا جاتا تھا یعنی اُردو کا دائرہ یا حلقہ دیگر کسی بھی ہندوستانی زبان سے بہت زیادہ وسیع تھا۔ لہٰذا میرے پتا جی نے میرے لیے اُردو کا انتخاب کیا اور یہی وجہ ہے کہ آج میں بطور اردو کا ایک ادیب کے جانا جاتا ہوں اور اب پچھلے کئی سالوں سے میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ میں ہی اُردو کا آخری بنگالی ادیب ہو کر رہ گیا ہوں۔ اور اب ایسی کوئی اُمید کی کرن بھی دکھائی نہیں دیتی کہ مستقبل میں اور کوئی بنگالی جس کی مادری زبان بنگلہ ہو وہ اُردو کا ادیب ہوگا۔

تقسیم ہند کے بعد اُردو کو سیاست دانوں نے پاکستانی زبان قرار دے دیا (یہ الگ بات ہے کہ پاکستان میں وہ کہاں تک سرکاری زبان یا پاکستانی زبان بننے میں کامیاب ہوئی ہے اور زبان کی سیاست نے پاکستان کا کیا حال کر دیا ہے)۔ خاص کر اُتر پردیش جو اُردو کا گھر تھا وہاں اُردو سے اتنی نفرت پھیلائی گئی کہ غیر مسلم تو دُور کی بات ہے خود اُردو بولنے والے مسلمان بھی اردو کے بدلے ہندی سیکھنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ وہاں کی صوبائی حکومت نے اُردو کے ساتھ ایسا بھیانک سلوک کیا کہ اردو زبان کی بنیادی تعلیم کے دروازے بھی بند ہو گئے۔

وہ طالب علم جو تقسیم ملک کے دنوں ساتویں یا آٹھویں جماعت تک اُردو میں تعلیم پا چکے تھے اُن کے والدین اپنے بچوں کی تعلیم میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے تھے لیکن ہر سال جو نئے نئے بچے میدانِ تعلیم میں قدم رکھنے لگے اُن میں اُردو پڑھنے والے غیر مسلم باقی نہیں رہے۔ آخر جس زبان کے پڑھنے سے بچوں کا مستقبل تاریک معلوم ہو والدین بچوں کو اُس زبان کی تعلیم کیوں

دیں گے؟ تقسیم ملک کے بعد ہندوستان میں اردو کو وہ مقام حاصل نہیں رہا لہٰذا غیر اردو داں والدین نے بچوں کو اردو تعلیم دینا بند کر دیا۔ جب ہزاروں لاکھوں لوگ کسی زبان کو سیکھتے ہیں تو اُن میں سے چند اُس زبان کے ادب سے دلچسپی لیتے ہیں اور چند اُس زبان میں ادب کی تخلیق بھی کرتے ہیں۔ تقسیم ہند سے پہلے بے شمار غیر مسلم اردو زبان کی تعلیم پاتے رہے ہیں لہٰذا اُس زبان میں وہ ادب کی تخلیق بھی کرتے رہے۔ لیکن جب یہ چشمہ ہی سوکھ گیا یعنی غیر مسلم اردو زبان کی تعلیم سے ہٹ گئے تو پھر میدان علم وادب میں نیا غیر مسلم خون کہاں سے آتا!

اس وقت اردو کے جو غیر مسلم ادباء و شعراء ہیں وہ سب کے سب بوڑھے ہیں اور وہ حقیقی معنی میں تقسیم ہند سے پہلے کی پیداوار ہیں۔ اب اُن میں دو چار اسی (۸۰) سال کے بوڑھے ہیں تو ۱۵، ۲۰، ساتویں دہائی میں ہیں اور باقی سب ہی کم از کم ساٹھ کے قریب ضرور ہیں۔ یہ سب اب ٹمٹماتے چراغ ہیں جو جلد ہی بجھنے والے ہیں۔ آج مالک رام گئے تو کل رام لعل کی باری ہے اور پرسوں ہمیں کسی اور کے لیے "رام نام ست ہے" کا نعرہ لگانا پڑے گا۔ اگر یہی رفتار رہی حالات نہ بدلے اور ہندوستان میں اردو کو اپنا جائز مقام نہ ملا تو آج سے دو دہائیوں کے بعد دن میں چراغ لے کر ڈھونڈنے پر بھی اردو میں کوئی غیر مسلم نہیں ملے گا۔

اب سوچیئے کہ مستقبل میں ہم اردو کو ہندو مسلم کلچر اور مشترکہ تہذیب و تمدن کا نمائندہ کیونکر کہیں گے؟ اردو زبان کو ہم ہندو مسلم ملن کا سنگم محبت اور بھائی چارگی کی زبان ایک سکولر زبان کیسے کہیں گے؟ مالک رام کے انتقال پر ہمیں اس حقیقت پر بھی ٹھنڈے دل ودماغ سے غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔

گردوپیش

آغا شاعر قزلباش کو خراج عقیدت!

۱۷ مارچ کو ڈیفنس ہاؤسنگ لائبریری کراچی میں ایک ادبی جلسہ منعقد ہوا جس میں آغا شاعر قزلباش کی علمی و ادبی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ جلسہ کی صدارت سابق گورنر سندھ اور ہمدرد فاؤنڈیشن کے چیئرمین جناب حکیم محمد سعید دہلوی نے فرمائی۔ مقررین حضرات نے آغا شاعر قزلباش پر، بہ حیثیت شاعر، افسانہ نگار، ناول نگار، ڈرامانسٹ اور صحافی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مقررین میں ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر عالیہ امام جناب شان الحق حقی، پروفیسر سحر انصاری، جناب سیّد محمد صادق مرزا، گروپ کیپٹن (ریٹائرڈ) محمد حسن صفدر، جناب راغب مراد آبادی، جناب تابش دہلوی کے نام قابل ذکر ہیں ان کے علاوہ حاضرین میں مشہور افسانہ نگار محترمہ ہاجرہ مسرور اور آفتاب احمد خاں (سابق ڈیفنس سکریٹری) بھی موجود تھے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے کہا کہ ابھی آغا شاعر قزلباش پر خاطر خواہ کام نہیں ہوا ہے۔ اور اب یہ مشکل امر بنتا جارہا ہے کہ ان کے گم شدہ اور منتشر اوراق کو یکجا کیا جائے۔

جناب شان الحق حقی نے اپنی تقریر میں اس بات پر زور دیا کہ آغا شاعر کے ادبی کاموں اور قرآن پاک کے آٹھ پاروں کے تراجم کو بہر صورت محفوظ کرلیا جائے۔

آغا شاعر قزلباش نے ایک طویل عمر پائی ۷۹ برس کی عمر میں ۱۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو دہلی میں انتقال ہوا۔ آغا شاعر قزلباش صاحب کی یاد میں منائی جانے والی یہ پہلی تقریب تھی۔ ان کی زندگی کا بہت بڑا حصّہ لاہور میں گزرا۔ اُن کے قریبی رفقا میں علامہ اقبال شیخ نور الٰہی، پطرس بخاری اور سر شیخ عبد القادر کا شمار ہوتا تھا، آغا شاعر کے تمام کلام پر مشتمل کلیات کے قسم کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ البتہ ان کے دوست شیخ عبد القادر کی ذاتی کوششوں سے ۱۹۰۳ء میں لاہور سے ایک شعری مجموعہ "تیر و نشتر" شائع ہوا۔ آغا شاعر صاحب نے ایک ہفتہ وار ۱۸۰۹ء میں دلّی سے شائع کیا بعد ازاں ایک ادبی ماہنامہ "آفتاب" کا اجرا کیا جس کے وہ بانی مدیر رہے، اس پرچے میں علامہ اقبال، اکبر الٰہ آبادی، جوش ملیح آبادی، عزیز لکھنوی اور خواجہ حسن نظامی کی تخلیقات نظم و نثر چھپا کرتی تھیں۔

آغا شاعر قزلباش کے شعری کارناموں میں قرآن پاک کے آٹھ پاروں کی منظوم تفسیر شامل ہے، جن میں تین پارے اُن کی حیات میں اور پانچ بعد از وفات شائع ہوئے۔

شاعری کے علاوہ ڈراما نگاری سے بھی آغا شاعر کو گہرا شغف تھا، انھوں نے کئی ڈرامے لکھے ہیں جن کا ذکر جناب عشرت رحمانی نے اپنی کتاب "اردو ڈرامہ" میں کیا ہے۔

جناب آغا نوابی (ایک ایرانی نیشنل، کراچی میں مقیم ہیں، انھوں نے عمر خیام کی رباعیات کے وہ تراجم پڑھ کر سنائے آغا شاعر کے کیے ہوئے ہیں۔ گروپ کیپٹن (ریٹائرڈ) محمد صفدر نے آغا شاعر کا کلام پڑھ کر سنایا اور کہا کہ آغا صاحب کی عظمت شعری میں کوئی کلام نہیں۔

آغا شاعر قزلباش دلی اسکول کے ایک نمایاں شاعر تھے۔ ان کے معاصرین نے انھیں جانشین داغ کے اعزازی خطاب سے نوازا۔

اُن کی فارسی شاعری نے قاچار خاندان کے آخری حکمراں کو اپنی طرف متوجہ کیا اسی بنا پر شہنشاہ قاچار نے آغا شاعر قزلباش کو افسر الشعراء کے خطاب سے نوازا۔

۱۹۸۹ء میں آغا شاعر صاحب کے کچھ عقیدت مندوں نے اردو اکیڈمی دہلی کے پلیٹ فارم سے اُن کی علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں ایک جلسہ منعقد کیا جس میں مشہور شاعر آنجہانی کنور مہندر سنگھ بیدی اور جناب مالک رام پیش پیش تھے۔ ان حضرات نے آغا شاعر کے بڑے صاحبزادے آغا آفتاب قزلباش (جو خود بھی اپنے والد محترم کی طرح کراچی میں گوشہ نشین کی زندگی گزار رہے ہیں) کو اس میں شرکت کے لیے مدعو کیا۔

اس موقع پر مشہور نعت خواں محترمہ ام حبیبہ نے پرسوز لحن میں آغا صاحب کی نعت اور گلوکار ندیم نے اُن کی غزل سنائی۔

اکادمی ادبیات کی طرف سے ۱۴۰۹ اور ۱۴۱۰ھ کی بہترین کتب پر انعامات

اکادمی ادبیات پاکستان نے ۱۴۰۹ھ (اگست ۱۹۸۸ء تا اگست ۱۹۸۹ء) اور ۱۴۱۰ھ (اگست ۱۹۸۹ء تا اگست ۱۹۹۰) کے دوران شائع ہونے والی بہترین کتب پر مختلف انعامات کا اعلان کیا ہے۔ انعامات پانے والوں میں سرائیکی ادیب حفیظ خان واحد مصنف ہیں جن کی دو کتابوں کو یکے بعد دیگرے ایوارڈ کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ تفصیلات کے مطابق سال ۱۴۰۹ھ کے لیے اردو شاعری میں علامہ ڈاکٹر محمد اقبال ایوارڈ، سلیم احمد مرحوم کی کتاب "مشرق" کو اور اردو نثر میں بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق ایوارڈ، ڈاکٹر ایوب قادری مرحوم کی کتاب "اردو نثر کے ارتقاء میں علماء کا حصہ" کو دیا گیا۔ پنجابی میں وارث شاہ ایوارڈ افضل توصیف کی کتاب "ہتھ مارے بڑے" کو، پشتو میں خوشحال خان خٹک ایوارڈ پردل خٹک کی کتاب "خورے وارے ملغارے" کو، بلوچی میں مست توکلی ایوارڈ اللہ بخش بزدار کی کتاب "ہشکن رکھ سوز بنت" کو، سرائیکی میاں خواجہ غلام فرید ایوارڈ حفیظ خان کی کتاب "کچ دیاں مازیاں" کو اور انگریزی میں پطرس بخاری ایوارڈ مسرت تیموری برکی کی کتاب "ڈرپ ڈرائی سول" کو دیا گیا۔ سال ۱۴۱۰ھ کے لیے اردو شاعری میں ڈاکٹر علامہ محمد اقبال ایوارڈ احمد فراز کی کتاب "پس انداز موسم" کو اردو نثر میں بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق ایوارڈ مشتاق یوسفی کی کتاب "آب گم" کو پنجابی میں وارث شاہ ایوارڈ راشد چیمہ کی کتاب "چراہاں دے چن" کو پشتو میں خوشحال خان خٹک ایوارڈ حمزہ شنواری کی کتاب "سلگائی" کو، سرائیکی میں خواجہ غلام فرید ایوارڈ حفیظ خان کی کتاب "وہندی رت دی شام" کو سندھی میں شاہ عبداللطیف بھٹائی ایوارڈ محمد حسین کاشف کی کتاب "کندھیاں کنول تران" کو اور انگریزی میں پطرس بخاری ایوارڈ امداد حسینی کی کتاب "این انٹروڈکشن آف پوئٹری آف فیض احمد فیض" کو دیا گیا۔

روسی ادیبہ لدمیلا واسیلوا کو امیر خسرو ایوارڈ

گزشتہ دنوں قطر کی راجدھانی دوحہ میں بزم قطر اردو مرکز کے زیر اہتمام شاندار مشاعرہ کا انعقاد ہوا۔ مرکز کی طرف سے

چھٹے برس ہونے والے اس مشاعرہ کی منفرد خوبی یہ تھی کہ اس میں برصغیر کے اہم شعرا نے حصّہ لیا اور پہلی مرتبہ مرکز نے حضرت امیر خسرو بین الاقوامی ایوارڈ شروع کیا ہے اور ۳ فروری کو مشاعرہ کی پر اثر تقریب کے دوران اردو کی گرانقدر خدمت کرنے والی روسی محقق ڈاکٹر لدمیلا واسیلوا کو ایوارڈ سے سرفراز کیا۔ یہ ایوارڈ طلائی تمغہ اور نقد رقم پر مشتمل ہے۔

قطر کے نشریات اور ٹیلی ویژن کے وزیر ڈاکٹر عبد الرحمٰن سیف الہدی نے ڈاکٹر واسیلوا کو ایوارڈ دیا۔ ایوارڈ حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹر واسیلوا نے اردو کے تیئں اپنے جذباتی لگاؤ کا ذکر کیا۔ مرکز کا شکریہ ادا کیا اور روس میں اردو کے فروغ کے لیے کیے گئے اپنے کاموں کی تفصیلات بتائیں۔ ڈاکٹر واسیلوا ماسکو کی اکیڈمی آف سائنس میں شعبہ ادب میں ریسرچ کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں۔

قطر کے سابق سفیر مسٹر ایس ایل مالک مہمان خصوصی تھے اور موجودہ سفیر مسٹر کے پی فابیان نے تقریب کی صدارت کی شعرا میں علی سردار جعفری، حسرت جے پوری، تابش دہلوی، شمیم جے پوری، وسیم بریلوی، اصغر نقوی، اظہر عنایتی اور دوسرے شعرا نے شرکت کی۔

ہند قطر اردو مرکز کی کارکردگی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ انتہائی کم عرصہ کی مدت میں اسے جامعہ اردو (علی گڑھ) اور انجمن ترقی اردو ہند نے منظور کر لیا ہے۔

(قومی آواز لکھنؤ)

غلام ربانی تاباں کی برسی پر تعزیتی جلسے

کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے سکریٹری مسٹر مقیم الدین فاروقی نے کہا کہ آج ملک کا سیکولر ڈھانچہ خطرے میں ہے اور چاروں طرف فرقہ پرست اور بنیاد پرست قوتیں سر اٹھا رہی ہیں ایسے حالات کا تقاضہ ہے کہ کوئی بھی ادیب یا شاعر کسی مخصوص جماعت کا پابند نہ رہے بلکہ وہ اپنے فن کی توانائی ملک و قوم کے مفاد اور اس کے سیکولر کردار کے استحکام کے لیے صرف کرے۔ مسٹر فاروقی نے کہا کہ ممتاز ترقی پسند شاعر غلام ربانی تاباں انھیں خوبیوں کے مالک تھے خصوصی طور پر انھوں نے اپنے عمر کے آخری دور میں صحافتی مضامین لکھ کر فرقہ پرستی کے خلاف قائم محاذ کے ایک اہم سپاہی بن گئے تھے۔ مسٹر فاروقی آج یہاں غالب اکیڈمی میں بزم تاباں کے زیر اہتمام غلام ربانی تاباں کی پہلی برسی کے موقع پر منعقد ایک تعزیتی جلسے میں تقریر کر رہے ہیں۔

جامعہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر مسٹر انور جمال قدوائی کی صدارت میں منعقد اس جلسے میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ تاباں صاحب کی زندگی اتنی اہم تھی کہ موت کا حادثہ بہت کم تر دکھائی دیتا ہے۔ تاباں کی شاعری کو ترقی پسند تحریک کے اتار چڑھاؤ کی نمائندہ شاعری قرار دیتے ہوئے پروفیسر نے کہا کہ زمانہ جب بے حد نفرتوں اور انتشار کا شکار ہو گیا تو مرحوم شاعر نے غزل کے ساتھ صحافت پر توجہ دی اور یہی دور اس "مکمل اور عملی ترقی پسند شخص" کا سب سے زیادہ شاندار رہا ہے۔ انجمن ترقی اردو ہند کے سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا کہ غلام ربانی تاباں، کی شخصیت ان کی نثر میں، جھلکتی ہے۔ انسانیت پر ان کا اتنا کامل یقین تھا کہ کسی کے دکھ میں شریک ہوتے ہوئے یا کسی کا تعاون کرتے ہوئے انھوں نے کبھی بھی ہندو مسلم کی تفریق پیش نظر نہیں رکھا۔ بزم تاباں کے صدر عبد اللہ ولی بخش قادری نے کہا کہ تاباں صاحب کی فکر کا محور فرقہ وارانہ فساد تھا، فرقہ واریت، قدامت پرستی اور توہمات کے خلاف انھوں نے جب بھی لکھا بے لاگ لکھا اور عالمانہ بصیرت کے ساتھ

لکھا۔ جامعہ ملیہ میں شعبۂ ہندی کے استاد ڈاکٹر درگا پرساد نے ایک مضمون پڑھتے ہوئے تاباں صاحب کی پوری ادبی و سیاسی زندگی اور ان کے خدمات کا جائزہ لیا۔ اس موقع پر کتاب نما کے غلام ربانی تاباں نمبر اور تاباں صاحب کے انگریزی مضامین کا اردو ترجمہ "شعریات سے سیاسیات تک" کا اجراء عمل میں آیا۔ موخر الذکر کتاب کا ترجمہ ڈاکٹر اجمل اجملی نے کیا تھا اس موقع پر اعلان کیا گیا کہ ہر برس تاباں میموریل لیکچر کا انعقاد ہوگا جلسے کی نظامت ڈاکٹر سیدہ سیدین نے کیا جبکہ آخر میں حاضرین کا شکریہ بزم کے سکریٹری جمال الدین نے ادا کیا۔ بعد میں گلوکار استاد امیر احمد خاں نے کلام تاباں پیش کیا۔

(قومی آواز)

قرۃ العین سمیت ۹ ممتاز ادیب ساہتیہ اکادمی فیلو منتخب

اردو کی ممتاز ادیبہ قرۃ العین حیدر سمیت ملک کے ۹ ادیبوں کو ساہتیہ اکادمی فیلو کے لیے منتخب کیا گیا ہے، قابل ذکر ہے کہ اکادمی کا فیلو ایک ادیب کے لیے ادب کی دنیا کا اعلا ترین اعزاز ہے۔ یہ اعزاز مستقل ہوتا ہے اور اس کے لیے صرف انھیں ادباء کا انتخاب کیا جاتا ہے جن کی ادبی حیثیت مقدم اور عظمت کی حامل ہوتی ہے۔

فیلو شپ کے لیے ہندوستانی زبانوں کے جن ممتاز و منفرد ادبا کے ناموں کا اعلان آج کیا گیا ہے ان میں قرۃ العین حیدر کے علاوہ مسز آشا پورنا دیوی (بنگالی)، مسٹر آر کے نارائن (ہندوستانی انگریزی ادب) ڈاکٹر پی ٹی نرسمہا چار (کنڑ)، مسز این بالامنی اماں (ملیالم) ڈاکٹر وی کے گوکلے (مراٹھی) مسٹر کانہو چرن موہنتی (اڑیا) ڈاکٹر ہربھجن سنگھ (پنجابی)، مسٹر ناگار جن (ہندی) شامل ہے۔

ساہتیہ اکادمی کے صدر پروفیسر یو آر اننت مورتی نے درج بالا ناموں کا اعلان کرتے ہوئے بتایا کہ ۱۹۵۴ء میں ساہتیہ اکادمی کے قیام کے بعد ۱۹۶۸ میں پہلی مرتبہ ہندوستانی زبانوں کے ممتاز ادیبوں کو فیلو شپ دی گئی تھی۔

اس برس ۹ ادباء کو مزید فیلو شپ کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ ساہتیہ اکادمی کے آئین میں فیلو شپ کی کل تعداد ۲۱ ہے لیکن اکادمی کی ۴۰ سالہ تاریخ میں ۲۱ افراد کو ایک ساتھ فیلو شپ نہیں دی جا سکی۔ نئے ناموں کے اعلان کے ساتھ اب یہ تعداد بڑھ کر ۱۷ ہو گئی ہے ابھی تک ہندوستان کے ۴۵ ممتاز ادباء کو فیلو شپ کے اعزاز سے نوازا جا چکا ہے۔

مولانا کوثر نیازی کا انتقال

ہفتہ ۱۹ مارچ ۹۴ء دوپہر کو مولانا کوثر نیازی کا انتقال دماغ کی شریان کے پھٹ جانے کی وجہ سے ہوا۔ مرحوم ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے، وہ بہ یک وقت ملک کے ایک اہم سیاست دان، اسکالر، شاعر، صحافی اور دانشور تھے۔ اُن کی تصانیف نظم نثر کی تعداد پچیس تک پہنچتی ہے تقریباً تیرہ انگریزی کتابوں کے مصنف مؤلف تھے۔ اُن کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں غزل گوئی میں اُن کا اپنا ایک خاص رنگ ہے۔

مولانا کے سانحۂ ارتحال پر صدر، وزیر اعظم اور ملک کے دیگر سیاسی اداروں کے زعما نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ ایک ایسا ملی نقصان ہے جس کی تلافی تا دیر ممکن نہ ہو سکے گی۔ اللہ تعالیٰ انھیں جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین

جاوید وشسٹ کا انتقال

تاخیر سے ملی ایک اطلاع کے مطابق اردو کے مشہور شاعر و ادیب جاوید وششٹ کا ان کے آبائی وطن فتح پور بلوچ (ہریانہ) میں ۷۴ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ پسماندگان میں پانچ بیٹے، ایک بیٹی اور تین بھائی ہیں۔ نثر و نظم کی تقریباً ۳۴ کتابوں کے مصنف و مولف جاوید وششٹ کی عمر کا بیشتر حصہ اردو کی تدریس میں گزرا وہ دلی کالج کے پرانے طالب علم اور شعبہ اردو کے سینئر استاد تھے۔ دس برس قبل اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوکر اپنے آبائی وطن میں قیام پذیر تھے۔ انتقال سے دو روز قبل ہی انھوں نے جموں کے ایک مشاعرے میں شرکت کی تھی اور بالکل تندرست تھے۔ ہریانہ اردو اکادمی کے قیام کی کوششوں میں جاوید وششٹ پیش پیش تھے، وہ اکادمی کے پہلے سکریٹری بھی رہے۔

کلام حیدری کا انتقال

ممتاز افسانہ نگار کلام حیدری کا ۲ فروری کو گیا میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً ۶۵ سال تھی پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ایک بیٹی ہے۔ ان کے تین افسانوی مجموعے "بے نام گلیاں" "صفر" اور "الف لام میم" ہیں ان کی ادارت میں ماہنامہ "آہنگ" اور ہفت روزہ "مورچہ" برسوں تک نئے ادبی ذہنوں کی آبیاری کرتے رہے۔ انھوں نے گیا میں ایک کلچرل اکیڈمی بنا رکھی تھی۔

بزرگ شاعر رشید الزماں خلش کلکتوی انتقال کر گئے

اسلام آباد میں مقیم بزرگ شاعر خلش کلکتوی مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ انھوں نے شاعری کے علاوہ عروض پر ایک کتاب "کلید سخن" شائع کی تھی۔ وہ بنگال کی بزمِ شعر و سخن میں نیک نام شاعر تھے۔

(جنگ ۲۱ مارچ ۹۴ء)

رفتار ادب

(تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

سیرتِ احمدِ مجتبیٰ

جلد سوم

شاہ مصباح الدین شکیل

صفحات ۸۲۲

ناشر: پاکستان اسٹیٹ آئل کمپنی لیمٹڈ۔ داؤد سینٹر، مولوی تمیزالدین روڈ کراچی

کتاب کی یہ جلد بھی پہلی دو جلدوں کی طرح نہایت اہتمام سے مرتب کی گئی ہے۔ اس جلد میں غزوہ خندق (احزاب) سے سفر آخرت تک کے حالات نہایت تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ سیرتِ طیّبہ کے واقعات کو ہجرت کے سالوں کے تحت بیا کیا گیا ہے۔ چنانچہ ہجرت کے پانچویں سال کے عنوان کے تحت غزوہ خندق، غزوہ بنوقریظہ اور اسی سال کے دیگر اہم واقعات بیا کئے گئے ہیں۔ چھے سال میں بعض سرئے اور غزوہ بنولحیان غزوہ ذی قرد، صلح حدیبیہ اور بین الاقوامی سطح پر دعوت اسلام کا تفصی تذکرہ نیز حرمت خمر کا ذکر ہے۔ ساتویں سال میں غزوہ خیبر، عمرۃ القضاء اور غزوہ ذات الرقاع کے حالات دیے گئے ہیں۔ آٹھو سال میں سریۂ موتہ سریۂ ذات السلاسل سریۂ ابوعبیدہ بن الجراح، فتح مکہ، غزوہ حنین، سریۂ اوطاس کا ذکر ہے۔ نویں سال کے تح وفود کی آمد وغیرہ اور دسویں سال میں بعض وفود کی آمد اور حجتہ الوداع گیارھویں سال میں سفر آخرت اور رحلت رسول صلی اللہ وسلم کے بعد کے واقعات بیان ہوئے ہیں۔

ہر واقعہ کو بیان کرتے وقت تمام ممکنہ ماخذات کو کام میں لایا گیا ہے۔ اور بعض واقعات کے وہ پہلو جو دوسری کتابوں م بیان نہیں ہوئے ہیں یا جن کے بارے میں روایات سُنتے چلے آتے تھے اس کتاب میں حوالوں کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ غزوہ خندق کے سلسلہ میں مشہور روایت جو سیرت کی کتابوں میں عام طور پر بیان کی جاتی ہے یہ ہے کہ حضرت سلمان فارسیؓ مشورے سے مدینہ کے شمال میں خندق کھودی گئی تھی البتہ زبانی طور پر یہ بھی سُنا جاتا تھا کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالےٰ نے خندق کھودنے کی ہدایت فرمائی تھی۔ لیکن کتاب ہذا کے مصنف نے ڈاکٹر حمید اللہ کے مرتب کردہ "سیاسی و جات" کے حوالے سے۔ اس روایت کی تصدیق ان الفاظ میں کی ہے کہ "ابوسفیان کے خط کے جواب میں رسول کریم صلی اللہ وسلم نے بیان فرمایا" اور یہ جو تم نے لکھا ہے کہ مجھے خندق کھودنے کا طریقہ یاد نہ تھا تو یہ طریقہ مجھے اللہ تعالےٰ نے اس و عطا فرمایا جب تمہارا اور تمہارے ہمراہیوں کا غیظ و غضب یہاں تک آپہنچا کہ تم لوگ مدینہ کی اینٹ سے اینٹ بجانے پر تل گ

غزوہ حنین اور جبل اوطاس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ڈاکٹر حمید اللہ نے پچاس میل کا چکر لگا معلومات حاصل کی تھیں وہ یقیناً گراں قدر تھیں لیکن اس کتاب میں اس سے کہیں زیادہ تفصیلات متعدد کتابوں کے حوالے فراہم کر دی گئی ہیں۔ لفظ حنین کی جو تشریح پیش کی گئی ہے وہ یقیناً قابل تعریف ہے۔ اسی طرح غزوہ خیبر اور غزوہ تبوک سلسلہ میں بھی بڑی تحقیق سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن "حدیثِ قرطاس" کے بارے میں تفصیلی بحث نہیں کی گئی حالانکہ اس

کی بنیاد پر بعض معاندین نے بہت سے غلط نتائج اخذ کئے ہیں۔ شبلی کا حوالہ ضرور دیا گیا ہے لیکن انہوں نے اس واقعہ کی تردید میں جو کچھ لکھا ہے وہ اس کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

بہر حال بعض تسامحات سے قطع نظر یہ کتاب سیرتِ طیّبہ کی اہم کتابوں میں شامل کئے جانے کے قابل ہے۔ ویسے تو اس کتاب کی تینوں جلدیں ہی کافی وقیع ہیں لیکن یہ جلد سوم تحقیق و تفصیلات کے لحاظ سے خاصہ کی چیز ہے اور پہلی دو جلدوں سے فائق ہے۔ اس کے لیے لائق مصنف لائقِ تحسین و تبریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے کہ انہوں نے ایک ایسے متبرک موضوع کے لیے اپنی بہترین صلاحیتوں کو وقف کیا۔

(ثناء الحق صدیقی)

مرقع جامعہ عثمانیہ
بہ موقع جشنِ الماس

شاہ مصباح الدّین شکیل

صفحات ۳۱۶

انجمن طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ پاکستان (کراچی)

یہ مرقع جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کے طلبائے قدیم کے تعاون سے تیار کیا گیا ہے۔ اِس میں جامعہ عثمانیہ کی سرگرمیوں اور کامرانیوں کا نہایت دلچسپ انداز سے تذکرہ پیش کیا ہے۔ جامعہ عثمانیہ غیر منقسم ہندوستان اور دورِ غلامی کا وہ منفرد ادارہ ہے جس نے اعلیٰ سطح پر مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنا کر اور اُس سے بہترین نتائج حاصل کر کے دنیا کو دکھا دیا کہ اگر انسان عزم و ہمت سے کام لے تو ہر میدان میں کامیابی اُس کے قدم چومتی ہے۔ اُس وقت جب ملک میں غیر ملکی حکومت کا آفتاب نقطۂ عروج پر تھا اور اُردو کی کم مائیگی واضح تھی چند بلند ہمّت حضرات نے اعلیحضرت خسرو دکن میر عثمان علی آصف جاہ سابع کے زیر سرپرستی اس بے سہارا زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا اور محض ایک چوتھائی صدی میں ہر طرح کے ادب کے خزانے کو مالا مال کر دیا۔ اِس زبان کے ذریعہ جس کو آج بھی حقیر اور غیر وقیع سمجھا جاتا ہے تعلیم پائے ہوئے حضرات نے نہ صرف قوم وپبلک کو غیر معمولی فائدہ پہنچایا بلکہ اغیار سے بھی خراجِ تحسین حاصل کیا۔

اس مادرِ علمی کے فرزندوں نے ماضی کے دلکش نقوش کو اس جامعہ کے "جشن الماس" کے موقع پر اس حسین و جمیل مرقع میں سجا کر نہایت اہتمام سے پیش کیا ہے۔ اور فرزندان جامعہ کے فوٹو شائع کر کے اس مرقع کی دلکشی میں گرانبہا اضافہ کر دیا ہے۔ ان میں بھی خاصہ کی چیز آصف جاہ اوّل سے آصف جاہ سابع تک کے ہیں۔ فوٹو جو پہلی بار یکجا کر کے شائع کیے گئے ہیں۔ اس مرقع میں شائع نقوش جامعہ کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کرتے ہیں اور ان پہلوؤں کی مزید وضاحت کے لیے اِس مرقع کو دلکش عنوانات کے ساتھ مختلف ابواب میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ مثلاً پہلے باب کا عنوان ہے "دکن ہے نگینہ انگوٹھی ہے جگ" غرض ان نقشہائے رنگ رنگ نے اِس مرقع کو "کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست" کا مصداق بنا دیا ہے۔ اور اس کو یہ حُسن و رعنائی بخشنے کا سہرا محترم مصباح الدّین شکیل کے سر ہے، وہ اور اُن کے ساتھ تعاون کرنے والے طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ بجا طور پر تحسین و تبریک کے مستحق ہیں۔ فجزاھم اللہ خیرا الجزاء۔

(ثناء الحق صدیقی)

حاصلِ سفر

ذکی آذر

صفحات ۱۲۸ قیمت ۸۰/۰۰ روپے

شہزاد فیضی۔ اے ۲۹ ریلکیس اپارٹمنٹس بلاک نمبر ۲۰ فیڈرل بی ایریا (کراچی)

ذکی آذر جسمانی اعتبار سے ہم میں موجود نہیں، لیکن اُن کے تصورات اُن کے افکار "حاصلِ سفر" کی شکل میں زندہ ہیں اور تادیر زندہ رہیں گے۔ افسوس اِس بات کا ہے کہ کاش یہ کتاب وہ خود اپنے ہاتھ سے ترتیب دیتے اور اُن کی زندگی ہی میں آجاتی۔

اس کتاب کی ترتیب و تدوین مصنف کے بڑے بھائی پروفیسر نظیر صدیقی نے کی ہے۔ اور ہر لحاظ سے دیدہ زیب ہے۔ انھوں نے ایک بڑا پُر اثر تعارفی مضمون "کیا تیرا بگڑتا جو مرتا کوئی دن اور" کے عنوان سے لکھا ہے ان کے علاوہ جناب افسر ماہ پوری اور جناب اختر لکھنوی نے صاحب کتاب کی شخصیت و فن کا تفصیلی تعارف کرایا ہے۔ افسر صاحب کے مضمون کا عنوان "ذکی آذر...... ایک خوش فکر شاعر" ہے، اسے پڑھ کر ذکی آذر کے باب میں آسودگی ہوتی ہے،

ذکی آذر نے کم کہا لیکن جو کہا خوب کہا ہے، یہ بات بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ذکی صاحب کی شاعری ہر اعتبار سے صاف اور شفاف ہے یہ صورت کم شعرا کے ہاں دیکھنے میں آتی ہے۔

ذکی آذر کم گو اور کم سخن تھے۔ محفل شعر و شاعری کی ہما ہمی سے دور پرے رہنے ہی کو عافیت جانتے تھے۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا اُن کی شاعری تماشہ نہ بن پائی اور یہ یک نظر دل کو چھولینے کے قابل ہوئی۔

ذکی آذر نے ایک بہت اہم کام کا آغاز کیا تھا۔ وہ کاشف الحقائق کے مصنف نواب امداد امام اثر کی علمی و ادبی خدمات پر پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کر رہے تھے۔ یہ کتاب مکمل ہوجاتی تو یقینی اُن کا ایک کارنامہ ہوتا۔ لیکن انھیں اچانک حلق کے کینسر نے آدبوچا اور یہ کام ادھورا رہ گیا۔

اب جبکہ ذکی صاحب سقوطِ ڈھاکہ کی پریشانیوں سے یہاں آکر قدرے آزاد اور SETTLED ہوئے تھے۔ شاعری اور نثر نگاری کو زیادہ سے زیادہ وقت دینا چاہتے تو خود ہی نہ رہے۔

اپنی گفتگو کو ختم کرتے ہوئے ایک بار پھر اس بات کو دوہرانا چاہوں گا کہ ذکی آذر کی شاعری ہر اعتبار سے صاف اور شفاف ہے۔ میں جب بھی "حاصلِ سفر" کا مطالعہ کرتا ہوں میرا تاثر یہی بنتا ہے،

دیکھیے ذکی آذر کے اِس شعر میں دو ہجرتوں کا دکھ کس طرح سمٹ آیا ہے:۔

خواب تم نے دیکھے تھے درد ہم نے جھیلے ہیں

خواب دیکھنے والے کاش تم یہاں ہوتے

دشتِ خواب

رشید امجد
صفحات ۱۲۴ قیمت ۹۰/- روپے
مقبول اکیڈمی لاہور

"دشتِ خواب" رشید امجد کا تازہ افسانوی مجموعہ ہے کتاب کا انتساب اعجاز راہی کے نام ہے جو خود بھی معروف افسانہ نگار ہیں انھوں نے فکشن کے موضوع پر پی ایچ ڈی کیا ہے جناب ممتاز مفتی کے تعارفی مضمون "مجاہد ہا تو" پر ہوا۔ جو اُن کی مخصوص شگفتگیٔ تحریر کے ساتھ رقم ہوا ہے، میں اس سے محظوظ تو ہوسکتا ہوں۔ اس کے بارے میں کچھ کہنے کی جسارت میرے حیطۂ اظہار سے باہر ہے۔ ہمارے درمیاں یہ لوگ غنیمت ہیں خدا کرے اُردو ادب میں ایسے لوگوں کے آتے رہنے کا سلسلہ جاری رہے۔ اس کتاب میں ایک اور تعارفی مضمون ڈاکٹر نوازش علی کا شامل کیا گیا ہے، جس کا مزاج تحقیقی و تنقیدی ہے، رشید امجد کے فکر و فن کو سمجھنے میں معاون ہوتا ہے،

ڈاکٹر وزیر آغا نے پچھلی دو تین دہائیوں میں نمایاں ہونے والے افسانہ نگاروں کا جو مثلث بنایا ہے، اُسمیں انتظار حسین، ڈاکٹر انور سجاد کے ساتھ رشید امجد کا نام بھی ہے۔

رشید امجد کے افسانوی مجموعہ "دشتِ خواب" میں پچھلے تمام افسانوی مجموعوں کے مقابلے میں کہانی پن کو زیادہ جگہ ملی ہے، علامت کا استعمال جو اُن کا اسلوبی مزاج ہے وہ اب بھی افسانوں کے تار و پود میں موجود ہے اور ان کے افسانے کو یکسر سطح پر آنے نہیں دیتا۔ اس بات کا احساس مجھے "پھول تمنا کا ویران سفر" "زیرِ خواب راستہ" کو پڑھ کر ہوا ہے۔ زیرِ بحث کتاب میں بھی دوسرے افسانوی مجموعوں کی طرح اسکیچوں کی مدد سے افسانے کے حسن و معنویت میں اضافہ کرنے کی روایت قائم ہے، جو اب رشید امجد کی کتابوں کا اختصاص بن چکے ہیں۔ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ باتیں کہہ دینے کی خصوصیت اور اختصار کی روش بدستور قائم ہے جس کی وجہ سے افسانے میں ڈرامائی عنصر داخل ہوجاتا ہے جو قاری کے ذہن کو بہت قریب سے اپیل کرتا ہے تصنیف کے اعتبار سے "دشتِ خواب" رشید امجد کا نواں افسانوی مجموعہ ہے۔ رشید امجد ان تھک ہے اور اس موقع پر یہی کہا جاسکتا ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

(ا۔س)

یادِ خزانہ
ریڈیو پاکستان میں پچیس سال

جمیل زبیری
صفحات ۴۰۰ قیمت ۱۲۵/- روپے
مکتبۂ دانیال عبد اللہ ہارون روڈ، کراچی

جمیل زبیری صاحب کی تازہ تصنیف "یادِ خزانہ" صحیح معنوں میں یادِ خزانہ ہے۔ اس میں انھوں نے ۲۵ سال کی یادداشتوں کو بند کر دیا ہے، یہ یادداشتیں ان تمام ریڈیو اسٹیشنوں کی ہیں، جہاں جہاں وہ اپنی ریڈیو کی ملازمت کے زمانے میں

تعصبات رہے۔

کتاب کا پہلا باب "سندھ کا پہلا ریڈیو اسٹیشن" ہے، جو قیام پاکستان کے فوراً بعد کی بے سروسامانی کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی پاکستان پہ فدا ہونے والے اُن ریڈیو انجینئروں اور کارکنوں کا جذبہ دیکھنے کے قابل ہے، جنھوں نے مل جل کر اور فالتو پُرزوں کو کام میں لاکر پہلا ریڈیو اسٹیشن ایک بیرک میں قائم کر دیا۔ جس کے ذریعے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو بابائے قوم قائدِ اعظم، پاکستان کے پہلے گورنر جنرل حلف اٹھانے اور قوم کو خطاب کرنے کے قابل ہوئے۔

اس کتاب کی افادیت یہ ہے کہ سیکڑوں بھولے بسرے ادیب، شاعر، فنکار گلوکار، سائنس داں، اداکار و صدا کار کی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں، ان میں سے بہت سوں سے قارئین کی پہلی ملاقات ہوتی ہے، اُن کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے وہ استعجاب، اور خوشی و مسرت کے لمحوں سے گزرتے ہیں اس کتاب کے حوالے سے قارئین کچھ یادیں ذہنوں میں محفوظ کر لیتے اور کچھ کے حوالے ڈائری میں قلم بند کر لیتے ہیں کچھ باتیں ایسی بھی شامل ہیں جو ریڈیو میں بوجوہ گفتنی نہ بن سکیں یادِ خزانہ میں انھیں گفتنی بنا دیا گیا "یادِ خزانہ" کی شکل میں جمیل زبیری کی کوششیں قابلِ تحسین ہیں ایک ساتھ بہت سے مزوں سے پڑھنے والوں کو ہمکنار کرتی ہیں اور افکار و احوال و افراد کے معاملے میں انسائیکلو پیڈک ہو گئی ہیں۔

(ا۔ س)

سیف الملوک

مصنف

میاں محمد بخش

ترجمہ و مقدمہ

شفیع عقیل

قیمت: ۱۵۰/= روپے

شائع کردہ

انجمن ترقی اُردو پاکستان ڈی ۱۵۹ بلاک ۷ گلشن اقبال کراچی

قومی زبان - مئی ۹۴ء جلد ۶۶ شمارہ ۵

مضمون نما

ادارۂ تحریر

ادا جعفری

جمیل الدین عالی

مشفق خواجہ

مدیر

ادیب سہیل

بدل اشتراک

فی پرچہ ——— ۸ روپے

سالانہ عام ڈاک سے ۹۰ روپے

سالانہ رجسٹری سے ۱۶۲ روپے

بیرونِ ملک

سالانہ عام ڈاک سے ۱۰ پونڈ ۱۵ ڈالر

سالانہ ہوائی ڈاک سے ۱۵ پونڈ ۲۵ ڈالر

انجمن ترقی اردو پاکستان

شعبۂ تحقیق: ڈی ۱۵۹ - بلاک ۷ - گلشن اقبال

کراچی [illegible] - فون: ۴۶۱۴۰۶

حبیب بینک

کے کھاتے دار اَب
ہر دِن کے ۲۴ گھنٹے
اور سال کے ۳۶۵ دِن
نقد رقوم نکلوا سکتے ہیں۔

حبیب بینک نے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو **سیلف سروس بینکنگ** کی سہولت فراہم کرنے کے لئے آٹو کیش مشینیں نصب کی ہیں۔

ہماری آٹو کیش مشینیں اس وقت کراچی، لاہور، اسلام آباد، راولپنڈی، پشاور اور فیصل آباد میں کام کر رہی ہیں۔
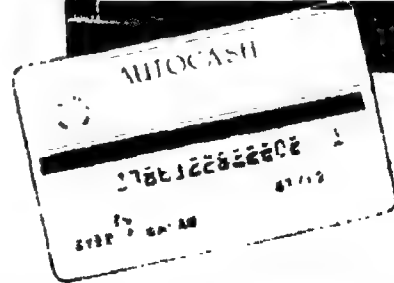
اے ٹی ایم کارڈ حاصل کرنے کے لئے آج ہی اپنے برانچ منیجر سے رجوع کیجیے۔

بہتر خدمت کی روایت

حبیب بینک لمیٹڈ

"اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ دینے کے لیے رٹ" کے عنوان کے تحت ۱۸ اپریل ۹۴ء کو کراچی کے روزنامہ "جنگ" میں یک خبر شائع ہوئی جس میں کہا گیا ہے کہ اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ دینے کے لیے لاہور ہائی کورٹ میں تحریک نفاذِ اُردو کے صدر ی طرف سے ایک رٹ دائر کی گئی ہے اس سلسلے میں اُن کا موقف یہ ہے کہ آئین کے تحت ۱۴ اگست ۱۹۸۸ء تک اُردو کو رکاری زبان کی حیثیت سے انگریزی کی جگہ لے لینی چاہیے تھی مگر ساڑھے پانچ سال کا عرصہ گزرنے کے باوجود حکومت نے یہ ئینی تقاضا پورا نہیں کیا......

اس رٹ کا نتیجہ کیا نکلتا ہے اس کے بارے میں کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا البتہ اس سے "قومی زبان" کو جلد سے جلد اس کا ل مقام دلانے کے سلسلے میں عوام کے بے چین جذبات کا اظہار ضرور ہوتا ہے۔ "قومی زبان" کے نفاذ کے سلسلے میں عوام اس کی بے چینی بے سبب بھی نہیں۔ اس لیے کہ برسوں پہلے پاکستان کے حصول کی لڑائی بمبئی سے پشاور تک اسی زبان کے توسط ے لڑی گئی تھی اور مملکت کا کاروبار عوام کے لیے انگریزی میں چلانا ناممکن ہوگیا ہے۔

بانیِ پاکستان حضرت قائداعظم نے اس کے جائز مقام کا واضح اعلان یہ فرما کر ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء میں کردیا تھا کہ پاکستان کی ی زبان اُردو ہوگی۔ اب اس اعلان کو بھی تقریباً ۴۶ برس کا طویل عرصہ ہوتا ہے۔ مزید برآں یہ کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ین ۱۹۷۳ء کی شق (۱) ۲۵۱ کے تحت پاکستان کی قومی زبان، اُردو کو قرار دیا جاچکا ہے۔ اس آئین کے نفاذ کو بھی بیس برس کا ہ ہوتا ہے لیکن قومی زبان کے نفاذ کا عمل ہے کہ ہنوز کل پر ٹلتا جاتا ہے اور ہر آنے والا کل روزِ اوّل ثابت ہوتا ہے۔ اس کے کس لاہور اور کراچی کے کئی اک سرکاری دفاتر کے ذمہ دار کارپرداز جو قومی زبان کے جلد از جلد نفاذ کی ضرورت کو سمجھتے ہیں اور اس سلے میں مخلص ہیں، اُن کے ارادے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔ اور اس سلسلے میں وہ خوش اسلوبی سے جو کرنا چاہتے ہیں رتے ہیں۔ ایسے ہی کئی چھوٹے سرکاری اداروں میں ایک "بلدیہ کراچی وسطی" ہے جس نے ۱۹۸۷ء میں اپنے ہاں قومی زبان ے نفاذ کے کام کا آغاز کیا۔ اور "آئینی تقاضوں کے مطابق ایک قرارداد کے ذریعے اُردو کو سرکاری زبان قرار دے دیا۔" ایسی مزید یں لاہور اور کراچی کے دوسرے سرکاری دفاتر سے بھی دستیاب ہوسکتی ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ اگر خلوص دل سے کسی کام کو نے کا عزم کیا جائے تو وہ ہوکر رہتا ہے۔ قومی زبان کا نفاذ جلد سے جلد عمل میں آنا ملک کے بہترین مفاد میں ہے اس سے وں کے درمیان بڑھتے ہوئے فاصلے کم سے کم تر ہوتے چلے جائیں گے اور قومی یکجہتی کو فروغ حاصل ہوگا۔

سوچنا یہ ہے کہ ایک چھوٹا سرکاری ادارہ اپنے تمام تر دفتری کام قومی زبان میں بہ طریق احسن انجام دے سکتا ہے۔ اور اس میں کسی طرح کی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی تو پھر یہی تجربہ سارے ملک کے بڑے بڑے دفاتر تک کیوں نہیں پھیلایا جاسکتا؟ سارا ہ عمل اور خلوص نیت کا ہے۔ یہاں مجھے بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی سابق صدر پاکستان محمد ایوب خاں سے ایک گفتگو یاد رہی ہے "انھوں نے ایک موقع پر صدر ایوب سے کہا تھا..... "اگر تم چاہو تو کل ایک ضابطۂ مارشل لا کے اجراء کے ذریعے اُردو ی حیثیت قومی زبان نفاذ ہوسکتا ہے۔"

ڈا[illegible] کرسٹینا ایک [illegible]

نام: کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ

[illegible]ت: برونو اوسٹر ہیلڈ

تاریخ و مقام پیدائش: ۲۲ اکتوبر ۱۹۵۲ء، برلن

پتہ: Muhlingstr-3

69121- Heidelberg,

Germany

تعلیمی کوائف: ایم اے اُردو، ہمبولٹ یونیورسٹی، برلن ۱۹۷۶ء

پی۔ ایچ۔ ڈی (اُردو ادب) ہمبولٹ یونیورسٹی، برلن، ۱۹۸۶ء

قرۃ العین حیدر" بطور ایک ناول نگار،

ناول "میرے بھی صنم خانے"، "آگ کا دریا"، اور "آخرِ شب کے ہمسفر" کا (جرمن میں) ایک تنقیدی مطالعہ۔

موجودہ تقرری: اُردو لیکچرر، ادارۂ جنوبی ایشیا (ساؤتھ ایشیا انسٹیٹیوٹ، ہائیڈل برگ یونیورسٹی، اِم نیون ہیمر فیلڈ۔ ۳۳۰) ۶۹۱۲۰ ہائیڈل برگ۔ جرمنی،

[illegible]پوزیشن: ریسرچ اسسٹنٹ، ساؤتھ ایشیا ڈپارٹمنٹ، اسکول آف اسٹڈیز، ہمبولٹ یونیورسٹی، برلن ۱۹۷۵-۱۹۹۰ء

اُردو لیکچرر ساؤتھ ایشیا انسٹیٹیوٹ، یونیورسٹی آف ہائیڈل برگ، ۱۹۹۰ء

[illegible]۔ تدریسی تجربہ: اُردو اور ہندی (بیسک کورسز۔ اُردو ہندی) ایڈوانسڈ کورسز اُردو کا اٹھارہ سالہ تدریسی تجربہ۔

لیکچرز اور سیمنارز (اُردو ادب کی تاریخ اور ہمعصر اردو ادب پر)

[illegible]۔ پبلیکیشنز

[illegible]۔ (۱) (جنھیں ایڈٹ کیا) ہندوستان کے مختصر افسانوں کا انتخاب۔ مددگار۔ مدیر۔ دیباچہ اردو کہانیوں کا انتخاب اور ترجمہ

(ہمعصر اُردو نثر اور شاعری، انتخاب دیباچہ اور ترجمہ)

(۲) ریسرچ پیپرز (تحقیقی مقالے) مضامین، ترجمے اُردو ادیبوں پر ۱۵ مضامین: ..... سلام بن رزاق کے افسانوی مجموعہ "انجام" کے ترجمے

[illegible]رۃ العین حیدر، "آگ کا دریا"، "چاندنی بیگم" (اقتباسات، انتخابات اور ترجمے)

(۳) ۱۹۹۴ء میں شائع ہونا ہیں۔

[illegible]میر کی آوازیں

[illegible] شاعرات کی منتخب شاعری

[illegible] سے پیوستہ

انڈیا کی ہمعصر اُردو مختصر کہانیوں (افسانوں) میں ہیرو یا اینٹی ہیرو..... "ابن الوقت" - "نذیر احمد"

[illegible] کے "ابن الوقت" مشرق و مغرب کا تصادم ایک کلچرل چیلنج

ڈاکٹر کرسٹینا ہیلڈ

۱۹ مارچ ۱۹۹۲ء انجمن ترقی اردو کی طرف سے [illegible] کی تقریب میں۔

[illegible]

دائیں سے بائیں جناب قمر جمیل، ڈاکٹر فہیم اعظمی، پروفیسر عتیق احمد، سید ذوالفقار احمد، شان الحق حقی۔

دائیں سے بائیں جمیل الدین عالی، علی حیدر ملک، سحر انصاری، قمر جمیل، نورالحسن جعفری، ڈاکٹر کرسٹینا ہیلڈ، ام عمارہ، ادا جعفری، سمی حقی، شہناز پروین، شہزاد منظر، شوکت صدیقی، شان الحق حقی، ممتاز احمد خاں، فہیم اعظمی، شہناز قدوائی، ذوالفقار احمد، ادیب سہیل
پروفیسر عتیق احمد، محمد طارق

[illegible]

ڈاکٹر کرشینا میننڈ کے ساتھ جامعہ کراچی کے اساتذہ حضرات و خواتین

قومی زبان (۹) مئی ۱۹۹۴ء

غالب دوستی ایک وسیع برادری ہے

انٹرویو

ڈاکٹر اجمل نیازی

آج اردو کے سب سے بڑے شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالب کی ۱۲۵ سالہ یوم وفات ہے بجنوری نے کہا تھا کہ عظیم مغلوں نے ہندوستان کو تین تحفے دیے اردو زبان، تاج محل اور مرزا غالب، مرزا غالب پر اب تک لاکھوں صفحات لکھے گئے ہیں۔ غالب اور اقبال دو ہی ایسے شاعر ہیں جن پر سب سے زیادہ تحقیقی اور تنقیدی کام ہوا ہے۔

اس موقع پر ہم نے معروف غالب شناس پروفیسر ڈاکٹر سید معین الرحمٰن سے ایک انٹرویو کیا ہے ڈاکٹر صاحب گورنمنٹ کالج میں صدر شعبۂ اردو ہیں انھیں غالب پر تحقیق کرنے پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے نوازا گیا ہے۔ تحقیق غالب کے حوالے سے انھوں نے یادگار کام کیا ہے اس ضمن میں کئی نادر چیزیں ان کے پاس محفوظ ہیں برصغیر میں جہاں کہیں غالب کے حوالے سے کوئی کام ہو رہا ہو ڈاکٹر صاحب کو اس کی خبر ہوتی ہے ڈاکٹر صاحب کے خیال میں غالب دوستوں کی ایک وسیع برادری دنیا میں پیدا ہو رہی ہے۔

۱۹۶۹ء میں گورنمنٹ کالج کے ممتاز ادبی جریدے راوی کا غالب نمبر بھی شائع ہوا تھا جسے پورے ملک میں پذیرائی ملی

س:...... ڈاکٹر صاحب یہ فرمائیے کہ آپ کی ابتدائی زندگی کے پہلے ورق پر کیا لکھا ہے اسکولنگ کہاں ہوئی؟

ج: میری ابتدائی تعلیم یا اسکولنگ کہہ لیجیے کہ بہاولنگر میں ہوئی انٹرمیڈیٹ میں نے گورنمنٹ کالج بہاولنگر سے کیا یہ ۱۹۵۹ء کی بات ہے اس وقت تک وہاں کوئی ڈگری کالج نہیں تھا اور مجھ سے دو سال بڑے بھائی معین الرحمٰن مرتضیٰ انٹر کے بعد تعلیم کے لیے کراچی چلے گئے۔ وہیں میں نے بھی بی اے میں "اردو کالج" میں داخلہ لیا۔

س: "اردو کالج" میں داخلہ کا کوئی سبب؟

ج: "اردو کالج" ہی میں داخلہ کیوں لیا، اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ اردو کالج میں داخلہ ہم نے بابائے اردو مولوی عبد الحق کی نسبت سے لیا یہ کالج ان کا قائم کیا ہوا تھا ان سے ہمارا قلمی رابطہ، بہاولنگر کالج کے میگزین "لالہ صحرا" کے مدیر کی حیثیت سے ہو چکا تھا۔ اردو کالج میگزین "برگ گل" کی مجلس ادارت سے وابستہ ہونے کا امتیاز بھی ہمیں حاصل ہوا۔ اس زمانے میں بابائے اردو سے رت کا رشتہ زیادہ مضبوط اور استوار ہوا اور ادب اور تحقیق میری منزل اور منہاج ٹھہری۔

ئین بھائی نے صحافت میں اور میں نے اردو میں کراچی یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔

س: اس کے بعد کی کہانی کیا ہے؟

ج: مختصراً یہ کہ معین صحافت میں چلے گئے۔ وہ صحافت کے استاد اور ایک دانشور کی حیثیت سے آج کے صحافتی حلقوں میں اپنی ایک مستند شناخت رکھتے ہیں وہ کراچی ہی میں رہ بس گئے اور کراچی یونیورسٹی کے شعبہ ابلاغ عامہ سے وابستہ ہیں میں کچھ عرصہ ترقی اردو ڈ کراچی کے عملہ لغت سے وابستہ رہا اس زمانے میں مجھے بہت زیادہ پڑھنے اور اردو زبان و ادب کے اکابر سے قریب ہونے کے مواقع ئے بھر میں عارضی سرکاری ملازمت ملنے پر لیکچرار شعبہ اردو گورنمنٹ کالج بہاولنگر میں چلا آیا ۶۶۔ ۱۹۶۵ء میں مجھے پنجاب

یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں اردو لیکچرار کی عارضی اسامی پر کام کرنے کا موقع ملا یہاں پروفیسر سید وقار عظیم اس زمانے میں شعبہ اردو کے سربراہ تھے مجھے ان کی روش حیات اور ان کے تدریسی اسلوب نے متاثر کیا۔ اورینٹل کالج کے بعد میں بطور لیکچرار ایف سی کالج چلا گیا۔

س: ایف سی کالج کی یادیں تو ابھی تازہ ہونگی؟

ج: ایف سی کالج سے میری وابستگی مجھے ہمیشہ بڑی عزیز رہی یہاں چھ سات برس بڑے بھرپور گزارے۔ میری کئی قابل ذکر کتابیں ایف سی کالج سے وابستگی کے زمانے کی یادگار ہیں غالب پر میری پہلی کتاب آج سے پچیس برس پہلے چھپی اس وقت میں ایف سی کالج میں پڑھا رہا تھا یہاں میرے علمی کاموں اور تدریس سے میری علمی دلچسپی کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا، مجھے اضافی ترقیاں ملیں ایف سی کالج کے پرنسپل پروفیسر ڈاکٹر ای جے۔ ینکلر اور بعد میں ڈاکٹر انور برکت اور شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر اقبال احمد خاں نے ہمیشہ میرا دل بڑھایا اور کام کرنے کی آسانیاں پیدا کیں یہاں مجھے بہت اچھے احبا میسر آئے اور محبت کرنے والے شاگرد بھی جن میں بہتوں سے آج بھی اچھا ربط اور رابطہ ہے۔

س: ایف سی کالج کو کیوں چھوڑ دیا؟

ج: ایف سی کالج میں نے نہیں چھوڑا یہ مجھ سے چھوٹ گیا۔ یہاں میں لیکچرار تھا پنجاب پبلک سروس کمیشن سے ڈائریکٹ بطور "اردو پروفیسر" میرا انتخاب ہو گیا۔ میں نے اور خود کالج نے بھی بہت چاہا کہ میں ایف سی ہی میں رہ جاؤں لیکن اس وقت پورے پنجاب میں اردو کے سینئر پروفیسر کی صرف ایک ہی جگہ تھی اور یہ جگہ گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں تھی جنوری ۱۹۷۴ء میں مجھے وہاں جانا پڑا۔ مجھے جانا اچھا نہیں لگا لیکن کوئی سات برس کے قیام کے بعد فروری ۱۹۸۱ء میں جب وہاں سے میری لاہور واپسی ہوئی تو واقعہ یہ ہے کہ میرا دل بڑا بوجھل تھا۔

فیصل آباد میں مجھے بڑی عزت، اپنائیت اور محبت ملی وہاں مجھے ایم اے (اردو) کی کلاسز کی تنظیم نو اور اپنے ذی استعداد ر. باہ کو ریسرچ کی طرف مائل کرنے اور انہیں علمی اور تحقیقی کاموں میں مصروف اور منہمک کر دینے میں کامیابی ہوئی۔ دل سے بہت قریب میرے بہت سے احباب کا تعلق فیصل آباد سے ہے۔

س: کچھ نام لینا پسند کریں گے؟

ج: سب نام لینا تو ممکن نہیں اور کچھ نام لینا خطرے سے خالی نہیں! لیکن واقعہ یہ ہے کہ شعبہ اردو سے وابستہ ۱۹۷۴ء سے ۱۹۸۱ تک کے اپنے سارے رفقائے کار آج بھی عزیز اور محترم ہیں اس زمانے کے اپنے طلبہ اور طالبات سے بھی مجھے محبت اور ارادت ملی جس نے مجھے مستعد اور متحرک رکھا۔ ہاں شعبہ اردو سے باہر کے کچھ نام لیے بغیر چارہ نہیں اسلامیات کے پروفیسر افتخار احمد چشتی، عربی کے ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی، انگریزی کے پروفیسر افسر ساجد اور پرنسپل منیر احمد چودھری ان کی خوئے دل نوازی کو بھول جانا تو میرے بس ہی میں نہیں۔ کالج سے باہر کے کرم فرماؤں میں ملک عبدالرحمٰن صاحب کی دلبری اور دلداری کا نقش دل پر بہت گہرا ہے تاریخ کے باغ و بہار پروفیسر ڈاکٹر نیازی، فیصل آباد سے پرنسپل ہو کر میانوالی چلے گئے انگریزی کے پروفیسر ظفر اقبال اور پروفیسر ایم آر آصف اللہ کو پیارے ہوئے۔

دل کو تڑپاتی ہے اب تک گرمیٔ محفل کی یاد!

س: گورنمنٹ کالج لاہور سے وابستگی کا حال سنائیں گے؟

قومی زبان (۱۱) مئی ۱۹۹۴ء

ج: ۱۹۸۱ء سے میں شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور سے وابستہ ہوں یہاں آکر میں نے ایم اے (اردو) کی کلاسز شروع کیں ایم اے اور پی ایچ ڈی کی سطح پر تدریس، تعلیمی منصوبہ بندی اور تحقیقی امور میں رہنمائی میرے فرائض کار کا حصّہ ہے شعبے میں تحقیق اور تخلیق و تنقید کا بڑا اچھا ٹیلنٹ ہم نے یہاں فراہم کیا ہے شعبے سے ریسرچ جرنل "تحقیق نامہ" چھپتا ہے اور شعبہ اردو کے اہتمام سے ہم پچھلے پانچ برسوں میں بیس بائیس سے زیادہ علمی و ادبی کتابیں چھاپ چکے ہیں۔

س: غالب سے تعلق یا تعلقات کیسے قائم ہوئے؟

ج: غالب سے اپنے تعلق کی روداد کیا سناؤں ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دنوں میں جب میں بہاؤلنگر سے اورینٹل کالج (لاہور) میں اپنی نئی خدمت پر لاہور پہنچا تو میرے مختصر سے سامان میں عجب نہیں کہ کچھ خوش جمالوں کے خطوط بھی رہے ہوں لیکن غالب کا دیوان اور ان کے خطوط ضرور سامان کا حصّہ تھے! خیر یہ تو محض ایک لطف کی بات ہے۔ پنجاب یونیورسٹی سے بطور لیکچرار میری وابستگی کے زمانے میں پروفیسر حمید احمد خان وائس چانسلر اور پروفیسر وقار عظیم شعبہ اردو کے صدر تھے۔ انہوں نے مجلس یادگار غالب قائم کی اور غالب کی صد سالہ برسی کی مناسبت سے بڑے پیمانے پر غالب کے بارے میں کتابوں کی تصنیف و ترتیب و تالیف کا پروگرام وضع ہوا۔ غالب کی صد سالہ برسی پر ۱۹۶۹ء میں میری کتاب "اشاریہ غالب" یونیورسٹی نے شائع کی، کام کی نوعیت ایسی تھی کہ پھر غالب میرے شوق اور مطالعے کا لازمی حصّہ بن گئے۔

۱۹۷۲ء میں مجھے سندھ یونیورسٹی سے "غالبیات کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ" کے موضوع پر اردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی۔ کسی پاکستانی یونیورسٹی سے غالب پر یہ پہلی سند فضیلت ہے میں نے یہ تحقیقی کام پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی رہنمائی میں پورا کیا ۱۹۷۴ء میں "غالب اور انقلاب ستاون" شائع ہوئی اس پر مصوّر مشرق عبد الرحمٰن چغتائی نے دیباچہ لکھا اس کتاب پر مجھے داؤد ادبی ایوارڈ ملا جو اس وقت ملک میں اردو تحقیق و تنقید کا سب سے بڑا اعزاز اور انعام تھا یہ کتاب ترمیم و اضافے کے ساتھ کئی بار چھپ چکی ہے غالب انسٹیٹیوٹ دہلی نے بھی اس کا ایک ایڈیشن شائع کیا ہے۔

۱۹۸۱ء میں میرے تحقیقی مقالات کا ایک مجموعہ "تحقیق غالب" کے نام سے چھپا۔ ۱۹۸۹ء میں غالب کی ۱۲۰ ویں برسی کے موقع پر میرا نمائندہ تحقیقی کام "غالبیات کا علمی سرمایہ" کے نام سے شائع ہوا۔ ۱۹۹۰ء میں میرے تحقیقی مقالات کا دوسرا مجموعہ "تحقیق اور تلاش" شائع ہوا جس کا ابتدائی اور بڑا حصّہ "غالبیات" ہی سے متعلق ہے۔ "جہانگیر غالب" کے نام سے میری مرتب کی ہوئی ایک بڑی اہم کتاب غالب کی ایک سو پچیسویں برسی کے مناسبت سے اس برس شائع ہوئی جس کا انتساب جمیل الدین عالی کے نام ہے جنھیں میں غالب کی علمی جاگیر کا وارث خیال کرتا ہوں۔

س: غالب سے تعلق خاطر کی کوئی خاص وجہ بھی تھی؟

ج: میرے اپنے شوق یا رغبت اور لگاؤ سے قطع نظر غالبیات کی طرف مجھے لانے میں پروفیسر وقار عظیم اور پروفیسر حمید احمد خان کا دخل ہے میری ابتدائی ادبی کاوشوں سے میرا حوصلہ بڑھانے اور مجھے اعتماد کی دولت عطا کرنے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا بھی ایک مستقل کردار ہے پھر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی شفقت اور دلداری میرے لیے ایک الگ اور مستقل باب رحمت ہے۔

س: آپ کو غالب شناس ہونا کیسا لگتا ہے؟

ج: میں کیا اور میری غالب شناسی کیا...... پچھلے پچاس ساٹھ برس میں برِ عظیم میں غالب شناس کے طور پر جو نام ابھرے اور آسمان غالب پر چھائے رہے ان میں مولانا غلام رسول مہر، مولانا امتیاز علی عرشی، شیخ محمد اکرام، مالک رام، قاضی عبد الودود اور رشید

احمد صدیقی کے اسماء ایسے ہیں جنہیں کبھی اور کہیں بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان جیسے مرتبے رُتبے اور قامت کے بے مثال غالب شناس پیدا ہونا اب ممکن نہیں ۔ بقول حالی "اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز" ان بڑوں کے اٹھ جانے سے نظر اب ہم پر پڑنے لگی ہو شاید "کر دیا مرکے یگانوں نے یگانہ ہم کو" میرے لیے تو یہ کہنا بھی چھوٹا منہ اور بڑی بات کے مترادف ہوگا لیکن ان اکابر سے مجھے ایک نسبت ضرور رہی ہے اس نسبت کی برکت سے غالب شناسی کے حوالے سے جہاں تہاں میرا نام لیا جاتا ہے اور بس اپنی کمزوریاں میرے سامنے ہیں۔

س: آپ کو پاکستان کے موجودہ غالب شناسوں میں کوئی ایک نام لینے میں مشکل تو پیش نہیں آئے گی؟

ج: غالب پر ہر لکھنے والے کو میں بہت عزیز جانتا ہوں اور ان کے بارے میں ذرا بھی بدخظ ہوئے یا کئے بغیر میں تادیر گفتگو کرنا پسند کروں گا لیکن آپ کے محدودات ہیں اور میرے بھی...... ہاں بہ اگر آپ تحقیق اور تنقید غالب میں پاکستان کی حد تک لکھنے والوں میں صرف "ایک" نام سننے پر اصرار کریں تو تحقیق غالب کے حوالے سے میں ڈاکٹر وحید قریشی اور تنقید غالب کے ضمن میں "غالب آشفتہ نوا" کے خالق ڈاکٹر آفتاب احمد کا نام بہت احترام سے لوں گا۔

س: آپ کا مضبوط اور بے مثال ذخیرہ غالب

ج: چلیئے یہ مان لیا جائے کہ میرا ذخیرۂ غالبیات بہت مضبوط ہے لیکن یہ "بے مثال" بہرحال نہیں ہے کراچی میں غالب کے عاشق صادق ڈاکٹر آفتاب احمد خان کا ذخیرہ اور ملتان میں لطیف الزماں خان کا ذخیرۂ غالبیات بہت شہرت رکھتا ہے۔ میری بدنصیبی کہ کراچی اور ملتان کے یہ شخصی ذخائر دیکھنے کا موقع مجھے میسّر نہیں آسکا۔ لاہور میں خلیل الرحمٰن داؤدی صاحب کا ذخیرہ بھی بڑا شاندار ہے۔

میرے شخصی ذخیرہ غالبیات کی سب سے قیمتی اور نادر چیز دیوان غالب کا وہ قلمی اور طلائی نسخہ ہے جس پر غالب کے اپنے قلم کی اصلاحات ہیں اس نسخے میں وسط ۱۸۵۲ء تک کا اردو کلام غالب آگیا ہے۔

غالب کے کچھ غیر مطبوعہ خطوط میں نے سالنامہ "نقوش" (لاہور) میں ۱۹۹۳ء میں پہلی بار متعارف کرائے ہیں کچھ مزید غیر مطبوعہ خطوط غالب میں شعبۂ اردو کے ریسرچ جرنل "تحقیق نامہ" کے غالب نمبر میں شامل کر رہا ہوں کچھ بڑی نادر دستاویزات میں نے اس برس "جاگیر غالب" کے نام سے چھاپ دی ہیں۔ غالب کی کتابوں کے پہلے اور معاصر ایڈیشن ان کی تصویریں، تحریریں، مہریں ان کے عکس غالب پر چھپنے والی اچھی بری چھوٹی بڑی کتابیں اور رسائل کی خاص اشاعتیں غالب پر لکھے جانے والے تھیسس، مضامین، اخبارات کے تراشے، غالبیاتی، سوینئر کلینڈرز اور دوسری یادگاریں، اپنے ذخیرہ غالبیات کی ان سب چیزوں کا ذکر ایک دو نشستوں میں ممکن نہیں۔

س: آپ کے پاس کتابیں کچھ زیادہ نہیں ہوگئیں۔؟

ج: میرے شخصی ذخیرہ کتب میں "غالبیات" کے علاوہ دو چار گوشے اور بھی ہیں جن پر میں نے بڑی محنت کی ہے۔ "اقبالیات" کے ایک بڑے ذخیرہ نے بھی میرے کتب خانے کا ایک بڑا حصّہ گھیرا ہوا ہے۔ ملک اور بیرونِ ملک کی پچاس سے زیادہ یونیورسٹیوں کے پی ایچ ڈی، ڈی لٹ یا اس نوع کے مختلف علمی اسناد پانے والے مقالات کا ایک الگ سیکشن ہے میرے پاس مطبوعہ، غیر مطبوعہ ایسی تحقیقی کتابوں کا ایک الگ سیکشن ہے میرے پاس مطبوعہ، غیر مطبوعہ ایسی تحقیقی کتابوں اور مقالوں کی تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ تو ضرور ہوگی۔ بعض علمی رسائل کے فائل بھی میرے ذخیرہ کتب کا امتیاز ہیں (مثلاً "نقوش ،

"اردو"، "قومی زبان"، "غالب نامہ" وغیرہ وغیرہ) غالب سے لے کر آج تک کے اکابر ادب کے قلمی خطوں اور تحریروں کا بڑا نادر اور قیمتی ذخیرہ بھی میں نے بڑی محنت اور شوق سے فراہم اور جمع کیا ہے۔ ان غیر مطبوعہ خطوں کی تعداد کئی ہزار سے متجاوز ہے۔

س: اس "غالب اندوزی" کا حاصل اور اس کے اثرات کیا کیا کچھ ہیں۔؟

ج: مجھے جو تھوڑی بہت شہرت اور عزت میسر آئی اسے غالب اور تحقیق سے اپنی وابستگی ہی کا انعام خیال کرتا ہوں۔ ملک اور بیرون ملک میرے حلقۂ احباب اور اثر میں غالب اور تحقیق سے متعلق میری دلچسپی کو قدر مشترک کی حیثیت حاصل ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، خواجہ منظور حسین میرا بڑا محبوب موضوع اور میرا مرکز نظر رہے ہیں اور مجھ پر حد درجہ مہربان بھی ...... پھر مولانا غلام رسول مہر، عبدالرحمٰن چغتائی، شیخ محمد اکرم، مالک رام، مولانا عرشی، پرتھوی چندر، محمد طفیل، مولانا مرتضیٰ حسین لکھنوی، ڈاکٹر شوکت سبزواری، کس کس کا نام لوں جن کی مہر و رحمت کا میں مورد رہا اور جن کا ماتم دار ہوں۔ آج پاکستان میں غالب فہم ہو یا غالب کا طرفدار ایک آدھ استثنیٰ کے علاوہ کوئی ایسا نہیں جس سے برا قریبی تعلق نہ ہو۔ بھارت کے غالب شناسوں میں پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر مختار الدین، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، رشید حسن خان، عرشی زادہ، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی اور کتنے ہی دوسرے ان کی محبت اگر مجھے حاصل ہے تو اسے میں غالب کا فیضان خیال کرتا ہوں۔

س: کچھ اپنے شاگردوں کے بارے میں بتانا پسند کرینگے؟

ج: شاگردوں کے حوالے سے میں اپنے آپ کو بڑا باثروت اور خوش نصیب خیال کرتا ہوں اعلیٰ مدارج میں ان کی تشفی اور ان کے اطمینان کی خاطر اور ان کے استفسارات کے باعث مجھے اپنے آپ کو ہمیشہ مصروف مطالعہ رکھنے کی خوشی میسر رہی اب یہ میری عادت ثانیہ بن چکی۔ مجھے اس میں راحت ملتی ہے اس کے لیے میں اپنے شاگردوں کا بڑا شکر گزار ہوں، شاگردوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ ۱۹۶۵ء میں میں نے پنجاب یونیورسٹی میں اردو لیکچرار کے طور پر تدریسی ذمہ داری سنبھالی ایم اے (فائنل) میں عطاالحق قاسمی، رفیع الدین ہاشمی، گلزار وفا اور عبدالغنی فاروق وغیرہ نمایاں طالبعلم تھے۔ ایم اے (پریویس) میں امجد اسلام امجد جلیل عالی، اجمل وجیہ ملک محمد حسین، ارشاد نقوی، اسد علی خان اور معراج نیر زیدی کے نام فوری طور پر ذہن میں آتے ہیں۔ ان سے بعد کے برسوں میں اب تک عزت اور محبت کا رشتہ میرے لیے بڑی تقویت اور افتخار کا باعث ہے لیکن تیس برس پر پھیلے ہوئے عزیزوں میں سے کچھ کا نام لینا، دراصل ان بہت سے شاگردوں سے زیادتی ہے جن کی خوبیاں اور جن کے اوصاف اور چہرے ذہن پر آج بھی نقش ہیں لیکن جن کے نام لینا بھی چاہوں تو وقت اور صفحات دونوں مزاحم ہیں! قریب کے شاگردوں میں نائیلہ انجم، راحیلہ اسلم، صباح مقبول، عاصمہ اعجاز اور ندرت معین اپنی الگ الگ خوبیوں کی بناء پر ایسے نام ہیں جن کو نظر انداز کر دینا میرے لیے ممکن نہیں،

س: ...... آپ بظاہر مطمئن زندگی بسر کر رہے ہیں، آپ کی بے اطمینانیاں کیسی ہیں۔؟

ج: ...... میں نے کہیں لکھا بھی ہے کہ تدریس اور تحقیق میرا موضوع، میدان اور میری پہچان ہے اور اس حوالے سے میں اپنی زندگی کو پُرمایہ، بامعنی اور باثروت پاتا ہوں، ان پچیس تیس برسوں میں مجھ ایسے محدود بساط اور استعداد کے شخص کو اپنے بزرگوں، ہم کار ساتھیوں یا اپنے شاگردوں سے جو ادب کے اعلیٰ درجوں میں میرے قریب اور رفیق ہوئے جیسی بے خلل اور بے دریغ عزت اور محبت ملی، اسے میں حاصل حیات خیال کرتا ہوں اور اس پذیرائی کو اپنا استحقاق نہیں خدا کی جانب سے انعام جانتا ہوں۔ اپنی تحسین اور تعریف سے ہر کم عقل خوش ہوتا ہے مجھے اس سے شرمندگی بھی ہوتی ہے اللہ مجھے توفیقات سے نوازے اور اپنے محبت اور عزت کرنے والوں سے سرخرو رکھے۔

قومی زبان (۱۴) مئی ۱۹۹۴ء

پروفیسر رالف رسل سے گفتگو

رعنا اقبال

انٹرویو

س:۔ آپ نے اردو زبان و ادب کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی اور اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز میں استاد بھی رہے لیکن آپ نے جو کام بھی کیا وہ انگریزی زبان میں ہے اردو میں نہیں۔ اس کی کیا وجہ تھی؟

ج:۔ لندن اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز میں میرا تقرر دوسری عالمی جنگ کے بعد کا واقعہ ہے۔ جب انگریزوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہماری محکوم قومیں اب آزاد ہو جائیں گی لیکن ان سے اچھے تعلقات برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کی زبان اور کلچر سے واقفیت حاصل کی جائے۔ میرا بھی یہی جذبہ تھا جب میں ہندوستان میں تھا یہ آزادی سے پہلے کی بات ہے تو مجھے وہاں کے لوگ بہت پسند آئے واپسی کے بعد میں نے یہ کوشش کی کہ مجھے کوئی ایسی نوکری مل جائے جس میں یہ تعلق برقرار رہے اور اس کے لیے میں سمجھتا تھا کہ میری خاص ذمہ داری اردو زبان و ادب کو انگریزی میں عام کرنا ہے اور یہ کام اُسی وقت ممکن تھا جب انگریزی زبان میں کام کیا جاتا البتہ میرے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ میں اردو میں بھی مواد اکٹھا کرتا رہوں غزل پڑھنے سے پہلے زبان آنی چاہیے۔"

س:۔ تو زبان کے سلسلے میں آپ نے کیا کیا؟

ج:۔ اس سلسلے میں میں نے خورشید الاسلام کے تعاون سے کام کیا ۱۹۶۸ء میں تھری مغل پوئٹس (تین مغل شاعر) میر حسن، سودا اور میر تقی میر اس میں شامل ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں غالب کے فارسی اور اردو کلام کا انتخاب شائع کیا اس کتاب میں غالب کی زندگی کے حالات بھی شامل ہیں ۱۹۹۱ء میں صرف میری کتاب "دی پرسوٹ آف اردو لٹریچر شائع ہوئی صرف میری میں نے اس لیے کہا کہ اس میں خورشید الاسلام کا تعاون حاصل نہیں تھا۔ میں ابتدا سے آج تک اردو سے متعلق ہی کام کرتا رہا ہوں اور اب ریٹائرمنٹ کے بعد سے تو میں سارا وقت اسی کام کو دیتا ہوں اپنی پہلی کتابوں میں کچھ اضافہ اور ترمیم کر رہا ہوں اس کے علاوہ اردو ادب کا انتخاب جو دو صدیوں پر مشتمل ہے اس پر کام کر رہا ہوں اب وہ تقریباً تیار ہے۔"

س:۔ کیا آپ کی کسی کتاب کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہوا؟

ج:۔ جی ہاں! تھری مغل پوئٹس کو دوبارہ چھاپا گیا ہے۔"

س:۔ آپ کی دلچسپی صنف غزل میں اور غزل کے حوالے سے غالب میں زیادہ ہے حالانکہ یہ دونوں ہی مشکل ہیں اس کی کوئی خاص وجہ؟

ج:۔ ابتدا میں غزل میں میرے لیے کوئی اپیل نہیں تھی میں اس صنف کو بالکل نہیں سمجھ پایا۔ اس کے موضوعات کے بارے میں، عاشق و معشوق کے بارے میں، اس کے معاشرتی پس منظر کے بارے...... میں یہ سب میں بالکل نہیں جانتا تھا لیکن

مطالعہ اور سیکھنے کا عمل برابر جاری رکھا رفتہ رفتہ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ غزل ہی بہترین چیز ہے۔ غالب کو میں بہت پسند کرتا ہوں لیکن میر بھی مجھے بہت پسند ہیں۔ میر کی شاعری زیادہ بلند ہے غالب کے مقابلے میں میر واقعی سچے عاشق تھے۔ غالب نہیں تھے۔

س:۔ کیا غالب دوسرے ممالک اور دوسری اقوام کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں؟

ج:۔ "بالکل، سو فیصد، اس میں کوئی شک نہیں۔ غالب کے اردو فارسی کلام کا انتخاب جو میں شائع کر رہا ہوں تو ظاہر ہے کہ وہاں الب پڑھے جاتے ہیں پسند کیے جاتے ہیں اسی طرح جس طرح ملٹن کو وہاں پسند کیا جاتا ہے لیکن یہاں ملٹن کو پڑھنے کے لیے اس ا ترجمہ کرنا ضروری ہے۔"

س:۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کے ساتھ آپ نے کافی وقت گزارا ہے ان کے بارے میں کچھ بتائیں؟

ج:۔ میں سب سے پہلے ۱۹۵۰ء میں پاکستان آیا تو لاہور میں ٹھہرا ہوا تھا۔ وہاں سے میں نے مولوی صاحب کو خط لکھا کہ میں آپ ے ملنا چاہتا ہوں تو انھوں نے جواب دیا کہ آپ کراچی آئیے اور میرے یہاں ٹھہریے تو میں یہاں پہنچا اور اس طرح کچھ دن مجھے ن کے ساتھ رہنے اور اُن کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان کی صاف گوئی مجھے بہت پسند آئی کیونکہ میں خود بہت صاف گو آدمی وں۔ مولوی صاحب محنتی بہت تھے اردو کی لگن انھیں بہت تھی ہر وقت اردو کی خدمت میں لگے رہتے تھے لیکن میں نے ان کے در کچھ تعصبات بھی پائے۔ وہ حالی کے حامی تھے اور ان کی محبت میں شبلی کے ساتھ بے انصافی کر جاتے تھے جبکہ شبلی کو وہ اپنا تاد بھی مانتے تھے۔ شوکت تھانوی نے ان کو مقدمہ باز کہا تو مقدمہ نگاری ان کی بڑی خدمت ہے بہت اہم کام ہے البتہ ان کی ستقل کتابیں کم ہیں سرسیّد کے بارے میں ان کی کتاب بہت اچھی ہے بہت عمدہ زبان لکھا کرتے تھے۔

:۔ جمیل الدّین عالی صاحب آپ کے گہرے دوست ہیں ان کے بارے میں آپ کے خیالات؟

:۔ بہت سے لوگوں کو میں جانتا ہوں۔ بہت سے لوگوں سے میرے بہت قریبی تعلقات ہیں لیکن عالی صاحب سے دوستی ان ب سے الگ اور مختلف ہے صرف ایک مثال خورشید الاسلام کی ضرور ہے۔ لیکن میں ان کی شاعری پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا۔ ن میں جب عالی صاحب میرے ساتھ رہتے تھے تو میں نے انھیں سُنا ان کے دوہے مجھے بہت پسند آئے نثر بھی یہ عمدہ لکھتے ں لیکن اس سے قطع نظر ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست ہیں ہمارے درمیان مضبوط دوستی کا ثبوت یہ ہے کہ ہم ے دوسرے کی خامیوں کو بھی واضح انداز میں بتا دیتے ہیں لیکن اندر یہ خوف نہیں ہوتا کہ کوئی بُرا مان جائے گا وہ مجھے اور میں نہیں ہر بات کہہ سکتے ہیں یہی بات میرے لیے بڑی قیمتی ہے وہ بہت مخلص آدمی ہیں ہم ایک دوسرے پر مکمل اعتماد رکھتے ہیں۔

:۔ عہدِ حاضر کے کن شعرا کا آپ نے مطالعہ کیا ہے؟

:۔ کسی ایک کا بھی پوری طرح نہیں کیا۔ اس لیے مجھے کسی تخلیق کار پر اپنی رائے دینے کا بھی موقع نہیں پہنچتا۔ وجہ اس کی یہ کہ میں جو کام کرتا رہا اس نے مجھے کسی اور طرف دیکھنے کا موقع نہیں دیا۔ غالب پر یا میر پر کام کرنے کے لیے کئی سال میں نے کو نہیں دیکھا کسی کو نہیں پڑھا۔ جب میں نے وہاں اردو پڑھانا شروع کیا تو مجھے صحیح کتابیں میسر نہیں آئیں ان طالب علموں لیے میں نے خود سارا مواد تیار کیا ظاہر ہے کہ یہ بھی وقت طلب کام تھا۔ ان کے دماغ میں اردو ادب ٹھونسنا کوئی آسان کام تو تھا اس لیے میں کچھ اور پڑھنے کے لیے وقت ہی نہ نکال سکا۔"

س:۔ پھر آپ کو اپنے مقصد میں کس حد تک کامیابی ہوئی؟

ج:۔ بڑی حد تک کامیابی ہوئی مجھے۔ دراصل انگریزوں کو یہ بتانے کے لیے کہ اردو بھی ایک چیز ہے میں نے ترجمے کے کام کی طرف زیادہ توجہ دی اس سلسلے میں عزیز احمد کے ناول "ایسی بلندی ایسی پستی" کو ترجمہ کیا البتہ یہ الگ بات ہے کہ میں اس ناول کو اردو کا بہترین ناول نہیں سمجھتا ہوں عزیز احمد اپنے دوسرے ناول "گریز" کا بھی ترجمہ چاہتے تھے لیکن میں نے وہ نہیں کیا میری نظر میں اردو کا سب سے بہترین ناول "امراؤ جان ادا" ہے اس کے علاوہ مجھے منشی پریم چند کے ناول بھی پسند ہیں ان کا ترجمہ کرنے کا بھی ارادہ ہے قرۃ العین مجھے بالکل پسند نہیں ان کے ناول "ہاؤسنگ سوسائٹی" کی تعریف سنی۔ پڑھا نہیں ہے۔ دراصل ان کے ہاں نمائش کا عنصر پایا جاتا ہے۔ غیر ضروری طور پر وہ انگریزی زبان اور ماحول کو بیان کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ "آگ کا دریا" لوگوں کو پسند ہے مجھے اس پر بھی کچھ شک ہے۔ ان کی خود نوشت کی بعض باتوں نے بھی مجھے بور کیا ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ لوگوں کے ناول بھی یقیناً اچھے ہوں گے لیکن مجھے امراؤ جان ادا ہی پسند ہے اور اس کا ترجمہ کرنا چاہتا ہوں۔ اسی طرح مجھے جو افسانے پسند آئے ان کا میں نے ترجمہ کیا ہے اور آئندہ بھی پروگرام میں شامل ہے لیکن بات وہی ہے کہ اب وہاں کے لوگوں میں اردو زبان و ادب سے لگاؤ پیدا ہو رہا ہے اور یہی میری کامیابی کا ثبوت ہے۔"

س:۔ آپ نے احمد علی صاحب کو بھی کہیں شامل کیا ہے؟

ج:۔ نہیں۔ کبھی نہیں۔ میں نے انھیں شامل نہیں کیا۔ ان سے میرا کچھ باتوں پر اختلاف ہے وہ اپنی جگہ ہے ان کی اردو تحریریں میں نے نہیں پڑھیں البتہ انگارے پڑھی ہے لیکن اس نے مجھے زیادہ متاثر نہیں کیا اس کے برعکس ان کا انگریزی ناول بہت خوب ہے

س:۔ اردو کی تدریس کے سلسلے میں آپ نے کیا طریقہ کار وضع کیا؟

ج:۔ یونیورسٹی کے طالبعلموں کے لیے اردو کی کتابوں کی فراہمی ایک کام ہے اور دوسرا یہ کہ پڑھنے والوں کے لیے وہ طریقہ کار طے کرنا جو سال بھر میں آپ کو اردو بولنا اور لکھنا سکھا دے۔ یہ کام یعنی کورس تیار کرنا بڑا اہم تھا اس کے علاوہ ایک اور اہم کام یہ تھا کہ وہاں مقیم ہندوستانی اور پاکستانی لوگوں کے بچے اردو کہاں سیکھیں حالانکہ وہاں مسجدوں میں اردو پڑھانے کا انتظام کیا جانے لگا تھا لیکن مولوی حضرات کا پڑھانے کا انداز ہم سے بہت مختلف تھا مثلاً سختی زبردستی اور مار پیٹ وغیرہ۔ جبکہ ہم نرمی محبت اور پیار سے پڑھانے پر زور دیتے ہیں تو ان کے اس روّیے سے بچے پڑھنے سے دور بھاگتے ہیں دوسرے یہ کہ خود مولوی صاحبان بھی پوری طرح اردو سے واقف نہیں ہوتے ہیں اور بچوں کو غلط اردو پڑھاتے ہیں۔ جب یہ مسئلہ بڑے پیمانے پر ابھرا تو وہاں کے انگریز ٹیچرز نے خود اردو سیکھنے کا ارادہ کیا اور یہ ضروری سمجھا کہ خود اردو سیکھ کر بچوں کو پڑھایا جائے چنانچہ ان کی ضروریات کو مدِ نظر رکھ کر میں نے کچھ کورسز تیار کیے جو مختلف مدتوں کے تھے جن کی اشاعت پہلی بار ۱۹۸۰ء میں ہوئی بہت بڑی تعداد میں وہ نسخے فروخت ہوئے۔ میں کچھ اور بھی کورسز تیار کرنا چاہتا تھا لیکن وقت کی کمی کے باعث ایسا نہیں ہو سکا اس لیے مجھے وقت سے پہلے ریٹائرمنٹ لینا پڑی میں ترجمے کے کام کو بھی آگے بڑھانا چاہتا تھا اس کے علاوہ ایسا مواد تیار کرنا چاہتا تھا جو انگریز بالغوں کو اردو سکھا دے اور اسکولوں میں ہندوستانی یا پاکستانی بچوں کے لیے اردو سیکھنا آسان ہو جائے تو اس میدان میں مجھے کامیابی بھی ہوئی میں اصل میں کالجوں میں یہ مواقع حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن یہ کافی دیر بعد قابل عمل ہو سکا۔ اسکول ٹیچر عموماً نکمے نکلتے ہیں جن کو صرف اپنی تنخواہ سے کام ہوتا تھا لیکن ہم لوگ اپنے مشن سے واقف تھے اور اسی پر پوری لگن کے ساتھ کام کرتے رہے جس میں کامیابی

قومی زبان (۱۷) مئی ۱۹۹۴ء

حاصل ہوئی۔"

س:۔ مختلف کاؤنٹیز میں آپ کی کوشوں کے نتائج کیا نکلے؟

ج:۔ ہماری یہ تحریک مختلف حوالوں سے آگے بڑھی یعنی گجراتی، بنگالی، سرائیکی، پنجابی اور دوسری زبانوں والے بھی یہ چاہتے تھے کہ ہماری زبانوں کے لیے کام کیا جائے لیکن میں تو صرف اردو سے دلچسپی رکھتا تھا اور رکھتا ہوں۔ بریڈفورڈ مانچسٹر، برمنگھم وغیرہ کے پچاس، ساٹھ اسکولوں میں اردو پڑھانے کا انتظام تھا بڑے شہروں کی تعداد تیس چالیس ہے جن میں اردو سکھانے کا بہترین انتظام موجود ہے۔"

س:۔ کیا اردو کی تدریس کے لیے وہاں کچھ شرائط بھی ہیں۔ حکومت کی جانب سے؟

ج:۔ باقاعدہ کوئی ایسی شرائط تو نہیں ہے لیکن ٹیچرز کو البتہ کچھ مشکلات پیش آتی ہیں کچھ متعصب لوگ بھی سامنے آئے لیکن میں تو ہمیشہ اردو کی حمایت میں بولا ہوں اور بولتا رہوں گا اردو کے لیے جو کام کر سکتا تھا کرتا رہا۔ اردو کی اہمیت منوانا چاہتا تھا اور منوایا۔"

س:۔ برطانیہ مں اردو زبان سکھانے میں کیا دشواری پیش آتی ہے؟

ج:۔ کوئی نہیں اردو سب سے آسان زبان ہے اس کی بہ نسبت فرانسیسی سیکھنا زیادہ مشکل ہے اردو لکھنا اور پڑھنا دونوں آسان ہے رسم الخط سکھانے کا میرا اپنا ایک طریقہ ہے میں بولنے پر زیادہ زور دیتا تھا اور ساتھ میں اشارے سے بھی اس لفظ کا مفہوم بتانے کی کوشش کرتا تھا۔ جملوں کو بار بار دہراتا اس سے طلبہ آسانی سے اردو پڑھنا سیکھ جاتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جملے بول کر پھر لکھنے کی مشق کرانے سے بھی اچھا نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ میرے خیال میں تو اردو سیکھنا اور اردو سکھانا دونوں ہی آسان ہیں۔"

س:۔ اپنی خود نوشت لکھنے کے بارے میں آپ کا کیا ارادہ ہے؟

ج:۔ اگلے سال سے لکھنے کا ارادہ ہے اس کا موضوع ہوگا "میں اور اردو" یعنی اردو سے میری محبت۔ اس سلسلے میں میری کاوشیں اور میری خدمات وغیرہ۔ بس اسی حوالے سے ایک کتاب پوری سچائی اور دیانتداری سے لکھنے کی کوشش کروں گا۔ یہ کتاب اس لیے اردو میں ہوگی کہ اس سے دلچسپی صرف اردو والوں کو ہی ہو سکتی ہے۔ آئندہ سال سے یہ سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

س:۔ ہندوستان اور پاکستان میں اردو زبان و ادب کے حوالے سے آپ کو کوئی فرق محسوس ہوتا ہے یا نہیں؟

ج:۔ بہت بڑا فرق ہے۔ پاکستان میں اردو عام ہے۔ عام آدمی میں اردو کا بہت شوق ہے بہتر اردو بولنے کا بہتر اردو لکھنے کا شوق یہاں پایا جاتا ہے۔ عام بول چال کے دوران کم پڑھے لکھے لوگ بھی زبان کا خاص خیال رکھتے ہیں جبکہ ہندوستان میں اردو کے ٹھیکدار بہت نکلے ہیں۔ یوپی اور بہار میں اردو کو ختم کرنے کی باقاعدہ کوششیں کی گئیں اور اس میں انھیں کافی کامیابی بھی حاصل ہوئی وہاں بچے اردو صرف بول سکتے ہیں لکھ پڑھ نہیں سکتے عصمت چغتائی کی بیٹی ہندی پڑھتی لکھتی تھی اردو نہیں لکھ پڑھ سکتی تھی۔ جبکہ جواہر لال نہرو میں اردو کے خلاف تعصب نہیں پایا جاتا تھا اور وہ ہندی کے بجائے اردو میں لکھتے پڑھتے تھے۔ پاکستان میں اردو والوں نے بہت کام کیے ہیں غالب کی صد سالہ برسی پر حکومت کی طرف سے کوئی امداد نہ ملنے کے باوجود بہت سے کام رضاکارانہ طور پر کیے گئے جبکہ بھارت میں حکومت نے اس موقع پر بڑی رقم ادا کی لیکن کوئی کام نہیں ہوا۔ لیکن ایک پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا وہ یہ کہ ہندوستان میں بڑے شہروں میں کچھ مخصوص طبقے ایسے بھی ہیں۔ جو واقعی اردو کے لیے کام کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے سنجیدہ ہیں۔"

س:۔ ایسٹ اور ویسٹ کی فکر میں فرق ہے اور کلچر میں بھی فرق ہے اس پس منظر میں آپ اردو شاعری کے انگریزی ترجمے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟

ج:۔ اس کے لیے کچھ باتوں کا خیال رکھنا بے حد ضروری ہے یعنی آپ ترجمے کے لیے ایسے اشعار منتخب کریں جو آپ کو بہت ہوں اور شاعر کی نمائندگی بھی کرتے ہوں دوسرے یہ کہ ان کا ترجمہ ممکن ہو۔ ترجمے میں کئی مسائل درپیش ہوتے ہیں بڑا مسئلہ الفاظ تلاش کرنے کا ہے کہ جو مکمل شعریت کے حامل ہوں۔ بعض اشعار ایسے ہوتے ہیں جنھیں مکمل الفاظ مل جاتے ہیں لیکن زبان کے الفاظ کا مکمل تاثر تلاش کرنا کافی مشکل کام ہے اور شاعری کا حسن برقرار رکھنا بھی اہم بات ہے اگر ان سب باتوں کو مد رکھ کر آپ ترجمہ کر سکتے ہیں تو ضرور کریں ورنہ عمدہ شاعری کا ناقص ترجمہ زیادتی ہے میر کے مقامی اشعار کا خوبصورت ترجمہ ہوا لیکن جو اور بجنل ہوتا ہے وہ سب کا سب ترجمہ نہیں ہو پاتا کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ کمزوری ضرور رہ جاتی ہے۔"

س:۔ آپ نے اپنے باذوق انگریز دوستوں کو جب اپنا ترجمہ سنایا تو کیا وہ اُسے سمجھ سکے یعنی اردو شاعری اور اس کے مزاج کو؟

ج:۔ اس کا اندازہ آپ اس بات سے لگالیں کہ جن کو اردو سے کوئی واسطہ نہیں تھا ادب سے یا کلچر سے کوئی واسطہ نہیں تھا ا نے تھری مغل پوئٹس کو پسند کیا اور اس کو پوری طرح سمجھا اور نہ صرف انگریزوں نے بلکہ وہاں دوسری قوموں کے لوگوں نے اسے پسند کیا۔ جبھی تو اس کا دوسرا ایڈیشن بھی چھاپنا پڑا۔"

س:۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کی خدمات کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج:۔ اس سلسلے میں کوئی بات اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ "قومی زبان" مجھے نہیں ملتا البتہ فہرست کتب دیکھنے سے اندازہ ہوتا بڑا کام ہوا ہے اور اگر فنڈ وغیرہ اور فراہم ہو سکے تو کام کی مقدار اور معیار مزید بہتر ہو سکتا ہے۔"

س:۔ ادب کے علاوہ دیگر فنون لطیفہ میں آپ کس حد تک دلچسپی رکھتے ہیں؟

ج:۔ موسیقی...... ہر قسم کی موسیقی پسند کرتا ہوں بہت شوق سے سُنتا ہوں۔ فوک اینڈ لائٹ میوزک۔ غزل وغیرہ یعنی مہ حسن۔ محمد رفیع وغیرہ کو بہت شوق سے سُنتا ہوں اور کیسٹ خرید تا رہتا ہوں فلمی گانے بھی مجھے بہت پسند ہیں۔ یورپین میوز بھی پسند کرتا ہوں۔ یعنی یہ سمجھ لیجیے کہ ادب کے علاوہ صرف موسیقی سے دلچسپی ہے۔

قومی زبان (۱۹) مئی ۱۹۹۴ء

ڈاکٹر سلیم الزماں۔ ایک ہمہ جہت شخصیت

عزیز اللہ شریف

۱۴ اپریل ۹۴ء کو ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی انتقال کر گئے۔ اُن کے انتقال سے پاکستان، سائنس اور سائنسی تحقیق کے ںان کے ایک روشن ستارے، ایک نامور مصوّر، ایک اہم ادبی شخصیت اور موسیقی کا پرکھ رکھنے والے اہم فرد سے محروم ہوگیا ہے۔

ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کو اُن کی سائنسی خدمات کے اعتراف میں بہت سے قومی اور بین الاقوامی انعامات سے نوازا گیا۔ ی اکادمی کی جانب سے طلائی تمغہ اور ۱۹۵۸ء میں MEDICAL HONORIS CAUSA - D کا اعزاز جرمنی کی فرینکفرٹ نیورسٹی سے حاصل ہوا۔ ۱۹۶۱ء میں رائل سوسائٹی نے فیلو منتخب کیا۔ ۱۹۶۴ء میں ڈاکٹر صدیقی کا پہلے ویٹکن اکادمی آف ئنس کے ممبر کی حیثیت سے انتخاب ہوا بعد ازاں اُن کی تقرری پاپائی مجلس فنون کے رُکن کے طور پر ہوئی۔ ۱۹۶۷ء میں کراچی لیڈز کی یونیورسٹیوں سے انھیں ڈاکٹر آف سائنس کی ڈگری تفویض کی گئی۔

ڈاکٹر صدیقی کا شمار ہندوستان اور پاکستان کی سائنسی اکادمیوں کے بانی ممبروں میں ہوتا ہے اور ۱۹۶۷ء میں دو برس کے یے آخر الذکر سائنس اکادمی (پاکستان) کے صدر بھی منتخب ہوئے۔ وہ سعودی عرب کی سائنسی اکادمی کے رفیق کار تو تھے ہی لیکن ۱۹۸۰ء میں پاکستان ایسوسی ایشن آف میڈیکل سائنس کے رفیق کار بھی مقرر ہوئے۔

ڈاکٹر صدیقی نے بہت سے قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی علاوہ ازیں ان کانفرنسوں میں شرکت کرنے لے اکثر پاکستانی وفود کی سربراہی کی۔

زازات و انعامات:

بر آف دی آرڈر آف برٹش امپائر (ایم۔ بی۔ ای) ۱۹۴۶ء میں

مغۂ پاکستان ۱۹۵۸ء

تارہ پاکستان ۱۹۶۲ء

سن کارکردگی کا صدارتی تمغہ ۱۹۶۶ء

ہلِ امتیاز پاکستان ۱۹۸۰ء

زت سائنسی فروغ فاؤنڈیشن کے اسلامی ادویاتی ادارے کا انعام ۱۹۸۱ء

کاؤنسل آف دی تھرڈ ورلڈ اکادمی آف سائنسز کی جانب سے RAUWOLFIA ALKALOIDS کے کیمیائی علم میں ن کی خدمات کے اعتراف کے طور پر ایک خصوصی انعام سے نوازا گیا ۱۹۸۷ء میں مدینۃ الحکمت۔ کراچی کے مختلف کاؤنسلوں اور میٹیوں کے ممبر منتخب کیے گئے۔

ڈاکٹر صدیقی کی خدمات، سائنس بالخصوص کیمسٹری کے میدان میں ان گنت اور بے حساب ہیں۔ وہ ساری عمر جڑی بوٹیوں کے تجربوں اور تحقیق میں مصروف رہے اُن کے تین سو سے زائد تحقیقی مقالے اور یادداشتیں محفوظ ہیں جو سب کے سب علمی خصوصی توجہ اور مطالعے کے متقاضی ہیں اور یہ کام ظاہر ہے کہ ماہر سائنس دانوں کے علاوہ کسی اور کے بس کا نہیں۔

ڈاکٹر صدیقی ۱۹ اکتوبر ۱۸۹۷ء میں پیدا ہوئے۔ اس لحاظ سے ان کا انتقال تین کم سو برس یعنی ۹۷ سال کی عمر میں ہوا۔ ۱۹۱۹ء میں ایم۔ اے۔ او۔ کالج علی گڑھ سے گریجویشن کرنے کے بعد ایک سال سے زیادہ لندن کے یونیورسٹی کالج میں تعلیم حاصل کی اور پھر جرمنی کی فرینکفرٹ یونیورسٹی میں ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۷ء تک تعلیمی سلسلہ جاری رکھا وہیں اُنھیں کیمسٹری میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی۔

جرمنی سے واپسی کے بعد ڈاکٹر صدیقی نے برصغیر کے معروف طبیب اور سیاست داں حکیم اجمل خاں کے ایماء پر ایک تحقیقی ادارہ دلی طبیہ کالج میں قائم کیا۔ ۱۹۴۰ء تک وہ اسی ادارے کے ڈائرکٹر رہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے چھڑ جانے کے بعد "انڈین کاؤنسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ" نے ان کی خدمات حاصل کرلیں۔

۱۹۴۷ء میں پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد حکومت پاکستان کی طرف سے ۱۹۵۱ء میں ڈاکٹر صدیقی کو سائنس اور صنعتی تحقیقاتی کونسل سے وابستہ کردیا گیا۔ اور وہ اس ادارے کے ڈائرکٹر اور چیرمین کے طور پر ۱۹۶۶ء تک اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ اور تب سے وہ ایچ۔ ای۔ جے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف کیمسٹری کراچی یونیورسٹی میں خدمات انجام دیتے تھے۔

تحقیقات میں قدرتی اشیاء کے کیمیائی عمل اور خاص طور پر امراضِ قلب کو سکون پہنچانے والی ادویات کی تحقیقات پر اُن کی خدمات کے اعتراف میں کئی یونیورسٹیوں نے اُنھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں اور طلائی تمغہ سے نوازا۔

مصوری کے مشاغل

ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی اپنے اسکول کے زمانے سے ہی ڈرائنگ، مصوری اور سنگ تراشی سے دلچسپی رکھتے تھے۔ آرٹ کی جانب اُن کے شغف کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ میٹریکولیشن کا امتحان پاس کرنے کے بعد انھوں نے آرٹ اسکول کلکتہ میں داخلہ لے لیا انھیں بنگلہ کے عظیم شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کے شاگرد ہونے کا شرف بھی حاصل رہا تھا جو مصوری کے بنگلہ اسکول کے بانی تھے۔

بہرحال مصوری میں اُن کی خاص دلچسپی ابتدائی مغل منی ایچر آرٹ سے تھی۔ بعد میں انھوں نے مصوری کو پیشہ کے طور پر اختیار کرلیا۔ یہی اُن کی پہچان بن گئی۔ وہ اس وقت کے مغل آرٹ اسکول کے نمائندہ تسلیم کیے جانے لگے جب ابھی مغل آرٹ خالص تھا۔

ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کے نانا فارسی ادب اور شاعری سے دلچسپی رکھنے کے علاوہ کیمیا سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ پھر دو تین پیڑھیوں سے اُن کے خاندان میں وکالت کا پیشہ چلا آرہا تھا۔ ڈاکٹر صدیقی خاندان میں پہلے شخص تھے جنھوں نے سائنس کا انتخاب کیا۔ بی اے تو اُنھوں نے بزرگوں کی خوشنودی کے لیے فلسفہ اور فارسی ادب میں کیا لیکن بالآخر کیمسٹری ہی اُن کا پسندیدہ موضوع ٹھہرا۔

اس پس منظر کے ساتھ وہ یورپ میں فنِ مصوّری میں ہونے والے نئے نئے تجربات اور نئے نئے رجحانات کی طرف راغب ہوئے۔ اور اُنھیں وان گاف اور فرانز مارک اور پکاسو کی اولین دور کی مصوری نے متاثر کیا۔

ایک موقع پر جب ڈاکٹر صدیقی گزرے دنوں کی یاد تازہ کر رہے تھے تو بتایا کہ انھوں نے ۲۴ برس کی عمر یعنی ۱۹۲۲ء میں مصوری کا آغاز کیا تھا اور یہ سلسلہ تجربہ کے طور پر دس برس تک چلتا رہا۔ اس میں انھوں نے قلم، پنسل اور رنگوں کا تجربہ کیا۔ ۱۹۲۷ء میں جب فرینک فرٹ کی " آوزیلی گیلری "میں ان کے فن کی دوسری نمائش ہوئی تو انھیں ایک ہزار "گولڈ مارکس" ملے جو مصوری سے ان کی پہلی یافت تھی۔

۱۹۲۸ء میں جب گھر واپس ہوئے تو وہ ڈرائنگ اور مصوری سے منسلک، خاندان کے واحد فرد تھے۔ اُنھوں نے اپنے متعدد فن پارے بنگلور کی نمائش میں بھیجے۔ ان کی غیر روایتی مصورانہ پیشکش "نشستہ بدھ" کی مقبولیت نے تو "لاآینڈ آرڈر" کا مسئلہ پیدا کر دیا۔ اخبار ہندو دہلی کے آرٹ مبصر و نکٹا چالم نے ان کی تعریف و توصیف میں بھرپور تبصرہ کیا تھا۔

اُن کے فن پاروں کی نمائش گاہے گاہے دہلی میں بھی ہوتی رہی۔ اور ان تمام ترادوار میں ان کی ڈرائنگ کی نوک پلک درست رہی۔

۱۹۴۰ء میں کلکتہ میں جیمنی رائے کے فن پارے کی نمائش کے موقع پر وہاں کا دورہ کیا۔ یہ نمائش ان کے لیے ایک تحریک ثابت ہوئی ڈاکٹر صدیقی کا دور مصوری کے باب میں بہت زرخیز کہا جاتا ہے اس قسم کی تحریک انھیں دہلی میں "حسین نمائش" کی وجہ سے بھی ملی تھی۔

پاکستان میں زیادہ تر اُنھوں نے اپنے فن پاروں میں چارکول اور چینی روشنائی کا استعمال کیا اُنھوں نے ۷ اپریل ۱۹۸۳ء کو اپنی ڈرائنگ کے پندرہ "پورٹ فولیو" نمائش کے لیے پیش کیے جن میں ۱۹۲۰ء سے ۱۹۵۰ء تک کے منتخب فن پارے شامل تھے۔

ڈاکٹر محمود حسن کے انتقال کے بعد ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی نے دس ماہ تک به حیثیت چیرمین کراچی یونیورسٹی اپنی خدمات انجام دیں۔

۱۹۸۵ء میں گوئٹے انسٹی ٹیوٹ نے ڈاکٹر صدیقی کی بنائی ہوئی تصویر "امیر خسرو" کو GREETING CARD میں استعمال کر کے اُن کی مصورانہ صلاحیت کا اعتراف کیا۔

ڈاکٹر صدیقی کے عربی اور فارسی کے دیرینہ ذوق اور خاص طور پر غالب اور میرؔ کے لیے اُن کی پسندیدگی نے اُن سے میرؔ کے کلام کا ایک ذاتی انتخاب کروایا۔

(تلخیص و ترجمہ - ادارہ)

مضمون صاف، خوشخط اور کاغذ کے ایک طرف لکھیں

Adarts HPA 5/9

"صحیفۂ افلاک کے قاری"

ڈاکٹر سلیم اختر

"منکہ گلیلیو گیلی ولد آنجہانی ون شن زیو گلیلی سکنہ فلورنس عمر ستّر سال، جو ذاتی طور پر عدالت میں لایا گیا اور دو زانو ہو کر آفاقی عیسائی ریاست کے محافظ اور بدعتی گناہ کے مخالف عظمت مآب، عزت مآب اور قابل صد احترام، منصف تفتیش عمومی کے سامنے پیش ہوا۔ مقدس بائبل میری آنکھوں کے سامنے ہے اسے میں اپنے ہاتھوں سے چھوتا اور حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ میں نے خداوند کے فضل سے ہمیشہ اس پر ایمان رکھا ہے اور آئندہ بھی رکھوں گا کیتھولک عقیدہ کی تمام جزویات پر بھی اور روم کے حواری گرجے (APOSTOLIC CHURCH) کی تعلیمات اور احکامات پر بھی، کیونکہ اس مقدس ادارے نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اپنے جھوٹے خیالات کو ترک کر دوں جن کے تحت میرا خیال تھا کہ سورج کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور وہ حرکت نہیں کرتا اور مجھے منع کیا گیا ہے کہ نہ ہی میں اس غلط نظریہ میں یقین رکھوں، نہ اس کی مدافعت کروں نہ دوسروں کو اس کی تعلیم دوں اور اب مجھ پر یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ یہ نظریہ کتاب مقدس کی نظر میں ناپسندیدہ ہے۔ میں نے ایک کتاب لکھی اور شائع کی جس میں، میں نے اس مردود نظریے کا پرچار کیا اور اس کو ثابت کرنے کے لیے اپنی پوری قوت سے جواز اور استدلال تلاش کیے مگر میں کسی نتیجے تک نہ پہنچا۔ لہٰذا مجھے اذیت ناک کفر کا مرتکب قرار دیا گیا کیونکہ میں اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ سورج زمین کا مرکز ہے اور گردش نہیں کرتا اور یہ کہ زمین مرکز نہیں ہے اور گردش کرتی ہے میں آپ سب تقدس مآب حضرات اور تمام کیتھولک عیسائیوں کے ذہنوں سے یہ بات صاف کر دینا چاہتا ہوں جو بالکل بجا طور پر میرے سلسلے میں بعض شکوک رکھتے ہیں لہٰذا خلوص دل سے اور صمیم قلب سے میں توبہ کرتا ہوں اور اپنی غلطی اور کفر کا ازالہ چاہتا ہوں اور اسے نفرت کی نظر سے دیکھتا ہوں اور اگر اس بات میں کوئی اور بھی غلطی ہے یا کوئی ایسی بات ہے جو مقدس چرچ کی شریعت کے مطابق نہیں۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ میں کبھی کوئی ایسا کام نہیں کروں گا اور نہ ہی کوئی ایسی بات زبانی کہوں گا نہ لکھوں گا جس کے باعث میرے سلسلے میں اس قسم کے شبہات دوبارہ پیدا ہوں اگر مجھے کسی ملحد کا پتہ چلا یا کسی ایسے شخص کا جس پر الحاد کا شبہ ہو سکے تو میں اس پر لعنت بھیجوں گا اور اس مقدس ادارے کو مطلع کر دوں گا یا کسی دینی عدالت کے منصف یا اس علاقہ کے پادری کو اطلاع دوں گا جہاں میں اس وقت موجود ہوں گا۔ میں پھر حلفیہ بیان کرتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ یہ مقدس ادارہ مجھ پر جو بھی حکم عائد کرے گا میں اسے بجا لاؤں گا اور کفارہ پوری طرح ادا کروں گا اور آئندہ ایسا ہو کہ میں اپنے کیے وعدے، اٹھائے حلف اعتراف سے پھر جاؤں (جس سے خداوند مجھے بچائے) تو میں اپنے آپ کو سزاوار ٹھہراؤں گا ان تمام تکالیف اور سزاؤں کا جو مقدس شریعت نے جاری کی ہیں اور جن کی اشاعت کی جا چکی ہے۔ میں سزاوار ہوں گا عمومی یا مخصوص غفلت شعاری کا جو دستوری توجیہ میں آتی ہے میری دعا ہے کہ خداوند میری مدد کرے اور اس کی

مقدس کتاب جسے میں اپنے ہاتھوں سے چھو رہا ہوں میری رہنمائی کرے اور مجھے مذکورہ بالا کا پابند رہنے کی توفیق دے اور تمام موجود شہادتوں کے سامنے جن کا میں نے اقرار کیا ہے اور جن سے میں نے طلفی انکار کیا ہے اور جو کچھ میں نے حرف بحرف پڑھا ہے۔ روم کے مقام پر کونونٹ منروا میں ۲۲/جون ۱۶۳۳ء میں گلیلیو(۱) گلیلی توبہ کرتا ہوں اور اسے ہاتھ سے یہ تحریر لکھ کر دیتا ہوں۔

"تاریک دن"

۲۲۔ جون ۱۶۳۳ء

پوپ اربن ہشتم (اصل نام: مافیو بربرنی URBAN VIII MAFFEO BARBRINI

خوش ہوگا کہ آج اس نے بوڑھے گلیلیو گلیلی سے اعتراف گناہ اور توبہ نامہ حاصل کر لینے کے بعد بائبل کی حرمت محفوظ کر کے گویا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہ طے کر دیا کہ یہ غیر متحرک کرۂ ارض مرکز کائنات ہے اور چاند سورج خدام ادب کی مانند اس کے گرد طواف کرتے ہیں۔ گلیلیو پوپ کا ذاتی دوست تھا اور وہ اس کی صلاحیتوں کا معترف بھی تھا مگر اس ناہنجار کی زبان بندی اس لیے ضروری تھی کہ اگر لادین عناصر کو دوربین جیسے کھلونوں کی مدد سے آنکھوں پر جادو کی پٹی باندھ کر ناقابل دید چیزیں دکھا کر کھلے عام بائبل کی تعلیمات کے برعکس اور تخلیق کائنات کے ربانی ارشاد کے منافی کافرانہ اور ملحدانہ نظریات پیش کرنے کی اجازت دے دی گئی تو ایک دن ایسا بھی آسکتا ہے جب نہ مسیحیت رہے گی، نہ پوپ نہ چرچ نہ پادری! یہ محض چاند سورج کی بات نہ تھی بلکہ عیسائیت سے وابستہ بنیادی عقاید کا معاملہ تھا۔

یوں دیکھیں تو ۲۲۔ جون ۱۶۳۳ کے دن سے فنڈامینٹل ازم کی باقاعدہ تاریخ کا آغاز کیا جاسکتا ہے کم از کم یورپ کی حد تک!

"گائے کے سینگ اور کچھوے کی پیٹھ"

گلیلیو کا توبہ نامہ محض انفرادی واقعہ نہیں بلکہ اس کے پس منظر میں کوئی دو ہزار برس کی علمی تاریخ کے مختلف ادوار شامل ہیں۔ عہد عتیق کے انسان کو اگر زمین ساکن اور چپٹی نظر آتی تھی، چاند سورج اس کے تابع فرمان اور زمین کے ناطہ سے وہ خود کو مرکز کائنات گردانتا تھا تو وجہ سمجھنی دشوار نہیں کہ برعکس کے لیے شواہد موجود نہ تھے۔

ناکافی علم اور ناقص معلومات پر مستزاد تھی اساطیر جس کے بموجب سورج چاند (اور بعض) ستارے دیوی دیوتا تھے، سیارے ان کا مسکن تو مظہر فطرت ان کے چمتکار! اسی لیے عام اور ناخواندہ افراد کا اس سے اطمینان ہو جاتا تھا کہ دھرتی گائے کے سینگ پر ٹکی ہے، کچھوے کی پیٹھ پر قائم ہے یا اسے اٹلس نے اٹھا رکھا ہے۔ تعلیم کی اس خُو کی دو بنیادی وجوہ تھیں ایک ناکافی اور ناقابل اعتبار علم اور دوسرے مذہب کی اجارہ‌داری پہلے اساطیر پھر مذہبی کتب، بزرگوں کے اقوال، مذہبی قصص اور مذہبی شخصیات کے خارق عادت کارناموں کی صورت میں۔

چلیں ماضی سے تو کوئی توقع نہ تھی لیکن لطیفہ یہ ہے کہ مسلمانان ہند میں سائنسی شعور پیدا کرنے کے داعی۔ مذہب میں عقلی معیارات کے ترویج کے حامی، مذہبی متکلم اور سائنس کی عمومی مقبولیت کے لیے سائنٹیفک سوسائٹی (غازی پور: ۱۸۶۳ء) قائم کرنے والے سر سید احمد خاں کا یہ عالم تھا کہ وہ خود ۱۸۴۸ء تک زمین کے ساکن ہونے کے قائل تھے بلکہ اس ضمن میں اتنے جذباتی تھے کہ ایک مقالہ بعنوان "قولِ متین در ابطالِ حرکتِ زمین" قلم کرتے ہوئے یہ طرز استدلال اپنایا:

"یونانی حکیم زمین کی گردش کے قائل نہیں ہوئے الّا ماشاءاللہ اور جو لوگ کہ گردشِ زمین کے قائل ہیں ان کے کان تک وہی اعتراض پہنچے ہیں جن کو خود یونانی حکیموں یا ان کے متبعوں نے رد کر دیا ہے۔"(۲)

حالانکہ سر سید سے آٹھ سو برس قبل البیرونی (۱۰۴۸ء-۹۷۳ء) ساکت زمین کے تصور پر تنقید کر چکا تھا (ویسے البیرونی کو علما نے مرتد قرار دیا تھا۔)

دراصل یہ کائنات کا بطلیموسی (POTLEMAIC) تصور تھا جو سترھویں صدی تک یورپ اور اس کے کئی صدیوں بعد تک مسلم ممالک میں رائج رہا خود اس تصور کی اساس بھی ایک یونانی ہئیت دان ہپارقوس (HIPPARCHUS) کے اقوال پر استوار تھی جن کی رو سے زمین مرکز کائنات تھی۔

"قدیم یونان میں علمی تصوّرات"

یونان میں سائنس اور فلسفہ کے مطالعہ کا اگرچہ اس مقالہ سے براہ راست تعلق نہیں لیکن یونانی مفکرین نے مشرق و مغرب کی سوچ پر صدیوں تک گہرے اثرات ڈالے ہیں اس لیے تناظر کی درستی کی خاطر مختصر ترین الفاظ میں چند اہم فلاسفروں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

قدیم یونان کے ایک جزیرہ ملوط کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ سب سے پہلے تین فلاسفروں کا تعلق اسی سے تھا۔ یونان کا پہلا اور باضابطہ فلسفی اسائنس دان طالیس ملوطی (۶۴۳ ق م-۵۴۷ ق م) کو سمجھا جاتا ہے اس کے خیال میں زمین پانی پر تیرتی ہے اور آب علت حیات ہے۔ فلکیات میں اس کی مہارت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۵۸۵ ق م میں اس نے سورج گرہن کی درست پیش گوئی سے تمام یونان کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ اس کے ہم وطن اور معاصر آنکسی مانڈر (۶۱۱ ق م-۵۴۷ ق م) سے دنیا کے پہلے نقشہ کی تیاری منسوب کی جاتی ہے اس نے مظاہرِ فطرت اور اجرام فلکی کی بارے میں بھی تحقیقات کیں لیکن اب اس کی شہرت اس بنا پر ہے کہ حیوانات کی زندگی کے مطالعے کے ضمن میں بعض امور کی حد تک تو یہ ڈارون کا پیش رو معلوم ہوتا ہے ہیرا قلیطس (۵۳۵ ق م-۴۷۰ ق م) تخلیقِ کائنات میں دیوتاؤں کے کردار کا قائل نہ تھا نہ وہ انسان پر دیوتاؤں کی برتری تسلیم کرتا تھا کہ وہ تقدیر کے خالق نہ تھے۔ اس کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ تم ایک دریا میں دو مرتبہ نہیں نہا سکتے کہ ہر لمحہ دریا تبدیل ہوتا رہتا ہے علامہ اقبال نے اسی کے ایک اور قول کو نظم کیا ہے:

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانہ میں

دیمو کرائطس (۴۶۰ ق م-۳۷۰ ق م) نے سب سے پہلے ایٹم کا تصور پیش کرتے ہوئے انھیں کرۂ ارض کی تشکیل کا باعث ٹھہرایا۔ ایٹم یونانی زبان کا لفظ ہے اور لغوی معنی ناقابلِ تقسیم ہیں۔ وہ مروج مفہوم میں روح، وجود اور عدم کا قائل نہ تھا اور سب مظاہرِ فطرت کو ایٹم کی متغیر صورتیں قرار دیتا تھا۔ اور پھر ان کے بعد فلسفہ کا وہ زریں دور آتا ہے جو عبارت ہے سقراط، افلاطون اور ارسطو!

کسی مفکر کا قول بہت مشہور ہے کہ خدا اتنا نادان بھی نہ تھا کہ کائنات تخلیق کرتا اور پھر اسے سمجھنے کے لیے یونانیوں کے آگے رکھ دیتا مگر عملاً یہی محسوس ہوتا ہے اگرچہ یونانیوں سے پہلے بابل، نینوا، مصر اور ہند کے مندروں کے پجاری، پروہت اور فلاسفر فلکیات کے ضمن میں بہت کچھ کر چکے تھے لیکن زبان کی اجنبیت کی وجہ سے ان کے نظریات معروف نہ ہوسکے جبکہ یورپ

کی علمی روایات کا آغاز یونان سے ہوتا ہے اس لیے اب ہر بات ان سے شروع کی جاتی ہے ورنہ فیثا غورث (۵۰۰ ق م۔ ۴۴۰) اور ارسطرکس (۲۲۰ ق م۔ ۱۴۳ ق م) کہیں پہلے زمین کی حرکت چاند سورج کے گرہن اور مدوجزر کی حقیقت سے آگاہ ہو چکے تھے۔

"جمال پرست یونانیوں کی سائنس"

یونانی سائنس، فلکیات یا طبیعیات وغیرہ کے تذکرے کے ضمن میں یہ واضح رہے کہ اس عہد میں ہر نوع کے مطالعات کا مشترک نام فلسفہ (لغوی مطلب: علم سے محبت، حصولِ دانش تھا) اسی لیے تو اس عہد کے فلسفی مابعد الطبیعیات، طبیعیات، طب، فلکیات، اخلاقیات، شاعری، ڈرامہ، خطابت، کیمیا الغرض ہر مسئلہ پر اظہارِ خیال کرتے تھے۔ بلکہ ارسطو سے تو پامسٹری کا ایک رسالہ بھی منسوب ہے۔

آج کی سائنس کے برعکس یونانی سائنس عملی اور تجربی نہ تھی بلکہ نظری اور فکری تھی جس کی بنیادی وجہ جمال پرست یونانیوں کا ہاتھ سے کام کی ناپسندیدگی تھی۔ اکثر قدیم تمدنوں کی مانند یونان میں بھی محنت مشقت اور گھریلو کام کاج کے لیے غلام تھے اور حکمران، اشرافیہ، آزاد شہری اور فوجی بھی ہاتھ سے کام کرنا باعثِ ہتک جانتے تھے۔ غلاموں کی کثرت کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تیسری صدی قبل مسیح کے ایتھنز کی تقریباً سوا تین لاکھ کی آبادی میں سوا لاکھ غلام تھے یعنی تین اور ایک کی نسبت ـــــ چنانچہ تمام کام غلام کرتے تھے، کھیلوں کے مقابلہ میں حصّہ لیتے، ڈراموں میں حصّہ لیتے اور فنونِ لطیفہ کی سرپرستی کرتے۔

ہاتھ سے کام کرنے کے بارے میں اجتماعی روّیہ کو زنیفون (۴۳۰ ق م۔ ۳۵۵ ق م) کی اس رائے کی روشنی میں با آسانی سمجھا جاسکتا ہے۔

"مہذب قومیں میکانکی ہنروں کو جائز طور پر حقیر سمجھتی ہیں کیونکہ اس سے جسم خراب ہوجاتا ہے مزدوروں کا بھی اور ان کی نگرانی کرنے والوں کا بھی۔ ان کو لامحالہ زمین پر بیٹھ کر کام کرنا پڑتا ہے یا سارا سارا دن بھٹی کے سامنے جھکا رہنا پڑتا ہے جسمانی انحطاط کے ساتھ ان کی روح بھی کمزور ہوجاتی ہے پھر یہ ذلیل پیشے اتنا وقت چاہتے ہیں کہ انسان کو اپنے دوستوں یا ریاست کے کاموں کی طرف توجہ دینے کی مہلت نہیں ملتی۔" (۳)

دیکھا جائے تو ہمارے شاہوں، حاکموں اور ان کے زیرِ اثر پرورش پانے والے اشرافیہ اور جاگیرداروں کا "کمی کمین" کی صورت میں اب بھی یہی روّیہ ہے کہ وہ ہاتھ سے کام کو گھٹیا، خلافِ شان اور امارت کے منافی جانتے ہیں انگریز حکام میں بھی یہی روّیہ ملتا تھا اور اب کالے حاکم بھی یہی شان رکھتے ہیں۔ اعلیٰ افسر فون خود نہ کرے گا، اٹھ کر خود پانی نہ پیئے گا، بریف کیس خود نہ اٹھائے گا اور کار کا دروازہ خود نہ کھولے گا خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔ کہنے کا مطلب ہے کہ ہاتھ سے کام نہ کرنے کی وجہ سے ان کے تمام سائنسی تصورات کی اساس تجربہ کی بجائے ظن و تخمین پر استوار رہی اب یہ ان کا رعب تھا کہ صدیوں تک ان کے قیاسات ہی نظریات بنے رہے یوں کہ ارسطو کے حوالہ سے صدیوں تک یہی سمجھا جاتا رہا کہ گھوڑی اور عورت کے دانتوں کی تعداد میں فرق ہوتا ہے اس پر کسی ستم ظریف نے فقرہ چست کیا کہ وہ بیوی کا منہ کھول کر اس کے دانت تو گن سکتا تھا۔ میرے خیال میں ارسطو نہیں بلکہ اس کا غلام یہ گھٹیا کام کرسکتا تھا اسی لیے جب ارسطو کا "طلسم ٹوٹا تو بری طرح سے، مشرق میں بھی اور مغرب میں بھی، اور بقول البیرونی:

> "بہت سے لوگوں کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ وہ ارسطو کی آراء کے سلسلے میں اسراف سے کام لیتے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کے نظریات میں غلطی کا امکان ہی نہیں ہے اگرچہ ان

کو یہ معلوم ہے کہ وہ اپنی بہترین قابلیت کی وجہ سے صرف نظریات تشکیل دیتا تھا" (۴)

"صحیفۂ افلاک کا مطالعہ"

بہرحال یونانیوں کو اس بات کا کریڈٹ یقیناً دیا جاسکتا ہے کہ عملی اور تجربی نہ ہونے کے باوجود بھی وہ کئی امور میں حقائق کے درست مطالعہ اور درست نتائج تک پہنچے تھے مثلاً ارسطو (۳۸۴-۳۲۲ ق م) نے بھی فلکیات پر اپنے رسالہ میں چاند گرہن کی وجہ سے زمین کا گول ہونا تسلیم کیا تھا اس ضمن میں اس کی دوسری دلیل وہی تھی جو میں نے چوتھی جماعت کے جغرافیہ کی کتاب میں پڑھی تھی یعنی دور سے آنے والا بحری جہاز ساحل پر سے یک وقت مکمل طور پر دکھائی دینے کے بجائے بتدریج نگاہوں کے سامنے آتا ہے لیکن ارسطو بھی کرۂ ارض کے غیر متحرک اور مرکزِ کائنات ہونے کا قائل تھا۔ تاہم برعکس سوچ رکھنے والے بھی ہوتے تھے۔ برٹرینڈ رسل "گلیلیو" پر اپنے مقالہ میں رقم طراز ہے:

> "خیر جو کچھ بھی ہو یونانیوں نے علم فلکیات میں جو کچھ دریافت کیا تھا یقینی طور پر قابل داد ہے انھوں نے بہت جلد یہ اندازہ کر لیا تھا کہ زمین گول ہے اور کچھ تو کوپرنیکس کے نقطۂ نظر تک پہنچ گئے تھے اور سمجھتے تھے کہ زمین گھومتی ہے آسمان نہیں گھومتا اور اسی وجہ سے روز مرہ سورج اور ستارے حرکت کرتے نظر آتے ہیں ارشمیدس گیلون کے بادشاہ سیر اکیوس کے نام ایک تحریر میں کہتا ہے:
>
> "ساموس کے ارسٹارکس نے چند مفروضوں کی بنیاد پر ایک کتاب لکھی ہے جس کے بنیادی قضیہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ کائنات جیسی کہ نظر آتی ہے اس سے کئی گنا زیادہ بڑی ہے اس کا مفروضہ یہ ہے کہ بڑے ہوئے ستارے اور سورج حرکت نہیں کرتے۔ زمین سورج کے گرد دائرے کی صورت میں مدار پر گھومتی ہے اور سورج مدار کے مرکز میں پڑا رہتا ہے۔"

چنانچہ یونانیوں نے نہ صرف زمین کی یومیہ گردش کا پتہ چلا لیا تھا بلکہ وہ اس کی سورج کے گرد سالانہ گردش کو بھی مان گئے تھے۔ یہ ایک یونانی ہی کے خیالات اور دریافت تھی جس نے کوپرنیکس کو یہ حوصلہ دیا کہ وہ اس کا احیاء کرے۔ (۵) اس ضمن میں یہ بھی واضح رہے کہ ارسطوفس سیموسی نے دن رات اور موسموں کی تبدیلی کے بارے میں بھی درست قیاس کیا تھا۔

(زیرِ نظر یہ کتاب "بنیاد پرستی" کا ایک باب)

حواشی

(۱) "گلیلیو" از برٹرینڈ رسل۔ مشمولہ: "تخلیقی رویے" مترجم شہزاد احمد ص: ۴۸، ۴۶

(۲) "مقالات سر سید" مرتبہ: مولانا محمد اسماعیل پانی پتی۔ جلد شانزدہم میں یہ مقالہ شامل ہے ص: ۵۰۰-۴۸۷

(۳) بحوالہ: "موسیٰ سے مارکس تک" از سبط حسن، ص: ۶۰

(۴) بحوالہ: "ارمان اور حقیقت" از ڈاکٹر عبد السلام مترجم شہزاد احمد ص: ۸۶

(۵) بحوالہ: "تحقیقی رویے" ص: ۳۹

ساون رین کا سپنا

سید امتیاز علی تاج کے ایک ڈرامے کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر محمد سلیم ملک

سید امتیاز علی تاج نے شیکسپیئر کے ایک ڈرامے "اے مڈسمر نائٹس ڈریم" کا اُردو میں ترجمہ کیا تھا اس زمانے میں حکیم احمد ع نے ایک پندرہ روزہ ادبی رسالہ "ہزار داستان" کے نام سے جاری کیا۔ اس طرح اس ڈرامے کی پہلی چار قسطیں۔ "ہزار داستان ے پہلے چار شماروں میں شائع ہوئیں جو جولائی ۱۹۲۲ء کے دو شماروں (۱) اور (۲) اگست ۱۹۲۲ء کے دو شماروں (۳) میں (۴) طبع ئیں۔ اس ڈرامے کی پانچویں قسط، اس رسالے کے پانچویں شمارے میں شائع نہ ہو سکی۔ اس لیے حکیم احمد شجاع نے اپنے ،یے میں لکھا کہ امتیاز علی تاج "اس مرتبہ، ساون رین کا سپنا" عنایت فرمانے سے معذور ہیں" (۵) بعد ازاں اس ڈرامے کی اور ی قسطیں اس رسالے میں شائع ہوئیں۔ اس بارے میں عابد علی عابد کا خیال ہے کہ تاج نے اس ڈرامے کا ترجمہ مکمل نہیں کیا ۔ (۶) لیکن عابد علی عابد کا یہ خیال دُرست نہیں بلکہ اس کا ترجمہ جب مجلّہ "ہزار داستان" میں مکمل طور پر شائع ہو گیا تو تاج نے س کو کتابی شکل میں شائع کرنے کا ارادہ کیا۔ اس بارے میں سراج نظامی نے لکھا ہے:

> "ایک دن میں دارالاشاعت پنجاب میں غلام عباس صاحب سے ملنے گیا تو انھوں نے کہا امتیاز صاحب "ساون رین کا سپنا" اور لیلیٰ یا محاصرہ غرناطہ، کتابی صورت میں شائع کرنا چاہتے ہیں مگر افسوس اُن کے پاس "ہزار داستان" کے وہ پرچے موجود نہیں جن میں یہ شائع ہوئے تھے میں نے اُن سے کہا کہ سراج نظامی کے پاس "ہزار داستان" کی مکمل جلد موجود ہے تو وہ کہنے لگے کہ وہ جلد مجھے مستعار دے دی جائے تو نوازش ہوگی۔ میں نے دوسرے دن، "ہزار داستان" کی خوبصورت جلد امتیاز صاحب کے حوالے کر دی۔ ناول، محاصرۂ غرناطہ، شائع ہو گیا" (۷)

تاج کا ناول "لیلیٰ یا محاصرۂ غرناطہ" ۱۹۲۴ء میں پہلی بار کتابی شکل میں شائع ہوا تھا۔ (۸) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ "ساون رین ک
سپنا" بھی ۱۹۲۴ء تک "ہزار داستان" میں مکمل طور پر شائع ہو چکا تھا۔ مگر یہ ڈرامہ کتابی صورت میں سامنے نہ آسکا۔ راقم السطور کو اس
ڈرامے کا ایک ایسا مسوّدہ دستیاب ہوا ہے جو تاج کے قلم سے نکلا ہے اور اس پر جون ۱۹۲۳ء کی تاریخ ثبت ہے۔ اس کے آغا
میں یہ عبارت درج ہے:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواب و خیال

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

تین باب میں ایک کھیل

ماخوذ از مڈسمر نائٹس ڈریم مصنفہ ولیم شکسپیئر

مؤلفہ

سیّد امتیاز علی تاج" (۹)

اس سرورق سے ظاہر ہوتا ہے کہ تاج صاحب نے اسے کتابی شکل میں شائع کرنے کے لیے مرتب کیا تو اس کا عنوان بدل ک
"خواب و خیال" رکھا اور اس کا ذیلی عنوان ایک مصرع "خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا" تجویز کیا۔ "تین باب میں ایک
کھیل" کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ تاج نے اس ڈرامے کے ڈھانچے میں تبدیلی کی اور اس پنج بابی ڈرامے کو سہ بابی بنا دیا۔ جب
"ماخوذ" کے لفظ سے قیاس ہوتا ہے کہ اس کھیل کو لفظ بہ لفظ اور سطر در سطر اُردو میں منتقل کرنے کے بجائے اس میں بڑ
آزادی سے تصرف اور ترمیم کی گئی۔ یہ مسوّدہ ناقص الطرفین حالت میں دستیاب ہوا ہے جو تیسرے باب کے دو منظروں اور چوتھ
باب کے پہلے منظر پر مشتمل ہے اور اپنی ضخامت کے اعتبار سے کاپی کے اٹھارہ صفحات پر محیط ہے۔

"ساون رین کا سپنا" کا ایک اور مسوّدہ بھی راقم السطور کو دستیاب ہوا ہے یہ بھی تاج کے قلم سے نکلا ہے۔ اس کے سرورق
یہ الفاظ درج ہیں:۔

"جملہ حقوق محفوظ

ساون رین کا سپنا

از

ولیم شکسپیئر

مترجمہ

سیّد امتیاز علی تاج

دارالاشاعت پنجاب لاہور

بار اوّل" (۱۰)

اس سرورق سے ظاہر ہوتا ہے کہ تاج نے اس ڈرامے کو جون ۱۹۲۳ء میں کتابی شکل میں شائع کرنے کی پہلی کوشش کے کوئی د
برس بعد ۱۹۳۳ء میں شائع کرنے کا دوسری بار ڈول ڈالا اب اس کے نام "خواب و خیال" کو ترک کر دیا اور پہلا مطبوعہ عنو

ساون رین کا سپنا" دوبارہ تجویز کیا۔ یہ مسوّدہ لمبی تقطیع (فل سکیپ) کے اٹھائیس صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں پہلے باب کے دونوں منظر اور دوسرے باب کے بھی دونوں منظر موجود ہیں جبکہ تیسرے باب کا صرف پہلا منظر پایا جاتا ہے۔ گویا اس مسوّدے میں مجموعی طور پر پانچ منظر موجود ہیں۔

اگر مذکورہ بالا دونوں مسوّدوں کو مجلہ "ہزار داستان" کے دستیاب شدہ پہلے چار شماروں کے ساتھ ملا لیا جائے تو اس ڈرامے کے جتنے منظر راقم السطور کو دستیاب ہوسکے ہیں اُن کی تعداد سات بنتی ہے۔ گویا اس ڈرامے کے آخری دو منظر تلاش کرنا ابھی باقی ہیں۔

امتیاز علی تاج سے پہلے شکسپیر کے اس ڈرامے کا مولوی امیر احمد علوی نے "خوابِ پریشاں" کے نام سے ترجمہ کیا تھا۔ جو منشی سجاد حسین کے اخبار "اودھ پنچ" میں ۱۶ اگست ۱۹۰۰ء سے ۲۲ نومبر ۱۹۰۰ء تک شائع ہوتا رہا۔ بعد ازاں صاحب ترجمہ کے صاحب زادے مشیر احمد علوی نے اسے ۱۹۲۴ء میں لکھنؤ سے کتابی صورت میں شائع کیا۔ (۱۱) ممکن ہے تاج نے اپنے ڈرامے کی اشاعت پہلی بار اس لیے موخر کردی ہو کہ امیر احمد علوی کا "خوابِ پریشاں" ابھی ابھی شائع ہوا ہے علاوہ ازیں اظہر علی آزاد نے بھی شکسپیر کے اس ڈرامے کو ۱۹۰۲ء میں "جامِ الفت" کے نام سے اُردو میں منتقل کیا تھا۔ (۱۲) بعد ازاں گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل جی۔ ڈی۔ سوندھی کی فرمائش پر صوفی غلام مصطفےٰ تبسم نے اس ڈرامے کے کچھ اجزا کا پنجابی زبان میں ترجمہ کیا جو ۱۹۴۰ء کے آس پاس گورنمنٹ کالج لاہور کے اسٹیج پر پیش کیا گیا۔ صوفی تبسم نے اسے اپنی کتاب "دو ناٹک" میں شامل کیا جو ۱۹۵۶ء میں لاہور سے پہلی بار شائع ہوئی (۱۳) اس ترجمے میں یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ مسخرے کردار پنجابی زبان میں گفتگو کرتے ہیں جبکہ بادشاہ اور پریاں اپنے مکالمے اُردو زبان میں ادا کرتے ہیں۔ اس کتاب میں جہاں جہاں اُردو کے مکالمے آئے ہیں۔ وہاں تبسم نے تاج کے ترجمے سے استفادہ کیا ہے۔ صوفی تبسم نے اس کتاب کے دیباچے میں اس کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے:۔

"اُردو دے پہلے کُجھ حِصّے میرے دوست امتیاز علی تاج صاحب دے اک پُرانے ترجمے توں
لے کے تھوڑے بوہتے فرق نال رکھے گئے ہیں" (۱۴)

تبسم نے تاج کے ترجمے سے اپنا چراغ اس طرح جلایا ہے کہ تاج مطبوعہ عنوان "ساون رین کا سپنا" میں ہلکا سا تصرف کر کے اس کا عنوان "ساون رین دا سفنا" تجویز کیا۔ پریوں کے بادشاہ کا نام "اندر" اور پریوں کی ملکہ کا نام "اندرانی" بھی تاج سے لیے اسی طرح دو پریوں "کلی" اور "پنکھی" کے نام بھی تاج کے ترجمے سے لیے اور دوسرے باب کا پہلا منظر (پریوں کے گیت سے ختم تک) تاج کے ترجمے سے لفظ بلفظ نقل کیا ہے۔ صرف دو ایک مقامات پر تاج کے چند ایسے جملے حذف کر دیے ہیں جن میں کسی اساطیری کا ذکر پایا جاتا تھا۔

شکسپیر کے ڈرامے "مڈسمر نائٹس ڈریم" کی کہانی مختصر طور پر اس طرح سے ہے کہ پُرانے زمانے میں ایتھنز کی ریاست میں ایک نوجوان لسندر اور ایک دوشیزہ ہرمیا ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ ہرمیا کے باپ کو پتا چلا تو اس نے ہرمیا کا بیاہ ایک اور نوجوان ڈیمتریوس سے کرنا چاہا مگر ہرمیا نے اس سے شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا اس پر ہرمیا کے باپ نے ریاست کے نواب سے اپنی بیٹی ہرمیا کے لیے موت کا پروانہ حاصل کر لیا کیونکہ اس ملک میں والدین کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنی نافرمان بیٹی کو موت کے گھاٹ اُتار دیں۔ ہرمیا کو اپنی موت کے فرمان کا پتا چلا تو وہ رات کے اندھیرے میں لسندر کے ساتھ فرار ہو گئی تاکہ دوسری ریاست میں پہنچ کر اس سے شادی کر لے۔ دونوں چلتے چلتے تھک گئے تو جنگل میں ایک جگہ پڑ کر سو رہے۔

ہرمیا جب اپنے گھر سے روانہ ہوئی تھی تو اس نے اپنی ایک سہیلی ہیلینا کو بتا دیا تھا کہ وہ گھر سے فرار ہو رہی ہے۔ ہیلینا نے یہ بات ذیمتریوس کو بتادی کیونکہ وہ ذیمتریوس سے محبت کرتی تھی اور اس طرح اس کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتی تھی ا۔ ذیمتریوس اور ہیلینا ان دونوں کے پیچھے چل پڑے۔ جب وہ دونوں جنگل میں پہنچے تو ہیلینا نے ذیمتریوس سے اظہار محبت کر شروع کر دیا مگر ذیمتریوس نے سرد مہری کا مظاہرہ کیا۔ پریوں کا بادشاہ اُن کی یہ باتیں سن رہا تھا۔ اس نے اپنے ایک پریز "پوک" کو حکم دیا کہ وہ جادو کا پھول لے آئے اور اُس کا رس اس نوجوان کی آنکھوں میں اس وقت نچوڑ دے، جب وہ سو رہا ہو۔ اس نوجوان کی جونہی آنکھ کھلے گی وہ سب سے پہلے ہیلینا کو دیکھے گا اور اسے چاہنے لگے گا۔ "پوک" پھول لے کر واپس آیا تو اس ۔ لسندر اور ہرمیا کو ایک جگہ سوتا پایا اس نے لسندر کو ذیمتریوس سمجھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں رس نچوڑ دیا۔

ادھر ہیلینا ذیمتریوس کی بے رخی پر سخت برہم ہوئی اور اسے چھوڑ کر گرتی پڑتی لسندر کے پاس آپہنچی۔ لسندر کی آنکھ کھلی اس کی نظر سب سے پہلے ہیلینا کے چہرے پر پڑی اس لیے وہ اس پر عاشق ہو گیا اور اس سے اظہارِ محبت کرنے لگا۔ ہیلینا نے دیکھا تو وہاں سے بھی بھاگ کھڑی ہوئی اور کسی نہ کسی طرح دوبارہ ذیمتریوس کے پاس جا پہنچی۔

ادھر "پوک" کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس نے ذیمتریوس پر نیند طاری کر کے اس کی آنکھوں میں رس ڈال دیا۔ ذیمتریوس بیدار ہوا تو اس کی پہلی نظر ہیلینا پر پڑی۔ اس لیے وہ بھی ہیلینا پر مر مٹا۔ اب ذیمتریوس اور لسندر دونوں ایک ہی محبو (ہیلینا) کو حاصل کرنے پر تُل گئے اور مقابلہ کرنے کے لیے جنگل میں موزوں مقام تلاش کرنے لگے۔ "پوک" نے یہ دیکھا انھیں ایک دوسرے سے جُدا کر دیا۔ وہ دونوں جنگل میں ساری رات بھٹکتے پھرے اندھیرے میں ایک دوسرے کو آوازیں دیتے ا للکارتے رہے۔ حتیٰ کہ تھک ہار کر گہری نیند سو گئے اب "پوک" نے لسندر کی آنکھوں میں ایسا رس ڈال دیا جس سے پہلے رس اثر زائل ہو گیا۔ صبح جب وہ دونوں بیدار ہوئے تو لسندر اپنی محبوبہ ہرمیا کو اور ذیمتریوس ہیلینا کو چاہنے لگا۔ اب انھوں ۔ دوسری ریاست میں جا کر شادیاں کر لیں۔ (۱۵)

تاج کا جو ترجمہ رسالے میں شائع ہوا۔ اس میں مقامات کے ساتھ ساتھ کرداروں کے نام بھی جوں کے توں انگریزی ۔ رہنے دیے ہیں۔ اس طرح یونان کے دیومالائی کرداروں کے نام بھی ویسے رہنے دیے گئے جیسے چاند کی دیوی "فیبی" عشق کا دی "قیوپڈ" اور طاقت کا دیوتا "اپالو" وغیرہ۔ ان دیوتاؤں کے ساتھ جو اساطیری کہانیاں وابستہ ہیں انھیں بھی ویسے ہی بیان کیا ہے انگریزی کے اصل متن کو اُردو میں ہو بہو منتقل کرنے کا احساس غالب نظر آتا ہے۔ اس لیے یونان کا رئیس واحد متکلم کے صیغے میں بات کرتا ہے کیونکہ انگریزی زبان کا انداز ہی کچھ ایسا ہے کہ آدمی کتنے ہی بلند رتبے پر فائز کیوں نہ ہو مگر وہ گفتگو واحد متکلم کے صیغے میں کرتا ہے اس ترجمے میں عربی، فارسی کے ثقیل الفاظ اور ترکیبیں راہ پا گئی ہیں جن سے مکالموں کے زور اور تقر کے بہاؤ میں رخنہ پڑتا ہے اور کہیں کہیں زبان و بیان میں بوجھل پن کا احساس بھی ہوتا ہے۔

"ساون رین کا سپنا" کا جو ترجمہ رسالے میں پہلی بار شائع ہوا۔ تاج نے اسے سامنے رکھ کر اپنا مسودہ "خواب و خیال" ۔ نام سے تیار کیا۔ اس میں ریاست کے نام "ایتھنز" کو بدل کر "عادل پور" بنا دیا۔ اسی طرح کرداروں کے انگریزی ناموں کو اُردو کا جامہ پہنا دیا۔ اس لیے اس مسودے میں لسندر کو اختر، ذیمتریوس کو غیاث، ہرمیا کو امینہ اور ہیلینا کو سلیمہ کا نام دیا ہے علا ازیں کمتر درجے کے کرداروں کو ہمارے معاشرے کے اہل حرفہ بنا دیا ہے اور ان کے نام بھی مقامی اور دلچسپ تجویز کیے ہیں جیسے پنجیرے کو تتھو، جلاہے کو بدھن، دھونکنی ساز کو ممّہ، نجار کو مودا اور درزی کو شبراتی لکھا ہے۔

تاج نے "ساون رین کا سپنا" کا جو مسودہ، اشاعت کی غرض سے ۱۹۳۳ء میں تیار کیا اس میں بعض ایسی تبدیلیاں ۔

لے لیں جو انہوں نے ۱۹۲۳ء کے مسوّدے میں کردی تھیں۔ مثلاً ریاست کے "عادل پور" نام کو دوبارہ "ایتھنز" بنا دیا۔ اور کرداروں کے مقامی نام بدل کر ان کی جگہ انگریزی کے اصل نام واپس لے آئے۔ اس تبدیلی کی وجہ ممکن ہے یہ رہی ہو کہ اس کلاسیکی ڈرامے کے کرداروں کے اصل ناموں سے قارئین کو ناآشنا رکھنا مناسب نہ سمجھا ہو۔ اس مسوّدے میں کئی دوسری تبدیلیاں بھی نظر آتی ہیں جیسے اس ڈرامے کو رسالے میں شائع کیا تو (MERMAID) کا ترجمہ "دُخترِ آب" کیا تھا مگر اب اسے "سمندری مچھلی" بنا دیا۔ (STOOL) کا ترجمہ پہلے "سٹول" ہی رہنے دیا تھا اب اسے "پیڑھی" بنا دیا (PEARL) کا ترجمہ پہلے "دردانہ" کیا تھا اب اسے موتی بنادیا اور (CRAB) کا ترجمہ پہلے "جنگلی سیب" کیا تھا اب اسے "جھینگر بنا دیا تاکہ ترجمے میں صحیح اور قطعی صورت حال منتقل ہوجائے۔

اس مسوّدے میں غیر ملکی اجنبی فضا دُور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے لیے ڈرامے کے ایسے تمام حصّے حذف کر دیے ہیں جہاں یونانی صنمیات کے اساطیری نام اور ان سے وابستہ کہانیاں بیان کی گئی تھیں۔ اسی طرح یونان کا بادشاہ بھی جمع کے صیغے میں کلام کرتا ہے کیونکہ مشرق کے تاجدار جمع متکلم کے صیغے میں گفتگو کیا کرتے تھے۔

اصل انگریزی ڈرامے میں مزاحیہ کردار "بوطوم" سیدھے سادے انداز میں بات کرتا ہے جبکہ تاج کا جولاہا "بُدمّن" (بوطوم) "پوچھو کیوں؟ اور سمجھے آپ؟" کا تکیہ کلام اپنی گفتگو میں بار بار لاتا ہے۔ عربی فارسی کے مشکل لفظوں اور ترکیبوں کو اُردو کے آسان لفظوں میں بدل دیا ہے۔ جیسے "پیری" جو "بڑھاپے" میں "باطل دعوے" کو "جھوٹے وعدے" میں اور "تحائفِ محبت" کو "محبت کے تحفوں" میں بدل دیا جاتا ہے اسی طرح بہت سے جملوں کو اتنا سادہ اور آسان بنا دیا کہ وہ تقریری زبان کے قریب آگئے جیسے ایک جملے "یہ رائے قابلِ قدر ہے" کو "یہ درست ہے" میں بدل دیا ہے۔ "بیماریاں متعدی ہوا کرتی ہیں" کو بیماریاں ایک دوسرے کو لگتی ہیں" میں تبدیل کیا ہے اور اسی طرح "ہم سب کے سب پھانسی پر چڑھا دیے جائیں گے" کو "ہم سب کے سب کے ٹنگ جائیں گے" میں منتقل کر کے انہیں نرم، آسان اور رواں بنا دیا۔

تاج نے "ساون رین کا سپنا" کے آخری مسوّدے میں بہت سی لفظی اور جزوی تبدیلیاں کی ہیں۔ کہیں لفظ بدلے ہیں تو کہیں لفظوں کی نشست بدلی ہے۔ کہیں فقروں میں روانی تو کہیں جملوں میں جوش پیدا کیا ہے۔ پہلے متن میں تکلف اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ ساتھ تقریر کا پیراہن بھی تنگ تنگ سا تھا جبکہ آخری مسوّدے سے بے تکلفی اور بے باکی کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کا چٹخارہ بھی مزہ دیتا ہے۔ کئی مکالموں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تاج نے انگریزی ڈرامے کا اصل مفہوم ذہن میں رکھ کر اُردو میں اپنی طرف سے مکالمے لکھے ہیں جو ہماری سماجی زندگی کے قریب آگئے ہیں اور اردو کے محاورے اور روز مرے ان میں ایک خاص لطف پیدا کرتے ہیں۔

مثلاً پہلے باب کے دوسرے منظر میں جب سب اداکار "قنس" کے گھر میں جمع ہوجاتے ہیں اور ڈراما کرنے کے لیے آپس میں کردار بانٹتے ہیں۔ اس صورت حال کو جو مکالمے ظاہر کرتے ہیں وہ "ہزار داستان" میں جس طرح شائع ہوئے بعد ازاں ۱۹۲۳ء کے مسوّدے میں کافی حد تک تبدیل کردیے گئے۔ ان کا موازنہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

"بوطوم: اومیاں پطرس وقنس! پہلے فرمایے کہ یہ کھیل ہے کس مضمون پر۔ پھر ایکٹروں کے نام لینا۔ یوں باقاعدگی سے کسی ٹھکانے پر پہنچو نہ"

(مطبوعہ ہزار داستان)

"بوطوم: اجی قبلہ! پہلے یہ فرمایئے کہ یہ کھیل، سُسرا ہے تو کس مضمون پر؟ پھر ایکٹروں کے نام لیجیے گا۔ یوں سلیقے سے کسی ٹھکانے پر پہنچیے نہ۔"

(مسودہ، ۱۹۳۳ء)

"فلوت: توبہ توبہ یار۔ عورت مجھ سے نہ بنا جائے گا۔ اور داڑھی بھی تو نکل رہی ہے میرے۔"

(مطبوعہ ہزار داستان)

فلوت: معشوقہ؟ نہ بھئی عورت میں نہیں بننے کا۔ ہاں اور کیا نام کہ داڑھی بھی تو نکل رہی ہے میرے۔ اس کو کس گھر رکھ آؤں گا؟"

(مسودہ، ۱۹۳۳ء)

"قنس: کچھ ڈر نہیں۔ تم نقلی منہ لگا لینا۔ باقی رہی آواز۔ تو جتنی پتلی آواز سے بولا جائے بولنا۔"

(مطبوعہ ہزار داستان)

"قنس: داڑھی نکل رہی ہے تو کون سی قیامت آگئی۔ نقلی چہرہ لگا لینا اور کیا؟ باقی رہی آواز تو جتنی مہین آواز میں بولا جائے بول ڈالنا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

(مسودہ ۱۹۳۳ء)

ج نے اپنے ترجمے میں مقامی اور معاشرتی تقاضوں کا خیال رکھا ہے۔ وہ اُردو کے لفظوں کو بے تکلفی سے استعمال کر جاتے ہیں۔ ں لیے وہ "پرولوگ" کو "نظم" "سانٹ" کو "مثنوی" "کیلنڈر" کو "جنتری" اور "نِنی" کو "پیر مکوڑے شاہ" لکھتے ہیں اور محاوروں اور روزمروں کی تو بساط بچھا دیتے ہیں۔ ایسے صرف دو مکالمے ملاحظہ ہوں:۔

"Quin: Ninus' tomb' man"

"قِنس: ارے بھئی، نگوڑے نہیں پیر مکوڑے کے مرقد پر کھو نہ۔"

"Snout: Býr lakin, a parlous Fear"

"اسنوت: بھئی واللہ۔ ہے تو ٹیڑھی کھیر۔"

تاج اپنے ترجمے میں زبان کو اس قدر تیکھا کر دیتے ہیں کہ وہ ان کی طبعزاد تخلیق بن جاتی ہے خاص طور پر جہاں عورتوں کا کڑا دکھانا ہو وہاں تاج کا قلم پَر پُرزے نکال لیتا ہے جس کے رنگ کو محاوروں اور روزمروں کے چھینٹے اور شوخ کر دیتے ہیں۔ مثلاً سرے باب کے دوسرے منظر میں جب پریزاد "پُوک" لسنڈر کی آنکھوں میں جادو کا رس نچوڑ دیتا ہے تو لسنڈر، ہیلینا پر عاشق جاتا ہے۔ لسنڈر کی محبوبہ ہرمیا یہ دیکھ کر اپنی سہیلی ہیلینا سے اُلجھ پڑتی ہے۔ ان دونوں سہیلیوں کے کوسنے اور تیز تیز باتیں ملاحظہ ہوں:

"امینہ (ہرمیا): (سلیمہ سے) اُف! دغا باز! پھول کو کھا جانے والے کیڑے۔ محبت کی چور۔ تو نے رات میں آکر میرے محبوب کا دل چُرا لیا۔

سلیمہ (ہیلینا): کیا کہا؟ شرم نہیں آتی تم کو؟ حیا بھون کھائی؟ ڈوب نہیں مرتی؟ میری معصوم زبان سے کوئی سخت جواب سننا چاہتی ہے۔ تف ہے تجھ پر دغا باز موم کی گڑیا۔

امینہ (ہرمیا): موم کی گڑیا؟ وہ کیوں؟ اچھا اچھا۔ یہ بات ہے اب سمجھی۔ اس نے میرے اور اپنے قد کا مقابلہ کیا ہے۔ اپنے قد کو سراہا ہے۔ اپنے کو سرو قد کہہ کہہ کر اختر کا دل موہ لیا ہے۔ میں چونکہ ناٹی اور قد کی چھوٹی ہوں۔ اس لیے تم اس کی نظروں میں اتنی بڑھ گئیں۔ کتنی نیچی ہوں میں؟ کیوں ری آسمان کی سیڑھی۔ کتنی نیچی ہوں میں؟ اتنی نیچی نہیں کہ میرے ناخن تیری آنکھوں تک نہ پہنچ سکیں۔"

(مسودہ، ۱۹۳۴ء)

اُردو میں ترجمے تو بہت سے ادیبوں نے کیے ہیں۔ کسی نے انگلی کٹا کر شہیدوں میں اپنا نام لکھوانے کے لیے، کسی نے اپنے قلم میں روانی پیدا کرنے کے لیے تو کسی نے انگریزی زبان پر عبور حاصل کرنے کے لیے' ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی۔ مگر ایسے مترجم بہت کم تعداد میں ہیں جو اپنے ترجمے کو خونِ جگر سے سینچتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ تاج ان مترجموں کے سرتاج ہیں کیونکہ وہ اپنے ترجمے میں بڑی ریاضت کرتے ہیں۔ اس کے لیے وہ ایک خیال کو ممکنہ نحوی ساختوں میں لکھتے اور پھر صحیح ترین جملے کا انتخاب کرتے ہیں۔ اس طرح وہ صحیح صورت حال، اصل کیفیت اور سچے مفہوم تک جا پہنچتے ہیں۔ اس لیے تاج کا ترجمہ سینکڑوں میں پہچانا جاتا ہے اور ان کے ترجمے پر طبعزاد کا گمان ہوتا ہے۔ اس بارے میں سیّد عابد علی عابد نے لکھا ہے:

"میں نے بہت سی کتابیں ترجمہ کی ہیں لیکن ایمان داری سے کہتا ہوں کہ شکسپیئر کے کھیل مڈسمر نائٹس ڈریم، کا نامکمل ترجمہ "ساون رین کا سپنا" جو تاج نے کیا ہے...... ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اصل مصنّف نے یہ چیزیں اُردو میں ہی لکھی تھیں۔ (۱۶)

تاج نے اس ڈرامے کے نثری حصّوں کا ترجمہ نثر میں کیا ہے لیکن جہاں کوئی ٹکڑا منظوم آیا وہاں اس کا ترجمہ بھی منظوم کر دیا۔ وہ پریوں کے گیت ہوں، فلوط کے نغمے ہوں یا بوطوم کی لن ترانیاں۔ تاج نے ان کے ترجمے شعروں میں کیے ہیں۔ مثلاً دوسرے باب کا پہلا منظر ایک پری کے نغمے سے شروع ہوتا ہے۔ اس نغمے کا آخری بند ملاحظہ ہو:

یہ اونچے گاؤ زباں کے پودے
بنے ہوئے ہیں مصاحب اس کے
لباس پر جن کے پھول بوٹے
سنہری یا لالہ گوں ہیں سارے
تمام پریوں کے ہیں پیارے
انہیں کی خوشبو بسی ہوئی ہے

ان شعروں کو تاج کی تخلیق قرار دینے میں ہمیں کوئی تامل نہیں کیونکہ تاج نے جب "ساون رین کا سپنا" لکھا تھا اس زمانے میں وہ شاعری بھی کیا کرتے تھے۔ انھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور کی تقریبات میں اپنی کئی نظمیں پڑھیں۔ ان میں سے ایک نظم ۱918ء میں چھپ کر قارئین کی نظروں سے گزری بھی گئی۔ (۱۷) اسی طرح وہ مشاعروں میں غزلیں بھی پڑھا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک غزل کے کچھ شعر اس خط میں محفوظ رہ گئے ہیں جو منشی پریم چند نے ۱۹۲۱ء میں تاج کو لکھا تھا۔ (۱۸) گویا تاج کا قلم نثر کے ساتھ ساتھ شاعری میں بھی بند نہ تھا۔

اس ڈرامے میں ایک دلچسپ کردار بوطوم (Bottom) کا ہے جس کا نام تاج نے "بدھن" رکھا ہے۔ وہ ایک ایسا بر خود غلط نوجوان ہے جو لاف زنی کرتا اور شیخیاں بگھارتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ہر فن مولا سمجھتا اور ہر کام کو مہارت سے سر انجام دینے کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس ڈرامے میں جب اداکاروں میں کردار بانٹے جاتے ہیں تو بوطوم کی "ہمہ دانی" اسے چین نہیں لینے دیتی۔ وہ اس ڈرامے میں خوبرو دوشیزہ کا کردار ادا کرنا چاہتا ہے۔ نامراد عاشق بھی بننا چاہتا ہے، ظالم کا پارٹ بھی کرنا چاہتا ہے اور لطف یہ کہ خوفناک شیر کا بہروپ بھر کر دھاڑنا بھی چاہتا ہے۔ جب اس کے ساتھی یہ اندیشہ ظاہر کرتے ہیں۔ کہ تمہاری گرجدار آواز سے اگر امیر زادیاں ڈر گئیں تو نواب ہم سب کو پھانسی پر لٹکا دے گا تو اس مسئلے کا بھی وہ دلچسپ حل نکال لیتا ہے۔ اس کردار کے چند مکالمے ملاحظہ ہوں:۔

"بوطوم: خوب۔ تو حضرت اگر یہ چیزیں عین مین طور پر کی گئی تو آنسوؤں کی جھڑی بندھ جائے گی۔ اگر ہمارے ذمے ہے تو پھر دیکھنے والے اپنی آنکھوں کا انتظام کر لیں۔ جناب میں! ایک طوفان اٹھا دوں گا۔ ہاں طوفان۔ ویسے اپنا کسی قدر رنج بھی ظاہر کردوں گا۔ (باقی ایکٹروں سے) ہمارا خاص مذاق ظالم کے پارٹ کا ہے۔ ارقل کا پارٹ تو ایسا کر سکتا ہوں کہ باید و شاید۔ یا پھر کوئی ایسا پارٹ ہو جس کا کام بڑا زبردست اور خوفناک ہو تو جناب سب لوگ کانوں پر ہاتھ نہ دھر لیں تو سہی۔

"بوطوم: اماں اس پیراموس اور ثبئی کے قصے میں بعض باتیں کچھ ایسی ان مل، بے جوڑ آ پڑتی ہیں کہ بھلی نہ معلوم ہوں گی۔ کہی کو سمجھے آپ؟ پوچھیے کیا؟ اول تو لیجیے کہ آخر میں پیراموس کو خودکشی کے لیے تلوار کھینچنا پڑتی ہے۔ ہے ناٹھیک۔ اچھا تو جناب یہ کھیل دیکھنے کو ہوں گی بیگمات بھی موجود۔ سمجھے آپ؟ تو اب ہم یہ کہتے ہیں کہ بیگمات اس خون خرابے کے قصے کو دیکھیں گی تو کیسے؟ مارے ڈر کے چیخیں مار مار کر آسمان سر پر نہ اٹھالیں تو ہم ایکٹر کا ہے کے ہوئے۔ اب فرمائیے اس نقص کا علاج جناب نے کیا سوچا ہے؟

"بوطوم: ایک بات کہیں۔ بھئی شیر بھی ہمیں ہی بن جانے دو۔ جناب من! ایک دفعہ تو ایسا گرجوں کہ سماں بندھ جائے اور نواب تو کہے کہ بیٹا! گرجتا جا۔

"بوطوم: کہنے لگے کہ ٹنگ جائیں گے۔ جیسے ہم تو کچھ جانتے ہی نہیں۔ اماں تبھی تو۔ اگر بیگمات ہمارے گرجنے سے ڈر گئیں۔ ایسی حالت میں تو بے شک "ٹانگو" کے سوا ان کے منہ سے کچھ نہ نکلے گا۔ لیکن، قبلہ ہم تو شیر کی گرج کو ایسا ہلکا پھلکا بنا کر نکالیں گے جیسے کوئی

کبوتر غٹرغوں کرتا ہے۔ آیا سمجھ میں؟ کیا معنی کہ ہم گرجیں گے اور جناب کہیں گے کوئی بلبل بول رہا ہے۔"

بوطوم کا یہ کردار شکسپئر نے تخلیق کیا تھا لیکن تاج نے اسے اردو کا جامعہ کچھ اس طرح پہنایا ہے گویا اسے (Adopt) کر لیا ہے۔ یہ کردار تاج کے قلم سے ۱۹۲۲ء میں گزرا اور اس کے صرف چار برس بعد ۱۹۲۶ء میں تاج نے چچا چھکن کے بارے میں اپنا پہلا مضمون لکھا۔ (۱۹) بوطوم میں شیخی، لاف زنی اور احساس برتری کی جو صفات پائی جاتی ہیں۔ وہی خصائص آگے چل کر چچا چھکن کی ذات کا حصّہ بنیں۔ اس لیے تاج کے چچا چھکن کو شکسپئر کے بوطوم کا جانشین کہا جائے تو کچھ ایسا غلط نہ ہوگا۔

حوالہ جات

(۱) امتیاز علی تاج "ساون رین کا سپنا" لاہور؛ شمارہ ۱، جولائی ۱۹۲۲ء ص ص ۵۳۔ ۶۰

(۲) امتیاز علی تاج "ساون رین کا سپنا" ہزار داستان، لاہور جلد شمارہ ۲، جولائی ۱۹۲۲ء ص ص ۳۸۔ ۴۱

(۳) امتیاز علی تاج "ساون رین کا سپنا" ہزار داستان لاہور؛ جلد ۱، شمارہ ۳، اگست ۱۹۲۲ء ص ص ۳۹۔ ۴۱

(۴) امتیاز علی تاج "ساون رین کا سپنا" ہزار داستان لاہور؛ جلد شمارہ ۴، اگست ۱۹۲۲ء ص ص ۴۲۔ ۴۵

(۵) حکیم احمد شجاع "اداریہ" ہزار داستان، لاہور جلد ۱، شمارہ ۵، ستمبر ۱۹۲۲ء ص ۲

(۶) عابد علی عابد "سیّد امتیاز علی تاج" تخلیق، لاہور؛ جلد ۱، شمارہ ۳، ۴، ص ۲۵

(۷) سراج نظامی "تاج کی چند یادیں" کتاب لاہور؛ تاج نمبر، جلد ۴، شمارہ ۹، جون ۱۹۷۰ء ص ۱۶

(۸) ایڈورڈ بل وَرلٹن "لیلیٰ یا محاصرۂ غرناطہ" (مترجمہ) امتیاز علی تاج، لاہور؛ دارالاشاعت پنجاب، بار اوّل ۱۹۲۴ء ص ص ۱۔ ۲۶۲

(۹) امتیاز علی تاج "خواب و خیال" مسوّدہ محررہ جون ۱۹۲۳ء مملوکہ راقم السطور

(۱۰) امتیاز علی تاج "ساون رین کا سپنا" مسوّدہ محررہ ۱۹۲۳ء مملوکہ راقم السطور

(۱۱) محمد اسلم قریشی "اُردو ڈرامے میں نئے رجحانات" لاہور؛ ایکورینٹ پرنٹرز، بار اوّل، اگست ۱۹۸۱ء ص ۱۱۰، ۱۱۱

(۱۲) عبدالعلیم نامی "اُردو تھیٹر" (جلد اوّل) کراچی؛ انجمن ترقی اُردو پاکستان، بار اوّل ۱۹۶۲ء، ص ۳۱۴

(۱۳) غلام مصطفیٰ تبسم "دو ناٹک" لاہور؛ مکتبہ گنج دریا، بار دوم، اکتوبر ۱۹۶۴ء

(۱۴) ایضاً ص ۱۳۰

(۱۵) WILLIAM SHAKESPEARE "A MIDSUMMER NIGHTS, DREAM" COMPILED BY K. DEIGHTON LONDON: MACMILLAM AND COMPANY FOURTH EDITION 1877.

(۱۶) عابد علی عابد "سیّد امتیاز علی تاج" محولہ بالا ۶

(۱۷) امتیاز علی تاج "الوداع شاد" (نظم)، راوی، لاہور؛ جون ۱۹۱۶، ص ص ۱۳۸۱، ۱۳۸۲

(۱۸) دھنپت رائے (منشی پریم چند)، مکتوب بنام امتیاز علی تاج، از نارمل سکول گورکھپور، محررہ ۱۴ ستمبر ۱۹۲۰ بحوالہ "پریم چند" مرتبہ مدن گوپال کراچی؛ فرینڈز پبلشرز اُردو بازار، بار اوّل مئی ۱۹۸۲، ص ۱۱۴، ۱۱۵

(۱۹) امتیاز علی تاج "چچا چھکن نے تصویر ٹانگی" نیرنگِ خیال، لاہور عید نمبر، اپریل ۱۹۲۶ء ص ص ۵۱۔ ۵۳

"خواجہ محمد خان اسد اور اُن کا کتب خانہ"

راشد علیزئی

علاقہ چھچھ ضلع اٹک کا ایک سرسبز و شاداب اور حسین خطہ ہے۔ اس کی ایک اپنی تاریخی حیثیت و اہمیت ہے۔ یہ ہمیشہ سے
انین کی گزرگاہ رہا ہے۔ سکندرِ اعظم سے لیکر سیّد احمد شہیدؒ تک ہر ایک طالع آزما نے مختلف عنوان سے یہاں اپنی شجاعت کے علم
ائے ہیں۔ یہ دریائے سندھ کے بائیں کنارے کے ساتھ ساتھ دور تک پھیلا ہوا ہے اس علاقہ کی زرخیز مٹی نے بڑی بڑی نامور
ستیوں کا جنم دیا ہے۔ جنھوں نے ہر شعبۂ زندگی میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں انھیں نامور اور قد آور ہستیوں میں سے ایک
..... خواجہ محمد خاں اسد حضرویؒ تھے۔ جن کی ذاتِ گرامی علمی و ادبی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں ہے۔ انھوں نے تقریباً نصف
دی اس علاقہ میں گیسوئے ادب سنوارنے میں بسر کر دی۔

علاقہ چھچھ کے صدر مقام حضرو کے محلہ محمد عظیم خان میں جنم لینے والے اِس بچے کو ایک علمی و ادبی ماحول میّسر آیا تھا۔ ان
الدِ گرامی محمد خان عطا ایک اچھے شاعر اور مولانا ظفر علی خان و مولانا ذکاء اللہ خان کے بہترین دوستوں میں سے تھے۔ یہی وجہ ہے
ب خواجہ محمد خان اسدؒ آٹھویں جماعت میں تھے تو اُس وقت ان کے پاس تقریباً آٹھ صد کتب کا ذخیر موجود تھا۔ جب انھوں نے
ں کے میدان میں قدم رکھا تو انہیں مولانا ظفر علی خاں جیسا شفیق استاد میسر آیا مولانا نے ہی آپ کا تخلص اسد تجویز کیا۔ بعد
اسد حضرویؒ کو علم کی لگن اور شوق نے اعظم گڑھ پہنچا دیا۔ جہاں علامہ سیّد سلیمان ندویؒ اور شاہ معین الدین ندویؒ جیسے راہنما
آئے کچھ مدت بعد جب وہ اپنے آبائی گاؤں حضرو واپس آئے تو اُنھوں نے علامہ سیّد سلیمان ندویؒ کے حکم پر ان کے کتب خانہ
کی طرز پر خالص اردو کتب خانے کی بنیاد رکھی۔ جسے دیکھنے علامہ ندویؒ بہ نفسِ نفیس حضرو تشریف لائے۔ نامور مؤرخ مولانا
ں مہر نے کتب خانہ کا نام "میرا کتب خانہ" تجویز کیا۔ اس کتب خانہ کی پہلی کتاب "نشر الطیب فی ذکر النبی ﷺ" ہے جسے
اشرف علی تھانویؒ نے بطورِ خاص تھانہ بھون سے ارسال فرمایا تھا۔

خواجہ محمد اسدؒ کو کتاب سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ انھوں نے ہمیشہ اپنی ضروریات کو پسِ پشت ڈالے رکھا اور جہاں بھی
کتاب کی اشاعت کی بابت سُنا اُس کا حصول گویا اپنے اوپر فرض کر لیا۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو دوسروں پہ رعب
، کے لیے کتابیں اکٹھی کرتے ہیں بلکہ وہ ہر کتاب کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کرتے تھے۔ کافی تحقیق اور جانچ پڑتال کے بعد کتاب کو
ں کتب خانہ کرتے تھے۔ کتاب کو حفاظت سے رکھنا اُس کی جلد بندی کے بعد اُس پر خوبصورت گردپوش چڑھانا بھی اُن کا
ب مشغلہ تھا۔ وہ مطالعہ کے ساتھ ساتھ مختلف موضوعات پر لکھتے بھی رہے ملک کے کئی بڑے جرائد میں اُن کے مقالات شائع
ئے ہیں۔ انھوں نے مولانا اسلم جیراجپوری کی وفات کے بعد "رقعاتِ عالمگیری" پہ کام کرنے کا بیڑہ اُٹھایا اس سلسلے میں

موصوف کی دارالمصنفین اعظم گڑھ کے علاوہ کئی معاصر شخصیات سے خط و کتابت بھی رہی جو کتب خانے میں محفوظ ہے۔ خ
محمد خاں اسد کے شاندار تحقیقی مقالے کی کئی اقساط ماہنامہ "تعلیم القرآن" راولپنڈی میں شائع ہوئیں۔ آخری دنوں میں "
علیز'بیان چھپچھ" یہ کام تقریباً مکمل کر چکے تھے کہ دیارِ حرم سے بلاوا آگیا اور وہ بغرضِ حج اگست ۱۹۸۵ء میں مکّہ مکرمہ تشریف
گئے۔ مگر جیساکہ انھوں نے جانے سے پہلے واضح طور پہ کہہ دیا تھا کہ "میں واپس نہیں آؤنگا" اللہ نے اپنے نیک بندے کی بات
لاج رکھ لی اور پھر وہیں مہبطِ وحی غارِ حرا کے مقام پر علم و ادب کے اِس دلدادہ کو اجل نے آلیا اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اُسی سرز
کے سپرد ہوگئے۔ جس کی انھوں نے خواہش کی تھی۔

خواجہ محمد خان اسد حضرویؒ خود تو ۲۱ ستمبر ۱۹۸۰ء بروز اتوار کو اس دنیا سے چل بسے مگر اُن کی زندگی کا یادگار سرمایہ "
کتب خانہ" آج بھی تشنگانِ علم کی پیاس بجھا رہا ہے اِس کتب خانہ سے ملک کی بڑی بڑی شخصیات نے استفادہ کیا ہے اور
بھی ملک و بیرونِ ملک سے مشاہیر و اسکالرز یہاں آکر اپنی علمی پیاس بجھاتے رہتے ہیں۔ اِس "مجموعہ حضرویؒ" میں کئی نا
نایاب کتب اور رسائل کی جلدوں کے علاوہ مخطوطات اور مکاتیبِ مشاہیر کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ اس کتب خانہ کے بارے م
ممتاز اسکالر و ماہرِ لسانیات مولانا عبد القدوس ہاشمیؒ ایک جگہ رقمطراز ہیں کہ "خواجہ محمد خان اسدؒ کے کتب خانہ میں کتابوں کے ع
بعض قدیم اور نایاب رسالوں کی مجلدات موجود ہیں۔ مثلاً ۱۸۸۸ء کے بعض قدیم رسائل کی مکمل جلدیں ہیں۔ خصوصیت کے
ہم اس کو غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں کہ "معارف" "اعظم گڑھ" "برہان" دہلی اور "ترجمان القرآن" لاہور وغیرہ کی بھی پچھلی جلد
یہاں تقریباً پوری موجود ہیں۔ اسی طرح اردو کی بہت سی ایسی کتابیں دیکھنے میں آئیں جو اب کمیاب ہی نہیں بلکہ نایاب ہو
ہیں۔ مثلاً سوانح "حضرت غریب نواز" مصنفہ محمد حافظ اللہ چشتی مطبوعہ افضل الاخبار ۱۳۱۵ھ سیرتِ شافعی از نجم الدین دخانی رفاہ
پریس لاہور ۱۸۹۹ء "تاریخ اسلام" مصنفہ محمد احسان اللہ عباسی مطبوعہ وقت پریس گوادر اسپور ۱۸۸۹ء ان کے علاوہ مولانا عبد الحل
شرر کی تاریخ سندھ، تاریخ یہود اور مولانا محمد حسین الہ آبادی مرحوم کے بعض تراجم تواریخ جو اب کہیں نہیں ملتے ہیں۔"

میرا کتب خانہ میں تقریباً بارہ ہزار کے لگ بھگ کتب و رسائل موجود ہیں جو سیرت، دینیات، سوانح، تاریخ، قرآن و حدیث
فقہ و قانون، ادب و سیاست اور مکاتیب و خطبات وغیرہ جیسے اہم موضوعات کی حامل کتب ہیں اور تمام کی تمام مشہور و بلند پ
مصنفین کی تصنیفات ہیں۔ کتب خانے کا ایک حصہ ڈراموں، مختصر افسانوں، تراجم، ناولوں اور دوسرے موضوعات کے لیے وق
ہے جس میں تقسیم سے قبل کے تقریباً ہر معروف مصنف کی کتب موجود ہیں۔ نایاب کتب میں قصہ حضرت بلالؓ مصنفہ بہادر
ظفر۔ ہے جو نوادر کا درجہ رکھتی ہے۔ اب کسی لائبریری میں شاید ہی موجود ہو۔ اِسی طرح نسخۂ پنجم رقعہ ارادت خان واضح (
مفتوح الحرمین از محی الدین محی لاری (مطبوعہ ۱۸۸۰ء) وغیرہ جیسی کئی نادر و نایاب کتب و رسائل اور مخطوطات کتب
موجود ہیں۔

رسائل میں سے اکثر قبل از تقسیم کے ہیں جن میں سے آج کل کئی کمیاب ہی نہیں نایاب بھی ہیں۔ الھ
ابوالکلام آزاد)، مخزن (لاہور)، الامداد (تھانہ بھون)، دین دنیا (دہلی) پیشوا (دہلی) آجکل (دہلی) خطیب (دہلی) سرپنچ (لکھنؤ
اسلام (لاہور)، دِلگداز (لکھنؤ)، شفاء (کلکتہ)، خطیب (دہلی)، علیگڑھ میگزین، شانِ ہند (بمبئی)، عالمگیر (لاہور)، ساقی (دہلی
(دہلی)، مولوی (دہلی)، صوفی (منڈی بہاؤ الدین) اور نگار (نیاز فتحپوری) وغیرہ جیسے علمی اور معروف رسائل کی اکثر مکمل
جلدیں کتب خانہ میں موجود ہیں مگر ان محدود صفحات میں کتب خانہ کی اہم کتب و رسائل کا ذکر ناممکنات میں سے ہے!

آگے بڑھاتے ہوئے کتب خانہ کے صرف چند مخطوطات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

گنج حضروی میں سب سے اہم قرآن پاک کا وہ قلمی نسخہ ہے جو شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیرؒ کے ہاتھوں کا لکھا ہوا نہایت بوسیدہ حالت میں ہے۔ ایک قرانِ پاک خطِ کوفی میں موجود ہے جو کاغذ کی ساخت کے اعتبار سے تقریباً تین سو سال پرانا معلوم ہوتا ہے اس کے علاوہ کلامِ مجید کے کئی نادر قلمی نسخے بھی موجود ہیں۔

کلیاتِ ظفر خان احسن کا ایک قلمی نسخہ عمدہ حالت میں کتب خانہ کی زینت ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن لائبریری میں محفوظ ہے جس کے حوالے سے عبد الرحمٰن چغتائی نے ایک مفصل مضمون لکھا تھا۔ اس کا شاید ہی کوئی قلمی نسخہ پاکستان کی کسی لائبریری میں موجود ہو۔ اٹک شہر کالج کے سابق لائبریرین نذر صابری اس نسخے کا ایک انتخاب تفصیلی تعارف کے ساتھ عنقریب شائع کرنے والے ہیں میرے خیال میں آج تک "کلیاتِ احسن" کی اشاعت نہیں ہوئی ہے۔

کتب خانہ کا ایک اہم مخطوطہ بہادر شاہ نامہ ہے جس کے مصنّف مرزا مبارک اللہ واضح اور کاتب کنہیالال ہیں۔ یہ تاریخی نسخہ نہایت عمدہ اور اچھی حالت میں ہے۔ اسی نسخے کو مولانا غلام رسول مہر (۱) نے ایڈیٹ کر کے "تاریخ ارادت خان" کے نام سے دانشگاہِ پنجاب لاہور سے ۱۹۷۱ میں شائع کروایا تھا اور کتاب کے دیباچہ میں کتب خانہ و صاحبِ میر اکتب خانہ کا بطورِ خاص ذکر کیا ہے۔ اس تاریخی قلمی نسخہ کا "نوادراتِ علمیہ اٹک" میں نذر صابری اس طرح تعارف کراتے ہیں۔ "بہادر شاہ نامہ (فارسی) مصنفہ مرزا مبارک اللہ متخلص بہ واضح۔ سنِ تالیف ۱۱۲۶ھ اورنگ زیب کے بعد اُس کے خاندان پر کیا گزری۔ مصنّف نے اپنی سرگزشت کے پیرایہ میں اس داستانِ خونچکاں کو بیان کیا ہے۔ چونکہ وہ خود خاندانِ مغلیہ کا ایک منصب دار تھا اور ارادت خان کا عہدہ اُس کے خاندان میں عہدِ شاہجہانی سے چلا آرہا تھا۔ "محرم رازِ درونِ خانہ" کے طور پر اس کے بیان کو بڑا اعتبار حاصل ہے لہٰذا یہ کتاب اپنے دور کی گراں قدر، معتبر تاریخ کا درجہ رکھتی ہے۔ جلی نستعلیق میں خوشخط نسخہ ہے۔ جسے کنہیالال نے سرمست خان کے لیے ۱۲۵۷ھ میں تحریر کیا آخر میں سرمست خان کی مہر ثبت ہے۔ یہ نسخہ خان بہادر محمد عظیم خان حضروی کی ملک رہ چکا ہے۔" (۲) جو صاحبِ کتب خانہ کے چچا تھے۔ نوشت خان زمان پہتی، یہ نسخہ پہتی گاؤں (جو کہ حضرو کے نزدیک ہی ہے) کے علی زئی خاندان کے ایک فرد کی خود نوشت سوانح عمری ہے جو زیادہ تر خاندانی حالات و واقعات پر مشتمل ہے۔ خان موصوف نے کافی طویل عمر پائی تھی آخری عمر میں انھوں نے اپنی اولاد کے لے یہ ڈائری لکھی تھی ابتداء میں ان کے لیے کچھ اقوال وغیرہ بھی درج ہیں۔ اس میں آخری واقعہ ۱۹ اگست ۱۹۲۷ء کو درج کیا گیا ہے۔

ان تاریخی قلمی کتب کے علاوہ حکایت الابرار مصنفہ مُلّا عبد المجید ساکن رحموں (حضرو کے نزدیک ایک قصبہ ہے) نے تحریر کیا ہے یہ ایک منظوم داستان ہے اس کا ضخیم قلمی نسخہ نہایت عمدہ حالت میں ہے۔ اسی طرح حضرو کے ایک نزدیکی گاؤں ملک ، مالہ کے ایک محدث فضل دین نے مولانا جامی کی یوسف زلیخا پر حواشی لکھے ہیں یہ قلمی نسخہ فضل دین محدث نے ۱۲۷۴ھ میں تحریر کیا ہے۔ ایک پنجسورہ ہے جس کو فضل دین مالہ نے تحریر کیا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف معروف کتب مثلاً بہار دانش، شرح گلستان، بوستان سعدی اور یوسف زلیخا وغیرہ کے قلمی نسخے ہیں۔ اور ان سب کے کاتب وہی فضل دین ملک مالہ والے ہیں۔

مخطوطات کے مفصل تعارف کے لیے ایک علاحدہ مضمون کی ضرورت ہے لہٰذا اسی پہ اکتفاء کرتا ہوں کہ ابھی تو ایسے مخطوطات میر اکتب خانہ کی زینت ہیں جو کسی سکالر کی راہ دیکھ رہے ہیں۔

حواشی

(۱) خواجہ محمد خان اسدؒ کے نام مولانا مہر کے مکاتیب ماہنامہ "قومی زبان" کراچی بابت جون ۱۹۷۳ء میں شائع ہو چکے ہیں۔
(۲) بحوالہ "نوادراتِ علمیہ اٹک" مرتبہ نذر صابری ص ۱۲ مطبوعہ ۱۹۶۳ء

کایا پلٹ.... یا الٹ پلٹ؟

ایس ایم معین قریشی

کہا جاتا ہے کہ اردو کے پہلے (باقاعدہ) شاعر ولی دکنی نے اپنی پوری زندگی میں دلّی کے صرف دو سفر کیے تھے جن سے ان کے
تجربات و مشاہدات میں اتنی وسعت پیدا ہو گئی کہ انھوں نے شاعری کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا تھا۔ تاہم یہ اس دور کی بات ہے
جب خود دکن میں کسی پڑوسی ریاست سے دوچار میل کا سفر کر کے آنے والے کو "غیر ملکی" کہا اور سمجھا جاتا تھا۔ آج ذرائع ابلاغ
(بشمول ذرائع آمد و رفت) کی ترقی کے باعث دنیا بقول مارشل میک کوہان ایک عالمی گاؤں "میں سمٹ کر رہ گئی ہے یہی وجہ ہے
کہ ہمارے شاعر جست لگا کر امارات مشرقِ وسطیٰ، یورپ اور امریکہ پہنچ جاتے ہیں اور پھر اردو کی ترقی کے خاطر مہینوں وہیں پڑے
اپنے تجربات و مشاہدات کو وسعت دیتے رہتے ہیں۔ بعض عالی مرتبت شعرائے کرام تو بیرونی میزبانیوں کے حق میں میر انیس کے
نگینوں والے اصول پر اتنی سختی سے عمل کرتے ہیں کہ وہ مقامی میزبانوں کے ہاتھ نہیں لگتے۔ ان کے لیے فن لینڈ کا ہوائی سفر
بنی جٹ لینڈ کے سفر سے زیادہ آسان ہے چنانچہ یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ ان کے ذہن و فکر میں کتنی تبدیلیاں رونما ہوتی ہوں
گی۔ ویسے بھی زمانہ بدلنے کے ساتھ ساتھ اقدار بدلتی ہیں لہذا ادب کے اسلوب، اصناف، موضوعات اور تلامذات میں تبدیلی ایک
بدیہی امر ہے۔

اردو ادب اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ نئے نئے الفاظ و محاورات کی شمولیت کے باوجود
ہمارے ادب نے قدیم محاورات، ہندسوں اور تراکیب سے اپنے تعلق کو بڑی حد تک برقرار رکھا ہے۔ ایک نظریہ کے مطابق ادب،
انسان کی سماجی اور معاشی ضروریات کی پیداوار ہے اور یہی ضروریات اس میں تبدیلیاں لاتی ہیں مگر اردو ادب کے سلسلے میں
صورت حال قدرے مختلف ہے۔ مثلاً برصغیر پاک و ہند میں اعشاری نظام کو رائج ہوئے صدی سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا ہے اس کے
باوجود صحیح بات آج بھی سولہ آنے صحیح ہوتی ہے (سو پیسے نہیں) چاند بے چارے کے حسن کا پردہ بہت سال پہلے فاش ہو چکا ہے
لیکن مائیں آج بھی اپنے بیٹوں کے لیے چاند سی دلہن تلاش کرتی ہیں حد یہ کہ لنکا والوں نے اپنے ملک کا نام بدل کر سری لنکا رکھ
یا اور گز میٹر میں بدل گیا لیکن اردو ادب کی رُو سے آج بھی "لنکا میں جسے دیکھو باون گز کا..!"

جہاں تک اردو ادب کی ہیئتوں یا اسالیب کا تعلق ہے، نثر میں نظم کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔
شاعری کے سلسلے میں تبدیلیوں کے دعوے تو بہت کیے گئے اور برسوں سے کیے جا رہے ہیں مثلاً پنڈت برج نرائن چکبست نے
کہا تھا۔

نیا مسلک نیا رنگِ سخن ایجاد کرتے ہیں
عروضِ شعر کو ہم قید سے آزاد کرتے ہیں

ایسے ہی دعوے سلام مچھلی شہری، ن م راشد اور دیگر بہت سے شاعروں نے کیے اور آج تک کر رہے ہیں لیکن شاعری کو ردیف اور قافیے کی "قید" سے ہنوز آزاد نہیں کرایا جاسکا ہے۔ "نثری نظم" کی اصطلاح جو اپنی ساخت میں دو متضاد الفاظ کا مرکب ہے جیسے کوئی کہہ دے "نمکین حلوہ" اب سے نصف صدی قبل فروغ کی گئی تھی مگر آج تک یہ قبولِ عام کی سند حاصل نہیں کر سکی ہے۔ خود انگریزی ادب میں جہاں سے اسے درآمد کیا گیا تھا، اسے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا چنانچہ مشہور امریکی شاعر رابرٹ فراسٹ نے کہا تھا "نثری نظم لکھنا ایسا ہی ہے جیسے بغیر نیٹ کے ٹینس کھیلنا" ہمارے ایک دوست کی رائے میں اگر ایک نثری نظم کو درمیان میں سے پھاڑ لیں تو دو نثری نظمیں آسانی سے معرضِ وجود میں آسکتی ہیں۔

خیر یہ بات تو ضمناً آگئی تھی۔ ہمیں تسلیم ہے کہ اس سلسلے میں ہمارے موقف سے متعدد اہلِ قلم کو اختلاف ہوگا اور یہ ان کا "بنیادی انسانی حق" ہے (اسی حق کے مظاہر آج کل ہر چہار سو نظر آتے ہیں) جہاں تک موضوعات کا تعلق ہے اردو شاعری نے ہمیشہ اپنے ماحول اور مسائل کی کامیابی کے ساتھ ترجمانی کی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ شاعری کا واسطہ انسانی جذبات سے ہے جن سے دامن نہیں بچایا جاسکتا بقول شخصے،

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

یہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا زمانہ ہے اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اب شاعری کے بجائے صنعت و حرفت پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ بات بھی سب سے پہلے ایک شاعر (اکبر الہ آبادی) ہی نے کہی تھی،

کچھ صنعت و حرفت پہ بھی لازم ہے توجہ
آخر یہ گورنمنٹ سے تنخواہ کہاں تک

تاہم احمد ندیم قاسمی نے اپنے ایک مضمون میں بجا طور پر لکھا ہے "کیا ہاتھ میں پلاس آتے ہی انسان گنگنانا بھول جاتا ہے؟ یا کیا اس طرح وہ اچھے خواب سے دست کش ہو جاتا ہے؟" اسی مضمون میں وہ آگے چل کر لکھتے ہیں۔ "سائنس اور ادب میں بعد کہاں ہے! سائنس کی ترقی تو شاعر اور ادب کی قوت متخیلہ کا ایک ٹھوس روپ ہے۔ "لہٰذا شعر و ادب کی ضرورت اپنی جگہ مسلم ہے۔ اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ جدید موضوعات کے اضافہ کے باوجود اردو شاعری نے بعض "بنیادی قسم" کے موضوعات کو بھی کلیجے سے لگا کر رکھا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے بارے میں اب شعراُ کے نقطۂ نظر میں واضح تبدیلی آگئی ہے۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے (نہ کہ تنقید و تضحیک کی غرض سے) ہم نے اسی بدلی ہوئی اپروچ "پر قدیم اور جدید اشعار کی روشنی میں اپنی محدود سمجھ کی حد تک رائے زنی کی ہے۔

محبت جس کی معراج عشق ہے اردو شاعری کا ایک مقبول موضوع ہے۔ قدیم شعرا نے اس کو نئی نئی طرز کے ساتھ ادا کیا ہے لیکن اس کی عظمت کے قائل رہے۔ ایک نے تو یہاں تک کہا،

دیارِ عشق کی عظمت کو کوئی کیا سمجھے
یہاں کی خاک سے انساں بنائے جاتے ہیں

ماضی قریب تک شعرا نوجوان کو عشق کی تلقین کرتے تھے۔ علامہ اقبال نے کہا،

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

جگر نے عاشق کے ادب و احترام کو یوں رقم کیا،

تیرے عشق کی کرامت یہ اگر نہیں تو کیا ہے
کبھی بے ادب نہ گزرا مرے پاس سے زمانہ

یہ ماضی کا عشق کیا تھا جب عاشق کے پاس سے کوئی بھی بے ادب نہیں گزر سکتا تھا۔ آج اظہار شوق کی دُھن میں عاشق خود بے ادب ہوجاتا ہے۔ مرض عشق کا علاج کریں تو بد پرہیزیاں کرتا ہے۔ غرض پہلے تو بے ڈھب حرکتیں کرتا ہے اور جب لوگ تفریح کے لیے اس کے پاس آنے لگیں تو وہ الٹا محبوب سے گلہ کرتا ہے کہ،

اب مری دید کی دنیا بھی تمنائی ہے
تو نے کیا مجھ کو محبت میں بنا رکھا ہے

(حکیم ناصر)

ایسا معلوم ہوتا ہے گویا عاشق صاحب کوئی مافوق الفطرت شے بن گئے ہیں اور عنقریب ان پر ٹکٹ لگنے والا ہے۔ ایک طرف دیارِ عشق کی عظمت کو کیا سمجھے دوسری طرف "تو نے کیا مجھ کو محبت میں بنا رکھا ہے" فرق صاف ظاہر ہے۔

قدیم شاعروں کا عشق سچا، کھرا اور "نصابی ضروریات" کے عین مطابق ہوا کرتا تھا آج کی طرح نہیں کہ،

دل لگایا ہے دل لگی کے لیے

یہی وجہ ہے کہ اس زمانے کے عاشق خود دار بہت تھے اور دل کے معاملات برابری کی بنیادوں پر طے کرتے تھے مثلاً مومن نے کہا،

جب پاسِ وفا اسے ہمارا نہ رہا
ہم کو بھی خیال دوستی کا نہ رہا

پہلے شاعر اپنے محبوب کے جملہ حقوق صرف اپنے نام محفوظ رکھتا تھا اور اس سلسلے میں کسی صورت اپنا استحقاق مجروح نہیں ہونے دیتا تھا۔ اگر اسے وہم بھی ہوجائے کہ اس کے (ذاتی) محبوب کی کسی اور سے بھی علیک سلیک ہے تو وہ مارنے مرنے پر آمادہ ہوجاتا تھا۔ میر نے کہا،

بدگمانی ہے جس سے تس سے آہ
قصدِ شور و فساد ہے ہم کو

آج ہر طرف مصلحت کوشی کا دور دورہ ہے اس لیے ادب سے بھی خودداری عنقا ہوگئی۔ اب بھٹکے ہوئے محبوب کو ٹھکرانے یا اس سے باز پرس کرنے کے بجائے اس کی دلجوئی کی جاتی ہے؛

وہ جہاں بھی گیا لوٹا تو مرے پاس آیا
بس یہی بات ہے اچھی مرے ہرجائی کی

(پروین شاکر)

ہجر وصال کی کیفیات عشق کے لوازمات میں شامل ہیں عاشق کے لیے وصل میں بے شک راحت ہے لیکن ہجر کی کلفت، عشق میں شدت پیدا کرتی ہے اس لیے سچا عاشق اسے اپنے لیے ایک امتحان سمجھتا ہے۔ قدیم شعرا اس نازک مرحلے سے بڑی کامیابی کے ساتھ گزر جاتے تھے۔ غالب کا دھیما انداز ملاحظہ ہو،

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ہجر کی راتیں پرانے عاشقوں پر بھی آتی تھیں لیکن وہ اپنے آپ کو لیے دیے رہتے تھے۔ داغ نے کہا،

ہجر کی یہ رات کیسی رات ہے
ایک میں ہوں یا خدا کی ذات ہے

ہجر جب طول پکڑ جاتے تو پرانا شاعر احتجاج بھی کرتا تھا مگر سلیقے کے ساتھ۔ مثلاً مومن نے اپنی انا کی پاسداری کرتے ہوئے کہا،

کیا سناتے ہو کہ ہے ہجر میں جینا مشکل
تم سے بے رحم پہ مرنے سے تو آساں ہوگا

حد یہ کہ مزاح گو شاعر بھی ہجر کی حالت میں اپنی خودی کو بلند رکھتے تھے ظریف جبلپوری نے کہا،

جھوٹے عاشق جو ہیں آہ بکا کرتے ہیں
ہم شبِ ہجر میں اخبار پڑھا کرتے ہیں

آج جلد بازی کا دور ہے۔ انتظار کرنا تو آج کے انسان نے سیکھا ہی نہیں۔ عہدِ حاضر کے ایک معروف شاعر ہجر کی طوالت سے اتنے بے حال ہوگئے کہ انھوں نے ایک مکمل غزل اس موضوع پر لکھی جس میں اپنے محبوب کو بلانے کے لیے نت نئے جواز تراشے۔ ہر جواز اُن کی بے قرار طبیعت کا آئینہ دار ہے مثلاً، دل ہی دکھانے کے آ، چھوڑ کے جانے کے لیے آ، مجھ کو منانے کے لیے آ وغیرہ حتیٰ کہ آخری حربے کے طور پر انھوں نے محبوب کے ضمیر کو یہ کہہ کر جھنجھوڑا کہ،

کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم
تو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لیے آ

(احمد فراز)

شاید بے تابیٔ شوق کی یہ انتہائی منزل ہے کہ عاشق اپنے محبوب کو اپنے لیے نہیں بلکہ "زمانے کے لیے" بلائے، تقاضۂ وصل کا یہ عجب انداز ہے جیسے کوئی بچہ اپنی ماں سے ٹافی کے لیے ضد کرتا ہے۔! سنجیدہ شاعری کے ساتھ یہی انداز اب مزاحیہ شاعری میں بھی در آیا ہے چنانچہ دلاور فگار کہتے ہیں،

تو وصل کی شب پانچ بجے تک نہیں آیا
اب صبح ہے اب جھینپ مٹانے کے لیے آ

غالباً سنجیدہ شاعر سے یہی ایک جواز سہو اً رہ گیا تھا جسے مزاحیہ شاعر نے اپنے حق میں استعمال کرلیا۔

پرانے زمانے میں چونکہ لوگوں کے پاس وقت بہت ہوا کرتا تھا اس لیے وہ ایک وقت میں ایک کام پوری توجہ اور یکسوئی کے ساتھ کرتے تھے اور کرنے کے لیے ان کے پاس عشق سے بہتر کوئی کام نہ تھا لہٰذا عاشق ہمہ وقت عشق کے سمندر میں غو

خوری کرتا رہتا تھا۔ مصحفی نے عشق اور عاشق کو لازم و ملزوم قرار دیتے ہوئے کہا،

جدا نہیں کسی حالت میں عشق عاشق سے
کہ ساتھ عشق کے ہے التزام عاشق کا

آج عشق اس طرح کیا جاتا ہے جیسے کوئی خالی وقت میں تاش کی بازی جمالے۔ آج کے عشق کا کمرشل انداز ملاحظہ ہو،

عشق نے سیکھ ہی لی وقت کی تقسیم کہ اب
وہ مجھے یاد تو آتا ہے مگر کام کے بعد

(پروین شاکر)

اس کے برعکس ماضی میں عشق ایک فل ٹائم معزز پیشہ تھا اس لیے عشاق حضرات دیگر معاشی سرگرمیوں سے حتیٰ المقدور پرہیز کرتے تھے علاوہ ازیں ان کی معاشی ضروریات بھی محدود تھیں مثلاً امانت لکھنوی کی خوراک دیکھیے،

حسابِ آب و دانہ حشر میں ہوگا تو کہہ دوں گا
پیا ہے عمر بھر خونِ جگر، غم میں نے کھایا ہے

کچھ اسی قسم کا مینو "خدائے سخن" میر صاحب کا تھا،

غم و غصہ ہے حصے میں میرے
اب معیشت ہے ان ہی کھانوں پر

چنانچہ عام معیشت سے اپنا رشتہ توڑ کر ماضی کا عاشق خود کو اپنے محبوب کی یاد سے نتھی کر لیتا ہے جیسا کہ ناسخ نے کہا تھا،

وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں
ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں

آج کے صنعتی دور نے انسان کی ضروریات اور پھر مصروفیات اتنی بڑھا دی ہیں کہ اسے اپنا محبوب بھی یاد نہیں رہتا۔ اب دل سے زیادہ پیٹ کی اہمیت ہوگئی ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ فیض صاحب کی اس صاف گوئی پر دوسری جانب کا ردِعمل کیا رہا ہوگا،

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کردیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

شراب بھی اردو شاعری کا ایک پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ قدیم شاعروں نے مے نوشی کو ہمیشہ اپنے لیے ایک اعزاز سمجھا۔ مثلاً درد نے کہا،

تردامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

ریاض خیر آبادی جنھیں اردو شاعری میں "خمریات کا امام" کہا جاتا ہے اور جن کے بارے میں مشہور ہے کہ شراب کو چھوا تک نہ تھا اپنی مے خواری پر ان الفاظ میں فخر کرتے ہیں،

مری شراب کی کیا تجھ کو قدر اے واعظ
جسے میں پی کے دعا دوں وہ جنتی ہوجائے

دورِ گزشتہ کے ایک شاعر نے شراب کی "فضیلت" میں یہاں تک کہا کہ،

یہ مئے کدہ ہے ترا مدرسہ نہیں واعظ
یہاں شراب سے انسان بنائے جاتے ہیں

دراصل قدیم دور میں (اور اس کے بعد بھی کچھ عرصہ تک) شاعری میں معرفت کی شراب پی جاتی تھی یا پھر شاعر اصطلاحاً شراب پی لیتے تھے بقول حضرت فنا کانپوری،

میں شرابی نہیں ہوں شاعر ہوں
اصطلاحاً شراب پیتا ہوں

اصلی شراب سے بچنے کی تاکید ذوق نے اس طرح کی تھی،

اے ذوق دیکھ دخترِ رز کو نہ منہ لگا
چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

آج کے عملی دور میں ہر کام اپنی اصلی صورت میں انجام پاتا ہے چنانچہ آج کا شاعر (عموماً) وہی چیز پیتا ہے جو پینی چاہیے (ہمارے اس دعوے کی تصدیق دوبئی کے شاعروں کی کیسٹس سے بھی کی جاسکتی ہے) یوں بھی جیسا کہ مشتاق یوسفی نے کہیں لکھا ہے "شراب مردوں کا مشروب ہے، دودھ بچوں کا مشروب ہے اور پانی چوپایوں کا" چنانچہ اس دور کے ایک شاعر نے مہنگائی اور تنگ دستی کے باوجود کہا،

ہر چند کے حالات اجازت نہیں دیتے
پی لیتا ہوں پھر بھی کبھی دوچار روپے کی

(کرار نوری)

(ہمارے خیال میں قافیہ تنگ ہوجانے کی وجہ سے شاعرؔ نے اپنے شوق کے اخراجات کے بارے میں غلط بیانی سے کام لیا ہے ورنہ اس قیمت میں شاید شربت بھی نہ دستیاب ہو) شاعر ایک لحاظ سے اپنے قاری کی رہنمائی بھی کرتا ہے اور بعض اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں اسے مفید مشوروں سے نوازتا ہے چنانچہ ایک جدید شاعر نے اپنے ایک شعر میں باتوں ہی باتوں میں "مردانہ مشروب کی تاثیر کو دوچند کرنے کا تیر بہ ہدف نسخہ تجویز کردیا،

غم دنیا بھی غم عشق میں شامل کر لو ....
نشہ بڑھتا ہے شرابیں جو شرابوں میں ملیں

(احمد فراز)

پرانے زمانے کے لوگوں میں تواضع اور انکسار بہت تھا۔ گفتگو، نشست و برخاست اور آمد و رفت میں آداب کو ملحوظِ نظر رکھتے تھے۔ شاعر اپنے محبوب کی آمد پر دیدہ و دل فرش راہ کردیا کرتے تھے۔ اُس دور کے ایک شاعر نے اپنے محبوب کی پذیرائی میں کہا،

تنہا نہ گل ہی کھولے ہیں آنکھوں کو چاہ میں
پلکیں بچھائے خار بھی ہیں عین راہ میں

آتش نے محبوب کی راہ میں خود اپنی آنکھیں بچھادیں

لیکن بقول علامہ اقبال "احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات" چنانچہ صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ معاشرتی اقدار گرتی گئیں اور انسان اخلاق و آداب سے دور ہوتا گیا۔ آج کا شاعر اپنے محبوب کا "والہانہ استقبال" اس طرح کرتا ہے،

انہی پتھروں پہ چل کے اگر آسکو تو آؤ
مرے گھر کے راستے میں کہیں کہکشاں نہیں ہے

(مصطفٰے زیدی)

(بھئی انسان گڑ نہ دے گڑ کی سی بات تو کردے حد ہوتی ہے کُھرے پن کی بھی....!)

قدیم ادب کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ اس دور کے شاعر آج کے مقابلے میں جمہوریت پسند تھے۔ وہ اکثریت کی رائے کا احترام کرتے تھے جیسا کہ ذوق نے نصیحت کی،

بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو
زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

ایک اور پرانے شاعر (قدیر لکھنوی) نے زمانے کا ساتھ یوں دیا،

ماضی قریب تک کیفیت یہ تھی کہ شاعر اپنے محبوب کو "بغاوت" پر آمادہ کرتے ہوئے بھی دنیاداری کے تقاضے بنھاتے تھے اور "پُرامن بقائے باہمی" کے اصول کو مدِ نظر رکھتے تھے۔ چنانچہ ساحر لدھیانوی نے محبوب کو یہ مشورہ دیا،

تم میں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کردو
ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کرلو

آج کے جمہوری دور کا شاعر یک طرفہ بات کرتا ہے اور محبوب کو بھی اکساتا ہے کہ وہ دنیا والوں کی باتوں کو خاطر میں نہ لائے،

چاہت میں کیا دنیا داری عشق میں کیسی مجبوری
لوگوں کا کیا سمجھانے دو ان کی اپنی مجبوری

(محسن بھوپالی)

قناعت پسندی بھی قدیم شاعری کا خاصہ تھی شاعر کو محبوب تک رسائی نہ ہوتی تھی تو اس کی تصویر سے کام چلالیتا تھا،

دل کے آئینے میں ہے تصویر یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

ایک اور شاعر نے اپنی قانع اور بے نیاز طبیعت کا اظہار یوں کیا،

کھلی نہیں ہیں زمانے پہ چوریاں میری
میں بزم سے ترا نقشہ چرا کے لایا ہوں

پھر ایسا وقت آیا کہ حقیقت نے مجاز کا روپ دھار لیا چنانچہ عاشق کے نزدیک محبوب کی تصویر کی اہمیت ختم ہو گئی اور وہ کہہ اٹھا:

تصویر تیری دل میرا بہلا نہ سکے گی
یہ تیری طرح مجھ سے تو شرما نہ سکے گی

(فیاض ہاشمی)

(اس ابتدائی فرماحضوری کی بعد شاعر نے دو ٹوک الفاظ میں کہہ دیا، پرچھائیں توانسان کے کام آنہ سکے گی)

الغرض کیا ادب کیا سیاست، کیا معیشت ہر شعبے میں انسانی فکر و عمل کی کایا پلٹ چکی ہے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ اس ادبی جائزے میں ہم سے کہیں کہیں بے ادبی سرزد ہوئی ہے۔ اس میں بہت کچھ کھینچ تان کا بھی سہارا لیا گیا ہے۔ لیکن ہمیں امید ہے کہ صاحبِ ذوق قارئین اور "متاثرینِ ادب" اسے ادبی منہ شگافی سمجھ کر درگذر فرمائیں گے اور مضمون کو اس جذبے کے ساتھ پڑھیں گے بقول داغ،

دوست یک رنگ جو یکجا کہیں مل بیٹھتے ہیں
لطف کے ساتھ گزر جاتی ہے صحبت کیسی

قومی زبان (۵۱) مئی ۱۹۹۴ء

بوڑھا پھیری والا

برنارڈ مالمڈ/ پروفیسر عبد السلام

کینال اسٹریٹ پر گشت کرتی پولیس کی گاڑی نے گرمیوں کی صبح ایک موڑ کاٹا۔ گاڑی میں بیٹھے دو پولیس والوں میں سے ایک نے سڑک کے کنارے چلتے کالے ڈربی ہیٹ پہنے ایک بوڑھے کو انگلی کے اشارہ سے پاس آنے کے لیے کہا۔ بوڑھے نے ایک بڑا بکس لمبے کپڑے کی پٹی کی مدد سے اپنے کاندھے پر لٹکا رکھا تھا دوسرا چھوٹا بکس اس نے اپنے ہاتھ سے پکڑا ہوا تھا۔

"اوئے ادھر آؤ"

لیکن پھیری والے بوڑھے نے یا تو سنا ہی نہیں یا پھر وہ توجہ نہیں دینا چاہتا تھا۔ اُس نے چلنا جاری رکھا۔ اس پر نوجوان پولیس والا پھرتی سے گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر کودا۔ تیز قدموں سے چلتا بوڑھے کے پاس پہنچا اور بوڑھے کے کاندھے سے لٹکے بکس کو ٹھوکا مارتے ہوئے اپنے ہاتھوں کی پوری طاقت سے بوڑھے کو اپنی طرف اس طرح گھمایا جیسے وہ گھاس پھونس کا بنا ہوا ہو بوڑھے پھیری والے نے حیرت اور خوف سے نوجوان پولیس والے کو دیکھا۔ بوڑھا بہت نحیف اور دبلا پتلا تھا لیکن اس کی آنکھیں بڑی روشن اور چمکدار تھیں۔ ایک لمحہ کے لیے نوجوان پولیس والا پھر بولا۔

"کیا تم بہرے ہو"

بوڑھے پھیری والے کے ہونٹ اس طرح ہلے جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ ہاں وہ بہرہ ہے۔ لیکن آخر کار اُس نے چلا کر کہا۔

"تم نے مجھے دھکا کیوں دیا۔" بوڑھے پھیری والے نے اپنی گرج دار آواز سے نوجوان پولیس والے کو ایک مرتبہ پھر حیرت زدہ کر دیا۔

"جب میں نے تمھیں پکارا تھا تو تم رکے کیوں نہیں؟"

"کب پکارا تھا۔ کیا تم نے میرا نام لیا تھا" بوڑھے پھیری والے نے اپنے چھدرے پیلے دانتوں کو بھینچ کر کہا۔

"اور تمھارا لائسنس کہاں ہے؟"

"کون سا لائسنس؟ کیسا لائسنس؟"

"چالاک مت بنو۔ پھیری لگانے کا لائسنس۔" "ہم نے تمھیں چیزیں بیچتے ہوئے دیکھا ہے۔" بوڑھا پھیری والا خاموش رہا۔ اُس نے اس الزام کو نہیں جھٹلایا۔

"اس بڑے بکس میں کیا ہے؟"

"سوولٹ"

"کیا چیز۔ کیا کہا تم نے؟"

"بجلی کے سوواٹ کے بلب"

"اور دوسرے میں؟"

"ساٹھ واٹ"

"کیا تمھیں پتہ نہیں کہ بغیر لائسنس پھیری لگانا جُرم ہے؟"

بوڑھے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بوڑھے نے چاروں طرف نظر دوڑائی لیکن وہاں گاڑی میں بیٹھے ادھیڑ عمر کے اونگھتے پولیس والے کے کوئی دوسرا نہیں تھا۔ نوجوان پولیس والے نے اپنی نوٹ بک کھولی۔

"بکس خالی کرو۔ کہاں رہتے ہو؟"

"بوڑھے نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"جلدی کرو۔ لیئو۔" گاڑی میں بیٹھے ادھیڑ عمر پولیس والے نے چلا کر کہا۔

"ایک سیکنڈ۔ والٹر۔ یہ بوڑھا بڑا اڑیل ہے۔"

نوجوان پولیس والے نے اپنی پنسل سے بوڑھے کو ٹھوکا دیا۔ بوڑھا اب بھی نیچے زمین کو تک رہا تھا۔ لیکن آخر کار وہ بر... اس کے پاس لائسنس بنانے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔

"لیکن تمھارے پاس بلب خریدنے کے لیے تو پیسے ہیں۔ کیا تمھیں پتہ نہیں ہے کہ تم اپنی قانونی فیس ادا نہ کر کے اس شہر کے ساتھ دھوکا کر رہے ہو" بوڑھے نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"بولو"

"جلدی کرو۔ لیئو۔" گاڑی میں بیٹھا ادھیڑ عمر پولیس والا پھر چلّایا۔

"یار تم خود یہاں آجاؤ۔ یہ بوڑھا بکرا تو بول کر ہی نہیں دیتا"

دوسرا پولیس والا آہستہ سے گاڑی سے باہر آیا۔ وہ بھاری بھر کم جسامت اور بھورے بالوں والا شخص تھا۔ اس کا چہرہ پسینے سے چمک رہا تھا۔

"بابا۔ آپ اس کے سوالوں کا جواب کیوں نہیں دیتے۔"

بوڑھا پھیری والا اپنے جسم کو اکڑائے دونوں پولیس والوں کو گھورتا رہا۔ اس وقت تک وہاں کافی لوگ جمع ہو گئے تھے۔ لیکن لیئو نے ہاتھ کے اشارے سے ان کو بھگا دیا۔

"ٹھیک ہے۔ والٹر۔ مجھے ہتھکڑی دو۔ یہ بوڑھا تھانے جائے گا۔"

والٹر نے نوجوان پولیس والے کو غیر یقینی انداز سے دیکھا۔

"پولیس کے کام میں مداخلت۔"

نوجوان پولیس والے نے بوڑھے کا بازو پکڑا اور اس کو چلنے کا اشارہ کیا۔ بلبوں کا بکس بوڑھے کے شانے سے نیچے گر پڑا تھا۔ خود بھی گھٹنوں کے بل گرا۔ والٹر نے لیئو کی مدد کی اور ان دونوں نے بوڑھے کو گاڑی کی پچھلی نشست پر ڈالا۔ نوجوان پولیس والے نے بڑے بکس کو کھینچ کر گاڑی کے پچھلے حصے میں رکھا۔ جیسے ہی گاڑی روانہ ہوئی ایک اسٹور کے سامنے کھڑے ہوئے ایک

آدمی نے چھوٹا بکس اٹھایا چلا کر کہا "جناب آپ یہ بکس بھولے جا رہے ہیں۔" لیکن دونوں میں سے کسی نے اس کی آواز نہیں سنی۔ اور بوڑھا۔ وہ تو ایسے لگتا تھا جیسے وہ سننا ہی نہ چاہتا ہو۔

پولیس اسٹیشن جاتے ہوئے وہ بروک لین پل سے گزرے۔

"ایک سیکنڈ لیئو۔ پُل پار کرنے کے بعد گاڑی موڑ کر میرے گھر کے سامنے روک دینا۔ میں پسینہ میں نہا گیا ہوں اور قمیض تبدیل کرنا چاہتا ہوں۔

"جی نہیں۔ بعد میں جب ہم اس کمبخت بوڑھے کو حوالات میں بند کردیں۔" لیکن والٹر نے اپنی بات زور دے کر دہرائی اور کہا کہ اس وقت تک بہت دیر ہو جائے گی۔ لیئو۔ والٹر کو جانے نہیں دینا چاہتا تھا لیکن آخر کار اس نے ہار مان لی۔ والٹر کا گھر پل سے زیادہ دور نہیں تھا۔ دونوں نے کوئی بات نہیں کی۔ جب والٹر گاڑی سے اترا تو اس نے بوڑھے پھیری والے سے کہا۔

"اگر تم جرمنی ہوتے تو وہ لوگ تمھیں قتل کر دیتے۔ ہم تو صرف اتنی ہی قانونی کارروائی کر رہے ہیں جس کے نتیجہ میں تمھیں زیادہ سے زیادہ ایک ڈالر جُرمانہ ہوگا۔" تھوڑی دیر کے انتظار کے بعد لیئو بے چین ہوگیا۔ اور زور زور سے ہارن بجانے لگا۔ دوسری منزل کی کھڑکی کھلی اور والٹر نے انڈر ویئر پہنے جھانکا۔

"صرف پانچ منٹ لیئو۔ میں اپنا پسینہ خشک کر رہا ہوں"

والٹر چاق و چوبند تیز قدموں کے ساتھ واپس آیا۔ گاڑی دوبارہ پل پر آئی۔ ٹریفک رش کی وجہ سے گاڑی کو آہستہ کرنا پڑا۔ بوڑھے نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ اور پل کی ریلنگ کی طرف دوڑا۔ وہ معجزانہ طور سے مخالف سمت سے آتے ہوئے ٹرالرز اور ٹرکوں کی زد میں آتے آتے بال بال بچا۔ وہ کودتا ہوا فٹ پاتھ پر آیا اور پل کی ریلنگ پر چڑھ گیا۔ لیئو نے پھرتی کے ساتھ بوڑھے کا پیچھا کیا اور اس کے کوٹ کا پچھلا کونہ پکڑ کر اس کو اپنی طرف کھینچا۔ بوڑھا پل سے چھلانگ لگانے کے لیے تیار تھا۔ لیئو نے ایک جھٹکے کے ساتھ نیچے زمین کی طرف کھینچا۔ بوڑھا زمین پر گرا اور اس کا سر فٹ پاتھ سے ٹکرایا۔ بوڑھے کا ڈربی ہیٹ اچھل کر دور گرا۔ لیکن بوڑھا بے ہوش نہیں ہوا۔ بوڑھا زمین پر لیٹا کراہتا رہا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ اور سینہ نوچتا رہا۔ دونوں پولیس والے حیرت زدہ انداز میں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ اسی دوران ایک بوڑھی عورت وہاں سے گزری جو کہ شدید گرمی کے باوجود سر پر شال اوڑھے تھی۔ اس کے کندھے سے ایک ہینڈل والی ٹوکری لٹکی ہوئی تھی جس میں پانچ سینٹ کے نمکین بسکٹوں کے پیکٹ بھرے ہوئے تھے۔ بوڑھی عورت رکی تاکہ معلوم کر سکے کہ کیا ہوا۔ وہ زمین پر گرے ہوئے بوڑھے کو دیکھتے ہی چلائی۔

"بلواسٹائن۔" لیکن بوڑھے نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ لگاتار اپنا سینہ پیٹتا رہا۔

"کیا آپ اس کو جانتی ہیں۔" لیئو نے پوچھا۔

"ہاں یہ بلواسٹائن ہے۔ ہمارے محلہ میں رہتا ہے۔"

"کہاں؟"

عورت نے تھوڑی دیر سوچا۔ میرے والد کہا کرتے تھے کہ بلواسٹائن سیکنڈ ایونیو پر واقع ایک بڑے جنرل اسٹور کا مالک تھا لیکن اس کا کاروبار تباہ ہوگیا پھر اس کی بیوی مر گئی اور لڑکی آگ میں جل کر مر گئی۔ اب اس کو لاعلاج خارش کی بیماری ہے۔ لوگ

"کیا تمھیں اس کا پتہ معلوم ہے"

"نہیں۔ لیکن اس نے کیا کیا ہے؟"

"جو کچھ بھی اس نے کیا ہے اس سے یہ سزا سے نہیں بچ سکتا ہے۔" والٹر بولا

"خدا حافظ! بلواسٹائن! مجھے اسکول پہنچنا ہے۔" بوڑھی عورت نے معذرت کی۔ اپنی بسکٹوں کی ٹوکری اٹھائی اور چل دی۔ اب بوڑھے نے اپنا منہ اور سینہ نوچنا بند کر دیا تھا۔ وہ سکون سے زمین پر لیٹا رہا۔ سورج کی تیز شعاؤں کے باجود بوڑھے نے اپنی آنکھیں نہیں جھپکائیں تھیں۔

"اسے جانے دو" والٹر نے کہا۔

انھوں نے بوڑھے کو اس کے قدموں پر کھڑا کیا۔ اس کے کوٹ سے مٹی جھاڑی۔ اس کا مڑا تڑا ہیٹ اس کے سر پر رکھا۔ انھوں نے بوڑھے کو گاڑی میں بٹھایا اور چند ہی منٹ بعد بوڑھے کو اس کے بلبوں والے بکس کے ساتھ ٹھیک اسی جگہ چھوڑا جہاں سے اس کو پکڑا تھا۔

لیکن اُس رات جب ایک ساتھ اپنا گشت مکمل کرنے کے بعد لینو نے والٹر کو اُس کے گھر کے سامنے اتارا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اُس نے بوڑھے کو اس کے مکان کے سامنے کھڑے پایا۔

"سنو لینو!" والٹر نے لینو کو روکنا چاہا لیکن بوڑھے لینو نے نہیں سنا اور تیزی سے گاڑی نکال کر لے گیا۔ اب والٹر کو تنہا ہی بوڑھے کا سامنا تھا۔ بوڑھا اپنے بلبوں کے بکس کے ساتھ بالکل ویسا ہی دکھائی دیا جیسے آج صبح سوائے ایک فرق کے ساتھ کہ اب اس کا ڈربی ہیٹ تڑا مڑا تھا اور چہرے پر تھکن کے آثار تھے۔

"تمھیں کیا چاہیے" والٹر نے پوچھا۔

بوڑھے کے ہونٹ ہلے۔ اس نے بلبوں کے بکس کی طرف اشارہ کیا۔ "میرے بلبوں کا چھوٹا بکس"

"کیا۔ کیا ہوا اس کو؟"

"کہاں ہے۔ کیا کیا تم نے اس کا؟؟"

والٹر نے تھوڑی دیر غور کیا تو اس کو بوڑھے کا چھوٹا بکس یاد آیا۔

"تمھیں یقین ہے کہ تم نے اس کو کہیں اور نہیں چھپایا؟" والٹر نے سختی سے پوچھا بوڑھے نے والٹر کی طرف دیکھا تک نہیں۔ والٹر کو شدید گرمی کا احساس ہوا۔

"ٹھیک ہے ہم کوشش کریں گے تلاش کرنے کی۔ لیکن پہلے میں رات کا کھانا کھانا چاہتا ہوں، مجھے سخت بھوک لگی ہے۔"

والٹر زینے پر چڑھا۔ وہ مڑ کر بوڑھے سے کچھ اور کہنا چاہتا تھا۔ لیکن اوپر سے ایک خاتون آئی تو وہ اپنا ہیٹ اتار کر اس کی طرف مسکرایا اور دروازے میں داخل ہوگیا۔ کھانے کے بعد اس کی خواہش تھی کہ وہ تھوڑی دیر آرام کرتے ہوئے ریڈیو سُنے۔ اس نے اپنی وردی اتار کر گھر کے کپڑے پہنے اور بیوی سے کہا کہ ذرا کونے تک جارہا ہوں۔ اس کے سینہ پر ایک بوجھ تھا بوڑھا ٹھیک اسی جگہ موجود تھا جہاں اس نے اس کو چھوڑا تھا۔

"چلو میری گاڑی گیراج میں ہے۔" بوڑھا اپنے بکس کے ساتھ والٹر کے پیچھے پیچھے آیا۔ گیراج میں آکر والٹر نے بوڑھے کو گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بوڑھے نے اپنا بکس گاڑی کے پچھلے حصہ میں ڈالا اور خود بھی بیٹھ گیا۔ والٹر گاڑی چلاتا ہوا پُل پار کرتا

اُس جگہ آیا جہاں سے اُس نے بوڑھے کو اٹھایا تھا۔ اُس نے گاڑی پارک کی اور باری باری سامنے کی تینوں دو کانوں میں گیا اور اپنا پولیس کارڈ دکھاتے ہوئے دریافت کیا کہ کسی نے بوڑھے کا بکس تو نہیں دیکھا۔ کسی کو بھی پتہ نہیں تھا سوائے تیسری دکان کے ایک کلرک کے جس نے بتلایا کہ شاید بکس محلہ کے ایک شخص کے پاس ہے۔ کلرک نے اس شخص کا پتہ دیا۔ اپنی گاڑی میں واپس آنے کے بعد والٹر ایک بار میں گیا اور کئی گلاس بیئر کے حلق میں انڈیلے۔ بیئر کا چوتھا گلاس پینے سے پہلے والٹر کو ایک خیال آیا اس نے تھانے فون کر کے کلرک سے پوچھا کہ وہاں بلبوں کا کوئی چھوٹا بکس تو نہیں ہے۔ کلرک نے جواب دیا کہ آج اس نے کوئی بکس وصول نہیں کیا۔ واپس آکر والٹر نے بوڑھے سے پوچھا کہ بکس میں کتنے بلب تھے۔

"پانچ درجن۔"

"کیا قیمت ہوئی۔ قیمتِ خرید۔ ہول سیل میں"

"آٹھ سینٹ"

"اس کا مطلب ہوا چار ڈالر اسّی سینٹ۔" والٹر نے اپنے پرس سے پانچ ڈالر کا نوٹ نکالا اور بوڑھے کے حوالے کیا۔ لیکن بوڑھے نے اُسے قبول نہیں کیا۔

"کیا چاہتے ہو خبیث بڈھے۔"

"میرا چھوٹا بکس۔"

"میرا خیال ہے کہ تمھیں گاڑی میں گھومنے کا شوق ہے" والٹر نے کلرک کے دیئے ہوئے پتہ پر گاڑی روکی۔ لیکن وہاں کسی کو اُس شخص کے بارے میں پتہ نہیں تھا جس کے پاس بلبوں کا بکس دیکھا گیا تھا۔ آخر کار نیکر پہنے ایک گنجا شخص اوپر کی منزل سے آیا اور والٹر سے کہا کہ اس کو جس شخص کی تلاش ہے وہ اس کا چچا ہے۔ والٹر نے چچا کو یقین دلایا کہ کوئی سنگین معاملہ نہیں ہے۔ اتفاقاً وہ بلبوں کے اس بکس کے بارے میں معلومات رکھتا ہے جو کہ وہ غلطی سے سڑک پر بھول گیا جب وہ ایک بوڑھے کو گرفتار کر کے تھانے لے گئے تھے۔ چچا نے کہا کہ اس کا بھتیجا اس وقت ایک کلب میں موجود ہوگا۔ لیکن وہ اُس کلب کا پتہ صرف اُسی صورت میں دے سکتا ہے جبکہ معاملہ سنگین نوعیت کا نہ ہو۔ والٹر کو جو پتہ دیا گیا وہ شہر کے شمالی حصّہ کا کافی فاصلہ کا پتہ تھا۔

"اوخدایا یہ تو میری بیوقوفی والی حرکتیں کر رہا ہوں" والٹر بڑبڑایا۔ واپس اپنی گاڑی کی طرف آتے ہوئے والٹر نے سوچا کہ اگر وہ یہ کام سستی سے کرے تو شاید بوڑھا عاجز آکر خود ہی دفع ہو جائے۔ لہٰذا اُس نے ایک بار کے سامنے گاڑی روکی اور کئی گلاس بیئر پی۔ اسی دوران T.V پر دس راؤنڈ کی مکمل کُشتی بھی دیکھی۔ وہ پسینہ میں شرابور بار سے باہر آیا۔ لیکن بوڑھا اسی طرح گاڑی میں موجود تھا۔ والٹر نے اپنی بغلوں کو کھجایا۔

"کھجلی کے لیے کون سی چیز مفید ہے" والٹر نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بوڑھے سے دریافت کیا۔ والٹر نے ہلکا سا خفیف سا نشہ محسوس کیا۔ اب وہ بڑے اطمینان سے گاڑی چلا رہا تھا وہ شہر سے کافی فاصلہ پر واقع اُس کلب پر آیا جہاں اب بھی رقص جاری تھا۔ اُس نے ٹکٹ کلرک سے بھتیجے کے بارے میں معلوم کیا۔ ٹکٹ کلرک نے جواب دیا کہ اُس نام کا کوئی بھتیجا اُس وقت کلب میں موجود نہیں ہے۔

"کوئی سنگین بات نہیں ہے سوائے اس کے کہ بھتیجے کو بلبوں کے اُس بکس کے بارے میں علم ہے جس کا مالک وہ خبیث بوڑھا ہے جو باہر میری گاڑی میں بیٹھا ہے۔" والٹر نے کہا۔

"مجھے کچھ معلوم نہیں" کلرک بولا۔

"چلو کوئی بات نہیں۔" والٹر چند منٹ دروازے میں کھڑا رقاصوں کو دیکھتا رہا لیکن وہ وہاں کسی کو بھی نہیں پہچان سکتا تھا۔ تھوڑے توقف کے بعد والٹر نے کہا کہ اس کو رقص پسند آیا لیکن وہ وہاں زیادہ دیر رک نہیں سکتا۔

"تھوڑی دیر تو رُکیے۔"

"نہیں۔ آج رات میری ایک خبیث بوڑھے سے DATE ہے۔"

"تم ابھی تک موجود ہو۔" والٹر نے واپسی پر بوڑھے سے دریافت کیا۔

والٹر نے اپنی گاڑی کو چھٹی ایونیو پر واقع ایک بار کے سامنے روکا اپنے لیے ایک وسکی خریدی۔ گاڑی میں واپس آکر اُس نے بوتل کا کارک کھولا اور ایک لمبا گھونٹ بھرا "پیو۔" والٹر نے بوڑھے بلواسٹائن کو دعوت دی۔ بوڑھا بلواسٹائن جو کہ گاڑی کی پچھلی نشت پر ایک نحیف اُلو کی طرح پیلا سا بیٹھا تھا۔ گھور کر والٹر کو دیکھا والٹر نے بوتل کا کارک دوبارہ لگایا۔ لیکن گاڑی اسٹارٹ نہیں کی۔ وہ کافی دیر اسٹیرنگ وہیل پکڑے محویت کے عالم میں بیٹھا رہا ٹھیک اس لمحہ جب اُسے کوفت محسوس ہوئی تو اُسے ایک خیال آیا۔ اُسے وہ خیال اتنا اچھا اور سادہ لگا کہ فوراً گاڑی اسٹارٹ کی اور دوبارہ شہر کی طرف واپس مڑا۔ وہ شہر کے اُس علاقے میں آیا جہاں رات کے وقت بھی ہارڈویر کی دکانیں کھلی رہتی ہیں۔ اُس نے گاڑی ایک ہارڈویر اسٹور سے تقریباً ٹکرا ہی دی تھی۔ دس منٹ کے بعد وہ ایک ملفوف بکس کے ساتھ واپس آیا جس میں ساٹھ واٹ کے پانچ درجن بلب تھے۔

"مفت کی تفریح ختم ہوئی دوست"

بوڑھا پھیری والا گاڑی سے باہر آیا۔ والٹر نے اپنی گاڑی سے بڑا بکس نکال کر سڑک کے کنارے چھوٹے بکس کے ساتھ رکھ دیا۔ اور تیزی کے ساتھ گاڑی آگے کی طرف دوڑا کر لے گیا۔ پُل پر گاڑی چلاتے ہوئے والٹر نے اپنے آپ کو ہلکا محسوس کیا۔ وہ سونے کے لیے بے چین تھا کیونکہ دوسرے دن صبح اُسے چھ بجے ڈیوٹی پر جانا تھا۔ والٹر نے گاڑی گیراج میں کھڑی کی اور زینہ پھلانگتا مکان میں داخل ہوا۔ وہ گھر میں بہت احتیاط سے چل رہا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے بیٹے اور بیوی کو جگانا نہیں چاہتا تھا۔

کپڑے تبدیل کرنے کے بعد جب وہ اپنے بستر میں لیٹا تو شدید گرمی کے باوجود اُس نے جسم کو برف کی طرح سرد محسوس کیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بستر سے اٹھا اور شیڈ کھول کر کھڑکی کے نزدیک کھڑا ہو گیا۔ خاموش سڑک چاندنی میں بھیگی ہوئی تھی۔ اور درختوں کے سیاہ سائے چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے۔ مکان کے سامنے والے درخت کے سائے میں اُس کو ایک ٹیڑھا میڑھا بھدا سایہ نظر آیا۔ والٹر نے اپنا گاؤن اور سلیپر پہنا اور دوڑتا ہوا نیچے آیا۔

"اب کیا بات ہوئی۔"

بوڑھا بلواسٹائن سڑک کے کنارے کھڑا اُس کو گھورتا رہا۔

"اب کیا چاہیے؟" بوڑھا خاموش رہا۔

"بہتر ہو گا بلواسٹائن کہ تم اب یہاں سے چلے جاؤ۔ مزید گزر بسر کرنے کے لیے رات کا یہ پچھلا پہر موزوں نہیں ہے۔ تمھیں تمھارے بلب مل گئے ہیں۔ بہتر ہو گا کہ تم اپنے گھر جاؤ اور میرا پیچھا چھوڑو۔ مجھے پولیس بلانے سے نفرت ہے۔ جاؤ اپنے گھر جاؤ۔ والٹر لڑکھڑاتے ہوئے زینہ چڑھ کر اوپر آیا۔ اس نے اپنے بیڈ روم میں اپنے بیٹے کے کراہنے کی آواز سنی والٹر لیٹا اور سو گیا۔ لیکن جلد ہی بارش کی آواز سے جاگ گیا۔ کھڑکی پر آکر اس نے نیچے کی طرف دیکھا۔ بوڑھا بلواسٹائن بارش میں کھڑا پہلے کی طرح موجود تھا۔

اُس نے اپنا چہرہ اوپر کھڑکی کی طرف اٹھائے رکھا تھا۔ والٹر کو اس کا چہرہ اتنا نزدیک لگا جیسے کہ وہ کھڑکی کی سِل پر کھڑا ہو۔
والٹر ہال کی طرف دوڑا۔ اس نے الماری سے چھتری تلاش کی جو اُسے نہ مل سکی اُس کی بیوی جاگ گئی۔ اور بلند سرگوشی میں بولی "کون ہے؟" وہ بے حرکت کھڑا رہا۔ اُس کی بیوی نے ایک منٹ انتظار کیا اور شاید دوبارہ اس کی آنکھ لگ گئی۔ چھتری نہ ملنے پر اس نے گرمیوں کا ایک کمبل نکالا اور کھڑکی کے پاس آکر اُس نے کمبل بوڑھے کی طرف اُچھالا۔
والٹر واپس اپنی خواب گاہ میں مصمم ارادہ کر کے آیا کہ اب وہ کئی گھنٹوں تک لگاتار سوئے گا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے محسوس کیا کہ بارش تھم چکی ہے۔ وہ بوڑھے کو دیکھنے کے لیے اُٹھا۔ کمبل ٹھیک اسی جگہ سڑک کے کنارے پڑا تھا جہاں اس نے پھینکا تھا۔ بوڑھا بلواسٹائن درخت کے نیچے اسی طرح موجود تھا۔ والٹر سلیپر پہنے نیچے آیا گرمی کا زور اب کم ہوگیا تھا۔ سڑک پر ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ درخت کے پتے ہوا سے کانپ رہے تھے۔
"بلواسٹائن!" والٹر نے پکارا اُسے اپنی آواز کانپتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اُسے اپنے اندر خالی پن کا احساس ہوا۔ سڑک کے کنارے چلتے ہوئے والٹر نے تمام دن کی باتوں پر غور کیا آخر کار اُس نے اپنا سر اُٹھایا اور نرمی سے بولا۔
"بلواسٹائن! تمھاری معافی مجھ پر قرض ہے۔ مجھے دلی افسوس ہوا ہے کہ یہ سارا واقعہ ہوا۔ میں سو نہیں سکا ہوں۔ میں تم سے دل سے معافی چاہتا ہوں۔"
بلواسٹائن نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے جس میں چاند چمک رہا تھا اسے گھور کر دیکھا لیکن کوئی جواب نہیں دیا والٹر کو ایسا محسوس ہوا کہ بوڑھے کا جسم اور اس کے ساتھ اس کا سایہ بھی ڈھیلا پڑا ہے۔ والٹر نے بوڑھے کو الوداع کہا اور پھر اپنی خواب گاہ میں آکر سوگیا۔
"کیا بات ہے؟" اس کی بیوی نے پوچھا۔
"کچھ نہیں۔"
اس کی بیوی نے دوسری طرف کروٹ لی اور بولی "سنی کو مت جگانا۔"
"نہیں۔"
والٹر اٹھا اور کھڑکی کی طرف گیا۔ شیڈ کو اوپر کرتے ہوئے اس نے نیچے سڑک کی طرف دیکھا۔
"ہاں چلا گیا۔" بوڑھا پھیری والا ـــ اپنے بجلی کے بلبوں والے بکس کے ساتھ بمعہ کمبل اب وہاں موجود نہیں تھا۔
والٹر نے دوبارہ سڑک کو دیکھا لیکن چاندنی سے روشن لمبی سڑک اُس کو اس سے پہلے کبھی اتنی سنسان نہیں لگی تھی۔

انگریزی کہانی

تقدیر اور گولی

جیرالڈ کیرش / ڈاکٹر ممتاز احمد خان

یہ جنگ کا زمانہ تھا۔ ماحول میں گھٹن کا راج تھا اور کوئی شخص یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔

اسی زمانے میں میرے علاوہ تین اشخاص باتوں میں معروف تھے ہمارے ساتھیوں میں سے لمبوترے چہرے والے نے پوچھا۔

"مستقبل میں کیا ہونے والا ہے؟"

ہم میں سے چھوٹے سے قد والے کھردرے چہرے کے حامل شخص نے یہ تاثر دیا گویا وہ اس سوال کا جواب دینے والا ہو۔ ہم محسوس کرتے تھے جیسے کہ اس کا چہرہ ساگوان کی لکڑی کا بنا ہوا ہو۔ وہ منطقہ حارّہ کے علاقے میں رہنے والوں کی طرح زندگی کے سرد و گرم دیکھ چکا تھا۔ وہ ٹویڈ کے سوٹ میں ایسا لگ رہا تھا گویا سوٹ نے اسے پہن رکھا ہو۔ لوگ کہتے ہیں کہ کپڑوں سے انسان کی شخصیت نکھرتی ہے۔ مگر یہاں دوسرا معاملہ تھا۔ اس کے بال سفید تھے اور اس کی مونچھوں میں چاندی چمک رہی تھی۔ اس کے انداز گفتگو میں نیم دل آویزی کے ساتھ ساتھ تحکم بھی تھا۔ اس نے ہمارے ساتھی کے سوال کا زوردار انداز میں کچھ یوں جواب دیا۔

"دنیا میں کون جان سکتا ہے کہ کوئی واقعہ کس طرح شروع ہوتا ہے اور کس نہج پر جا کر ختم ہوتا ہے۔"

ماحول پر تقریباً دس منٹ خاموشی طاری رہی پھر وہ مزید بولا۔

"عجب بات ہے کہ جب میں چھوٹا تھا تو جانتا تھا کہ کوئی بات کس طرح شروع ہوتی ہے اور کہاں جا کر ختم ہوتی ہے لیکن جب پندرہ سال کا ہوا تو میں نے اندازہ لگایا کہ لوگ کسی بھی واقعہ کے آغاز اور اختتام کے بارے میں بتانے سے قاصر رہتے ہیں۔"

میں اور میرے دیگر ساتھیوں نے یہ اخذ کیا ہے کہ وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ ہم تینوں بھی کسی واقعہ کے آغاز و اختتام کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ پھر وہ خود ہی اپنے نقطہ نظر کو ثابت کرنے کے لیے ایک قصہ سنانے لگا۔

"یہ برسوں پرانی بات ہے۔ میں اس وقت چین میں تھا میں فوجی تھا اور اپنی ذاتی حیثیت میں چینی لوگوں کو پسند کرتا تھا۔ ایک رات جبکہ میں اسلحہ کے ڈپو پر تعینات تھا کہ میں نے کسی کی آہٹ سنی۔ ان دنوں اسلحہ کی چوری کے واقعات جاری تھے۔ یہ ڈپو سوکاؤ کریک پر واقع تھا۔ اس وقت تقریباً بارہ بج رہے تھے۔ چاند کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ ماحول پر پُراسرارت اور خوف کا راج تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک سایہ سا رینگ رہا ہے۔ میں نے وارننگ دی اور کہا کہ جو کوئی بھی ہو رک جائے ورنہ میں گولی چلا دوں گا وہ کوئی بوڑھا چینی تھا وہ بجائے رُکنے کے مخالف سمت بھاگنے لگا میں نے بلا جھجک اس کی ٹانگوں کا نشانہ لیا۔ میں اس وقت جوش میں تھا اس لیے کہ اس سے قبل میں نے کسی پر اس جرم پر گولی نہیں چلائی تھی۔ جب میں اس کے پاس

پہنچا تو دیکھا کہ وہ اوندھا پڑا تھا اور مر چکا تھا۔ گولی اس کے دل کے پار ہو چکی تھی!

"میں بہت اداس ہوا اس لیے کہ میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے پاس سے چند لوہے اور تانبے کے ٹکڑے ملے جن کی قیمت کوڑیوں کے برابر ہوگی۔ میرے ضمیر پر کچوکے لگنے لگے۔ میں جانتا تھا کہ وہ غریب اور مفلس چینی چاول خریدنے کے لیے ایسی حرکت کا مرتکب ہوا ہوگا۔

"وقت گزر گیا۔ میں نے فوج کی نوکری چھوڑ دی اور سنگاپور منتقل ہو گیا۔ میں نے شادی کر لی۔ میری بیوی بہت نفیس عورت تھی۔ وہیں پر مجھے باغات میں نوکری مل گئی اور میرا گزارہ بہت بہتر ہونے لگا۔ اسی اثنا میں میں نے ایک چینی لڑکی کو اپنے یہاں ملازم رکھ لیا۔ ساتھیو! میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ دنیا میں اس سے زیادہ بے زبان، وفادار اور محنتی شاید ہی کوئی دوسری ملازمہ ہو۔ یوں سمجھیے ایسی ملازمہ کا تذکرہ صرف پرانی کہانیوں میں ملتا ہے۔ میری بیوی اس پر بہت مہربان تھی۔

"شادی کے پانچ سال بعد میرے یہاں لڑکا ہوا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ میں زچگی کے لیے دنیا کے بہترین انتظامات کراؤں گا لیکن زچگی سے دو ماہ قبل مجھے ایک ضروری کام سے باہر جانا پڑ گیا۔ اتفاق سے یہ بچہ وقت سے قبل ہوا۔ اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ اگر یہ چینی ملازمہ نہ ہوتی تو شاید دونوں مر گئے ہوتے جبکہ آج میرا لڑکا تیس سال کا ہے اور ڈاکٹر ہے۔

"ساتھیو! اس لڑکی نے نہ صرف میری بیمار بیوی کی خدمت کی بلکہ فونٹین پین کے FILLER سے میرے نوزائیدہ جاں بلب بچے کو دودھ پلا پلا کر زندہ رکھا۔ مجھے ایسا لگا گویا وہ میری فیملی کی ڈاکٹر، نرس اور خادمہ سب کچھ تھی۔ ایک بات میں اور بتاؤں کہ اس واقعہ سے قبل میں اسے حقارت کی نگاہ سے دیکھتا تھا حالانکہ وہ انتہائی وفادار اور جفاکش تھی مگر اس واقعہ کے بعد میں نے اپنی حقارت سمیٹ لی اور اس کا دلی احترام کرنے لگا۔ ایک دن میں نے اسے بلایا اور اس کے ماضی کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ اس کا باپ بھی بہت محنتی اور جفاکش تھا۔ وہ مزدور تھا لیکن ہم لوگ اکثر بھوکے رہا کرتے تھے۔ ایک دن جبکہ ہم بھوک سے نڈھال تھے وہ ساؤ کریک کے اسلحہ کے ڈپو میں گھس گیا تاکہ لوہے اور تانبے کے چند ٹکڑے چوری کر کے بیچ کر ان کی رقم سے ہمارے پیٹ کی دوزخ کو بھر سکے۔ وہاں کسی ظالم انگریز گارڈ کی ڈیوٹی تھی اس نے میرے بے گناہ باپ کو گولی مار دی۔ یوں ہماری فیملی برباد و ویران ہو گئی۔ صرف میں زندہ بچی۔ مجھے ایک تاجر سنگاپور لے آیا۔ جناب عالی آپ نہ ہوتے تو میرا نہ معلوم کیا بنتا۔ آپ میرے محسن ہیں......

"میں اور اس کا محسن!!! ساتھیو۔ میں بھی کتنا بزدل ہوں کہ اسے یہ نہ بتا سکا کہ........

اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے۔ ہم لوگ کافی دیر تک خاموش رہے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پوچھا۔

"ساتھیو! کیا ہم مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات کی آگہی رکھتے ہیں اور کیا ہم ان کی ماہیت جان سکتے ہیں؟"

ہم لوگ حسب سابق خاموش ہی رہے۔

آخر میں وہ پھر بولا

"دوستو! ہمیشہ نیکی کرو اور پھر مستقبل سے اچھی توقعات وابستہ کرو......"

کس لیے روتے ہو تم؟

(ایک انگریزی نظم کا منظوم ترجمہ)

شاعر: رابن سن جیفرس
مترجم: ظہیر مشرقی

(مندرجہ ذیل نظم "کس لیے روتے ہو تم" دراصل اس کی نظم "BATTLE" کے ایک حصے کا ترجمہ ہے جو ۲۸ مئی ۱۹۴۰ء کو یعنی عالمی جنگ چھڑ جانے کے تقریباً نو ماہ بعد لکھی گئی تھی۔ یہ نظم جنگ کی ہولناکیوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔)

کس لیے روتے ہو تم اے جانِ جاں
کس لیے روتے ہو تم ؟
رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
دام میں تقدیر کے الجھی ہوئی ہے زندگی
بھاگتا ہے جو کوئی تقدیر سے
جانبِ تقدیر ہی اٹھتا ہے اس کا ہر قدم
جو بھی ہونا ہے وہ ہوگا، جو بھی ہونا تھا ہوا
کس لیے روتے ہو تم ؟
جنم لیتے ہیں اگر ہر روز لاکھوں آدمی
ان کا مرنا بھی ضروری ہے اسی تعداد میں
گھر کے بستر پر مریں یا جنگ کے میدان میں
فرق کچھ پڑتا نہیں
وقت کے ادوارِ لاحدود میں
کس لیے روتے ہو تم ؟
ہار جائے خواہ انگریز اور جرمن جیت جائے
خواہ پانسہ جنگ کا اپنے موافق ہی پڑے
کوہِ جہدِ بقا میں
شیر ہوگا صرف وہ کتا جو ہے سب سے قوی
انقلابِ دہر کا یہ ہے بدیہی اک اصول
کس لیے روتے ہو تم ؟
ہاں مگر جب آدمیت کا زوال
آدمی کو لا گرائے جانور کی سطح پر
تو سمجھ جاؤ قیامت آگئی
لیکن ایسا ہو نہیں سکتا ہمارے جیتے جی
ایسا نہیں ہوگا ہمارے جیتے جی
کس لیے روتے ہو تم ؟
ہم امر ہوتے اگر تو ایک دن
آدمیت کی لحد پر آدمی کی نوحہ خوانی کا تماشا دیکھتے
قاتل و مقتول دونوں ہی کو اک پیکر میں یکجا دیکھتے
کس لیے روتے ہو تم اے جانِ جاں
کس لیے روتے ہو تم ؟

ہنگامِ رخصت

لارڈ بائرن / ترجمہ: سجاد مرزا

کتنا خاموش، الم ناک سماں تھا پیاری!
اشک آنکھوں میں تھے تم سے جدا ہونا تھا
کس کو معلوم تھی رخصت کی یہ فتنا کاری
درد کو اور مری جان! سوا ہونا تھا!
قلبِ رنجور و پریشاں میں کشاکش جاری
خشک ہونٹوں سے کوئی حرف ادا ہونا تھا!
سرد رخسار کے چھونے سے یہ معلوم ہوا
اوس پڑ جائے گی یونہی میرے ارمانوں پر
تیری قسموں کا زمانہ بھی ہے معدوم ہوا
انگلیاں اٹھیں گی اب پیار کے افسانوں پر
ہائے وہ خوابِ محبت بھی ہے موہوم ہوا!
داغ پڑجائیں گے فرقت کے گریبانوں پر
لوگ جب نام کبھی لیں گے ترا بھولے سے
تیرگی یاس کی دنیا میں بکھر جائے گی
سرد لے مرے سینے میں اتر جائیں گے!
تجھ کو فرقت نہ مری جان! یہ تڑپائے گی؟
لوگ کیا جانیں، کہا کرتے ہیں، کیا تیرے لیے
تیرے انداز کی کیا ان کو سمجھ آئے گی!
پھر اگر چھپ کے کہیں تجھ سے ملاقات ہوئی
میں تو چپ چاپ غم و درد میں کھو جاؤں گا
دل تیرا بھول گیا، پیار میں جو بات ہوئی
بھول کر تجھ کو بھلا چین سے سو جاؤں گا؟
مدتوں بعد اگر ایسی کرامات ہوئی!
دیکھ کر تجھ کو میں دیوانہ سا ہوجاؤں گا!

این فرینچ
کریم اور لوشن
آپ کے سراپا کے لیے
ریشم سا احساس
Anne French
MPL

ایس کے جمی / سہیل احمد صدیقی

لہندا کے لوک گیت

لہندا پنجابی زبان کی ایک بولی ہے۔ اوانکاری، لہندا کی ایک قسم ہے۔ مرحوم پروفیسر شاہین ملک پہلے محقق تھے جنھوں نے لہندہ اور اوانکاری کے لوک گیتوں کو جمع کیا اور "لہندا شعر ریت" کے نام سے ایک کتاب شائع کی۔ اس کتاب میں شامل نمونہ ہائے کلام یقیناً زبانی ہیں اور (یعنی غیر تحریر شدہ مواد جمع کیا گیا ہے) مغربی پنجاب کے روایتی لہجہ کے عکاس ہیں۔

یہ لوک گیت تلہ گنگ اور وادیٔ سوان کے دیہقانی طبقہ میں گائے جاتے ہیں۔ اس خطّہ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ماہیا، چھلاّ، ڈھولا، ہیری، دوہڑا، وار، پوری اور لٹاگاؤں اوانکاری کے مقبول گیت ہیں۔

اوانکاری کا علاقہ اٹک (شمالی)، خوشاب (جنوب)، چکوال (مشرق) اور مغرب میں ضلع میانوالی کے درمیان واقع ہے۔ لیلیٰ مجنوں، سوہنی مہینوال، شیریں فرہاد، سسی پنوں، ہیر رانجھا اور میرزا صاحبان کی رومانی داستان سب سے زیادہ مقبول ہے۔ علاقائی لوک داستانیں مثلاً حسن اور ہندو دوشیزہ بھی عام ہیں۔

اوانکاری کے لوک گیتوں کا اپنا مخصوص رنگ اور خوشبو ہے۔ یہ انسانی جذبات و احساسات کا اظہار صفائی اور شستگی سے کرتے ہیں۔ ان گیتوں میں ہمیشہ محبت، جدائی اور کسی چیلنج سے نمٹنے کے لیے جرأت اور بہادری کا پیغام سمویا ہوتا ہے۔

ماہیا

کسی کی محبت میں گرفتار ایک دوشیزہ کہتی ہے:

تم مجھ سے پیار کرو یا نفرت!
مگر میں تو ہمیشہ یہی کہوں گی
"سدا جیو میرے محبوب"
میرا دل تمھارا منتظر ہے
خدا تمھیں واپس لائے
کسی سجن سے ملنا
بہت مشکل ہے
میرے پیارے کالے کوّے (۲)
تو اُڑ کے جا اور پٹواری کو بُلا کے لا

میں اپنی زندگی کو تبدیل کرنا چاہتی ہوں
اپنے محبوب کے نام پر

ماہیا اصل میں "ماہ" یعنی پورے چاند (فارسی) سے ماخوذ ہے۔ چنانچہ یہ لفظ اس معشوق کے لیے استعمال ہوتا ہے جس کا چہرہ چاند جیسا ہو۔ ماہیا دیسی پنجاب کا مقبول لوک گیت ہے اور مرد اور عورت دونوں ہی اسے گاتے ہیں۔

ڈھولا

ماہیا کی طرح ڈھولا بھی محبوب ہے (یعنی اس کی محبت کا تذکرہ ہے) اسے دیہات کی عورتیں اپنے فاضل وقت میں گاتی ہیں۔ اس لوک گیت کا موضوع بھی عشق اور دردِ فرقت ہے۔

میں یہاں گاؤں میں ہوں
میرا محبوب بہت دور ہے
پہاڑ پر،
میرا محبوب آتا ہے اور
میرے کنویں کا میٹھا پانی پیتا ہے
میرا محبوب اور میں....
ہم عمر ہیں
اس نے مجھ سے پانی مانگا اور میں نے
اُسے دودھ پیش کر دیا

چھلاّ

چھلاّ (جیسا کہ نام سے ظاہر ہے) مرد اور عورت دونوں اپنی انگلی میں پہنتے ہیں، بعض چھلّے پاؤں میں بھی پہنے جاتے ہیں۔ عُشاق عشق و محبت کے اظہار کے لیے چھلّوں کا تبادلہ کرتے ہیں۔

بنیادی طور پر یہ گیت چرواہوں اور شُتربانوں کا مقبول گیت ہے۔ ماہیا اور ڈھولا کی طرح چھلاّ بھی عشق اور دردِ ہجر کا گیت ہے۔

میرا چھلاّ چاند جیسا ہے
ہم دونوں محبت میں گرفتار ہیں
مجھے نہیں معلوم لوگ کیوں جلتے ہیں

دوہرا

دوہرا چار مصرعوں کا بند ہوتا ہے۔ دوہرا کی تین قسمیں ہیں۔ تصوّف سے متعلق دوہرا جو تصوّف اور عشقِ الہیٰ سے معمور ہوتا ہے، حقانی دوہرا کہلاتا ہے۔ حسینی دوہرا، سانحہ کربلا کا پرچار کرتا ہے۔ رومانوی دوہرا عشق و محبت کا بیان کرتا ہے اور یہ کسانوں،

چرواہوں اور شتربانوں نیز مزارعوں میں مقبول ہے۔

اطاعت محبت کا ثبوت ہے!
مجھے دنیا کی کوئی پروا نہیں!
مجھے تو صرف اپنے محبوب کے چہرے کا خیال ہے!
میں اُس کی خاطر اپنی زندگی قربان کر سکتی ہوں

وار

وار رزمیہ نظم ہوتی ہے جو دو حریفوں کے مابین معرکہ کا نقشہ کھینچتی ہے۔ سیاح قسم کے مطرب زور آور کی مدح سرائی کرتے ہیں اور کمزور کی ہتک و عیب جوئی کرتے ہیں۔

جُوس

جُوس پنجابی میں مدح و ثناء سے پُر قصیدہ کو کہتے ہیں۔ اس کے ذریعہ ہیرو کے کارناموں کو، جو ہمیشہ شاندار ہوتے ہیں، سراہا جاتا ہے۔ اصل میں یہ باقاعدہ اور باضابطہ تعریف ہوتی ہے۔ جہاں اوانکاری مقامی ہیروز کے معاملہ میں زرخیز ہے، وہیں اس میں جوس کی بھی کوئی کمی نہیں۔ مذہبی جوس بھی موجود ہیں۔

پَوری

پَوری پنجابی میں سیڑھی کو کہتے ہیں۔ جس طرح سیڑھی میں قدم ہوتے ہیں اسی طرح پَوری میں بند ہوتے ہیں جو عزت و آبرو کی خاطر لڑنے والے بہادر سپوتوں کے کارناموں کو بیان کرتے ہیں۔ بعض اوقات شکار کے کارناموں کا ذکر ہوتا ہے۔

لہندا کی لوک شاعری وار، جُوس اور پَوری میں خاصی زرخیز ہے اور عام لوگوں کے جو اپنے ماضی کے ہیروز سے محبت و عقیدت رکھتے ہیں، احساسات کی ترجمانی کرتی ہے۔

("فرنٹیئر پوسٹ" بابت ۲ مارچ ۱۹۹۳ء سے ماخوذ)

حواشی

لہندا پہلے لنڈا رسم الخط میں لکھی جاتی تھی اب فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے، مشرقی پنجابی سے مختلف ہے۔ (زبان و ادب۔ مطالعہ و تحقیق از حبیب اللہ غضنفر ص ۶۳)

(۲) کوے کی ہندی شاعری میں وہی حیثیت ہے جو فارسی میں بلبل کی ہے۔

رفتار ادب

(تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

نگارِ پاکستان
خدا نمبر

علامہ نیاز فتح پوری/ڈاکٹر فرمان فتح پوری
صفحات ۲۷۲ قیمت ۱۰۰/۴۰ روپے
سی ۲۸، بلاک ۱۳ ڈی، گلشن اقبال کراچی- ۴۶۳۳۲۷

"خُدا" فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں "خود آنے والا" یعنی کوئی ایسی ہستی جس کو کسی نے تخلیق نہ کیا ہو بلکہ وہ از خود وجود میں آئی ہو۔ عربی میں اِس لفظ کا مترادف "اِلہ" ہے۔ لیکن عام طور پر اس لفظ کو "اللہ" کا مترادف سمجھ لیا گیا ہے اور اسی لیے "اللہ" کی بجائے زیادہ تر اسی لفظ کو استعمال کیا جاتا ہے۔ حالانکہ "اللہ" کا پاک و مقدس لفظ مخصوص ہے اُس ذات بے ہمتا کے لیے جس کا کوئی سہیم و شریک نہیں جب کہ خُدا کا لفظ ہر اُس شے یا ذات کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے جس کے آگے سر عبودیت خم کر دیا جائے۔

بہر حال اِس بحث کو طول نہ دے کر یہاں یہ بتا دینا مناسب ہے کہ لفظ "خُدا" کا یہی مفہوم سامنے رکھ کر "نگار" کا خُدا نمبر شائع کیا گیا تھا۔ پہلی مرتبہ اس کی اشاعت آزادی سے بہت پہلے ہوئی تھی۔ دو مرتبہ آزادی ملنے کے بعد کراچی سے نگار پاکستان کے سالنامے کے طور پر اسی نمبر کو شائع کیا گیا۔ اِس طرح تین بار یہ نمبر شائع ہوا جو اس کی مقبولیت کی بیّن دلیل ہے۔

جس زمانہ میں پہلی بار یہ نمبر شائع کیا گا تھا اُس وقت "ارتقائے حیوانی" کا نظریہ کافی مقبول تھا۔ یہ نظریہ جس کو سجاد علی انصاری کے بقول "تخلیق آدم کے ملکوتی تصور کے مقابلہ میں ارتقائے حیوانی کے میمونی (بندر سے نسبت ہونا) نظریہ کے طور پر آنجہانی چارلس ڈارون نے پیش کیا تھا اس امر کا مدعی تھا کہ شروع میں انسان خدا کے تصور سے عاری تھا۔ لیکن چونکہ غور و فکر اُس کی سرشت میں داخل تھا اس لیے ایک برتر و بالا وجود کا قائل ہو کر مظاہر فطرت میں مختلف چیزوں کو خُدا کا نام دے بیٹھا اور اُن کی پوجا کرنے لگا۔ اسی غور و فکر کے نتیجہ میں کچھ لوگ تو خدائے واحد کے قائل ہو گئے لیکن اکثریت جو "خوگرِ پیکر محسوس" تھی چاند، سورج، ستاروں، آگ، پانی مٹی وغیرہ کو مسجود بنا بیٹھی۔

ظاہر ہے کہ تخلیق آدم کے ملکوتی تصور میں ابتداء ہی خُدائے خالق و برتر کے وجود سے ہوئی ہے اس لیے یہ دعویٰ کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتا کہ شروع میں انسان خدا کے تصور سے عاری تھا۔ دراصل تخلیق آدم ہی خدائے واحد کی مشیت سے ہوئی بعدہ مادیت میں گھر کر انسان مختلف گمراہیوں میں مبتلا ہوتا چلا گیا۔

زیرِ تبصرہ "خدا نمبر" کی بنیاد "ارتقائے حیوانی" کے نظریہ پر ہے جیسا کہ خود صفحہ ۸۸ کی اس عبارت سے عیاں ہے۔
"اگر نظریہ ارتقا صحیح ہے (اور اس کے غلط ہونے کی کوئی وجہ نہیں) تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وقت جس انسان پیدا ہوا تو وہ مذہب کے تصور سے بالکل خالی الذہن تھا....."

اسی نظریہ کے مطابق خدا کے تصور کی پوری تاریخ اس نمبر میں بیان کردی گئی ہے اور اپنی اس اولیت کا نیاز صاحب نے بھی ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے "میں نہیں سمجھتا کہ اس موضوع پر کسی ایشیائی زبان میں اتنی جامع و موثر کتاب اس سے قبل شائع ہوئی۔

ناچیز تبصرہ نگار بھی بخل سے کام نہ لے کر اس حقیقت کا برملا اظہار کرتا ہے کہ "اس نمبر میں نبی نوع انسان کی تمام گمراہیوں اور گمراہ کن نظریات کو یکجا کر کے قارئین کی معلومات میں گرانبہا اضافہ کیا گیا ہے۔"

(ثناء الحق صدیقی)

سری پرکاش اور پاکستان

ترتیب و تعاون ڈاکٹر فرمان فتح پوری

صفحات ۲۳۰ قیمت -/۱۰۱ روپے

پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈس۔ لاہور

زیرِ تبصرہ کتاب پاکستان میں ہندوستان کے پہلے ہائی کمشنر آنجہانی سری پرکاش کی تصنیف ہے۔ مصنف کا تعلق انڈین نیشنل کانگریس کی ہائی کمان سے تھا۔ اُن کے والد ڈاکٹر بھگوان داس نے فرقہ وارانہ اتحاد کے لیے اپنی ساری زندگی وقف کردی تھی اور اُن کو اس خیال سے تکلیف ہوتی تھی کہ کانگریسی رہنما تقسیم ملک پر کیوں رضامند ہوگئے۔ "خود سری پرکاش بھی تقسیم ملک کے آخر وقت تک خلاف رہے۔ وہ واضح طور پر فرماتے ہیں۔ میں بذات خود تقسیم ملک کے خلاف تھا اور اب بھی ہوں۔"

اِن حقائق کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو یہ امر قدرتی معلوم ہونے لگتا ہے کہ اس کتاب کا انداز اس موضوع پر لکھی جانی والی دوسری کتابوں سے مختلف ہے۔ یہ کتاب ہندوستانی نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتی ہے اور بہت سی وہ باتیں اس میں بیان کی گئی ہیں جو دوسری کتابوں میں دکھائی نہیں دیتیں۔ بعض باتوں کو جو اس میں بیان کی گئی ہیں پڑھ کر قاری چونک پڑے گا بعض باتوں کو پڑھ کر اُس کو دلی اذیت ہوگی اور بعض باتوں میں اُسے عصبیت کی جھلک دکھائی دے گی۔ لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ کتاب نہایت دھیمے انداز میں لکھی گئی ہے اور اس میں جذباتیت کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ مصنف موصوف نے نہایت صاف گوئی سے کام لیا ہے اور بعض مقامات پر اپنے ہم قوم لوگوں کی بھی کمزوریاں بتائی ہیں۔ مثلاً سندھ کی صوبائی کانگریس کے صدر چھوئتہ رام گدوانی کا مصنف سے پہلی ملاقات میں جو طرز عمل رہا اُس کے بارے میں اُن کا تاثر یہ تھا۔

"بہرحال وہ غصہ میں بھرے ہوئے تھے۔ مجھے اس بات کا صدمہ ہوا کہ جس سے مجھ کو بہت کچھ توقعات تھیں اُس سے مل کر طبیعت کچھ مکدر سی ہوگئی۔"

اس کے علاوہ سندھی شرنارتھیوں کے مبالغہ آمیز بیانات پر یقین کر کے پٹیل اور گاندھی جی کا جو رویہ مصنف کتاب کے ساتھ رہا اُس سے اُنھیں ملال ہوا۔ اُس کا بھی اُنھوں نے اظہار کر دیا ہے۔

بہر حال کتاب زیر تبصرہ میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں ضروری نہیں کہ اُن سے سب کو اتفاق ہو تاہمیں یہ بات ماننی پڑے گی کہ اس سے فریق مخالف کا موقف کھل کر سامنے آجاتا ہے۔

"ضروری نہیں کہ آپ ہر چیز سے اتفاق کریں۔ لیکن تاریخ کے طلبہ کے لیے اس میں بہر طور بڑا مواد ہے اور اس قسم کی کتابوں کی اشاعت کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے کہ نسل نو ایک مخصوص قسم کے نصابی کورس سے ماورا ہو کر حالات کا از خود تجزیہ کرے اس ضمن میں یہ کتاب بڑی مفید ثابت ہوگی۔"

جناب سری پرکاش کی زیر بحث تصنیف اُردو میں منتقل ہو کر اس سے پہلے "پاکستان۔ قیام اور ابتدائی حالات" کے نام سے اگست ۱۹۹۳ء میں لاہور سے شائع ہو چکی ہے۔ جس کے مترجم جناب حمایت الحسن ہیں۔

(ثناء الحق صدیقی)

جرس

رمز کسمری

صفحات ۱۹۲ قیمت: ۱۰۰ روپے

اُردو کالج، بابائے اردو روڈ۔ کراچی

"جرس" حضرت رمز کسمری کا شعری مجموعہ ہے اس کو اُن کے لائق بیٹے پروفیسر مظفر حسین رزمی نے اشاعت کے لیے مرتب کیا تھا۔ (مظفر حسین رزمی خود صاحب دیوان شاعر تھے)۔ افسوس کہ وہ اس کتاب کے شائع ہونے تک زندہ نہ رہ سکے اور والد محترم کے شعری مجموعہ کو مطبوعہ صورت میں دیکھنے کی تمنا دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ قابلِ ستائش ہے وفاقی گورنمنٹ اُردو کالج کا شعبہ تصنیف و تالیف اور اُس کے کرتا دھرتا پروفیسر ڈاکٹر نسیم اور پروفیسر علی حیدر ملک جنھوں نے اس کارِ خیر کو خوبصورت انجام تک پہنچایا۔

جرس کے لیے جن موقر حضرات نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اُن میں بھارت کے مشہور شاعر ڈاکٹر کلیم عاجز، اُردو کالج کے پرنسپل پروفیسر محمد رفیع عالم، ڈاکٹر حنیف فوق، جناب افسر ماہ پوری اور خود حضرت رمز کسمری کے صاحبزادے پروفیسر سید مظفر حسین رزمی کے نام نامی ہیں۔

ڈاکٹر حنیف فوق نے لکھا ہے "سابق مشرقی پاکستان میں جن بزرگوں سے اُردو کی شعری روایات کی آن بان قائم تھی اُن میں عندلیب شادانی، وحشت کلکتوی، تمنا عمادی، آصف بنارسی اور رمز کسمری نمایاں حیثیت رکھتے تھے....."

افسر ماہ پوری نے اپنے مضمون میں یہ خبر ہم بہم پہنچائی ہے کہ عصر حاضر کے ممتاز غزل گو مولانا حسرت موہانی جب پٹنے تشریف لاتے تھے تو رمز صاحب کے ہاں ان کا قیام ہوتا تھا اور محفلِ شعر و شاعری کا سلسلہ رہتا تھا۔

جناب رمز کسمری کے معاصرین میں جمیل مظہری، عطا کاکوی اور نادم بلخی کا شمار ہوتا ہے۔ کلام کے معیار کو پرکھنے کے لیے یہی کافی ہے کہ اُن کا کلام الہلال کلکتہ میں شائع ہوتا تھا جس کے مدیر مکرم مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔

رمز صاحب کے شعری محاسن کو جاننے کے لیے چند شعر ملاحظہ ہوں:

یہ بھی تھا ایک شعر کا انداز

تم نہ سمجھے مری شکایت کو

کہا تو آپ کا احسان، آپ کا احسان
اب ایک بات کو پھر بار بار کیا کہنا

ایک وہ دن تھے کہ آتی تھی محبّت پہ ہنسی
اور اب ترکِ محبّت پہ ہنسی آتی ہے

کوچہ یار تک آیا ہوں بڑی مشکل سے
کاش رہنے دے یہاں چین سے گردش میری

ہر ذرۂ عالم کو دیکھا تو یہی پایا
یا پر توِ دل اپنا یا عکسِ جمال اُن کا

خواجہ منظر حسن منظر کی نظم "تاریخ جرس" رمز صاحب سے اُن کی عقیدت اور تاریخ گوئی میں اُن کی مہارت ظاہر کرتی ہے۔ التزام یہ ہے کہ ابتدا سے آخر تک اس کے ہر شعر میں مصرعِ اولیٰ سے سنہ ہجری ۱۴۱۳ اور مصرعِ ثانی سے سنہ عیسوی ۱۹۹۲ء برآمد ہوتا ہے۔

(ا-س)

بے آب آئینوں کے شہر میں

سعید احمد
صفحات ۱۱۰ قیمت ۸۰/- روپے
دستاویز مطبوعات کوٹھی رتن چند (رتن باغ) میو ہسپتال لاہور

سعید احمد صاحب کا شعری مجموعہ "بے آب آئینوں کے شہر میں" دستاویز مطبوعات نے چھاپا ہے۔ مجلّہ دستاویز کے مدیر اشرف سلیم اب ناشرین کی صف میں داخل ہو گئے ہیں اُنھوں نے ایک ساتھ کئی کتابیں مرحمت کی ہیں۔ دشتِ خواب، (رشید امجد کا تازہ افسانوی مجموعہ) پرندے (ڈاکٹر سہیل احمد خاں کا شعری مجموعہ) اور سعید احمد صاحب کی مذکورہ کتاب۔ "پرندے" پر میں اس کے پہلے ایڈیشن میں تبصرہ کر چکا ہوں "دشتِ خواب" میرے تبصرے کی فہرست میں اس لیے شامل نہیں کہ میں نے اپنے ایک مضمون میں رشید امجد کے فن کا اجمالی جائزہ "دشتِ نظر سے آگے" اور "دشت خواب" کے حوالے سے لیا ہے سو اب تبصرے کے لیے صرف "بے آب آئینوں کے شہر میں" رہ جاتی ہے۔

ڈاکٹر سعادت سعید نے صاحب کتاب کا تعارف، "نئی تمثالوں کا شاعر" کے عنوان سے کرایا ہے۔ اس تعارف سے قاری و

مبصر کو مطالعے کی کئی جہات مہیا ہوتی ہیں کتاب میں شامل نظموں اور غزلوں کے مطالعہ سے کچھ اور ظاہر ہو یا نہ ہو ایک بات کا تعین ہو جاتا ہے کہ اس شعری مجموعے کا شاعر تازہ خیالی کو اہمیت دیتا ہے اور عام راہ سے ہٹ کر اپنی راہ متعین کرنے کی تگ و دو میں لگا ہوا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ تگ و دو کا خلوص کبھی رائگاں نہیں جاتا یہ خلوص ایک شاعر کو وہاں تک پہنچاتا ہے جہاں تک جانے کی وہ تمنا رکھتا ہو۔ احمد سعید صاحب کے باب میں بھی ہمیں یہی کچھ نظر آتا ہے بہرحال انھیں اس آخری مقامِ قبولیت و شہرت تک پہنچنے کے لیے تمنا کی آگ کو جلائے رکھنا ہے۔

اب شاعر کو اس کے کلام میں دیکھیے:

تمام منظر اس ایک منظر میں دیکھتا ہے
وفا کا چہرہ وہ چشمۂ زر میں دیکھتا ہے

عزیز اتنا ہے اس کو چلنا روش سے ہٹ کر
وہ خیر کی سب علامتیں شر میں دیکھتا ہے

مجھے رنگینیٔ دنیا میں ڈھلنا ہی نہیں آتا
نمایاں ہو کے دائم حیرتِ محفل میں رہتا ہوں

اس زمین کے تینوں شعر تازہ کاری کا بین ثبوت ہیں۔ نموتاً ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

عجب معمول ہے دل کا نئے گھر میں سمانے کو
ہمہ اوقات تصویریں پرانی مانگتے رہنا

(ا - س)

وہ زلف پریشاں ہے ابھی

سرفراز ابد

صفحات ۱۲۰ قیمت ۱۰۰/- روپے

آر ۱۷، ۳، بلاک ۱۴، نصیر آباد فیڈرل بی ایریا کراچی

غالب کا ایک شعر ہے:

سو سال سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

اور جناب سرفراز ابد کے شعری مجموعے "وہ زلف پریشاں ہے ابھی" کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

شاعری پر ابد کی حیرت کیا
اپنے ہی خاندان پر تو گیا

گویا سرفراز ابد اس بات پر مفاخر ہیں کہ وہ اپنے اُس خاندان پر گئے۔ جہاں ہر وقت شعر و شاعری کا چرچہ ہوتا تھا جس نے اُن کے والد حضرت شفق اکبر آبادی کی شکل میں انھیں ذوقِ شعری کا تسلسل عطا کیا۔

اس کتاب کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ ژولیدہ بیانی تقریباً نہیں ہے سرفراز ابد جو بات کہتے ہیں صاف اور سیدھے دل میں اُتر جاتی ہے۔ کلام پر یہ گرفت مشکل سے پیدا ہوتی ہے۔ جناب سرفراز ابد نے یہ مشکل مرحلہ اپنے لیے آسان کر لیا ہے۔ اُن کے کلام میں مجھے جا بہ جا سادگی کے ساتھ معصومیت کا بھی احساس ہوا ہے اس نقطہ نگاہ سے ذرا اس شعر پر نظر ڈالیے:

جس نے مجھے قبول کیا اور خوشی کے ساتھ
میں نے بتادی عمر اسی باولی کے ساتھ

باولی کے اس تخاطب اور خود اس لفظ کے برمحل استعمال نے اس شعر کے مفہوم کو معصوم اور دلربا بنادیا ہے۔

اگر آپ اس کتاب کو بہ نظرِ غائر دیکھیں تو یہ محسوس کریں گے کہ یہ شعر بہت سی غزلوں میں روپ بدل بدل کر آتا ہے اور باولی گویا یہاں محوری صورت کے طور پر ظاہر ہوتی ہے۔

کتاب کے لیے جناب مدبر رضوی، جناب عباس رضوی اور جناب قاضی قیصر الاسلام نے تعارفی مضامین اور صفدر صدیق رضی نے فلیپ تحریر کیا ہے۔ ان سے سرفراز ابد کے کلام کی خوبیاں اُجاگر ہوتی ہیں۔

(ا۔س)

روشنی ہماری ہے

سعدیہ روشن صدیقی

صفحات ۲۳۲ قیمت ۱۰۰/۰ روپے

محمد روشن صدیقی پوسٹ بکس نمبر ۸۹۸ ایڈناک ابوظہبی، متحدہ عرب امارات

"روشنی ہماری ہے" محترمہ سعدیہ روشن صدیقی صاحبہ کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ موصوفہ ۶۸ء تا ۷۸ء کے درمیان جامعہ کراچی کے شعبۂ سیاسیات میں پڑھایا کرتی تھیں۔ اِن دنوں وہ ابوظہبی میں قیام کرتی ہیں۔ اُن کی شاعری میں سیاست علی الاعلان داخل نہیں ہوئی۔ کہیں کہیں اُس کی جھلک ملتی ہے وہ بھی دھیمے لب و لہجے میں، اس میں کرختگی اس لیے بھی نہ آسکی کہ اُن کی نسائیت مانع ہوئی۔

کتاب کا دیباچہ "سعدیہ کی شاعری" کے عنوان سے جناب احمد ندیم قاسمی نے لکھا ہے ندیم صاحب نے اُن کے شعری سیاق و سباق کو اُسی طرح دیکھا ہے جیسے ایک بڑا اپنے خوردوں کے کلام پر خوبیوں کی جستجو میں نگاہ ڈالتا ہے۔

کتاب کا آغاز "لبیک یا رسول اللہ" سے ہوتا ہے جو سرور کائنات ﷺ کے حضور ایک نذرانۂ عقیدت و محبت ہے۔ اس نظم کا سب سے بڑا وصف سادگی ہے۔ ہر مصرع سے حُبِ رسول ﷺ ظاہر ہوتا چلا جاتا ہے، اور ذات سے اٹھ کر یہ نظم کائناتی دائرہ بناتی ہوئی اختتام کو پہنچتی ہے۔

محترمہ سعدیہ کی ایک غزل پوربی لہجے میں بھی ہے جس کا ایک شعر ہے:

اس صورتِ حال میں بھی صبر کرو ہو
تم سعدیہ بی بی نہ جیو ہو نہ مرو ہو

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ غزل ڈاکٹر کلیم عاجز کے کلام سے متاثر ہو کر کہی ہے انھوں نے اس زمین میں بہت سی غزلیں کہی ہیں جو دبئی اور ابوظبی کے مشاعروں میں بار بار سُنائی گئی ہیں۔ غزل کا یہ لہجہ اُن سے مختص ہو گیا ہے۔ لیکن "کرو ہو" اور "کرے ہے" کے فرق سے یہ لہجہ سب سے پہلے میر تقی میر کے ہاں غزلوں میں ملتا ہے۔ اس لہجے کے حوالے سے گفتگو کرنے کا مقصد محض یہ بتانا ہے کہ محترمہ سعدیہ شعر گوئی میں نئے پن کی متلاشی ہیں اور تلاش و جستجو ہی سے شاعری کو جلا نصیب ہوتی ہے۔

محترمہ سعدیہ روشن صدیقی کی نظموں، غزلوں کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اس میں تکلف یا اہتمام نہیں برتا گیا ہے۔ جب اور جس طرح جو خیال ذہن میں اُبھا گر ہوا اُسے زیب قرطاس کر دیا گیا ہے۔ اس پیرایہ بیان میں بے ساختگی کا حُسن ظاہر ہوا ہے۔ توقع رکھنی چاہیے کہ مستقبل میں یہ خوبیاں اور نکھر کر آئیں گی۔

کتاب دیدہ زیب چھپی ہے اور قابلِ مطالعہ ہے۔

(ا-س)

جگر شخصیت اور شاعری

مرتب: اطہر ضیائی

صفحات ۳۲۶ قیمت ۰۰/۱۰۰ روپے

دبستان جگر ۱۹/۱۶۶ فیڈرل بی ایریا کراچی ۷۵۹۵۰

"جگر شخصیت اور شاعری" "دبستان جگر" کے زیر اہتمام چھپی ہے "دبستان جگر" حضرت جگر کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے آج سے چند سال قبل قائم ہوا اب تک دبستان جگر کی سرگرمیاں ادبی مجالس برپا کرنے تک محدود تھیں۔ لیکن اس سے آگے نکل کر جگر سے اپنی عقیدت کے عملی اظہار کے طور پر مذکورہ کتاب چھاپی گئی ہے اس کے مرتب بلکہ مرتبین کی جگر سے عقیدت اور محبت ورق ورق سے ظاہر ہوتی ہے۔ کتاب کو "فکرِ نو" "منجملہ خاصانِ میخانہ" بازگشت، داغ جگر اور نقشِ جگر کے ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ "فکرِ نو" کے تحت جگر کے فن پر تازہ مضامین، منجملہ خاصانِ میخانہ کے تحت شخصیت و تاثرات، بازگشت کے تحت مطبوعہ مضامین کا انتخاب، داغ جگر کے تحت، وفات جگر پر شعرا کے نذرانۂ عقیدت اور "نقشِ جگر" کے تحت جگر کے منتخبہ کلام کو یکجا کیا گیا ہے۔ اس طرح جگر کے فن و شخصیت کی ایک مجموعی صورت نئے قارئین کے لیے بہم ہو گئی ہے ادبی ذوق رکھنے والی نئی نسل کے لیے تو یہ کتاب ایک خوبصورت تحفے کا درجہ رکھتی ہے۔

حضرت جگر اُن خوش قسمت شعراء میں تھے، شہرت و مقبولیت جن کے قدم چومتی تھی، شہرت و مقبولیت کسی شاعر پہ بے سبب اس طرح فدا نہیں ہوتی کہیں نہ کہیں اور کوئی نہ کوئی انوکھی بات اُس شاعر کے کلام میں ہوتی ہے، محفلِ مشاعرہ میں جن لوگوں نے حضرت جگر کو دیکھا ہے وہ بتاسکتے ہیں کہ اُن کی موجودگی سے مشاعرہ میں جان پڑجاتی تھی۔ اُن کا کلام معاصر شعراء کے درمیان سب سے جدا ایک بانکپن سے کھڑا دکھائی دیتا تھا۔

ڈھاکہ کے کل پاک و ہند مشاعرے میں جہاں سارے نامور شعراء ہوتے تھے جگر کی شان جداگانہ دکھائی دیتی تھی۔ سچ پوچھیے تو حضرت جگر اپنی زندگی ہی میں ایک لیجنڈ بن گئے تھے اور یہ رُتبہ خال خال ہی کے حصے میں آتا ہے۔ جگر کی انفرادیت و عظمت

ہماری یادوں کی محتاج نہیں بلکہ ہماری یادوں کی تفاخر ہے۔ لیکن اس کے یہ مطلب نہیں کہ عقیدت مندانِ جگر اور خاصانِ میخانۂ غزل اُن کی یاد کے لیے ادبی و تصنیفی نوعیت کے بہانے نہ پیدا کرتے رہیں زندہ افراد اسی طرح اپنے محسنوں کو یاد کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے جناب اطہر ضیائی اور اُن کے رفقا کی یہ مرتب کردہ کتاب "جگر شخصیت اور شاعری" ایک وقیع ترحیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ اُن کی یہ مساعی قابلِ داد و توصیف ہے اور جگر کے مطالعے میں ایک گران بہا اضافہ ایسی ہر کتاب کی اشاعت کا خیر مقدم اس لیے کرنا چاہیے کہ اس سے تحقیق کی راہیں کھلتی ہیں اور کسی ایک فرد کے فن و شخصیت پر بہت سا مواد یکجا حاصل ہو جاتا اس لحاظ سے "دبستانِ جگر" قابلِ مبارکباد ہے۔

مخلد خیال

شوکت واسطی
صفحات ۲۰۸ قیمت ۔/۲۵۰ روپے
بزمِ علم و فن پاکستان پوسٹ بکس۔ اسلام آباد ۱۹۳۵
پیشاور ۳۵۵

"مخلد خیال" جناب شوکت واسطی کی غزلیات کا مجموعہ ہے۔ اس پر بات کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ صاحبِ کتاب کی دوسری تصنیفات کا ذکر کیا جائے۔ اب تک ان کے آٹھ طبع زاد شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں سے بیشتر کا تعلق نظمیہ شاعری سے ہے۔ اُن کا عالمی ادبِ عالیہ کے منظوم تراجم کا کام اتنا وقیع و وافر ہے کہ اس کے سبب سے وہ انفرادیت کے درجے پر فائز نظر آتے ہیں۔ "فردوسِ گم گشتہ" (ملٹن) "کربیہ طربیہ" دانتے کی "ڈیوائن کامیڈی" کے تین حصوں کا ترجمۂ الیہ حکیم فسطاس، "آشوبیہ" (ہومر کے ایلیڈ کے پہلے چھ دفتر) "راگ کی آگ" (ٹیگور کی گیتانجلی کا ترجمہ) یہ تمام کی تمام نظمیں کلاسیک کا درجہ رکھتی ہیں۔

نظم کے باب میں جناب شوکت واسطی کا طرزِ اظہار اتنا پختہ ہو چکا ہے کہ اب یہ رنگ کسی طور اُترتا معلوم نہیں ہوتا۔ چنانچہ اُن کی غزلیہ شاعری میں بھی نظمیہ کا رنگ و آہنگ صاف طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ نظم کا سنگار عام طور پر خارجی عوامل سے ہوتا ہے۔ اس کے برعکس غزل سر تا سر داخلی رویہ کی متقاضی ہے اور وارداتِ قلبیہ اور امورِ ذہنیہ و روحیہ کو بیان کرتی ہوئی اچھی لگتی ہے۔ داخلی اور خارجی رویوں کے اس فرق کو میر تقی میر اور ناسخ کے کلام کے حوالے سے پرکھا جا سکتا ہے۔ جناب شوکت واسطی کی غزلوں میں مذکورہ داخلی رنگ کی جھلک جا بجا ملتی ہے۔ اگر غزل کا یہ روپ کسی شعری مجموعہ میں جابجا بھی مل جائے تو اس وساطت سے وہ شعری مجموعہ وقیع ہو جاتا ہے۔

"مخلد خیال" خوبصورت چھپی ہے کتاب و طباعت معیاری ہے۔ البتہ قیمت کچھ زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

(ا۔ر)

قومی زبان (۷۴) مئی ۱۹۹۴ء

کچھ وقت غیر ملکی اردو کتابوں کے ساتھ

ڈاکٹر انور ر

جگن ناتھ آزاد (حیات اور ادبی خدمات) مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم

جگن ناتھ آزاد بھارت میں اردو کے بے حد نیک نام ادیب ہیں، اور خوبی کی بات یہ کہ انھیں پاکستان میں بھارت سے زیادہ قدر و منزلت حاصل ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان کی پیدائش پاکستان میں میانوالی کے ضلع میں عیسیٰ خیل کے ہوئی، دوسری یہ کہ ان کے والد تلوک چند محروم کو ان کی پیدائش سے پہلے برصغیر میں ایک بلند پایہ شاعر کی حیثیت میں حاصل ہو چکی تھی، شعر و شاعری میں وہ ان کے اوّلین استاد تھے، تیسری وجہ یہ کہ انھوں نے اپنی جوانی اُس لاہور میں بسر کی ادب کا گہوارہ تھا اور جہاں علامہ تاجور نجیب آبادی، مولانا غلام الدّین سالک، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، سیّد عابد علی عابد، مولانا عب سالک اور ڈاکٹر سیّد عبداللہ جیسے اہل ادب نے ایک بے ریا اور بے لوث علمی فضا مرتب کر رکھی تھی، آخری بات یہ ہے کہ کے بعد جگن ناتھ آزاد نقل مکانی کر کے واگھہ کی سرحد کے اس پار چلے گئے تو انھوں نے پاکستان سے اپنا روحانی اور جسمانی ر کیا، علامہ اقبال اُن کے مرشدِ اوّل تھے اُن کی شاعری اور فلسفے کو بھارت میں فروغِ عام دینے میں جگن ناتھ آزاد نے خصوصی سرانجام دیں۔

وہ اس آزاد ملک سے وقت کا زخم لے کر گئے تھے۔ لیکن پاکستانیوں کی محبّت نے کا اندمال کر دیا، یہ بات بہت اہمیّت رکھتی ہے کہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی شب قیام پاکستان کا اعلان ہوا تو اس اعلان کے ریڈیو پاکستان سے جگن ناتھ آزاد ہی کا ترانہ نشر کیا گیا تھا۔ اس ترانے کا ایک بند حسب ذیل ہے۔

اے سرزمینِ پاک
ذرّے ترے ہیں آج ستاروں سے تابناک
روشن ہے کہکشاں سے کہیں آج تیری خاک
تندیِ حاسداں پہ ہے غالب تیرا سواک
دامن وہ سِل گیا ہے جو تھا مدتوں سے چاک
اے سرزمینِ پاک

جگن ناتھ آزاد ایک جامع الحیثیات ادیب ہیں۔ وہ اعلیٰ درجے کے فطری شاعر ہیں، بلند پایہ نقاد اور نثر نگار ہیں، انھیں صفِ
ں کے ماہرینِ اقبالیات میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کے جامع ادبی شخصیت پر متعدد کتابیں چھپ چکی ہیں، ان کی نظم و نثر کو جن
بلند پایہ ادیبوں نے سراہا ان میں سیّد احتشام حسین، فراق گورکھپوری، ڈاکٹر تاثیر، قاضی عبد الغفار، پروفیسر گیان چند، مصطفیٰ
یدی۔ شیخ سر عبد القادر، سیّد وقار عظیم، عبد المجید سالک، خواجہ غلام السیّدین، ڈاکٹر اعجاز حسین، صباح الدّین عبد الرّحمن، ڈاکٹر ظفر
غفاری، پروفیسر اشرف ندوی اور متعدد دوسرے بڑے ادیبوں کے نام شامل ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف اور ان کے
نقوشِ حیات کو مزید روشن کرنے کے لیے ڈاکٹر خلیق انجم نے زیر نظر کتاب "جگن ناتھ آزاد...... حیات اور ادبی خدمات" دہلی سے
شائع کی ہے۔

اس کتاب میں جگن ناتھ آزاد کی پوری شخصیت کو پیش کرنے کی عمدہ کاوش کی گئی ہے۔ ہر چند کہ یہ ایک تہنیتی کتاب
ہے جو جگن ناتھ آزاد کے ۷۵ ویں یوم ولادت پر مرتب کی گئی اور اس میں جو مضامین جمع کیے گئے ہیں، وہ ایسے مضامین ہیں جو
جگن ناتھ آزاد کی پوری ادبی زندگی میں لکھے جاتے رہے تھے تاہم اس کتاب سے زمانی اعتبار سے یہ بات بالخصوص سامنے آتی ہے
کہ جگن ناتھ آزاد ہر دور میں مرجع خواص تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے لکھا:

یہ (جگن ناتھ آزاد کی کتاب "بے کراں") ایک گداز طبیعت، درد مند دل، حسّاس شخصیت کا کلام ہے۔ یہ ایک محبّت کرنے
والے، عالی ظرف دوست کی گفتار ہے جو بہت سی باتیں چشمِ سخن اور چشمِ ابرو سے کہہ جاتا ہے۔ قاضی عبد الغفار کی رائے میں:

"آزاد ہندوستان کے اس جدید دور کے نقیب اور نقاش ہی نہیں بلکہ داستاں گو بھی ہیں ان کی بہت سی نظمیں ایسی ہیں کہ
اگر انہیں ان کے صحیح پس منظر میں رکھ کر پڑھا جائے تو انقلابی نفسیات کی ایک تصویر آنکھوں کے سامنے آتی اور ایک داستان
کانوں میں گونجتی ہے۔"

علامہ سیماب اکبر آبادی نے فرمایا:

"آزاد نے زندگی کا مطالعہ قریب سے کیا ہے... مسائل حیات ان کے کلام میں بڑی خوبی سے سموئے ہوئے ہیں۔ وہ
سیاست، سماج اور مذہب کے متعلق گہری نظر رکھتے ہیں اور ان کے یہاں جا بجا محبّت کے چھینٹے بھی ملتے ہیں"

خامہ بگوش نے ان کے بارے میں کالم "سخن در سخن" لکھا تو ان کے ہاتھ میں پھول کا قلم تھا اور وہ ان کی مقبولیت کی چشم
دید روایتوں سے اخذ و اکتساب کر رہے تھے۔ انھوں نے لکھا:

"جگن ناتھ آزاد ہندوستان کے ان ڈیڑھ دو شاعروں میں سے ہیں جو پاکستان میں بے حد مقبول ہیں، ...... یہاں آتے ہی وہ
اپنے چاہنے والوں میں تبرک کی طرح تقسیم ہونے لگتے ہیں، ایک ایک دن میں ان کی دس دس دعوتیں ہوتی ہیں، خوش اخلاق وہ
اتنے ہیں کہ ہر دعوت قبول کر لیتے ہیں اور ہر دعوت کے بعد کلام بھی سناتے ہیں... انھوں نے حافظہ بلا کا پایا ہے۔ بلا مبالغہ ہزاروں
اشعار یاد ہیں۔ اپنے ہی نہیں دوسروں کے بھی، اپنا کلام تو ہر شاعر کو یاد ہوتا ہے لیکن آزاد صاحب کو دوسرے شاعروں کے شعر بھی
بڑی تعداد میں یاد ہیں، علامہ اقبال کا تو انہیں پورا کلام حفظ ہے۔ محتاط اتنے ہیں کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اپنے شعر علامہ اقبال کے
نام سے یا علامہ کے شعر اپنے نام سے سنا دیئے ہوں۔ حالانکہ علامہ سے ان کی عقیدت ایسی ہے کہ من و تو کا فرق مٹ جائے تو کوئی
تعجب نہیں"

اس کتاب کی ایک بڑی خوا[illegible] ہے کہ [illegible] ، بیشتر مواد جمع کر دیا گیا ہے جو اخبارات و رسائل [illegible] بکھرا ہوا تھا۔ مثلاً ، کہ

علاوہ ہنگری میں علامہ اقبال کے فکروفن پر جگن ناتھ آزاد کا لیکچر، ہسپانیہ اور چیکوسلواکیہ میں پروفیسر آزاد کی تقریریں آزاد نے دنیا کے مختلف مقامات پر اقبالیات کی محافل میں شرکت کی، ان محفلوں کی رودادیں اور اطلاعات کے اخباری تراشے اور تبصرے بھی اس کتاب میں شامل ہیں یوں سمجھیے کہ ہر وہ چیز جس میں جگن ناتھ آزاد کا نام، ذکر اور حوالہ آتا ہے... اس کتاب کا جزو لاینفک بن گیا ہے۔ اس ضمن میں یہاں خوانین عیسیٰ خیل کی فہرست کا حوالہ دیا جاسکتا ہے جنھوں نے عیسیٰ خیل میں آزاد صاحب کی تشریف آوری پر مختلف جلسوں میں نذرانہ خلوص پیش کیا۔ اپریل ۱۹۸۰ میں ان کی پاکستان تشریف آوری پر جو سرکاری پروگرام منیر احمد شیخ پریس کونسلر پاکستان متعینہ دہلی نے مرتب کیا تھا، اس کا پورا متن اس کتاب میں موجود ہے۔ حلقۂ ارباب ذوق نوٹنگھم نے ۱۲ اگست ۱۹۹۰ء کو آزاد صاحب کے ساتھ ایک شام منائی تھی، اس کا دعوت نامہ اردو انگریزی دو زبانوں میں پیش کیا گیا ہے۔ آزاد صاحب کے بارے میں دنیا کے جن اردو انگریزی اخبارات میں خبریں شائع ہوئیں، ان سب کا ریکارڈ اس کتاب میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ کتاب کی ایک اور خوبی جگن ناتھ آزاد کی ادبی زندگی کا مکمل البم ہے جس سے ان کی سرگرمیوں اور ادبی دائرے کی وسعتوں کا علم ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اتنے وسیع زاویوں سے اردو کے کسی مصنّف کو تہنیت پیش نہیں کی گئی، ایسا بوقلموں مواد کسی مصنّف کا جمع نہیں کیا گیا۔ یہ کتاب محروم میموریل لٹریری سوسائٹی، نئی دہلی کے اہتمام سے چھپی ہے۔ میں نے اس کتاب کو اپنے کتب خانے کے گوشہ آزاد میں سجا دیا ہے۔

کتب خانہ...... رضا علی عابدی

عرصے کی بات ہے کہ بی، بی، سی لندن سے رضا علی عابدی کا ایک نادر اور انوکھا پروگرام نشر ہوتا تھا جس کا انتظار بڑی شدّت سے پوری ادبی دنیا میں کیا جاتا تھا۔ اس پروگرام میں رضا علی عابدی کسی قدیم کتاب کو اس طرح متعارف کراتے کہ کتاب اور اس کے مصنّف کی نشاۃ ثانیہ برپا ہوجاتی۔ چنانچہ متعدد ایسی کتابیں جنھیں نجی کتب خانوں میں عرصے سے روشنی دیکھنا نصیب نہیں ہوئی تھیں، منوّر ہوگئیں، متعدد ایسے مصنّف جو قید حیات سے آزاد ہو کر لائبریریوں میں دفن تھے، زندہ ہوگئے۔ بی بی سی کا یہ پروگرام عرصے تک اردو دنیا کا مقبول ترین پروگرام تسلیم کیا گیا...... زیرِ نظر کتاب "کتب خانہ" میں رضا علی عابدی نے متذکرہ ریڈیو پروگرام کو طباعتی صورت دے دی ہے...... متعدد ایسے کتب خانوں کا ذکر کر کے جو نظر سے اوجھل ہیں لیکن جو نایاب کتابوں کے خزینے ہیں۔

یہ کتاب ۱۹۸۵ء میں چھپی تھی، اس پر متعدد تبصرے شائع ہوئے، میں نے اس کے بعض مندرجات ریڈیو پر سُنے تھے۔ اور بعض ذوالفقار احمد تابش کے سرکاری رسالہ "کتاب" میں پڑھے تھے، لیکن پوری کتاب نظر سے نہ گزر سکی اب ایک دوست لندن سے لائے ہیں تو اس کے مندرجات سے تجدید ملاقات کر کے میں نے بے پایاں خوشی محسوس کی۔ ایک غیر ملکی تالیف کی حیثیت میں اس کتاب پر تبصرہ کرنے کی حِس فوراً جاگ اٹھی...... نو برس کے اس عرصے میں یہ کتاب خاک نہیں ہوئی بلکہ اس کی زمین سرسبز و شاداب ہے اور اب اس تبصرے کے شگوفے کو پھوٹنے کا موقع فراہم کر رہی ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ ذہن کو معطر اور آنکھوں کو قومی بے حسی پر اشکبار کر رہا ہے۔

اس کتاب کا پہلا مضمون "کتاب کس حال میں ہے"... اس دردناک حقیقت کو منکشف کرتا ہے کہ جس سے ہماری کتابیں اور کتب خانے اس وقت دوچار ہیں، عابدی صاحب نے ان چند ہفتوں کا ذکر بڑی خوش اسلوبی سے کیا ہے کہ جو بے خبری کے

قومی زبان (۷۷) مئی ۱۹۹۴ء

ساحلوں سے چلے اور قدر شناسی کے محفوظ کناروں پر جا لگے، پھر ان قافلوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے جو دن دہاڑے لٹ گئے، لیکن کتابوں اور کتب خانوں کا المیہ مؤخر الذکر بات سے ہی ابھرتا ہے۔ اور دکھ ہوتا ہے کہ بے حد قیمتی کتابیں اور متعدد نجی کتب خانوں کو محفوظ رکھنے کا فی الحال ہمارے ہاں کوئی انتظام نہیں۔ بلکہ اب عالم یہ ہے کہ لاہور، کراچی، ملتان، پشاور اور اسلام آباد کے نجی کتب خانوں کو ان کے مالکوں کی وفات کے بعد کوئی سرکاری لائبریری قبول کرنے پر تیار نہیں ہے۔ ان کے پاس یہ نادر و نایاب کتابیں رکھنے کے لیے جگہ ہی دستیاب نہیں۔

رضا علی عابدی کی اس کتاب میں عوام اور خواص کو کتابوں اور دستاویزوں کے تحفظ کی راہ دکھائی گئی ہے، کتاب کے داخلی اوصاف سے کتاب سے محبت کا جذبہ جگایا گیا ہے، یہ کتاب اس انداز میں لکھی گئی ہے کہ ایک زندہ داستان ہمارے سامنے "متکلم" ہوتی چلی جاتی ہے، اور قاری خود کتاب سے ہم کلام ہو جاتا ہے۔ اس دوران وہ تعلقات بھی سامنے آئے ہیں جن میں عابدی صاحب کتاب کی تلاش کے دوران گزرے یوں ایک سچا افسانہ مرتب ہوتا چلے گئے، مثلاً ایک دلچسپ کہانی غواصی کے دیوان اور نصرتی کے "علی نامہ" کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ ایک کہانی غالب کوئے ملامت میں غالب کے خود نوشت دیوان کے بارے میں پیش کی گئی ہے۔ اس کتاب سے ہمارے سامنے ایسے عظیم نام بھی آتے ہیں جن کی پوری زندگی کتاب کی محبت میں گزری، عابدی صاحب نے محبت کی یہ داستانیں بڑی عقیدت سے پیش کی ہیں۔ وہ نیّر مسعود صاحب سے لکھنؤ میں ملے تو انھوں نے والا گرامی پروفیسر مسعود حسن رضوی کا ذکر کیا اور ان کی کتاب دوستی کے ضمن میں کہا:

"ابّا کو اگر کوئی کتاب نکلوانا ہوتی تھی تو کہتے تھے کہ فلاں کمرے میں فلاں الماری ہے۔ اس کے تیسرے خانے میں داہنے ہاتھ سے پانچویں کتاب ہے۔ اتنی موٹی ہے۔ سرخ رنگ کی جلد ہے اور کتھئی رنگ کے چمڑے کی پشتی ہے" کراچی میں ذاتی کتب خانوں کے سلسلے میں افتخار عارف پر انحصار کیا گیا۔ انھوں نے کہا:

"ادبی کتابوں کا جو ذخیرہ میری نظر سے گزرا ہے کہ جہاں جا کر جی چاہتا ہے کہ انسان بیٹھا رہے وہ مشفق خواجہ صاحب کا ذخیرہ ہے۔ وہ نہایت حلیم الطبع ہیں اور ہمارے بزرگ دوست اور کرم فرما ہیں۔ مشفق خواجہ صاحب کے پاس بے انتہا اچھا اور منتخب ذخیرہ ہے۔ وہ خود محقق ہیں اور ورثہ دار ہیں ایک بڑے محقق کے۔ ان کا کتب خانہ دیکھنے کے قابل ہے۔ یگانہ کی بہت سی چیزیں ان کے پاس جمع ہیں۔"

کتاب کا پیش لفظ رالف رسل نے لکھا ہے۔ ان کا یہ خیال عملی توجہ کا تقاضا کرتا ہے کہ یہ کتاب ایک پرزور اپیل کی تمہید ہے اس کتاب نے افراد، انجمنوں اور ارباب حل و عقد، سب کی توجہ اس طرف دلانی چاہی ہے کہ پاکستان اور بھارت میں پبلک اور ذاتی کتب خانوں، مدرسوں، خانقاہوں اور گھروں میں بیش بہا کتابوں اور مخطوطوں کا ایسا بڑا ذخیرہ ہے کہ بقول مصنف (رضا علی عابدی)

"اگر یہ ساری کتابیں یکجا کر دی جائیں تو دنیا کا سب سے بڑا کتب خانہ وجود میں آ جائے"

رالف رسل کا یہ انتباہ بار بار دوہرانے اور کتابوں کے تحفظ کی تحریک چلانے کی ضرورت ہے۔

اردو میں رپورتاژ کی روایت..... طلعت گل

رپورتاژ کے بارے میں سید احتشام حسین نے لکھا ہے کہ "یہ واقعات کی ادبی اور صحافتی رپورٹ ہے" علی سردار جعفری کے نزدیک یہ صحافت اور افسانے کی درمیانی کڑی ہے محمد حسن عسکری نے رائے دی کہ "رپورتاژ" کا نام اس لیے اختراع کیا گیا تھا کہ بعض تحریروں کو صحافت اور ادب دونوں سے الگ کیا جا سکے۔ دہلی میں اردو ادب کی ہونہار طالبہ طلعت گل نے اپنے رپورتاژ کے

قومی زبان (۸۰) مئی ۱۹۹۴ء

۱۸ مارچ کی شام کو جناب جمیل زبیری کی قیام گاہ پر "ہمعصر" کی طرف سے ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ نشست کی صدارت جناب مختار زمن نے فرمائی۔ ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ مہمان خصوصی تھیں۔ اس نشست کا اہتمام انجمن کے ایما پر جناب جمیل زبیری نے اپنے گھر پہ کیا تھا۔ چونکہ مہمان خصوصی کی خاص دلچسپی فکشن سے ہے اس لیے اس بات کا خیال رکھا گیا تھا کہ مدعوعین میں زیادہ تر افسانہ نگار ہوں۔ اس موقع پر جمیل زبیری نے اپنا مختصر افسانہ "دھند لکے" سنایا۔ اس کے بعد امراؤ طارق نے ایک کہانی پڑھی جس کا عنوان تھا "کرفیو کی ایک رات" نشست کے شرکاء میں زاہدہ حنا، علی حیدر ملک، صبا اکرام، سلطان جمیل نسیم، شہناز پروین، فردوس حیدر، انیس صدیقی، یوسف شاہ نسیم عزیز، ثریا جبین اور فریدہ جمیل شامل تھیں۔

۱۹ مارچ کو ڈاکٹر کرسٹینا کے اعزاز میں انجمن ترقی اُردو کے دفتر واقع یونیورسٹی روڈ میں ادیبوں اور دانشوروں سے ملاقات اور ظہرانہ کا انتظام کیا گیا۔

ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ کی آمد کے بعد انجمن کے دفتر میں ان کے اعزاز میں مرتب کی گئی نشست کا آغاز ہوا۔ پہلے انجمن ترقی اردو کے معتمد اعزازی جناب جمیل الدین عالی نے انجمن، اس کی مطبوعات اور اس کی اشاعتی سرگرمیوں کا تفصیل سے تعارف کرایا، پھر عالی صاحب کے ایما پر پروفیسر سحر انصاری نے مہمان خصوصی ڈاکٹر کرسٹینا سے حاضرین کا تعارف کرایا۔ اس کے بعد ڈاکٹر کرسٹینا کو گفتگو کی دعوت دی گئی۔

ڈاکٹر کرسٹینا نے اختصار سے بتایا کہ ہیڈل برگ یونیورسٹی کے جنوبی ایشیا کے شعبے میں اُردو کے ساتھ ہندی، بنگالی اور مراٹھی کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ اُردو کی طلبہ کی تعداد آٹھ تا دس ہوتی ہے۔

ڈاکٹر کرسٹینا نے کہا کہ آجکل ہماری ایک اُردو طالبہ "لکھنؤ کی قصہ کہانیاں" کے موضوع پر پی ایچ ڈی کر رہی ہے۔ میں نے اردو شاعرات پر بھی کچھ کام شروع کیا ہے۔ اس کی ابتدا ادا جعفری سے ہوتی ہے۔ میں ولی دکنی سے لے کر فیض احمد فیض تک انتخاب کا ارادہ رکھتی ہوں میرے طباعتی منصوبے میں امراؤ جان ادا بھی ہے۔

انھوں نے مزید بتایا کہ ایک خاتون رخسانہ شمیم جرمن اور اُردو دونوں زبانوں میں لکھتی ہیں، اور کبھی جرمنی سے اُردو کبھی اُردو سے جرمنی میں ترجمہ بھی کرتی ہیں، ڈاکٹر منیر الدین اس سلسلے میں اہم کام کر رہے ہیں، ابھی ابھی جرمن شاعر ایرک فریڈ کی نظموں کے ترجمے کی کتاب انھوں نے شائع کی ہے۔

ڈاکٹر کرسٹینا نے کہا کہ ان کی یونیورسٹی میں ایک صاحب اقبال احمد خاں ہیں وہ کیمسٹری کے شعبے سے تعلق رکھتے ہیں، ا کی بیگم جرمن خاتون ہیں، وہ بھی اپنے طور پر ترجمے کا کام کرتی رہتی ہیں۔

عالی صاحب نے ڈاکٹر کرسٹینا سے کہا کہ ہم اُردو والے غیر ملکی ادب کی اہمیت سے بخوبی واقف ہیں ایک ہزار برس پہ البیرونی نے "کتاب الہند" لکھی تھی، وہ ہمارے ہاں ترجمے کی صورت میں موجود ہے، البیرونی پر ایک طویل مقالہ کتابی صورت میں انجمن نے چھاپا ہے، ۱۸۷۰ء کے قریب گارساں دتاسی کی تاریخ اُردو بھی انجمن نے ترجمہ کرا کے چھاپی ہے، قدیم کتب کے علا جدید ادیبوں میں کافکا اور برشت پر اُردو میں بہت کام ہوا ہے، ہم اُردو میں ان کی کتابوں کے تراجم مسلسل چھاپ رہے ہیں لیکن ایسا کوئی کام جرمنی میں نہیں ہوا اس پر شان الحق حقی نے کہا "حالانکہ اورینٹل مومنٹ جرمنی سے شروع ہوا۔"

عالی صاحب نے گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا، اُردو زبان و ادب تراجم کے معاملے میں بہت باثروت ہو چکا ہے۔ اب کو ایسی ضرورت ہوئی چاہیے کہ یہ ٹریفک دو طرفہ ہو۔ کیا جرمنی میں اُردو زبان و ادب کے سلسلے میں کوئی میجر انٹرسٹ پیدا ہوا ہے؟

ہیں؟ اس کا جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر کرسٹینا نے کہا کہ ایک طبقے میں دلچسپی تو ہے اور کام بھی ہوا ہے۔

عالی صاحب نے ڈاکٹر کرسٹینا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہم چاہتے ہیں کہ آپ جرمنی زبان میں ہمارے لیے "گارساں دتاسی" بن جائیں۔ اُردو ادب اس مقام پر پہنچ چکا ہے کہ جرمن قوم کو اُردو پر زیادہ دھیان دینا چاہیے۔ عالی صاحب نے مزید کہا کہ انجمن کے وسیع تر مقاصد میں یہ بھی ہے کہ عالمی روابط میں اس کا مقام پیدا ہو۔

پروفیسر عتیق کے اس سوال کا کہ "شہر کے علاوہ دیہات آپ کے افسانہ نگاروں کے افسانوں میں پیش کیا جاتا ہے کہ نہیں" ڈاکٹر کرسٹینا نے کہا کہ "جرمن افسانہ نگاری پر شہری زندگی زیادہ تر غالب ہے۔ دیہی زندگی کم روشناس ہوئی ہے۔ اعلیٰ طبقہ اور متوسط طبقہ ہی کا ادب فکشن میں لکھا جاتا ہے۔"

قمر جمیل نے جرمنی اسٹرکچرلزم کے حوالے سے جب سوال کیا تو ڈاکٹر کرسٹینا نے کہا ساختیات کے مختلف اسکول ہیں، ساختیات ایک طرح کی انتہا پسندی کا شکار ہے، بہرحال سب ادبی تحریکیں ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہیں۔ اور نئی نئی تحریکیں بھی روشناس ہوتی رہی ہیں۔ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔

قمر جمیل نے ڈاکٹر کرسٹینا سے پوچھا "قرۃ العین کے ناول "آگ کا دریا" پر ORLANDO کا اثر تو نہیں اس کے TIMECONCEPT کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ڈاکٹر کرسٹینا نے جواب میں کہا کہ، ہند کلچر اور موڈرن کلچر کا CONCEPTOFTIME گہرا نہیں معلوم ہوتا ہے۔

قمر جمیل کے اس سوال کے جواب میں کہ قرۃ العین کے ہاں CONCEPTOFREALITY کا تصور کہاں سے انسپائر ہے؟ ڈاکٹر کرسٹینا نے کہا کہ "لندن کی ایک رات" وغیرہ سے ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کے اس سوال کے جواب میں کہ آپ نے پی ایچ ڈی کے لیے قرۃ العین ہی کا انتخاب کیوں کیا؟ ڈاکٹر کرسٹینا نے جواب دیا کہ "ایک وجہ تو یہ ہے کہ قرۃ العین فی الحال اُردو ناول کا سب سے بڑا نام ہے دوسرے یہ کہ اس طرف میری توجہ سیّد سبط حسن صاحب نے کرائی تھی۔"

شہاب قدوائی نے سوال کیا آپ کو اُنکے ناولوں میں سب سے زیادہ متاثر کس کردار نے کیا ہے تو ڈاکٹر کرسٹینا نے جواب دیا کہ اُن کے ناول "آخرِ شب کے ہمسفر" میں دیپالی کے کردار نے۔

ام عمارہ نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ ایک اور اہم کردار "آگ کا دریا" میں چمپا کا ہے پھر اُم عمارہ نے کچھ دیر ناول "آخرِ شب کے ہمسفر" کے سیاق و سباق پڑھا کے کے حوالے سے اظہار خیال کیا

اس طویل گفتگو میں وقتاً فوقتاً انجمن ترقی اُردو کے صدر نور الحسن جعفری، محترمہ ادا جعفری ڈاکٹر فہیم اعظمی وغیرہ شریک ہوتے رہے۔

جو لوگ ڈاکٹر کرسٹینا کے اعزاز میں کیے گئے ظہرانہ میں شریک ہوئے اُن میں جناب نور الحسن جعفری، محترمہ ادا جعفری، جناب شان الحق حقی، جناب جمیل الدّین عالی، جناب شوکت صدیقی، جناب قمر جمیل ڈاکٹر فہیم اعظمی، پروفیسر عتیق، احمد جناب ذوالفقار احمد، پروفیسر سلمیٰ حقی جناب سحر انصاری، محترمہ ام عمارہ محترمہ شہناز پروین، پروفیسر علی حیدر ملک اور ڈاکٹر ممتاز احمد خاں شامل تھے۔

تقریب کا اختتام ظہرانے پر ہوا۔

"بابائے اردو ریسرچ سینٹر کراچی" کا اجلاس

۳۰ مارچ ۱۹۹۴ء کو بابائے اُردو ریسرچ سینٹر وفاقی گورنمنٹ اُردو کالج کی طرف سے "نفاذِ اردو...... امکانات و پیش رفت" کے موضوع پر بلدیہ کراچی وسطی کے آڈیٹوریم میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ جلسے کی صدارت جناب ایس ایچ ہاشمی نے فرمائی، مہمان خصوصی جناب جمیل الدّین عالی تھے، جنھیں پروگرام کے مطابق کلیدی خطبہ سُنانا تھا۔ ان کے علاوہ اسٹیج پر بابائے اُردو ریسرچ سینٹر کے سرپرست اعلیٰ پروفیسر رفیع عالم اور بلدیہ وسطی کے ایڈمنسٹریٹر جناب خواجہ شفیق احمد بھی موجود تھے۔

جلسے کی نظامت کے فرائض پروفیسر علی حیدر ملک نے انجام دیے۔ جلسہ کا آغاز جناب سیّد وسیم الدّین کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔

پروفیسر علی حیدر ملک نے مہمانوں کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ جلسہ بلدیہ وسطی کے ایڈمنسٹریٹر جناب خواجہ شفیق احمد کے تعاون سے ہو رہا ہے۔ آج کے توسیعی خطبہ کا موضوع جیسا کہ آپ سب کو معلوم ہے۔ "نفاذ اُردو امکانات و پیش رفت ہے" یہ ایک اہم موضوع تھا اس کے لیے موزوں شخص انجمن ترقی اُردو کے معتمد اعزازی جناب جمیل الدّین عالی ہی ہوسکتے تھے۔ اُردو کے لیے اُن کی خدمات کا دائرہ وسیع تر ہے۔ ان کے علاوہ اس تقریب کے لیے ایس ایچ ہاشمی صاحب کا دوسرا موزوں نام ہے اُردو کے سلسلے میں ان کی خاموش خدمت سب کی نظر میں ہے۔ جہاں کہیں اُردو کے مفاد میں کوئی کام ہوتا ہے، اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں اس کے بعد پروفیسر رفیع عالم نے ایک مضمون پڑھا اپنے مضمون میں انھوں نے کہا کہ بابائے اردو مولوی عبد الحق کے شایان شان یادگار قائم کرنا۔ غیر ملکیوں کے لیے ڈپلوما کورس کا اردو میں انتظام کرنا، اور ملکی و غیر ملکی اساتذہ کے لیے توسیعی خطبے کا بندوبست کرنا "بابائے اردو ریسرچ سینٹر" کے اغراض و مقاصد میں شامل ہے۔

کلیدی خطبے کے لیے مائیک پر مہمان خصوصی جناب جمیل الدّین عالی کے آنے سے پہلے پروفیسر علی حیدر ملک نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ عالی صاحب اس کلیدی خطبہ کے لیے موزوں ترین فرد ہیں، ان کی علمی و ادبی خدمات ہمہ جہت ہیں مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنی انتھک محنت سے علم و ادب کی ایک تاریخ مرتب کی ہے، اور اب وہ خود ایک تاریخ ہیں، ملک کی کوئی سرگرمی اگر وہ علم و ادب سے تعلق رکھتی ہے تو اُس میں عالی صاحب کی خدمات اور وہ خود وہاں کسی نہ کسی عنوان سے موجود ہوتے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ وہ ثقافتی، ادبی و علمی راستے کا ایک جنکشن ہیں۔

جناب علی حیدر ملک نے مزید کہا کہ ایک وقت میں عالی صاحب اُردو کالج کے ایڈمنسٹریٹر رہے، بلاشبہ اُردو کالج کے بانی مبانی بابائے اردو مولوی عبد الحق کی ذات گرامی ہے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اُردو سائنس کالج کی تعمیر کے سلسلے میں جناب اختر حسین، سابق صدر انجمن اور جناب جمیل الدّین عالی کی مجاہدانہ سرگرمیاں کبھی بھلائی نہیں جاسکتیں۔

اس تعارف کے بعد جناب جمیل الدّین عالی نے مائیک کے روبرو آتے ہوئے کہا میں بابائے اردو تحقیقی مرکز (ریسرچ سینٹر) کے قیام پر اُن کے سرگرم منتظمین کو مبارکباد دیتا ہوں۔ ان کی توقعات کا احترام کرتا ہوں اگر توقعات ختم کردی جائیں تو پھر باقی مایوسی رہ جاتی ہے اور مایوسی کفر ہے لہذا ہمیں ہر حال میں توقعات کا چراغ جلائے رکھنا چاہیے اور نہ صرف جلائے رکھنا چاہیے بلکہ جہاں کہیں جلنے والے ایسے ہر چراغ سے تعاون کرنا چاہیے۔

جناب عالی صاحب نے اس بات کی یاد دلائی کہ قائد اعظمؒ کے ساتھ بابائے اردو مولوی عبد الحق نے اُردو کے ہتھیار سے پاکستان کے حصول کی جنگ لڑی۔ فروغ اردو اور نفاذ اردو کی خاطر کیا کچھ نہ کیا۔ اور کیا کچھ نہ کیا جارہا ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی

کتاب "اُردو قومی یکجہتی اور پاکستان" محمد احمد سبزواری کی تالیف "فرہنگِ اصطلاحات بینکاری" اس کے تازہ ثبوت کے طور پر پیش کیا۔

اُنھوں نے کہا کہ "اُردو قومی یکجہتی اور پاکستان" اُردو کی سیاسی تاریخ پیش کرتی ہے اس کتاب میں ۳۲ صفحات پر محیط میرا مقدمہ ہے جس میں تیس فیصد ایسے عوامل و عناصر کا ذکر کیا گیا ہے جو آج نفاذِ اُردو کی راہ میں درپیش ہیں۔

عالی صاحب نے کہا مجھے یاد ہے ایک موقع پر صدر ایوب خاں کو مولوی صاحب نے برملا کہا تھا۔ "اگر تم چاہو تو مارشل لا کا کوئی ضابطہ بنا کر کل سے اُردو کا نفاذ کرا سکتے ہو۔"

انھوں نے کہا وقتاً فوقتاً سرکاری حلقے سے دفتری اُردو اور عدالتی اُردو کی جو آوازیں اُٹھتی رہتی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ نفاذ کے سلسلے میں ایسی کوئی رکاوٹ حائل نہیں یا ایسی کوئی چیز نہیں جو اُردو زبان میں پہلے سے تیار نہ ہو یا فرمایش پر فوری تیار نہ کی جاسکے۔

اُردو کے نفاذ کے سلسلے میں ڈاکٹر سیّد عبد اللہ اور مولانا صلاح الدّین کی خدمات اور ایثار کو نہیں بھلایا جاسکتا۔ دیکھا جائے تو اُردو عوامی سطح پر تورخم سے لے کر کراچی تک نفوذ کر چکی ہے۔ اس حقیقت کو سرکاری حلقے کے جو لوگ آج تسلیم نہیں کرتے کل وہ تسلیم کرنے پر مجبور ہونگے۔ حقیقت میں اُردو کے نفاذ کا مستقبل قومی یکجہتی کے مستقبل سے جڑا ہوا ہے۔

صدر جلسہ کے خطاب سے پہلے پروفیسر علی حیدر ملک نے اُن کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ویسے تو ہاشمی صاحب کا تعارف یہ ہے کہ وہ ایک بہت بڑے ایڈورٹائزنگ ادارے کے سربراہ ہیں۔ لیکن میرے نزدیک ان کا تعارف دو حوالوں سے اہم ہے۔ ایک یہ کہ وہ ایک بڑے عالم باپ مولانا عبد القدوس ہاشمی کے صاحبزادے ہیں دوسرا یہ کہ وہ ہر ایسے کام میں، جس میں پاکستان کی فلاح و بہبود شامل ہو دامے، درمے سخنے حصّہ لیتے ہیں۔ اسلام آباد اور لاہور میں جناب ہاشمی صاحب زیادہ فعّال نظر آتے ہیں۔

جناب ایس ایچ ہاشمی نے صدر جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا، "قائد اعظم کا وعدہ پورا کیجیے اور نفاذ اُردو کا کام مکمل کیجیے۔" میرا یہی مطالبہ ہے، گزشتہ دس سال میں نفاذِ اُردو کے مسئلہ کو جس قدر میں نے سمجھا اُس کی ترجمانی عالی صاحب نے بہت اچھے انداز سے کردی۔ یہاں میں ایک واقعہ اس حوالے سے بیان کروں گا کہ اگر نفاذ اُردو کے سلسلے میں کوئی صدق دل سے ہمدرد ہو تو وہ بہت کچھ کرسکتا ہے۔ کچھ دنوں پہلے نفاذ اُردو کے سلسلے میں ایک وفد لے کر میں سابق وزیر اعلیٰ پنجاب غلام حیدر وائیں مرحوم کے پاس گیا۔ اس وفد میں جنگ کے میر خلیل الرّحمٰن بھی شامل تھے وائیں صاحب نے اپنے ذاتی اختیارات کو استعمال کر کے پنجاب میں نفاذِ اُردو میں خاصی پیش رفت کردی، اللہ انھیں جنّت میں درجہ بلند کرے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ کسی بات کے کرنے میں خلوص نیت ہو تو ہر سدِّ راہ باطل ہوسکتا ہے۔

صدر جلسہ ایس ایچ ہاشمی صاحب نے مہمان خصوصی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ..... عالی صاحب آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کوئی نہ کوئی آپ کے رہتے ہوئے اُٹھے گا اسی سے نفاذ اُردو کی تحریک آگے بڑھے گی ایسے کام میں سب سے بڑا مسئلہ فنڈ کا ہوتا ہے لیکن میں یقین دلاتا ہوں کہ آپ کو فنڈز کی کمی نہیں ہوگی۔

صدر کے اختتامی خطبہ کے بعد اظہار تشکر کے لیے بلدیہ وسطی کے ایڈمنسٹریٹر جناب خواجہ شفیق احمد مائیک پر آئے۔ اُنھوں نے اپنے مضمون کے حوالے سے بتایا کہ بلدیہ وسطی کی کارکردگی کا محور قومی ہے اور اس کے متعلقہ اداروں میں اردو کے نفاذ

اسلام آباد میں ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کا "واک"

گذشتہ دنوں ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کا، ایک ملک گیر واک (WALK) اسلام آباد میں عمل میں آیا۔ یہ واک کشمیر کاز کے سلسلے میں کیا گیا۔ واک کا انتظام کشمیر اہل قلم کمیٹی نے کیا تھا۔ اس کا مقصد کشمیری عوام کے ساتھ اتحاد و یک جہتی ظاہر کرنا، اور مقبوضہ کشمیر میں بھارتی مسلح افواج کی طرف سے روا رکھے جانے والے ظلم و تشدد کے خلاف غم و غصے کا اظہار کرنا تھا۔

اس احتجاجی "واک" میں چکوال، حویلیاں، فیصل آباد، ایبٹ آباد، حیدر آباد، کراچی اور مظفر آباد کے ادبا، شعرا اور دانشور حضرات بھی کشمیریوں کے حق خود ارادیت کے مطالبے کو تقویت پہنچانے کے لیے شریک ہوئے۔

یہ واک (یا خرام یا پیدل قدمی) پارلیمنٹ کے مقابل پریڈ گراؤنڈ سے شروع ہو کر بھارتی ہائی کمیشن کی عمارت پر ختم ہوا۔ جہاں جناب سید ضمیر جعفری، ڈاکٹر جمیل جالبی، جناب احمد فراز، جناب افتخار عارف اور محترمہ شبنم شکیل نے ہائی کمیشن کے دفتر میں ایک یادداشت پیش کی، اس موقع پر خواتین لکھنے والیوں کی ایک بڑی تعداد کے علاوہ نوے سالہ بزرگ امیر ابازری، (فیصل آباد سے) بیمار پروفیسر عنایت علی (حیدر آباد سے) مشہور فلم و ٹی وی قلم کار جناب اطہر شاہ خان جیدی (کراچی سے) جناب پرتو روہیلہ، جناب محمود ہاشمی، بریگیڈیر ریٹائرڈ گلزار احمد، جناب حلیم قریشی بھی موجود تھے۔

یادداشت میں بھارتی حکومت کو یہ کہا گیا تھا کہ وہ کشمیر و جموں کے عوام سے کیے گئے اپنے وعدہ کا احترام کرے اور انھیں آزادانہ اور غیر جانبدارانہ رائے شماری کے ذریعے۔ اپنی قسمت کا فیصلہ آپ کرنے دے،

"واک" کے اختتام پر اس میں حصہ لینے والے اہل قل حضرات سے کشمیری اہل قلم کمیٹی کے چیرمین سید ضمیر جعفری نے خطاب کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس طرح کے واک (خرام) کا انتظام کشمیر میں کنٹرول لائین اور واگھا سرحد تک اور پاکستان کے بڑے بڑے شہروں میں کیا جائے گا۔

جناب احمد فراز نے اپنی تقریر میں مطالبہ کیا کہ کشمیری عوام کے حقوق کے مقدمہ کو اُجاگر اور پیش کرنے کے لیے جو وفد حکومت کی جانب سے باہر بھیجے جاتے ہیں اس میں ادیبوں کی نمائندگی بھی ہونی چاہیے۔

(ڈان)

نامور سائنسدان ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کا انتقال

پاکستان کے بین الاقوامی شہرت یافتہ سائنسداں ایچ ای جے ریسرچ انسٹیٹیوٹ آف کیمسٹری کے بانی ڈائرکٹر اور پی سی ایس آئی آر کے بانی ڈائرکٹر پروفیسر ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کا جمعرات کی صبح ایک مقامی ہسپتال میں انتقال ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ ان کی عمر ۹۶ سال سے تجاوز کر چکی تھی اُنھوں نے تین بیٹے اور پوتے اور پوتیاں سوگوار چھوڑی ہیں۔ انتقال کی اطلاع ملتے ہی جامعہ کراچی میں تدریس معطل کر دی گئی۔ ایصال ثواب کے لیے جامعہ کراچی کے مختلف شعبوں میں قرآن خوانی اور فاتحہ خوانی کا انتظام کیا گیا۔ انھیں شام کو بعد نماز عصر جامعہ کراچی کے قبرستان میں ان کی اہلیہ کے برابر میں سپرد خاک کیا گیا۔ جنازہ میں گورنر سندھ کے مشیر جی ڈی میمن، صوبائی وزیر عبد الحکیم بلوچ، جامعہ کراچی کے قائم مقام وائس چانسلر، ایچ ای جے ریسرچ انسٹیٹیوٹ آف کیمسٹری کے ڈائرکٹر جامعہ کے اساتذہ اور معززین شہر نے شرکت کی،

ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کی قبر پر گورنر سندھ اور جامعہ کراچی کے چانسلر جناب محمود اے ہارون، انجمن ترقی اردو پاکستان

یونی کیرین اور گرامر اسکول کی جانب سے پھولوں کی چادریں چڑھائی گئیں۔ پختون اسٹوڈینٹس فیڈریشن جامعہ کراچی کے صدر امین خٹک سکریٹری، زاہد انور اور سابق صدر جامعہ کراچی رب نواز مسعود اور اسلامی جمعیت طلبہ جامعہ کراچی یونٹ کے ناظم نے بھی قبر پر پھول چڑھائے۔

ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کی وفات کو صدر مملکت سردار فاروق احمد خاں لغاری نے ایک قومی نقصان کہا اور اپنے تعزیتی پیغام میں فرمایا کہ مرحوم عالمی شہرت کے حامل سائنس داں تھے، جنھوں نے اپنی تمام زندگی سائنسی تحقیق میں صرف کردی، وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو نے ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے مرحوم کے صاحبزادے رافع الزماں کے نام تعزیتی پیغام میں کہا کہ ڈاکٹر صدیقی فخر پاکستان تھے جنھوں نے سائنسی تحقیق کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دیں دریں اثنا رکن قومی اسمبلی، بیگم نصرت بھٹو، گورنر سندھ محمود اے ہارون، وزیر اعلیٰ سندھ سید عبداللہ شاہ نے کہا کہ ڈاکٹر صدیقی نے ملک کے وقار بڑھانے میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، سابق گورنر سندھ حکیم محمد سعید مشیران وزیر اعلیٰ اقبال یوسف اور سید شہود عالم، رکن قومی اسمبلی عبدالعزیز میمن نے بھی تعزیت کی۔ ملک کے بیشتر سیاسی و ثقافتی و کاروباری اداروں کے سربراہوں نے بھی ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کے انتقال پر تعزیت کی اور ان کی موت کو ناقابل تلافی نقصان سے تعبیر کیا۔

مشہور افسانہ نگار شکیلہ اختر کا انتقال

ممتاز ادیب ڈاکٹر اختر اورینوی کی اہلیہ اور اُردو کی مشہور افسانہ نگار محترمہ شکیلہ اختر، بھارت کے شہر پٹنہ میں وفات پاگئیں۔

مرحومہ عصمت چغتائی کے دور کی افسانہ نگار تھیں، ان کا پہلا افسانہ "رحمت" ۱۹۳۶ء میں ادب لطیف میں چھپا تھا۔ اس کے بعد وہ مسلسل افسانے لکھتی رہیں۔ ساتھ ہی شاعری کے ذوق کو بھی زندہ رکھا پہلا افسانوی مجموعہ مکتبہ اردو لاہور نے "درپن" کے نام سے بہت پہلے چھاپا تھا۔ آنکھ مچولی اُن کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ ان کی تصنیفات و تالیفات ان کے علاوہ بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

شمیم صبائی متھراوی

گذشتہ سال جُدا ہم سے ہو گئے یہ لوگ

(۱۹۹۳ء)

(۳۳)

"چشمۂ بخششِ شمیم احمد"

۱۹۹۳ء

موت سے اک محترم نقّاد کی
ہو گیا آغازِ باب درد و غم
اے شمیم ان کے لیے تاریخِ مرگ
لکھ "شمیم احمد ہے مشتاقِ عدم"

۱۴۱۳ھ

(اردو کے ممتاز نقّاد اور جامعہ کراچی کے شعبۂ اردو کے سابق پروفیسر جناب شمیم احمد نے ۲۰ جون ۱۹۹۳ء مطابق ۲۸ ذی الحج ۱۴۱۳ھ بروز اتوار بعمر ۶۰ سال کراچی میں انتقال فرمایا مرحوم کو ان کی وصیّت کے مطابق ان کے بڑے بھائی سلیم احمد مرحوم کے برابر میں پاپوش نگر کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا)

(۳۴)

"وائے داغِ ارتحالِ راگ انبالوی"

۱۹۹۳ء

راگ کی موت سے ہوا غمگیں
ہ سُر [illegible] کو جاننے والا

سال رحلت شمیم ان کا لکھو
"ہوگئی ختم راگ کی مالا"

۱۴۱۴ھ

(ممتاز شاعر، ادیب، صحافی، ناول نگار، افسانہ نویس اور ماہنامہ "آسمان" کراچی کے مالک مدیر جناب راگ انبالوی (اصل نام محمد رفیق) نے ۲۸ جون ۱۹۹۳ء مطابق ۷ محرم الحرام ۱۴۱۴ھ بروز پیر کراچی میں انتقال فرمایا)

(۳۵)

"ہاروں سعد عالمِ باغِ جنّت"

۱۹۹۳ء

چھوڑ کر دنیا کی ساری کلفتیں
دامنِ رحمت میں ہاروں سعد ہیں
بولا یوں رضوان جنّت اے شمیم
"گلشن جنّت میں ہاروں سعد ہیں"

۱۴۱۴ھ

(۳۶)

"مرگِ نامیِ زماں مولانا محمد عنایت اللہ وارثی"

۱۹۹۳ء

اُف عنایت وارثی بھی چل بسے
آپ مولانا بھی تھے خطاط بھی
مصرع سالِ فنا لکھ دے شمیم
"مل گیا حُزنِ عنایت وارثی"

۱۴۱۴ھ

(ملک کے نامور خطاط، نامی حکیم و صحافی اور دس علمی و دینی کتابوں کے مصنف مولانا محمد عنایت اللہ وارثی نے ۶ جولائی ۱۹۹۳ء مطابق ۱۵ محرم الحرام ۱۴۱۴ھ بروز منگل بعمر ۹۵ سال کوٹ وارث ضلع گجرانوالہ میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کو ان کے آبائی قبرستان کوٹ وارث میں سپرد خاک کیا گیا)

(۳۷)

"لوحِ مرقدِ مظفر حسین رزمی"

۱۹۹۳ء

محفل شعر و سخن چھوڑ گئے
کر گئے دہر سے رحلت رزمی
خوب تاریخ شمیم اُن کی ملی
"شاعرِ مجلس جنت رزمی"

۱۴۱۴ھ

(معروف شاعر اور ماہر تعلیم جناب سیّد مظفر حسین رزمی نے ۵ جولائی ۱۹۹۳ء مطابق ۱۴ محرّم الحرام ۱۴۱۴ھ بروز پیر بعمر ۵۹ سال اسلام آباد میں رحلت فرمائی۔ ۶ جولائی کو مرحوم کا جسد خاکی اسلام آباد کے قبرستان (نزد زیرو پوائنٹ) میں سپرد خاک کیا گیا)

(۳۸)

"غم ناک وفات سیف الدّین سیف"

۱۹۹۳ء

سر زمینِ پاک کے جو شاعر معروف تھے
پا گئے مُلک عدم کی راہ سیف الدّین سیف
یوں کہا ہاتف نے ان کا سال رحلت اے شمیم
"تج گئے اجلاسِ ہستی آہ سیف الدّین سیف"

۱۴۱۴ھ

(معروف شاعر، ادیب فلمی نغمہ نگار، فلم ساز، اور ہدایت کار جناب سیف الدّین سیف نے ۱۲ جولائی ۱۹۹۳ء مطابق ۲۱ محرّم الحرام ۱۴۱۴ھ بروز پیر بعمر ۷۲ سال لاہور میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کو منگل کو لاہور میں سپرد خاک کیا گیا)

(۳۹)

"درد آمیز تاریخِ مرگ انعام عزیز"

۱۹۹۳ء

آہ ایوان صحافت چھوڑ کر
بزم گیتی سے اُٹھا انعام آج
سال رحلت یوں ملا ان کا شمیم

"باغِ عالم سے چلا انعام آج"

۱۴۱۴ھ

(معروف صحافی اور روز نامہ ملت لندن کے مالک جناب انعام عزیز نے ۲۶ جولائی ۱۹۹۳ء مطابق ۵ صفر المظفر ۱۴۱۴ھ بروز پیر لندن میں انتقال فرمایا انھیں بدھ کے دن لندن کے ایک قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا)

(۴۰)

"وصل دوام محمد اعظم چشتی"

۱۹۹۳ء

نعت خواں و نعت گو اعظم کی موت
مُلک میں جب باعثِ غم ہو گئی
ان کی تاریخِ اجل بھی اے شمیم
"ماہ و سالِ مرگِ اعظم ہو گئی

۱۴۱۴ھ

(ممتاز نعت خواں اور نعت گو شاعر جناب محمد اعظم چشتی نے ۳۱ جولائی ۱۹۹۳ء مطابق ۱۰ صفر المظفر ۱۴۱۴ھ بروز ہفتہ بعمر ۷۲ سال لاہور میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کو اسی دن قبرستان میاں میر میں سپرد خاک کر دیا گیا)

(۴۱)

"فردوس نشیں جمیل نظر"

۱۹۹۳ء

تھے وطن کے جو شاعر ممتاز
بُدھ کی شب چل بسے جمیل نظر
لکھئے تاریخ مرگ ان کی شمیم
"وائے جاں سے گئے، جمیل نظر

۱۴۱۴ھ

(ممتاز شاعر جناب جمیل احمد نظر نے ۱۸ اگست ۱۹۹۳ء مطابق ۲۸ صفر المظفر ۱۴۱۴ھ بروز چہارشنبہ کراچی میں انتقال فرمایا مرحوم کی تدفین جمعرات کو کراچی کے ایک قبرستان میں عمل میں آئی)

(۴۲)

"روزِ مرگِ خواجہ خیر الدّین"

۱۹۹۳ء

رحلتِ خواجہ خیر الدّین سے
چشم پُر نم ہے قلب ہے غمگین
سال غم بن گیا شمیم ان کا
"وائے بابِ وفاتِ خیر الدّین"

۱۴۱۴ھ

(تحریک پاکستان کے بزرگ رہ نما اور پاکستان مسلم لیگ کے رہ نما خواجہ خیر الدّین نے ۳ اکتوبر ۱۹۹۳ء مطابق ۱۵ ربیع الثانی بروز اتوار بعمر ۷۲ سال کراچی کے جناح اسپتال میں رحلت فرمائی مرحوم کو بعد نماز مغرب گذری قبرستان میں سپرد لحد کیا گیا)

(۴۳)

"یوسف علی سایرِ باغ جناں"

۱۹۹۳ء

اُٹھے دہر سے آہ یوسف علی
وہ کل تک تھے اپنے ہوئے آج غیر
شمیم ان کی تاریخ رحلت ہوئی
"ہیں جنّت میں یوسف علی گرمِ سیر"

۱۴۱۴ھ

(ٹی وی اور سندھی فلموں کے مشہور اداکار جناب یوسف علی نے ۲۲ اکتوبر مطابق ۵ جمادی الاوّل ۱۴۱۴ھ بروز جمعہ بعمر ۴۸ سال کراچی میں انتقال فرمایا۔ بعد نماز عصر مرحوم کو لیاقت آباد کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا)

(۴۴)

"بیان وفاتِ سیّد نظیر حسنین زیدی"

۱۹۹۳ء

حضرت حسنین زیدی اک محقق اک ادیب
قصرِ فردوسِ بریں کے ہوگئے جس دم مکیں
مصرعِ تاریخِ رحلت یوں ملا ان کا شمیم

"بن گئے حسنین زیدی راویٔ خلدِ بریں"

۱۴۱۴ھ

(اردو اور فارسی کے ممتاز ادیب، محقق اور ماہر لسانیات پروفیسر ڈاکٹر سیّد نظیر حسنین زیدی نے ۳ نومبر ۱۹۹۳ء مطابق ۱۷ جمادی الاوّل ۱۴۱۴ھ بروز بُدھ بعمر ۷۰ سال انتقال فرمایا)

(۴۵)

"غمِ مرگ ادیب پاک میاں محمد شفیع"

۱۹۹۳ء

ہیں دنیائے فانی کو تج کر شمیم
ہر اک غم سے پاک اب محمد شفیع
ملا ان کی رحلت کا مصرع ہمیں
"ہوئی زیرِ خاک اب محمد شفیع"

۱۴۱۴ھ

(تحریک پاکستان کے معروف کارکن، بزرگ صحافی، دانشور ادیب میاں محمد شفیع (م۔ش) نے یکم دسمبر ۱۹۹۳ء مطابق جمادی الآخر ۱۴۱۴ھ بروز بُدھ بعمر ۸۰ سال لاہور میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کی تدفین جمعرات کو ہزاروں سوگواروں کے سامنے قبرستان ماڈل ٹاؤن لاہور میں عمل میں آئی)

(۴۶)

"قصۂ وفاتِ شکیل نشتر"

۱۹۹۳ء

ہوا روانہ عدم کی جانب
جب ایک شاعر جہاں سے اٹھ کر
شمیم ہاتف نے یوں پکارا
"جدا ہوا اُف شکیل نشتر"

۱۴۱۴ھ

(اردو کے معروف شاعر جناب شکیل نشتر نے ۴ دسمبر ۱۹۹۳ء مطابق جمادی الآخر ۱۴۱۴ھ بروز ہفتہ بعمر ۵۸ سال کراچی میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کو سوسائٹی کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا)

"تنویر سپرا آرزو مندِ بزم بہشت"

۱۹۹۳ء

چھوڑ کر تنویر سپرا باغِ عالم کو شمیم
جانبِ گلزارِ جنّت جب روانہ ہو گئے
مصرعِ تاریخِ رحلت نکلا ان کے واسطے
"سایلِ فردوس اب تنویر سپرا ہو گئے"

۱۴۱۴ھ

(اردو کے معروف شاعر جناب تنویر سپرا (اصل نام محمد حیات) نے ۱۳ دسمبر ۱۹۹۳ء مطابق ۲۸ جمادی الاخر ۱۴۱۴ھ بروز پیر بعمر ۶۰ سال اسلام آباد کے ہاسپٹل کمپلیکس میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کی میّت جہلم لیجائی گئی اور تدفین منگل کو رشید آباد قبرستان جہلم میں عمل میں آئی)

(۴۸)

"پُر رنج وفاتِ پروفیسر احسن احمد اشک"

۱۹۹۳ء

اشک معروف شاعرِ اردو
کر گئے جب جہان سے رحلت
ان کا سال اجل شمیم مجھے
مل گیا "اشک مالکِ تربت"

۱۴۱۴ھ

(اردو کے معروف شاعر پروفیسر احسن احمد اشک نے ۱۷ دسمبر ۱۹۹۳ء مطابق ۳ رجب المرجب ۱۴۱۴ھ بروز جمعہ بعمر ۴۷ سال ڈھاکا (بنگلہ دیش) میں رحلت فرمائی۔)

(۴۹)

"وجد چغتائی جانِ بزم جنّت"

۱۹۹۳ء

چھوڑ کر دنیائے آب و گل معاً
جا بسے باغ ارم میں وجد بھی

ان کی تاریخِ فنا تو اے شمیم
لکھ گئے "باغِ ارم میں وجد بھی"

۱۴۱۴ھ

(معروف شاعر جناب وجد چغتائی نے دسمبر ۱۹۹۳ء کے آخری ہفتے میں داعی اجل کو لبیک کہا)

(۵۰)

"افق اجمیری علم دانِ باغ فردوس"

۱۹۹۳ء

جا بسے وہ گلشنِ فردوس میں
باغ دنیا میں کہاں ہیں اب اُفق
یوں ندائے غیب آئی اے شمیم
"ماضی باغِ جناں ہیں اب اُفق"

۱۴۱۴ھ

(اردو کے ممتاز شاعر اور صحافی جناب اُفق اجمیری نے ۳۱ دسمبر ۱۹۹۳ء مطابق ۱۷ رجب المرجب ۱۴۱۴ھ بروز جمعہ بعمر ۶۵ سال کراچی میں رحلت فرمائی)

تصوّف پر کچھ کار آمد مقالات

(خدا بخش لائبریری میں)

مرتبہ: رضوان اللہ

مقالہ عنوان	مقالہ نگار	ماخذ
۱۔ حضرت نجم الدین کبریٰ فردوسی	معین الدّین دردائی	دسمبر ۶۱، معارف
۲۔ حالات حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ	سیّد محمد فاروق	مئی جون ۷۹، برہان
۳۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ	نثار احمد فاروقی	ستمبر ۷۶، برہان
۴۔ نظام الدین اولیاؒ محبوب الٰہی	نثار احمد فاروقی	۱۲/۵۳ منادی
۵۔ حضرت خواجہ معین الدین سجزی اجمیری، تاریخ کی روشنی میں	نثار احمد فاروقی	دسمبر ۷۸ جنوری ۷۹، برہان
۶۔ خواجہ خواجگان حضرت خواجہ معین الدّین چشتیؒ	عابد حسین نظامی	۸/۵۷، منادی
۷۔ شاہ محمد غوث گوالیاری	پروفیسر محمد مسعود صاحب	جولائی۔ ستمبر ۶۲، معارف
۸۔ مسعود بک ہندوستان کے حسین بن منصور حلاج	الطاف حسین قروانی	ستمبر ۷۳، معارف
۹۔ شیخ غلام نقشبند گھوسوی لکھنوی	قاضی اطہر مبارک پوری	جنوری فروری ۷۴، معارف
۱۰۔ مخدوم سیّد قاسم حاجی پوری	ڈاکٹر مجتبیٰ حسین	نومبر ۷۴، معارف
۱۱۔ شاہ محب اللہ الہ آبادی	مسعود انور علوی	اگست ۸۴، معارف
۱۲۔ سلسلہ شطاریہ وجیہہ الدّین گجراتی	عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی	فروری ۸۲، معارف
۱۳۔ ہندوستان کے ایک قدیم صاحب دیوان صوفی شاعر شیخ جمال الدین ہانسوی	الطاف حسین قروانی	اکتوبر ۷۵، معارف
۱۴۔ جمال الدّین ہانسوی الخطیب	مسعود احمد	۶،۵/۴۵۔ برہان
۱۵۔ حیات حضرت خواجہ باقی باللہ پر کچھ تازہ مواد	ڈاکٹر محمد سلیم	جنوری ۸۰۔ معارف
۱۶۔ حضرت شاہ برہان الدّین راز الٰہی	بشیر محمد خاں	۸،۶/۶۱، معارف
۱۷۔ حضرت شاہ عیسیٰ جند اللہ	شیخ فرید جبل پوری	۳/۷۵، معارف
۱۸۔ حضرت سید اشرف جہانگیر کا خاندانی پس منظر اور ان کی شخصیت	محی الدّین اظہر	اگست ۸۲، برہان
۱۹۔ تاریخ پیدائش و وفات حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانی	ڈاکٹر وحید اشرف	مارچ ۶۶، معارف
۲۰۔ شیخ نصیر الدّین چراغ دہلوی	مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی	جون ۷۳، برہان
۲۱۔ شیخ عبدالرحمٰن چشتی	ڈاکٹر محمد عمر	مارچ۔ مئی ۷۹، برہان

عنوان	مصنف	ماخذ
۲۲- شیخ عبدالعزیز جون پوری م ۹۷۵ء	محمد ارشد اعظمی	جون ۷۹، معارف
۲۳- قاضی ضیاء الدّین سنائی م ۷۰۹ء ایک اجمالی تعارف	محمد ارشد اعظمی	اکتوبر ۸۱، برہان
۲۴- شیخ محمد عاشق پھلتی	مسعود انور علوی	اپریل ۸۳، برہان
۲۵- شاہ اہل الہند پھلتی قدس سرہ	مسعود انور علوی	اکتوبر نومبر ۸۴، برہان
۲۶- شاہ ولی اللہ دہلوی کے گمنام خلیفہ حافظ عبدالنبی	مسعود انور علی	ستمبر اکتوبر ۸۳، برہان
۲۷- شاہ نور اللہ بڈھانویؒ شاہ ولی اللہ کے شاگرد و خلیفہ	مسعود انور علوی	جولائی ۸۴، برہان
۲۸- خواجہ عبیداللہ احرار نقشبندی ایک مطالعہ	نقی انور علوی	دسمبر ۸۴، برہان
۲۹- مولانا ضیاالدّین نخشبی	خلیق احمد نظامی	۵/۲۷ برہان
۳۰- مرزا رحیم بیگ محمد درویش عظیم آبادی شہید	مناظر احسن گیلانی	۲/۴۱ برہان
۳۱- حضرت شاہ فخر الدّین دہلوی	خلیق احمد نظامی	۲/۸ برہان
۳۲- شیخ ابوالقاسم جلال الدّین تبریزی	ڈاکٹر محمد سلیم	۳/۲۱/۲۰ برہان
۳۳- حضرت بابا فریدؒ	نثار احمد فاروقی	۴/۳۹-۶ منادی
۳۴- حضرت شیوخ العالم بابا فریدؒ	امیر خورد ترجمہ حسن ثانی نظامی	۴/۳۹-۶ منادی
۳۵- حضرت بابا فریدؒ سلسلہ چشتیہ کے ملفوظات میں	نثار احمد فاروقی	۴/۳۹-۶ منادی
۳۶- حضرت شاہ کلیم اللہ جہان آبادی مکتوبات کے آئینہ میں	خلیق احمد نظامی	۴/۱۷ برہان
۳۷- حضرت شیخ اکبر ابن عربی اور ہندوستان	خلیق احمد نظامی	۱/۲۴ برہان
۳۸- حضرت شیخ حسام الدّین مانک پوری اور ان کی تصنیفات	مولانا نظام الدّین احمد	جولائی ۷۹، برہان
۳۹- شاہ ولایت صاحب امروہی کا نسب	سیّد سخی حسن نقوی	مئی ۶۹، برہان
۴۰- شاہ ولی اللہ دہلوی کی تاریخ وفات اور ان کے اہل خاندان کے مزارات اور کتبے	مولانا نور الحسن کاندھلوی	جولائی ۸۳، برہان
۴۱- مشائخ جین پور سید جلال الدّین سید شمس الدّین	قاضی اطہر مبارک پوری	مئی ۸۴، برہان
۴۲- بہار کے صوفیاء کرام: تاج فقیہہ، مخدوم چرم پوش، شیخ یحییٰ منیری،	سیّد شمیم احمد	نومبر دسمبر ۶۳- معارف
۴۳- لطائف اکبری نادر قلمی ملفوظ- خواجہ علی اکبر مودودی کے احوال و اقوال	مفتی محمد رضا انصاری	مارچ جولائی ستمبر اکتوبر ۷۱، برہان
۴۴- مناقب الاصفیا- خانوادہ فردوسیہ کا قدیم ترین تذکرہ	سیّد شمیم احمد	مارچ ۶۵- معارف
۴۵- مناقب الاصفیا	سیّد شاہ علی ارشد	اپریل ۶۶، معارف
۴۶- مناقب الاصفیا	یکے از خاکپائے فردوسیاں	اکتوبر ۶۵، معارف
۴۷- مناقب الاصفیا از شمیم احمد پر تنقید	یکے از خاکپائے فردوسیاں	۴/۹۶، معارف
۴۸- شیخ شیوخ العالم حضرت بابا فریدؒ مسعود گنج کے مجموعہ ملفوظات، احت القلوب کا مطالعہ	اخلاق حسین دہلوی	نومبر- جنوری ۸۲-۸۱ معارف
۴۹- راحت القلوب	نثار احمد فاروقی	۴/۳۹-۶ منادی
۵۰- شیخ شیوخ العالم حضرت بابا فرید کے مجموعہ ملفوظات "اسرار الاولیا" کا مطالعہ	اخلاق حسین دہلوی	نومبر- فروری ۸۱-۸۰ معارف
۵۱- اسرار الاولیا	... نثا احمد فاروقی	..... منادی

۵۲۔ حضرت بختیار کاکی کے مجموعہ ملفوظات "فوائد السالکین" کا مطالعہ	نثار احمد فاروقی	۴/۳۹-۶ منادی
۵۳۔ فوائد السالکین	نثار احمد فاروقی	۴/۳۹-۶ منادی
۵۴۔ دُررِ نظامی، بابا فریدؒ اور محبوب الٰہی کے حالات کا ایک اہم ماخذ	نثار احمد فاروقی	۴/۳۹-۶ منادی
۵۵۔ احسن الاقوال، بابا فرید اور محبوب الٰہیؒ کے حالات کا ایک اہم ماخذ	نثار احمد فاروقی	۴/۳۹-۶ منادی
۵۶۔ تصوفِ اسلامی پر ایک ہندوستانی کتاب "لطائف اشرفی"	ڈاکٹر وحید اشرف	اگست، ستمبر ۶۸، معا
۵۷۔ مبلغ الرجال، خواجہ باقی باللہ کی تصنیف	محمد اسلم	مئی ۶۹، برہان
۵۸۔ مراۃ الاسرار ایک جائزہ	معین احمد	مئی ۸۴، معارف
۵۹۔ گلزار وحدت از شاہ تراب علی چشتی	ڈاکٹر انور السعید اختر	جولائی ۷۱، معارف
۶۰۔ شاہ حسین لاہوری کا ایک غیر معروف رسالہ "تہنیہ"	محمد اقبال مجددی	اگست ۷۰۔ معارف
۶۱۔ الخرگوشی کا رسالہ تصور انڈیا آفس لائبریری میں	اربری کی تلخیص	معارف
۶۲۔ کشف الحقائق شاہ جند اللہ کے ملفوظات	شیخ فرید جبلپوری	۶/۸۰ معارف
۶۳۔ حضرت امیر خسرو اور افضل الفوائد	صباح الدین عبدالرحمٰن	۱/۵۴-۴ منادی
۶۴۔ ملفوظات خواجگان چشت	صباح الدین عبدالرحمٰن	اکتوبر۔ دسمبر ۶۴ء
۶۵۔ ملفوظات حضرت شیخ وجیہہ الدین گجراتی	غلام مصطفیٰ خاں	۶/۶۵ معارف
۶۶۔ جواہر الاسرار میں کبیر کی بات چیت	سید سلیمان ندوی	۳/۴۳، معارف
۶۷۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے ملفوظات	نثار احمد فاروقی	نومبر ۷۱، برہان
۶۸۔ مکتوبات مجدد الف ثانی	مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی	اگست ۷۳، برہان
۶۹۔ مکتوبات شیخ الاسلام مظفر شمس بلخی اور سلطان غیاث الدین	سید عبدالرزاق اورنگ آبادی	۸۲/۲،۳،۶ معارف
۷۰۔ مکاتیب مرزا مظہر جانجاناں	عبدالرزاق قریشی	۸۵/۲۔ معارف
۷۱۔ جوگ بششٹ مترجمہ دارا شکوہ	ابوظفر ندوی	۴۰/۱،۲، ۴ برہان
۷۲۔ صوفیانہ اشارات و اصطلاحات	ڈاکٹر صفدر علی بیگ	جنوری ۶۸ معارف
۷۳۔ تصوف اور اس کے مسائل	ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ	ستمبر ۷، معارف
۷۴۔ روح کے اقسام کے متعلق مسلم مفکرین اور صوفیہ کے خیالات	کبیر الدین فوزان	جون ۱، معارف
۷۵۔ فلسفہ فقر یعنی سائنس اور تصوف	سر امین جنگ بہادر	۳/۲۱-۴ معارف
۷۶۔ تصوف کی اجمالی تاریخ	عبدالسلام ندوی	۳۵/۴،۶،۳/۲-۲
۷۷۔ تصوف کا اثر علوم و فنون پر	عبدالسلام ندوی	۳۷/۱۔ معارف
۷۸۔ دکن میں چشتیہ سلسلہ کی ابتدا اور فروغ: ۱۵۳۸-۱۳۰۰	ڈاکٹر سلمان صدیقی	ستمبر ۷۹، برہان
۷۹۔ عوالم خمسہ اور مراتب وجود	شاہ فتح محمد غوث ترجمہ محمد علی رحمانی	۲/۱۹ برہان
۸۰۔ حضرت اخی سراج کی آرام گاہ سعد اللہ پور کا تعارف	اکمل یزدانی	جولائی ۸۰ معارف
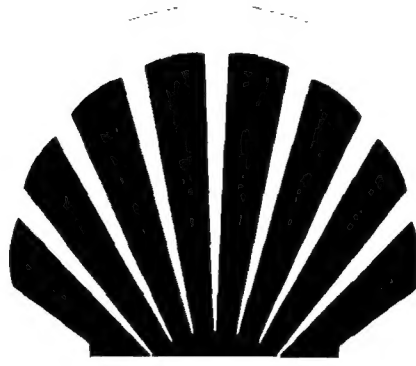
Regd M.No. 270 (Phone: 461406

Monthly # QAUMI ZABAN **Karachi**

انجمن کی مجوزہ عمارت کا نقشہ
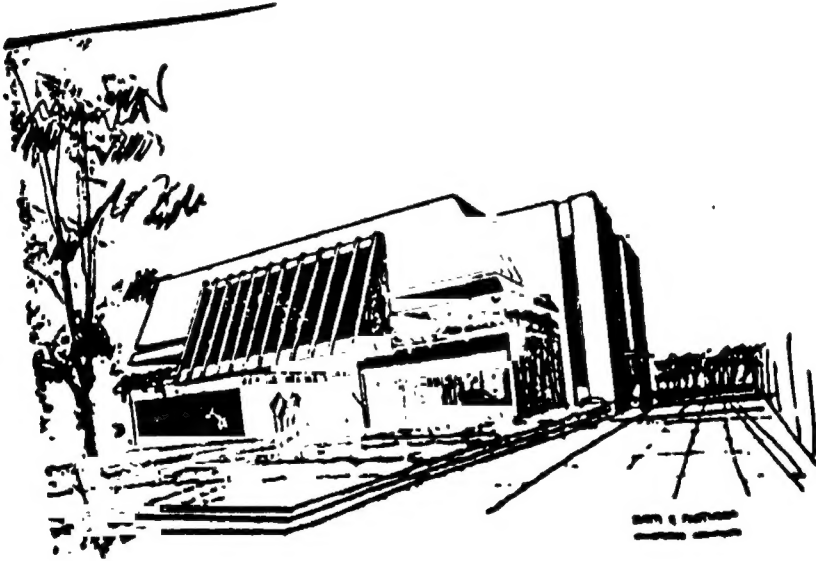
ایک خواب

جسے شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے ہر پاکستانی کے تعاون کی ضرورت ہے

مدیر: ادیب سہیل، طابع: مشہور آفسٹ پریس، مقامِ اشاعت: انجمن ترقی اردو پاکستان، ڈی - ۱۵۹ - بلاک (۷) گلشن اقبال کر